جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن
قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ
کہئے: پس حُجّت پوری اللہ کی رہی
رَحْمَةُ اللّٰهِ الْوَاسِعَةُ
شرح
حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَةُ
جلد سوم
تصنیف
امام اکبر، مجدّدِ ملّت، حکیم الاسلام
حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی قدس سرہ
(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ — ۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء)
شارح
حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ
استاذ دار العلوم دیوبند
زمزم پبلشرز

جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ

کہئے: پس حجت پوری اللہ کی رہی

رَحْمَةُ اللّٰهِ الْوَاسِعَةُ

شرح

حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَةُ

جلدِ سوم

تصنیف

امامِ اکبر، مجددِ ملت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ

(۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ — ۱۷۰۳ء - ۱۷۶۲ء)

شارح

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

اُستاذِ دار العُلوم دیوبند

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مُقدس مسجد اُردو بازار کراچی

کتاب کا نام ——— رحمۃ اللہ الواسعۃ جلد سوم
(جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

تاریخ اشاعت ——— اپریل ۲۰۱۰ء

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-32760374-021-32725673

فیکس: 021-32725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: www.zamzampublishers.com

فہرست مضامین

قسم ثانی

تفصیل وار احادیثِ مرفوعہ کے اسرار وحِکم کا بیان

کتاب الطهارة

کتاب الصلاۃ

☆ ☆ ☆

فہرست فوائد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُخن ہائے گفتنی

اگر روید از تن صد زبانم چو سوسن، شکرِ لطفش کے توانم [1]

رحمۃ اللہ الواسعہ جلد دوم کے پیش لفظ میں عرض کیا تھا کہ آگے شرح کا مسودہ تیار نہیں۔ قارئین کرام کو کم از کم دو سال کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مگر فضلِ خداوندی سے جلد سوم صرف تین ماہ میں تیار ہوگئی۔ رمضان میں لندن میں قیام رہا۔ وہاں سے واپسی پر ۱۵ شوال سے کام شروع کیا۔ اور ۱۳ محرم ۱۴۲۳ ہجری میں یہ جلد تکمیل پذیر ہوئی۔ اور اس کی طباعت کا فیصلہ کیا گیا۔ اب یہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔

اس جلد میں مشکوۃ شریف کی کتاب الایمان، باب الکبائر وعلامات النفاق، باب الوسوسہ، باب الایمان بالقدر، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب العلم، کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلاۃ مع باب الجنائز کی احادیث کی شرح کی گئی ہے۔ اور ان احادیث میں مذکورہ احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس جلد میں بہت سے اہم مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اور شاہ صاحب قدس سرہ چونکہ غایتِ ایجاز سے کام لیتے ہیں، بلکہ کہیں تو صرف اشارہ کرتے ہیں، اس لئے شرح میں تفصیل ناگزیر ہوگئی۔ بہر حال:

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

☆ ☆ ☆

رحمۃ اللہ الواسعہ کی جلد سوم سے حجۃ اللہ البالغہ کی قسم دوم شروع ہو رہی ہے۔ قسم اول میں وہ قواعد کلیہ اور ضوابط عامہ بیان کئے گئے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر شریعتِ اسلامیہ میں ملحوظ اسرار و رموز اور حِکم و مصالح کو مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ یعنی راسخین فی العلم یہ کام خود انجام دے سکتے ہیں۔ اور قسم ثانی میں تفصیل سے شریعت کے اسرار و حکم بیان کئے گئے ہیں۔ اور

[1] سوسن: آسمانی رنگ کا ایک پھول ہے، جسے شعراء زبان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ترجمہ: اگر میرے جسم میں سوسن کی طرح سو زبانیں نمودار ہوں، تو بھی میں ان کی عنایات کا شکر کب ادا کر سکتا ہوں!

احادیث کو بنیاد بنا کر یہ کام انجام دیا ہے۔ جس سے "ہم خرما ہم ثواب" والی بات صادق آ گئی ہے۔ غرض دونوں قسموں کے مندرجات کا فرق ایک مثال سے واضح ہوگا:

ایک باکمال باورچی پلاؤ قورمہ پکانے کی ترکیب لوگوں کو بتائے، پھر دیگ اتارے اور کھانا پکا کر پیش کر دے۔ تو ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ہر شخص مطلوبہ کھانا تیار نہیں کر سکتا، اور دوسری صورت میں صرف کھانے کی دیر رہتی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی قسم اول میں اسرار و حکم جاننے کا فارمولہ پیش کیا ہے۔ مگر فارمولہ چونکہ نظری ہوتا ہے، اس لئے اس کے فہم میں دقت پیش آتی ہے۔ اور کبھی اس کو عملی جامہ پہنانا دشوار ہوتا ہے۔ اور قسم دوم میں مائدہ بچھا دیا ہے۔ اب بڑھیں بھوکے خواہش مند، اور بھریں دامن مراد!

البتہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دیگ تیار کر کے اس پر بھاری ڈھکن رکھ دیا تھا۔ جس کو ہر شخص سرکا نہیں سکتا تھا۔ کوئی موسیٰ ہی کنویں کے اس پتھر کو ہٹا سکتا تھا۔ شارح نے راغبین کی سہولت کے لئے اس ڈھکن کو سرکا دیا ہے۔ بلکہ کھانا برتنوں میں نکال کر دسترخوان سجا دیا ہے۔ اب یہ فیصلہ قارئین کرام کو کرنا ہے کہ شارح نے یہ خدمت بخوبی انجام دی ہے یا نہیں؟ میاں مٹھو بننا ٹھیک نہیں!

☆ ☆ ☆

رحمۃ اللہ الواسعۃ کی پہلی دو جلدوں کی قارئین کرام اور اربابِ نظر نے توقع سے زیادہ پذیرائی کی۔ مکرم و محترم جناب مولانا واصف حسین ندیم الواجدی صاحب نے ماہنامہ ترجمانِ دیوبند (جلد ۳ شمارہ ۲ بابت ماہ ذی قعدہ سن ۱۴۲۲ ہجری) میں اور شیخوپورہ (اعظم گڈھ) کے حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے، جو شارح کے خواجہ تاش ہیں، ماہنامہ ضیاء الاسلام (جلد ۲ شمارہ ۵ بابت صفر سن ۱۴۲۳ ہجری) میں اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی اعظمی نے رسالہ دارالعلوم (جلد ۸۶ شمارہ ۵ و ۶ بابت صفر سن ۱۴۲۳ ہجری) میں، اور حضرت مولانا زین العابدین صاحب اعظمی نے رسالہ مظاہر علوم میں، اور برادر مکرم مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری نے رسالہ ندائے شاہی میں ایسے وقیع تبصرے فرمائے کہ کلاہِ دہقاں بہ آفتاب رسید! اور زبانی ذرّہ نوازی کرنے والے قارئین اور اہل علم کا تو شمار ہی نہیں۔ شارح ان سب بزرگوں، دوستوں اور قارئین کی تشجیع کا ممنون و مشکور ہے۔ ان کے تاثرات سے شارح کو حوصلہ ملا ہے، اور کام تیز تر ہو گیا ہے **فالحمد للہ!**

☆ ☆ ☆

ایک خاص بات: جسے لوگوں نے بہت سراہا ہے: وہ شرح کا نام ہے۔ مگر عام طور پر ایسا خیال کیا گیا ہے کہ یہ نام بس اتفاقاً ہاتھ آ گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جہاں سے حضرت شاہ صاحب نے اپنی کتاب کا نام رکھا ہے اور جس مناسبت سے رکھا ہے، اسی جگہ سے اور اسی وجہ سے شرح کا نام بھی اخذ کیا گیا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے سورۃ الانعام آیت ۱۴۹ سے اپنی کتاب کا نام لیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: ﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ اس آیت میں تین باتوں کی طرف اشارہ ہے: (۱) انسانوں کو مکلّف کیوں بنایا گیا ہے، دیگر حیوانات کی طرح اسے بھی 'مہمل' کیوں نہیں چھوڑا گیا؟ (۲) انسانوں کے لئے جزاؤ سزا کیوں ہے؟ دیگر حیوانات کی طرح وہ بھی مرفوع القلم کیوں نہیں؟ (۳) شریعت: حِکَم ومصالح پر مشتمل ہے۔ اور چونکہ حجۃ اللہ البالغہ میں بھی یہی تین باتیں بیان کی گئی ہیں، اس لئے آپ نے کتاب کا یہ نام رکھا ہے۔

مذکورہ آیت سے ایک آیت پہلے ہے: ﴿فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ﴾ اس آیت میں بھی مذکورہ تینوں باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ مضمون یہ چل رہا ہے کہ یہود پر بعض عارضی مصالح سے یا ان کی شرارتوں کی وجہ سے بعض چیزیں حرام کی گئی تھیں۔ جیسے اونٹ کا گوشت اور چربی ان پر حرام تھی۔ اور ان کا یہ دعوی سراسر غلط تھا کہ یہ چیزیں ابراہیم ونوح علیہما السلام کے زمانہ ہی سے حرام چلی آرہی ہیں۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ اگر شریعت اسلامیہ برحق ہوتی تو وہ سابقہ شرائع سے مختلف کیسے ہوتی! اس آیت میں ان کو جواب دیا گیا ہے کہ تمام شرائع میں اصل محرمات یہ ہیں: (۱) مردار (۲) بہنے والا خون (۳) سور کا گوشت (۴) اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور۔ اونٹ اور چربی کی حرمت اصل شرائع میں نہیں تھی۔ اس کے بعد فرمایا: ''اگر وہ (یہود) آپ کو جھٹلائیں تو آپ کہہ دیں: تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے'' یعنی تمہاری سزا ٹل نہیں گئی۔ بس رحمت کی سمائی سے اب تک تم بچے ہوئے ہو۔ ورنہ اللہ کا عذاب مجرموں سے پھیرا نہیں جاتا۔ وہ ضرور پہنچ کر رہے گا۔

غرض اس آیت میں بھی مذکورہ بالا تین باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جب شرائع میں بعض عارضی مصالح کا اعتبار کیا جاتا ہے، تو دائمی اور مستقل مصالح کا تو بدرجۂ اَولی اعتبار کیا جائے گا۔ اور جس ملت کو جو آئین ملا ہے: وہ اس پر عمل کی پابند ہے۔ یہی تکلیف شرعی ہے۔ اور جو تکذیب پر اڑا رہے گا وہ سزا پائے گا۔ یہ مجازات ہے۔ پس شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کتاب کی جو وجہ تسمیہ ہے، وہی اس کی شرح کی بھی وجہ تسمیہ ہے۔ یہ بات جلد اول کے پیش لفظ میں آنی چاہئے تھی۔ مگر رہ گئی تھی اس لئے اس کی یہاں وضاحت ضروری خیال کی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس جلد میں چند ایسے مسائل آئے ہیں: جن میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف اختیار کیا ہے۔ جیسے نماز میں فاتحہ کی فرضیت کا مسئلہ یعنی فاتحہ نماز میں فرض ہے یا واجب؟ مقتدی کی قراءت کا مسئلہ مراد نہیں۔ اس میں شاہ صاحب نے شوافع کے مسلک کو ترجیح نہیں دی۔ اور رکوع میں جاتے اور اٹھتے رفع یدین کی سنیت کا مسئلہ۔ اور

قلتین کی حدیث سے مائے کثیر وقلیل کی حد بندی کا مسئلہ۔ اور بعض جگہ امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کی طرف میلان پایا جاتا ہے، جیسے حیض کی اقل واکثر مدت کا مسئلہ۔ اور بعض جگہ امام احمد رحمہ اللہ کے مسلک کو پسند کیا ہے۔ جیسے نماز میں کلام قلیل کی گنجائش کا مسئلہ۔ ایسی تمام جگہوں میں اور ان کے علاوہ دیگر اختلافی مسائل میں شرح میں دو باتوں کا التزام کیا گیا ہے:

پہلی بات: امانتِ علمی کے حق کی ادائیگی کے لئے شارح کے نزدیک جو بات حق تھی، اُسے ادب واحترام کے تقاضوں کا پورا لحاظ رکھ کر، پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری کے سامنے مسئلہ کے دونوں پہلو آجائیں۔ اور وہ علی وجہ البصیرت فیصلہ کر سکے۔

دوسری بات: اہم اختلافی مسائل میں مدارکِ اجتہاد بیان کئے گئے ہیں یعنی وہ نقطہ ابھارا گیا ہے جو اختلاف کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اختلافِ ادلّہ کی صورت میں مؤثر نقطۂ نظر ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح نصوص فہمی پر بھی نقطۂ نظر کا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً رفع یدین کی سنیت وعدم سنیت میں اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ رفع یدین: تکبیر فعلی یعنی تعظیم عملی ہے یا اس کا مقصد تحرم ہے اور وہ محض ایک حرکت ہے جو نماز کے منافی ہے؟ پہلا نقطۂ نظر: حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد رحمہما اللہ کا ہے، چنانچہ وہ سنیتِ رفع کے قائل ہوئے۔ اور دوسرا نقطۂ نظر امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا ہے۔ چنانچہ وہ نماز میں کسی بھی جگہ رفع یدین کی سنیت کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ کراہیت کے قائل ہیں (اور تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین نماز سے باہر ہے۔ نماز کا آغاز تکبیر سے ہوتا ہے) اور جب نقطۂ نظر مختلف ہو جاتا ہے تو دلائل میں الجھنا بےکار ہو جاتا ہے۔ جب تک نقطۂ نظر نہ بدلے: فیصلہ اور ترجیح کا رخ نہیں بدل سکتا۔

☆ ☆ ☆

خیر یہ باتیں تو موضوع سے ہٹی ہوئی ہیں یعنی ضمناً یہ باتیں کتاب میں زیر بحث آئی ہیں۔ مگر جو کتاب کا اصل موضوع ہے یعنی شریعت کے اسرار وحکم کا بیان: اس میں یہ کتاب لاجواب ہے۔ اسلامی کتب خانہ میں اس کی نہ کوئی مثال ہے نہ مثیل۔ موضوع کے تعلق سے حجۃ اللہ البالغہ کے ــــ بطور مثال ــــ تین امتیازات ہیں:

پہلا امتیاز: حکمتِ شرعیہ کے موضوع پر حجۃ اللہ سے پہلے بھی کتابیں لکھی گئی ہیں اور بعد میں بھی۔ بعد کی کتابیں یہ ہیں: علامہ حسین جسر طرابلسی کی الرسالة الحميدية في حقيقة الديانة الإسلامية اور حکیم الامت حضرت تھانوی کی المصالح العقلية للأحكام النقلية یعنی احکام اسلام عقل کی روشنی میں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے وہ تشفی حاصل نہیں ہوتی جو حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب قدس سرہ نصوص (قرآن

وحدیث) کو بنیاد بنا کر حکمتیں بیان کرتے ہیں۔اور بہت سی مصلحتوں کی طرف خود نصوص میں اشارے آئے ہیں۔اس لئے آدمی جب نص پڑھ کراس کی روشنی میں حکم کی مصلحت پڑھتا ہے تو اسے شرح صدر حاصل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جو حدیثیں مختصر لکھی ہیں: شرح میں وہ پوری مع حوالہ لکھی گئی ہیں، جس سے کتاب طویل تو ہوگئی ہے، مگر حکمت کے سمجھنے میں وہ بہت مددگار ثابت ہوگی۔

دوسرا امتیاز: حکمتِ شرعیہ کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں پوری شریعت کے اسرار وحکم کو بیان کرنے کا التزام نہیں کیا گیا۔اہم احکام کی حکمتیں بیان کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔جبکہ حجۃ اللہ میں ایک ایک جزئیہ کی وجہ بیان کی گئی ہے۔اور پوری شریعت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ایک مربوط ومنظم سلسلہ نظر آتا ہے۔حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے اسلام کو ایک مکمل نظام اور مرتبط الاجزاء نظام حیات کی حیثیت سے اسی کتاب سے جانا ہے''

تیسرا امتیاز: حکمتِ شرعیہ: احکام اسلام کو عقل کی روشنی میں پیش کرنے کا نام ہے۔اور عقل سے مراد: عقلِ اکتسابی نہیں ہے، جو مناطقہ، دانشورانِ قوم اور زیرک وذہین لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ عام انسانی عقل مراد ہے۔ جو بھی لوگوں کو کم وبیش حاصل ہوتی ہے۔مگر اس کا قدر مشترک کیا ہے؟ یہ بات دیگر مصنفین نے منقح نہیں کی۔شاہ صاحب قدس سرہ نے قدر مشترک منترع کیا ہے۔اور اس کی روشنی میں احکام اسلام کو پیش کیا ہے۔اور عقل مشترک کی تنقیح شاہ صاحب نے کس طرح کی ہے، اس کی وضاحت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی اعظمی زید مجدہٗ (مدیر رسالہ دارالعلوم) نے رحمۃ اللہ الواسعہ پر اپنے تبصرہ میں کی ہے۔لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی حکمت آفریں طبیعت کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی عالمگیر روح کو بے نقاب کیا۔اس اہم ترین اور بے نظیر کارنامہ کو انجام دینے کی غرض سے انھوں نے مجموعۂ انسانیت کو اپنی فکر کا محور بنایا۔ کل نوع کے خواص کیا ہیں۔انسانیت کے بہ حیثیت مجموعی تقاضے کیا ہیں۔انسان اپنی زندگی کو کس طرح منظم کرتے ہیں۔ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح باہمی رشتے قائم ہوتے ہیں۔اور حالات کے ساتھ ان میں کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ بہ الفاظِ واضح: انسانیت کیا ہے؟ اس کے جسمانی مطالبے کیا ہیں؟ اس کا دماغ کیا سوچتا ہے؟ اور اس کی روح کیا چاہتی ہے؟ کائنات سے اسے کیا نسبت ہے؟ اور کائنات کے خالق اور اس کے درمیان کیا علاقہ ہے؟ البدور البازغة، الخير الكثير، الطاف القدس وغیرہ اپنی یادگار زمانہ تصانیف میں ان مباحث پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اور پھر اپنی سب سے اہم، یگانۂ روزگار اور معرکۃ الآراء تصنیف: حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے انسانی حکمت کے اصولوں اور اسلامی شریعت کے درمیان مطابقت کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ

انسانیت کے عمومی تصور اور اس کی عملی شکل یعنی اسلامی شریعت میں کوئی تضاد نہیں۔ بلکہ ایک تصور ہے اور ایک اس کا عملی نمونہ (رسالہ دار العلوم ص ۷۰ امئی جون ۲۰۰۲ عیسوی)

سوال: جب شاہ صاحب رحمہ اللہ عام انسانی عقل کے معیار سے حکمتیں بیان کرتے ہیں، تو پھر ان کی باتیں عام لوگوں کے فہم سے بالاتر کیوں ہیں؟

جواب: اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: آپ کے ذہن کی بلند پروازی ہے۔ حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی زید مجدہ نے رحمۃ اللہ الواسعہ پر اپنے تبصرہ میں ارواح ثلاثہ (ص ۲۸۵) سے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے:

''مشاہیر امت میں تین قسم کے افراد گذرے ہیں: (۱) بعض ایسے ہیں کہ حقائقِ شرعیہ میں ان کا ذہن طول وعرض میں چلتا ہے۔ جیسے امام رازی کہ ہر مسئلہ میں پھیلتے زیادہ ہیں۔ اور ترتیب وتفصیل وتہذیب مواد میں زیادہ مستعد ہیں (۲) بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذہن علو کی طرف زیادہ چلتا ہے۔ جیسے شاہ صاحب رحمہ اللہ کہ حقائق میں اس قدر بلند پرواز ہیں کہ اصحابِ ذوق کو بھی ان کے مدرک تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے (۳) اور بعض ایسے ہیں جن کا ذہن عمق کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہ ہر مسئلہ کی تہ اور اصلیت کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ اور ایسی اصل قائم فرما دیتے ہیں کہ سیکڑوں تفریعات اس سے ممکن ہو جاتی ہیں'' (رسالہ ضیاء الاسلام ص ۳۲ جلد ۲ شمارہ ۶ بابت صفر سن ۱۴۲۳ ہجری)

احقر عرض کرتا ہے کہ خود حضرت نانوتوی قدس سرہ کا شمار دوسری قسم کے افراد میں ہے۔ میں نے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ سے یہ واقعہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ جلالین کے مدرس کو کوئی اشکال پیش آیا۔ اس نے احباب سے ذکر کیا۔ کسی سے حل نہ ہوا۔ تو چند اساتذہ مل کر مسجد چھتہ میں حضرت نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اشکال پیش کیا۔ آپ نے جواب دیا، مگر اساتذہ کے پلے کچھ نہ پڑا۔ ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت ذرا نزول فرما کر بیان فرمائیں۔ قدرے توقف کے بعد دوبارہ تقریر فرمائی۔ اس بار الفاظ تو پلے پڑے، مگر مطلب اب بھی سمجھ میں نہ آیا۔ عرض کیا گیا کہ حضرت کچھ اور نزول فرما کر ارشاد فرمائیں۔ فرمایا کہ اس وقت تو اتنا ہی ممکن ہے۔ کسی دوسرے وقت آپ حضرات تشریف لائیں —— اسی علو اور بلند پروازی کی وجہ سے آپ کی باتیں بھی عام لوگوں کے فہم سے بالاتر ہیں۔

غرض: شاہ صاحب کے کلام میں جہاں ایسی نوبت آئی ہے، وہاں ان کی بات کو سمجھانے کی پوری کوشش کرنے کے بعد شارح نے متبادل حکمت بیان کی ہے یا اشکال کا آسان جواب دیا ہے، تاکہ بات عام لوگوں کے لئے بھی قابل فہم ہو جائے۔

دوسری وجہ: مخصوص اصطلاحات، انوکھی تعبیرات اور کلام میں غایت درجہ ایجاز ہے۔ کبھی تو آدھی بات پر اکتفا

کرتے ہیں۔اور کبھی العاقل تکفیه الاشارة پر عمل کرتے ہیں۔اس لئے فہم میں دشواری پیش آتی ہے۔چنانچہ شرح میں اصطلاحات کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے۔عام فہم انداز اختیار کیا ہے اور بات کھول کر بیان کی ہے۔جس سے شرح طویل تو ہوگئی،مگر مضمون فہمی میں ان شاء اللہ کوئی پریشانی پیش نہیں آئے گی۔

☆ ☆ ☆

مذکورہ بالا امتیازات کی وجہ سے اور دیگر بہت سی خوبیوں کی وجہ سے: ہر ذی علم کو خاص طور پر حدیث شریف کے اساتذہ اور طلبہ کو اس جلد سے کتاب کا مطالعہ شروع کرنا چاہئے۔اساتذہ کی تدریس میں اس سے چار چاند لگ جائیں گے۔اور طلبہ کے علم میں گہرائی اور فہم میں گیرائی پیدا ہوگی۔اور دو فائدے مزید حاصل ہوں گے:

پہلا فائدہ: ذہانت سے بہرہ ور ہوں گے۔ذہن میں تیزی پیدا ہوگی اور جلد بات سمجھنے کا ملکہ حاصل ہوگا۔حضرت استاذ الاستاذ: شیخ الہند قدس سرہ نے اپنے استاذ امام اکبر حضرت نانوتوی قدس سرہ کا مقولہ نقل فرمایا ہے کہ:''امت میں تین شخصیتیں ایسی ہیں، جن کی کتابوں سے ربط رکھا جائے، تو آدمی خواہ کتنا بھی غبی ہو: ذہین ہوجاتا ہے ایک: شاہ ولی اللہ صاحب۔دوسرے: حضرت مجدد الف ثانی۔تیسرے شیخ محیی الدین ابن عربی'' پھر شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا:''ایک شخصیت کا میں اضافہ کرتا ہوں۔اور وہ ہیں حضرت الاستاذ'' یعنی حضرت نانوتوی قدس سرہ۔

دوسرا فائدہ: حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ سے آہستہ آہستہ مزاج بنے گا۔اور لوگوں کے سامنے حکمت سے دین پیش کرنے کا سلیقہ پیدا ہوگا۔زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔عقلیت پسندی کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔اور یوروپ وامریکہ میں تو ہو چکا ہے۔وہاں ہر شخص: ہر حکم شرعی کی وجہ پوچھتا ہے۔اور وہی عالم: دین کے افہام وتفہیم میں کامیاب ہے جو حقائق ومعارف سے آگاہ ہے۔اور یہ متاع گرانمایہ ان شاء اللہ اس کتاب سے حاصل ہوگی۔

تنبیہ: مغربی دنیا کا یہ مزاج ایک حد تک خطرناک ہے۔عام لوگ نہ احکام کے مصالح کا ادراک کرسکتے ہیں، نہ ہر عالم ان کی وضاحت پر قادر ہوتا ہے۔ثبوتِ احکام کا اصل مدار نصوص شرعیہ پر ہے۔جب کوئی حکم قرآن وحدیث سے ثابت ہوجائے تو اس کے قبول وامتثال میں حکمت ومصلحت کے معلوم ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔کتاب کے آغاز میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے بھی اس پر تنبیہ کی ہے۔رحمۃ اللہ الواسعہ جلد اول (ص ۱۰۹) عنوان:''احکام پر عمل پیرا ہونا حکمتوں کے جاننے پر موقوف نہیں'' ملاحظہ فرمائیں۔شارع اور مکلفین کی مثال: حاذق حکیم اور بیمار انسانوں جیسی ہے۔جب حکیم نسخہ تجویز کرتا ہے تو مریض اس پر اعتماد کرتا ہے۔مفردات کے خواص اور مرکبات کے فوائد جاننے تک نسخہ کے استعمال میں توقف نہیں کرتا۔

غرض اس ذہنیت کو بڑھاوا نہیں دینا چاہئے۔ اور عام لوگوں کے سامنے بے ضرورت احکام کی حکمتیں بیان نہیں کرنی چاہئیں۔ مجھ سے یوروپ وامریکہ میں لوگ ایک سوال کرتے ہیں کہ دو نمازیں (ظہر اور عصر) خاموش کیوں پڑھی جاتی ہیں؟ میں جواب دیتا ہوں کہ یہی سوال حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: **فی کل صلاۃ نقرأ، فما أَسْمَعَنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أَسْمَعْناکم، وما أخفی علینا أخفینا منکم** (رواہ النسائی وابوداؤد جامع الاصول حدیث ۳۴۷۳) یعنی قراءت تو سب نمازوں میں ہے۔ البتہ جو نمازیں آپؐ نے جہراً پڑھائی ہیں: ہم بھی جہراً پڑھاتے ہیں۔ اور جو سراً پڑھائی ہیں: ہم بھی سراً پڑھاتے ہیں۔ یہ روایت سنا کر میں سائل سے سوال کرتا ہوں کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کو وجہ معلوم تھی یا نہیں کہ دو نمازیں سری کیوں ہیں؟ اگر ان کو وجہ معلوم نہیں تھی تو میں ان سے زیادہ علم نہیں رکھتا۔ اور معلوم تھی تو کیوں بیان نہیں کی؟ اس لئے بیان نہیں کی کہ مخاطبین کما حقہ اس کا ادراک نہیں کر سکتے تھے۔ تو کیا آپ حضرات کی استعداد اُن تابعین سے زیادہ ہے! ہمارے اور آپ کے لئے اچھا راستہ وہی ہے جس کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نشان دہی کی ہے کہ نص کی پیروی کی جائے۔ اس سے زیادہ کی فکر میں نہ پڑا جائے۔

☆ ☆ ☆

اس جلد میں دو فہرستیں شامل کی گئی ہیں: ایک: فہرستِ مضامین ہے۔ جس میں کتاب کے مرکزی عناوین لئے گئے ہیں۔ ضمنی باتوں اور دیگر فوائد کے لئے ''فہرست فوائد'' مرتب کی گئی ہے۔ اس کے مضامین زیادہ تر شرح میں بیان ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ اس سے بھی قارئین کو فائدہ ہوگا۔ **واللہ الموفق والحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.**

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دار العلوم دیوبند
جمعہ یکم جمادی الاولی ۱۴۲۳ ہجری
مطابق ۱۲ جولائی ۲۰۰۲ عیسوی

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حکم کا بیان

کتاب الایمان

و

کتاب الاعتصام

کتاب الایمان میں باب الکبائر وعلامات النفاق، باب الوسوسة اور باب الإیمان بالقدر کی احادیث کی بھی شرح کی گئی ہے ـــــ اور باب الاعتصام بالکتاب والسنّة میں باب العلم کی احادیث کی بھی شرح کی گئی ہے

من أبواب کذا سے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی مراد اس باب کی "اصولی باتیں" ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسمِ ثانی

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حِکم کا بیان

پہلی قسم میں ''قواعد کلیہ'' کا بیان تھا۔ یعنی اس میں وہ اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں، جن کا تعلق بالا جمال تمام نصوص سے ہے۔ اُن مباحث کا تعلق کسی خاص باب یا خاص مسئلہ یا خاص آیت وحدیث سے نہیں ہے۔ اب قسم ثانی میں ابواب وار احادیث مرفوعہ کی اچھی خاصی مقدار کی شرح کرتے ہیں یعنی تمام احادیث کی شرح نہیں کی گئی۔ اور اُن نصوص میں مذکور احکام شرعیہ کے رموز واسرار بیان کرتے ہیں۔

یہاں دو باتیں ذہن نشیں کرلی جائیں:

پہلی بات: حجۃ اللہ میں حدیثوں کے حوالے نہیں دیئے گئے۔ کیونکہ یہ سب معروف حدیثیں ہیں۔ اور حدیث شریف کی چار بنیادی کتابوں: بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی شریف سے لی گئی ہیں۔ دیگر کتابوں سے شاذ ونادر ہی کوئی حدیث لی ہے۔ البتہ تبعاً اور ضمناً دوسری کتابوں کی حدیثیں بھی آئی ہیں (اور شرح میں بھی احادیث کی مفصل تخریج نہیں کی گئی، کیونکہ اس سے کتاب طویل ہوجاتی۔ جو حدیثیں مشکوۃ شریف میں مل گئیں، ان میں عموماً مشکوۃ شریف ہی کا حوالہ دیا گیا ہے، ورنہ اصل کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے)

دوسری بات: حجۃ اللہ میں سب حدیثیں بتمامہ اور بلفظہ نہیں لی گئیں۔ کہیں الفاظ بدل گئے ہیں، اور کہیں حدیث کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ قارئین کرام مذکورہ کتابوں کی طرف مراجعت کرکے پوری حدیث کا پتہ چلا سکتے ہیں (اور شرح میں ہر حدیث بلفظہ اور مفصل درج کی گئی ہے تاکہ قارئین کو مراجعت کی زحمت نہ اٹھانی پڑے مگر صرف ترجمہ کیا گیا ہے)

نوٹ: پہلے مبحث ہفتم کے باب اول میں یہ بات گذر چکی ہے کہ قسم دوم میں صرف اُن احادیث کی شرح کی گئی ہے جو احکام شرعیہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ سنن زوائد سے تعلق رکھنے والی روایات کی شرح نہیں کی گئی۔

القسم الثانی

﴿فی بیانِ أسرارِ ماجاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تفصیلا﴾

والمقصودُ ههنا ذکرُ جُملةٍ صالحةٍ من الأحادیث المعروفةِ عند أهلها، السائرةِ بین حَمَلَةِ العلم، المرویَّةِ فی صحیحَي البخاری ومسلمٍ، وکتابَيْ أبی داود والترمذی. وقلَّما أوردتُ عن غیرها، إلا استطراداً، ولذلک لم أتعرَّضْ لنسبةِ کلِّ حدیثٍ لمُخْرِجه، وربما ذکرتُ حاصلَ المعنی، أو طائفةً من الحدیث، فإن هذه الکتبَ تیسَّر مراجعتُها وتتبُّعُها علی الطالب.

ترجمہ: قسم دوم: آنحضرت ﷺ سے منقول احادیث کے رموز (حکمتوں) کے تفصیلی بیان میں: یہاں مقصود ان احادیث کی معتد بہ مقدار کا تذکرہ کرنا ہے جو محدثین کے نزدیک مشہور ہیں، جو اہل علم کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں، جو بخاری ومسلم کی صحیحین میں اور ابوداؤد وترمذی کی کتابوں میں مروی ہیں۔ اور بہت کم لایا ہوں میں ان کے علاوہ کتابوں سے۔ البتہ ضمناً لانا مستثنیٰ ہے۔ اور اسی وجہ سے ہر حدیث کی اس کی تخریج کرنے والے کی طرف نسبت کرنے سے میں نے تعرض نہیں کیا۔ اور کبھی میں نے حدیث کا خلاصہ یا حدیث کا ایک ٹکڑا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اُن کتابوں کی مراجعت اور ان کی تفتیش خواہش مند کے لئے آسان ہے۔

لغات: جملة صالحة ای مقداراً کافیا ...... حَمَلَة جمع ہے حَامِل کی ...... اسْتَطْرَدَ له: ضمناً لانا یعنی کلام کو اس طرح چلانا کہ اس سے دوسرا کلام لازم آئے۔ یعنی کسی حدیث کی شرح میں ضمناً کوئی حدیث مذکورہ چار کتابوں کے علاوہ کتابوں سے بھی لائی گئی ہے ...... مُخْرِج (اسم فاعل) نکالنے والا۔ مراد وہ محدثین ہیں جو اپنی کتابوں میں سند کے ساتھ حدیثیں روایت کرتے ہیں۔

باب ـــــ ۱

ایمان کے سلسلہ کی اصولی باتیں

ایمان کی دو قسمیں: ظاہری انقیاد اور کامل یقین

پہلے تین باتیں سمجھ لیں:

پہلی بات: آنحضرت ﷺ کی بعثت زمان ومکان یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ آپ تمام جنّ وانس کی

طرف قیامت تک کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ سورۂ سبا آیت ۲۸ میں اس کی صراحت ہے۔ ارشاد پاک ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ، بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بھی لوگوں کے لئے، خوش خبری اور ڈر اوا سنانے والا بنا کر، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں!

دوسری بات: آپؐ کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ آپؐ اللہ کے دین کو تمام ادیان پر غالب کردیں۔ سورۃ الصف آیت ۹ میں ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

اللہ وہی ہیں جنھوں نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا، تاکہ وہ اس کو سب ادیان پر غالب کردیں، اگرچہ کیسے ہی ناخوش ہوں مشرک!

یہی مضمون سورۃ التوبہ آیت ۳۳ وسورۃ الفتح آیت ۲۸ میں بھی آیا ہے۔

تیسری بات: آخری دین کے نازل ہونے کے بعد لوگوں کی صورت حال یہ ہوگی کہ جس کو عزت پیاری ہے وہ تو آپؐ کا لایا ہوا دین قبول کرلے گا اور عزت پائے گا۔ اور جس کی قسمت برگشتہ ہے وہ انکار کر کے ذلیل وخوار ہوگا۔ مسند احمد (۱۰۳:۴) میں روایت ہے کہ:

ليبلُغَنَّ هـذا الأمـرُ مـا بـلَـغَ الليلُ والنهـارُ، ولايتـرك اللّٰهُ بيتَ مَـدَرٍ ولا وَبَـرٍ إلا أدخلَـه اللّٰه هـذا الـدينَ، بِعِزِّ عـزيـزٍ أو بِـذُلِّ ذليـلٍ، عِـزًّا يُعِزُّ اللّٰه به الإسلامَ، وذُلًّا يُذِلُّ اللّٰه به الكفر

یہ دین ضرور وہاں تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک شب وروز پہنچے ہیں (یعنی چاردانگ عالم میں پھیل کر رہے گا) اور اللہ تعالیٰ کوئی کچا پکا گھر ایسا نہیں چھوڑیں گے جس میں اس دین کو داخل نہ کردیں، معزز کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی رسوائی کے ساتھ۔ ایسی عزت جس سے اللہ تعالیٰ اسلام کو قوی کریں گے۔ اور ایسی ذلت جس سے اللہ تعالیٰ کفر کو ذلیل کریں گے۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کر کے فرمایا:

''میں نے اپنے خاندان میں اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے انھوں نے بھلائی، بزرگی اور عزت پائی۔ اور جنھوں نے انکار کیا ان کے حصہ میں ذلت، رسوائی اور جزیہ آیا''

جب آپؐ کے لائے ہوئے دین کی صورت حال یہ ہوگی تو ضروری ہے کہ آپؐ کی امت میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوں۔ مؤمن بھی اور غیر مؤمن بھی[1]۔ ایسے مخلص بھی جنھوں نے آپؐ کی لائی ہوئی ہدایت سے راہ نمائی حاصل کی، اور ایسے منافق بھی جن کے دلوں میں ایمان کی بشاشت داخل نہیں ہوئی۔ پس ضروری ہے کہ ان مختلف قسم کے لوگوں

---

[1] تمام جن وانس آپ ﷺ کی امت ہیں۔ پھر جو ایمان لائے وہ ''امت اجابہ'' ہیں، اور جو ایمان نہیں لائے وہ ''امت دعوت'' ہیں ۱۲

کے درمیان امتیاز قائم کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے انقیاد ظاہری اور تصدیق قلبی کے لحاظ سے ایمان کی دو قسمیں قرار دیں:

پہلی قسم: وہ ایمان ہے جس کے ساتھ دنیوی احکام متعلق ہوتے ہیں یعنی اس سے جان و مال کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ مجاہدین ان کی جانوں اور مالوں سے تعرض نہیں کرتے۔ ایمان کی اس قسم کو آنحضور ﷺ نے چند ایسے امور کے ساتھ منضبط کیا ہے جن سے اطاعت و انقیاد کا صاف طور پر پتہ چل جاتا ہے اور ان اعمال سے مسلمان اور غیر مسلمان میں امتیاز قائم ہو جاتا ہے۔ درج ذیل احادیث ایمان کی اسی قسم سے متعلق ہیں:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ جاری رکھوں کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں۔ پس جب وہ یہ کام کرنے لگیں تو انھوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کر لیا۔ مگر حق اسلام کی وجہ سے، اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے[1]''

تشریح: اس حدیث میں جنگ چھیڑنے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ جنگ بندی کی حد بیان کی گئی ہے کہ جب لوگ توحید و رسالت کو مان لیں اور نماز و زکات کا اہتمام کرنے لگیں تو اب جنگ بند کر دینا ضروری ہے۔ اب جنگ جاری رکھنا جائز نہیں۔ لیکن مسلمان ہونے کے لئے صرف نماز و زکات کافی نہیں، تمام اعمال اسلام ضروری ہیں۔ اور اس حدیث میں صرف ان دو کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان سے اطاعت و انقیاد کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور ''حق اسلام'' سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کوئی ایسا جرم کرے جو جانی یا مالی سزا کو واجب کرتا ہو تو وہ سزا دی جا سکے گی۔ اسلام اس قانون سزا سے مانع نہیں بنے گا۔ اور ''اس کا حساب اللہ پر ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر دل میں کھوٹ ہے تو اس کا حساب آخرت میں ہوگا۔ دنیا میں احکام ظاہر پر جاری ہوں گے۔

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے ہماری (طرح) نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے پس تم اللہ کی ذمہ داری میں رخنہ اندازی نہ کرو[2]''

تشریح: حدیث شریف کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص میں تم اسلام کی یہ ظاہری علامتیں دیکھو اس کو مسلمان سمجھو، اور اس کے جان و مال سے تعرض نہ کرو، کیونکہ یہ اللہ کی ذمہ داری میں رخنہ اندازی ہے۔ حدیث شریف کا یہ مقصد نہیں ہے کہ جس میں بھی یہ ظاہری علامتیں پائی جائیں وہ بہر حال مسلمان ہے۔ خواہ وہ کیسے ہی خلافِ اسلام عقائد و خیالات رکھتا

---

[1] متفق علیہ، مشکوۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۱۲

[2] رواہ البخاری، مشکوۃ، کتاب الایمان، فصل اول، حدیث نمبر ۱۳

ہو،ایسا سمجھنا پرلے درجہ کی جہالت ہے۔

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا:

''تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں:(۱)اس شخص سے باز آنا جس نے لاإلٰـه إلا اللّٰه کہا،کسی بھی گناہ کی وجہ سے آپ اس کی تکفیر نہ کریں اور کسی بھی بدعملی کی وجہ سے آپ اس کو اسلام سے خارج نہ کریں (۲) جہاد۔ وہ اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔اور وہ اس وقت تک جاری رہے گا جب اس امت کا آخری طبقہ دجال سے جنگ کرے گا۔کسی ظالم (حکمراں) کا ظلم اور کسی عادل (حکمراں) کا عدل اس کو ختم نہیں کرے گا (۳) تقدیر پر ایمان لانا[۱]'' (اس حدیث کے بیان سے مقصود صرف پہلی بات ہے،اس لئے شاہ صاحب نے حدیث مختصر کردی ہے)

دوسری قسم: وہ ایمان ہے،جس پر اخروی احکام کا مدار ہے یعنی جہنم سے رستگاری اور جنت کے درجات حاصل کرنے میں کامیابی۔ یہ ایمان اس وقت متحقق ہوتا ہے جب آدمی تمام برحق باتوں کا اعتقاد رکھے،تمام پسندیدہ اعمال پر کاربند ہو اور تمام اعلیٰ اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرلے۔یہی کامل اور اعلیٰ درجہ کا ایمان ہے۔ یہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے۔قرآن کریم میں جو ایمان میں زیادتی کا تذکرہ آیا ہے اس کا تعلق ایمان کی اسی قسم سے ہے۔اور امام اعظم رحمہ اللہ سے جو مروی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی،اس کا تعلق نفس ایمان سے ہے،کامل ایمان سے نہیں ہے۔

اور آنحضرت ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ایمان کی اس قسم میں شامل تمام چیزوں پر لفظ ایمان کا اطلاق فرماتے تھے۔جیسے حُبُّ الأنصار من الإیمان۔امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الایمان میں اس سلسلہ میں متعدد ابواب قائم کئے ہیں۔اور اعمال اسلام پر ایمان کے اطلاق سے آنحضرت ﷺ کا مقصد اس بات پر مؤثر انداز میں تنبیہ کرنا ہے کہ یہ اعمال،ایمان کامل کا جزء ہیں،ان کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا،درج ذیل احادیث کا تعلق ایمان کی اسی قسم سے ہے:

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ:

''جس میں امانت داری نہیں،اس میں ایمان نہیں۔اور جس میں عہد وپیمان کی پاسداری نہیں،اس میں دین نہیں''[۲]

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ:

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔اور مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے لوگوں کو اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں کوئی خطرہ نہ ہو''[۳]

تشریح: پہلی حدیث میں مثبت پہلو سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ امانت داری اور عہد وپیمان کی پاسداری ایمانیات

---

[۱] رواہ ابوداؤد،مشکوٰۃ،کتاب الایمان،باب الکبائر،فصل ثانی،حدیث نمبر ۵۹

[۲] مسند احمد (۳: ۱۳۵و۱۵۴و۲۱۰و۲۵۱) سنن کبریٰ بیہقی (۶: ۲۸۸) مشکوٰۃ،کتاب الایمان،فصل ثانی،حدیث نمبر ۳۵

[۳] رواہ الترمذی والنسائی،مشکوٰۃ،کتاب الایمان،فصل ثانی،حدیث نمبر ۳۳

میں شامل ہیں۔ اور دوسری حدیث میں منفی پہلو سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ مسلمانوں کی ایذا رسانی اور لوگوں کو ستانا ایمان کے منافی ہے۔

غرض ایمان کی اس قسم کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ایک متفق علیہ روایت میں ایمان کی ستر سے زائد شاخوں کا تذکرہ آیا ہے، وہ سب اعمال اسلام ہیں اور ایمان کی اسی قسم میں شامل ہیں، کیونکہ تمام اعمال خیر یہ، اخلاق حسنہ اور احوال صادقہ ایمان کے شعبے ہیں۔ جب دل میں ایمان جم جاتا ہے اور یقین جڑ پکڑ لیتا ہے تو یہ اعمال اس شخص سے نتیجہ اور ثمرہ کے طور پر ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔

مثال سے وضاحت: ایمان کی اس دوسری قسم کی مثال یہ ہے کہ درخت: تنا، شاخوں، پتوں، پھلوں اور پھولوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ سرسبز وشاداب درخت میں برگ وبار نکلتے ہیں اور یہی کامل اور شاندار درخت ہے۔ ثمر بار بھی ہے اور سایہ فگن بھی اور ہر اعتبار سے قیمتی اور قابل قدر ہے۔ اور اگر اس درخت کی شاخیں کاٹ دی جائیں، پتے جھاڑ دیئے جائیں اور پھل توڑ لئے جائیں تو بھی درخت، درخت ہے مگر ناقص درخت ہے۔ یہی حال اعمال واخلاق کا ہے کہ اگر وہ نہ بھی ہوں تب بھی مؤمن، مؤمن ہے مگر ناقص مؤمن ہے۔ اور اگر تنا ہی اکھاڑ دیا جائے تو درخت ہی نابود ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر تصدیق باقی نہ رہے تو ایمان ہی باقی نہیں رہے گا۔

اور ایمان کی اس قسم کے بارے میں اللہ پاک کا یہ ارشاد ہے کہ:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ، وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيْمَانًا، وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ، الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ، وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ، أُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا، لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (الانفال ۲-۴)

ایمان والے تو بس ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جب ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کردیتی ہیں، اور وہ لوگ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، وہ لوگ جو کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے بڑے درجات ہیں اور مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔

﴿من أبواب الإيمان﴾

اعلم: أن النبي صلى الله عليه وسلم لما كان مبعوثا إلى الخلق بعثا عاما، لِيُغَلِّبَ دِيْنَهُ على الأديان كلها بِعِزِّ عَزِيْزٍ أو ذُلِّ ذليلٍ، حصل في دينه أنواع من الناس، فوجب التمييز بين الذين

يدينون بدين الإسلام وبين غيرهم، ثم بين الذين اهْتَدَوْا بالهداية التى بُعث بها، وبين غيرهم ممن لم تَدْخُلْ بَشَاشَةُ الإيمان قلوبَهم؛ فجعل الإيمان على ضربين:

أحدهما : الإيمان الذى يَدُور عليه أحكامُ الدنيا: من عِصْمَةِ الدماء والأموال؛ وَضَبَطَهُ بأمور ظاهرة فى الانقياد، وهو:

قوله : صلى الله عليه وسلم:" أمرتُ أن أُقاتِلَ الناسَ حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله، وأن محمدًا رسول الله، ويُقيموا الصلاة، ويؤتوا الزكاة، فإذا فعلوا ذلك عصموا منى دماءَ هم وأموالَهم، إلا بحق الإسلام، وحسابُهُمْ على الله"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" من صلَّى صلاتَنا، واستقبل قبلتَنا، وأكل ذبيحتَنا، فذلك المسلم الذى له ذِمَّةُ اللّٰه وذمةُ رسولِه، فلاتُخْفِرُوْا اللّٰهَ فى ذمته"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" ثلاث من أصل الإيمان: الكفُّ عمن قال: لا إله إلا اللّٰه، لا تُكَفِّرْهُ بذنب، ولا تُخْرِجْه من الإسلام بعملٍ" الحديث.

وثانيهما : الإيمان الذى يَدُور عليه أحكامُ الآخرة: من النجاة، والفوز بالدرجات؛ وهو متناوِلٌ لكل اعْتِقَادٍ حقٍّ، وعملٍ مَرْضِيٍّ، ومَلَكَةٍ فاضلةٍ، وهو يزيد ويَنْقُص؛ وسنَّةُ الشارع: أن يُسَمِّيَ كلَّ شيءٍ منها إيمانًا، ليكون تنبيها بليغًا على جزئيَّتِه، وهو:

قوله صلى الله عليه وسلم:" لا إيمانَ لمن لا أمانةَ له، ولا دينَ لمن لا عَهْدَ له"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" المسلم من سَلِمَ المسلمون من لسانه ويده" الحديث.

وله شُعَبٌ كثيرة؛ ومَثَلُه كَمَثَلِ الشجرة، يقال للدَّوحة، والأغصان، والأوراق، والثِّمار، والأزهار جميعًا: إنها شجرة؛ فإذا قُطع أغصانُها، وخُبط أوراقُها، وخُرِف ثمارُها، قيل: شجرة ناقصة؛ فإذا قُلِعت الدَّوحةُ بطل الأصل، وهو قوله تعالى: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ الآية.

ترجمہ: ایمان سے تعلق رکھنے والی اصولی باتیں: جان لیں کہ جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ساری مخلوق کی طرف عام تھی، تاکہ آپ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کریں، معزز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی خواری کے ساتھ (تو) آپ کے دین میں مختلف قسم کے لوگ پیدا ہوگئے۔ پس ضروری ہوا امتیاز کرنا ان لوگوں کے درمیان جو اسلام کو دین بنانے والے ہیں اور ان کے علاوہ کے درمیان (یعنی مؤمن وغیر مؤمن کے درمیان) پھر ان لوگوں کے درمیان جنھوں نے اُس ہدایت سے راہ نمائی حاصل کی، جس کے ساتھ آپ ﷺ مبعوث کئے گئے ہیں، اور ان کے علاوہ کے درمیان

جن کے دلوں میں ایمان کی خوشی داخل نہیں ہوئی (یعنی مخلص مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان) پس آپؐ نے ایمان کی دو قسمیں قرار دیں:

ایک: وہ ایمان جس پر دنیوی احکام کا مدار ہے یعنی جان و مال کا تحفظ۔ اور آپ ﷺ نے (ایمان کی) اس قسم کو ایسے امور کے ذریعہ منضبط کیا جن سے انقیاد و اطاعت صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ:

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''میں حکم دیا گیا ہوں کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں۔ پس جب وہ یہ کام کرنے لگیں تو انھوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کرلیا، بجز حق اسلام کے، اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے''

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''جس نے ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے، پس نہ رخنہ اندازی کرو تم اللہ کی ذمہ داری میں''

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''تین باتیں اصول اسلام میں سے ہیں: اس شخص سے باز رہنا جو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو، کسی بھی گناہ کی وجہ سے تو اس کی تکفیر نہ کر، اور کسی بھی عمل کی وجہ سے تو اس کو اسلام سے خارج نہ کر'' حدیث آخر تک پڑھیے۔

دوسری قسم: وہ ایمان ہے جس پر اُخروی احکام کا مدار ہے یعنی نجات پانا اور جنت کے درجات حاصل کرنے میں کامیاب ہونا۔ اور یہ قسم برحق اعتقاد، پسندیدہ عمل اور اعلیٰ درجہ کی اخلاقی صلاحیتوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ ایمان بڑھتا گھٹتا ہے۔ اور شارع علیہ السلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان (عقائد و اعمال و اخلاق) میں سے ہر چیز کو ایمان کا نام دیتے ہیں، تاکہ وہ مؤثر تنبیہ ہو اس کے جز ایمان ہونے پر، اور یہی:

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جس میں امانت داری نہیں، اس میں ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں، اس میں دین نہیں''

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں'' حدیث آخر تک پڑھیں۔

اور ایمان کی اس قسم کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور اس ایمان کی مثال درخت کی سی ہے کہ تنے، ٹہنیاں، پتے، پھل اور پھول سبھی کو ''درخت'' کہتے ہیں۔ پھر جب درخت کی شاخیں کاٹ دی جائیں، اور اس کے پتے جھاڑ دیئے جائیں اور اس کے پھل چُن لئے جائیں تو اس کو ''ناقص درخت'' کہتے ہیں۔ پھر جب تنا اکھاڑ دیا جائے تو درخت ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور اسی قسم کے بارے میں اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ: ''ایمان والے تو بس ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے

اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب سہم جاتے ہیں'' آخر آیت تک پڑھیں (یہ آیت ایمان بالمعنی الثانی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں اعمال کا بھی تذکرہ ہے اور اعمال، ایمان کامل ہی کا جزء ہیں)

لغات: عَزَّ (ض) عِزًّا وَعِزَّةً: عزیز وقوی ہونا۔ العزیز: شریف، قوی، معزز...... ذَلَّ (ض) ذُلًّا وذِلَّةً: ذلیل وخوار ہونا صفت ذَلِیْلٌ: خوار...... دَانَ (ض) دِیْنًا وَدِیَانَةً به: دین اختیار کرنا، دین بنانا...... بَشَّ (س) بَشًّا وبَشَاشَةً: خوش ہونا، کشادہ رو ہونا، ہنس مکھ ہونا...... دَارَ (ن) دَوْرًا وَدَوَرَانًا: گھومنا، چکر کھانا دار علیه: گرد گھومنا...... أَخْفَرَ العهدَ: عہد توڑنا، بے وفائی کرنا...... الذِمَّة: امان، عہد وپیمان، ذمہ داری...... الأمانة: امانت، فریضہ، ذمہ داری...... العهد: میثاق، وفا، ذمہ...... الدَّوْحَة: بڑا پھیلا ہوا درخت...... خَرَفَ (ن) خَرْفًا الثمرَ: میوہ چننا...... خَبَطَ (ض) خَبْطًا الشجرةَ: پتے جھاڑنا۔ **فائدہ**: عنوان میں مِن کے اضافہ سے شاہ صاحب نے ''اصولی باتیں'' مراد لی ہیں۔ آگے بھی یہی معنی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اعمالِ اسلام کے دو درجے

ایمان بمعنی یقین کامل میں جو اعمال شامل ہیں، وہ سب ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے دو درجے قرار دیئے ہیں۔

پہلا درجہ: ارکان اسلام کا ہے۔ اعمال اسلام میں یہ سب سے عمدہ اعمال ہیں۔ درج ذیل حدیث میں انہی اعمال کا تذکرہ ہے:

حدیث —— آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور نماز کا اہتمام کرنا، اور زکوۃ دینا، اور حج کرنا، اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا''[1]

تشریح: اور یہ بات ابھی آگے بیان کی جائے گی کہ ایمان کی دوسری قسم میں شامل اعمال کے لئے ''ایمان'' کے بجائے لفظ ''اسلام'' زیادہ موزون ہے۔ چنانچہ مذکورہ حدیث میں ارکان خمسہ پر اسلام کی بنا بتائی گئی ہے۔ اور توحید ورسالت کی شہادت ایک عمل ہے، بلکہ بہترین عمل ہے۔ گواہی ہمیشہ منکر کے سامنے دی جاتی ہے۔ پس غیر مسلموں تک یہ دعوت لے جانا اسلام کا بنیادی عمل ہے۔

دوسرا درجہ: ارکان خمسہ کے علاوہ دیگر اعمال اسلام کا ہے۔ درج ذیل حدیث میں ان کا تذکرہ ہے:

حدیث —— آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

---

[1] متفق علیہ، مشکوۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۴

''ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔جن میں بہترین شاخ لا إلٰہ إلا اللّٰہ کہنا ہےاور معمولی شاخ راستہ سے تکلیف دِہ چیز کو ہٹانا ہےاور حیاایمان کی اہم شاخ ہے''[1]

تشریح: ستر کا عدد تحدید کے لئے نہیں ہے، بلکہ زیادتی بیان کرنے کے لئے ہے یعنی ایمان کی بہت شاخیں ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے شُعَبُ الإیمان میں ایمان کی ان سب شاخوں کو بیان کیا ہے۔

> ولَمَّا لم یکن جمیعُ تلك الأشیاء علی حدٍ واحدٍ، جعلَها النبی صلی اللہ علیه وسلم علی مرتبتین:
> منها: الأرکان التی هی عمدةُ أجزائها، وهو:
> قوله : صلی اللہ علیه وسلم:" بُنی الإسلامُ علی خمس: شهادة أن لا إله إلا اللّٰه، وأن محمدًا عبده ورسوله، وإقام الصلاة، وإیتاء الزکاة، والحج، وصوم رمضان"
> ومنها: سائِرُ الشُّعَبِ، وهو:
> قوله : صلی اللہ علیه وسلم:" الإیمان بِضْع وسبعون شُعبةً، فأفضلُها: قولُ لا إله إلا اللّٰه، وأدناها: إماطةُ الأذی عن الطریق، والحیاء شعبةٌ من الإیمان"

ترجمہ: اور جبکہ نہیں تھیں وہ تمام چیزیں ایک درجہ کی،تو قرار دیئے ان کے رسول اللہ ﷺ نے دو درجے:
ان میں سے ایک: ان ارکان کا درجہ ہے، جو کہ وہ ان اجزاء میں بہترین ہیں۔اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے الی آخرہ۔
اور ان میں سے ایک: ایمان کی دیگر شاخیں ہیں۔اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

اقسامِ ایمان کے متقابلات

ایمان کی پہلی قسم یعنی ظاہری انقیاد جس کے ساتھ دنیوی احکام متعلق ہوتے ہیں،اس کا مقابل'' کفر'' ہے۔اور دوسری قسم یعنی یقینِ کامل جس پر اُخروی احکام کا مدار ہے،اس کے مقابل کی تین صورتیں ہیں،اور تینوں کے الگ الگ نام ہیں:
پہلی صورت: اگر تصدیقِ قلبی بالکل ہی فوت ہو اور ظاہری انقیاد واطاعت صرف تلوار کے خوف سے ہو،تو وہ اصلی اور''اعتقادی نفاق'' ہے۔اور اُخروی احکام میں اِس منافق اور کافر مجاہر کے درمیان کچھ فرق نہیں، بلکہ یہ منافق کافر سے

[1] متفق علیہ مشکوۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۵

بدتر ہے۔وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوگا، جیسا کہ سورۃ النساء آیت ۱۴۵ میں اس کی صراحت ہے۔

دوسری صورت: اور اگر دل میں تصدیق تو موجود ہو مگر عمل بالجوارح فوت ہو یعنی فرائض کا تارک اور کبائر کا مرتکب ہو تو وہ "فاسق" کہلاتا ہے۔

تیسری صورت: اور اگر دل میں تصدیق تو ہو مگر وہ دل کا وظیفہ فوت کرنے والا ہو یعنی ایمان میں یقین کی دولت سے محروم ہو، تو وہ ایک اور قسم کا نفاق ہے۔ بعض سلف نے اس کا نام "نفاق عمل" رکھا ہے۔

اور نفاق عمل تین طرح سے پیدا ہوتا ہے:

① —— آدمی پر نفس کا یا دنیا کا یا جہالت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ مال کی، خاندان کی اور اولاد کی محبت میں بری طرح پھنس جاتا ہے، اس لئے وہ جزاء وسزا کو مستبعد سمجھنے لگتا ہے اور گناہوں پر بے باک ہوجاتا ہے۔ اور یہ چیزیں اس طرح سے اس کے دل میں سرایت کرجاتی ہیں کہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا، اگرچہ عقل وبرہان سے وہ اُن باتوں کو مانتا ہو جن کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے (اور حجابِ نفس، حجاب دنیا اور حجاب بدعقیدگی کی تفصیل مبحث چہارم کے باب ششم میں گذر چکی ہے)

② —— یا وہ اسلام میں سختیاں دیکھتا ہے یعنی مسلمان ہونے کے بعد وہ آلام ومصائب سے دوچار رہتا ہے یا وہ آبائی مسلمان ہے اور اس کو یہ صورت پیش آتی ہے تو وہ اسلام کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔

③ —— یا کچھ خاص کافروں سے اس کو محبت ہوتی ہے، جو اس کو اللہ کا بول بالا کرنے سے روک دیتی ہے (اسی وجہ سے کفار سے مودّت یعنی قلبی تعلق رکھنے کی قرآن میں سخت ممانعت آئی ہے)

ويُسمى مقابلُ الإيمان الأول بالكفر؛ وأما مقابل الإيمان الثاني:

[۱-] فإن كان تَفْوِيتًا للتصديق، وإنما يكون الانقيادُ بغلبة السيف، فهو النفاق الأصلي؛ والمنافق بهذا المعنى لا فرق بينه وبين الكافر في الآخرة، بل المنافقون: ﴿فِي الدَّرْكِ الأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾

[۲-] وإن كان مصدِّقًا، مفوِّتًا لوظيفة الجوارح، سُمي فاسقًا.

[۳-] أو مفوِّتًا لوظيفة الجِنان، فهو المنافق بنفاق آخر؛ وقد سمَّاه بعضُ السلف نفاقَ العمل. وذلك:

[۱-] أن يغلب عليه حجابُ الطبع، أو الرسم، أو سوء المعرفة، فيكون مُمْعِنًا في مَحبة الدنيا والعشائر والأولاد، فَيَدِبُّ في قلبه استبعادُ المجازاة، والاجتراءُ على المعاصي من حيث لا يدري، وإن كان معترفا بالنظر البرهاني بما ينبغي الاعتراف به.

[-۲] أو رأى الشدائدَ في الإسلام فكرِهَه.

[-۳] أو أحبَّ الكفار بأعيانهم، فصدَّ ذلك من إعلاء كلمة الله.

ترجمہ: اور ایمان کی پہلی قسم کا مقابل ''کفر'' کہلاتا ہے۔ اور رہا ایمان کی دوسری قسم کا مقابل: (۱) پس اگر ہے وہ تصدیق قلبی کو فوت کرنے والا، اور انقیاد و اطاعت صرف تلوار کے خوف سے ہے تو وہ ''نفاق اصلی'' ہے، اور منافق بایں معنی: کوئی فرق نہیں ہے آخرت میں اس کے درمیان اور کافر کے درمیان، بلکہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے (۲) اور اگر وہ شخص تصدیق کرنے والا ہے، اعضاء کے وظیفہ کو فوت کرنے والا ہے تو وہ ''فاسق'' کہلاتا ہے (۳) یا وہ دل کے وظیفہ کو فوت کرنے والا ہے تو وہ ایک دوسری قسم کا منافق ہے۔ اور بعض سلف نے اس قسم کے نفاق کو ''نفاق عملی'' سے تعبیر کیا ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ (۱) آدمی پر طبیعت (نفس) یا ریت رواج (دنیا) یا اللہ کے معاملہ میں بدعقیدگی چھا جاتی ہے۔ پس وہ دور تک چلا جاتا ہے دنیا (مال) کی اور خاندان کی اور اولاد کی محبت میں، پس رینگتا ہے اس کے دل میں جزاء وسزا کا استبعاد اور گناہوں پر بے باکی، ایسی جگہ سے کہ وہ نہیں جانتا، اگرچہ ہوتا ہے وہ اقرار کرنے والا دلیل برہانی کے ذریعہ ان باتوں کا جن کا اقرار کرنا مناسب ہے (۲) یا دیکھتا ہے وہ اسلام میں سختیوں کو، پس وہ اس کو ناپسند کرتا ہے (۳) یا مخصوص کافروں سے اس کو محبت ہوتی ہے، پس روک دیتی ہے وہ محبت اللہ کا بول بالا کرنے سے۔

☆ ☆ ☆

ایمان کے دو اور معنی: تصدیق اور سکینت قلبی

ایمان کے، مذکورہ بالا دو قسموں کے علاوہ، دو اور معنی بھی ہیں:

ایک: تصدیق قلبی یعنی دل سے ان باتوں کی تصدیق کرنا جن کی تصدیق ایمان کے لئے ضروری ہے۔ درج ذیل حدیث میں اسی کا تذکرہ ہے:

حدیث — حضرت جبرئیل نے سوال کیا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ:

''ایمان یہ ہے کہ آپ دل سے اللہ تعالیٰ کو، اس کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو اور آخرت کے دن کو مانیں۔ اور اچھی بری تقدیر کو (بھی) مانیں''[۱]

دوم: دل کی سکینت واطمینان۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جو مقربین کو حاصل ہوتی ہے۔ درج ذیل احادیث میں

[۱] رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر۲

اس کا تذکرہ ہے:

حدیث ــــ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''پاکی آدھا ایمان ہے''[1] یعنی طہارت و پاکیزگی ایمان کا خاص جزء اور اس کا اہم شعبہ اور حصہ ہے، جو شخص طہارت کا اہتمام کرتا ہے اس کو دل جمعی کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

حدیث ــــ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''جب کوئی بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے۔ اور وہ اس کے سر پر سائبان کی طرح ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اس گناہ سے نکل جاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے''[2] یعنی گناہ کی حالت میں ایمانی جمعیتِ خاطر باقی نہیں رہتی۔

حدیث ــــ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: ''آؤ، ہم ایک گھڑی ایمان لائیں''[3] یعنی کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر ایمان کی باتیں کریں، تاکہ ایمان تازہ ہو اور دل کو تسکین حاصل ہو۔

وللإيمان معنيان آخَران:

أحدهما: تصديقُ الجِنان بمالابد من تصديقه، وهو:

قوله صلى الله عليه وسلم في جواب جبريل:" الإيمان: أن تؤمن بالله وملائكته" الحديثَ.

والثاني: السكينة، والهيئة الوِجْدانية التي تحصل للمقرَّبين، وهو:

قوله صلى الله عليه وسلم:" الطُّهور شَطْرُ الإيمان"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" إذا زنى العبدُ خرج منه الإيمانُ، فكان فوقَ رأسه كالظُّلَّة، فإذا خرج من ذلك العمل رجع إليه الإيمان"

وقول مُعاذ رضي الله عنه:" تَعالَ نؤمنْ ساعةً"

ترجمہ: اور ایمان کے دو معنی اور ہیں:

ایک: دل سے تصدیق کرنا ان باتوں کی جن کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے حضرت جبرئیل کے سوال کے جواب میں کہ ایمان یہ ہے کہ دل سے مانے تو اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو۔ حدیث آخر تک پڑھیے۔

دوم: وہ سکینت اور ہیئتِ وجدانیہ (کیفیت قلبیہ) ہے جو مقربین کو نصیب ہوتی ہے اور وہ آنحضرت ﷺ کا

[1] رواہ مسلم، مشکوۃ، کتاب الطہارۃ، حدیث نمبر ۲۸۱

[2] رواہ الترمذی وابوداؤد، مشکوۃ، کتاب الایمان، باب الکبائر، حدیث نمبر ۶۰

[3] رواہ البخاری، کتاب الایمان، باب اول رواہ فی ترجمۃ الباب، ورواہ احمد مسنداً عن عبداللہ بن رواحۃ رضی اللہ عنہ (۳: ۲۶۵)

ارشاد ہے کہ: ''پاکی آدھا ایمان ہے'' اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب کوئی بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس میں سے نکل جاتا ہے۔ اور وہ اس کے سر پر سائبان کی طرح ہوتا ہے، پھر جب وہ اس برے کام سے نکل جاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے'' اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: ''آؤ، ایمان لائیں ہم ایک گھڑی''

☆ ☆ ☆

خلاصۂ مرام

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ ایمان کے چار معنی ہیں یعنی لفظ ایمان شریعت میں چاروں معنی میں مستعمل ہے۔ اور وہ معانی یہ ہیں:

۱- وہ ایمان جس پر دنیوی احکام جاری ہوتے ہیں یعنی جان و مال کا تحفظ ہوجاتا ہے اور جس سے ظاہری انقیاد واطاعت کا پتہ چلتا ہے۔

۲- وہ ایمان جس پر احکام آخرت کا دارومدار ہے، جو حقیقی اور کامل ایمان ہے۔

۳- اُن امور کی تصدیق کرنا جن کی تصدیق لازمی اور ضروری ہے۔

۴- سکون قلبی اور وجدانی کیفیت جو مقربین کو حاصل ہوتی ہے۔

اگر آپ باب الایمان کی متعارض روایات میں سے ہر ایک کو اس کے صحیح محمل پر اتار دیں تو آپ کے تمام شکوک وشبہات دور ہوجائیں گے۔

اسلام اور احسان:

اور ایمان کے پہلے معنی کے لئے ایمان سے زیادہ واضح لفظ 'اسلام' ہے۔ چنانچہ سورۃ الحُجرات میں اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ:

''گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمادیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے، البتہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہوگئے اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''

تشریح: اس آیت سے ایمان واسلام کا فرق ظاہر ہوتا ہے کہ ظاہری اطاعت وانقیاد کا نام اسلام ہے اور دل سے پختہ یقین کا نام ایمان ہے۔ اعراب (گنواروں) کے دل میں ایمان واعتقاد پوری طرح پیوست نہیں ہوا تھا، انھوں نے صرف اطاعت قبول کی تھی، اس لئے کہا گیا کہ ابھی ایمان کی منزل دور ہے، ابھی تو تم سرحد اطاعت پر ہو اور بس۔

حدیث — متفق علیہ روایت میں ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ لوگوں کے درمیان کچھ مال بانٹ رہے تھے،

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک شخص کو جو میرے نزدیک اچھا تھا کچھ نہ دیا۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے فلاں آدمی کو نہیں دیا حالانکہ قسم بخدا میں اس کو مؤمن پاتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "یا مسلمان" (پاتا ہوں)[1] یعنی یقین کے ساتھ مؤمن نہ کہو۔ ایمان تو دل کے عقیدہ کا نام ہے، اس کا پتہ دوسرے کو نہیں چل سکتا۔ ہاں تردید کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ مؤمن یا مسلمان پاتا ہوں۔ اس حدیث سے بھی ایمان اور اسلام کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

اور ایمان کے چوتھے معنی پر یعنی سکون خاطر اور وجدان قلبی پر ایمان کے بجائے لفظ "احسان" کا اطلاق زیادہ واضح اور موزون ہے (اور دوسرے معنی کو "ایمان کامل" کہنا چاہئے، اور تیسرے معنی پر "محض ایمان" کا اطلاق ہونا چاہئے)

فللإيمان أربعةُ معانٍ مستعملَة في الشرع، إن حملتَ كلَّ حديث من الأحاديث المتعارضة في الباب، على محمله، اندفعتْ عنك الشكوكُ والشبهات.

والإسلام أوضح من الإيمان في المعنى الأول، ولذلك قال الله تعالى: ﴿قُلْ: لَمْ تُؤْمِنُوْا، وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا﴾، وقال النبي صلى الله عليه وسلم لسعدٍ: "أوْ مسلما"، والإحسانُ أوضح منه في المعنى الرابع.

ترجمہ: پس ایمان کے چار معنی ہیں، جو شریعت میں مستعمل ہیں، اگر محمول کریں آپ ہر حدیث کو باب کی متعارض حدیثوں میں سے اس کے محمل پر تو دور ہو جائیں گے آپ سے شکوک وشبہات۔

اور اسلام زیادہ واضح ہے ایمان سے پہلے معنی میں، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کہہ دیں آپ کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ کہو کہ ہم نے اطاعت کی ہے، اور فرمایا نبی ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہ: "یا مسلمان" اور "احسان" زیادہ واضح ہے ایمان سے چوتھے معنی میں۔

☆ ☆ ☆

نفاق عمل اور اخلاص کی علامتیں

نفاق عمل اور اس کا مقابل اخلاص دونوں پوشیدہ چیزیں ہیں۔ دونوں دل کی کیفیات ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کی ایسی علامتیں بیان کی جائیں، جن کے ذریعہ ان کو پہچانا جا سکے۔ اور ہر شخص اپنا جائزہ لے سکے کہ وہ کس حال

[1] بخاری کتاب الایمان باب ۱۹ کتاب الزکوۃ باب نمبر ۵۳ حدیث نمبر ۲۷، ۱۴۷۸ مسلم شریف کتاب الایمان وکتاب الزکاۃ ۱۲

میں ہے۔ اگر اس میں ایمان کامل کی علامتیں پائی جاتی ہیں تو شکر خداوندی بجالائے کہ شکر سے نعمت بڑھتی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ دوسری صورت ہے تو اپنی اصلاح کرے کہ وقت ابھی ہاتھ سے نہیں گیا۔

یہاں کچھ لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے دوسروں کے عیوب کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور تبصرے کرتے ہیں کہ فلاں میں نفاق کی یہ علامت پائی جاتی ہے، وہ علامت پائی جاتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک پنہاں بیماری اور اخلاقی کمزوری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائیں۔

درج ذیل احادیث میں اخلاص و نفاق عمل کی علامتیں بیان کی گئی ہیں:

حدیث —— آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''جس شخص میں چار باتیں پائی جائیں وہ خالص (پکا) منافق ہے۔ اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے، اس میں نفاق کی ایک بات ہے، یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے (اسی وقت وہ نفاق سے پاک ہوسکتا ہے) (۱) جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۳) جب پیمان باندھے تو عہد شکنی کرے (۴) اور جب جھگڑا کرے تو بدکاری کرے (گالیاں بکے یا حد سے تجاوز کرے)''[۱]

تشریح: مذکورہ چار باتیں نفاق عمل یعنی ایمان میں کھوٹ کی علامتیں ہیں۔ اور ان کے متقابلات کمال ایمان کی علامتیں ہیں۔ یعنی امانت داری، سچائی، عہد کی پاسداری اور نزاع میں میانہ روی اور خوش کلامی ایمان میں اخلاص کے ثمرات ہیں۔

حدیث —— آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''جس شخص میں تین باتیں پائی جاتی ہیں، وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت (چاشنی) پاتا ہے: (۱) اس کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں (۲) وہ جس سے محبت کرے اللہ ہی کے لئے کرے (۳) اور کفر کی طرف پلٹنے کو وہ ایسا ناپسند کرے جیسا آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے''[۲]

تشریح: مذکورہ تین باتیں کمال ایمان کی علامتیں ہیں۔ اور ان کے متقابلات نفاق عمل کی دلیل ہیں یعنی دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، اور غرض سے محبت کرنا اور کفر کے حق میں نرم گوشہ رکھنا ایمان کی کمزوری کی علامات ہیں۔ ایسے شخص کو ایمان کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔

حدیث —— آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ مسجد کی نماز کا پابند ہے، تو اس کے لئے ایمان کی گواہی دو، کیونکہ اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ اللہ

---

[۱] متفق علیہ، مشکوٰۃ شریف، حدیث نمبر ۵۶

[۲] متفق علیہ، مشکوٰۃ شریف، حدیث نمبر ۸

کی مسجدوں کو بس وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں'' [۱]

تشریح: پابندی سے مسجد کی نماز میں حاضر ہونا کمال ایمان کی علامت ہے۔ اور ایسی مضبوط دلیل ہے کہ اس کی بنیاد پر کسی کے مؤمن ہونے کی شہادت دی جاسکتی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے یہ مضمون سورۃ التوبہ کی آیت ۱۸ سے اخذ فرمایا ہے۔ اس ارشاد نبوی سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آیت پاک میں مسجد کی صرف ظاہری تعمیر مراد نہیں ہے۔ بلکہ معنوی تعمیر یعنی عبادت سے آباد کرنا بھی مراد ہے۔

اور مسجد کی نماز سے غیر حاضری نفاق عمل کی علامت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ زمانۂ نبوت میں کھلا منافق یا بیمار ہی مسجد کی نماز سے پیچھے رہتا تھا [۲]۔ اور حضرت اُبی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ فجر کی نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا کہ فلاں موجود ہے؟ صحابہ نے جواب دیا نہیں۔ آپ نے دوسرے شخص کے بارے میں دریافت کیا وہ بھی موجود نہیں تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ دو نمازیں (عشاء اور فجر) منافقین پر سب سے زیادہ بھاری ہیں'' [۳]

حدیث ـــــ مسلم شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد مروی ہے کہ:

''اس ذات کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا (اور غلہ اور درختوں کو اگایا) اور ذی روح (مخلوقات) کو پیدا کیا! بیشک نبی امی ﷺ نے مجھ سے یہ عہد کیا ہے کہ مجھ کو مؤمن ہی دوست رکھے گا، اور مجھ سے منافق ہی بغض رکھے گا'' [۴]

اور ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''منافق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوست نہیں رکھتا، اور مؤمن آپؓ سے بغض نہیں رکھتا'' [۵] پس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشروع محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے، اور آپؓ سے عداوت اور دشمنی رکھنا نفاق کی نشانی ہے۔

اس قسم کا مضمون دیگر صحابہ کے بارے میں بھی مروی ہے۔ ابن عدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی

---

[۱] مشکوٰۃ شریف حدیث نمبر ۷۲۳ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں ایک راوی دَرّاج أبو السَّمح ہے، وہ أبو الهیثم سے روایت کرتا ہے۔ اور درّاج کی ابوالہیثم سے روایتیں ضعیف ہوتی ہیں۔ ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی میں یَتَعَاهَدُ المسجد ہے یعنی مسجد کا خوگر ہے اور مستدرک حاکم (۲: ۳۳۲) میں یَلْزَمُ المسجدَ ہے یعنی مسجد سے چپکا رہتا ہے۔

[۲] رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۰۷۲

[۳] رواہ ابوداؤد والنسائی۔ مشکوٰۃ باب الجماعۃ، حدیث نمبر ۱۰۶۶

[۴] مشکوٰۃ، باب مناقب علیؓ، حدیث نمبر ۶۰۷۹ اصل حدیث یہ ہے۔ اور شاہ صاحب نے حدیث کے جو الفاظ لکھے ہیں وہ کسی کتاب میں مروی نہیں ہیں۔ غالباً شاہ صاحب نے روایت بالمعنی لکھی ہے۔

[۵] مشکوٰۃ شریف حدیث نمبر ۶۰۹۱

ہے کہ: ''حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم سے محبت ایمان ہے، اوران سے بغض کفر ہے'' اور ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت بیان کی ہے، اس میں ہے کہ: ''حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت ایمان ہے، اوران سے بغض کفر ہے'' [1]

تشریح: اشخاص کے بارے میں اس قسم کے ارشادات کی مختلف وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: بڑوں کے مقام ومرتبہ کی معرفت اوراُن کی قدر شناسی انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو حسد اور خود پسندی سے مبرا ہوں، جن کے نفسانی تقاضے تھم گئے ہوں یعنی اُن میں نفسانیت کا شائبہ تک نہ رہا ہو۔ اوران کی عقل خواہش پر غالب آگئی ہو یعنی وہ ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات سے اوپر اٹھ کر معاملات کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کے عادی ہو چکے ہوں۔ یہی حضرات بڑی ہستیوں کے بارے میں متوازن فیصلہ کرتے ہیں، اوران کا مقام ومرتبہ پہچانتے ہیں۔ برخود غلط قسم کے لوگ تو طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ قرابت کا شوشہ چھوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابوبکر وعمر تو خسر تھے اور عثمان وعلی داماد تھے۔ اسی قرابت داری کی بناء پر ان کو اسلام میں برتر مقام حاصل ہوا ہے۔ حالانکہ وہ غور نہیں کرتے کہ خسر تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی تھے اور داماد تو حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مگران کو یہ مقام کہاں نصیب ہوا؟

دوسری وجہ: حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دین کے معاملہ میں سخت تھے۔ ایسے اکابر کی سختی کو وہی شخص برداشت کرتا ہے جو خود غرضی اور نفسانیت سے پاک ہو، جو مفادِ کلی کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنے کا عادی ہو۔ جس کے ایمان میں کھوٹ ہوتی ہے وہ تو بجا سختی سے بھی برگشتہ ہو جاتا ہے اوراُن اکابر کے خلاف بکواس کرنے لگتا ہے۔

تیسری وجہ: صاحبزادگی بایں اعتبار مفید ہے کہ بے استحقاق بڑا مرتبہ مل جاتا ہے۔ مگر اس اعتبار سے غیر مفید ہے کہ صاحبزادوں کی واقعی خوبیوں کا بھی بعض لوگ اعتراف نہیں کرتے۔ وہ یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کہ یہ مقام صاحبزادگی کے طفیل میں مل گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ گویا آپ ﷺ کے صاحبزادے تھے، آپؐ نے ہی ان کو پالا پوسا تھا۔ آپؓ کے کمالات کے اعتراف میں کچھ لوگوں کے لئے یہی چیز مانع بن گئی تھی۔ اس لئے آپؓ کے بارے میں مذکورہ بالا ارشاد اور مَنْ کنتُ مولاہ فعليٌ مولاہ [2] (میں جس کا محبوب ہوں، پس علی بھی اس کے محبوب ہیں یعنی مجھ سے محبت اور علی سے نفرت کیا معنی رکھتی ہے!) اور من سبّ علیا فقد سبّني [3] (جو علی کو برا کہتا ہے وہ مجھ کو برا کہتا ہے) وغیرہ ارشادات وارد ہوئے ہیں۔

---

[1] یہ دونوں روایتیں مظاہر حق تتمہ جلد رابع صفحہ ۱۲۱ میں ہیں

[2] رواہ احمد والترمذی، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۶۰۸۲

[3] رواہ احمد، مشکوٰۃ حدیث ۶۰۹۲

حدیث — آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''انصار سے محبت ایمان کی نشانی ہے، اور ان سے بغض نفاق کی نشانی ہے'' [1] اور ابن عساکر کی مذکورہ بالا روایت میں ہے کہ: ''عربوں سے محبت ایمان سے ہے، اور ان سے دشمنی کفر ہے''

تشریح: اقوام، قبائل اور جماعتوں کے بارے میں اس قسم کے ارشادات کی وجہ یہ ہے کہ مختلف اسباب سے قوموں اور نسلوں میں تشتت وافتراق پیدا ہوجاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ وہ عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عدنان کی اولاد میں بھی اسی قسم کا اختلاف ہوا تھا۔ اور وہ یہاں تک بڑھا تھا کہ خاندان کا کچھ حصہ یمن منتقل ہوگیا تھا۔ اور معد کی اولاد ہی حجاز میں رہ گئی تھی پھر ارم کا باندھ ٹوٹنے کے بعد اوس وخزرج مدینہ میں آ بسے تھے۔ یہی قبیلے اسلام کے انصار بنے۔ اور معد کی اولاد بھی ہجرت کر کے مدینہ میں آ گئی تو یہ حضرات مہاجر کہلائے۔ ان معدی اور یمنی عربوں میں پرانی عداوت تھی۔ اسی طرح عرب وعجم میں منافرت بھی دلوں میں جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو یہ سب حضرات اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ پس ضروری ہوا کہ دلوں کی پرانی کدورتیں دور کر دی جائیں۔ چنانچہ مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ انصار سے محبت کریں اور پرانی باتیں دلوں سے نکال دیں۔ اسی طرح عجمیوں کو حکم دیا کہ وہ عربوں سے محبت کریں، اور دلوں سے ان کی نفرت دور کر دیں۔ اب جو شخص ہمہ تن اسلام کا بول بالا کرنے کی طرف متوجہ ہوگا، وہ تو دل سے کینہ دور کر دے گا۔ اور انصار سے اور عربوں سے محبت کرے گا اور سب ایک متحد امت بن کر اسلام کی گاڑی کھینچیں گے۔ اور جو اپنی پوری توجہ اسلام کی سربلندی پر مرکوز کئے ہوئے نہیں ہے، اس کی فطرت میں نزاع باقی رہے گا، جو اسلام کے کاز کو نقصان پہنچائے گا۔ اس لئے انصار کی محبت اور عربوں کی محبت کو ایمان کی علامت اور ان سے بغض ونفرت کو کفر ونفاق کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

ولما كان نفاقُ العمل وما يقابلُه من الإخلاص أمرًا خفيا، وجب بيانُ علاماتِ كلٍّ واحد منهما، وهو:

قوله: صلى الله عليه وسلم:" أربع من كُنَّ فيه كان منافقًا خالصًا، ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدَعها: إذا ائْتُمن خان، وإذا حدَّث كذب، وإذا عاهد غدَر، وإذا خاصم فجر"

وقوله: صلى الله عليه وسلم:"ثلاثٌ من كنّ فيه وجدبهنّ حلاوةَ الإيمان: أن يكون اللهُ ورسولُه أحبَّ إليه مما سواهما، وأن يحب المرءَ لا يحبُّه إلا لله، وأن يَكْرَه أن يعود في الكفر كما يكره أن يُقْذَفَ في النار"

[1] متفق علیہ، مشکوٰۃ، باب جامع المناقب، حدیث ۶۲۰۶

وقوله: صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم العبدَ يُلازم المسجدَ فاشْهَدوا له بالإيمان"

وكذا قوله عليه السلام:" حبُّ عليٍّ آيةُ الإيمان، وبُغض عليٍّ آية النفاق" والفقه فيه: أنه رضي الله عنه كان شديدًا في أمر الله، فلايتحمَّل شدّته إلا من ركدتْ طبيعتُه، وغلب عقلُه على هواه.

وقوله : صلى الله عليه وسلم:" حُبُّ الأنصار آية الإيمان" والفقه فيه: أن العرب المَعدِّيَة واليَمَنِيَّةَ ما زالوا يتنازعون بينهم، حتى جَمَعَهم الإيمان، فمن كان جامعَ الهمَّة على إعلاء الكلمة زال عنه الحِقْد، ومن لم يكن جامعا بقي فيه النزاع.

ترجمہ: اور جب نفاق عمل اور وہ اخلاص جو اس کے بالمقابل ہے مخفی چیز تھے، تو ضروری ہوا ان میں سے ہر ایک کی علامتیں بیان کرنا، اور وہ:

آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: '' چار باتیں جس میں ہوتی ہیں وہ خالص منافق ہوتا ہے۔ اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہوتی ہے اس میں نفاق کی ایک بات ہوتی ہے، تا آنکہ وہ اس کو چھوڑ دے: جب وہ امین بنایا جائے تو خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب پیمان باندھے تو عہد شکنی کرے اور جب جھگڑا کرے تو بدکاری کرے''

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: '' تین باتیں جس میں پائی جاتی ہیں، وہ ان کی وجہ سے ایمان کی چاشنی پاتا ہے: یہ بات کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس کے نزدیک زیادہ محبوب ہوں ان کے ماسوا سے۔ اور یہ کہ محبت کرے وہ کسی شخص سے، نہ محبت کرے وہ اس سے مگر اللہ کے لئے، اور یہ کہ ناپسند کرے وہ کہ لوٹے وہ کفر میں، جیسا ناپسند کرتا ہے وہ کہ پھینکا جائے آگ میں''

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: '' جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ وہ مسجد سے چمٹا رہتا ہے تو اس کے لئے ایمان کی گواہی دو''

اور اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: '' حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت ایمان کی نشانی ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی نفاق کی علامت ہے'' (یہ روایت کا ماحصل ہے) اور سمجھنے کی بات اس میں یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اللہ کے معاملہ میں سخت تھے، پس آپؓ کی سختی کو برداشت نہیں کرتا مگر وہ شخص جس کی طبیعت تھم گئی ہو، اور اس کی عقل اس کی خواہش پر غالب آگئی ہو۔

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: '' انصار سے محبت ایمان کی نشانی ہے'' اور سمجھنے کی بات اس میں یہ ہے کہ مَعَدّی اور یمنی عرب برابر آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایمان نے ان کو اکٹھا کیا۔ پس جو شخص اللہ کا بول بالا کرنے پر پوری توجہ اکٹھا کرنے والا ہے اس سے کینہ دور ہو جائے گا۔ اور جو شخص جامع الہمت نہیں ہے اس میں نزاع باقی رہے گا۔

لغات: رکدت أی سکنت غلیانُها..... المعدّية: هم المهاجرون..... واليمنية: هم الأنصار (سندیؒ)..... إئتمن فلانا على كذا: کسی کو کسی چیز کا امین بنانا..... الفقه: السر..... مَعَدّ بن عدنان: ابوالعرب ہیں..... الهِمّة: خاص توجہ۔

☆ ☆ ☆

نجاتِ اوّلی کے لئے ارکان خمسہ کی ادائیگی ضروری ہے

جس طرح مختلف روایات میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ وضوء کی صحت کے لئے اعضائے مغسولہ کو کم از کم ایک بار بالاستیعاب دھونا اور کم از کم چوتھائی سر کا مسح ضروری ہے، اور نماز کی صحت کے لئے چھ فرائض کی ادائیگی ضروری ہے، اسی طرح آنحضرت ﷺ نے متعدد روایات میں یہ بات بیان فرمائی ہے کہ آخرت میں نجات کے لئے اسلام کے ارکان خمسہ کی ادائیگی ضروری ہے۔ جو شخص گناہوں سے بچتے ہوئے ان اعمال اسلام پر عمل پیرا ہوگا، وہ اگر دیگر طاعات نہ بھی بجالائے گا تو بھی اس کی نجات ہوگی۔ وہ عذاب جہنم سے بچ جائے گا، اور جنت کا حقدار بن جائے گا۔ اور وہ احادیث جن میں یہ بات بیان کی گئی ہے، درج ذیل ہیں:

پہلے یہ حدیث گذر چکی ہے کہ: ''اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے: (۱) اس بات کی گواہی دینا یعنی اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں (۲) اور نماز کا اہتمام کرنا (۳) اور زکوۃ دینا (۴) اور حج کرنا (۵) اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا۔

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اسلام کو ایک ایسی عمارت سے تشبیہ دی ہے جو چند ستونوں پر قائم ہو۔ اور بتلایا ہے کہ اسلام کی عمارت ان پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لئے اس کی گنجائش نہیں کہ وہ ان ارکان کے ادا کرنے اور قائم کرنے میں غفلت برتے، کیونکہ یہ اسلام کے بنیادی ستون ہیں (معارف الحدیث ۱: ۷۳)

حدیث ـــــ قبیلۂ بنو سعد بن بکر کے ایک صحابی حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ اپنی قوم کی طرف سے نمائندہ بن کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ اور چند باتوں کی تحقیق کی جو ان کو رسول اللہ ﷺ کے قاصد کے ذریعہ پہنچ چکی تھیں۔ اس طویل روایت کا ضروری حصہ درج ذیل ہے:

''انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے رسالت کی تصدیق کرنے کے بعد پوچھا کہ آپؐ کے قاصد نے ہم سے بیان کیا ہے کہ ہم پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس نے تم سے ٹھیک کہا'' اس دیہاتی صحابی نے قسم دیکر پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان نمازوں کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں یہ اللہ ہی کا حکم ہے'' پھر بدوی نے کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی بیان کیا کہ ہمارے مالوں میں زکوۃ بھی مقرر کی گئی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ بھی اس نے تم سے سچ کہا'' بدوی نے قسم دیکر پوچھا: کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں! یہ بھی اللہ ہی کا

حکم ہے" پھر اس نے کہا: آپ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی بیان کیا کہ سال میں ماہ رمضان کے روزے بھی ہم پر فرض کئے گئے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "یہ بھی اس نے سچ کہا" بدوی نے قسم دیگر پوچھا: کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "ہاں! یہ بھی اللہ ہی کا حکم ہے"۔ پھر اعرابی نے کہا: آپ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی بیان کیا کہ ہم میں سے جو حج کے لئے مکہ مکرمہ پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، اس پر بیت اللہ کا حج بھی فرض ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ بھی اس نے سچ کہا" —— یہ سوال و جواب کر کے وہ اعرابی چل دیا، اور چلتے ہوئے اس نے کہا: "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! میں ان میں نہ کوئی زیادتی کروں گا اور نہ کوئی کمی" (یعنی آپ کے جوابات جوں کے توں اپنی قوم کو پہنچاؤں گا) اس کے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر یہ صادق ہے تو ضرور جنت میں جائے گا" (متفق علیہ)

حدیث —— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"میری کسی ایسے عمل کی طرف راہنمائی کیجئے کہ جب میں اس کو کروں تو جنت میں پہنچ جاؤں؟ آپ نے فرمایا: تو اللہ کی عبادت کر، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر، اور فرض نمازوں کا اہتمام کر اور فرض زکوٰۃ ادا کر اور ماہ رمضان کے روزے رکھ"۔ اس دیہاتی نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! نہ میں اس میں کچھ بڑھاؤں گا، نہ اس میں کمی کروں گا۔ پھر جب وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کو خوشی ہو کہ وہ کسی جنتی آدمی کو دیکھے تو وہ اس شخص کو دیکھ لے" (متفق علیہ)

انہی ارکان خمسہ کا تذکرہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی آیا ہے۔ انھوں نے دریافت کیا تھا کہ مجھے ایسا عمل بتادیں جو مجھے جنت میں پہنچادے اور جہنم سے دور کردے؟ آپ نے فرمایا: "تم نے بہت بڑی بات پوچھی ہے اور وہ اس شخص پر آسان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کردیں: تم اللہ کی بندگی کرو، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور نماز کا اہتمام کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو"[1]

وقد بيَّن النبيُّ صلى الله عليه وسلم في حديث: "بُني الإسلام على خمس" وحديث ضِمام بن ثعلبة، وحديث أعرابي، قال: "دُلّني على عمل إذا عملته دخلتُ الجنة": أن هذه الأشياء الخمسةَ أركانُ الإسلام، وأن من فعلها، ولم يفعل غيرَها من الطاعات قد خلَّص رقبته من العذاب، واستوجب الجنة، كما بيّن أن أدنى الصلاة ماذا؟ وأدنى الوضوء ماذا؟

ترجمہ: اور تحقیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا حدیث بُني الإسلام على خمس میں، اور ضمام بن ثعلبہ کی حدیث

[1] رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۹

میں اور اس دیہاتی کی حدیث میں جس نے پوچھا تھا کہ: ''میری راہ نمائی کیجئے کسی ایسے عمل کی طرف کہ جب میں اس کو کروں تو جنت میں پہنچ جاؤں'' (آپؐ نے بیان فرمایا) کہ یہ پانچ چیزیں اسلام کے ارکان (بنیادی اعمال) ہیں۔ اور یہ کہ جس نے کیا ان کو، اور نہ کی اس نے ان کے علاوہ طاعتیں، تو یقیناً اس نے چھڑالی عذاب سے اپنی گردن، اور واجب ولازم جانا اس نے جنت کو، جیسا کہ بیان فرمایا (آپؐ نے) کہ نماز کا کم از کم درجہ کیا ہے؟ اور وضوء کا کم از کم درجہ کیا ہے؟

لغات: دُلَّ فعل امر ہے دلّ (ن) دلالۃ سے جس کے معنی ہیں راہ نمائی کرنا۔۔۔۔ خلّص من کذا: نجات دینا، چھڑانا۔۔۔۔ اِسْتَوْجَبَ الشیَ: مستحق ہونا، واجب ولازم جاننا۔

☆ ☆ ☆

ارکان خمسہ کی تخصیص کی وجہ

ارکان خمسہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار، نماز، زکوۃ، روزے اور حج کو اعمال اسلامی میں رکنیت کا درجہ دو وجہ سے دیا گیا ہے:

پہلی وجہ: یہ پانچ اعمال لوگوں کی مشہور ترین عبادتیں ہیں۔ تمام ملتوں نے ان امور کو اختیار کیا ہے اور ان کا التزام کیا ہے۔ یہود ہوں یا عیسائی، مجوس ہوں یا عرب کے سمجھ دار لوگ جو دین ابراہیمی پر کسی درجہ میں قائم تھے، سب ان طاعات کو اپنائے ہوئے تھے، اگرچہ ان عبادتوں کی ادائیگی کے طریقوں میں ان میں اختلاف تھا۔ یہود کی نماز کا طریقہ اور تھا اور عیسائیوں کا اور۔ مگر سب نماز ادا کرتے تھے۔ یہی حال زکوۃ وغیرہ کا تھا۔ سب ملتوں کے ماننے والے غریبوں پر خرچ کرتے تھے۔ پس یہ متفق علیہ امور ہیں، اس لئے ان کو رکنیت کے لئے خاص کیا گیا ہے۔

دوسری وجہ: ان طاعات خمسہ میں وہ خوبیاں ہیں کہ وہ ان کے علاوہ طاعات سے مستغنی کر دیتی ہیں اور دیگر طاعات میں وہ بات نہیں ہے کہ وہ ان طاعات سے مستغنی کر دیں۔ اس وجہ سے انہی کو رکنیت کے لئے خاص کیا گیا ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

(۱) ــــــ نیکی کی بنیادی باتیں تین ہیں: توحید کا اقرار، رسالت محمدی کی تصدیق اور پوری شریعت کو تسلیم کرنا۔ اور بعثت نبوی عام ہے۔ زمان ومکان یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں۔ چنانچہ لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے لگے، تو کوئی ایسی کھلی علامت مقرر کرنی ضروری تھی، جس کے ذریعہ موافق ومخالف کے درمیان امتیاز کیا جاسکے، اور اس کی بنیاد پر کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جاسکے اور جس میں کوتاہی کرنے پر باز پرس کی جاسکے۔ اگر ایسی کوئی واضح علامت مقرر نہیں کی جائے گی تو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز عرصۂ دراز کے تجربہ کے بعد ہی کیا جاسکے گا۔ اور وہ فرق بھی ظنی ہوگا۔ کیونکہ وہ قرائن کی بنیاد پر ہوگا۔ نیز لوگوں میں کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کرنے میں اختلاف بھی

ہوگا۔اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس صورت حال میں احکام میں بڑا اختلال رونما ہوگا ——— اور ایسی علامت برضاء ورغبت توحید ورسالت کا اقرار ہی ہے۔اس اقرار ہی سے اس اعتقاد وتصدیق کا پتہ چلتا ہے جو دل میں مکنون ہے۔اس لئے اسلام کا سب سے اہم رکن توحید ورسالت کے اقرار کو قرار دیا گیا ہے۔

(۲) ——— پہلے (مبحث ۲ باب ۴ میں) یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ نوع بشری کی نیک بختی کا مدار اور نجات اخروی کا سرمایہ اخلاق اربعہ ہیں۔یعنی اِخبات (بارگاہ خداوندی میں نیازمندی) طہارت (پاکی) سماحت (فیاضی اور سہل گیری) اور عدل وانصاف اور نماز کے ذریعہ دو اخلاق بدست آتے ہیں: اخبات اور نظافت۔کیونکہ نماز کے لئے پاکی شرط ہے اور نماز بارگاہ خداوندی میں اعلیٰ درجہ کی نیازمندی ہے۔اور زکوۃ دوسری دو خصلتوں کی تحصیل کے لئے مقرر کی گئی ہے۔کیونکہ شرائط کا لحاظ کرکے زکوۃ کی رقم اس کے مصارف میں خرچ کرنا اعلیٰ درجہ کی فیاضی ہے اور یہی انصاف کی بات بھی ہے کہ مالدار اللہ کی بخشی ہوئی دولت میں سے غریبوں کا حق ادا کرے۔پس زکوۃ کے ذریعہ سماحت وعدالت کو بدست لایا جاسکتا ہے۔

(۳) ——— پہلے (مبحث ۵ باب ۱۱ میں) یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ انسانوں کے لئے کوئی ایسی عبادت ضروری ہے جو اس کی خواہشات پر قہرمان ہو، تاکہ اس کے ذریعہ نفسانی خواہشات کو دبایا جاسکے۔اور ایسی عبادت روزہ ہی ہے، اس مقصد کے لئے اس سے بہتر کوئی عبادت نہیں ہے، اس لئے روزہ کو چوتھا رکن قرار دیا گیا ہے۔

(۴) ——— پہلے (مبحث ۵ باب ۷ میں) یہ بات بھی بیان کی جاچکی ہے کہ منزّل من اللہ شریعتوں میں ایک بنیادی حکم یہ بھی رہا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کی جائے۔اور اہم شعائر اللہ چار ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز۔حج کی عبادت کعبہ شریف کی تعظیم کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

اور مبحث خامس کے مختلف ابواب میں مذکورہ چاروں عبادتوں کے فوائد کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ چار عبادتیں دوسری عبادتوں سے مستغنی کرنے والی ہیں۔اور دوسری عبادتیں ان چار مستغنی نہیں کرتیں، اس لئے ارکان اسلام کی تعیین کے لئے انہی چار کی تخصیص کی گئی ہے۔

فائدہ: واضح رہے کہ اسلام کے فرائض اِن ارکان خمسہ ہی میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ ان کے علاوہ اور بھی امور فرض ہیں۔مثلاً جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ۔لیکن جو اہمیت اور جو خصوصیت ان پانچ کو حاصل ہے، وہ چونکہ اَوروں کو حاصل نہیں، اس لئے اسلام کا رکن صرف انہی کو قرار دیا گیا ہے۔اور وہ خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ یہ ارکان خمسہ دین اسلام کے لئے بمنزلۂ پیکر محسوس کے ہیں۔نیز یہی وہ خاص تعبدی امور ہیں جو بالذات مطلوب ومقصود ہیں۔اور ان کی فرضیت کسی عارض کی وجہ سے، اور کسی خاص حالت سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ یہ مستقل اور دوامی فرائض ہیں۔بخلاف جہاد اور امر بالمعروف کے، کہ اُن کی یہ حیثیت نہیں ہے اور وہ خاص حالات میں اور خاص موقعوں پر فرض ہوتے ہیں (ماخوذ از معارف الحدیث ۱: ۴۳-۷۴)

وإنماخَصَّ الخمسةَ بالركنية:

[۱-] لأنها أشهرُ عبادات البشر، وليست ملّةٌ من الملل إلا قد أخذت بها، والتزمتها، كاليهود، والنصارى، والمجوس، وبقية العرب، على اختلافهم في أوضاع أدائها.

[۲-] ولأن فيها ما يَكفي عن غيرها، وليس في غيرها ما يَكفي عنها.

وذلك:

[۱-] لأن أصل أصول البرّ: التوحيدُ، وتصديقُ النبي، والتسليمُ للشرائع الإلٰهية، ولمَّا كانت البعثة عامَّةً، وكان الناس يدخلون في دين الله أفواجًا، لم يكن بُدٌّ من علامة ظاهرة، بها يُمَيَّزُ بين الموافق والمخالِف، وعليها يُدار حكمُ الإسلام، وبها يُؤاخَذ الناسُ. ولولا ذلك لم يُفرَّق بينهما إلا بعد طول الممارسة، إلا تفريقًا ظنيًّا، معتمِدًا على قرائنَ، ولَاختلف الناس في الحكم بالإسلام، وفي ذلك اختلالٌ كثير من الأحكام، كما لايخفى. وليس شيئ كالإقرار طوعًا ورغبةً كاشفًا عن حقيقة ما في القلب من الاعتقاد والتصديق.

[۲-] ولِمَا ذكرنا من قبلُ: من أن مدارَ السعادة النوعية، ومِلَاكَ النجاة الأخروية، هي الأخلاقُ الأربعةُ، فَجُعلت الصلاة المقرونة بالطهارة شَبَحًا ومَظِنَّةً لِخُلُقي الإخبات والنظافة، وجُعلت الزكاة المقرونةُ بشروطها، المصروفةُ إلى مصارفها، مَظِنَّةً للسَّماحة والعدالة.

[۳-] ولِمَا ذكرنا: أنه لابد من طاعة قاهرة على النفس، لِيَدْفع بها الحُجُبَ الطبيعيَّةَ، ولا شيئَ في ذلك كالصوم.

[٤-] ولِمَا ذكرنا أيضًا: من أن أصل أصول الشرائع هو تعظيم شعائر الله؛ وهي أربعة، منها الكعبة وتعظيمُها الحجُّ.

وقد ذكرنا فيما سبق من فوائد هذه الطاعات ما يُعلم به: أنها تَكفي عن غيرها، وأن غيرها لا تَكفي عنها.

ترجمہ: اور پانچ چیزوں کو رکن ہونے کے ساتھ اس وجہ سے (آپ ﷺ نے) خاص کیا ہے:

(۱) اس لئے کہ وہ امور انسانوں کی مشہورترین عبادتیں ہیں۔ اور نہیں ہے ملتوں میں سے کوئی ملت مگر تحقیق اس نے اختیار کیا ہے اُن امور کو، اور اس نے ان کا التزام کیا ہے۔ جیسے یہود، نصاریٰ، مجوس اور باقی ماندہ عرب۔ ان کے اختلاف کے ساتھ ان امور کی ادائیگی کے احوال میں۔

(۲) اور اس لئے کہ ان امور میں وہ بات ہے جو کافی ہوجاتی ہے ان کے علاوہ سے۔ اور نہیں ہے ان کے علاوہ میں

وہ بات جو کافی ہو جائے ان امور کی طرف سے۔

اور یہ بات:

(۱) اس لئے ہے کہ نیکیوں کی بنیادی باتوں کی اساس: توحید و رسالت کی تصدیق اور احکام الہیہ کو تسلیم کرنا ہے۔ اور جبکہ (آنحضرت ﷺ کی) بعثت عام تھی۔ اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے تھے (تو) کوئی چارہ نہیں تھا کسی ظاہری علامت کے بغیر، جس کے ذریعہ امتیاز کیا جائے موافق ومخالف کے درمیان۔ اور جس پر حکم اسلام کا مدار رکھا جائے۔ اور اس کے ذریعہ لوگوں سے باز پرس کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ جدائی کی جا سکتی موافق ومخالف کے درمیان مگر عرصۂ دراز کی ممارست کے بعد، مگر ظنی جدائی کرنا، قرائن پر اعتماد کرتے ہوئے۔ اور ضرور لوگ اختلاف کرتے اسلام کا حکم لگانے میں۔ اور اس میں بہت بڑا اختلال تھا احکام میں، جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔ اور نہیں ہے کوئی چیز برضاء ورغبت اقرار کی طرح اس اعتقاد وتصدیق کی حقیقت کھولنے میں جو دل میں ہے۔

(۲) اور اس وجہ سے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نوع بشری کی نیک بختی کا مدار، اور اخروی نجات کا سرمایہ، اخلاق اربعہ ہیں۔ پس گردانی گئی وہ نماز جو پاکی کے ساتھ مقرون ہو اخبات ونظافت کی دو خصلتوں کا پیکر محسوس اور احتمالی جگہ۔ اور گردانی گئی وہ زکوۃ جو اس کی شرطوں کے ساتھ مقرون ہو، اور جو اس کے مصارف میں خرچ کی گئی ہو سماحت وعدالت کے لئے احتمالی جگہ۔

(۳) اور اس وجہ سے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ضروری ہے کوئی ایسی عبادت جو نفس پر غالب ہو، تاکہ آدمی دور کرے اس کے ذریعہ فطری حجابات کو۔ اور نہیں ہے کوئی چیز اس میں روزہ کی طرح۔

(۴) اور اس وجہ سے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خدائی شریعتوں کی اصل اصول شعائر اللہ کی تعظیم ہے۔ اور شعائر اللہ چار ہیں۔ ان میں سے ایک کعبہ ہے۔ اور اس کی تعظیم اس کا حج کرنا ہے۔

اور تحقیق ذکر کئے ہیں ہم نے گذشتہ ابواب میں ان عبادات کے فوائد میں سے وہ جن کے ذریعہ جانا جاتا ہے کہ یہ عبادتیں کفایت کرتی ہیں ان کے علاوہ سے۔ اور یہ کہ ان کے ماسواء کفایت نہیں کرتیں ان سے۔

لغات: اِلْتزم العمل أو المال: اپنے اوپر واجب کر لینا ..... اوضاع جمع ہے وضع کی، جو عرض کے نو مقولوں میں سے ایک مقولہ ہے، پس یہ نیم منطقی اصطلاحی لفظ ہے ..... کَفَی یکفی کفایۃ: کافی ہونا، دوسرے سے مستغنی کرنا ..... مِلاکُ الأمر: سہارا، سرمایہ ..... شبح: پرچھائیں۔ یہاں پیکر محسوس مراد ہے ..... مَظِنّۃ: کسی چیز کے ملنے کی احتمالی جگہ ..... حجاب طبعی سے حجاب نفس مراد ہے۔ دیکھئے مبحث ۴ باب ۹

ترکیب: لم یکن بُدٌّ: جزاء ہے لما کانت البعثۃ کی ..... ولاختلف کا عطف لم یفرق پر ہے ..... کاشفا تمیز ہے لیس کی۔

تصحیح: إلا بعدؔ میں إلا تینوں مخطوطوں سے بڑھایا ہے۔ اور دوسرا إلا استثناء در استثناء ہے، استثناء ثانی نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

گناہ: کبائر و صغائر

اوپر جو بیان کیا گیا ہے کہ نجات کے لئے کم از کم اسلام کے ارکان خمسہ پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ آدمی بڑے گناہوں سے بچا رہے۔ سورۃ النساء آیت ۳۱ میں ارشاد پاک ہے:

إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّآتِكُمْ، وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلاً كَرِيْمًا.

جن کاموں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اُن میں جو بھاری بھاری کام ہیں اگر تم ان سے بچتے رہو تو ہم تمہاری خفیف برائیاں تم سے دور فرمادیں گے، اور ہم تم کو ایک معزز جگہ میں داخل کریں گے۔

شریعت کی نظر میں گناہ کی دو قسمیں ہیں: کبائر اور صغائر:

(۱) ــــ کبائر (بڑے گناہ) وہ ہیں جو آدمی سے اس وقت صادر ہوتے ہیں جب اس پر بہیمیت، درندگی یا شیطنت (شرارت و خباثت) کا بھاری پردہ پڑ جاتا ہے یعنی غلبہ ہو جاتا ہے اور جس کے ارتکاب سے راہِ حق مسدود ہو جاتی ہے یعنی آدمی دین سے دور جا پڑتا ہے اور جس سے شعائر اللہ کی عظمت برباد ہو جاتی ہے۔ یا وہ کام تدبیرات نافعہ کو خلاف ورزی ہوتے ہیں، اور ان سے لوگوں کو ضرر عظیم پہنچتا ہے۔ اور مع ہذا ان کاموں کا مرتکب شریعت کو پس پشت ڈالدیتا ہے۔ یہ نیز شریعت نے ان کاموں سے نہایت سختی کے ساتھ روکا ہے اور ان کے ارتکاب پر نہایت سخت تہدید فرمائی ہے، اور اس کو ایسا خطرناک کام قرار دیا ہے کہ گویا اس کا مرتکب ملت سے خارج ہے۔

(۲) ــــ صغائر (چھوٹے گناہ): برائی کے وہ اسباب و دواعی ہیں جو مذکورہ گناہوں سے فروتر ہیں، شریعت نے ان سے بھی قطعی طور پر روکا ہے، لیکن ان پر ایسی سخت تہدید نہیں فرمائی جیسی مذکورہ گناہوں کے بارے میں فرمائی ہے۔

تشریح: کبیرہ کی تعریف میں بہت اختلاف ہے، اور صغیرہ چونکہ اس کا مقابل ہے اس لئے اس کی تعریف میں بھی اختلاف ناگزیر ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم ہی درست نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ہر گناہ جس سے قرآن وحدیث میں روکا گیا ہے کبیرہ ہے۔ ان کے خیال میں یہ بات مناسب نہیں ہے کہ جس کام سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اس کو صغیرہ (معمولی گناہ) کہہ دیا جائے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں، مذکورہ آیت میں تقسیم کی طرف صاف اشارہ موجود ہے۔

روح المعانی (۵:۱۷) میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں کبیرہ کی تعریف میں سات آٹھ قول ذکر کئے گئے ہیں، مگر یہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ہر ایک نے ایک پہلو ظاہر کیا ہے۔ اور بعض حضرات نے سب اقوال کو جمع کیا ہے۔ شیخ الاسلام

بارِزی فرماتے ہیں:

''جس گناہ پر کوئی وعید آئی ہو یا اس پر کوئی حد (سزا) مقرر کی گئی ہو، یا اس پر قرآن وحدیث میں لعنت وارد ہوئی ہو، یا اس میں خرابی کسی ایسے گناہ کے برابر یا زیادہ ہو جس پر وعید یا حد یا لعنت آئی ہو، یا اس کے مرتکب کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوتا ہو کہ وہ دین میں متہاون ہے، تو وہ کبیرہ ہے اور اس کا مقابل صغیرہ ہے'' (روح المعانی)

اور شاہ صاحب قدس سرہ نے اس سلسلہ میں قول جامع یہ بیان کیا ہے کہ ایسے کام جو آدمی سے اس وقت صادر ہوتے ہیں جب اس پر بہیمیت یا سَبُعیت یا شیطنت کا سخت حملہ ہوتا ہے۔ جیسے زنا، ناحق قتل اور مال غنیمت لوٹنا۔ جب آدمی اس قسم کی حرکتیں کرتا ہے تو وہ دین سے دور جا پڑتا ہے۔ جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے یعنی وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اور ان کاموں کے ارتکاب سے شعائر اللہ کی عظمت پر بھی حرف آتا ہے گویا اس گنہگار کے نزدیک قرآن وحدیث کے احکام کی کوئی حیثیت ہی نہیں! ——— یا اُن کاموں میں ارتفاقات کی خلاف ورزی ہوتی ہے، جیسے زنا، حالت حیض میں صحبت اور اغلام وغیرہ کہ ان سے نکاح اور توالد وتناسل کی راہ مسدود ہو جاتی ہے، اور لوگوں کو ضرر عظیم پہنچتا ہے۔

علاوہ ازیں ان کاموں کا مرتکب شریعت کو پس پشت بھی ڈال دیتا ہے۔ وہ شریعت کی ممانعت اور تہدیدات کی کچھ پرواہ نہیں کرتا، حالانکہ شریعت نے ان کو ایسا خطرناک کام قرار دیا ہے کہ گویا ان کا مرتکب ملت سے خارج ہے۔ اس کے حق میں **فقد کفر** اور **فقد برئ مما أُنزل علی محمد** جیسے سخت کلمات وارد ہوئے ہیں۔

اور صغائر: بڑے گناہوں کے اسباب ودواعی ہیں۔ جیسے بدنظری: زنا کا سبب اور اس تک مُفضی ہے۔ مگر یہ گناہ زنا سے فروتر ہے، پس زنا کی بہ نسبت یہ صغیرہ ہے۔ شریعت نے ان گناہوں سے بھی روکا ہے، مگر ان پر کبائر جیسی سخت وعید وارد نہیں ہوئی۔ غرض صغائر سے بھی بچنا ضروری ہے۔ صغیرہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں۔ چھوٹی چنگاری بھی آگ ہے، وہ بھی ایک جہاں کو پھونک سکتی ہے۔

کبائر کی تعداد متعین نہیں

کبائر کی تعداد روایات میں مختلف آئی ہے۔ ایک متفق علیہ روایت میں ہے کہ: ''سات مہلک گناہوں سے بچو'' الخ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ایک روایت میں ان کی تعداد نو آئی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے دس کی تعداد مروی ہے، بلکہ عبدالرزاق نے ایک روایت ذکر کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ کیا کبائر سات ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''وہ قریب ستر ہیں'' اور سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کی روایت میں ابن عباسؓ کا یہ جواب مروی ہے کہ: ''وہ قریب سات سو ہیں''۔ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

"حق بات یہ ہے کہ کبائر کی تعداد متعین نہیں۔ ان کو حد (تعریف) ہی سے پہچانا جاسکتا ہے کہ جس کام پر قرآن کریم میں اور احادیث صحیحہ میں جہنم کی وعید آئی ہے یا اس پر سزا مقرر کی گئی ہے یا نصوص میں اس کو کبیرہ کہا گیا ہے یا اس کے مرتکب کو ملت سے خارج قرار دیا گیا ہے یا اس کی خرابی اُن گناہوں سے بڑھی ہوئی ہے یا ان کے برابر ہے جن کے کبیرہ ہونے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرمائی ہے"

اور واحدی رحمہ اللہ نے تعداد متعین نہ ہونے کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اگر کبائر کی تعداد متعین کر دی جاتی تو لوگ صغائر کا ارتکاب شروع کر دیتے، اور ان کو جائز سمجھ لیتے کہ یہ تو معمولی گناہ ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں سے کبائر کی تعداد مخفی رکھی تاکہ لوگ ہر منہی عنہ سے بچیں، یہ خیال کر کے کہ کہیں وہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ جیسے صلوٰۃ وسطیٰ کا، شب قدر کا اور جمعہ کے دن قبولیت کی گھڑی کا علم مخفی کر دیا گیا ہے، تاکہ لوگ ہر نماز کو درمیانی نماز خیال کر کے اس کا اہتمام کریں اور رمضان کی ہر رات میں شب قدر کو تلاش کریں اور جمعہ کے دن بوقت نماز بھی، عصر کے بعد بھی اور دیگر ساعات میں بھی دعا کریں (روح المعانی ۵:۱۷)

والآثام: باعتبار الملّة على قسمين: صغائر وكبائر:

والكَبائر: مالايصدُر إلا بغاشية عظيمة من البهيمية، أو السَّبُعية، أو الشيطنة، وفيه انْسِداد سبيل الحق، وهَتْكُ حُرْمَةِ شعائرِ اللّه، أو مخالفاتُ الارتفاقات الضرورية، والضررُ العظيم بالناس، ويكون مع ذلك منابذًا للشرع، لأن الشرع نهى عنه أشدَّ نهيٍ، وغلَّظ التهديدَ على فاعله، وجعله كأنه خروج من الملة.

والصغائر: ماكان دون ذلك من دواعي الشرومُفضياتِ إليه، وقد ظهر نهيُ الشرع عنه حتما، ولكن لم يُغَلِّظْ فيه ذلك التغليظَ.

والحقُّ: أن الكبائر ليست محصورةً في عدد، وأنها تُعرف بإيعاد النار في الكتاب والسنة الصحيحة، وشَرْعِ الحدِّ عليه، وتسميتِه كبيرةً، وجعلِه خروجا عن الدين، وكونِ الشيئ أكثرَ مفسدةً مما نصَّ النبي صلى الله عليه وسلم على كونه كبيرةً، أو مثلَها في المفسدة.

ترجمہ: اور گناہ ملت کے اعتبار سے یعنی شریعت کی نظر میں دو قسموں پر ہیں: صغائر اور کبائر:

اور کبائر: وہ کام ہیں جو نہیں صادر ہوتے مگر بہیمیت یا درندگی یا شیطنت کا بڑا پردہ پڑ جانے کی وجہ سے، اور اس میں راہ حق کو مسدود کرنا ہے اور عظمتِ شعائر اللہ کی ہتک ہے۔ یا ضروری تدبیرات نافعہ کی خلاف ورزی ہے اور لوگوں کو ضرر عظیم پہنچانا ہے اور ہوتا ہے گنہگار اُن (خرابیوں) کے ساتھ شریعت کو پس پشت ڈالنے والا۔ اس لئے کہ شریعت نے روکا ہے اس

سے تاکید کے ساتھ روکنا۔اور گاڑھا گیا ہے دھمکی کو اس کے مرتکب پر۔اور گردانا ہے اس کو گویا وہ ملت سے نکل جاتا ہے۔

اور صغائر: وہ کام ہیں جو اُس سے فروتر ہیں، برائی کے اسباب میں سے اور برائی تک مُفضی امور میں سے۔اور تحقیق ظاہر ہوا ہے شریعت کا روکنا اس سے قطعی طور پر، مگر نہیں گاڑھا گیا ہے اس میں اس دھمکی کو۔

اور حق بات یہ ہے کہ کبائر کسی عدد میں محصور نہیں ہیں۔اور (حق بات) یہ ہے کہ وہ (کبائر) پہچانے جاتے ہیں جہنم کی دھمکی دینے سے قرآن اور احادیث صحیحہ میں، اور اس پر سزا مقرر کرنے سے، اور اس کا کبیرہ نام رکھنے سے، اور اس کو ملت سے نکلنا گردانتے سے، اور کسی چیز کے ہونے سے خرابی میں بڑھا ہوا اُن گناہوں سے جن کے کبیرہ ہونے کی رسول اللہ ﷺ نے صراحت کی ہے، یا خرابی میں اس کے برابر ہونے سے۔

لغات: الغاشیۃ: مؤنث غاشی: پردہ، دل کا پردہ، جمع غَوَاشٍ۔

☆ ☆ ☆

فصل

ایمانیات سے تعلق رکھنے والی روایات

وہ روایات جن میں کبائر و کفریات کا تذکرہ ہے

حدیث —— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"نہیں زنا کرتا کوئی زنا کار، جب وہ زنا کرتا ہے درانحالیکہ وہ مؤمن ہو۔اور نہیں چوری کرتا کوئی چور، جب وہ چوری کرتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو۔اور نہیں شراب پیتا کوئی شرابی، جب وہ شراب پیتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو۔اور نہیں لوٹتا (لٹیرا) کوئی لوٹ —— کہ لوگ اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھتے ہیں —— جب وہ لوٹتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو۔اور نہیں خیانت کرتا مالِ غنیمت میں کوئی خائن، جب وہ خیانت کرتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو، پس بچو! بچو!! (متفق علیہ)

اور ایک دوسری متفق علیہ روایت میں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے مذکورہ امور کے ساتھ ناحق قتل کا بھی ذکر ہے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ زنا، چوری، شراب نوشی، لوٹ مار، مال غنیمت میں خیانت اور قتل ناحق یہ سب ایسی حرکتیں ہیں جو آدمی سے اسی وقت صادر ہوتی ہیں جب اس پر بہیمیت یا درندگی کا بڑا پردہ پڑ جاتا ہے۔اس وقت ملکیت (ایمان کا نور) گویا بالکل ختم ہوجاتی ہے، اور ایمان کافور ہوجاتا ہے۔اس ارشاد پاک کے ذریعہ یہ سمجھانا مقصود ہے کہ یہ سب افعال کبیرہ گناہ ہیں (یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اسلام کے دائرہ سے بالکل نکل جاتا ہے اور کافروں میں شامل ہوجاتا ہے)

فائدہ: اس قسم کی حدیثیں جن میں خاص خاص بداعمالیوں اور بداخلاقیوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان میں ایمان نہیں، یا وہ مؤمن نہیں۔ اور اسی طرح وہ حدیثیں جن میں بعض اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ان کا تارک ہے وہ ایمان سے خالی اور بے نصیب ہے یا یہ کہ وہ مؤمن نہیں ہے۔ ان کا مقصد ومنشا یہ نہیں ہوتا کہ وہ شخص دائرۂ اسلام سے بالکل نکل گیا۔ اور اب اس پر اسلام کے بجائے کفر کے احکام جاری ہوں گے اور آخرت میں اس کے ساتھ ٹھیٹ کافروں والا معاملہ ہوگا۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اس حقیقی ایمان سے محروم اور بے نصیب ہے جو مسلمانوں کی اصلی شان ہے، اور جو اللہ کو محبوب ہے۔

اور اس کے لئے نحوی ترکیب میں کاملاً یا تامًّا جیسے الفاظ مقدر ماننے کی بالکل ضرورت نہیں، بلکہ ایسا کرنا ایک قسم کی بدذوقی ہے۔ ہر زبان کا یہ عام محاورہ ہے کہ اگر کسی میں کوئی صفت بہت ناقص اور کمزور درجہ کی ہو، تو اس کو کالعدم قرار دے کر اس کی مطلق نفی کر دی جاتی ہے۔ خاص کر دعوت وخطابت اور ترغیب وترہیب میں یہی طرز بیان زیادہ موزوں اور زیادہ مفید مطلب ہوتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے دیکھیں معارف الحدیث (۱:۱۵۵)

حدیث —— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے! اس امت کا (یعنی اس دور کا) کوئی بھی —— خواہ یہودی یا عیسائی ہی کیوں نہ ہو —— میری خبر سن لے گا (یعنی اس کو میری نبوت کی دعوت پہنچ جائے گی) پھر وہ مجھ پر اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مرے گا، تو وہ ضرور دوزخ میں جائے گا'' (رواہ مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کی دعوت پہنچ جائے، پھر وہ آپؐ پر ایمان نہ لائے، انکار پر اڑا رہے، اور اسی حال میں مر جائے تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ اگرچہ وہ کسی سابق پیغمبر کو، اس کے دین کو اور اس کی کتاب وشریعت کو ماننے والا یہودی یا عیسائی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دور محمدی میں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت سے شروع ہوا ہے، اور قیامت تک جاری رہے گا اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بندوں کی اصلاح کے لئے جو نظم وانتظام کیا ہے، وہ شخص اس کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کی اور مقرب فرشتوں کی پھٹکار کا موردِ بنا ہے۔ اور اس نے نجات کی راہ خود ہی گم کر دی ہے۔ الغرض خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت کے بعد آپؐ پر ایمان لائے بغیر اور آپ کی شریعت کو قبول کئے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اور یہ مسئلہ دین اسلام کے قطعیات وبدیہیات میں سے ہے، جس میں شک وشبہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کی حیثیت کو نہ سمجھنے ہی سے ہوسکتا ہے (معارف الحدیث ۱:۸۹)

حدیث —— حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہو جائیں''

تشریح: ایمان کا کمال یہ ہے کہ عقل طبیعت پر غالب آجائے یعنی عقل کا مقتضیٰ واضح طور پر اسکے نزدیک طبیعت کے مقتضیٰ

سے افضل ہو۔ اور یہ بات دین کے ہر معاملہ میں ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ سے، اسلام سے، قرآن سے اور رسول اللہ ﷺ سے محبت ہر چیز کی محبت سے زیادہ ہونی چاہئے۔ جبھی ایمان کی تکمیل ہوسکتی ہے اور اسی وقت ایمان کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔

اور یہ بات اپنے اندر پیدا کرنا یا اس حقیقت کو سمجھنا کچھ دشوار نہیں، کیونکہ اللہ و رسول کے ساتھ اہل ایمان کو جو محبت ہوتی ہے وہ ماں باپ اور بیوی بچوں کی محبت کی طرح خونی رشتوں یا دوسرے طبعی اسباب کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ روحانی اور عقلی وجوہ سے ہوتی ہے۔ اور جب وہ کامل ہوجاتی ہے تو اس کے سوا دوسری تمام وہ محبتیں جو طبعی یا نفسانی اسباب سے ہوتی ہیں دب جاتی ہیں، اور مغلوب ہوجاتی ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''میری زندگی کی قسم! (یعنی میری زندگی کے تجربات، گواہ ہیں کہ) یہ چیز کامل ایمان والوں میں مشاہدہ کی ہوئی ہے'' یعنی وہ وقت آنے پر ہر تعلق کو اپنے حبیب ﷺ سے تعلق پر قربان کردیتے ہیں۔

فائدہ: لایؤمن کی تعبیر سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے ہر چیز سے زیادہ محبت کرنا اور ھَوی (خواہشات نفس) کو ھُدی (اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی تعلیمات) کے تابع کرنا واجب ہے اور اس کی جانبِ مخالف حرام ہے۔ پس یہی گناہ کبیرہ ہے۔

[۱] وقوله: صلى الله عليه وسلم: "لايزنى الزانى حين يزنى وهو مؤمن" الحديث، معناه: أن هذه الأفعال لا تصدُر إلا بغاشية عظيمة من البهيمية، أو السبعية، فتَصير حينئذ الملكيةُ كأن لم تكن، والإيمانُ كأنه زائل؛ ودلّ بذلك على كونها كبائرَ.

[۲] قال النبى صلى الله عليه وسلم: "والذى نفسُ محمدٍ بيده! لا يَسْمع بى أحدٌ من هذه الأمة: يهوديٌّ ولانصرانى، ثم يموت، ولم يؤمن بالذى أُرسلتُ به، إلا كان من أصحاب النار"

أقول: يعنى من بلَغتْه الدعوةُ، ثم أَصرَّ على الكفر حتى مات دخل النار، لأنه نَاقَضَ تدبيرَ الله تعالى لعباده، ومَكّن من نفسه لعنةَ الله والملائكةِ المقرَّبين، وأخطأ الطريقَ الكاسبَ للنجاة.

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم: "لايؤمن أحدُكم حتى أكون أحبَّ إليه من والده وولده والناس أجمعين" وقال: "حتى يكونَ هواه تبعاً لما جئتُ به"

أقول: كمالُ الإيمان أن يغلب العقل على الطبع، بحيث يكون مقتضى العقل أَمْثَلَ بين عينيه من مقتضى الطبع بادى الأمر، وكذلك الحال فى حب الرسول، ولَعَمرِىْ! هذا مشهودٌ فى الكاملين.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''نہیں زنا کرتا زنا کرنے والا، جب وہ زنا کرتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو'' حدیث آخر تک پڑھیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ افعال نہیں صادر ہوتے مگر بہیمیت یا سَبُعیت کے بڑے پردے کی

وجہ سے۔ پس اس وقت ملکیت ہوجاتی ہے گویا تھی ہی نہیں۔ اور ایمان گویا وہ ختم ہوجانے والا ہے۔ راہ نمائی کی ہے آپ نے اس ارشاد سے ان افعال کے کبیرہ ہونے کی طرف۔

(۲) فرمایا نبی ﷺ نے: ''قسم ہے الخ'' میں کہتا ہوں: مراد لے رہے ہیں آپ ﷺ اس شخص کو جس کو دعوت پہنچی، پھر اُڑا رہا وہ انکار پر، یہاں تک کہ مرگیا، تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ کیونکہ اس نے مخالفت کی اللہ تعالیٰ کے انتظام کی اپنے بندوں کے لئے۔ اور موقع دیا اس نے اپنے اندر اللہ کی اور مقرب فرشتوں کی پھٹکار کو۔ اور چوک گیا وہ اس راہ کو جو نجات کو کمانے والی ہے۔

(۳) اور فرمایا آپ ﷺ نے: ''نہیں ایمان لاتا الخ'' اور فرمایا: ''یہاں تک کہ الخ'' میں کہتا ہوں: ایمان کا کمال یہ ہے کہ عقل طبیعت پر غالب آجائے، بایں طور کہ عقل کا مقتضی اس کی آنکھوں کے سامنے ہو طبیعت کے مقتضی سے واضح طور پر۔ اور اسی طرح حالت ہے حب رسول کی۔ اور میری زندگی کی قسم! یہ چیز کاملین میں مشاہدہ کی ہوئی ہے۔

☆ ☆ ☆

ایک جامع تعلیم اور اسلام کا عطر

حدیث —— حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اسلام کے بارے میں مجھے کوئی ایسی جامع اور شافی بات بتلایئے کہ آپ کے بعد —— اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے علاوہ —— پھر میں کسی سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھوں آپ نے ارشاد فرمایا: ''کہو: ایمان لایا میں اللہ پر، پھر اس پر جم جاؤ'' (رواہ مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کو الٰہ اور رب مان کر اپنے کو بس اس کا بندہ بنادو، انقیاد و اطاعت کو اور اللہ کے احکام کے سامنے سرافگندگی کو اپنا شیوہ بنالو۔ اعمال اسلام پر عمل پیرا ہوجاؤ اور اسلام میں ممنوع اعمال سے بالکلیہ کنارہ کش ہوجاؤ یہی جامع تعلیم اور اسلام کا عطر ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی اور سبق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سورہ حٰمٓ السجدۃ آیت ۳۰ میں ارشاد پاک ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا: رَبُّنَا اللّٰهُ، ثُمَّ اسْتَقَامُوْا، تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ.	بیشک جن لوگوں نے دل سے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر مستقیم رہے تو ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ تم اندیشہ نہ کرو، اور نہ رنج کرو، اور تم اس جنت کی خوش خبری سن لو جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔

الغرض یہ ایک جامع ارشاد اور کلی بات ہے۔ اس سے مؤمن کو تمام احکاماتِ شرعیہ کے سلسلہ میں بصیرت حاصل ہوجاتی ہے کہ تمام اوامر و نواہی اور جملہ احکام خداوندی کی پیروی ضروری ہے۔ اور یہ اجمالی علم بھی انسان کو دین میں اور

خیرات (اعمال صالحہ) میں آگے بڑھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

[٤] قیل: یارسولَ اللہ! قل لی فی الإسلام قولاً لاأسألُ عنه احدًا بعدك، وفی روایة: غیرَك، قال: " قل: آمنتُ باللّٰه، ثم اسْتَقِمْ"
أقول: معناه أن یُحضر الإنسانُ بین عینیه حالةَ الانقیاد والإسلام، ثم یعمل بمایناسبه، ویترکُ مایخالفه، وهذا قولٌ کلیٌّ یصیر به الإنسانُ علی بصیرة من الشرائع، وإن لم یکن تفصیلاً، فلایخلو عن علم اجمالی، یجعلُ الإنسان سابقًا.

ترجمہ: (۴) پوچھا گیا الخ میں کہتا ہوں: اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر کرے فرمانبرداری اور سرافگندگی کی حالت کو، پھر کرے وہ کام جو اس کے مناسب ہیں، اور چھوڑے وہ کام جو اس کے برخلاف ہیں (جیسے کسی کو استاذ مان لیا جائے تو اب اس کے تقاضے پورے کرنے ضروری ہیں) اور یہ ایک جامع ارشاد ہے اس کے ذریعہ انسان بابصیرت ہو جاتا ہے احکامِ شرعیہ میں۔ اگرچہ یہ بات تفصیلی نہیں ہے مگر خالی نہیں ہے ایسے اجمالی علم سے جو انسان کو آگے بڑھنے والا بنا دیتا ہے۔

☆　☆　☆

مؤمن ناجی ہے ناری نہیں

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"جو کوئی سچے دل سے شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ پر حرام کر دیں گے" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا میں لوگوں کو اس کی خبر نہ کر دوں کہ وہ خوش ہو جائیں؟ آپؐ نے فرمایا: "پھر وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے!" پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری وقت میں کتمانِ علم کے خوف سے یہ حدیث لوگوں سے بیان کی" (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث نمبر ۲۵)

حدیث ـــــ آنحضرت ﷺ نے ایک بار حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"جو بھی بندہ لا إلٰه إلا اللّٰه کہے، اور پھر اس پر اس کو موت آجائے، تو وہ جنت میں ضرور جائے گا" حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو، اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟ آپؐ نے فرمایا: "اگرچہ اس نے زنا کیا ہو، اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو!" دوسری مرتبہ ابوذرؓ نے استعجاب سے یہی دریافت کیا، تو بھی آپؐ نے یہی

جواب دیا۔ تیسری بار جب حضرت ابوذرؓ نے یہی بات تعجب سے عرض کی تو آپؐ نے فرمایا: ''اگرچہ اس نے زنا کیا ہو، اوراگرچہ اس نے چوری کی ہو، وہ ابوذرؓ کی ناگواری کے باوجود جنت میں جائے گا'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث نمبر ۲۵)

حدیث ـــــ حضرت عُبادۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو بے ہمہ ہے، جس کا کوئی ساجھی نہیں، اور یہ گواہی دے کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور یہ گواہی دے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور ان کی بندی کے بیٹے ہیں، اور اللہ کا بول ہیں جس کو اللہ نے مریم کی طرف ڈالا ہے اور اللہ کی پیاری روح ہیں اور جنت اور جہنم برحق ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے، خواہ اس نے کچھ بھی عمل کیا ہو (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث نمبر ۲۷)

حدیث ـــــ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو کوئی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کردیتے ہیں'' (مشکوۃ، حدیث نمبر ۳۶)

حدیث ـــــ اور مسلم شریف ہی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

''دو باتیں واجب کرنے والی ہیں'' ایک شخص نے پوچھا: وہ دو واجب کرنے والی باتیں کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''جس کی اس حال میں موت آئے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہراتا تھا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ اور جس کی اس حال میں موت آئے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگا'' (مشکوۃ حدیث ۳۸)

تشریح: ان تمام روایات کا مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان واسلام کی دعوت قبول کی، اور توحید ورسالت کی شہادت دی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نجات کا حتمی وعدہ ہے۔ اور اگر وہ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی کرتا رہا اور کبائر سے بچتا بھی رہا تو وہ نجاتِ اوّلی کا حقدار ہے۔ اور اگر بہ تقاضائے بشریت اعمال میں کوتاہیاں ہوئیں یا کبائر کا ارتکاب کیا، تو دو صورتیں ہونگی: اگر مغفرت خداوندی اس کے شامل حال ہوجائے گی تو وہ بھی بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوگا۔ اور اگر اس کا نصیب ایسا نہیں تو وہ کوتاہیوں اور گناہوں کی پاداش میں جہنم میں داخل کیا جائے گا، اور سزایابی کے بعد جنت میں پہنچایا جائے گا۔ تا ابد وہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ جہنم کی ابدی سزا کفار ہی کے لئے ہے۔ مؤمن کے لئے اگرچہ اس نے کبائر کا ارتکاب کیا ہو جہنم کی ابدی سزا نہیں ہے۔

ان روایات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ توحید ورسالت کا اقرار کرنے کے بعد آدمی خواہ کیسا ہی بدعقیدہ اور بدعمل رہا ہو، بہر حال وہ اللہ کے عذاب سے مامون ومحفوظ رہے گا، دوزخ کی آگ اس کو چھو ہی نہیں سکتی۔ ایسا سمجھنا ان بشارتی ارشادات کا صحیح مفہوم ومدعا سمجھنے سے محرومی ہے۔

سوال: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان روایات کا یہی مطلب ہے جو اوپر بیان کیا گیا، تو پھر یہ تعبیرات کہ: ''اس کو دوزخ پر حرام کردیں گے'' اور ''وہ ضرور جنت میں جائے گا'' اور ''اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے خواہ اس نے کچھ بھی عمل کیا ہو'' اور ''اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کردیتے ہیں'' اور ''توحید خالص دخول جنت کو واجب کرنے والی ہے'' یہ تعبیرات کیوں اختیار کی گئی ہیں؟ اس صورت میں تو صاف اور سیدھا انداز بیان یہ ہونا چاہئے تھا کہ: ''ایمان کی یہ دولت مؤمن کسی نہ کسی دن جنت میں ضرور جائے گا'' ۔ یہ تعبیرات تو ذہن کو اس طرف لے جاتی ہیں کہ ایمان کے ساتھ عملی کوتاہیاں اور کبائر کا ارتکاب کچھ مضر نہیں، جیسا کہ مُرجیہ فرقہ کہتا ہے۔

جواب: کلام کو اس انداز پر چلانے میں نکتہ یہ ہے کہ ان تعبیرات سے مؤمن کو بشارت سنانے کے ساتھ، کفر وشرک کی سنگینی بھی ظاہر کرنی ہے یعنی یہ بتلانا بھی مقصود ہے کہ کفر وشرک کی بہ نسبت کبائر بے حیثیت ہیں۔ گویا وہ گناہ ہی نہیں۔ اس لئے مؤمن ضرور جنت میں جائے گا۔ خواہ اس نے کچھ بھی عمل کیا ہو۔ ہاں البتہ کفر وشرک کی معافی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ نہایت سنگین گناہ ہیں۔ جیسے بغاوت: حکومت کے نزدیک نہایت سخت گناہ ہے، اس کی معافی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور بغاوت کی بہ نسبت دیگر اخلاقی اور عملی جرائم معمولی گناہ ہیں۔ اس لئے مجرم کو بغیر سزا کے بھی چھوڑا جاسکتا ہے، اور سزا دی جائے تو بھی وہ دیر سویر جیل سے نکل آتا ہے۔ اور اس کی نظیر أمرت أن أقاتل إلخ ہے۔ اس حدیث کا مقصد جنگ چھیڑنا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں جنگ بندی کی حد بیان کی گئی ہے۔ مگر تعبیر أمرت أن أقاتل الناس اختیار کی گئی ہے تاکہ اس طرف بھی اشارہ ہوجائے کہ فتنہ ختم کرنے کے لئے اقدامی جہاد بھی مشروع ہے۔

اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے انداز پر اس کی تفصیل یہ ہے کہ گناہ کے مراتب میں واضح تفاوت ہے، اگرچہ سب گناہ ''گناہ'' ہیں، مگر تمام گناہ ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ مثلاً کبائر کا کفر سے موازنہ کیا جائے تو ان کی کوئی محسوس حیثیت نہ ہوگی۔ وہ پہاڑ کے سامنے رائی کا دانہ نظر آئیں گے اور ان میں دخول نار کی سببیت کی شان بہت ہی مضمحل نظر آئے گی۔ یہی حال صغائر کا ہے جب ان کا کبائر سے موازنہ کیا جائے۔ پس نبی کریم ﷺ نے اپنی ان تعبیرات سے کفر اور کبائر کے درمیان نہایت واضح فرق سمجھایا ہے کہ کفر وشرک تو ایسے سنگین گناہ ہیں کہ ان کی معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور کبائر چونکہ کفر وشرک کی بہ نسبت بے قدر ہیں۔ اس لئے ان کی معافی ابتداءً بھی ہوسکتی ہے اور بالآخر (یعنی سزایابی کے بعد) بھی ہوسکتی ہے۔ بلکہ ضرور ہوگی۔ مرتکب کبیرہ بھی کسی نہ کسی دن جنت میں ضرور پہنچ کر رہے گا۔

مثال سے وضاحت: معمولی بیماریاں جیسے زکام اور تکان وغیرہ جب ان کا مُزمن بیماریوں سے جیسے جذام، اور سل دق وغیرہ سے موازنہ کیا جائے جو فساد مزاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، جب کہ وہ بگاڑ جسم انسانی میں جگہ بنالیتا ہے تو وہ معمولی بیماریاں صحت وتندرستی نظر آئیں گی، وہ کوئی علت وعارضہ ہی نہیں سمجھی جائیں گی۔ کیونکہ کبھی بھاری مصیبت چھوٹی مصیبت کو بھلا دیتی ہے۔ پیر میں کانٹا چبھ جائے، پھر آل یا مال پر کوئی آفت آن پڑے تو آدمی کانٹا چبھنے کی تکلیف

بھول جاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس نئی آنے والی آفت سے پہلے مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہی نہیں۔اسی طرح کبائر: کفروشرک کے مقابلہ میں کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں۔

[٥] وقال صلى الله عليه وسلم: " مامن احدٍ يَشْهَد ان لا إله إلا الله، وأن محمدا رّسول الله، صِدْقا من قلبه، إلا حَرَّمه الله على النار" وقوله صلى الله عليه وسلم: " وإن زنى وإن سرق" وقوله صلى الله عليه وسلم: " على ما كان من عملٍ"

أقول: معناه: حَرَّمه الله على النار الشديدة المؤَبَّدةِ التى أعدَّها للكافرين، وإن عمل الكبائر.

والنكتة فى سَوق الكلام هذا السياق: أن مراتب الإثم بينها تفاوتٌ بَيِّنٌ، وإن كان يجمَعُها كلَّها اسمُ الإثم، فالكبائر إذا قيست بالكفر لم يكن لهاقدرٌ محسوسٌ، ولا تأثيرٌ يُعتد به، ولاسببيةٌ لدخول النار تُسمى سببيةً، وكذلك الصغائر بالنسبة إلى الكبائر، فبيَّن النبيُّ صلى الله عليه وسلم الفرق بينها على آكد وجهٍ، بمنزلة الصحة والسُّقم: فإن الأعراض البادية، كالزكام والنَّصَب، إذا قيست إلى سوء المزاج المتمكّن، كالجُذام والسِّلّ والاستسقاء، يُحكم عليها بأنها صحةٌ، وأن صاحبها ليسٍ بمريض، وأن ليس به قَلَبَةٌ، ورُبَّ داهيةٍ تُنسى داهيةً، كمن أصابه شوكةٌ، ثم وُتر أهلَه ومالَه،قال: لم يكن بى مصيبة قبلُ اصلاً.

ترجمہ:(۵)اورآنحضرت ﷺ نے فرمایا:"نہیں ہے کوئی شخص جوگواہی دے" الخ۔

میں کہتا ہوں:اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اس کواللہ تعالیٰ حرام کردیں گے سخت دائمی آگ پر،جس کواللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے تیار کیا ہے،اگرچہ اس نے کبائر کا ارتکاب کیا ہو۔

اورکلام کواس انداز پر چلانے میں نکتہ یہ ہے کہ گناہ کے مراتب،ان کے درمیان واضح تفاوت ہے،اگرچہ سب مراتب کولفظ"گناہ"شامل ہے۔پس کبائر جب موازنہ کئے جائیں کفر کے ساتھ تونہیں ہوگی ان کے لئے کوئی محسوس حیثیت اورنہ قابل لحاظ قدر۔اورنہ آگ میں جانے کے لئے ایسی سببیت جس کوسببیت کہا جاسکے۔اوراسی طرح صغائر (کا حال ہے) کبائر کی بہ نسبت۔پس بیان فرمایا آنحضرت ﷺ نے ان کے درمیان فرق نہایت مؤکد طور پر(یعنی نتائج کا تفاوت دکھلاکر) جیسے تندرستی اور بیماری (کا حال ہے) پس معمولی بیماریاں جیسے زکام اورتکان،جب وہ موازنہ کی جائیں (جسم میں) جگہ پکڑنے والے فسادمزاج کے ساتھ،جیسے جُذام (کوڑھ،فسادخون کی ایک بیماری) اورسل دق (ایک بیماری جس سے پھیپھڑوں میں زخم ہوجاتے ہیں،اورمنہ سے خون آنے لگتا ہے۔ٹی بی) اوراستسقاء(ایک بیماری جس سے پیٹ بڑھ جاتا ہےاور پیاس بہت لگتی ہے،جلندر کا روگ) توحکم لگایا جائے گا اُن (معمولی بیماریوں) پر

کہ وہ تندرستی ہیں۔ اور یہ کہ وہ ہلکی بیماریوں والا بیمار ہی نہیں ہے، اور یہ کہ نہیں ہے اسے کوئی سخت عارضہ اور کبھی ایک مصیبت دوسری مصیبت کو بھلا دیتی ہے، جیسے وہ شخص جسے کانٹا چبھا ہو، پھر آفت آن پڑے اس کے خاندان اور مال پر تو وہ کہتا ہے کہ نہیں پہنچی تھی مجھے کوئی مصیبت اس سے پہلے بالکل ہی۔

لغات: الأعراض البادية: معمولی بیماریاں...... نَصَب: تھکن...... المتمکن: جگہ پکڑنے والا...... قَلَبَة: وہ بیماری جس سے بیمار بچھونے پر تڑپے، کوئی سخت عارضہ۔ وَتَرَ: گھبرا دینا، ستانا، تکلیف پہنچانا وُتِر (مجہول) آفت کا آنا حادثہ پڑنا۔

☆　　☆　　☆

ابلیس کا پانی پر تخت بچھانا اور دربار لگانا حقیقت ہے

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بیشک ابلیس پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے، پھر وہ اپنے لشکروں کو بھیجتا ہے، جو لوگوں کو بہکاتے پھرتے ہیں۔ پس ان میں سے ابلیس سے مرتبہ میں قریب تر وہ ہے جو ان میں سب سے بڑا فتنہ انگیز ہے۔ ان میں سے ایک (ابلیس کے دربار میں) آتا ہے، پس کہتا ہے: ''میں نے یہ کیا اور یہ کیا'' (یعنی کسی کو زنا میں مبتلا کیا اور کسی کو چوری میں) پس ابلیس کہتا ہے: ''تو نے کچھ نہیں کیا!'' پھر ان میں سے ایک اور آتا ہے اور کہتا ہے: ''میں ایک شخص کے پیچھے پڑا رہا، تا آنکہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی کردی'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: پس ابلیس اس کو اپنے قریب کرتا ہے، اور کہتا ہے: ''تو بہت اچھا (پٹھا) ہے!'' اعمش راوی کہتے ہیں: میرا گمان یہ ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''پس وہ اس کو سینے سے لگاتا ہے'' (رواہ مسلم، مشکوۃ، حدیث نمبر ۷۱ باب الوسوسۃ)

تشریح: اللہ تعالیٰ نے شیاطین کی تخلیق ہی کچھ اس طرح فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔ جیسے کیڑے وہ کام کرتے رہتے ہیں جو ان کے مزاج کا تقاضا ہوتا ہے، جیسے گبریلا پاخانہ لڑھکا کر اپنے بل میں لے جاتا ہے۔ اور یہی اس کی فطرت ہے۔ اسی طرح شیاطین بھی اپنی فطرت کے تقاضے سے لوگوں کو بہکاتے رہتے ہیں۔

اور اللہ کا طریقہ مخلوقات کی ہر نوع اور ہر صنف میں یہ ہے کہ ان کا ایک سردار ہوتا ہے، جو اپنے ماتحتوں کو کام سپرد کرتا ہے، پھر ان کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیتا ہے۔ اور جو شاندار کام کرتا ہے اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ اسی طرح شیاطین کا سردار ابلیس ہے، جو شقاوت میں ٹاپ اور گمراہی میں طاق ہے، وہ پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے۔ کیونکہ تخلیق ارض وسماء کے وقت اللہ کا تخت پانی پر تھا۔ پس شیطان بھی پانی پر اپنا تخت بچھا کر اپنی خدائی کا تاثر دیتا ہے۔ اور وہ اپنے کارندوں کو اپنا پروگرام سپرد کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کس نے شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک سب سے شاندار کارنامہ میاں بیوی میں تفرق کرانا ہے۔ وہ اس حرکت کے کرنے والے کو گلے

لگا تا ہے اور شاباسی دیتا ہے۔

غرض اس حدیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بالکل حقیقت ہے، مجاز یا تمثیل (پیرایۂ بیان) ہرگز نہیں اور مجھے اس کا یقین ہے جیسا آنکھ سے دیکھی بھالی چیز کا ہوتا ہے۔

[٦] وقوله صلى الله عليه وسلم: إن أبليس يضَع عرشَه على الماء، ثم يَبْعث سَرَاياه يفتنون الناس" الحديثَ. اعلم أن الله تعالىٰ خلَق الشياطين وجبلَهم على الإغواء، بمنزلة الدود التي تفعلُ افعالاً بمقتضى مزاجها، كالجُعل يُدهدهُ الْخَرْأَةَ، وأن لهم رئيسا يضع عرشَه على الماء ويدعوهم لتكميل ما هم قِبَلَهُ، قد استوجب أتمَّ الشقاوة وأوفرَ الضلال؛ وهذه سنة الله في كل نوع وفي كل صِنفٍ، وليس في هذا مَجَازٌ. وقد تَحقَّقْتُ من ذلك مايكون بمنزلة الرؤية بالعَيْن.

ترجمہ: (٦) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "بیشک ابلیس پانی پر الخ" جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو پیدا فرمایا ہے اور ان کی تخلیق فرمائی ہے گمراہ کرنے پر، جیسے وہ کیڑے جو کرتے ہیں کچھ کام ان کے مزاج کے تقاضے سے، جیسے گبریلا لڑھکاتا ہے پاخانے کو۔

اور یہ (بات بھی جان لیں) کہ شیاطین کا ایک سردار ہے، جو پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے۔ اور بلاتا ہے وہ شیاطین کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے جو اس کا ہے۔ تحقیق واجب ولازم جانا ہے اس سردار نے اعلیٰ درجہ کی بدبختی کو اور کامل درجہ کی گمراہی کو۔ اور یہ اللہ کا طریقہ ہے ہر نوع میں اور ہر صنف میں اور نہیں ہے اس میں کچھ مجاز (بلکہ سراسر حقیقت ہے) اور تحقیق یقین کیا ہے میں نے اس سلسلہ میں وہ جو ہوتا ہے آنکھ سے دیکھنے جیسا۔

☆ ☆ ☆

شیطان کی وسوسہ اندازی

حدیث ——— حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ: کبھی میرے دل میں ایسے برے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں اُن کو زبان پر لاؤں! آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اللہ کا شکر ہے جس نے شیطان کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا" (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ، حدیث نمبر ۷۳)

حدیث ——— حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بیشک شیطان اس سے تو ناامید ہوگیا ہے کہ نمازی بندے جزیرۃ العرب میں اس کی عبادت کریں۔ البتہ وہ ایک کو دوسرے کے خلاف

بھڑکانے میں مشغول ہے'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۷۲)

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں ایسے برے خیالات اور وسوسے پاتے ہیں کہ ان کو زبان سے ادا کرنا بہت برا اور بہت بھاری معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: ''کیا واقعی تمہاری یہ حالت ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ہاں، یہی حال ہے، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''یہ تو خالص ایمان ہے!'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۶۴)

تشریح: شیطان کی وسوسہ اندازی، جس کے دل میں وہ وسوسہ ڈالتا ہے، اس کی استعداد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ سب سے خطرناک اثر اندازی یہ ہے کہ آدمی کفر میں مبتلا ہو جائے اور ملت سے نکل جائے۔ اگر اس سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں ——— ایمان قوی ہونے کی وجہ سے ——— تو پھر اس کی وسوسہ اندازی دوسری صورت اختیار کرتی ہے۔ وہ آپس میں خونریزی کراتا ہے، گھریلو زندگی بگاڑتا ہے اور اہل خانہ اور اہل بستی کے درمیان آگ بھڑکاتا ہے۔ اور اس سے بھی اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں تو پھر شیطان کے وسوسے خیالات کی شکل اختیار کرتے ہیں، جو آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ وساوس اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ وہ نفس کو کسی عمل پر نہیں ابھارتے۔ یہ وساوس ضرر رساں نہیں ہیں۔ اور اگر یہ خیالات ان کی برائی کے اعتقاد کے ساتھ مقارن ہوں تو پھر وہ واضح ایمان کی دلیل ہیں۔

پہلی اور تیسری حدیث میں آپ ﷺ نے یہی جواب دیا ہے کہ یہ فکر مند ہونے کی بات نہیں ہے، کیونکہ ان خیالات کو آدمی برا سمجھ رہا ہے۔ پس وہ واضح ایمان کی دلیل ہیں۔ بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہئے کہ اس کی دستگیری نے بات وسوسہ کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دی۔ اور دوسری حدیث میں شیطان کی وسوسہ اندازی کی دوسری صورت کا بیان ہے۔

ہاں جو نفوس قدسیہ ہیں ان کو اس قسم کی کوئی بات پیش نہیں آتی۔ درج ذیل حدیث میں اسی کا بیان ہے:

حدیث ——— حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی نہیں، مگر اس کے ساتھ مسلط کیا گیا ہے اس کا ایک ساتھی جنات میں سے، اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے'' صحابہ نے دریافت کیا: اور آپؐ کے ساتھ بھی، یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا: ''میرے ساتھ بھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی ہے، پس میں محفوظ رہتا ہوں، پس وہ مجھے بھلائی ہی کا حکم دیتا ہے'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۶۷)

اور شیطان کے وساوس کی تاثیرات کا حال آفتاب کی شعاعوں کی تاثیرات جیسا ہے۔ لوہے اور دیگر دھاتوں پر ان کا اثر سب سے زیادہ پڑتا ہے۔ پھر صیقل شدہ یعنی مانجھے ہوئے اجسام پر جو زنگ اور میل سے صاف ہوتے ہیں اول سے کم

اثر پڑتا ہے پھر درجہ بہ درجہ اجسام ان شعاعوں کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ حتی کہ سنگ سفید کی ایک قسم تو ایسی بھی ہے جو مطلق ان شعاعوں کا اثر قبول نہیں کرتی۔ وہ چل چلاتی دھوپ میں بھی ٹھنڈا محسوس ہوتا ہے۔ یہ نفوس قدسیہ کی مثال ہے۔

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم: " الحمد لله الذى رَدَّ أمره إلى الوسوسة"، وقوله صلى الله عليه وسلم: " إن الشيطانَ قد أيِسَ من أن يَّعْبُدَه المصَلُّون فى جزيرة العرب، ولكن فى التَّحريش بينهم" وقوله صلى الله عليه وسلم: " ذاك صريحُ الإيمان"

اعلم أن تأثير وسوسة الشياطين يكون مختلِفا، بحسب استعداد المُوَسْوَسِ إليه: فأعظمُ تأثيرِهِ الكفرُ والخروجُ من الملة؛ فإذا عَصَمَ اللّٰهُ من ذلك بقوة اليقين انْقَلَبَ تأثيرُه فى صورة أخرى، وهى المقاتَلاتُ، وفسادُ تدبير المنزل، والتحريش بين أهل البيت وأهل المدينة؛ ثم إذا عَصَمَ اللّٰه من ذلك أيضًا صار خاطرًا يجيئ ويذهب، ولايبعثُ النفسَ إلى عملٍ، لضعفِ أثره؛ وهذا لايضرُّ، بل إذا اقترن باعتقاد قبحِ ذلك كان دليلاً على صراحة الإيمان.

نعم أصحابُ النفوس القدسية لايجدون شيئًا من ذلك، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " إلاَّ إنَّ اللّٰه أعانني عليه فَأَسْلَمُ، فلايامرني إلا بخير"

وإنما مَثَلُ هذه التأثيرات مَثَل شعاعِ الشمس، يؤثر فى الحديد والأجسام الصقيلة مالايؤثر فى غيرها، ثم وثم.

ترجمہ: (۷) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''تمام ستائشیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے شیطان کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا'' اور آپ کا ارشاد: ''بیشک شیطان یقیناً ناامید ہوگیا ہے اس بات سے کہ نمازی بندے اس کی عبادت کریں جزیرۃ العرب میں، البتہ (مشغول ہے وہ) ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے میں'' اور آپ کا ارشاد: ''یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے''

جان لیں کہ شیاطین کے وسوسہ کی تاثیر مختلف ہوتی ہے اس شخص کی استعداد کے اعتبار سے جس کی طرف وسوسہ ڈالا گیا ہے۔ پس اس کی بڑی اثر اندازی کفر اور ملت سے نکلنا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ بچالیتے ہیں اُس سے، یقین کی قوت کی وجہ سے تو پلٹ جاتی ہے اس کی اثر اندازی دوسری صورت میں۔ اور وہ باہم کشت وخوں اور گھریلو زندگی کو بگاڑنا اور اہل خانہ اور اہل بستی کے درمیان آگ بھڑکانا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ بچالیتے ہیں اس سے بھی تو ہوجاتا ہے وسوسہ دل کے ایسے خیالات جو آتے ہیں اور جاتے ہیں، اور نہیں ابھارتے وہ نفس کو کسی عمل کی طرف، اس کے اثر کے کمزور ہونے کی وجہ سے۔ اور یہ خیالات ضرر رساں نہیں ہیں۔ بلکہ جب وہ ملے ہوئے ہوں اس کی برائی کے اعتقاد کے ساتھ تو وہ کھلے ایمان کی دلیل ہوتے ہیں۔

ہاں نفوسِ قدسیہ والے اس میں سے کچھ بھی نہیں پاتے، اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''مگر بیشک اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی ہے، پس میں محفوظ رہتا ہوں۔ پس نہیں حکم دیتا وہ مجھ کو مگر بھلائی کا''

اور ان تاثیرات کا حال آفتاب کی شعاعوں کی تاثیرات جیسا ہی ہے۔ اثر انداز ہوتی ہیں وہ لوہے میں اور صیقل شدہ اجسام میں، وہ جو نہیں اثر ڈالتیں وہ ان کے علاوہ میں، پھر اور پھر۔

فائدہ: جزیرۃ العرب کی تخصیص اس لئے فرمائی ہے کہ اس ارشاد کے وقت اسلام جزیرۃ العرب کے اندر محدود تھا۔ بعد میں اسلام چار دانگ عالم پھیل گیا۔ اب مسلمان خواہ کہیں ہو وہ غیر اللہ کی عبادت نہیں کرسکتا، بشرطیکہ وہ نمازی اور دین دار ہو۔

لغات: مُوَسْوَس: اسم مفعول: وسوسہ ڈالا ہوا إلیہ: اس کا ظرف ہے..... صَرِیح: صیغہ صفت: صاف، واضح، خالص صَرَاحة: مصدر، باب کرم سے صاف ہونا، خالص ہونا، واضح ہونا اور باب فتح سے: ظاہر کرنا، واضح کرنا..... صَقَلَ (ن) صَقْلاً الشیئَ: صاف کرنا، چکنا کرنا، زنگ دور کرنا الأجسام الصقیلة: تمام دھاتیں جن پر پالش کی جاتی ہے۔

تصحیح: دوسری حدیث میں **یعبده المصلّون** اصل میں اور تینوں مخطوطوں میں **یعبده المسلمون** تھا۔ مگر یہ سبقتِ قلم ہے تصحیح مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف سے کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

شیطانی وساوس اور فرشتوں کے الہام کی صورتیں

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بیشک شیطان کے لئے انسان سے ایک نزدیکی ہے، اور فرشتے کے لئے بھی ایک نزدیکی ہے (یعنی شیطان انسان سے نزدیک ہو کر وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور فرشتہ بھی اترتا ہے اور خیر کا الہام کرتا ہے) پس رہی شیطان کی قربت تو وہ برائی کا وعدہ کرنا ہے اور دین حق کو جھٹلانا ہے۔ اور رہی فرشتہ کی قربت تو وہ خیر کا وعدہ کرنا ہے، اور دین حق کی تصدیق کرنا ہے۔ پس جو شخص اس کو پائے، پس وہ جان لے کہ یہ بات اللہ کی طرف سے ہے، پس چاہئے کہ وہ اللہ کی تعریف کرے۔ اور جو پائے دوسری صورت، پس چاہئے کہ وہ پناہ مانگے اللہ کی مردود شیطان سے۔ پھر آپ نے سورۃ البقرہ کی آیت ۲۶۸ تلاوت فرمائی کہ: ''شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات کا مشورہ دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتے ہیں اپنی طرف سے بخشش کا اور مزید دینے کا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والے، خوب جاننے والے ہیں''[1]

---

[1] رواہ الترمذی ۲: ۱۲۳ کتاب التفسیر وقال: ہٰذا حدیث حسن صحیح غریب مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۷۴ ونقل عن الترمذی أنه قال: هذا حديث غريب، فلعل نسخ السنن مختلفة ۱۲

حدیث شریف کا خلاصہ: یہ ہے کہ ملائکہ کی اثر اندازی کی صورتیں یہ بنتی ہیں کہ آدمی کے دل میں نیک کاموں سے انس ومحبت اور رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اور شیاطین کی اثر اندازی سے نیک کاموں سے وحشت ونفرت پیدا ہوتی ہے، دل بے چین ہوتا ہے اور آدمی میں برے کاموں کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔

تشریح: رسول اللہ ﷺ نے یہ مضمون آیت پاک سے اخذ فرمایا ہے۔ آیت کریمہ انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے ذیل میں آئی ہے۔ ارشاد پاک ہے کہ شیطان تم کو محتاجگی سے ڈراتا ہے کہ اگر راہ خدا میں خرچ کرو گے تو محتاج ہو جاؤ گے، اور بے حیائی کے کاموں کا حکم دیتا ہے۔ عیش میں، رنگ رلیوں میں خرچ کرنے کا خوب مشورہ دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں کہ اگر تم راہ خدا میں خرچ کرو گے تو تم کو مغفرت نصیب ہوگی۔ اور وہ زیادہ دینے کا بھی وعدہ فرماتے ہیں یعنی وہ تم کو بے حد وحساب فضل واحسان سے نہال کر دیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ وسعت والے، خوب جاننے والے ہیں۔ ان کے یہاں کمی کس بات کی ہے اور وہ جانتے بھی ہیں کہ کون عطا کا مستحق ہے۔

یہ آیت پاک اگرچہ انفاق فی سبیل اللہ کے تعلق سے وارد ہوئی ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے مذکورہ ارشاد سے واضح ہوا کہ یہ آیت اسی موقع کے لئے خاص نہیں ہے، بلکہ ہر معاملہ کو عام ہے۔ پس اگر دل میں کسی بھی نیک کام کا خیال پیدا ہو تو جان لے کہ یہ مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف سے، فرشتہ کے ذریعہ الہام کیا گیا ہے۔ پس خدا کا شکر بجالائے اور پہلی فرصت میں وہ نیک کام کر ڈالے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خیال بدل جائے۔ اور اگر کسی کے دل میں کسی برائی کا خیال آئے تو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے آیا ہے۔ یہ نہ سوچے کہ شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی۔ شیطان ایک حقیقت واقعیہ ہے۔ پس اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ اللہ ضرور اس کی حفاظت فرمائیں گے۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن للشيطان لَمَّةً، وللملَكِ لَمَّةً" الحديث.

الحاصل: أن صورةَ تأثير الملائكة في نَشْأةِ الخواطر الأُنْسُ والرغبةُ في الخير، وتأثيرِ الشياطين فيها الوحشةُ وقَلَقُ الخاطر والرغبةُ في الشر.

ترجمہ: (۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "بیشک شیطان کے لئے ایک نزدیکی ہے، اور فرشتہ کے لئے بھی ایک نزدیکی ہے" آخر حدیث تک۔

ماحصل: یہ ہے کہ فرشتوں کی اثر اندازی کی صورت خیالات کے پیدا ہونے میں (نیک کاموں سے) اُنس اور خیر کی رغبت ہے۔ اور شیاطین کی اثر اندازی خیالات (کے پیدا ہونے) میں (نیک کاموں سے) وحشت (ونفرت) دل کی بے چینی اور برے کاموں کی رغبت ہے۔

لغات: اللَّمَّة: لَمَّ کا اسم مرّۃ: اثر، نزول، قربت لَمَّ بفلانٍ: کسی کے پاس آ کر نازل ہونا...... نَشَأَ (ف) نَشْأَة: نیا پیدا

ہونا..... الخواطر جمع ہے الخاطِر کی: خیال، وہ امر یا تدبیر جو دل میں گزرے۔ خَطر (ن،ض) خُطورًا الأمرُ له: سوجھنا۔

☆ ☆ ☆

شیطانی وساوس اور پریشان خوابوں کا علاج

حدیث ــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لوگوں میں سوال وجواب کا سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ سوال کیا جائے گا: اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا، پس اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ پس جو شخص اس قسم کا وسوسہ پائے تو چاہئے کہ کہے: ''ایمان لایا میں اللہ پر اور اس کے رسول پر'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۶۶)

حدیث ــــ احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص پریشان کن خواب دیکھے تو اللہ کی پناہ طلب کرے، اور بائیں جانب تین بار تھتکار دے[1]۔

تشریح: ان حدیثوں میں شیطانی وساوس کا اور پریشان کن خوابوں کا ــــ کہ وہ بھی حقیقت میں وساوس ہیں ــــ جو علاج تجویز کیا گیا ہے اس میں راز یہ ہے کہ شیطان کی وسوسہ اندازی کے وقت اللہ کی پناہ لے لینا، اللہ کو فوراً یاد کرنا، شیطان کی حرکت پر تھوتھو کرنا اور اس کی تذلیل وتحقیر کرنا دل کے رُخ کو دوسری طرف پھیر دیتا ہے، اور قلب شیاطین کا اثر قبول کرنے سے رُک جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۲۰۱ میں ارشاد پاک ہے کہ:

''جو لوگ خدا ترس ہیں، جب ان کو کوئی خیال شیطان کی طرف سے آجاتا ہے، تو وہ (فوراً) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، پس یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''

> [۹] قوله صلى الله عليه وسلم: " من وَجَدَ من ذلك شيئًا فليقل: آمنتُ بالله ورسوله" وقوله صلى الله عليه وسلم: " فَلْيَسْتَعِذْ بالله، وليتفُل عن يساره"
>
> سِرُّه: أن الالتجاء إلى الله، وتذكُّرَهُ، وتقبيحَ حالِ الشياطين، وإهانةَ أمرهم: يَصْرِف وجهَ النفس عنهم، ويصدعن قبول أثرهم، وهو قوله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾

ترجمہ: (۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جو پائے اس قسم کا کچھ وسوسہ۔ پس چاہئے کہ وہ کہے: ''ایمان لایا میں اللہ پر اور اس کے رسول پر'' (یہ تجدید ایمان نہیں ہے، بلکہ اس وسوسہ کو دفع کرنے کا طریقہ ہے) اور آنحضرت ﷺ کا

---

[1] یہ روایتیں مشکوٰۃ شریف میں کتاب الرؤیا میں ہیں۔

ارشاد: ''پس چاہئے کہ پناہ طلب کرے اللہ کی اور چاہئے کہ بائیں جانب تھوک دے'' (یہ بھی پریشان خواب کے اثر کو زائل کرنے کا طریقہ بتایا ہے)

اس کا راز: یہ ہے کہ اللہ کی طرف پناہ لینا، اور اللہ کو یاد کرنا اور شیاطین کی حالت کی قباحت بیان کرنا اور ان کے معاملہ کی توہین کرنا، نفس کے رخ کو ان سے پھیر دیتا ہے۔ اور ان کے اثر کو قبول کرنے سے روک دیتا ہے، اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''یقیناً جو لوگ متقی ہیں، جب ان کو کوئی شیطانی خیال آجاتا ہے، تو وہ (اللہ کو) یاد کرتے ہیں۔ پس یکایک اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''

لغات: اِلْتِجَاء: مصدر ہے۔ اِلْتَجَا إلى كذا: پناہ لینا...... تَذَكَّرَ الشيئَ: یاد کرنا...... تقبیح: کسی کے عمل کے خلاف ناراضی کا اظہار کرنا۔

☆ ☆ ☆

آدم وموسیٰ علیہما السلام میں ایک مناظرہ

اور

اس واقعہ کا باطنی پہلو

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام میں ان کے رب کے پاس مناظرہ ہوا، تو آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آئے (وہ مناظرہ اس طرح ہوا تھا:)

موسیٰ علیہ السلام نے کہا ـــــ: آپ وہی آدم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے بنایا، اور آپ میں اپنی خاص روح پھونکی، اور آپ کے سامنے اپنے فرشتوں کو سجدہ ریز کیا، اور آپ کو اپنی (عیش بھری) جنت میں بسایا، پھر آپ نے اپنی چوک سے لوگوں کو زمین پر اتارا؟ (یعنی آپ نے بایں ہمہ منزلت یہ خطا کیوں کی؟ آپ پامردی سے کام لیتے اور شجر ممنوعہ نہ کھاتے تو آپ کی اولاد جنت میں عیش کرتی!)

آدم علیہ السلام نے کہا ـــــ: آپ وہی موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی پیام رسانی اور ہم کلامی کا شرف بخشا، اور آپ کو الواح تورات عنایت فرمائیں، جن میں ہر چیز کی وضاحت تھی۔ اور آپ کو نزدیک کر کے سرگوشی کی، آپ بتلائیں: اللہ نے تورات مجھے پیدا کرنے سے کتنا عرصہ پہلے لکھی تھی؟

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا ـــــ: چالیس سال پہلے۔

آدم علیہ السلام نے پوچھا ـــــ: کیا آپ نے تورات میں یہ بات نہیں پائی کہ: ''آدم سے اپنے رب کا قصور ہوگیا، پس وہ غلطی میں پڑ گیا؟''

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا ـــــ: ہاں (یہ بات تورات میں ہے)

آدم علیہ السلام نے فرمایا ـــــ: تو کیا آپ مجھے اس کام پر ملامت کرتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے لکھ دیا تھا کہ میں اسے کرونگا؟!

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ـــــ: پس آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آئے (اور موسیٰ علیہ السلام لاجواب ہوگئے[1])

تشریح: اس حدیث میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''ان کے رب کے پاس'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ وفات کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام کی روح بارگاہ خداوندی میں پہنچی، تو وہاں آپ کی حضرت آدم کی روح سے ملاقات ہوئی، اور آپس میں یہ سوال وجواب ہوئے، جیسے خواب میں کسی فرشتہ سے یا کسی نیک آدمی سے ملاقات ہوتی ہے اور باہم بات چیت ہوتی ہے۔ اور بارگاہ خداوندی میں ارواح کے سمٹنے کا مطلب مبحث دوم کے باب چہارم میں گذر چکا ہے[2]

دوسرا سوال: یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے نوشتۂ تقدیر کا سہارا لے کر الزام رفع فرمایا ہے۔ حالانکہ تقدیر کو بہانہ بنانا درست نہیں۔

جواب: یہ ہے کہ نوشتۂ تقدیر کوتاہی کا عذر تو نہیں بن سکتا، مگر اس کے ذریعہ الزام کو رفع کیا جاسکتا ہے۔ آدم علیہ السلام سے جب لغزش ہوئی تھی اور عتاب خداوندی نازل ہوا تھا، تو آپ نے فوراً توبہ کی تھی، تقدیر کا عذر پیش نہیں کیا تھا۔ مگر جب اس لغزش کو موسیٰ علیہ السلام نے انسانوں کی پریشانی کا باعث قرار دیا تو آپ نے اس لغزش کا یہ پہلو سامنے رکھا کہ یہ تو نوشتۂ تقدیر تھا، اس کے مطابق واقعات کو رونما ہونا ہی تھا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام لاجواب ہوگئے۔ اب یہ جواب شاہ صاحب رحمہ اللہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

اس واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ ایک علم منکشف کیا، بالکل اسی طرح جس طرح آدمی خواب میں کسی فرشتہ کو یا کسی نیک آدمی کو دیکھتا ہے، اور اس سے سوال کرتا ہے اور اس سے باتیں کرتا ہے۔ پھر جب آنکھ کھلتی ہے تو اس کو ایک ایسا علم حاصل ہو چکا ہوتا ہے، جو پہلے حاصل نہیں

---

[1] رواہ مسلم، مشکوٰۃ، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۸۱ بخاری میں بھی یہ حدیث اختصار کے ساتھ پانچ جگہ آئی ہے۔ سب سے پہلے کتاب الانبیاء، باب وفاۃ موسیٰ میں آئی ہے، حدیث نمبر ۳۴۰۹ نیز ابوداؤد میں بھی ہے، حدیث نمبر ۴۷۰۱ و ۴۷۰۲

[2] رحمۃ اللہ الواسعہ ۱:۴۰۵ وہاں یہ حدیث اجتمع کے لفظ سے آئی ہے، مگر روایات میں احتج آیا ہے۔

تھا۔اسی طرح اس واقعہ میں ایک بال سے باریک علم تھا، جوحضرت موسیٰ علیہ السلام پر مخفی تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اس واقعہ کی صورت میں منکشف کیا۔

اور وہ علم یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش میں دو پہلو ہیں:

ایک پہلو: وہ ہے جس کا تعلق خاص آدم علیہ السلام کی ذات سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب تک آپ نے شجرۂ ممنوعہ نہیں کھایا تھا، جنت کی ہمہ قسم کی نعمتیں اور راحتیں حاصل تھیں: نہ پیاس ستاتی تھی، نہ بھوک لگتی تھی۔ نہ برہنہ ہوتے تھے، نہ دھوپ لگتی تھی۔ یہی انسان کی بڑی ضرورتیں ہیں، جو سب وہاں پوری ہورہی تھیں۔ اس وقت آپ کی حالت بالکل فرشتوں جیسی تھی، جن کو کوئی کلفت پیش نہیں آتی۔ پھر جب آپ نے وہ درخت کھالیا تو صورت حال بدل گئی۔ ملکیت چھپ گئی اور بہیمیت نے سر ابھارا۔ پس اس پہلو سے درخت کا کھانا ایک ایسا گناہ تھا جس سے استغفار ضروری تھا۔ چنانچہ آپ نے استغفار کیا، اور خوب گڑگڑا کر توبہ کی، جو بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی۔

دوسرا پہلو: وہ ہے جس کا تعلق نظام عالم سے ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم سے پہلے ہی فرشتوں پر ظاہر کردیا تھا۔ جس کا تذکرہ سورۃ البقرہ آیت ۳۰ میں آیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تخلیق آدم کی غرض نوع انسانی کو زمین میں خلیفہ بنانا ہے یعنی ایک ایسی مخلوق وجود میں لانا منظور ہے جس میں خیر وشر کی صلاحیتیں مجتمع ہوں، جو گناہ کرے اور توبہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں، جس کو احکام شرعیہ کا مکلف بنایا جائے، ان میں رسولوں کو بھیجا جائے، ان کے اعمال پر جزاء وسزا مرتب ہو، اور جو ان میں باکمال ہوں وہ مختلف درجات پر فائز ہوں، اور جو گمراہ ہوں وہ بھی مختلف طبقات کے ہوں۔ اور یہ تخلیق آدم کا ایک مستقل اہم مقصد ہے۔ مسند احمد (۳۰۹:۲) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر تم گناہ نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ تم کو ہٹادیں، اور ایسی قوم لے آئیں جو گناہ کرے اور توبہ کرے، پس اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمائیں''

پس اس پہلو سے آدم علیہ السلام کا شجر ممنوعہ کھانا، اللہ کی مراد کے مطابق اور ان کی حکمت کے موافق تھا۔

اور جب آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو ابتداء آپ پر یہ دوسرا پہلو مخفی تھا۔ پہلا ہی پہلو پیش نظر تھا، چنانچہ آپ پر سخت عتاب نازل ہوا، پھر آپ کے غم کا مداوا کیا گیا، اور آپ پر معاملہ کا دوسرا پہلو کسی قدر روشن ہوا، تو ڈھارس بندھی۔ پھر جب آپ بارگاہ خداوندی میں منتقل ہوئے تو واقعہ کا دوسرا پہلو پوری طرح واضح ہوکر سامنے آیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا خیال بھی ابتداء میں وہی تھا جو شروع میں آدم علیہ السلام کا تھا، مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر آدم علیہ السلام کے ذریعہ معاملہ کا دوسرا پہلو واضح کیا، تو وہ خاموش ہوگئے، اور بات ان کی سمجھ میں آگئی۔

اور پہلے مبحث دوم کے باب رابع میں یہ بات تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے کہ خارج میں پیش آنے والے

واقعات کی بھی ویسی ہی تعبیر ہوتی ہے جیسی خواب کی تعبیر ہوتی ہے۔ پس آدم علیہ السلام کے واقعہ کی پہلی جہت ایک خارجی واقعہ ہے، اور دوسری جہت اس واقعہ کی تعبیر ہے۔

نیز پہلے یہ بات بھی ذکر کی جاچکی ہے کہ شریعت کے اوامر ونواہی اٹکل پچو کے تیر نہیں ہوتے بلکہ دونوں کے لئے ایک استعداد ہوتی ہے جوان کو واجب کرتی ہے۔ شجرۂ ممنوعہ کا کھانا اگرچہ مقدر تھا، تاہم آدم علیہ السلام کو اس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا کیونکہ ان میں جو تکلیف شرعی کی صلاحیت ودیعت کی گئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ ان کو ایسا حکم دیا جائے۔

مثال سے مزید وضاحت: ایک ذہین طالب علم کا کسی معمولی بات پر ایک مدرسہ سے اخراج ہوگیا تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس نے داخلہ کی بحالی کے لئے ہر ممکن تدبیر کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ مجبور ہوکر اس نے ایک بڑے ادارہ میں داخلہ لیا، وہاں محنت سے پڑھا اور اول نمبر سے کامیاب ہوا، پھر وہ وہاں مدرس رکھ لیا گیا اور رفتہ رفتہ شیخ الحدیث بن گیا۔ اس واقعہ میں غور کریں: اگر اس طالب علم سے وہ معمولی کوتاہی نہ ہوتی، اور اس چھوٹے ادارہ سے اس کا اخراج نہ ہوتا، تو اس بڑے ادارہ میں اس کو شیخ الحدیث کا مرتبہ کہاں نصیب ہوتا! مگر جس وقت اس کا اخراج ہوتا ہے، یہ انجام اس کو معلوم نہیں ہوتا، اس لئے اس کو افسوس ہوتا ہے۔ مگر جب اس کا اچھا انجام سامنے آتا ہے تو وہ اس اخراج کو نعمت عظمی سمجھتا ہے۔

[١٠] وقوله صلى الله عليه وسلم: " احْتَجَّ آدمُ وموسى عند ربهما"

أقول: معنى قوله: " عند ربهما": أن روحَ موسى عليه السلام انْجَذَبَتْ إلى حظيرة القدس، فوَافَتْ هنالك آدم.

وبطن هذه الواقعة وسِرُّها: أن الله فتح على موسى علمًا على لسان آدم عليهما السلام شِبْهَ مايرى النائم في منامه ملَكًا، أو رجلاً من الصالحين، يسأله ويُراجعه الكلام، حتى يفيئ عنه بعلم لم يكن عنده.

وههنا عِلْم دقيق كان قد خفي على موسىٰ عليه السلام، حتى كشفه الله عليه في هذه الواقعة، وهو: أنه اجتمع في قصة آدم عليه السلام وجهان:

أحدهما: مما يَلِيْ خُوَيْصَة نفس آدم عليه السلام؛ وهو: أنه كان مالم يأكل الشجرة لا يَظْمَأُ ولايَضْحى، ولايجوع ولا يَعْرىٰ، وكان بمنزلة الملائكة، فلما أكل غلبت البهيمية، وكمنت الملكية، فلا جرم أن أكل الشجرة إثم يجب الاستغفار عنه.

وثانيهما: ممايَلِي التدبير الكليَّ الذى قصده الله تعالى في خلق العالم، وأوحاه إلى الملائكة قبلَ أن يَخْلُقَ آدم؛ وهو: أن الله تعالى أراد بخلقه: أن يكون نوعُ الإنسان خليفةً في الأرض يُذْنِبُ ويستغفر، فيغفر له، ويتحقق فيهم التكليف، وبعثُ الرسل، والثواب والعذاب،

ومراتب الكمال والضلال؛ وهذه نشأة عظيمة على حِدَتها.

وكان أكل الشجرة حسب مراد الحق، ووفقَ حكمته، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "لو لم تُذنبوا لذهب الله بكم، وجاء بقوم آخرين، يُذنبون ويستغفرون، فيغفرلهم"

وكان آدم أولَ ما غلبت عليه بهيميته استَتَرَ عليه العلم الثاني، وأحاط به الوجه الأول، وعوتب عتابا شديدًا في نفسه، ثم سُرِّيَ عنه، ولمع عليه بارق من العلم الثاني، ثم لما انتقل إلى حظيرة القدس علم الحالَ أصرحَ مايكون، وكان موسىٰ عليه السلام يظنّ ماكان يظن آدم عليه السلام، حتى فتح الله عليه العلمَ الثاني.

وقد ذكرنا: أن الوقائع الخارجية يكون لها تعبير كتعبير المنام، وأن الأمر والنهي لايكونان جُزَافا، بل لهما استعداد يوجبهما.

ترجمہ: (۱۰) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''آدم وموسیٰ علیہما السلام کے درمیان ان کے رب کے پاس مناظرہ ہوا''

میں کہتا ہوں: آنحضرت ﷺ کے ارشاد: ''ان کے رب کے پاس'' کے معنی یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی روح کھنچ گئی مقدس بارگاہ کی طرف، اور وہاں وہ آدم علیہ السلام سے ملی۔

اور اس واقعہ کا باطن اور اس کا راز: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر آدم علیہ السلام کے ذریعہ ایک علم کھولا، ایسے جیسے سونے والا خواب میں کسی فرشتہ یا کسی نیک آدمی کو دیکھتا ہے۔ وہ اس سے دریافت کرتا ہے اور اس سے باتیں کرتا ہے۔ یہاں تک کہ لوٹتا ہے وہ اس سے ایک ایسے علم کے ساتھ جو اس کو حاصل نہیں تھا۔

اور یہاں ایک باریک علم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مخفی تھا یہاں تک کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اس واقعہ میں کھولا۔ اور وہ علم یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے واقعہ میں دو جہتیں ہیں:

ان میں سے ایک جہت: وہ ہے جو متصل ہے آدم علیہ السلام کی خاص ذات سے، اور وہ یہ ہے کہ آپ نے جب تک نہیں کھایا تھا درخت تو نہ آپ کو پیاس لگتی تھی اور نہ دھوپ، اور نہ آپ کو بھوک لگتی تھی اور نہ آپ برہنہ ہوتے تھے۔ اور آپ فرشتوں جیسے تھے۔ پھر جب درخت کھایا تو غالب آگئی بہیمیت اور چھپ گئی ملکیت۔ پس یقیناً درخت کا کھانا ایک ایسا گناہ ہے جس سے استغفار واجب ہے۔

اور ان میں سے دوسری جہت: وہ ہے جو متصل ہے اس کلی انتظام سے جس کا اللہ تعالیٰ نے قصد فرمایا ہے تخلیق عالم سے، اور جس کی وحی فرمائی ہے فرشتوں کی طرف آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے سے پہلے۔ اور وہ (تدبیر کلی) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے سے کہ نوع انسانی زمین میں نائب ہو، گناہ کرے اور توبہ کرے، پس اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائیں اور متحقق ہو ان میں مکلف ہونا۔ اور رسولوں کا بھیجنا، اور ثواب وعذاب اور کمال وضلال کے

مراتب۔اور یہ (تخلیق آدم کا) مستقل ایک بڑا مقصد ہے۔

اور (آدم علیہ السلام کا) درخت کو کھانا اللہ کی مراد کے مطابق اور ان کی حکمت کے موافق تھا، اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو ختم کردیں، اور لائیں ایک دوسری قوم جو گناہ کرے اور توبہ کرے، پس اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائیں''

اور آدم علیہ السلام پر ابتداءً جب بہیمیت غالب آئی، اس وقت ان پر دوسرا علم مخفی تھا، اور ان کو پہلی جہت نے گھیر رکھا تھا، اور وہ اپنے معاملہ میں سخت سرزنش کئے گئے پھر ان کے دل سے غم دور کیا گیا اور ان پر علم ثانی کی بجلی چمکی۔ پھر جب وہ منتقل ہوگئے بارگاہ مقدس کی طرف تو انھوں نے صورت حال کو جانا زیادہ سے زیادہ واضح طور پر جاننا جو ممکن تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام خیال کرتے تھے وہ جو آدم علیہ السلام خیال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے دوسرا علم کھولا۔

اور ہم ذکر کرچکے ہیں کہ خارجی واقعات کے لئے بھی ویسی ہی تعبیر ہوتی ہے جیسی خواب کے لئے تعبیر ہوتی ہیں اور یہ کہ امرونہی اٹکل پچو نہیں ہوتے بلکہ دونوں کے لئے ایک استعداد ہوتی ہے جو ان کو واجب کرتی ہے۔

لغات: اِنْجَذَبَ: کھنچ جانا ...... وَافَی الرجل: کسی کے پاس اچانک آنا، ملنا ...... فَاءَ یفیئ فیئًا به: کوئی چیز لے کر لوٹنا ...... خُوَیْصَّة: مخصوص ...... نَشْأة: (مصدر) نو پید ہونا، زندہ ہونا۔ یہاں بمعنی نیا مقصد آیا ہے ...... سُرِّیَ عنه: غم یا غصہ کا زائل ہونا۔

☆　☆　☆

ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر ماحول اس کو بگاڑ دیتا ہے

حدیث ــــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہر بچہ فطرتِ اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں، جیسے چوپایہ صحیح وسالم جنا جاتا ہے، کیا تم ان میں کوئی کان کٹا دیکھتے ہو؟!''[1]

تشریح: جاننا چاہئے کہ سنت الٰہی اس طرح چل رہی ہے کہ حیوانات اور نباتات وغیرہ کی ہر نوع کی ایک مخصوص شکل ہے، مثلاً انسان کھلی کھال والا، سیدھے قد والا، چوڑے ناخن والا، ناطق وضاحک ہے۔ اور انہی خصوصیات سے پہچان لیا جاتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ البتہ اگر کسی نادر فرد میں خرقِ عادت ہوجائے، جیسے بعض بچے سونڈ یا کھر والے پیدا ہوتے ہیں، تو وہ دوسری بات ہے۔

اسی طرح اللہ کی سنت یہ بھی چل رہی ہے کہ ہر نوع میں علم وادراک کا ایک مخصوص حصہ ہوتا ہے۔ جو اس نوع کے

[1] متفق علیہ، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۹۰ باب الایمان بالقدر ۱۲

ساتھ خاص ہوتا ہے۔ دوسری انواع میں وہ نہیں پایا جاتا، اور اس نوع کے تمام افراد میں وہ حصہ پایا جاتا ہے۔ جیسے شہد کی مکھیوں کو یہ ادراک عطا فرمایا گیا ہے کہ وہ ان درختوں کو پہچان لیتی ہیں جو ان کے مناسب ہیں، وہ ہر درخت کا رس نہیں چوستیں۔ پھر مُہال بنانا اور اس میں شہد جمع کرنے کا طریقہ ان کو سکھلا دیا گیا ہے۔ اسی طرح کبوتر کو گٹکری نکالنا، آشیانہ بنانا اور اپنے چوزوں کو چگانے کا علم دیدیا گیا ہے۔

اسی سنت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک زائد ادراک کے ساتھ اور وافر عقل کے ساتھ خاص کیا ہے، اور اس کی فطرت میں خالق کی پہچان، اس کی بندگی کا جذبہ اور معاشی تدبیرات نافعہ کا علم نہاں رکھا ہے۔ اور اسی کا نام فطرت ہے۔ پس اگر کوئی مانع پیش نہ آئے تو بچہ اسی فطرت پر بڑا ہوگا۔ مگر کبھی عوارض پیش آتے ہیں۔ بچہ جن ہاتھوں میں اور جس ماحول میں پلتا بڑھتا ہے وہ ماحول اس کو خراب کر دیتا ہے اس وقت وہ فطری علم جہالت سے تبدیل ہو جاتا ہے جیسے گرجاؤں کے گوشہ نشین اور سنیاسی مختلف تدبیروں سے جنسی شہوت اور بھوک کی خواہش ختم کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں انسان کی فطرت میں شامل ہیں۔

فائدہ: بکریوں وغیرہ کی پہچان کے لئے ان کے کان کاٹے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کاٹتے ہیں۔ کوئی چوپایہ کان کٹا پیدا نہیں ہوتا۔ ہر جانور صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے۔ یہ مثال دیکر آنحضرت ﷺ نے سمجھایا کہ اسی طرح ہر انسانی بچہ فطرت اسلام پر جنا جاتا ہے، بعد میں اس کو گمراہ کر دیا جاتا ہے۔

[١١] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "كُلُّ مولودٍ يولد على الفطرة، ثم أبواه يُهَوِّدَانِهِ، أو يُنَصِّرَانِهِ، أويُمَجِّسَانِهِ، كما تُنْتَجُ البهيمةُ بهيمةً جَمْعَاءَ، هل تُحِسُّوْن فيها من جَدْعَاءَ؟!"

أقول: اعلم أن الله تعالى أجرى سُنَّتَه بأن يخلق كلَّ نوع من الحيوانات والنباتات وغيرهما على شكل خاصٍّ به: فَخَصَّ الإنسانَ — مثلاً — بكونه باديَ الْبَشَرَةِ، مستوِيَ القامة، عريضَ الأظفار، ناطقًا، ضاحكًا؛ وبتلك الخواص يُعرف أنه إنسان؛ اللّهم إلا أن تُخْرَقَ العادةُ في فرد نادر، كما ترى أن بعض المولودات يكون له خُرطوم أو حافر.

فكذلك أجرى سنّتَه أن يخلق في كل نوع قسطًا من العلم والإدراك، محدودًا بحدِّه، مخصوصا به، لايوجد في غيره، مُطَّرِدًا في أفراده:

فَخَصَّ النحل بإدراك الأشجار المناسبة لها، ثم اتِّخاذِ الأكنان وجمعِ العسل فيها، فلن ترى فردًا من أفراد النحل إلا وهو يُدرك ذلك: فَخَصَّ الحَمَام بأنه كيف يَهْدِرُ؟ وكيف يُعَشِّشُ؟ وكيف يَزُقُّ فِرَاخَه؟

وكذلك خَصَّ الله تعالى الإنسان بإدراك زائد، وعقلٍ مستوفىً، ودَسَّ فيه معرفة

بارئه، والعبادةَ له، وأنواعَ ما يرتفقون به في معاشهم، وهو الفطرة، فلو أنهم لم يمنعهم مانع لَكَبُرُوْا عليها، لكنه قد تعترض العوارضُ، كإضلال الأبوين، فينقلب العلم جهلاً، كمثل الرُّهبان يتمسكون بأنواع الْحِيَلِ، فيقطعون شهوة النساء والجوع، مع أنهما مدسوسان في فطرة الإنسان.

ترجمہ: (۱۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر بچہ فطرتِ اسلامی پر جنا جاتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں، جس طرح چوپایہ جنا جاتا ہے صحیح وسالم، کیا تم ان میں سے کسی کو ناک کان کٹا ہوا دیکھتے ہو؟''

میں کہتا ہوں: جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا طریقہ اس طرح چلایا ہے کہ حیوانات اور نباتات وغیرہ کی ہر نوع کو پیدا کریں ایک ایسی شکل پر جو اس کے ساتھ خاص ہو۔ چنانچہ خاص کیا انسان کو ــــ مثال کے طور پر ــــ کھلی کھال والا، سیدھے قد والا، چوڑے ناخن والا، بولنے والا اور ہنسنے والا ہونے کے ساتھ۔ اور انہی خصوصیات سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ اے اللہ! مگر یہ کہ کسی نادر فرد میں عادت الٰہی خرق ہوجائے، جیسا کہ آپ بعض بچوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کی سونڈ یا کھر ہوتا ہے۔

پس اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت جاری کی ہے کہ ہر نوع میں علم وادراک کا ایک ایسا حصہ پیدا کریں جو ایک حد کے ساتھ محدود ہو (یعنی اس کی مقدار متعین ہو) جو اس کے ساتھ مخصوص ہو، وہ نہ پایا جائے اس کے علاوہ میں، عام ہو وہ اس کے تمام افراد میں:

چنانچہ خاص کیا شہد کی مکھی کو ان درختوں کے ادراک کے ساتھ جو ان کے مناسب ہیں، پھر چھتہ بنانے کے ساتھ، اور اس میں شہد جمع کرنے کے ساتھ۔ پس نہیں دیکھیں گے آپ شہد کی مکھیوں کے کسی فرد کو، مگر وہ اس کا ادراک رکھتا ہوگا۔ اسی طرح خاص کیا کبوتر کو اس بات کے ساتھ کہ وہ کس طرح گٹکری لے؟ اور کس طرح آشیانہ بنائے؟ اور کس طرح چوزوں کو چوگا دے؟

اور اسی طرح خاص کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک زائد ادراک کے ساتھ، اور وافر عقل کے ساتھ، اور چھپادی اس میں اپنے خالق کی پہچان، اور اس کے لئے بندگی کرنا، اور ان تدبیرات نافعہ کی انواع جن کے ذریعہ وہ فائدہ اٹھائیں اپنی معیشت میں، اور اسی کا نام فطرت ہے۔ پس اگر بچوں کو نہ روکے کوئی مانع تو وہ اس فطرت پر بڑے ہوں گے۔ مگر کبھی عوارض پیش آتے ہیں، جیسے والدین کا گمراہ کرنا، تو یہ فطری علم جہالت سے تبدیل ہوجاتا ہے۔ جیسے تارک الدنیا عیسائی مختلف قسم کی تدبیریں اختیار کرتے ہیں، پس وہ ختم کرلیتے ہیں عورتوں کی اور بھوک کی خواہش کو، حالانکہ یہ دونوں چیزیں انسان کی فطرت میں چھپائی ہوئی ہیں۔

لغات: هَوَّدَ تَهْوِيْدًا: یہودی بنانا...... نَصَّرَہ: عیسائی بنانا...... مَجَّسَہ: آتش پرست بنانا...... نَتَجَتْ ولدًا: جننا نُتِجَ الولدُ: جنا جانا...... جَمْعَاء مؤنث اجمع...... أَحَسَّ الشيئَ: معلوم کرنا...... جَدْعَاء مؤنث اَجْدَع: ناک کان کٹا ہوا...... اَكْنَان: جمع كِنّ کی بمعنی منزل، گھر...... هَدَرَ الحمام: کبوتر کا کوکو کرنا۔ ٹکٹکری لینا، گلے میں آواز گھما کر گانا، کبوتر کا غٹرغوں کرنا...... عَشَّشَ الطائرُ: گھونسلا بنانا...... زَقَّ الطائر فَرْخه: چوزہ کو چوگا (غذا) دینا...... دَسَّ الشيئَ تحت التراب: دھنسانا، چھپانا۔

☆ ☆ ☆

نابالغ بچوں کے احکام

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو انصار کے کسی بچے کا جنازہ پڑھانے کے لئے بلایا گیا، تو میں نے کہا: یارسول اللہ! یہ بچہ قابل رشک ہے، جنت کی ایک چڑیا ہے، اس نے نہ تو کوئی برائی کی ہے اور نہ ہی اس کا زمانہ پایا ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: ''یا اس کے علاوہ، اے عائشہ! (یعنی یقین سے نہ کہو کہ بہشتی ہے) بیشک اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے جنت کے لائق لوگوں کو، پیدا کیا ہے ان کو جنت کے لئے درانحالیکہ وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے۔ اور پیدا کیا ہے دوزخ کے لائق لوگوں کو۔ پیدا کیا ہے ان کو دوزخ کے لئے درانحالیکہ وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے''[1]

فائدہ: یہ حدیث اطفال مسلمین کے بارے میں ہے، اس حدیث سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اطفال مسلمین کا بھی جنتی ہونا یقینی نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت ودوزخ میں داخل ہونا نیک وبد عمل پر موقوف نہیں، بلکہ تقدیر الٰہی سے اس کا تعلق ہے۔ جس کو بہشت کے لئے پیدا کیا ہے وہ بہشتی ہے، خواہ کچھ بھی عمل کرے۔ اور جسے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے وہ دوزخی ہے خواہ وہ کچھ بھی عمل کرے۔

حدیث ـــــ حضرت صَعْب بن جَثّامہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ ہمارے (فوجی) گھوڑے رات میں (جب شب خون مارتے ہیں تو) مشرکین کے بچوں کو (بھی) روند ڈالتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''وہ اپنے آباء سے ہیں'' (مسند احمد ۴: ۷۱)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں دریافت کیا گیا؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ جو کچھ کرنے والے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہیں''[2]

---

[1] رواہ مسلم، مشکوٰۃ، باب الایمان بالقدر، حدیث ۸۴

[2] متفق علیہ، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۹۳ یہ حدیث اس باب کی سب سے قوی حدیث ہے

حدیث ـــــ آنحضرت ﷺ نے اپنا ایک طویل خواب بیان فرمایا ہے جو بخاری شریف میں مروی ہے۔ اس میں ہے کہ: ''پھر ہم چلے، یہاں تک کہ ہم ایک سرسبز باغ میں پہنچے، اس میں ایک بڑا درخت تھا، اور اس کے تنے کے پاس ایک بڑے حضرت اور کچھ بچے تھے'' بعد میں ساتھ والے دو فرشتوں نے وضاحت کی کہ: '' وہ بڑے حضرت جن کو آپؐ نے درخت کے تنے کے پاس دیکھا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں، اور ان کے ارد گرد جو بچے ہیں وہ لوگوں کی اولاد ہیں''[1]

تشریح: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اولاد (نابالغ بچوں) کے احکام تفصیل سے بیان نہیں کئے۔ نہ روایات کا تعارض رفع کیا ہے۔ صرف پہلی تین حدیثوں کی مختصر شرح کی ہے جو درج ذیل ہے:

① ـــــ بچے فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتے ہیں، جیسا کہ ابھی گذرا، تاہم کچھ بچے اس طرح بھی پیدا ہوتے ہیں کہ وہ کسی عمل کے بغیر لعنت کے مستوجب ہوتے ہیں، جیسے وہ لڑکا جس کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کرڈالا تھا، کافر پیدا کیا گیا تھا۔ یعنی اس کی سرشت میں کفر و سرکشی تھی (پس کسی بچہ کے مؤمن کی اولاد ہونے سے جنتی ہونے کا جزم نہیں کرنا چاہئے۔ یہ پہلی حدیث کی شرح ہے)

② ـــــ حضرت صَعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو فرمایا گیا ہے کہ: ''وہ اپنے آباء سے ہیں'' یہ مشرکین کے بچوں کا دنیوی حکم ہے یعنی اگر بے خبری میں فوج کے ہاتھوں ان کا قتل ہو جائے تو وہ کوئی قابلِ مؤاخذہ بات نہیں (یہ دوسری حدیث کی شرح ہے)

③ ـــــ اور یہ جو آپؐ نے فرمایا کہ وہ جو کچھ کرنے والے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہیں، یہ مسئلہ میں توقف پر دال ہے۔ اور احکام شرعیہ میں توقف کی وجہ صرف یہی نہیں ہوتی کہ اس کے بارے میں وحی نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ توقف کی اور بھی وجوہ ہوتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) ـــــ کسی حکم کا کوئی واضح قرینہ موجود نہیں ہوتا، اس لئے توقف کیا جاتا ہے۔

(۲) ـــــ کسی حکم کی وضاحت ضروری نہیں ہوتی، اس لئے بات مبہم رکھی جاتی ہے۔

(۳) ـــــ کوئی حکم دقیق ہوتا ہے، مخاطبین میں اس کے فہم کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس لئے توقف کیا جاتا ہے۔

یہ تیسری حدیث کی شرح ہوئی۔ اور چوتھی حدیث کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ اس میں سب بچوں کے جنتی ہونے کا اشارہ ہے۔

اطفال کا حکم:

ذراری کا حکم دو طرح کا ہے: دنیوی اور اخروی:

---

[1] مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۴۶۲۱ کتاب الرؤیا ۱۲

(۱) ــــ نابالغ بچوں کا دنیوی حکم یہ ہے کہ وہ خیر الابوین کے تابع ہوتے ہیں: اگر ماں باپ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک مسلمان ہو تو بچہ بھی مسلمان تصور کیا جائے گا۔ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور اس کی میراث مسلمان ورثاء کو ملے گی۔ اور اگر بچہ کے والدین غیر مسلم ہوں تو اس کو مسلمان تصور نہیں کیا جائے گا۔

(۲) ــــ اور نابالغ بچوں کا اُخروی حکم یہ ہے کہ جو بچہ نابالغ ہونے کی حالت میں مر گیا ہے، وہ اگر مسلمان کا بچہ ہے تو اس کے بارے میں تقریباً اتفاق ہے کہ وہ جنتی ہوگا۔ اور اطفال مشرکین کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ پانچ چھ قول ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

(الف) وہ دوزخی ہوں گے تبعاً لآبائہم۔ یہ مذہب بیّن البطلان ہے، کیونکہ سلف کا اجماع ہے کہ عمل بد کے بغیر عذاب نہیں ہوگا۔

(ب) وہ اعراف میں ہوں گے، وہاں ان کو نہ عذاب ہوگا، نہ راحت پہنچے گی۔ یہ قول بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ اعراف ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔

(ج) ان کا آخرت میں امتحان ہوگا جیسے اصحاب فترت اور پاگلوں کا امتحان ہوگا، جو کامیاب ہوں گے جنت میں جائیں گے اور جو ناکام ہوں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔ یہ قول بھی صحیح نہیں، کیونکہ آخرت دار جزاء ہے، دار تکلیف نہیں۔

(د) ایک رائے یہ ہے کہ وہ اہل جنت کے خدام ہوں گے۔ مگر اس قول کی مرفوع روایت سے کوئی دلیل نہیں اور قرآن کریم میں جو دو جگہ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُوْن آیا ہے وہ لڑکے جنت کی مخلوق ہوں گے۔

(ھ) اطفال مشرکین بھی جنتی ہوں گے۔ یہ امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کا قول ہے۔

(و) ایک رائے یہ ہے کہ اطفال مشرکین کے مسئلہ میں توقف کیا جائے۔ توقف کے دو معنی ہیں: ایک: کسی چیز کے بارے میں علم نہ ہونا یا حکم نہ لگا سکنا یعنی سکوت اختیار کرنا، دوسرے: کسی چیز پر کوئی کلی حکم نہ لگانا۔ اطفال کے مسئلہ میں توقف بالمعنی الثانی ہے یعنی ہم نہ سب کو ناجی کہتے ہیں، نہ ناری۔ کون ناجی ہوگا اور کون ناری؟ اس کی تعیین اللہ کے سپرد ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے اکابر کا مسلک یہی ہے، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی غالباً اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں حدیثیں مختلف وارد ہوئی ہیں۔ اور نسخ یعنی تقدیم و تاخیر کا کوئی قرینہ نہیں اور سند کے اعتبار سے قوی اللّٰہ أعلم بما کانوا عاملین کی روایت ہے، جو توقف پر دلالت کرتی ہے، پس یہی قول راجح ہے[1]

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں عمدۃ القاری شرح بخاری ۸: ۲۱۴ کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ فیض الباری ۲: ۴۹۳ شرح فقہ اکبر از بحر العلوم (فارسی) ص ۸۶ و ۸۷۔ اشرف التوضیح تقریر اردو مشکوۃ شریف از مولانا نذیر احمد صاحب ۱: ۲۴۱-۲۴۳

[۱۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "خَلَقَهم لها، وهم في أصلاب آبائهم" وقوله صلى الله عليه وسلم: " هم من آبائهم" وقوله صلى الله عليه وسلم: " الله أعلم بما كانوا عاملين" وقوله صلى الله عليه وسلم في منامه الطويل: " نَسَمُ ذريةِ بني آدم تكون عند إبراهيم عليه السلام"

اعلم أن الأكثر أن يولد الولد على الفطرة، كما مَرَّ، لكن قد يُخلَق بحيث يستوجب اللعن بلاعمل، كالذي قتله الخضر طُبع كافرًا. وأما" من آبائهم" فمحمولٌ على أحكام الدنيا. وليس أن التوقف في النواميس إنما يكون لعدم العلم، بل قد يكون لعدم انْضِبَاطِ الأحكام بمَظِنَّةٍ ظاهرة، أو لعدم الحاجة إلى بيانه، أو غموضٍ فيه، بحيث لا يفهمه المخاطَبون.

ترجمہ: (۱۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "پیدا کیا اللہ نے ان کو جہنم کے لئے درانحالیکہ وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے" اور آپ ﷺ کا ارشاد: "وہ اپنے آباء سے ہیں" اور آپ ﷺ کا ارشاد: "وہ جو کچھ کرتے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہیں" اور آپ ﷺ کا ارشاد ایک طویل خواب میں: "اولادِ آدم کی ذریت کی ارواح ابراہیم علیہ السلام کے پاس ہوتی ہیں"

جان لیں کہ (۱) اکثر یہی ہوتا ہے کہ بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ گزرا، لیکن کبھی پیدا کیا جاتا ہے بایں طور کہ وہ لعنت کو واجب ولازم جانتا ہے کسی بھی عمل کے بغیر، جیسے وہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا پیدا کیا گیا تھا کافر ہونے کی حالت میں۔

(۲) اور رہا ارشاد کہ: "وہ اپنے آباء سے ہیں" تو (یہ ارشاد) محمول ہے دنیوی احکام پر۔

(۳) اور نہیں ہے یہ بات کہ احکام شرعیہ میں توقف کرنا صرف علم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، بلکہ کبھی ہوتا ہے احکام منضبط نہ ہونے کی وجہ سے واضح مظنہ (احتمالی جگہ) کے ساتھ، یا ان کی وضاحت کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے، یا اس میں دقت کی وجہ سے، بایں طور کہ اس کو مخاطبین سمجھ نہ سکتے ہوں۔

لغات: طُبع أي خُلق...... الناموس: وحی، النوامیس: الأحكام الشرعية...... نَسَم جمع نسمة بمعنی الروح۔

☆　☆　☆

"اللہ کے ہاتھ میں ترازو" کا مطلب

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

"اللہ کا ہاتھ یعنی اس کا خزانہ بھرا ہوا ہے، کوئی خرچ کرنا اس کو ناقص نہیں کرتا۔ وہ رات دن نعمتیں لٹاتے ہیں، کیا نہیں

دیکھے تم کہ کس قدر خرچ کیا ہے جب سے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے، پھر بھی کوئی کمی نہیں آئی اس میں جو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور (تخلیق ارض وسماء کے وقت) ان کا تخت پانی پر تھا۔ انہی کے دست قدرت میں ترازو ہے: پست کرتے ہیں اور بلند کرتے ہیں'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۹۲)

تشریح: اس حدیث کے آخری حصہ میں انتظام خداوندی کی طرف اشارہ ہے، اور صفت تدبیر کی کارفرمائی کا بیان ہے۔ تدبیر الٰہی کا مدار خیر سے زیادہ ہم آہنگ کو ترجیح دینے پر ہے یعنی حکمت خداوندی اس سبب کو ترجیح دیتی ہے جو خیر کامل (مفاد عامہ) سے زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ پس جب کسی نئی پیدا ہونے والی بات کے سلسلہ میں متعارض اسباب اکٹھا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں جو انصاف کی ہوتی ہے۔ اور سورۃ الرحمان میں جو آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ہر آن کسی شان میں ہوتے ہیں'' کا بھی یہی مطلب ہے کہ بوقت تعارض اسباب اللہ تعالیٰ بعض اسباب کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں۔ تفصیل قسم اول کے مبحث اول کے باب اول و چہارم میں گزر چکی ہے۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے بیدہ المیزان کا جو مطلب بیان کیا ہے، سیاق حدیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ایک بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ صفت تدبیر کی جس کرشمہ سازی کا یہاں اور پہلے تذکرہ آیا ہے، وہ بات صحیح ہے اور سورۃ الرحمان کی آیت میں اسی کا تذکرہ ہے۔

بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ترازو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی پر روزی تنگ کرتے ہیں اور کسی پر فراخ۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ یہ مضمون آیا ہے کہ پروردگارِ عالم جس کو چاہتے ہیں زیادہ روزی دیتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں کم دیتے ہیں، اگرچہ ان کے خزانے میں کوئی ٹوٹا نہیں، مگر وہ اپنی حکمت و مصلحت کے موافق کسی کو پلڑا ابھر کر روزی دیتے ہیں اور کسی کو ناقص دیتے ہیں۔

> [۱۳] قوله صلى الله عليه وسلم: "بيده الميزان يَخْفِضُ ويرفع"
> أقول: هـذا إشـارة إلى التدبير، فإن مبناه على اختيار الأوفق: فما من حادثة يجتمع فيها أسبابٌ متنازعة إلا ويقضي الله في ذلك ما هو العدل، وهو قوله تعالىٰ: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ﴾

ترجمہ: (۱۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''ان کے ہاتھ میں ترازو ہے، پلڑا جھکاتے ہیں اور اٹھاتے ہیں''
میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے تدبیر الٰہی کی طرف۔ پس بیشک اس کا مدار زیادہ ہم آہنگ کے اختیار کرنے پر ہے، پس نہیں ہے کوئی نیا واقعہ جس میں متعارض اسباب اکٹھا ہوں مگر فیصلہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اس واقعہ میں اس کا جو کہ وہ انصاف کی بات ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''ہر وقت وہ کسی اہم کام میں ہیں''

☆ ☆ ☆

انسان کا اختیار ایک حد تک ہے، کامل اختیار اللہ کا ہے

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بیشک انسانوں کے سب دل مہربان ہستی کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں ایک دل کی طرح پھیرتے ہیں وہ اس کو جس طرح چاہتے ہیں یعنی وہ قادر مطلق ہیں، وہ قلوب بنی آدم پر جس طرح چاہیں تصرف کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث نمبر ۸۹)

حدیث ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''دل کا حال چٹیل میدان میں پڑے ہوئے پر کی طرح ہے، ہوائیں اس کو پھیرتی ہیں پیٹھ سے پیٹ کی طرف یعنی پر کی طرح دل بھلائی سے برائی کی طرف، اور برائی سے بھلائی کی طرف پھیرتے ہیں (رواہ احمد، مشکوۃ، حدیث نمبر ۱۰۳)

آیت کریمہ: سورۃ التکویر کی آخری آیت ہے ﴿وَمَا تَشَاءُوْنَ إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ﴾ ترجمہ: اور تم بدوں خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔

تشریح: اس آیت پاک میں اور ان احادیث شریفہ میں خدائے پاک کی قدرت کاملہ کا بیان ہے۔ جس طرح اللہ پاک کا علم شامل ہے، ان کی قدرت بھی کامل ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ نہ ان کے علم سے باہر ہے، نہ ان کی قدرت سے خارج۔ اگر ایک بھی چیز کا ان کو علم نہ ہو یا کوئی بھی چیز ان کی قدرت سے خارج ہو تو ان کا علم اور ان کی قدرت ناقص ہوگی، پھر وہ خدا کہاں رہا؟ پس با اختیار مخلوق انسان کے اختیاری افعال بلکہ خود اس کا اختیار بھی اللہ ہی کی قدرت و اختیار میں ہے۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ کوئی انسان پتھر پھینکنا چاہتا ہے پتھر ایک بے اختیار مخلوق ہے۔ لیکن فرض کرو اگر انسان قادر و حکیم ہو، اور وہ اس پتھر میں حرکت کا اختیار پیدا کر دے تو اب پتھر اپنے اختیار سے حرکت کرے گا۔ اور اس حرکت کو پتھر کے اختیار کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے اختیار سے حرکت کی ہے۔ مگر اس پتھر کو اپنے اس اختیار میں اختیار نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ آدمی کا پیدا کردہ ہے۔ مگر چونکہ آدمی کو پتھر میں حرکت کا اختیار پیدا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے جب وہ پتھر پھینکتا ہے تو وہ آدمی کے اختیار سے حرکت کرتا ہے، اور اس کی حرکت آدمی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ غرض پتھر کی حرکت کا معاملہ دونوں صورتوں میں یکساں ہے، مگر ایک صورت میں پتھر مجبور ہے اور ایک صورت میں مختار۔ اسی طرح بندوں کے اختیار کا معاملہ ہے' چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اختیار پیدا فرمایا ہے، اس لئے اب انسان کے اختیاری افعال خود انسان کی طرف منسوب ہوں گے۔ مگر چونکہ اس کا اختیار خانہ زاد نہیں، اس لئے وہ اپنے اختیار میں مختار نہیں ہوگا۔ اسی طرح انسان کے افعالِ اختیار یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ اہل السنہ والجماعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی چیز کا خالق نہیں ہے۔

سوال: جب بندوں کے افعالِ اختیار یہ اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور انسان کی مشیت واختیار بھی اللہ کا پیدا کردہ ہے تو انسان مجبورِ محض ہوا، پس جزاء وسزا کی کوئی بنیاد نہ رہی؟!

جواب: جزاء وسزا کا تعلق اس بات سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض کاموں پر مرتب ہوتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ بندے میں ایک حالت پیدا کرتے ہیں جو حکمت خداوندی میں دوسری حالت کو مقتضی ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ پانی میں حرارت پیدا کرتے ہیں تو وہ تقاضا کرتی ہے کہ پانی بھاپ (ہوا) بن کر اڑ جائے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے بندے میں اختیار پیدا کیا تو اس نے تقاضا کیا کہ جزاء وسزا ہو یعنی بندے کو راحت یا رنج پہنچے۔

جواب بہ الفاظ دیگر: جزاء وسزا کے لئے کامل اختیار ضروری نہیں۔ ایک حد تک اختیار کافی ہے، اور وہ انسان کو حاصل ہے۔ انسان کے احوال میں اور چوپایہ کے احوال میں غور کرنے سے یہ بات عیاں ہے۔ اور ایک حد تک اختیار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھایا ہے۔ ایک شخص آپ کے پاس یہی مسئلہ لے کر آیا کہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے یا مجبور؟ آپ نے فرمایا: مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ اس نے کہا: یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: ایک پیر اٹھالو۔ اس نے اٹھالیا۔ آپ نے فرمایا دوسرا بھی اٹھالو۔ کہنے لگا: دوسرا کیسے اٹھاؤں، گر پڑوں گا۔ آپ نے فرمایا: پہلا پیر اٹھانے تک تم با اختیار تھے۔ اب مجبور ہو گئے۔ اسی طرح مشیت واختیار کا ابتدائی حصہ بندے کے اختیار میں ہے، مگر اس کا آخری سرا اس کے اختیار میں نہیں ہے یعنی انسان کو جزوی اختیار حاصل ہے، کلی اختیار حاصل نہیں۔ اور مجازات کے لئے جزوی اختیار بھی کافی ہے۔

مجازات کے لئے فی الجملہ اختیار کیوں ضروری ہے؟

کسب واختیار پر جزاء وسزا مرتب ہونے کے لئے ذاتی اختیار شرط نہیں، عرضی (خدا کا پیدا کیا ہوا، فی الجملہ) اختیار بھی کافی ہے۔ اور عرضی اختیار اس لئے ضروری ہے کہ انسان کا نفس دو قسم کے اعمال کا رنگ قبول نہیں کرتا یعنی ان سے اثر پذیر نہیں ہوتا:

ایک: ان اعمال کا جن کی نسبت کسی بھی درجہ میں اس کی طرف نہ ہو، بلکہ کسی اور کی طرف ہو۔ جیسے زید سے کوئی بڑی کوتاہی ہو جائے تو اس کو افسوس ہوگا۔ لیکن اگر کسی اور نے وہ گناہ کیا ہے تو زید کو افسوس نہیں ہوگا۔

دوم: ان اعمال کا جو نفس کے اختیار وارادہ کی طرف منسوب نہیں ہیں، جیسے سونے کی حالت میں کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے یا بھول چوک سے کوئی کام ہو جائے تو آدمی ''بھئی معاف کرنا'' کہہ کر جان بچالیتا ہے، کوئی افسوس نہیں کرتا۔

اور یہ بات حکمت خداوندی کے لائق نہیں کہ وہ ناکردہ گناہ کی یا بے اختیار سرزد ہونے والی خطا کی سزا دیں، جن کا رنگ انسان کے نفس نے قبول ہی نہیں کیا۔ اور جب جزاء کی صورتِ حال یہ ہے تو غیر مستقل اختیار بھی جزاء وسزا کی

شرطیت کے لئے کافی ہے۔ذاتی خانہ زاد اور کامل اختیار ضروری نہیں۔بس اس درجہ کا اختیار ضروری ہے کہ نفس عمل کا رنگ قبول کرے اور اس درجہ کا کسب ضروری ہے کہ وہ اس عمل کرنے والے میں حالتِ اُولی پیدا کرے تا کہ اس پر حالت ثانیہ مرتب ہوسکے۔کسی اور میں وہ حالتِ اولی پیدا نہ کرے، ورنہ اس پر حالت ثانیہ (نعمت والم) کیسے پیدا ہوگی؟!

نوٹ: مذکورہ تحقیق ایک عمدہ بیش بہا تحقیق ہے، اس کی قدر وہی شخص جانتا ہے جو کبھی جبر واختیار کے مسئلہ میں الجھا ہو اور اس مسئلہ میں شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنسا ہو۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے یہ تحقیق صحابہ وتابعین کے کلام سے سمجھی ہے، قارئین کو چاہئے کہ وہ اس کو اچھی طرح محفوظ کرلیں اور یہ مضمون کہ بندوں کا اختیار بھی باذن الٰہی ہے مبحث ۵ کے باب پنجم میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔

[١٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن قلوب بنى آدمَ كلَّها بين أُصْبُعين من أصابع الرحمٰن"
وقوله صلى الله عليه وسلم: " مَثَلُ القلب كرِيْشَة بأرضِ فلاةٍ، تُقَلِّبُهَا الرياحُ ظهرًا لبطن"

أقول: أفعال العباد اختيارية، لكن لا اختيار لهم فى ذلك الاختيار، وإنما مثلُه كمثل رجل أراد أن يرمىَ حجرًا، فلو أنه كان قادرًا حكيما خلق فى الحجر اختيارَ الحركة أيضًا.

ولايرد عليه: أن الأفعال إذا كانت مخلوقة للّٰه تعالى، وكذلك الاختيار، ففيم الجزاءُ؟ لأن معنى الجزاء يرجع إلى ترتُّب بعض أفعال اللّٰه تعالى على البعض، بمعنى أن الله تعالىٰ خلق هذه الحالة فى العبد، فاقتضى ذلك فى حكمته: أن يخلُق فيه حالةً أخرى من النعمة أو الألم، كما أنه يخلق فى الماء حرارة، فيقتضى ذلك أن يكسُوَه صورةَ الهواء.

وإنما يَشْترط وجودُ الاختيار وكسبُ العبد فى الجزاء بالعرض، لا بالذات؛ وذلك: لأن النفسَ الناطقةَ لا تقبل لونَ الأعمالِ التى لا تَسْتَنِدُ إليها، بل إلى غيرها، من جهة الكسب، ولا الأعمال التى لا تَسْتَنِدُ إلى اختيارها وقصدها، وليس فى حكمة اللّٰه: أن يجازِىَ العبدَ بمالم تَقْبل نفسُه الناطقةُ لونَه.

فإذا كان الأمر على ذلك كفى هذا الاختيارُ، غيرُ المستقل فى الشرطِيَّةِ إذا كان مُصَحِّحًا لقبول لونِ العمل، وهذا الكسبُ غيرُ المستقل إذا كان مُصَحِّحًا لتخصيص هذا العبد بخلق الحالة المتأخِّرة فيه، دون غيره، وهذا تحقيق شريف، مفهوم من كلام الصحابة والتابعين، فاحفظه.

ترجمہ: (۱۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "بیشک انسانوں کے سارے قلوب رحمان کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں" اور آپ ﷺ کا ارشاد: "دل کی حالت چٹیل میدان میں پڑے ہوئے پَر جیسی ہے، پلٹتی ہیں اس کو

ہوائیں پیٹھ سے پیٹ کی طرف''

میں کہتا ہوں: بندوں کے افعال اختیاری ہیں۔لیکن کوئی اختیار نہیں ہے بندوں کے لئے اس اختیار میں۔اور (بندے کے) اختیار کا حال اس آدمی کے حال جیسا ہی ہے جو چاہتا ہے کہ کوئی پتھر پھینکے۔پس اگر وہ قادر وحکیم ہو تو پیدا کرے گا وہ حرکت کا اختیار بھی۔

اور اعتراض وارد نہیں ہوگا اس پر یہ کہ جب افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اور اسی طرح اختیار بھی (انہی کا پیدا کیا ہوا ہے) تو پھر جزاء وسزا کے کیا معنی؟ اس لئے کہ جزاء کے معنی لوٹتے ہیں (یعنی جزاء کا تعلق ہے) اللہ تعالیٰ کے بعض کاموں کے مرتب ہونے کی طرف بعض پر، بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ نے بندے میں یہ حالت (اُولی) پیدا کی، پس چاہا اس نے اللہ کی حکمت میں کہ پیدا کریں وہ اس میں ایک دوسری حالت یعنی نعمت یا اَلَم۔جس طرح یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں پانی میں حرارت، پس چاہتی ہے وہ حرارت کہ پہنائیں اللہ تعالیٰ اس پانی کو ہوا کی صورت۔

اور شرط کی گئی ہے اختیار پائے جانے کی اور بندے کے کسب کی جزا میں: صرف بالعرض، نہ کہ بالذات۔اور وہ (عرضی اختیار) اس لئے ضروری ہے کہ نفسِ ناطقہ نہیں قبول کرتا ان اعمال کا رنگ جو اس کی طرف منسوب نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے علاوہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں اکتساب کی جہت سے (یعنی وہ فعل کسی اور نے کیا ہے) اور نہ ان اعمال کا رنگ قبول کرتا ہے جو کہ وہ منسوب نہیں ہوتے نفس کے اختیار وارادہ کی طرف (یعنی وہ اس کے اختیاری افعال نہیں ہوتے، بلکہ بے خبری میں کئے ہوئے اعمال ہوتے ہیں) اور اللہ کی حکمت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ بندے کو بدلہ دیں اس عمل کا کہ نہیں قبول کیا ہے بندے کے نفسِ ناطقہ نے اس کا رنگ۔

پس جب معاملہ ایسا ہے تو کافی ہے یہ غیر مستقل اختیار شرطیت کے لئے، جبکہ ہو وہ اختیار درست کرنے والا عمل کے رنگ کو قبول کرنے کے لئے۔اور (کافی ہے) یہ غیر مستقل کسب، جبکہ ہو وہ درست کرنے والا اس بندے کی تعیین کو بعد میں پیش آنے والی حالت (ثانیہ) کے پیدا کرنے کے ساتھ اس بندے میں، نہ کہ اس کے علاوہ میں (یعنی وہ پہلی حالت اسی بندے میں حالت ثانیہ پیدا کرے، کسی اور میں پیدا نہ کرے، ورنہ کرے کوئی اور بھرے کوئی کا معاملہ ہو کر رہ جائے گا) اور یہ عمدہ تحقیق ہے، سمجھی گئی ہے صحابہ وتابعین کے کلام سے، پس اس کو محفوظ کرلے۔

ترکیب: کلّھا صفت ہے قلوب کی...... اصبع میں ہمزہ اور باء پر تینوں حرکتیں درست ہیں...... أرض فلاة: موصوف صفت ہیں...... لبطن میں لام جارہ بمعنی إلی ہے...... من النعمة بیان ہے حالت اخری کا...... ولا الأعمال کا عطف پہلے الأعمال پر ہے...... ھذا الکسب کا عطف ھذا الاختیار پر ہے...... مُصَحِّحًا ای مُثبتا. صَحَّ بمعنی ثبت آتا ہے۔

تقدیر ازلی ہے، اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:
''بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات (مراد مکلّف مخلوقات: جن وانس ہیں) پیدا کی ہے (بہیمیت کی) تاریکی میں (سورۃ الشمس میں اس کو الہام فجور سے تعبیر کیا گیا ہے) پھر (دنیا میں ظاہر ہونے کے بعد بعثت انبیاء کے ذریعہ) ان پر اپنی (ہدایت کی) روشنی ڈالی۔ پس جس کو اس نور میں سے حصہ ملا، اس نے ہدایت پائی۔ اور جو اس نور کو چوک گیا وہ گمراہ ہوا۔ پس اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ: ''قلم تقدیر علم الٰہی کے مطابق (لکھ کر) خشک ہو چکا ہے (اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی) (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث نمبر ۱۰۱)

تشریح: اس حدیث میں تقدیر کے ازلی اور قطعی ہونے کا بیان ہے۔ اس کا ماسیق لاجلہ الکلام یہی ہے۔ باقی مضامین ضمنی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے ان کا اندازہ مقرر کرلیا ہے۔ اور تمام اندازے یکبارگی کرلئے ہیں۔ ان میں کوئی حالت منتظرہ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام طے کردہ باتیں قلم تقدیر نے علم الٰہی اور تقدیر خداوندی کے مطابق لوح محفوظ میں لکھ بھی لی ہیں۔ اور لکھ کر قلم خشک ہو چکا ہے یعنی اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ (قلم جب تک خشک نہ ہو جائے لکھے ہوئے میں تبدیلی ہوسکتی ہے)

فائدہ: نصوص فہمی میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

ایک: نص کا مقصد و مدعیٰ یعنی عبارت النص (ماسیق لاجلہ الکلام) متعین کرلیا جائے۔ تاکہ گفتگو کا مَصَب (گرنے کی جگہ) معلوم ہو جائے۔ اُسی کو قاری گفتگو کا ماحصل قرار دے، اور دوسری باتوں کو ضمنی سمجھے۔

دوم: ضمناً جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کا موقع اور مصداق متعین کرلیا جائے کہ یہ واقعہ کس موقع کا ہے۔

اگر ان دو باتوں کا خیال کر کے نص پڑھی جائے گی تو ان شاء اللہ نہ کوئی الجھن پیش آئے گی، نہ کہیں تعارض محسوس ہوگا۔ اب آپ شاہ صاحب کے انداز پر حدیث کا مطلب سمجھیں:

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے ان کا اندازہ مقرر کرلیا تھا۔ اور تمام مخلوقات ابتدائے آفرینش میں فی نفسہٖ ہر کمال سے عاری تھیں۔ پس ان کو باکمال بنانے کے لئے ضروری ہوا کہ ان کی طرف انبیاء کو مبعوث کیا جائے اور ان پر وحی نازل کی جائے۔ چنانچہ زمین میں انسان کا وجود ہونے کے بعد یہ سلسلہ شروع کیا گیا۔ پس ان میں سے جس نے اس نورِ ہدایت سے حصہ پایا وہ راہ یاب ہوا، اور جو محروم رہ گیا وہ گمراہ ہوا۔

اور یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے ازل میں یکبارگی اندازہ کرلی ہیں۔ ان میں زمانی تقدم وتأخر نہیں ہے۔ البتہ ذاتی ہے یعنی اُس حالت کو جو بعثت انبیاء سے پیشتر تھی یعنی لوگوں کا تاریکی میں ہونا، اس کو اس حالت پر تقدم حاصل ہے جو

بعثت انبیاء کے بعد ہے یعنی بعض کا تاریکی سے روشنی میں نکل آنا اور بعض کا تاریکی ہی میں رہ جانا۔ اسی تقدم وتأخر ذاتی کو ایک حدیث قدسی میں اس طرح سمجھایا گیا ہے۔ مسلم شریف (۱۶: ۱۳۲ مصری) میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

''میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنی ذات پر حرام کیا ہے، اور تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ میرے بندو! تم سب گمراہ تھے بجز اس کے جس کو میں راہ دکھاؤں، پس مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تمہاری راہ نمائی کرونگا۔ میرے بندو! تم سب بھوکے تھے بجز اس کے جس کو میں کھانا کھلاؤں، پس مجھ سے کھانا مانگو، میں تمہیں کھانا کھلاؤنگا۔ میرے بندو! تم سب ننگے تھے بجز اس کے جس کو میں کپڑا پہناؤں، پس مجھ سے لباس مانگو، میں تمہیں پوشاک دونگا الخ۔

دوسری توجیہ: یا اس حدیث میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جیسے آدم علیہ السلام کی ذریت کے جنت سے اخراج کا واقعہ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے اخراج تک ان کی ذریت کا وجود ہی نہیں ہوا تھا۔ پس ذریت آدم کا نکالا جانا ان کے باپ کے نکالے جانے کے ضمن میں ایک تقدیری واقعہ ہے۔ اسی طرح اس حدیث میں بھی غالباً اُس تقدیری واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو امام مالک، ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، جو مشکوٰۃ، باب الایمان بالقدر، فصل ثانی، حدیث نمبر ۹۵ میں مذکور ہے۔ وہ واقعہ اس طرح ہے:

مسلم بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آیت پاک: ﴿ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہی سوال ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا، تو آپؐ نے فرمایا تھا:

''بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر ان کی پیٹھ پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا، پس اس سے ایک ذریت نکالی، پس فرمایا: ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ جنتیوں والے اعمال کریں گے۔ پھر ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو اس سے ایک اور اولاد نکالی، پس فرمایا: ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ دوزخیوں والے اعمال کریں گے'' الخ۔

اس تقدیری واقعہ میں انسانوں کی دو حصوں میں تقسیم وجود ارضی سے پہلے ہوئی ہے، پس ممکن ہے زیر شرح حدیث میں جو دو حصوں میں انسانوں کی تقسیم کا بیان ہے، اس کا مَحَطِّ اشارہ یہی واقعہ ہو۔

> [۱۵] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن اللّٰه خلق خَلقه فى ظُلمة، فألقى عليهم من نوره، فمن أصابه من ذلك النور اهتدى، ومن أخطأه ضلَّ، فلذلك أقول: جَفَّ القلم على علم اللّٰه"

معناه: أنه قدَّرهم قبل أن يُخلقوا، فكانوا هنالك عُراةً عن الكمال في حدِّ أنفسهم، فاستوجبوا أن يُبعث إليهم، ويُنزل عليهم، فاهتدى بعضٌ منهم، وضلَّ آخرون.

قدَّر جميعَ ذلك مرةً واحدةً، لكن كان لِمَا من أنفسهم تقدُّمٌ على مالَهُم ببعث الرسل، كقوله صلى الله عليه وسلم رواية عن الله تعالى: "كلكم جائع إلا من أطعمتُه، وكلكم ضالٌّ إلا من هديتُه"

أو نقول: هذا إشارة إلى واقعةٍ مثلَ واقعةِ إخراج ذرية آدم عليه السلام.

ترجمہ: (۱۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے پیدا کی اپنی خلقت تاریکی میں۔ پس ان پر اپنی روشنی ڈالی، پس جس کو پہنچا اس نور میں سے ہدایت پائی اس نے۔ اور جو چوک گیا اس نور کو وہ گمراہ ہوا، پس اسی واسطے کہتا ہوں میں کہ: ''قلم علم الٰہی کے مطابق (لکھ کر) خشک ہو چکا ہے''

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا اندازہ کرلیا ہے ان کے پیدا کئے جانے سے پہلے، پس وہ تھے وہاں کمال سے کورے اپنی حد ذات میں۔ پس واجب ولازم جانا انھوں نے کہ ان کی طرف انبیاء بھیجے جائیں، اور ان پر وحی نازل کی جائے، پس راہ پائی ان میں سے بعض نے اور گمراہ ہو گئے دوسرے۔

اندازہ کرلی تھیں اللہ تعالیٰ نے یہ تمام باتیں یکبارگی، لیکن تقدم حاصل ہے اس حالت کو جوان کی اپنی فی حد ذاتہ ہے اُس حالت پر جوان کے لئے ہے بعثت انبیاء کے ذریعہ۔ جیسے آنحضرت ﷺ کا ارشاد، روایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کہ: ''تم سب بھوکے ہو مگر جس کو میں کھلاؤں۔ اور تم سب گمراہ ہو مگر جس کو میں راہ دکھاؤں''

یا کہیں کہ یہ اشارہ ہے کسی واقعہ کی طرف، جیسے آدم علیہ السلام کی ذریت کے جنت سے نکالنے کا واقعہ۔

تصحیح: قدَّر جمیع سے پہلے واو تھا، جو تینوں مخطوطوں میں نہیں ہے، اس لئے اس کو حذف کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

آدمی وہاں ضرور پہنچتا ہے جہاں موت مقدر ہوتی ہے

حدیث —— حضرت مطر بن عکامس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے کسی سرزمین میں موت کا فیصلہ فرماتے ہیں تو اس کے لئے اس زمین کی طرف کوئی حاجت گردانتے ہیں (رواہ احمد والترمذی، مشکوۃ، حدیث نمبر ۱۱۰)

تشریح: عام طور پر تو ایسا ہوتا ہے کہ جہاں موت مقدر ہوتی ہے، آدمی وہاں جابستا ہے۔ اس کے دل میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ اُس جگہ میں قیام اور بود و باش خوشگوار ہے۔ یا کوئی تقریب (کسی کی ملاقات، ملازمت وغیرہ) باعث

ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسی کوئی صورت پیش نہیں آتی اور وہاں موت مقدر ہوتی ہے تو پھر وہ صورت پیش آتی ہے جس کا اس حدیث میں تذکرہ ہے کہ ناگاہ کوئی ایسی حاجت پیش آتی ہے کہ آدمی خواہ مخواہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ اسباب کے نظام میں خلل واقع ہونا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے اس لئے کوئی نہ کوئی سبب بن جاتا ہے، اور آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے۔

[۱٦] قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا قَضَى اللّٰه لعبد أن يموت بأرض جعل له إليها حاجةً"
أقول: فيه إشارة إلى أن بعضَ الحوادث يوجد لئلا يَنْخَرِمَ نظامُ الأسباب، فإن لم يكن أَسْهَلَ من إلهام، أو بعثِ تقريبٍ، لابد أن يظهر ذلك.

ترجمہ: (۱٦) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: " جب فیصلہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے کہ مرے وہ کسی سرزمین میں تو گردانتے ہیں وہ اس کے لئے اس زمین کی طرف کوئی حاجت"
میں کہتا ہوں: اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بعض واقعات پائے جاتے ہیں تاکہ رخنہ نہ پڑے اسباب کے نظام میں۔ پس اگر وہ شخص میدانی علاقے کی طرف نہیں اترا ہے کسی الہام کی وجہ سے، یا کسی تقریب (باعث) کے بھیجنے کی وجہ سے، تو ضروری ہے کہ وہ حاجت ظاہر ہو (جس کا اس حدیث میں تذکرہ ہے)

لغات: خَرَمَه (ن) خَرْمًا: شگاف ڈالنا، سوراخ کرنا اِنْخَرَمَ أنفُه: نتھنوں کے بیچ کی ہڈی کا چھدنا۔ یہاں یہ معنی رخنہ پڑنا ہے...... أَسْهَلَ (باب افعال): پہاڑ سے میدانی زمین کی طرف اترنا...... السَّهْل: نرم زمین، ہموار زمین یعنی اس سرزمین میں جا بسنا اس کو خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ بعثِ تقریب کا عطف إلهام پر ہے۔ تقریب: باعث، سبب۔ اردو میں بھی کہتے ہیں: کوئی تقریب نکل آنا۔ یعنی اگر وہ شخص اس سرزمین میں الہام (دل میں داعیہ پیدا کرنے) کے ذریعہ یا کوئی تقریب پیش آنے کی وجہ سے وہاں اقامت اختیار نہیں کرتا تو بالآخر کوئی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ وہاں پہنچ کر مرتا ہے۔

تصحیح: أَسْهَلَ اصل میں اِسْتَهَلَ تھا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

تخلیق کائنات سے پچاس ہزار سال پہلے تقدیر لکھنے کا مطلب

حدیث —— حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
" اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی ہیں۔ اور فرمایا کہ اللہ

تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا (رواہ مسلم، مشکوۃ، حدیث نمبر ۷۹)

تشریح: اس حدیث میں دو باتیں تشریح طلب ہیں: اول یہ کہ اللہ کے تقدیر لکھنے سے کیا مراد ہے؟ دوم: پچاس ہزار سال پہلے کا کیا مطلب ہے؟

پہلی بات: ظاہر ہے کہ تقدیر لکھنے کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ جس طرح ہم ہاتھ میں قلم لے کر کاغذ یا تختی پر کچھ لکھتے ہیں، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے لکھا ہو، ایسا خیال کرنا اللہ تعالیٰ کی شان اقدس سے ناواقفی ہے۔ بلکہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک تمام مخلوقات کی تقدیر لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہماری قوت خیالیہ میں ہزاروں چیزوں کی صورتیں، اور ان کے بارے میں معلومات جمع رہتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عرش اور پانی کو پیدا کیا، اس وقت اللہ کا تخت پانی پر تھا، اور کوئی دوسری مخلوق ایسی موجود نہیں تھی جس پر حکومت کی جائے یعنی اس کا نظم وانتظام کیا جائے۔ اُسی وقت اللہ تعالیٰ نے عرش کی قوتوں میں سے کسی خاص قوت میں، جس کو ہماری قوت خیالیہ کے مشابہ سمجھنا چاہئے، تمام مخلوقات اور ان کے تمام احوال ثبت فرمادیئے تھے۔ سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۵ میں اسی کو الـذکـر سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

اور یہ ہرگز خیال نہ کیا جائے کہ یہ بات احادیث کے خلاف ہے۔ کیونکہ محدثین کے نزدیک لوح وقلم کی روایات صحیح نہیں ہیں۔ وہ سب روایات اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور بعد کے محدثین نے جو ان کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے تو وہ ایک طرح کا تعمق ہے یعنی رطب ویابس کو جمع کرنے میں آخری حد تک جانے کی کوشش ہے۔ متقدمین کا ان کے سلسلہ میں کوئی کلام نہیں ہے یعنی صحاح کے مصنفین نے ان روایات کو اپنی کتابوں میں درج نہیں کیا[۱]

حاصل کلام: یہ ہے کہ آج دنیا کے پردے پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب عرش کی اس قوت میں متحقق ہو چکا ہے۔ اور اسی کو کتابت تقدیر سے تعبیر کیا ہے۔ قانونی زبان میں کسی چیز کے طے کردینے اور معین ومقرر کردینے کو بھی کتابت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں روزوں کی فرضیت کو اور وصیت کے ایجاب کو اور قصاص کے حکم کو کُتِبَ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے پر اس کا حصۂ زنا لکھ دیا ہے یعنی تجویز کردیا ہے۔ اور ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میرا نام فلاں غزوہ میں لکھا گیا یعنی تجویز کیا گیا، کیونکہ دور نبوی میں ایسا کوئی رجسٹر نہیں تھا جس میں فوجیوں کے نام

---

[۱] البتہ ایک روایت ترمذی میں دو جگہ اور ابوداؤد اور مسند احمد میں آئی ہے اور وہ مشکوۃ میں نمبر ۹۴ پر باب الایمان بالقدر کی فصل ثانی کی ابتداء میں ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اسے حکم دیا کہ لکھ، اس نے عرض کیا: کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا: تقدیر لکھ۔ چنانچہ اس نے جمیع ما کان وما یکون کو لکھ دیا۔ امام ترمذی نے اس روایت کو ایک جگہ (کتاب القدر میں) غریب کہا ہے اور دوسری جگہ (کتاب التفسیر میں) حسن غریب کہا ہے۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبدالواحد بن سلیم ہے جو ضعیف ہے ۱۲

لکھے جاتے ہوں۔ یہ بات حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے۔ اور عربوں کے اشعار میں بھی اس کی بے شمار نظیریں ہیں۔

دوسری بات: اور پچاس ہزار برس میں احتمال ہے کہ یہی عدد مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ بہت طویل زمانہ مراد ہو۔ عربی محاورات میں یہ استعمال بھی شائع ذائع ہے۔

نوٹ: یہ مضمون تفصیل سے مبحث اول باب ۱۱ اور مبحث ۵ باب ۵ میں گزر چکا ہے۔

[۱۷] قال صلى الله عليه وسلم: "كتب الله مقادير الخلائق قبلَ أن يخلُقَ السماوات والأرض بخمسين ألف سنةٍ" قال: "وكان عرشُه على الماء"

أقول: خلق الله تعالى العرشَ والماءَ أولَّ ما خلق، ثم خلق جميعَ ما أراد أن يُوجد في قُوَّةٍ من قُوى العرش، يُشْبِهُ الخيالَ من قُوانا، وهو المعبَّرُ عنه بالذكر على ما بَيَّنه الإمام الغزالي.

ولا تَظُنَّنَّ ذلك مخالفاً للسنة، فإنه لم يَصِحَّ عند أهل المعرفة بالحديث من بيان صورة القلم واللَّوح، على ما يَلْهَجُ به العامة، شيئٌ يُعتدُّ به. والذي يروُونه هو من الإسرائيليات، وليس من الأحاديث المحمدية. وذَهابُ المتاخرين من أهل الحديث إلى مثله نوعٌ من التعمُّق، وليس للمتقدمين في ذلك كلام.

وبالجملة: فتحقَّقَتْ هنالك صورةُ هذه السلسلة بتمامها، وعُبِّرَ عنه بالكتابة، أخذًا من إطلاق الكتابة في السياسة المدنية على التعيين والإيجاب، ومنه قولُه تعالى: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ وقولُه تعالى: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ﴾ الآية، وقوله صلى الله عليه وسلم: "إن الله كتب على عبده حظَّه من الزنا" الحديث، وقولُ الصحابي: كُتِبتُ في غزوة كذا، ولم يكن هناك ديوان، كما ذكره كعب بن مالك، ونظيرُ ذلك في أشعار العرب كثير جدًا.

وذكر خمسين ألف سنة: يحتمل أن يكون تعييناً، ويحتمل أن يكون بيانا لطول المدة.

ترجمہ: (۱۷) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ نے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دیں آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے"۔ اور فرمایا: "اور ان کا عرش پانی پر تھا"

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا عرش اور پانی کو ابتدائے آفرینش میں۔ پھر پیدا کیا اُن تمام چیزوں کو جن کو پیدا کرنا چاہا عرش کے قُویٰ میں سے کسی قوت میں، جو مشابہ ہے ہمارے قُویٰ میں سے خیال کے۔ اور اُسی کو تعبیر کیا گیا ہے الذکر کے ذریعہ، جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

اور آپ ہرگز گمان نہ کریں اس بات کو احادیث کے خلاف۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ نہیں صحیح ہے حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک، قلم اور تختی کی صورت کے بیان میں سے، اس طور پر جس کو عام لوگ بیان کرتے ہیں، کوئی قابل لحاظ چیز (پس ترمذی کی مذکورہ روایت خارج ہوگئی، کیونکہ اس میں قلم کی صورت کا بیان نہیں ہے) اور وہ روایات جن کو لوگ بیان کرتے ہیں، وہ اسرائیلیات میں سے ہیں۔ اور نہیں ہیں وہ احادیث نبویہ میں سے۔ اور متاخرین اہل حدیث کا جانا اس کے مانند کی طرف ایک طرح کا تعمق ہے اور نہیں ہے متقدمین کا اس سلسلہ میں کچھ کلام۔

اور حاصل کلام: پس پائی گئی وہاں (یعنی عرش کی قوت خیالیہ میں، کائنات کے) اس پورے سلسلہ کی صورت، اور تعبیر کیا گیا اس (پائے جانے کو) کتابت سے، لیتے ہوئے لفظ کتابت کو اطلاق کرنے سے ملکی سیاست میں تعیین وایجاب پر۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لکھے گئے تم پر روزے'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لکھی گئی تم پر جب حاضر ہو'' آخر آیت تک۔ اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے اپنے بندے پر اس کا حصۂ زنا'' آخر حدیث تک (مشکوۃ حدیث نمبر ۸۶) اور صحابی کا قول: ''لکھا گیا میں فلاں غزوہ میں'' اور نہیں تھا وہاں کوئی دفتر، جیسا کہ ذکر کیا اس کو کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے۔ اور اس کی نظیریں عربوں کے اشعار میں بہت زیادہ ہیں۔

اور پچاس ہزار کا تذکرہ: احتمال رکھتا ہے کہ وہ تعیین ہو، اور احتمال رکھتا ہے کہ وہ مدت کی درازی کا بیان ہو۔

☆ ☆ ☆

آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے ذریت کو نکالنے کا بیان

آیت کریمہ: سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲ میں ارشاد پاک ہے: ''یاد کرو جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا، اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: کیوں نہیں! ہم گواہ بنتے ہیں!''

حدیث ـــــــ مذکورہ آیت پاک کی تفسیر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ پھر ان کی پیٹھ پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا، پس اس سے ایک ذریت نکالی اور فرمایا: میں نے ان کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ جنتیوں والے کام کریں گے۔ پھر ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، پس اس سے ایک اور ذریت نکالی، اور فرمایا: میں نے ان کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے، اور یہ دوزخیوں والے کام کریں گے'' (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد، مشکوۃ حدیث نمبر ۹۵)

تشریح: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تا کہ وہ ابوالبشر (انسانوں کے پہلے جد امجد) بنیں، تو ان کے وجود (ہستی) میں ان کی ساری نسل مضمر (پنہاں) ہوگئی۔ جس طرح بیج میں سارا درخت مضمر ہوتا ہے۔ پھر اللہ

تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کسی وقت میں[1] اس ذریت کا علم عطا فرمایا جن کو ارادۂ خداوندی کی رو سے ان کی ہستی متضمن تھی۔ چنانچہ وہ ساری ذریت مثالی پیکر میں آپ کو سر کی آنکھوں سے دکھائی گئی۔ اور ان کی نیک بختی اور بد بختی کا پیکر محسوس نور وظلمت کو بنایا یعنی نیک اولاد کو روشن، چمکدار موتیوں کی طرح دکھایا۔ اور بد بخت اولاد کو تاریک کوئلہ کی طرح کالا دکھایا[2]۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس ذریت میں جو مکلف ہونے کی استعداد رکھی ہے اس کا پیکر محسوس سوال وجواب کو اور اعتراف والتزام کو بنایا۔ جس کا تذکرہ مذکورہ آیت کریمہ میں آیا ہے۔ پس انسانوں سے داروگیر تو ان کی اصل استعداد کی بنیاد پر ہوگی، مگر اس کی نسبت اس استعداد کے پیکر محسوس کی طرف ہوگی۔

[۱۸] قوله صلى الله عليه وسلم: "إن اللّٰه خَلَق آدم، ثم مَسَحَ ظهره بيمينه" الحديث.

أقول: لما خلق اللّٰه آدم ليكون أباً للبشر التَفَّ في وجوده حقائقُ بنيه، فأعطاه اللّٰه تعالى — وقتاً من أوقاته — عِلْمَ ما تَضَمَّنَه وجودُه بحسب القصد الإلٰهي، فأراه إياهم رأىَ عينٍ بصورة مثالية، ومَثَّلَ سعادتَهم وشقاوتَهم بالنور والظلمة، ومَثَّلَ ما جَبَلَهم عليه من استعداد التكليف بالسؤال والجواب، والالتزامِ على أنفسهم، فهم يُؤاخذون بأصل استعدادهم، وتُنسب المؤاخذةُ إلى شَبَحِهِ في الظاهر.

ترجمہ: (۱۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا، پھر ان کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا" آخر حدیث تک۔

میں کہتا ہوں: جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تا کہ وہ ابو البشر بنیں تو لپٹ گئی ان کے وجود (ہستی) میں ان کی اولاد کی ماہیتیں، پس دیا آدم کو اللہ تعالیٰ نے — ان کے اوقات میں سے کسی وقت میں — علم اس چیز کا جس کو متضمن تھا ان کا وجود، ارادۂ الٰہی کے اعتبار سے، پس دکھائی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو ان کی اولاد سر کی آنکھوں سے، مثالی صورت کے ذریعہ (یعنی ذریت کا وجود عالم مثال میں ہوا تھا) اور پیکر محسوس بنایا ان کی نیک بختی اور بد بختی کو روشنی اور تاریکی کے ذریعہ۔ اور پیکر محسوس بنایا اس کو جس پر ان کو پیدا کیا تھا یعنی مکلف ہونے کی استعداد کو سوال وجواب اور اپنی ذاتوں پر التزام کے ذریعہ۔ پس وہ داروگیر کئے جائیں گے ان کی اصل استعداد کی وجہ سے، اور منسوب کیا جائے گا مؤاخذہ اس استعداد کی ظاہر میں پائی جانے والی شبیہ کی طرف۔

---

[1] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے وہ وقت قبلَ تَهْبِيْطِه من السماء مروی ہے (درمنثور ۳: ۱۴۱)

[2] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں ہے فأخرج منه ذُريةً بيضاءَ مثل اللؤلؤ اور فأخرج منه ذرية سوداء اور حضرت ابن عباس کی تفسیر میں ہے فخرج منه سواء مثل الحمم (درمنثور)

لغات: اِلْتَفَّ فی ثوبه: کپڑے میں لپٹنا...... فی وجوده کے فصل کی وجہ سے فعل مذکر آیا ہے...... حقائق جمع حقیقة کی بمعنی ماہیت...... وقتاً ظرف ہے...... مَثَّلَ تمثیلاً: ہو بہو تصویر بنانا...... التزام: کوئی بات سر لینا...... شبحه فی الظاهر پورے کا ترجمہ ہے: پیکرِ محسوس۔ فی الظاهر کا الگ ترجمہ نہیں ہے۔

☆　☆　☆

مراحلِ تخلیق اور فرشتہ کا چار باتیں لکھنا

حدیث ــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے، جو صادق (سچے) اور مصدوق (تصدیق کیے ہوئے) ہیں فرمایا کہ:

''تم میں سے ہر ایک کی پیدائش جمع کی جاتی ہے اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفہ کی حالت میں (یعنی اس مدت میں نطفہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی، بس حرارت کی وجہ سے معمولی تغیر ہوتا ہے) پھر اتنی ہی مدت میں علقہ (جما ہوا خون) ہوتا ہے، پھر اتنی ہی مدت میں مُضغہ (گوشت کا ٹکڑا) ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتے ہیں چار باتوں کے ساتھ (یعنی گوشت پوست اور ہڈی درست ہونے کے بعد فرشتہ نازل ہوتا ہے) پس وہ اس کا عمل، اس کی موت، اس کی روزی اور اس کا نیک بخت یا بد بخت ہونا لکھتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے''
آخر حدیث تک (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۸۲)

تشریح: مراحلِ تخلیق میں انتقال تدریجی ہوتا ہے، دفعی (یکبارگی) نہیں ہوتا۔ اور ہر مرحلہ پہلے والے اور بعد والے مراحل سے مختلف ہوتا ہے: مادّہ میں جب تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ خون ہی کی شکل میں رہتا ہے تو نطفہ کہلاتا ہے۔ پھر جب اس میں معمولی انجماد پیدا ہو جاتا ہے تو علقہ کہلاتا ہے۔ پھر جب اس میں خوب انجماد پیدا ہو جاتا ہے، اور نرم ہڈیاں بھی بن جاتی ہیں تو مُضغہ کہلاتا ہے۔

اور جس طرح کھجور کی گٹھلی مناسب موسم میں بوئی جائے، اور اس کی مناسب دیکھ بھال کی جائے تو باغبانی کا ماہر جو بیج، زمین اور آب و ہوا کی خاصیات سے واقف ہو، جان لیتا ہے کہ وہ گٹھلی شاندار طریقے پر اُگے گی۔ وہ ابتداء ہی سے اس کے بعض احوال جان لیتا ہے۔ اسی طرح جو فرشتہ جنین کی تدبیر پر مقرر ہے اس پر اللہ تعالیٰ مذکورہ چار باتیں منکشف فرما دیتے ہیں اور وہ بچہ کی فطرت ہی سے ان باتوں کا اندازہ کر لیتا ہے۔ یہ مضمون مبحث ۵ کے باب ۵ میں ظہور تقدیر کے چوتھے مرحلہ کے بیان میں گذر چکا ہے۔

[۱۹] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن خَلْقَ أحدِكم يُجمع في بطن أمه" الحديث.

أقول: هذا الانتقال تدريجي، غيرُ دفعي، وكل حدٍ يُباين السابقَ واللاحقَ، ويسمى مالم يتغيو من صورة الدم تغيرًا فاحشا نطفةً، ومافيه انجماد ضعيف علقةً، وما فيه انجماد أشدُّ من ذلك مُضغةً، وإن كان فيه عظمٌ رِخوٌ.

وكما أن النواة إذا أُلقيت في الأرض في وقت معلوم، وأحاط به تدبير معلوم، عَلِمَ المطّلِع على خاصية نوع النخل، وخاصية تلك الأرض، وذلك الماء، وذلك الوقت: أنه يحسُن نباتُها، ويتحقَّق من شأنه على بعض الأمر، فكذلك يُجَلّي الله على بعض الملائكة حالَ المولود بَحَسَب الجبلّة التي جُبل عليها.

ترجمہ: (۱۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بیشک تم میں سے ایک کی پیدائش جمع کی جاتی ہے اس کی ماں کے پیٹ میں'' آخر حدیث تک۔

میں کہتا ہوں: یہ انتقال (جس کا حدیث میں تذکرہ ہے) تدریجی ہے۔ دفعی نہیں ہے۔ اور ہر حد (مرحلہ) سابق ولاحق سے مختلف ہوتا ہے۔ اور کہلاتا ہے وہ (مادّہ) جب تک نہیں بدلتا خون کی صورت سے بہت زیادہ بدلنا نطفہ۔ اور وہ جس میں کمزور انجماد ہوتا ہے (کہلاتا ہے) علقہ (خون بستہ) اور وہ جس میں اس سے زیادہ انجماد ہوتا ہے مُضغہ (گوشت کی بوٹی) کہلاتا ہے، اگرچہ اس میں نرم ہڈی ہو۔

اور جس طرح یہ بات ہے کہ کھجور کی گٹھلی جب ڈالی جاتی ہے مٹی میں وقت معلوم میں، اور گھیر لیتی ہے اس کو تدبیر معلوم (تو) جان لیتا ہے کھجور کے درخت کی نوع کی خاصیت کا واقف اور اس زمین، اور اس پانی، اور اس وقت کی خاصیت کا جاننے والا کہ عمدہ ہوگا اُس کا اُگنا۔ اور پالیتا ہے وہ اس کے حال سے بعض معاملہ کو۔ پس اسی طرح ظاہر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ بعض فرشتوں پر نومولود کا حال، اس فطرت کے موافق جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں بھی ہے اور جہنم میں بھی

حدیث ——— حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا دوزخ کا اور جنت کا لکھا جا چکا ہے (یعنی جو بھی شخص دوزخ میں یا جنت میں جائے گا اس کی وہ جگہ پہلے سے مقدر ومقرر ہے) (متفق علیہ، مشکوٰۃ، حدیث ۸۵)

تشریح: اس حدیث کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

پہلا مطلب: ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں بھی ہے اور جہنم میں بھی۔ جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہنچ جائیں گے تو جہنمیوں کی جو جگہیں جنت میں ہیں وہ جنتیوں کے حصہ میں آجائیں گی اور جنتیوں کی جو جگہیں جہنم میں ہیں وہ جہنمیوں کو دیدی جائیں گی۔ یہی یوم التغابن (ہار جیت کا دن) ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص میں کمال بھی ہے اور نقصان بھی، وہ ثواب کا حقدار بھی ہوسکتا ہے اور عذاب کا بھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے ہر جگہ ٹھکانا تیار کر رکھا ہے۔

دوسرا مطلب: حدیث میں واؤ بمعنی اَو ہے یعنی اگر وہ دوزخی ہے تو اس کا ٹھکانا دوزخ میں، اور اگر وہ جنتی ہے تو اس کا ٹھکانا جنت میں لکھا جاچکا ہے۔

نوٹ: شاہ صاحب رحمہ اللہ نے پہلے قول کو اصل اور دوسرے قول کو درجۂ احتمال میں رکھا ہے۔ کیونکہ بعض روایات سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے۔ جیسے هذا فكاكك من النار (مشکوۃ حدیث ۵۵۵۲ باب الحساب)

> [۲۰] قوله صلى الله عليه وسلم: "ما منكم من أحد إلا وقد كتب له مقعده من النار ومقعده من الجنة"
> أقول: كل صنف من أصناف النفس له كمال ونقصان، عذاب وثواب، ويحتمل أن يكون المعنى: إما من الجنة وإما من النار.

ترجمہ: (۲۰) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہیں ہے تم میں سے کوئی، مگر تحقیق لکھا گیا ہے اس کے لئے اس کا ٹھکانا جنت میں اور اس کا ٹھکانا جہنم میں''

میں کہتا ہوں: نفس کی قسموں میں سے ہر قسم کے لئے (یعنی ہر انسان کے لئے خواہ نیک ہو یا بد) کمال ونقصان (اور) ثواب وعذاب ہے (اس لئے ہر ایک کا ٹھکانا دونوں جگہ لکھا گیا ہے) اور احتمال ہے کہ معنی ہوں: یا جنت میں یا جہنم میں (اس صورت میں ہر ایک کا ٹھکانا وہیں لکھا ہوا ہے جہاں اس کا جانا مقدر ومقرر ہے، دونوں جگہ لکھا ہوا نہیں ہے)

☆ ☆ ☆

رفعِ تخالف

سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲ میں ہے: ''اور وہ وقت یاد کرو جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو اولادِ آدم کی پشت سے نکالا گیا ہے۔ خود آدم علیہ السلام کی پشت سے نہیں نکالا گیا۔ اور پہلے جو حدیث گذری ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری ذریت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالی گئی تھی۔ پس آیت اور حدیث میں تعارض ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تعارض نہیں۔ واقعہ کا کچھ حصہ قرآن کریم

میں بیان کیا گیا ہے، اور کچھ حصہ حدیث میں ۔ بات دونوں سے مل کر مکمل ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت آدم علیہ السلام کی پشت پر پھیرا تو ان کی صلبی اولاد ان کی پشت سے نکل آئی ۔ پھر خود بخود ان اولاد کی پشت سے ان کی صلبی اولاد نکلی ۔ اسی طرح قیامت تک جس طرح وہ موجود ہونے والے ہیں نکلتے چلے گئے ۔ پس حدیث میں واقعہ کا ابتدائی حصہ ذکر کیا گیا ہے، اور قرآن کریم میں بعد کا۔

[۲۱] وقوله تعالى: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ﴾ الآية، لا يخالف حديث: "ثم مسح ظهره بيمينه، واستخرج منه ذريته" لأن آدم أُخذت عنه ذريتهُ، ومن ذريته ذريتُهم إلى يوم القيامة، على الترتيب الذي يوجدون عليه، فذُكر في القرآن بعضُ القصة، وبيَّن الحديثُ تتمتها.

ترجمہ: (۲۱) ارشاد باری تعالیٰ: ''اور جب لیا آپ کے رب نے اولاد آدم سے'' آخر آیت تک، مخالف نہیں ہے حدیث: ''پھر ان کی پیٹھ پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا، اور اس سے ان کی ذریت نکالی'' سے، اس لئے کہ آدم علیہ السلام سے لی گئی ان کی ذریت، اور ان کی ذریت سے ان کی ذریت قیامت تک، اس ترتیب پر جس پر وہ پائے جائیں گے ۔ پس ذکر کیا گیا قرآن میں واقعہ کا بعض حصہ، اور بیان کیا حدیث نے اس کا تتمہ۔

☆ ☆ ☆

اعتراض کا جواب

سوال: سورۃ اللیل آیات ۵-۷ میں ہے: ''سو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا، اور وہ اللہ سے ڈرا، اور اچھی بات (کلمۂ حُسنی) کو سچا سمجھا تو ہم عنقریب آسانی کریں گے اس کے لئے آسان کام کے لئے'' یعنی اس کے لئے مذکورہ نیک کاموں کا راستہ آسان کردیں گے ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شخص نیکیاں کر چکا تو اب اس کے لئے راہ آسان کرنے کا کیا مطلب؟ یہی سوال اگلی تین آیتوں کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔

جواب: یہ ہے کہ آیت کریمہ میں فعل ماضی کا استعمال علم الٰہی اور تقدیر خداوندی کے لحاظ سے ہے، وجود خارجی کے اعتبار سے نہیں ہے ۔ اور آیات پاک کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم الٰہی میں اور اندازۂ خداوندی میں ان صفات کے ساتھ متصف ہے، اس کے لئے خارج میں (پیدا ہونے کے بعد) ان کاموں کا کرنا اللہ تعالیٰ آسان کردیتے ہیں ۔ اب حدیث پڑھیے بات ٹھیک منطبق ہوجائے گی۔

حدیث کا ابتدائی حصہ وہ ہے جو پہلے گذر چکا ہے کہ: ''تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا دوزخ کا اور جنت کا لکھا جاچکا ہے'' آگے حدیث اس طرح ہے:

صحابہ نے عرض کیا ـــــــ: تو کیا ہم اپنے اس نوشتہ تقدیر پر بھروسہ نہ کریں، اور سعی وعمل چھوڑ نہ دیں؟! (یعنی جب سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے، اور لکھا ہوا ہے، تو پھر سعی وعمل کی دردسری کیوں مول لی جائے؟!)

آپ ﷺ نے جواب دیا ـــــــ: ''نہیں! عمل کئے جاؤ، کیونکہ ہر ایک کو اسی کام کی توفیق ملتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ پس جو کوئی نیک بختوں میں سے ہے، اس کو نیک بختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے۔ اور جو کوئی بدبختوں میں سے ہے، اس کو بدبختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے''

جواب کا حاصل: یہ ہے کہ اگرچہ ہر شخص کے لئے اُس کا آخری ٹھکانا مقدر ومقرر ہے۔ لیکن ساتھ ہی اچھے یا برے اعمال سے وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی پہلے سے مقدر ہے۔ یعنی تقدیر الٰہی صرف یہی نہیں ہے کہ فلاں جنت میں اور فلاں جہنم میں جائے گا۔ بلکہ تقدیر الٰہی میں یہ بھی طے ہو چکا ہے کہ جو جنت میں جائے گا، وہ اپنے فلاں فلاں اعمال خیر کے راستے سے جائے گا۔ اور جو جہنم میں جائے گا وہ اپنی فلاں فلاں بداعمالیوں کی وجہ سے جائے گا ـــــــ پھر دنیا میں پیدا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ دونوں کیلئے ان کی راہیں آسان کر دیتے ہیں: نیک اعمال کی راہ تو فی نفسہ بھی آسان ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مزید آسان کر دیتے ہیں۔ اور برے کام فی نفسہ تو بڑے سخت کام ہیں، مگر اللہ تعالیٰ ان کو بھی بدبختوں کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔

> **[۲۲] قوله تعالى:** ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى﴾ أى من كان متصفا بهذه الصفات فى علمنا وقَدَرِنا﴿فَسَنُيَسِّرُهُ﴾ لتلك الأعمال فى الخارج، وبهذا التوجيه ينطبق عليه الحديث.

ترجمہ: (۲۲) ارشاد باری تعالیٰ: ''پس رہا وہ جس نے دیا، اور وہ بچا، اور اس نے تصدیق کی اچھی بات کی'' یعنی جو شخص متصف ہے ان صفات کے ساتھ ہمارے علم اور ہمارے اندازے میں ''تو عنقریب آسانی کریں گے ہم اس کے لئے'' ان کاموں کو وجود خارجی میں کرنے کے لئے۔ اور اس توجیہ سے منطبق ہو جائے گی اس (آیت) پر حدیث۔

☆ ☆ ☆

نیکوکاری اور بدکاری الہام کرنے کا مطلب

سورۃ الشمس آیات ۷و۸ میں ہے: ''اور قسم ہے انسان کے نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا'' یعنی اول عقل سلیم عطا فرمائی تاکہ انسان اس کے ذریعہ بھلائی برائی اور صحیح غلط کی تمیز کر سکے ـــــــ ''پھر الہام فرمائی اس کو اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری'' ـــــــ چنانچہ دنیا میں پیدا ہونے کے بعد دل میں جو نیکی کا رجحان یا بدی کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے، وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ گو القائے اول میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے۔ اور ثانی میں شیطان۔ پھر یہی رجحان بندے کے اختیار سے مرتبۂ عزم تک پہنچ کر صدور فعل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جس کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں اور

کاسب بندہ ہے۔ اور اسی کسبِ خیر وشر پر مجازات کا مدار ہے (فوائد عثمانی) حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اس آیت میں ''الہام'' سے مراد نفس میں نیکی اور بدی کی صورت پیدا کرنا ہے۔ اور یہ تصور فرشتے اور شیطان کے توسط سے پیدا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گذر چکا ہے کہ: ''شیطان کے لئے انسان سے ایک نزدیکی ہے، اور فرشتے کے لئے بھی ایک نزدیکی ہے'' الخ کیونکہ الہام درحقیقت صورت علمیہ پیدا کرنے کا نام ہے، جس کی وجہ سے آدمی عالم (جاننے والا) بن جاتا ہے۔ مگر نیکی اور بدی کے تصور سے نیکی اور بدی کا وجود نہیں ہوتا۔ پس لفظ الہام مجازاً از راہ وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ تفصیلی صورت علمیہ جو عالم بناتی ہے، مراد نہیں ہے، بلکہ اجمالی صورت علمیہ مراد ہے، جو آثار کا مبدأ ہوتی ہے۔

اجمالی صورت علمیہ سے آدمی عالم (جاننے والا) نہیں بنتا۔ البتہ تحصیل علم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی صلاحیت آثار کا سرچشمہ ہوتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جیسے کوئی دقیق مسئلہ ہوتا ہے تو عام آدمی نہیں جان سکتا۔ کیونکہ اس میں سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔ مگر معقولات پڑھا ہوا طالب علم اس کو سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ یہ صلاحیت سرچشمہ ہے، یہی اجمالی صورت علمیہ ہے، پھر جب اس نے مسئلہ سمجھ لیا تو ماحصل فی الذہن تفصیلی صورت علمیہ ہے، جس کی وجہ سے اس کو مسئلہ کا جاننے والا کہتے ہیں۔ اسی طرح آیت پاک میں مذکور الہام سے نیکی اور بدی کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ اجمالی صورت علمیہ ہے۔ اسی کی بنیاد پر نیکی اور بدی کا وجود ہوتا ہے۔

[۲۳] قوله تعالىٰ: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَاسَوَّاهَا ، فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا﴾

أقول: المراد بالإلهام هنا خلقُ صورة الفجور في النفس، كما سبق في حديث ابن مسعود، فالإلهام في الأصل: خلقُ الصورة العلمية التي يصير بها عالمًا، ثم نُقل إلى صورة إجمالية هي مبدأُ آثارٍ، وإن لم يصر بها عالِمًا، تجوُّزًا، والله أعلم.

ترجمہ: (۲۳) ارشاد باری تعالیٰ: ''قسم ہے نفس کی اور اس کو درست بنانے والے کی، پس الہام کی اللہ تعالیٰ نے نفس کو اس کی بدکاری اور اس کی نیکوکاری''

میں کہتا ہوں: الہام کرنے سے یہاں مراد نفس میں بدکاری (اور نیکوکاری) کی صورت پیدا کرنا ہے، جیسا کہ پہلے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گذرا۔ پس الہام درحقیقت: اس صورت علمیہ کو پیدا کرنا ہے جس کی وجہ سے آدمی جاننے والا ہوتا ہے۔ پھر منتقل کیا گیا (لفظ الہام) اس اجمالی صورت کی طرف جو آثار کا سرچشمہ ہے، اگرچہ نہ ہوا ہو اس کی وجہ سے آدمی جاننے والا، مجازاً اختیار کرنے کے طور پر (تجوُّزًا تمیز ہے نُقل سے) باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆　☆　☆

باب ــــــ ۲

کتاب وسنت کومضبوط پکڑنے کے سلسلہ کی اصولی باتیں

اِعْتَصَمَ به کے معنی ہیں: مضبوط پکڑنا۔ارشاد پاک ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَاتَفَرَّقُوْا﴾ ترجمہ: اورسب متفق ہوکراللہ کی رسّی مضبوط پکڑو،اور باہم نااتفاقی مت کرو۔اورسنت کے معنی ہیں: اسلامی طریقہ (الطريقة المسلوكة في الدين) اورحدیث وسنت میں عام خاص من وجہٍ کی نسبت ہے۔حدیث: آنحضرت ﷺ کے ارشادات، افعال، تائیدات اورصفات کا نام ہے۔اوران میں سے سنت صرف وہ احادیث ہیں جو معمول بہا ہیں۔ مخصوص یامنسوخ نہیں ہیں۔جیسے صوم وصال کی حدیث اور الماء من الماء حدیثیں ہیں،مگرسنت نہیں ہیں۔

اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے رائج کردہ دینی طریقے بھی سنت ہیں،مگرعرف عام میں ان پرحدیث کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔جیسے جمعہ کی پہلی اذان اور باجماعت ۲۰ رکعت تراویح سنت ہیں۔پس وہ احادیث شریفہ جومعمول بہا ہیں مادۂ اجتماع ہیں: وہ حدیث بھی ہیں اورسنت بھی اورحدیث الماءُ من الماء پہلا مادۂ افتراق ہے: وہ حدیث ہے،سنت نہیں،کیونکہ وہ منسوخ ہے۔اور جمعہ کی پہلی اذان دوسرا مادۂ افتراق ہے: وہ سنت ہے، حدیث نہیں، کیونکہ یہ طریقہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چلایا ہے،اوراس کوتمام صحابہ نے قبول کیا ہے۔

احادیث میں سنت کومضبوط پکڑنے کی تاکید آئی ہے،اورکتاب وسنت کے ساتھ ہدایت کے وابستہ ہونے کی خبردی گئی ہے۔ارشاد ہے: مَن تمسَّك بسنتي عند فساد أمتي، فله أجر مائة شهيد (مشکوۃ حدیث ۱۷۶) اورارشاد ہے: تركتُ فيكم أمرين لن تضِلُّوا ما تَمَسَّكْتم بهما: كتابَ الله، وسنةَ رسوله (مشکوۃ حدیث ۱۸۶) اوراحادیث کو یاد کرنے کی اورمنتقل کرنے کی فضیلت آئی ہے۔پس سوادِاعظم أهل السنّة والجماعة ہیں،اہل حدیث نہیں ہیں۔

نوٹ: کتاب العلم کی روایات کی شرح بھی اسی عنوان کے تحت کی گئی ہے۔

تحریف سے دین کا تحفظ ضروری ہے

مبحث سادس کے اٹھارویں باب میں اس سلسلہ میں مفصل کلام گذرچکا ہے۔اس وجہ سے شاہ صاحب نے یہاں مختصر کلام کیا ہے، بلکہ عبارت میں غایت درجہ ایجاز سے کام لیا ہے۔ہم بھی یہاں مختصر ہی لکھتے ہیں:

دین میں خلل واقع ہونے کی بے شمار راہیں ہیں۔سب کا احاطہ ناممکن ہے۔البتہ بڑے اسباب سات ہیں۔جن کی تفصیل پہلے گذرچکی ہے یہاں ان میں سے پانچ کا تذکرہ کیا ہے یعنی تہاون،تشدد،تعمق،خلط ملۃ بملۃ اوراستحسان۔

پہلا سبب: تہاون ہے یعنی دین کی بے قدری کرنا اور دین کے معاملہ میں تساہل (لاپرواہی) برتنا۔ پھر تہاون کے بھی متعدد اسباب ہیں مبحث سادس کے باب ۱۸ میں تین سبب بیان کئے ہیں۔ یہاں ان میں سے سب سے بڑا سبب ذکر کرتے ہیں۔ اور وہ ہے سنت نبوی پر عمل پیرا نہ ہونا یعنی اس کو حجت شرعیہ تسلیم نہ کرنا۔ درج ذیل دو ارشادات اسی سلسلہ میں ہیں۔

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی نہیں بھیجا، مگر اس کے لئے اس کی امت میں سے حواری (مددگار) اور اصحاب (ساتھی) ہوتے تھے۔ جو اس کا طریقہ اپناتے تھے۔ اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ناخلف پیدا ہوئے جو لوگوں سے وہ باتیں کہتے تھے جو خود نہیں کرتے تھے۔ اور وہ کام کرتے تھے جس کا وہ حکم نہیں دیئے گئے تھے (یہی تہاون فی الدین اور ترکِ سنت ہے) پس جو شخص ان سے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے۔ اور جو ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے (یعنی ان کو روکے) وہ بھی مؤمن ہے۔ اور جو شخص ان کے ساتھ اپنے دل سے جہاد کرے (یعنی ان کی حرکتوں کو برا جانے) وہ بھی مؤمن ہے۔ اور نہیں ہے اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر ایمان (کیونکہ اب وہ ان کی حرکتوں پر راضی ہوگا، جو ایمان کے منافی ہے) (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۱۵۷)

حدیث ـــــ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"ہرگز نہ پاؤں میں تم میں سے کسی کو ٹیک لگائے ہوئے (یعنی تکبر سے بافراغت بیٹھے ہوئے) اپنے چھپرکھٹ پر، پہنچے اس کو میرے حکموں میں سے کوئی حکم: ان باتوں میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے، یا منع کیا ہے، پس کہے وہ کہ: میں نہیں جانتا! (کہ حدیث میں کیا ہے؟) جو بات ہم نے کتاب اللہ میں پائی ہے، ہم اس کی پیروی کرتے ہیں! (اس حدیث میں خبر دی گئی ہے کہ ایسے جاہل ومتکبر لوگ ضرور پیدا ہوں گے جو حجیت حدیث کا انکار کریں گے۔ اور ان پر رد بھی کیا گیا ہے کہ حدیثیں بھی قرآن ہی کی طرح حجت ہیں) (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۶۲)

غرض رسول اللہ ﷺ نے سنت کو مضبوط پکڑنے کی بے حد ترغیب دی ہے۔ خاص طور پر جب لوگوں میں اس کی حجیت میں اختلاف رونما ہو۔

دوسرا سبب: تشدد ہے یعنی دین کے معاملہ میں اپنے اوپر سختی برتنا اور ایسی شاق عبادتیں اختیار کرنا جن کا شارع نے حکم نہیں دیا۔ مثلاً ایسی سخت ریاضتیں اور مجاہدے کرنا جن کی نفس میں طاقت نہ ہو، اسی طرح مباح چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرنا وغیرہ۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"سختی نہ کرو اپنی جانوں پر، پس اللہ تعالیٰ سختی کریں گے تم پر۔ پس بیشک ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے

ان پرسختی کی، پس یہ ان کے باقی ماندہ لوگ ہیں راہبوں کی کٹیوں میں اور خانقاہوں میں (اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:)
انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کرلیا تھا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا'' (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ حدیث ۱۸۱)

اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے اپنے اوپر ہمیشہ روزہ رکھنا اور رات بھر نماز پڑھنا لازم کیا تھا تو آپ ﷺ نے سختی سے ان کو منع کیا تھا (مشکوۃ، کتاب الصوم، باب صیام التطوع حدیث ۲۰۵۴)

اور متفق علیہ روایت میں یہ بھی ہے کہ تین حضرات ازواج مطہرات کے پاس آئے اور آپ ﷺ کی رات کی عبادت دریافت کی۔ ازواج نے بتائی، تو انھوں نے اس کو کم سمجھا اور یہ کہا کہ ہماری آنحضور سے کیا نسبت؟! آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے گئے ہیں! پھر ایک صاحب نے عہد کیا کہ وہ رات بھر نفلیں پڑھیں گے۔ دوسرے نے ہمیشہ روزہ رکھنے کا عہد کیا۔ اور تیسرے صاحب نے بیوی سے بے تعلق ہوجانے کا عزم کیا۔ آپ ﷺ نے ان حضرات کو نہایت سختی سے منع کیا (مشکوۃ، حدیث ۱۴۵)

تیسرا سبب: تعمق یعنی دین میں غلو کرنا ہے۔ آپ ﷺ کے درج ذیل ارشادات اسی سلسلہ میں ہیں:

حدیث ——— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے بیان جواز کے لئے ایک کام کیا۔ تاہم کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر ہوئی، تو آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا:
''کیا حال ہے ان لوگوں کا جو اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں جس کو میں کرتا ہوں؟! پس قسم بخدا! میں ان میں سب سے زیادہ اللہ (کی مرضی اور نامرضی) کو جانتا ہوں۔ اور ان میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۴۶)

حدیث ——— حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:
''نہیں گمراہ ہوتی کوئی قوم ایسی ہدایت کے بعد جو ان کو حاصل تھی مگر دیئے جاتے ہیں وہ جھگڑا (دین میں یہی جھگڑا تعمق ہے) (مشکوۃ حدیث نمبر ۱۸۰)

حدیث ——— آنحضرت ﷺ نے کھجوروں کی تلقیح کے مسئلہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ''تم اپنے دنیوی معاملات بہتر جانتے ہو'' امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے: ''ان باتوں کا امتثال ضروری ہے جو آپ نے حکم شرعی کے طور پر بیان فرمائی ہیں اور جو باتیں معیشت سے متعلق ہیں اور ان کے بارے میں آپ نے کوئی بات اپنی رائے سے ارشاد فرمائی ہے اس کا امتثال واجب نہیں'' پس ایسے ارشادات کا امتثال بھی ضروری قرار دینا تعمق فی الدین ہے۔ جو تحریف کا باعث بنتا ہے (مسلم شریف ۱۵: ۱۱۸ مصری، کتاب الفضائل)

چوتھا سبب: ایک ملت کو دوسری ملت کے ساتھ خلط ملط کرنا۔ جیسے آج بہت سی ہندوانی رسوم مسلمانوں میں در آئی ہیں اور مسلمان ان کو دین سمجھ کر اپنائے ہوئے ہیں۔ درج ذیل ارشادات اسی سلسلہ کے ہیں:

حدیث ——— حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: یہود کی بعض

باتیں ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ آپؐ کی کیا رائے ہے: ہم ان کو لکھ لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا:

''کیا تم یہود ونصاریٰ کی طرح دین کے معاملہ میں حیرت کا شکار ہو؟ بخدا! میں تمہارے پاس ایک روشن صاف ستھرا دین لایا ہوں۔ اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا'' (مشکوٰۃ، حدیث ۱۷۷)

اور آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو مبغوض ترین آدمی قرار دیا ہے جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے رائج کرنا چاہتا ہے (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۴۲)

پانچواں سبب: استحسان ہے یعنی کسی چیز کو بغیر دلیل شرعی کے اچھا سمجھ کر اپنا لینا۔ جیسے میلاد مروجہ اور عرس وغیرہ۔ آپؐ کا درج ذیل ارشاد اسی سلسلہ میں ہے:

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات پیدا کی، جو اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے'' یعنی جس نے اپنی پسند سے دین میں کوئی ایسی بات بڑھائی جس کی کتاب وسنت سے کوئی سند نہیں: نہ ظاہر نہ خفی، نہ لفظی نہ مستنبط، تو وہ مردود ہے (متفق علیہ مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۴۰)

﴿من أبواب الاعتصام بالكتاب والسنَّة﴾

قد حذَّرنا النبيُّ صلى الله عليه وسلم مَدَاخِلَ التحريف بأقسامها، وغَلَّظ النهي عنها، وأخذَ العهودَ من أمته فيها، فمن أعظم أسباب التهاون: تركُ السنة، وفيه قوله صلى الله عليه وسلم: "ما من نبي بعثه الله في أمته قبلي، إلا كان له من أمته حواريون وأصحابٌ يأخذون بسنته، ويقتدون بأمره، ثم إنها تَخْلُفُ من بعدهم خُلوفٌ: يقولون مالايفعلون، ويفعلون مالايؤمرون؛ فمن جاهَدَهم بيده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن، وليس وراءَ ذلك من الإيمان حَبَّةُ خردلٍ"

وقوله صلى الله عليه وسلم: " لا أُلْفِيَنَّ أحدَكم مُتكئًا على أرِيكَتِه، يأتيه الأمرُ من أمري، مما أُمرتُ به، أو نُهيتُ عنه، فيقول: لا أدري! ماوجدناه في كتاب الله اتَّبَعْنَاه"

ورغَّب في الأخذ بالسنة جدًا، لاسيما عند اختلافِ الناس.

وفي التشدُّد: قوله صلى الله عليه وسلم: " لاتُشدِّدوا على أنفسكم، فَيُشَدِّدَ الله عليكم" وردُّه على عبد الله بن عمروٍ، والرهطِ الذين تقالُّوا عبادةَ النبي صلى الله عليه وسلم، وأرادوا شاقَّ الطاعات.

وفي التعمُّق: قوله صلى الله عليه وسلم: "ما بالُ أقوامٍ يتنزَّهون عن الشيئ أصْنَعُه؟ فو الله إني لأعلَمُهم بالله، وأشدُّهم خشيةً لله" وقوله صلى الله عليه وسلم: "ما ضَلَّ قومٌ بعدَ هدىً كانوا عليه، إلا أُوتوا الجدلَ" وقوله صلى الله عليه وسلم: " أنتم أعلمُ بأمور دنياكم"

وفي الخلط: قوله صلى الله عليه وسلم لمن أراد الخوضَ في علم اليهود: " أمتهوِّكون أنتم كما تهوَّكتِ اليهود والنصارى؟! لقد جئتكم بها بيضاءَ نقيَّةً، ولو كان موسى حيًّا لما وسعه إلا اتِّباعي" وجعلُه صلى الله عليه وسلم من أبغض الناس مَن هو مُبْتَغٍ في الإسلام سنة الجاهلية.

وفي الاستحسان: قوله صلى الله عليه وسلم: " من أحدث في أمرنا هذا ماليس منه فهو رَدٌّ"

ترجمہ: کتاب وسنت کومضبوط پکڑنے کے سلسلہ کی روایات: تحقیق ڈرایا ہے ہمیں نبی ﷺ نے تحریف دین کی تمام راہوں سے۔ اور سخت کیا ہے ممانعت کو ان (راہوں) سے۔ اور عہد و پیان لیا ہے آپؐ نے اپنی امت سے ان کے بارے میں۔ (تحریف کا پہلا سبب تہاون ہے) پس تہاون کے اسباب میں سے بڑا سبب: سنت نبوی کو چھوڑنا ہے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کا یہ ارشاد ہے: ''نہیں ہے کوئی نبی الخ'' اور آپؐ کا ارشاد ہے: ''ہرگز نہ پاؤں میں الخ اور بے حد ترغیب دی ہے آپ نے سنت کو لینے کی، بالخصوص لوگوں کے اختلاف کے وقت۔ (اور دوسرا سبب تشدد ہے) اور تشدد کے سلسلہ میں آپ کا یہ ارشاد ہے: ''نہ سختی کرو تم الخ'' اور آپ کا رد فرمانا ہے عبداللہ بن عمرو پر اور اس جماعت پر جس نے کم سمجھا تھا نبی ﷺ کی عبادت کو، اور ارادہ کیا تھا انھوں نے عبادات شاقّہ کا۔

(اور تیسرا سبب تعمق ہے) اور تعمق کے بارے میں آپؐ کا ارشاد ہے: ''ان لوگوں کا کیا حال ہے الخ'' اور آپؐ کا ارشاد ہے: ''نہیں گمراہ ہوئی الخ'' اور آپؐ کا ارشاد ہے کہ ''تم زیادہ جانتے ہو تمہارے دنیا کے معاملات''

(اور چوتھا سبب دو ملتوں کو خلط ملط کرنا ہے) اور خلط ملط کرنے کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے اس شخص سے جس نے یہود کے علوم میں گھسنے کا ارادہ کیا تھا: ''کیا حیران ہو تم الخ'' اور آپؐ کا گرداننا ہے مبغوض ترین آدمی اس شخص کو جو اسلام میں جاہلیت کا طریقہ چاہنے والا ہے۔

(اور پانچواں سبب استحسان ہے) اور استحسان (پسندیدگی) کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے: ''جس نے نئی پیدا کی الخ''

لغات: تحذیر ڈرانا حَذَّر کا مفعول ثانی مِنْ کے بغیر بھی آتا ہے، جیسے یحذر کم اللّٰہ نفسہ: اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتے ہیں...... مداخل: راہیں۔ مدخل کی جمع ہے...... غَلَّظَ: بھاری کرنا، گاڑھا کرنا...... حواری: مددگار، مخصوص اصحاب...... تَقَالُّ الشیئ: کم گننا...... تَهَوَّكَ: حیران ہونا۔ مُتَهَوِّكٌ: حیران۔

اتباع نبوی کا وجوب اور محسوس مثال سے اس کی تفہیم

حدیث ــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے خواب میں فرشتے آئے۔ اور ان کے بعض نے بعض سے کہا کہ اِن حضرت جی کی کوئی مثال بیان کرو (یعنی ان کی حالت محسوس مثال کے ذریعہ سمجھاؤ) انھوں نے جواب دیا: آپ سو رہے ہیں (پس مثال بیان کرنے سے کیا فائدہ؟) پہلے فرشتوں نے کہا: آپ کی آنکھیں سو رہی ہیں، دل بیدار ہے (یعنی وہ سوتے ہوئے بھی ہماری باتیں محفوظ کریں گے) پس فرشتوں نے کہا: آپ کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے حویلی بنائی، اور اس میں ایک پُرتکلف دعوت سجائی، اور ایک بلانے والے کو بھیجا۔ پس جس نے داعی کی بات مان لی، وہ حویلی میں آیا اور اس نے کھانا کھایا۔ اور جس نے اس کی بات قبول نہ کی، وہ نہ آیا اور نہ کھایا۔ پہلے فرشتوں نے کہا: مثال منطبق کرو تاکہ آپ سمجھیں۔ دوسرے فرشتوں نے کہا: آپ تو سو رہے ہیں! پہلے فرشتوں نے کہا: آپ کی آنکھیں سو رہی ہیں، دل بیدار ہے۔ پہلے فرشتوں نے کہا: حویلی جنت ہے اور داعی آپ ﷺ ہیں۔ پس جس نے آپ کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی۔ اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور آپ لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں (یعنی جنتیوں اور جہنمیوں کو جدا جدا کرنے والے ہیں) (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۴۴)

تشریح: فرشتوں نے آپ کی جو مثال بیان کی ہے اس کے دو مقصد ہیں:

پہلا مقصد: لوگ آپ کی فرمانبرداری کے مکلّف ہیں۔ آپ کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، کیونکہ آپ اللہ کی طرف سے لوگوں کو جنت کی نعمتوں کی طرف بلانے والے ہیں پس حویلی میں وہی آئے گا جو آپ کی دعوت قبول کریگا۔

دوسرا مقصد: فرشتوں نے ایک معنوی حقیقت کو مثال دیکر محسوس بنادیا ہے تاکہ بات پوری وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہوجائے۔

> [۱] وَضَرَبَ الملائكةُ له صلى الله عليه وسلم" مثلَ رجلٍ بنى دارًا، وجعلَ فيها مأْدُبَةً، وبعثَ داعيًا"
>
> أقول: هذا إشارة إلى تكليف الناس به، وجعلُه كالأمر المحسوس، إكمالاً للتعليم.

ترجمہ: (۱) اور بیان کی فرشتوں نے آپ ﷺ کے لئے: "مثال اس شخص کی جس نے بنائی کوئی حویلی، اور اس میں ایک پُرتکلف دعوت رکھی، اور اس نے ایک بلانے والا بھیجا" میں کہتا ہوں: یہ (مثال) اشارہ ہے لوگوں کو مکلف بنانے کی طرف آپ کو ماننے کا۔ اور اس (اطاعت) کو محسوس امر کی طرح بنانا ہے تاکہ تعلیم مکمل طور پر ہو۔

کچھ اعمال فی نفسہ بھی موجبِ عذاب ہیں

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میری مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک آگ جلائی، پس جب روشن کردیا آگ نے اپنے اردگرد کی چیزوں کو (یعنی وہ خوب جل گئی) تو پروانوں نے اور دوسرے کیڑوں نے اس میں گرنا شروع کیا۔ اور اُس آگ جلانے والے نے ان کو روکنا شروع کیا، مگر وہ اس پر غالب آتے رہے۔ اور وہ زبردستی آگ میں گھستے رہے۔ پس میں تمہاری کمریں پکڑ کر تم کو آگ سے بچاتا ہوں۔ اور تم زبردستی اس میں گھسے چلے جارہے ہو! (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث نمبر ۱۴۹)

حدیث ـــــ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میری اور اس دین و شریعت کی مثال جس کے ساتھ اللہ نے مجھ کو مبعوث فرمایا ہے، بس اس شخص جیسی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا، پس اس نے کہا: اے میری قوم! میں نے دشمن کا لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (جو تم پر حملہ کرنے کے لئے بڑھا چلا آرہا ہے) اور میں ننگا ڈرانے والا ہوں، پس بچو! بچو!! پس اس کی بات مان لی اس کی قوم کی ایک جماعت نے پس وہ راتوں رات چل دیئے اور آہستگی کے ساتھ چلتے رہے، پس انھوں نے نجات پائی۔ اور ایک جماعت نے اس شخص کو جھٹلایا، پس وہ صبح تک وہیں رہے۔ پس شب خون مارا ان پر دشمن نے پس ان کو برباد کردیا اور جڑ سے اکھاڑ دیا۔ پس یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری فرمانبرداری کی اور اس دین کی پیروی کی جس کو میں لایا ہوں۔ اور اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی اور اس برحق دین کو جھٹلایا جس کو میں لے کر آیا ہوں (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث نمبر ۱۴۸)

تشریح: ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نفس الامر میں کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جو بعثت انبیاء سے پہلے بھی قابل مؤاخذہ ہیں۔ کیونکہ صورت حال یہ نہیں ہے کہ انبیاء لوگوں کو پکڑ پکڑ کر جہنم میں جھونک رہے ہیں یا وہ دشمن کو چڑھا لائے ہیں۔ لوگ تو خود ہی آگ میں گر رہے ہیں اور دشمن تو خود ہی چڑھا آرہا ہے۔ انبیاء تو بچا رہے ہیں اور آگاہی دے رہے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ لوگوں کے اعمال واحوال بذات خود موجب ہلاکت ہیں۔ اور شریعت کا نزول اس نفس الامری حسن وقبح سے پردہ اٹھاتا ہے، کچھ ان میں حسن وقبح پیدا نہیں کرتا۔ مگر چونکہ نفس الامری حسن وقبح کا ادراک مشکل ہے اس لئے جزاء وسزا کو نزول شرع پر موقوف رکھا گیا ہے۔ البتہ جن اعمال کا حسن وقبح مُدرَک بالعقل ہے ان پر مؤاخذہ بعثت انبیاء سے پہلے بھی ہوگا۔ یہ بحث کتاب کے مقدمہ میں، جہاں یہ مسئلہ آیا ہے کہ اعمال کا حسن وقبح عقلی ہے یا شرعی؟ تفصیل سے گذر چکی ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " مَثَلِيْ كمثل رجل استَوْقَدَ نارًا" الحديث، وقوله صلى الله عليه وسلم: " إنما مثلي ومَثَلُ ما بعثني الله به كمثل رجل أتى قومًا، فقال: يا قوم! أني رأيتُ الجيش بعينيَّ"

الحديثُ، دليلٌ ظاهر على أن هنالك أعمالاً تستوجب في أنفسها عذاباً قبل البعثة.

ترجمہ: (۲) آپ ﷺ کا ارشاد: ''میری مثال اس آدمی کی سی ہے جس نے آگ روشن کی'' آخر حدیث تک۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد: ''میری حالت اور اس ہدایت کی حالت جس کے ساتھ اللہ نے مجھ کو بھیجا ہے اس آدمی کی سی ہے جو کسی قوم'' آخر حدیث تک (یہ دونوں ارشادات) اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ وہاں کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جو واجب و لازم جانتے ہیں فی نفسہ عذاب کو بعثت سے پہلے (پہلا قولہ مبتدا ہے دوسرا اس پر معطوف ہے اور دلیل خبر ہے)

☆ ☆ ☆

آپؐ کے لائے ہوئے دین کے تعلق سے لوگوں کی تین قسمیں

حدیث — حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اس علم و ہدایت کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تیز بارش کی سی ہے، جو زمین پر برسی تو زمین کی تین قسمیں ہوگئیں:

(۱) — زرخیز زمین۔ اس نے پانی اپنے اندر جذب کیا۔ پس گھاس اور بہت سبزہ اُگایا۔

(۲) — بنجر زمین۔ اس نے پانی روکا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس سے لوگوں کو نفع پہنچایا۔ لوگوں نے پیا، پلایا اور کھیتی کی۔

(۳) — زمین کی ایک اور قسم ہے جو چٹیل میدان ہے۔ اس نے نہ تو پانی روکا نہ گھاس اُگائی (سارا پانی بہ گیا)

پس یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے اللہ کا دین سمجھا اور اس کو اُس علم نے نفع پہنچایا جس کے ساتھ اللہ نے مجھ کو بھیجا ہے، پس اس نے سیکھا اور سکھلایا۔ اور مثال ہے اس شخص کی جس نے اس دین کی طرف سر ہی نہیں اٹھایا اور اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۱۵۰)

تشریح: اس حدیث میں غور طلب بات یہ ہے کہ مثال یعنی زمین کی تو تین قسمیں کی گئی ہیں، مگر ممثّل لہ یعنی لوگوں کی دو ہی قسمیں بیان کی گئی ہیں، لوگوں کی تیسری قسم کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں مثال (زمین) کی طرح ممثّل لہٗ (لوگوں) کی بھی تینوں قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ لوگوں کی پہلی قسم میں سے دو قسمیں نکلتی ہیں علماء اور عباد۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے لائے ہوئے علم و ہدایت کے تعلق سے لوگوں کی اولاً دو قسمیں ہوتی ہیں: علماء (دین حاصل کرنے والے) اور جہلاء۔ پھر اول کی دو قسمیں ہیں: فقہاء اور عباد۔ فقہاء یعنی مجتہدین کی مثال پہلی قسم کی زمین ہے۔ اور عباد کی مثال دوسری قسم کی زمین ہے اور تیسری قسم کی زمین جہلاء یعنی کفار کی مثال ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اہل علم آپ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کو دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے قبول کریں گے:

پہلا طریقہ: صریح روایت کے ذریعہ یا دلالۃ روایت کے ذریعہ۔ دلالۃ روایت کا مطلب یہ ہے کہ وہ نصوص سے استنباط کریں گے اور لوگوں کو اپنی استنباط کی ہوئی باتیں بتلائیں گے تاکہ وہ ان کی پیروی کریں (اس کی مزید تفصیل مبحث سابع کے باب ثالث میں گذر چکی ہے)

دوسرا طریقہ: عبّاد یعنی دین کے جاننے والے شریعت پر عمل پیرا ہوں گے، اور ان کی سیرت سے لوگ راہ نمائی حاصل کریں گے۔ دوسری قسم کی زمین ان عبّاد و عاملین کی مثال ہے۔

اور لوگوں کی تیسری قسم جہلاء کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سرے سے دین قبول ہی نہیں کریں گے۔ زمین کی تیسری قسم ان لوگوں کی مثال ہے۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے لوگوں کی تین قسمیں جس طرح بیان فرمائی ہیں اس پر اشکال یہ ہے کہ عاملین وعباد کی مثال بنجر زمین کیسے ہوسکتی ہے؟ بنجر زمین تو خود پانی سے منتفع نہیں ہوتی، صرف دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اور یہ حضرات تو خود بھی دین سے منتفع ہوتے ہیں؟ اس لئے شارحین حدیث نے اور طرح سے لوگوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ مظاہر حق اور فتح الباری میں اس کی تفصیل ہے۔ راقم کا خیال یہ ہے کہ تیسری قسم کا تذکرہ چھوڑ دیا گیا ہے ان کو قابل ذکر نہیں سمجھا گیا۔ جیسے یوم السبت میں مچھلی کا شکار کرنے والوں کے قصہ میں بیان جزاء کے وقت ایک قسم کا تذکرہ بالقصد چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ تیسری قسم عالم غیر عامل کی ہے جس نے علم دین سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا، مگر خود منتفع نہ ہوا۔ اللہ ایسا عالم ہونے سے ہماری حفاظت فرمائیں (آمین)

[۳] وقوله صلى الله عليه وسلم: " مَثَلُ ما بعثني الله به من الهدى والعلم كمثل الغيث الكثير، أصاب أرضًا" الحديث.

فيه: بيانُ قبولِ أهل العلم هدايتَه صلى الله عليه وسلم بأحد وجهَين: الروايةِ صريحًا والروايةِ دلالةً: بأن استنبطوا وأخبروا بالمستَنْبَطات، أو عملوا بالشرع، فاهتدى الناس بهَدْيهم، وعدمِ قبولِ أهل الجهل رأسًا.

ترجمہ: (۳) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "اس علم وہدایت کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بھیجا ہے الخ اس حدیث میں اہل علم کے قبول کرنے کا بیان ہے آپ کی (لائی ہوئی) ہدایت کو دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے: صریح روایت کے ذریعہ یا دلالۃ روایت کے ذریعہ: بایں طور کہ وہ استنباط کریں اور بتلائیں (لوگوں کو) اپنی

استنباط کی ہوئی باتیں (تاکہ لوگ اس پر عمل پیرا ہوں۔ یہی تقلید مجتہدین کی حقیقت ہے) یا شریعت پر عمل پیرا ہوں۔ پس لوگ ان کی سیرت سے راہ نمائی حاصل کریں اور (اس حدیث میں بیان ہے) جہلاء کے قبول نہ کرنے کا سرے سے۔

☆ ☆ ☆

خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کیوں ضروری ہے؟

حدیث —— حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ پس ہمیں نہایت مؤثر نصیحت کی جس سے آنکھیں بہ پڑیں، اور دل دہل گئے۔ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! گویا یہ رخصت کرنے والے کی نصیحت ہے (رخصت کرنے والا کوشش کرتا ہے کہ ہر ضروری بات کہہ ڈالے، کوئی بات رہ نہ جائے) پس آپؐ ہمیں وصیت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی اور امیر کی اطاعت کرنے کی، اگرچہ وہ حبشی غلام ہو (یہ اطاعت میں مبالغہ ہے) پس بیشک شان یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا۔ پس لازم پکڑو تم میری سنت، اور (میرے) راہ یاب، ہدایت مآب خلفاء کی سنت۔ تھامو تم خلفاء کی سنت کو، اور دانتوں سے اُسے مضبوط پکڑو، اور بچو تم نئی باتوں سے، پس بیشک ہر نئی بات بدعت ہے، اور جو بدعت ہے وہ گمراہی ہے'' (رواہ احمد وابوداؤد، والترمذی وابن ماجہ، مشکوۃ، حدیث نمبر ۱۶۵)

تشریح: کچھ لوگوں کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سنت نبوی کی پیروی کی ضرورت تو واضح ہے۔ آپؐ کی سنتیں تو دین کا جزء ہیں۔ مگر خلفائے راشدین کے طریقوں کی پیروی کیوں ضروری ہے۔ وہ پیغمبر ہیں نہ ان کے ذریعہ اللہ نے دین بھیجا ہے؟ شاہ صاحب قدس سرہ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ دین تو بیشک وہ ہے جو آپ ﷺ کے ذریعہ اللہ نے بھیجا ہے۔ اس لئے دین کا نظم و انتظام تو طریقۂ نبوی کی پیروی ہی سے استوار ہوسکتا ہے۔ مگر دین کے لئے اقامتِ دین کا نظام بھی ضروری ہے، اور وہ بڑی حکومت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اور حکومت کبری آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک قائم نہیں ہوسکی تھی۔ وہ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء کے ہاتھوں سے قائم ہوئی۔ اور خلافت کبری کا نظم و انتظام خلفاء کی تابعداری پر موقوف ہے۔ وہ معیشت کی مفید تدبیروں کے سلسلہ میں، جہاد برپا کرنے کے بارے میں، اور اس کے مانند دیگر امور میں جو حکم اپنے اجتہاد سے دیں گے اس کی اطاعت ضروری ہے، اس کے بغیر خلافت کبری کا نظام استوار نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ شرط ہے کہ وہ کوئی نیا حکم شرعی نافذ نہ کریں، کیونکہ غیر نبی کو اس کا اختیار نہیں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا حکم کسی نص کے خلاف نہ ہو، کیونکہ کسی بھی مخلوق کی اطاعت احکام خداوندی کے برخلاف جائز نہیں۔ مگر معروف احکام میں خلفائے راشدین کی پیروی ضروری ہے، اس کے بغیر خلافت کبری کا نظام کیسے درست ہوسکتا ہے؟!

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم في الموعظة البليغة: "فعليكم بسنتي وسنةِ الخلفاء الراشدين المَهْدِيِّيْنَ"

أقول: انتظامُ الدين يتوقف على اتباع سُنَنِ النبي وانتظامُ السياسة الكبرى يتوقف على الانقياد للخلفاء فيما يأمرونهم بالاجتهاد في باب الارتفاقات، وإقامةِ الجهاد، وأمثالِ ذلك، مالم يكن إبداعًا لشريعة، أو مخالفًا لنصّ.

ترجمہ: (۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد پُر تاثیر وعظ میں: ''پس لازم پکڑو تم میرے طریقہ کو، اور راہ یاب ہدایت مآب خلفاء کے طریقہ کو''

میں کہتا ہوں: دین کا انتظام آنحضرت ﷺ کی سنتوں کی اتباع پر موقوف ہے۔ اور خلافت کبری کا انتظام خلفاء کی تابعداری پر موقوف ہے ان باتوں میں جن کا وہ لوگوں کو حکم دیں اپنے اجتہاد سے معیشت کی مفید تدبیروں اور جہاد برپا کرنے اور اس جیسے معاملات کے سلسلہ میں۔ جب تک نہ ہو وہ شریعت کی نئی ایجاد یا کسی نص کے خلاف۔

☆ ☆ ☆

فرقۂ ناجیہ اور فرقِ غیر ناجیہ کی تمثیل

حدیث ——— حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لئے ایک (سیدھا) خط کھینچا، پھر فرمایا کہ: ''یہ اللہ کا راستہ ہے'' پھر اس کے دائیں بائیں کئی خطوط کھینچے (سات خط چھوٹے اور ٹیڑھے دائیں طرف اور اسی طرح بائیں طرف کھینچے) اور فرمایا: ''یہ (دیگر) راہیں ہیں۔ ان میں سے ہر راہ پر شیطان ہے، جو اس راہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور آپ نے (سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۳) تلاوت فرمائی (اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں کہ) یہ میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے، سو اس کی پیروی کرو، اور دوسری راہوں کی پیروی مت کرو، کیونکہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی (مشکوۃ حدیث ۱۶۶)

تشریح: سب سے پہلے یہ بات واضح طور پر ذہن نشیں کر لی جائے کہ اس حدیث میں فرقۂ ناجیہ اور فرق ضالّہ کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ سیدھا راستہ اہل السنہ والجماعہ کا راستہ ہے، باقی اسلامی فرقوں کی راہیں کج ہیں۔ اور فرقۂ ناجیہ ہی عقائد کی بنیاد پر نجات اوّلی کا حقدار ہے۔ دیگر فرقے عقائد کی خرابی کی وجہ سے غیر ناجی ہیں۔ انہیں اس بنیاد پر بہر حال جہنم میں جانا ہے۔ سزایابی کے بعد ان کو نجات ملے گی۔ وہ مخلّد فی النار نہیں ہیں۔ آیت کریمہ میں اسی صراط مستقیم پر گامزن رہنے اور دوسری راہوں سے بچنے کی ہدایت ہے۔ یہ حدیث اسلامی اور دیگر غیر اسلامی مذاہب کی تمثیل نہیں

ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اس حدیث کی تشریح میں جو فرقۂ ناجیہ اور دیگر فرق غیر ناجیہ کی تشخیص کی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ حدیث انہی کی تمثیل ہے۔

فرقۂ ناجیہ: وہ فرقہ ہے جو عقیدہ اور عمل دونوں ہی میں ظاہر کتاب وسنت کو اپنانے والا ہے یعنی قرآن وحدیث سے بہ ظاہر جو کچھ مفہوم ہوتا ہے اس کو لیتا ہے، بے جا تاویلات نہیں کرتا۔ اسی طرح عام طور پر صحابہ وتابعین جس راہ پر چلتے رہے ہیں اس کو اپناتا ہے۔ اور صحابۂ کرام، تابعین عظام اور مجتہدین عالی مقام میں جو باہم مسائل فرعیہ میں اختلافات ہوئے ہیں وہ مضر نہیں۔ کیونکہ یہ اختلافات ان مسائل میں ہوئے ہیں جن میں نص عام طور پر سامنے نہیں آئی، نہ ان مسائل میں صحابہ کا اجماع ہوا ہے۔ اور یہ اختلافات دو وجہ سے ہوئے ہیں:

(۱)۔۔۔ کسی نص سے استدلال کرنے میں اختلاف ہوا ہے۔

(۲)۔۔۔ یا کسی نص کے اجمال کی تفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔

بہر حال یہ اختلافات مضر نہیں۔ کیونکہ یہ فروع (شاخوں) کے اختلافات ہیں۔ اصول (تنے) میں یہ سب حضرات متحد ہیں۔ اور اصل واحد (ایک تنے) سے جتنی بھی شاخیں پھوٹیں درخت ایک ہی رہتا ہے۔ متعدد درخت نہیں بن جاتے۔ البتہ اصول (تنے) مختلف ہو جائیں تو پھر درخت ایک نہیں رہے گا، متعدد ہو جائیں گے۔

ایک حدیث میں ان اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر گامزن ہونے والا نجات پانے والا ہے۔ وہ حدیث درج ذیل ہے:

حدیث ۔۔۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ضرور میری امت پر ایسا زمانہ آئے گا جیسا بنی اسرائیل پر آچکا ہے، جیسا کہ ایک چپل دوسرے چپل کے نمونہ پر کاٹا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ایسا شخص ہوا ہے جس نے اپنی ماں سے علانیہ بدفعلی کی ہے تو میری امت میں بھی ایسا شخص ضرور پیدا ہوگا۔ اور بیشک بنی اسرائیل بہتر گروہ ہو گئے، اور میری امت کے تہتر گروہ ہوں گے۔ وہ سب جہنم میں جائیں گے بجز ایک کے۔ صحابہ نے دریافت کیا: ''وہ ایک ناجی فرقہ کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ما أنا عليه وأصحابي** (جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں) (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث ۱۷۱)

ما أنا عليه میں سنت نبوی کی طرف اشارہ ہے (حدیثوں پر عمل کرنے والے اس کا مصداق نہیں ہیں) اور **أصحابي** سے اجماع امت مراد ہے، جس کا اعلیٰ فرد صحابہ کا اجماع ہے۔ یہی جماعت مؤمنین کی راہ ہے۔ جو اس سے برگشتہ ہے وہ جماعت حقہ کا فرد نہیں۔

قرآن کریم کی حجیت میں تو کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ احادیث اور اجماع کی حجیت میں اسلامی فرقوں نے اختلاف کیا ہے۔ حالانکہ سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ میں دونوں کی حجیت کا ایک ساتھ تذکرہ ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿ وَمَنْ يُشَاقِقِ

الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى، وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ، نُوَلِّهِ مَاتَوَلّٰى، وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ، وَسَاءَ تْ مَصِيْرًا﴾ یعنی جوشخص رسول کی مخالفت کرتا ہے، اس کے بعد کہ اس کے لئے امر حق ظاہر ہو چکا (یعنی حدیث کی حجیت کا انکار کرتا ہے، حالانکہ رسول کا رسول ہونا ثابت ہو چکا، اور اللہ کے رسول کی باتیں حجت نہ ہوں گی تو پھر رسول بھیجنے کا فائدہ ہی کیا ہوگا) اور وہ مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہولیا (یعنی اجماع امت سے برگشتہ ہوگیا) تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے۔ اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور بری ہے وہ جگہ جانے کی!

اس آیت سے امام شافعی رحمہ اللہ نے اجماع کی حجیت پر استدلال کیا ہے۔ پس فرقۂ ناجیہ اہل السنہ والجماعہ ہے یعنی جولوگ سنت نبوی کو اپناتے ہیں، احادیث نبویہ کو حجت مانتے ہیں اور جماعت مسلمین کی راہ پر چلتے ہیں یعنی اجماع امت کو حجت مانتے ہیں وہی اہل حق ہیں۔ اللّٰھم اجعلنا منھم!

فِرَق غیر ناجیہ: وہ گروہ ہیں جنھوں نے کوئی ایسا عقیدہ اپنایا ہے جو سلف کے عقیدے کے خلاف ہے۔ یا کوئی ایسا عمل اختیار کیا ہے جو جمہور صحابہ وتابعین کے عمل کے علاوہ ہے یعنی جس عمل پر امت کا اجماع ہے، اور وہ اجماع دور اول سے چلا آ رہا ہے جیسے تراویح کی ۲۰ رکعتیں جو فرقہ اس کو قبول نہیں کرتا وہ گمراہ فرقہ ہے۔

[۵] خَطَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم خطًا، ثم قال: " هذا سبيل الله"، ثم خطَّ خطوطًا عن يمينه وعن شماله، وقال: " هذه سُبُلٌ، على كل سبيل منها شيطان،يدعو إليه" وقرأ: ﴿وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ، وَلَاتَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ﴾

أقول: الفرقة الناجية: هم الآخذون في العقيدة والعمل جميعًا بما ظهر من الكتاب والسنة، وجرى عليه جمهور الصحابة والتابعين، وإن اختلفوا فيما بينهم فيما لم يشتهر فيه نصٌّ، ولاظهر من الصحابة اتفاقٌ عليه، استدلالاً منهم ببعض ما هنالك، أو تفسيرًا لمجمله؛ وغيرُ الناجية: كلُّ فرقةٍ انْتَحَلَتْ عقيدةً خلافَ عقيدة السلف، أو عملاً دون أعمالهم.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے ایک (لمبا) خط کھینچا۔ پھر فرمایا: "یہ اللہ کا راستہ ہے" الخ۔

میں کہتا ہوں: نجات پانے والے لوگ وہ ہیں جو اپنانے والے ہیں عقیدہ اور عمل دونوں میں اس بات کو جو بہ ظاہر ثابت ہوتی ہے کتاب وسنت سے، اور چلے ہیں اس پر جمہور صحابہ وتابعین۔ اگرچہ وہ باہم مختلف ہوئے ہوں اس بات میں جس میں کوئی نص مشہور نہیں ہوئی۔ اور نہ صحابہ کا اس پر اتفاق ظاہر ہوا ہے (وہ حضرات مختلف ہوئے ہیں) استدلال کرتے ہوئے اپنی طرف سے بعض ان باتوں میں جو وہاں ہیں (یعنی مسئلہ کے بارے میں جو قرائن ہیں، ان سے استدلال کرنے میں اختلاف ہوگیا ہے) یا کسی نص کے اجمال کی تفسیر کرتے ہوئے۔ اور نجات نہ پانے والے: ہر وہ

گروہ ہے جو منسوب ہوا ہے کسی ایسے عقیدے کی طرف جو سلف کے عقیدے کے خلاف ہے یا کسی ایسے عمل کی طرف جو ان کے عمل کے علاوہ ہے۔ (اِنْتَحَلَ مذھب کذا: منسوب ہونا)

☆ ☆ ☆

مجدّ دین کی ضرورت اور ان کے کارنامے

حدیث ــــــ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''یہ امت گمراہی پر اکٹھا نہیں ہوگی'' ترمذی (۳۹:۲) کی روایت میں ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ میری امت کو ــ یا فرمایا: محمدؐ کی امت کو ــ کسی گمراہی پر اکٹھا نہیں کریں گے۔ اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ اور جو (جماعت سے) علحدہ ہوا وہ جہنم میں جھونک دیا جائے گا'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۳) اور مستدرک حاکم (۱۱۵:۱) میں ہے کہ: ''سوادِ اعظم کی پیروی کرو، پس جو شخص (سوادِ اعظم سے) علحدہ ہوا وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا (مشکوۃ حدیث ۱۷۴)

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ عزوجل بھیجیں گے اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر اس شخص کو جو امت کے لئے اس کے دین کی تجدید کرے گا''[1]

اس حدیث کی شرح درج ذیل روایت کرتی ہے:

حدیث ــــــ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اس علم کو لیں گے ہر آنے والی نسل کے نیک (ثقہ اور معتمد) لوگ۔ وہ اس علم سے دور کریں گے: حد سے بڑھنے والوں کی تحریف اور باطل پرستوں کا جھوٹ اور جاہلوں کی تاویل'' (مشکوۃ حدیث ۲۴۸)

تشریح: آنحضرت ﷺ سے پہلے جب لوگوں نے اللہ کے دین میں اختلاف کیا۔ اور زمین میں بگاڑ پھیلایا۔ تو صورت حال نے تقاضا کیا اور اللہ تعالیٰ نے رحمت عالم ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اور آپؐ کی بعثت کے ذریعہ سابقہ ملت کی کجی کو درست کیا۔ اور اللہ کے دین کو تروتازہ کردیا۔

پھر جب آپؐ نے وفات پائی تو وہ عنایت الٰہی بعینہ آپ کے لائے ہوئے علم وہدایت کی طرف متوجہ ہوئی۔ کیونکہ نبوت کا سلسلہ آپؐ پر منتہی ہوگیا تھا۔ اب ہدایت کی روشنی آپؐ کے دین کے بقاء پر موقوف تھی، اس لئے مصلحت خداوندی میں اس آخری دین کی حفاظت ضروری ہوئی۔ پس وہ مہر الٰہی امت کے دلوں میں الہامات اور دیگر تقریبات کا باعث بنی۔

غرض بارگاہ خداوندی میں فیصلہ ہو چکا ہے کہ ہدایت لوگوں میں قیامت تک برقرار رہے گی اس لئے ضروری ہوا کہ لوگوں میں لامحالہ ایک ایسی امت رہے جو دین کی حفاظت کرتی رہے اور یہ بھی ضروری ہوا کہ امت ساری گمراہی پر متفق

[1] رواہ ابوداؤد حدیث ۴۲۱۹ مستدرک ۵۲۲:۴ فتح الباری ۲۹۵:۱۳ ولم یتکلم فیه فهو عنده حسن ۱۲

نہ ہو جائے اور یہ بھی ضروری ہوا کہ قرآن کریم لوگوں میں ہمیشہ محفوظ رہے۔

اِدھر صورت حال یہ ہے کہ جس طرح شاندار حویلی میں عرصۂ دراز گذرنے سے مکڑیاں جالے تنتی ہیں، گرد وغبار جمتی ہے، کہیں سے پلاستر اکھڑتا ہے اور رنگ و روغن (پینٹ) پھیکا پڑتا ہے یا اڑ جاتا ہے تو حویلی کی صفائی اور تزئین کاری ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگوں کی استعدادوں کے اختلاف نے کہ کوئی عالم ہے اور کوئی جاہل، واجب کیا کہ مدت مدید گزرنے پر لوگ اپنی طرف سے دین میں کچھ ایسی چیزیں شامل کر دیں جو دین میں سے نہیں ہیں۔ ایسے وقت میں لطفِ خداوندی ایسے رجال کار کو کھڑا کرتا ہے جو دین کی عمارت کی صفائی اور تزئین کاری کا کام کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوتے ہیں جن کی سربلندی کا قدرت فیصلہ کر چکی ہوتی ہے۔ یہی مجددین امت ہیں۔ یہ حضرات پہلے علم دین خوب محنت سے حاصل کرتے ہیں، پھر تین قسم کے کام کرتے ہیں:

پہلا کام: غالی (حد سے بڑھا ہوا شخص) دین میں جو تحریف کرتا ہے، یہ حضرات اس کو دور کرتے ہیں۔ جیسے غالی شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مانتے ہیں یا اماموں کو پیغمبروں کا درجہ دیتے ہیں۔ مجددین ایسے امور کی اصلاح کرتے ہیں۔ غرض تشدد اور تعمق کی راہ سے جو خرابیاں دین میں در آتی ہیں ان کو یہ حضرات دور کرتے ہیں۔

دوسرا کام: باطل پرستوں کے ادّعاءات کی قلعی کھولتے ہیں، جیسے ملعون قادیانی کا دعوئے نبوت۔ غرض استحسان (جاہلوں کی پسندیدگی) اور دو ملتوں میں خلط ملط کرنے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کو یہ حضرات دور کرتے ہیں۔

تیسرا کام: جاہلوں کی غلط تاویلات سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ جیسے رضا خانیوں کا سورۃ المائدہ کی آیت ۱۵ سے استدلال کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے اور آپ کا سایہ نہیں تھا۔ حالانکہ آیت میں نور (ایک روشن چیز) سے مراد قرآن ہے، کیونکہ آگے یَهْدِی بِهٖ میں مفرد ضمیر آئی ہے اور مسند احمد (۳۳۸:۶) کی روایت سے آپ کا سایہ ہونا ثابت ہے۔ غرض تہاون کی راہ سے اور ضعیف تاویلات کی بنیاد پر مامور بہ کو ترک کرنے کی وجہ سے دین میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، مجددین ان کو بھی دور کرتے ہیں۔

[٦] قوله صلى الله عليه وسلم: " لا تجتمع هذه الأمةُ على الضلالة" وقوله صلى الله عليه وسلم: "يبعث الله لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدِّد لها دينها" وتفسيره في حديث آخر: "يَحْمِلُ هذا العلمَ من كل خَلَفٍ عُدولُه، يَنْفُوْنَ عنه تحريفَ الغالِين، وانتحالَ المبطلين، وتأويلَ الجاهلين"

اعلم أن الناس لما اختلفوا في الدين، وأفسدوا في الأرض: قرع ذلك بابَ جودِ الحق، فبعث محمدًا صلى الله عليه وسلم، وأراد بذلك إقامةَ الملة العوجاء، ثم لما توفي النبي صلى الله عليه وسلم صارت تلك العنايةُ بعينها متوجهةً إلى حفظِ علمِه ورُشدِه فيما بينهم، فأورثت فيهم إلهاماتٍ وتقريباتٍ.

ففی حظیرة القدس داعیة لإقامة الهدایة فیهم مالم تقم الساعة، فوجب لذلك أن یكون فیهم لا محالة أمةٌ قائمة بأمر الله، وأن لا یجتمعوا علی الضلالة بأسرهم، وأن یُحفظ القرآنُ فیهم.

وأوجب اختلافُ استعدادهم: أن یَلحق بماعندهم مع ذلك شیئ من التغیر، فانتظرتِ العنایةُ لناسٍ مستعدین، قُضی لهم بالتنویه، فاورثت فی قلوبهم الرغبةَ فی العلم، ونَفْیِ تحریف الغالین، وهو إشارة إلی التشدُّد والتعمُّق، وانتحالِ المبطلین، وهو إشارة إلی الاستحسان، وخَلْطِ ملةٍ بملة، وتأویلِ الجاهلین، وهو إشارة إلی التهاون، وترك المأمور به بتأویل ضعیف.

ترجمہ: (۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہیں اکٹھا ہوگی یہ امت گمراہی پر'' اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بھیجیں گے اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر (یعنی سو سال پورے ہونے پر) اس شخص کو جو نیا کرے گا امت کے لئے اس کے دین کو'' اور اس کی تفسیر ایک دوسری حدیث میں ہے: ''اٹھائیں گے اس علم کو ہر مابعد نسل میں سے اس کے معتبر لوگ، دور کریں گے وہ اس سے غالی لوگوں کی تحریفات کو، اور باطل پرستوں کے ادّعاءات کو، اور جاہلوں کی تاویلات کو''

جان لیں کہ جب لوگوں نے دین میں اختلاف کیا۔ اور زمین میں فساد پھیلایا، تو اس چیز نے دستک دی جود الٰہی کے دروازے پر، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اور اس بعثت سے ارادہ فرمایا کج ملت کو سیدھا کرنے کا۔ پھر جب آنحضرت ﷺ نے وفات پائی تو ہوگئی وہ مہربانی بعینہٖ متوجہ ہونے والی آپؐ کے علم کی اور آپ کی ہدایت کی لوگوں میں حفاظت کی طرف، پس پیچھے لائی وہ مہربانی لوگوں میں الہامات کو اور تقریبات کو۔

پس بارگاہ خداوندی میں ایک ارادہ ہے ہدایت کو برقرار رکھنے کا لوگوں میں قیامت کے دن تک۔ پس بایں وجہ ضروری ہوا کہ ہو لوگوں میں لامحالہ ایک ایسی امت جو اللہ کے دین کی حفاظت کرنے والی ہو، اور یہ کہ نہ اکٹھا ہوں وہ سارے کے سارے گمراہی پر، اور یہ کہ محفوظ رکھا جائے ان میں قرآن۔

اور لوگوں کی استعداد کے اختلاف نے واجب کیا کہ مل جائے اس دین کے ساتھ جو ان کے پاس ہے، اس کے ساتھ کچھ تبدیلی۔ پس مہر خداوندی نے انتظار کیا کچھ مستعد لوگوں کا، جن کے لئے سربلندی کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ پس پیچھے لائی وہ مہر خداوندی ان کے دلوں میں علم کی رغبت کو، اور غالی لوگوں کی تحریف کے دور کرنے کو، اور وہ اشارہ ہے تشدد وتعمق کی طرف۔ اور باطل پرستوں کے ادّعاءات کے دور کرنے کو، اور وہ اشارہ ہے استحسان اور ایک ملت کو دوسری ملت کے ساتھ خلط کرنے کی طرف۔ اور جاہلوں کی تاویلات کے دور کرنے کو، اور وہ اشارہ ہے تہاون کی طرف اور مامور بہ کو چھوڑنے کی طرف ضعیف تاویل کے ذریعہ (تفصیل کے لئے دیکھیں مبحث سادس کا باب ۱۸)

علماء انبیاء کے وارث ہیں

حدیث ـــــ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر چاہتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں'' (متفق علیہ، مشکوۃ، کتاب العلم، حدیث ۲۰۰)

حدیث ـــــ ایک طویل حدیث میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بیشک علماء انبیاء کے وارث (جانشین) ہیں۔ اور انبیاء نے دینار و درہم کا ورثہ نہیں چھوڑا، انھوں نے علم ہی کا ورثہ چھوڑا ہے۔ پس جس نے وہ علم حاصل کیا اس نے کامل حصہ لیا'' (مشکوۃ، حدیث ۲۱۲)

حدیث ـــــ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے عابد و عالم: دو شخصوں کا تذکرہ کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''عالم کی عابد پر برتری ایسی ہے جیسی میری تم میں سے ایک معمولی آدمی پر برتری!'' (مشکوۃ حدیث ۲۱۳)

اور اس قسم کی اور روایتیں بھی ہیں۔ جیسے ایک ضعیف حدیث ہے: **فقیهٌ واحدٌ أشدُّ على الشيطان من ألف عابدٍ**: ایک فقیہ (مسائل کا ماہر) شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ اور ایک دوسری مرسل روایت میں ہے کہ: ''جس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم دین حاصل کر رہا ہوتا کہ اس کے ذریعہ اسلام کو زندہ کرے، تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنت میں ایک درجہ (کا فرق) ہوگا'' (رواہ الدارمی، مشکوۃ حدیث ۲۴۹) اور اس قسم کی اور بھی حدیثیں ہیں، جن میں علماء کا مقام و مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔

تشریح: علماء کا یہ مقام و مرتبہ اس لئے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی ہستی کو نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں، اور اس سے مخلوق کی ہدایت کا کام لیتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نوازشیں ہوں۔ اور فرشتے مامور ہوں کہ وہ اس ہستی سے محبت کریں اور اس کی عظمت کا دم بھریں۔ پہلے مبحث اول کے باب سوم میں یہ روایت بیان کی جا چکی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اس سے محبت کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کی مقبولیت رکھی جاتی ہے۔

پھر جب نبی اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں، تو وہ نوازشیں جو نبی کے ساتھ مخصوص تھیں حاملین علوم نبوت، ناقلین شریعت اور ناشرینِ دین پر مبذول ہوتی ہیں، اس لحاظ سے کہ وہ نبی کی ملت کے محافظ ہیں۔ اس طرح علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو بے شمار فوائد و برکات سے نوازتے ہیں۔

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم: '' من يُرِدِ اللّٰهُ به خيرًا يُفَقِّهْهُ في الدين'' وقوله صلى الله عليه وسلم: '' إن العلماءَ وَرَثَةُ الأنبياء'' وقوله صلى الله عليه وسلم: '' فضل العالم على العابد كفضلي على أدناكم'' وأمثالُ ذلك.

اعلم أن العناية الإلٓهية إذا حلَّتْ بشخص، وصَيَّره الله مَظِنَّةً لتدبير إلٓهي لابد أن يصير مرحومًا، وأن تُؤمر الملائكةُ بمحبته وتعظيمه لحديث مَحَبةِ جبرائيل، ووضع القبول في الأرض.

ولما انتقل النبيُّ صلى الله عليه وسلم نزلت العناية الخاصَّةُ به بحَسَبِ حفظِ ملته إلى حَمَلَةِ العلم، ورُواته، ومُشِيْعِيْهِ، فأَنْتَجَ فيهم فوائدَ لا تُحْصى.

ترجمہ: (۷) آنحضرت ﷺ کے تین ارشادات۔ (جن کا ترجمہ اوپر آچکا ہے)

جان لیں کہ الطافِ خداوندی جب کسی شخص پر نازل ہوتے ہیں، اور اس کو اللہ تعالیٰ تدبیر الٰہی کی احتمالی جگہ بناتے ہیں، تو ضروری ہے کہ وہ مہربانی کیا ہوا ہو، اور یہ کہ فرشتے حکم دیئے جائیں اس سے محبت اور اس کی تعظیم کرنے کا محبت جبرئیل اور زمین میں قبولیت رکھنے کی حدیث کی وجہ سے۔

پھر جب نبی ﷺ (عالم بالا کی طرف) منتقل ہوگئے، تو اتری وہ عنایت جو آپؐ کے ساتھ خاص تھی، آپؐ کی ملت کی حفاظت کے لحاظ سے علم نبوت کے حاملین پر اور ناقلین علم پر اور اس علم کو پھیلانے والوں پر۔ پس پیدا کئے (اللہ نے) ان میں بے شمار فوائد۔

لغات: حَلَّ بالمکان: نازل ہونا، اترنا...... مُشِيْعِيْه: اسم فاعل جمع کا صیغہ ضمیر کی طرف مضاف ہے۔ إشاعة: پھیلانا...... أَنْتَجَ: برسانا کہا جاتا ہے أَنْتَجَتِ الريحُ السحابَ: بارش برسانا۔

☆ ☆ ☆

محدثین کے لئے تروتازگی کی دعا

حدیث ــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تازہ رکھیں اس بندے کو (یعنی قدر ومنزلت بڑھائیں۔ اور اس کو بہت خوشی حاصل ہو) جس نے میری بات سنی، پس اس کو یاد کیا اور اس کو محفوظ کیا، اور (دوسروں تک) پہنچایا۔ پس بعضے حاملین فقہ فقیہ نہیں ہوتے اور بعضے حاملین فقہ اس شخص کو پہنچاتے ہیں جو اس سے بڑا فقیہ ہوتا ہے'' (یعنی بعض حدیث کو یاد کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے یا فقیہ ہوتے ہیں مگر جس کو وہ پہنچاتے ہیں وہ زیادہ سمجھ رکھتا ہے، پس چاہئے کہ حدیث بعینہٖ پہنچائے تاکہ آگے والا اس سے مسائل مستنبط کرے) (مشکوۃ حدیث نمبر ۲۲۸ و ۲۳۰)

تشریح: علماء یعنی حاملین وناقلین وناشرین علوم نبوت تو انبیاء کے جانشین ہیں۔ ان کا مقام ومرتبہ تو بہت بلند ہے۔ ان کے بعد درجہ اُن محدثین کرام کا ہے جو فقیہ نہیں ہیں۔ ان کو بھی رسول اللہ ﷺ نے شادابی کی دعا دی ہے۔ یہ

فضیلت ان کو بایں وجہ حاصل ہوئی ہے کہ وہ بھی کسی درجہ میں ہدایت نبوی کو مخلوق تک پہنچانے والے ہیں۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " نَضَّرَ الله عبدًا سمع مقالتي، فَحَفِظَها ووَعَاها، وأدَّاها كما سمعها"
أقول: سبب هذا الفضل أنه مَظِنَّةٌ لحمل الهداية النبوية إلى الخلق.

ترجمہ: (۸) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''شاداب رکھیں الخ'' میں کہتا ہوں: اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ وہ (محدثین) احتمالی جگہ ہیں ہدایت نبوی کو مخلوق کی طرف اٹھانے کے لئے یعنی پہنچانے کے لئے۔

☆ ☆ ☆

حدیث میں کذب بیانی کبیرہ گناہ ہے

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس نے جان کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ڈھونڈھے!'' (مشکوۃ ۱۹۸)

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''آخر زمانہ میں بڑے فریبی بڑے جھوٹے لوگ ہوں گے، جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے، جو نہ تم نے سنی ہوں گی، نہ تمہارے باپ دادوں نے۔ پس بچو تم اُن سے، اور بچاؤ ان کو اپنے سے۔ نہ گمراہ کردیں وہ تم کو اور نہ فتنہ میں ڈال دیں وہ تم کو'' (مشکوۃ حدیث ۱۵۴)

تشریح: حدیث میں کذب بیانی کبیرہ گناہ ہے۔ پہلی حدیث میں جو وعید ہے وہ اس حرکت کے کبیرہ گناہ ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کی صدیوں تک دین کے پہنچنے کی راہ بس روایت ہی ہے۔ پس اگر روایات میں فساد درآئے گا تو دین کیسے محفوظ رہے گا؟! اس لئے روایت حدیث میں غایت درجہ احتیاط ضروری ہے۔ اور احتیاط کی دو صورتیں ہیں: (۱) راوی خود روایت حدیث میں بے احتیاطی نہ برتے۔ پورے تیقظ کے ساتھ روایت بیان کرے (۲) برخود غلط قسم کے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ بلکہ ان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ دوسری روایت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم: " من كَذَب عليَّ متعمِّدًا فَلْيَتَبَوأْ مقعده من النار" وقوله صلى الله عليه وسلم: " يكون في آخر الزمان دجّالون كذا بون"
أقول: لما كان طريقُ بلوغِ الدين إلى الأعصار المتأخرة، إنما هي الرواية، وإذا دخل الفساد من جهة الرواية لم يكن له علاج ألبتة، كان الكَذِبُ على النبي صلى الله عليه وسلم كبيرةً، ووجب الاحتياط في الرواية، لئلا يُروى كِذْبًا.

ترجمہ: (۹) آپ ﷺ کے ارشادات (جن کا ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: جب بعد کے زمانوں تک دین

کے پہنچنے کی راہ بس روایت ہی تھی، اور جب فساد داخل ہو روایت کی جہت سے، تو قطعی بات ہے کہ اس کے لئے کوئی علاج نہیں ہوگا (تو) نبی ﷺ پر جھوٹ باندھنا کبیرہ گناہ ہوا، اور احتیاط واجب ہوئی روایتِ حدیث میں، تاکہ جھوٹ کے طور پر حدیث روایت نہ کی جائے۔

☆　☆　☆

اسرائیلی روایات کے احکام

حدیث —— مذکورہ حدیث میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''بنی اسرائیل سے باتیں نقل کرو، اس میں کوئی حرج نہیں''

حدیث —— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھ کر، عربی میں مسلمانوں کے لئے تشریح کرتے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''نہ سچا جانو اہل کتاب کو، اور نہ جھٹلاؤ ان کو، اور کہو ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس وحی پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے، اور اس پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب پر اتاری گئی ہے۔ اور اس پر جو موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) دیئے گئے ہیں، اور اس پر جو دیگر انبیاء دیئے گئے ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے۔ تفریق نہیں کرتے ہم ان میں سے کسی کے درمیان، اور ہم اللہ کے مطیع ہیں (سورۃ البقرہ آیت ۱۳۶) (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۱۵۵)

علاوہ ازیں وہ حدیث بھی اس موقع پر پڑھ لی جائے، جس میں آپؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ہے: ''کیا تم یہود ونصاریٰ کی طرح دین کے معاملہ میں حیرت کا شکار ہو؟ الخ

مسئلہ (۱) اہل کتاب سے کتاب وسنت کی تائید کے طور پر کوئی بات نقل کرنا درست ہے۔ بشرطیکہ اس بات کا اطمینان ہو کہ دین کے احکام میں خلط ملط نہ ہوگا۔ اور اس کے علاوہ دیگر باتیں نقل کرنا جائز نہیں۔ (بائبل سے باتیں نقل کرنے کا بھی یہی حکم ہے)

مسئلہ (۲) تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں جو اسرائیلیات ہیں، ان میں سے بیشتر علمائے اہل کتاب سے مروی ہیں، ان پر کسی حکم شرعی یا کسی اعتقاد کی بنیاد قائم کرنا جائز نہیں۔

نوٹ: الفوز الکبیر باب رابع کی فصل اول میں شاہ صاحب نے تفسیر میں اسرائیلی روایات نقل کرنے کو اسلام کے خلاف ایک سازش قرار دیا ہے جو دین میں در آئی ہے۔ دیکھئے الخیر الکثیر ص ۴۵۰

[۱۰] قوله صلى الله عليه وسلم: " حَدِّثوا عن بنى إسرائيل، ولا حرج" وقوله صلى الله عليه وسلم: " لا تُصَدِّقوهم ولاتكذّبوهم"

أقول: الرواية عن أهل الكتاب تجوز فيما سبيلُه سبيلُ الاعتبار، وحيث يكون الأَمْنُ عن

الاختلاط في شرائع الدين؛ ولا تجوز فيما سوى ذلك.

ومما ينبغي أن يُعلم أن غالبَ الإسرائيليات المدسوسة في كتب التفسير والأخبار منقولةٌ عن أحبار أهل الكتاب، لا ينبغي أن يُبنى عليها حكمٌ واعتقادٌ، فتدبر.

ترجمہ: (۱۰) آپؐ کا ارشاد (جسکا ترجمہ اوپر آچکا) میں کہتا ہوں: اہل کتاب سے روایت جائز ہے اُس چیز میں جس کی راہ اعتبار (تائید) کی راہ ہے، اور جہاں اطمینان ہو دین کے احکام میں غت ربود ہونے سے۔ اور جائز نہیں اس کے علاوہ میں۔

اور اُن باتوں میں سے جن کو جاننا مناسب ہے یہ ہے کہ اکثر اسرائیلیات جو تفسیر کی کتابوں میں اور تاریخ کی کتابوں میں ٹھونسی گئی ہیں، وہ علمائے اہل کتاب سے مروی ہیں، مناسب نہیں کہ ان پر مدار رکھا جائے کسی حکم شرعی کا یا کسی عقیدے کا۔ پس سوچ لے۔

دنیوی اغراض کے لئے علم دین سیکھنا اور سکھانا حرام ہے

حدیث —— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کوئی علم سیکھا، اُن علوم میں سے جن کے ذریعہ اللہ کی رضا طلب کی جاتی ہے (یعنی دینی علم) نہیں سیکھتا ہے وہ اس کو مگر اس لئے کہ حاصل کرے اس کے ذریعہ دنیا کا سامان، تو وہ قیامت کے دن جنت کی مہک نہیں پائے گا'' یعنی اس کی بو (تک نہیں سونگھ سکے گا، جنت میں جانا تو درکنار!) (مشکوۃ حدیث ۲۲۷)

تشریح: دنیا کمانے کے لئے یعنی سرکاری عہدہ حاصل کرنے کے لئے: قاضی یا شیخ الاسلام بننے کے لئے یا پیٹ پالنے کے لئے دینی علم حاصل کرنا حرام ہے، حدیث میں اسی کا تذکرہ ہے۔

اسی طرح ایسے شخص کو جو علم دین کی تحصیل سے فاسد غرض رکھتا ہے، دین کی تعلیم دینا بھی بچند وجوہ حرام ہے:

پہلی وجہ: ایسا شخص عام طور پر دین سیکھنے کے بعد دنیوی اغراض کے لئے ضعیف تاویلات کے ذریعہ دین میں تحریف کا مرتکب ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس ذریعہ ہی کا سد باب کر دیا جائے۔

دوسری وجہ: ایسے شخص کو دین کی تعلیم دینا قرآن وحدیث کا احترام ملحوظ نہ رکھنا ہے، اور ان کے بارے میں لاپروائی برتنا ہے۔

نوٹ: سکھلانے کی حرمت کا اگرچہ حدیث میں صراحۃ تذکرہ نہیں، مگر اس کی حرمت بھی حدیث میں شامل ہے۔

[۱۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "من تعلَّم علمًا مما يُبتغى به وجهُ الله، لايتعلَّمه إلا لِيُصيب به عَرَضًا من الدنيا لم يجد عَرْفَ الجنة يوم القيامة" يعني ريحَها.

أقول: يحرم طلبُ العلم الديني لأجل الدنيا، ويحرم تعليمُ من يَرَى فيه الغرضَ الفاسد لوجوه: منها: أن مثله لايخلو غالبًا من تحريف الدين لأغراض الدنيا بتأويل ضعيفٍ، فوجب سدُّ الذريعة. ومنها: ترك حرمة القرآن والسنن، وعدمُ الاكتراث بها.

ترجمہ: (۱۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جس نے سیکھا الخ'' میں کہتا ہوں: دنیا کے لئے دینی علم حاصل کرنا حرام ہے۔ اور اس شخص کو سکھلانا بھی حرام ہے جو اس میں فاسد غرض رکھتا ہے، بچند وجوہ: ان میں سے: یہ ہے کہ اس طرح کا آدمی عام طور پر خالی نہیں ہوتا دین کی تحریف سے، دنیا کمانے کے لئے، کمزور (یعنی باطل) تاویلات کے ذریعہ، پس ضروری ہوا سوراخ کا بند کرنا۔ اور ان میں سے: قرآن وحدیث کے احترام کو ملحوظ نہ رکھنا ہے۔ اور ان کی پروانہ کرنا ہے (اِكْتَرَثَ للأمر: پروا کرنا كَرَثَ الغمُّ فلانا: سخت غمگین کرنا)

☆ ☆ ☆

بوقت حاجت علم دین کو چھپانا حرام ہے

حدیث ــــــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس سے کوئی علمی (دینی) بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا ہے، پس اس نے اس کو چھپایا (یعنی نہ بتایا) تو وہ قیامت کے دن آگ کی لگام دیا جائے گا'' (مشکوۃ حدیث ۲۲۳)

تشریح: حدیث شریف میں کتمان علم کی سزا آگ کی لگام بیان کی گئی ہے۔ دونوں باتوں کی وجہ درج ذیل ہے:

پہلی بات: بوقت حاجت علم دین کو چھپانا دو وجہ سے حرام ہے:

پہلی وجہ: یہ تہاون کا سرچشمہ ہے یعنی اشاعت دین سے لاپروائی ہے۔ ہر عالم دین کا فریضہ ہے کہ وہ تعلیم وتعلم کے ذریعہ اشاعت دین کا اہتمام کرے۔ ورنہ لوگ دین سیکھنے کا خیال ہی چھوڑ دیں گے، کیونکہ کوئی دین سکھلانے والا ہی نہیں ہوگا۔

دوسری وجہ: علم بیان کرنے سے محفوظ اور تازہ رہتا ہے۔ جو علم کو چھپاتا ہے وہ رفتہ رفتہ اس کو بھول جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مال جمع رکھنے سے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ اور جس طرح قرآن پاک کو بھول جانا بڑا وبال ہے، احکام شرعیہ کو بھول جانا بھی باعث خسران ہے۔

دوسری بات: اخروی جزاؤں کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ وہ جنس عمل سے ہوتی ہیں یعنی عمل اور اس کی جزاء میں مناسبت ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس شخص کا گناہ یہ ہے کہ اس نے حق کے اظہار سے زبان کو روکا ہے، اس لئے سزا بھی اسی قبیل سے دی جائے گی۔ لگام دینا منہ بند کرنے کا پیکر محسوس ہے، اس لئے آخرت میں کتمان علم کی یہ سزا تجویز کی گئی ہے۔

[۱۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "من سُئل عن علم عَلِمه، ثم كتمه، أُلجم يوم القيامة بِلِجَام من النار"
أقول: يحرم كتمُ العلم عند الحاجة إليه، لأنه أصل التهاون، وسببُ نسيان الشرائع؛ وأَجْزِيَةُ المعاد تُبنى على المناسبات، فلما كان الإثم كفَّ لسانه عن النطق، جوزى بشَبَح الكف، وهو اللجام من نار.

ترجمہ: (۱۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جس سے کوئی علمی بات الخ'' میں کہتا ہوں: علم کا چھپانا حرام ہے اس کی حاجت کے وقت، اس لئے کہ وہ تہاون کی جڑ ہے اور احکام شرعیہ کو بھولنے کا سبب ہے۔ اور اُخروی جزائیں مناسبتوں پر مبنی ہیں۔ پس جب گناہ بولنے سے زبان کو روکنا تھا تو وہ سزا دیا گیا روکنے کے پیکر محسوس کے ذریعہ، اور وہ آگ کی لگام ہے۔

☆ ☆ ☆

فرض کفایہ علوم اور ان کی تعیین وتفصیل

حدیث ـــــــ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''علم تین ہیں: آیت محکمہ یا سنت قائمہ یا فریضۂ عادلہ، اور جو علوم ان کے سوا ہیں وہ فضل (زائد) ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۹) (اس حدیث میں اَوْ تنویع کے لئے ہے)

تشریح: اس حدیث میں علم دین کے اُس درجہ کا بیان نہیں ہے جو فرض عین ہے۔ اس کا بیان **طلب العلم فریضة على كل مسلم** میں ہے۔ اس حدیث میں علم دین کے اس درجہ کا بیان ہے جو فرض کفایہ ہے۔ لفظ: فرض کفایہ کی تقدیر عبارت: فرض بقدرِ کفایہ ہے یعنی اتنے لوگوں پر اس علم کا جاننا ضروری ہے جن سے امت کی ہر طرح کی دینی ضرورت پوری ہوجائے۔

فرض کفایہ کے درجہ میں جو علوم ضروری ہیں وہ تین ہیں:

پہلا علم: قرآن کریم کا تفصیلی علم: یعنی وہ علوم جو نظم قرآنی سے متعلق ہیں، جیسے نحو وصرف، لغت واشتقاق اور تجوید وغیرہ کا جاننا، اسی طرح قرآن کریم کی جو محکم آیات ہیں، جن پر دین وشریعت کا مدار ہے ان کو تفصیل سے جاننا۔ قرآن کریم کے مشکل کلمات کی وضاحت، آیات کا شان نزول، غامض باتوں کی توجیہ یعنی ان کو اس طرح پیش کرنا کہ اذہان قبول کرلیں اور کوئی اشکال باقی نہ رہے اور ناسخ ومنسوخ آیات کو جاننا فرض کفایہ ہے ـــــــ رہی وہ آیات جو از قبیل متشابہات ہیں، جیسے حروف مقطعات اور آیات صفات، تو ان کا حکم یہ ہے کہ ان کی مراد میں توقف کیا جائے یا محکم آیات کے ذریعہ ان کی مراد متعین کی جائے اگر یہ بات ممکن ہو۔

دوسرا علم: سنت قائمہ (معمول بہا احادیث) کا علم: یعنی ان روایات کو جاننا بھی فرض کفایہ کے درجہ میں ضروری

ہے جو احکام شرعیہ یا آداب اسلامی سے متعلق ہیں۔ خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معیشت کی مفید تدبیروں سے۔ جن کا تفصیلی بیان علم فقہ میں ہے ـــــ اور قائم (برقرار) کا مطلب یہ ہے کہ وہ روایات نہ تو منسوخ ہوں، نہ متروک، نہ شاذ اور وہ صحابہ وتابعین میں عام طور پر معمول بہا رہی ہوں۔

ان میں اعلیٰ درجہ کی روایات وہ ہیں جو فقہائے مدینہ اور فقہائے کوفہ کے درمیان متفق علیہ ہیں۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ ان مسائل پر چاروں فقہی مکاتب فکر متفق ہوں۔

اور اس کے بعد درجہ ان روایات کا ہے جن میں صحابۂ کرام میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ان کے دو یا تین قول ہیں، اور ہر قول پر کسی نہ کسی فقیہ کا عمل رہا ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ روایات موطا مالک، مصنف عبدالرزاق جیسی کتابوں میں موجود ہوں۔ اس زمانہ تک جو روایتیں مخفی رہیں اور بعد کی کتابوں میں، جن میں رطب ویابس جمع کیا گیا ہے، لی گئیں ان کا اعتبار نہیں۔

یہی دو قسم کی روایتیں سنت قائمہ ہیں، ان کے علاوہ جو باتیں کتب حدیث میں ہیں، وہ بعض فقہائے متقدمین کی آراء ہیں، جو کسی حدیث کی تفسیر میں یا اس پر تفریع کرتے ہوئے یا کسی روایت سے استدلال کرتے ہوئے یا استنباط کے طور پر وجود میں آئی ہیں۔ وہ باتیں سنت قائمہ میں شامل نہیں۔

تیسرا علم: فریضۂ عادلہ کا علم: فریضہ کے معنی ہیں: متعین کردہ بات فَرَضَ الأمر کے معنی ہیں: متعین کرنا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ فریضۂ عادلہ سے مراد علم میراث میں ذوی الفروض کے حصص ہیں۔ نیز قضاء وعدالت کے وہ مسائل بھی فریضۂ عادلہ میں شامل ہیں جن کے ذریعہ مسلمانوں کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔ اور راقم کے خیال میں معاملات کے سارے ہی مسائل فریضۂ عادلہ کا مصداق ہیں۔ ان کی خصوصی اہمیت کی وجہ سے ان کو علحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ اور فریضہ کے ساتھ عادلہ کی قید یہ واضح کرنے کے لئے بڑھائی گئی ہے کہ معاملاتی مسائل کو بروئے کار لایا جائے گا تو معاشرہ عدل وانصاف کا گہوارہ بن جائے گا۔

غرض یہ تین علوم فرض کفایہ ہیں۔ کسی بھی شہر کا ان علوم کے جاننے والے سے خالی ہونا حرام ہے۔ کیونکہ دین کا دارومدار انہی علوم پر ہے۔ اور ان کے ماسواء دیگر علوم فضل مزید ہیں، بشرطیکہ شرعاً ان کی تحصیل جائز ہو۔ فضل کے معنی: فضول نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگ کم علمی سے ایسا خیال کرتے ہیں۔

[۱۳] قوله صلى الله عليه وسلم:" العلم ثلاثة: آيةٌ محكمة، أو سنة قائمة، أو فريضة عادلة، وما كان سوى ذلك فهو فضلٌ"

أقول: هذا ضبطٌ وتحديدٌ لما يجب عليهم بالكفاية، فيجب:

[الف] معرفةُ القرآن لفظًا، ومعرفةُ محكمِه بالبحث عن شرح غريبه، وأسبابِ نزوله، وتوجيهِ

مُعْضَلِه، وناسخِه ومنسوخه؛ أما المتشابه: فحكمُه التوقفُ، أو الإرجاعُ إلى المحكم.

[ب] والسنة القائمة: ما ثبت في العبادات والارتفاقات من الشرائع والسنن، مما يشتمل عليه علمُ الفقه.

والقائمة: مالم يُنسخ، ولم يُهجر، ولم يَشُذَّ راويه، وجرى عليه جمهور الصحابة والتابعين:

أعلاها: ما اتفق فقهاءُ المدينة والكوفة عليه. وآيتُه: أن يتفق على ذلك المذاهبُ الأربعة.

ثم: ما كان فيه قولان لجمهور الصحابة، أو ثلاثة، كلُّ ذلك قد عمل به طائفة من أهل العلم. وآيةُ ذلك: أن تظهر في مثل الموطأ وجامع عبدِ الرزاق رواياتُهم.

وما سوى ذلك: فإنما هو استنباطُ بعض الفقهاء دون بعض: تفسيرًا وتخريجًا، أو استدلالاً واستنباطًا، وليس من القائمة.

[ج] والفريضة العادلة: الأنْصِباءُ للورثة، ويُلحق به أبوابُ القضاء، مما سبيلُه قطعُ المنازعة بين المسلمين بالعدل.

فهذه الثلاثة: يحرم خُلُوُّ البلد عن عالِمها، لتوقُّف الدين عليه، وما سوى ذلك من باب الفضل والزيادة.

ترجمہ: (۱۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''علم تین ہیں الخ'' میں کہتا ہوں: یہ منضبط کرنا ہے اور متعین کرنا ہے ان علوم کو جن کی تحصیل لوگوں پر واجب علی الکفایہ ہے۔ پس واجب ہے:

(الف) قرآن کو جاننا لفظوں کے اعتبار سے، اور اس کے محکم کو پہچاننا بحث کر کے اس کے نامانوس الفاظ کی تشریح سے، اور اس کے شان نزول کو، اور اس کے غامض کی توجیہ کو اور اس کے ناسخ ومنسوخ کو پہچاننا۔ رہا متشابہ (حصہ) پس اس کا حکم توقف کرنا ہے یا محکم کی طرف لوٹانا ہے۔

(ب) سنت قائمہ: وہ احکام شرعیہ اور سنن نبویہ ہیں جو ثابت ہوئی ہیں عبادتوں اور معیشت کی مفید تدبیروں میں، ان میں سے جس پر علم فقہ مشتمل ہے۔ اور قائمہ: وہ ہیں جو منسوخ نہیں کی گئیں۔ اور نہ چھوڑی گئیں ہیں، اور نہیں اکیلا ہوا اس کا راوی اور اس پر چلے ہیں جمہور صحابہ وتابعین۔

ان کا اعلیٰ درجہ: وہ ہے جس پر مدینہ اور کوفہ کے فقہاء متفق ہیں۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس پر چاروں مذاہب متفق ہوں۔

پھر: وہ ہیں جن میں جمہور صحابہ کے دو یا تین قول ہیں۔ ان میں سے ہر قول پر عمل کیا ہے اہل علم کی ایک جماعت نے۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ روایتیں سامنے آئی ہوں موطا مالک اور مصنف عبدالرزاق جیسی کتابوں میں۔

اوراس کے ماسواء: پس وہ بعض فقہاء کا استنباط ہے، نہ کہ بعض کا۔ تفسیر اور تخریج کے طور پر یا استدلال اور استنباط کے طور پر، اور نہیں ہیں وہ روایات سنتِ قائمہ میں سے۔

(ج) اور فریضۂ عادلہ: ورثاء کے حصص ہیں۔ اور لاحق کئے جائیں گے اس کے ساتھ قضاء کے مسائل، ان میں سے جن کی راہ انصاف کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان قطع منازعت کی راہ ہے۔

پس یہ تین علوم: حرام ہے کسی شہر کا خالی ہونا ان کے جاننے والے سے، دین ان پر موقوف ہونے کی وجہ سے۔ اور جو علوم ان کے علاوہ ہیں وہ فضل وزیادتی کے باب سے ہیں۔

☆　☆　☆

دین کو چیستان بنا کر پیش نہ کیا جائے

حدیث ـــــ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اُغلوطات (مبہم باتوں) سے منع فرمایا (رواہ ابوداؤد حدیث ۳۶۵۶ مشکوٰۃ حدیث ۲۴۳)

تشریح: اُغلوطات: وہ مبہم مسائل ہیں جن سے آدمی غلطی میں پڑ جائے۔ اور ان کے ذریعہ لوگوں کا امتحان لیا جائے۔ اردو میں ایسی باتیں چیستاں کہلاتی ہیں۔ اور دینی باتوں کو چیستان بنا کر بیان کرنا بچند وجوہ ممنوع ہے:

پہلی وجہ: مغالطہ دینے سے مسئول عنہ کو تکلیف پہنچتی ہے اور مسلم کی ایذا رسانی حرام ہے۔ اور اگر مخاطب سے جواب نہ بن پڑا تو وہ رسوا بھی ہوگا۔ یہ بھی ایذا رسانی ہے۔ نیز اس اندازِ بیان میں خود پسندی اور اپنی بڑائی کا اظہار بھی ہے، جو شرعاً پسندیدہ عمل نہیں۔

دوسری وجہ: یہ انداز بیان دین میں تعمق کا دروازہ کھولتا ہے۔ تعمق کی تفصیل مبحث سادس کے باب ۱۸ میں گذر چکی ہے۔ دین فہمی کا صحیح طریقہ وہی ہے جو صحابہ اور تابعین کا تھا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ:

(الف) ـــــ احادیث سے بظاہر جو کچھ مفہوم ہوتا ہے اس پر توقف کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ جو بات بمنزلۂ ظاہر ہو اس کو لیا جائے۔ جو باتیں ایماء (مفہوم مخالف) یا اقتضاء النص یا فحوی (مفہوم موافق یعنی دلالت النص) سے سمجھی جاتی ہیں وہ بمنزلۂ ظاہر ہیں (ان تینوں کی تفصیل مبحث سابع کے باب خامس میں گذر چکی ہے) اس سے زیادہ گہرائی میں نہیں اترنا چاہئے۔

(ب) ـــــ جب تک واقعہ رونما ہو اور حکم جاننے کی شدید مجبوری پیش نہ آئے اجتہاد میں نہیں گھسنا چاہئے۔ کیونکہ جب واقعہ رونما ہوتا ہے اور اس کا شرعی حکم جاننے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی عنایت سے جو ہمیشہ لوگوں کے حال پر مبذول رہتی ہے، اس سلسلہ میں علم کا دروازہ وَا کرتے ہیں۔ اور یہ خیال کہ پہلے سے تیاری کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟ اس وجہ سے صحیح نہیں کہ قبل از وقت مسائل میں غور کرنے میں غلطی کا احتمال ہے۔ کیونکہ جس طرح الفاظ کا موضوع لہ جانے بغیر

الفاظ کو وضع نہیں کیا جاسکتا اسی طرح صورت واقعہ کو اچھی طرح سمجھے بغیر ان کے احکام بھی مرتب نہیں کئے جاسکتے۔

فائدہ: پیش آمدہ صورت کے ہر پہلو پر غور کر کے ان کے احکام مرتب کرنا، اس سے مختلف چیز ہے، یہ کام درست ہے بلکہ ضروری ہے۔ مثلاً جب تک ریل گاڑی نہیں چلی تھی یا ہوائی جہاز نہیں اڑا تھا۔ ان کے احکام کو مرتب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اور کوئی شخص یہ کوشش کرتا بھی تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا مگر اب ان کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے سب ممکنہ صورتوں کے احکام مرتب کرنا ضروری ہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ نے یہی کام کیا تھا۔ وہ أرأیتَ؟ سے واقعہ کا ایک پہلو ذکر کرتے تھے، پھر اس کا حکم بیان کرتے تھے۔

فائدہ: اختبار (ذہنی صلاحیت کا اندازہ کرنے) کے لئے یا ذہنی صلاحیت کی بالیدگی کے لئے کوئی مبہم سوال کرنا سنت سے ثابت ہے، وہ بھی مذکورہ ضابطہ سے مختلف چیز ہے۔ بخاری شریف، کتاب العلم، باب ۵ حدیث نمبر ۶۲ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے ایک سوال کیا تھا کہ بتاؤ، وہ کونسا درخت ہے جس کے پتے کبھی نہیں جھڑتے اور وہ مؤمن کی مثال ہے؟ پھر جب کوئی جواب نہ دے سکا تو آپؐ نے خود ہی بتایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

[۱۴] ونَهَى صلى الله عليه وسلم عن الأُغلوطات: وهي المسائل التي يقع المسئولُ عنها في الغَلَط، ويُمْتَحَنُ بها أذهانُ الناس؛ وإنما نَهى عنها لوجوه:

منها: أن فيها إيذاءً وإذلالاً للمسئول عنها، وعُجبا وبطرًا لنفسه.

ومنها: أنها تَفتح بابَ التعمُّق؛ وإنما الصوابُ: ماكان عند الصحابة والتابعين:

[الف] أن يُوقف على ظاهر السنة، وما هو بمنزلة الظاهر: من الإيماء، والاقتضاءِ، والفحوى، ولايُمعَن جدًا.

[ب] وأن لا يُقتَحَم في الاجتهاد حتى يُضطر إليه، وتقعَ الحادثةُ، فإن الله يفتح عند ذلك العلمَ، عنايةً منه بالناس؛ وأما تَهيِئَتُه من قبلُ فمظِنةُ الغَلَط.

ترجمہ: (۱۴) نبی ﷺ نے مغالطے دینے سے منع فرمایا۔ اور مغالطے: وہ مسائل (مبہمہ) ہیں کہ مسئول عنہ غلطی میں پڑ جائے، اور ان کے ذریعہ لوگوں کی عقلوں کا امتحان لیا جائے۔ اور ان سے چند وجوہ روکا گیا ہے:

ان میں سے: یہ ہے کہ اس میں مسئول عنہ کو ستانا اور رسوا کرنا ہے۔ اور خود بینی اور اپنی ذات پر اتراتا ہے۔

اور ان میں سے: یہ ہے کہ وہ باتیں تعمق کا دروازہ کھولتی ہیں۔ اور درست بات بس وہی ہے جو صحابہ اور تابعین کے پاس تھی کہ: (الف) ٹھہرا جائے ظاہر سنت پر اور اس پر جو بمنزلۂ ظاہر ہے یعنی ایماء اور اقتضاء اور فحویٰ۔ اور نہ گہرائی میں اترا جائے بہت زیادہ۔ (ب) اور یہ کہ نہ گھسا جائے اجتہاد میں۔ جب تک اس کی طرف سخت مجبور نہ ہو جائے اور جب

تک واقعہ پیش نہ آجائے۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ اس وقت علم کھولتے ہیں اپنی طرف سے لوگوں پر مہربانی کے طور پر
——— اور رہا اس کی تیاری کر لینا پہلے سے تو وہ غلطی کی احتمالی جگہ ہے۔

☆ ☆ ☆

تفسیر بالرائے حرام ہے، اور رائے کا مطلب

حدیث ——— حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس نے قرآن میں اپنی رائے سے بات کہی، پس چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے'' اور ایک روایت میں ہے: ''جس نے قرآن میں علم کے بغیر کہا پس چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں ڈھونڈھے''

حدیث ——— حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا، پس اس نے درست کہا تو بھی یقیناً اس نے خطا کی'' (مشکوۃ حدیث نمبر ۲۳۴ و ۲۳۵)

تشریح: پہلی حدیث میں جو وعید ہے اس کے پیش نظر رائے سے تفسیر کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ تفسیر کرنے کے لئے سب سے پہلے عربی زبان کا کما حقہ علم ضروری ہے۔ نیز احادیث مرفوعہ اور صحابہ و تابعین کے آثار کا علم بھی ضروری ہے۔ خواہ ان کا تعلق مشکل الفاظ کی وضاحت سے ہو، یا شان نزول سے یا ناسخ و منسوخ سے۔ کیونکہ ان باتوں کے بغیر جو بھی شخص تفسیر کرے گا، وہ اپنی سمجھ سے کرے گا۔ اور قرآن کی تفسیر میں خود رائی حرام ہے (شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات پوری ہوئی)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے تحذیر الناس کے آخر میں عقل کی مثال دوربین اور خوردبین سے دی ہے۔ دوربین سے دور فاصلہ کی چیزیں قریب نظر آتی ہیں، اور خوردبین سے چھوٹی چیزیں بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح عقل بھی اذہان سے بعید اور دقیق باتوں کو واضح کرتی ہے۔ پس تفسیر قرآن میں عقل کا استعمال ممنوع نہیں اور رائے سے عقل مراد نہیں۔ تفسیر میں عقل کا استعمال ممنوع کیسے ہوسکتا ہے، قرآن کریم میں تو جگہ جگہ عقل سے کام لینے کی ہدایت ہے؟ اور عقلوں کے تفاوت ہی سے بے شمار تفاسیر وجود میں آئی ہیں۔ بلکہ حدیث میں ہے: لَا یَنْقَضِی عجائبه (اس کی حیرت زا باتیں کبھی ختم ہونے والی نہیں) اس سے تو تفسیر میں عقل کا زیادہ سے زیادہ استعمال مستحسن ثابت ہوتا ہے۔

البتہ قرآن کریم میں عقل کا استعمال بس اسی درجہ تک ہونا چاہئے کہ جو باتیں عام فہم نہ ہوں ان کو عقل کی مدد سے عام فہم بنایا جائے اور جو مضامین دقیق ہوں ان کی وضاحت کی جائے۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوربین اور خوردبین پر رنگین گلاس چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے آلہ سے جب کوئی چیز دیکھی جائے گی تو علاوہ نزدیک اور جلی ہونے کے رنگین بھی نظر آئے گی۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ رنگ نظر آنے والی چیز کا وصف نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ایک عارض ہے۔ یہ تفسیر بالرائے کی مثال ہے۔ یعنی قرآن کریم کی کسی آیت میں درجۂ اجمال میں جو مضامین ملحوظ ہوں ان کو عقل کی مدد سے واضح کرنا تو

درست ہے۔ مگر اس پر کوئی ایسا رنگ چڑھانا جو محض مفسر کی عقل کے اثر سے ہو جائز نہیں۔

مثلاً: قرآن کریم میں کوئی ضابطہ کلیہ بیان کیا گیا ہو، تو جو اس کی واقعی جزئیات ہیں، ان کی وضاحت کرنا تفسیر بالرائے نہیں ہے۔ البتہ کسی ایسی جزئی کو جو اس قاعدہ کا فرد نہیں ہے، مگر اس کی جزئیات کے مشابہ ہے، تفسیر کرتے ہوئے اس کو اس قاعدہ کا فرد قرار دینا تفسیر بالرائے ہے اور درست نہیں۔ جیسے انسان کی ماہیت حیوان ناطق ہے۔ جس کی اربوں کھربوں جزئیات ہیں۔ مگر بن مانس اس کی جزئی نہیں ہے بلکہ وہ حیوانات کی ایک مستقل نوع ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کو انسان کا فرد قرار دے اور حیوان ناطق کی جزئیات میں اس کو شمار کرائے تو یہ حیوان ناطق کی تفسیر بالرائے ہے (حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی بات وضاحت کے ساتھ پوری ہوئی)

راقم کے خیال میں حدیث میں جس رائے کا تذکرہ ہے۔ اس سے مراد نظریہ بھی ہوسکتا ہے یعنی پہلے سے ایک نظریہ قائم کرنا پھر قرآن کو توڑ مروڑ کر اس کے مطابق بنانا تفسیر بالرائے ہے۔ جیسے ایک صاحب نے حکومت الٰہیہ کے قیام کو، جو اسلام کا ایک شعبہ (شاخ) تھا، اسلام کی اصل (تنا) بنایا، اور اس کو تعلیمات اسلام کا قُطْبُ الرَّحیٰ (چکی کا بیچ کا کیلا) قرار دیا۔ پھر جب قرآن سے یہ بات بے تکلف ثابت ہوتی نظر نہ آئی تو قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں وضع کیں۔ اور ان میں اقتدار اعلیٰ کا مفہوم شامل کیا، تاکہ قرآن پاک سے مطلب برآری کی جاسکے۔ یہ بھی تفسیر بالرائے ہے، اور ایسا کرنا حرام ہے۔ اگر اتفاقاً کسی نے کوئی صحیح نظریہ قائم کیا، اور اس کو قرآن سے ثابت کیا تو بھی یہ حرکت نادرست ہے۔ دوسری حدیث میں اسی کا بیان ہے۔ کیونکہ جب ایسا کرنے کی عادت پڑ جائے گی تو معلوم نہیں وہ کہاں کہاں ٹھوکر کھائے گا۔ تفسیر کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تفسیر کرنے کے لئے جو علوم ضروری ہیں، پہلے ان کو حاصل کیا جائے، پھر روایات کی روشنی میں جو بات قرآن کریم سے مفہوم ہوتی ہے اس کو رائے اور نظریہ بنایا جائے اور قرآن کے کسی اجمال کی وضاحت میں کوئی ایسی بات نہ بڑھائی جائے جو درجۂ اجمال میں ملحوظ نہ ہو۔ ورنہ ثواب ندارد گناہ لازم ہوگا۔

[۱۵] قوله صلى الله عليه وسلم: "من قال في القرآن برأيه فَلْيَتَبَوَّأْ مقعده في النار"
أقول: يحرم الخوضُ في التفسير لمن لا يعرف اللسانَ الذي نزل القرآنُ به، والمأثورَ عن النبي صلى الله عليه وسلم، وأصحابه والتابعين: من شرح غريبٍ، وسبب نزولٍ، وناسخٍ ومنسوخٍ.

ترجمہ: (۱۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا، پس چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے'' میں کہتا ہوں: تفسیر میں گھسنا حرام ہے اس شخص کے لئے جو نہیں جانتا اس زبان کو جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے، اور نہ اُن روایات کو (جانتا ہے) جو نبی ﷺ، اور آپ کے صحابہ وتابعین سے مروی ہیں۔ خواہ وہ کسی مشکل لفظ کی شرح ہو، یا شان نزول یا ناسخ ومنسوخ۔

  ☆

قرآن میں جھگڑا کفر ہے اور جھگڑا کرنے کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے'' (رواہ ابوداؤد واحمد والحاکم، مشکوٰۃ حدیث ۲۳۶)

تشریح: مِراءٌ: باب مفاعلہ کا مصدر ہے مادی مِراء و مُماراۃ کے معنی ہیں: جھگڑا کرنا۔ دوسرا لفظ اس مفہوم کے لئے جدال ہے۔ قرآن میں جدال حرام ہے۔ اور جدال فی القرآن یہ ہے کہ قرآن کے منصوص (مصرح) حکم کو دل میں پیدا ہونے والے کسی شبہ کی وجہ سے رد کرنا۔

فائدہ: مگر اس میں اشکال یہ ہے کہ باب مفاعلہ کا خاصہ اشتراک ہے یعنی دو شخص کسی کام میں شریک ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی ہے: دَعِ المراءَ فإن نفعه قليل، وهو يهيج العداوةَ بين الإخوان (دارمی ۱:۹۱) جھگڑا چھوڑ، کیونکہ اس کا فائدہ تھوڑا ہے، اور وہ برادروں میں عداوت بھڑکاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جھگڑا دو شخصوں میں ہوگا۔ حدیث میں ہے: من ترك المراء وهو مُحِق بُنِي له في وسْطها (ابن ماجہ حدیث ۵۱) جو جھگڑا چھوڑ دے درانحالیکہ وہ حق پر ہے تو اس کے لئے جنت کے بیچ میں ایک محل بنایا جائے گا۔ یہ جھگڑا بھی ظاہر ہے کہ دو شخصوں کے درمیان ہوگا۔ پس مراء کی جو صورت شاہ صاحب نے بیان کی ہے وہ محل نظر ہے۔

زین العرب نے مراء کے معنی شک کے کئے ہیں۔ اور اس لفظ کو مِـرْيَة کے معنی میں لیا ہے۔ مگر یہ بات بھی مضبوط نہیں ہے، کیونکہ مِـراء اور ہے اور مِـرْية اور ہے۔ قاضی بیضاوی نے تـدارُء (جھگڑے میں بات کو ایک دوسرے پر ڈالنا) کے معنی کئے ہیں۔ پس یہ حدیث آئندہ حدیث کے معنی میں ہوگی (یہ دونوں قول مرقات شرح مشکات میں ہیں)

> [١٦] قوله صلى الله عليه وسلم: "المراء في القرآن كفر"
> أقول: يحرم الجدال في القرآن، وهو: أن يَّرُدَّ الحكمَ المنصوص بشبهة، يجدها في نفسه.

ترجمہ: (۱۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے'' میں کہتا ہوں: قرآن میں جھگڑا کرنا حرام ہے، اور وہ یہ ہے کہ رد کردے مصرح حکم کو کسی شبہ کی وجہ سے، جس کو وہ اپنے دل میں پاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

قرآن وحدیث کو باہم ٹکرانا حرام ہے اور اس کی صورت

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ قرآن کریم کے ذریعہ ایک دوسرے کی تردید کر رہے ہیں۔ پس آپ نے فرمایا: ''جو لوگ تم سے پہلے ہوئے وہ بس اسی وجہ سے

برباد ہوئے کہ انھوں نے اللہ کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے ٹکرایا۔ حالانکہ قرآن کریم اس حال میں نازل ہوا ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہے۔ پس تم اس کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ کے ذریعہ مت جھٹلاؤ۔ تم اس میں سے جو جانتے ہو اس کو کہو، اور جو نہیں جانتے اسکو جاننے والے کے حوالے کرو (رواہ احمد ۲: ۱۸۵ مشکوۃ حدیث ۲۳۷)

تشریح: قرآن کریم کے ذریعہ تدافُع حرام ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کی دو صورتیں بیان کی ہیں:

پہلی صورت: ایک شخص ایک آیت سے اپنے موقف پر استدلال کرے، دوسرا اس کی تردید کرے۔ اور وہ اس کے برخلاف دوسری آیت سے اپنے موقف پر استدلال کرے اور پہلا اس کی تردید کرے —— یہ صورت حرام ہے۔ روایت کے بعض طُرُق میں ہے کہ صحابہ میں تقدیر کے مسئلہ میں بحث ہو رہی تھی کہ آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا۔ پس ایسے پیچیدہ مسئلہ میں عام لوگوں کا بحث کرنا اور قرآن کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے ٹکرانا باعث ہلاکت ہے۔ قرآن کا بعض بعض کی تصدیق کرنے والا ہی ہے۔ اس کے مضامین میں کوئی اختلاف نہیں۔ سورۃ النساء آیت ۸۲ میں قرآن میں اختلاف کی نفی کی گئی ہے۔ اگر کسی کو قرآن میں دو مختلف باتیں نظر آئیں تو وہ نظر کا قصور ہے۔ ایسی صورت میں کسی بڑے عالم کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اور صحیح بات سمجھنی چاہئے۔

دوسری صورت: کوئی شخص ائمہ مجتہدین میں سے کسی امام کے قول کی تائید میں قرآن سے یا حدیث سے استدلال کرے، دوسرا اس کی تردید کرے اور دوسرا اپنے امام کے مذہب کی تائید میں استدلال کرے اور پہلا اس کی تردید کرے۔ اور دونوں کا مقصد مناظرہ (مکابرہ) ہو، صرف اپنے امام کے قول کو ثابت کرنا پیش نظر ہو، ان کا پختہ عزم درست بات کو واضح کرنے کا نہ ہو، تو یہ بھی قرآن یا حدیث کے ذریعہ تدافُع ہے اور حرام ہے۔

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ارباب مذاہب اپنے اماموں کے قول پر قرآن وحدیث سے استدلال نہ کریں۔ کیونکہ صحابہ وتابعین ہمیشہ اپنے موقف پر قرآن وحدیث سے استدلال کرتے رہے ہیں، اور دوسرے کے استدلال کا جواب بھی دیتے رہے ہیں۔ بلکہ شاہ صاحب کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے استدلالات میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ نصوص کو باہم ٹکرانے کی صورت پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ نیز مستدِل کا مقصد اظہار حق ہونا چاہئے۔ صرف بات کی پچ مقصد نہ ہو۔

[۱۶] قوله صلى الله عليه وسلم: " إنما هلك من كان قبلكم بهذا، ضربوا كتابَ الله بعضَه ببعض"

أقول: يحرم التَّدَارُؤُ بالقرآن، وهو: أن يَّستدلَّ واحدٌ بآية، فيرده آخر بآيةٍ أخرى، طلبًا لإثبات مذهبِ نفسِه، وهَدْمِ وضعِ صاحبه، أو ذَهَابًا إلى نصرة مذهب بعض الأئمة على مذهب بعض، ولايكون جامعَ الهمة على ظهور الصواب؛ والتدارؤُ بالسنة مثلُ ذلك.

ترجمہ: (۱۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جو لوگ تم سے پہلے ہوئے وہ بس اسی وجہ سے برباد ہوئے کہ انھوں نے

اللہ کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے ٹکرایا'' میں کہتا ہوں: قرآن کے ذریعہ تدافع (ایک دوسرے کی بات کو ہٹانا) حرام ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک آیت سے استدلال کرے، پس دوسرا شخص اس کو دوسری آیت سے رد کرے، مذہب خود کو ثابت کرنے کی کوشش میں، اور اپنے ساتھی کے نظریہ کو گرانے کی خاطر سے۔ یا جاتے ہوئے بعض ائمہ کے مذہب کی مدد کی طرف، دوسرے بعض کے مقابلہ میں۔ اور نہ ہو وہ پختہ ارادہ رکھنے والا درست بات کے واضح ہونے کا ـــــ اور ایک حدیث کے ذریعہ دوسری حدیث کی تردید بھی اسی کے مانند ہے (تَدَارُؤ (باب تفاعل) بمعنی تدافع ہے، یعنی ایک دوسرے کی بات کو ٹالنا۔ مجرد دَرَأَہ (ف) دَرءٌا: زور سے دھکا دینا)

☆　　☆　　☆

آیات کا ظاہر و باطن اور ہر ایک کی جائے اطلاع

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے (اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ: ہر حرف کی ایک حد ہے یعنی ظاہر و باطن کے دائرے الگ الگ ہیں) اور ہر حد کی ایک جائے اطلاع ہے'' (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۳۸)

تشریح: قرآن کریم میں بکثرت بیان ہونے والے مضامین پانچ ہیں: (۱) اللہ کی صفات اور ان کی قدرت کی نشانیوں کا بیان (۲) احکام شرعیہ کا بیان (۳) انبیاء کے واقعات (۴) آیات مخاصمہ۔ جن میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین کے مزعومات اور ان کی سخافت سے بحث کی گئی ہے (۵) تذکیر کے مضامین یعنی جنت و جہنم وغیرہ کا تذکرہ کر کے نصیحت کرنا۔

قرآن کریم کے مرکزی مضامین یہی علوم خمسہ ہیں۔ ان کی کچھ تفصیل مبحث اول کے ساتویں باب میں گذر چکی ہے۔ اور ان کا مفصل بیان حضرت کی دوسری کتاب الفوز الکبیر میں ہے۔ یہاں آپ نے یہ مضمون نہایت مختصر لکھا ہے۔

علوم خمسہ سے متعلق تمام آیات کا ظاہر اُن مضامین کو اچھی طرح سمجھ لینا ہے جن کے لئے کلام چلایا گیا ہے یعنی عبارت النص (وہ مفہوم و مدلول جن پر آیات صراحۃً دلالت کرتی ہیں) اُن آیات کا ظاہر ہے۔ اور باطن پانچوں قسم کی آیات کا الگ الگ ہے، جو درج ذیل ہے:

آیاتِ صفات کا باطن: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور کرنا اور ان کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہے۔

آیاتِ احکام کا باطن: احکام کا استنباط ہے۔ خواہ استنباط ایماء یعنی مفہوم مخالف سے ہو، یا اشارۃ النص سے ہو، یا فحوی یعنی مفہوم موافق (دلالۃ النص) سے ہو، یا اقتضاء النص سے ہو (استنباط کے ان چاروں طریقوں کی وضاحت مبحث سابع کے باب خامس میں ہے)

استنباط کی ایک مثال: خلافت عثمانی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت نے نکاح سے چھ ماہ بعد بچہ جنا۔ شوہر نے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی۔ آپ نے عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی۔ آپ حضرت عثمان کے پاس گئے۔ اور فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ حضرت عثمان نے فرمایا: اس نے چھ ماہ میں بچہ جنا ہے کیا یہ بات ممکن ہے؟ حضرت علی رضی اللہ نے فرمایا: ہاں یہ بات ممکن ہے، اور قرآن کریم سے ثابت ہے۔ سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ میں ہے کہ: ''بچے کو پیٹ میں رکھنا، اور دودھ چھڑانا تیس مہینے (میں پورا ہوتا) ہے'' اور سورۂ لقمان آیت ۱۴ میں ہے: ''اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے'' اور سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۳ میں ہے: ''اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں'' آخری دو آیتوں سے ثابت ہوا کہ مدت رضاعت دو سال ہے، پس مدت حمل کے لئے چھ ماہ بچے۔ یہی اقل مدت حمل ہے، پس چھ ماہ میں ولادت ہوسکتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات تو میری سمجھ میں آئی ہی نہیں! اس عورت کو واپس لاؤ۔ مگر وہ سنگسار کی جا چکی تھی۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۃ الاحقاف کی تفسیر میں (۱۵۷:۴) یہ استدلال ذکر کر کے فرمایا ہے: وهـــو استنباط قوى صحيح، ووافقه عليه عثمان وجماعة من الصحابة (یہ مضبوط اور درست استنباط ہے، حضرت عثمان اور صحابہ کی ایک جماعت نے حضرت علی کی ہمنوائی کی ہے) احناف کے یہاں بھی فتوی اسی پر ہے کہ مدت رضاعت دو ہی سال ہے۔ اور چھ ماہ کم سے کم مدت حمل ہے۔ غرض اس قسم کے استنباطات آیات اَحکام کا باطن ہیں۔

فائدہ: سورۃ الاحقاف کی آیت میں اکثر مدت رضاعت اور اقل مدت حمل کو اس لئے جمع کیا گیا ہے کہ کم سے کم مدت رضاعت اول تو متعین نہیں۔ ماں کسی وجہ سے مطلق دودھ نہ پلائے یہ بھی درست ہے، ثانیاً: اس سے احکام بھی متعلق نہیں۔ اور اکثر مدت رضاعت متعین بھی ہے اور اس سے احکام بھی متعلق ہیں، اس لئے اس کو لیا گیا ہے۔ اسی طرح زیادہ سے زیادہ مدت حمل اول تو قطعی طور پر متعین نہیں، ثانیاً: اس سے بھی احکام متعلق نہیں، اس لئے اکثر مدت حمل کا بیان ضروری نہیں۔ اور اقل مدت حمل متعین بھی ہے اور اس سے ثبوت نسب وغیرہ احکام بھی متعلق ہیں۔ اس لئے اس کو لیا گیا ہے۔ اور دونوں کو ملا کر تیس مہینے بیان کئے گئے ہیں (فائدہ ختم ہوا)

آیات قصص کا باطن: انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات میں غور کرنا کہ انبیاء اور مؤمنین جو انعامات سے نوازے گئے اور ان کی مدح وستائش کی گئی تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اور مخالفین کو جو سزائیں دی گئیں اور ان کی قباحت وشناعت بیان کی گئی تو اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہی باتیں جاننا قصص القرآن کا باطن ہے۔

آیات مخاصمہ کا باطن: فِرَق اربعہ کی گمراہیوں کی بنیاد پہچاننا، اور ان جیسی گمراہیوں کو ان کے ساتھ ملانا ہے یعنی یہود ونصاریٰ اور مشرکین ومنافقین کی ضلالت کی جڑ جاننا، اور ان کی جن گمراہیوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے ان کے جوابات نکالنا آیات جدل کا باطن ہے۔ مثلاً تناسخ (آواگون) کا تذکرہ قرآن میں صراحۃً نہیں ہے۔ ہنود کا یہ نظریہ غلط کیوں ہے؟ اس کی وجہ آیات مخاصمہ میں غور کرنے سے معلوم ہوسکتی ہے۔ یہی ان آیات کا بطن ہے (آیات مخاصمہ کے

باطن کا تذکرہ مختصر نویسی کی نذر ہوگیا ہے، ہم نے الفوز الکبیر باب رابع فصل سوم سے بڑھایا ہے)

آیاتِ تذکیر کا باطن: یہ ہے کہ آیات تذکیر کے مضامین سے دل ودماغ متاثر ہوں، دل پسیجے اور قلب میں خوف ورجاء کی کیفیت پیدا ہو، تاکہ بندے میں شکرگذاری کا جذبہ ابھرے، اور وہ اطاعت خداوندی میں مضبوط ہوجائے۔

ہر حد کی جائے اطلاع: ظاہر کی جائے اطلاع: عربی زبان کی کماحقہ معرفت اور ان روایات کو پہچاننا ہے جن کا فن تفسیر سے تعلق ہے۔ اور باطن کی جائے اطلاع: ذہن کا رسا اور فہم کا درست ہونا ہے۔ ساتھ ہی دل کا نور ایمان سے روشن اور پرسکون ہونا ہے یعنی جس کا ذہن عمدہ، فہم درست اور دل ایمان واعمال صالحہ کی روشنی سے منور ہوگا، وہ بطن قرآن کو سمجھ سکے گا۔ اور جس میں یہ خوبیاں نہیں ہیں، اس کے لئے بطن قرآن کا سمجھنا دشوار ہے (شاہ صاحب نے یہ مضمون بھی یہاں بہت مختصر لکھا ہے۔ ہم نے الفوز الکبیر سے یہ مضمون بڑھایا ہے)

[۱۸] قوله صلى الله عليه وسلم: "لكل آية منها ظهر وبطن، ولكل حدّ مُطَّلع"

أقول: أكثرُ ما في القرآن: بيانُ صفات الله تعالى، وآياتِه، والأحكامُ، والقصصُ، والاحتجاجُ على الكفار، والموعظةُ بالجنة والنار:

فالظَّهر: الإحاطةُ بنفس ماسيق الكلامُ له.

والبطن في آيات الصفات: التفكر في آلاء الله والمراقبةُ؛ وفي آيات الأحكام: الاستنباط بالإيماء، والإشارة والفحوى، والاقتضاء، كاستنباط على رضى الله عنه من قوله تعالى: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُوْنَ شَهْرًا﴾ أن مدة الحمل قد تكون ستة أشهرٍ، لقوله: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ وفي القصص: معرفةُ مناط الثواب والمدح، أوالعذاب والذم؛ وفي العِظة: رِقَّةُ القلب، وظهورُ الخوف والرجاء، وأمثالُ ذلك.

ومُطَّلَعُ كلِّ حد: الاستعدادُ الذى به يحصل، كمعرفة اللسان والآثار، وكلُطف الذهن، واستقامة الفهم.

ترجمہ: (۱۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "آیات میں سے ہر ایک آیت کا ظاہر وباطن ہے، اور ہر حد کے لئے ایک جائے اطلاع ہے"

میں کہتا ہوں: زیادہ تر مضامین جو قرآن کریم میں ہیں: (۱) اللہ کی صفات اور ان کی نشانیوں کا بیان ہے (۲) اور احکام (۳) اور واقعات (۴) اور کفار کے ساتھ مباحثہ (۵) اور جنت وجہنم کے ذریعہ نصیحت کرنا ہے۔

پس ظاہر: بعینہٖ اُن مضامین کو اچھی طرح سمجھنا ہے جن کے لئے کلام چلایا گیا ہے۔

اور صفات کی آیات کا باطن: اللہ کی نعمتوں میں غور کرنا اوران کو پیش نظر رکھنا ہے۔اور آیات احکام کا باطن: احکام کا استنباط ہے ایماء اور اشارہ اور فحوی اور اقتضاء سے۔جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استنباط ارشاد باری تعالیٰ: وحملہ الخ سے کہ مدت حمل کبھی چھ ماہ بھی ہوتی ہے، ارشاد باری حولین کاملین کی وجہ سے۔اور واقعات کا باطن: ثواب وستائش یا عذاب وقباحت کی بنیاد (علت) کو پہچاننا ہے۔اور موعظت کا باطن: دل کا پسیجنا اور خوف ورجاء کا ظاہر ہونا اور اس کے مانند چیزیں ہیں۔

اور ہر حد کی جائے اطلاع: وہ استعداد ہے جس سے وہ بات حاصل ہوتی ہے، جیسے زبان اور روایات کو جاننا، اور ذہن کی عمدگی اور فہم کی درستگی۔

لغات: ظَھر کے لغوی معنی ہیں پیٹھ، اور مرادی معنی ہیں: ظاہر۔اور بَطن کے معنی ہیں: پیٹ اور مراد ہے باطن ...... اور حدّ کے معنی ہیں: سرحد، کنارہ یعنی ظاہر و باطن میں سے ہر ایک کا ایک دائرہ ہے۔دونوں باہم خلط ملط نہیں ہیں ...... مُطّلع کے معنی ہیں: باہر جھانکنے کا جھروکا، واقف ہونے کی جگہ، جائے اطلاع یعنی آیات کے ظاہری معنی کو جاننے کا ایک طریقہ ہے، اور باطنی معنی کو سمجھنے کا بھی ایک راستہ ہے..... أحَاطَ بہ: گھیرنا، احاطہ کرنا احاط بہ علما: پوری طرح سے جان لینا...... رَاقَبَہ: نگہبانی کرنا یعنی ہر وقت ان نعمتوں کو پیش نظر رکھنا...... وَعظہ عِظَۃً: نصیحت کرنا۔توبہ اور اصلاح پر ابھارنے والی باتیں یاد دلانا۔

☆ ☆ ☆

محکم ومتشابہ کا مطلب

سورۂ آل عمران آیت سات ہے: ''اللہ وہی ہیں جنھوں نے آپ پر کتاب اتاری۔اس کی بعض آیتیں محکم ہیں یعنی ان کے معنی واضح ہیں وہ کتاب اللہ کی اصل آیات ہیں۔اور دوسری متشابہ ہیں یعنی ان کے معنی معلوم یا متعین نہیں ہیں سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں۔گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب جاننے کی نیت سے۔اوران کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔اور مضبوط علم رکھنے والے کہتے ہیں: ہم اس پر یقین رکھتے ہیں۔سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔اور سمجھانے سے وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے''

تشریح: محکم: وہ کلام ہے جو ایک ہی معنی کا احتمال رکھتا ہو۔یعنی عربی زبان کا جاننے والا اس سے ایک ہی معنی سمجھے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں الخ (سورۃ النساء آیت ۲۳)

متشابہ: وہ کلام ہے جو متعدد معانی کا احتمال رکھتا ہو، مگر مراد ان میں سے کوئی ایک ہی معنی ہوں۔الفوز الکبیر میں شاہ صاحب نے اس کی چار صورتیں بیان کی ہیں: (۱) کسی ضمیر کا مرجع دو چیزیں بن سکتی ہوں (۲) کوئی کلمہ دو معنوں میں

مشترک ہو (۴) عطف میں دو احتمال ہوں (۵) عطف اور استیناف دونوں کا احتمال ہو۔ مگر یہاں جو مثال دی ہے، وہ ان کے علاوہ صورت ہے۔

متشابہ کی مثال: سورۃ المائدہ کی آیت ۹۳ اس طرح ہے: ''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک کام کئے کوئی گناہ نہیں اُس میں جو وہ (پہلے) کھا چکے، جبکہ وہ (آئندہ) ڈر گئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے'' آخر آیت تک۔ اس آیت سے کچھ گمراہ لوگوں نے شراب کی حلت ثابت کی ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ سرکشی یا اودھم مچانے کے لئے نہ پی گئی ہو۔ حالانکہ آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے شراب حرام ہونے سے پہلے شراب پی ہے ان پر کوئی مواخذہ نہیں جبکہ وہ آئندہ اللہ سے ڈریں اور ایمان کے ساتھ نیک کام کریں۔

فوائد عثمانی میں اس کی وضاحت اس طرح ہے:

''نہایت صحیح اور قوی احادیث میں ہے کہ جب تحریم خمر کی آیات نازل ہوئیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ان مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جنھوں نے حکم تحریم آنے سے پہلے شراب پی اور اُسی حالت میں انتقال کر گئے؟ مثلاً: بعض صحابہ جنگ احد میں شراب پی کر شریک ہوئے تھے۔ اور اسی حالت میں شہید ہو گئے کہ پیٹ میں شراب موجود تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ضابطہ کلیہ بیان کیا کہ جو لوگ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں ان کے لئے کسی مباح چیز کے بوقت اباحت کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جبکہ وہ عام احوال میں تقوی اور خصال ایمان سے متصف ہوں''

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے الفوز الکبیر میں متشابہ کی جو صورتیں بیان کی ہیں اور ان کی جو مثالیں دی ہیں ان پر تو کوئی خاص اشکال وارد نہیں ہوتا۔ مگر یہاں متشابہ کی جو مثال دی ہے وہ محل نظر ہے۔ کیونکہ گمراہ لوگوں کے اس قسم کے استدلالات سے اگر آیات متشابہ ہو جائیں گی تو پھر نماز کی آیات بھی متشابہ ہو جائیں گی۔ کیونکہ گمراہ لوگ صلوۃ کے معنی دعا اور گیان دھیان کے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نماز ضروری نہیں۔ غرض یہ آیت از قبیل متشابہات نہیں، محکم ہے۔ ہاں مشکلات القرآن میں اس کو شمار کر سکتے ہیں۔

نوٹ: محکم و متشابہ کی وضاحت فوائد عثمانی میں بہت اچھی کی گئی ہے اور متشابہ کی انواع کا بیان لغات القرآن میں ہے۔

[۱۹] قوله تعالى: ﴿مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ، هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ، وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾

أقول: الظاهر أن المحكم مالم يحتمل إلا وجهًا واحدًا، مثل: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ﴾ والمتشابه: ما احتمل وجوهًا، إنما المرادُ بعضُها، كقوله تعالى: ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا، وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا﴾ حملها الزائغون على إباحة الخمر مالم يكن بغيٌ، أو إفسادٌ في الأرض، والصحيحُ حملُها على شاربها قبل التحريم.

ترجمہ: (۱۹) ارشاد باری تعالی ہے: ''جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہِ مراد سے محفوظ ہیں (یعنی ان کا

مطلب واضح ہے) اور یہی آیتیں کتاب کی بنیادی آیتیں ہیں۔ اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں''

میں کہتا ہوں: ظاہر یہ ہے کہ محکم وہ کلام ہے جو نہ احتمال رکھتا ہو، مگر ایک معنی کا، جیسے: ''حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں'' اور متشابہ: وہ ہے جو احتمال رکھتا ہو متعدد معانی کا، جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ''کوئی گناہ نہیں ان لوگوں پر جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اس چیز میں جس کو وہ کھاتے ہیں'' کو بعض کج رؤوں نے محمول کیا ہے شراب کی حلت پر جب کہ نہ ہو سرکشی یا زمین میں فساد مچانا۔ اور صحیح اس کو محمول کرنا ہے شراب کی تحریم سے پہلے اس کو پینے والوں پر۔

☆ ☆ ☆

نیت اصل ہے، اعمال اس کے پیکر ہیں

حدیث —— حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ہی اجر ملتا ہے۔ پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے۔ اور جس نے کسی دنیوی غرض کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کام کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث اول)

تشریح: نیت کے معنی ہیں: قصد وارادہ۔ مگر حدیث شریف میں نیت سے علت غائی مراد ہے۔ علت غائی: وہ مقصد ہے جس کے پیش نظر کام کیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص گھر یا چارپائی بناتا ہے تو ایک مقصد لے کر بناتا ہے۔ یہی مقصد علت غائی ہے۔ اور حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی نے دینی کام کرتے وقت اچھا مقصد پیش نظر رکھا ہے، مثلاً ثواب کی امید باندھی ہے یا اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا پیش نظر ہے تو وہ دینی عمل ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی دنیوی غرض پیش نظر ہے تو وہ دینی عمل نہیں ہے، اور اس پر کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ مثلاً ہجرت ایک عمل ہے، پس جو دین کی نصرت کے لئے وطن چھوڑ کر مدینہ آیا، اس کا یہ عمل بہت بڑے اجر کا حقدار ہے۔ اور جو مدینہ میں تجارت کرنے کے لئے یا کسی خاتون سے نکاح کرنے کے لئے آیا اس کا یہ عمل بس اسی مقصد کے لئے ہے جو وہ لے کر آیا ہے۔ اس کا یہ عمل نہ تو دینی ہے اور نہ باعث اجر۔

اور حدیث شریف کے ذریعہ یہ بات سمجھانی مقصود ہے کہ اعمال صالحہ نفس کو اس وقت سنوارتے ہیں اور اس کی کجی کو اس وقت دور کرتے ہیں جب ان کے پیچھے کوئی ایسا مقصد ہو جس کا تہذیب نفس سے تعلق ہو۔ اگر اعمال بطور عادت کئے گئے ہیں، یا لوگوں کو دکھلانے اور سنانے کے لئے کئے گئے ہیں یا طبیعت کے تقاضے سے کئے گئے ہیں تو وہ بے فائدہ اور بے کار ہیں۔ اور طبیعت کے تقاضے سے عمل کی مثال وہ بہادر شخص ہے، جس کو لڑے بغیر چین ہی نہیں آتا۔ اگر دشمن

سے لڑنے کا موقعہ نہیں ملتا تو اپنے بھائیوں سے لڑنے لگتا ہے۔ایسے شخص کا جہاد دینی عمل نہیں ۔نہ ایسے جہاد سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔درج ذیل حدیث میں یہی مضمون ہے۔

حدیث ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا،اور سوال کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے لڑتا ہے،دوسرا ناموری کے لئے لڑتا ہے اور تیسرا اپنی بہادری کا ڈنکا بجانے کے لئے لڑتا ہے۔ان تینوں میں سے راہ خدا میں جہاد کرنے والا کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا:''جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کا بول بالا ہو،وہی راہ خدا میں جہاد کرنے والا ہے''(مشکوۃ حدیث نمبر ۳۸۱۴ کتاب الجہاد)

اور نیت کی اہمیت:اس قدر اس لئے ہے کہ وہ اعمال کی روح ہے۔اور اعمال اس کی صورتیں اور پیکر ہائے محسوس ہیں۔اور اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ وہ قربانیوں کے گوشت پوست اور خون نہیں دیکھتے۔وہ تو تقوی (دل کی کیفیت) کو دیکھتے ہیں(سورۃ الحج آیت ۳۷)

[۲۰] قوله صلى الله عليه وسلم:" إنما الأعمال بالنيات"

أقول: النية: القصد والعزيمة، والمراد ههنا العلّة الغائية التي يتصورها الإنسان، فيبعثه على العمل، مثلُ طلبِ ثواب من الله، أو طلبِ رضا الله.

والمعنى : ليس للأعمال أثر في تهذيب النفس, وإصلاح عِوجها إلا إذا كانت صادرةً من تصوُّرِ مقصدٍ، مما يرجع إلى التهذيب، دونَ العادةِ، وموافقةِ الناس، أو الرياء والسُّمعةِ، أو قضاءِ جِبلَّةٍ، كالقتال من الشجاع الذي لايستطيع الصبر عن القتال، فلو لامجاهدةُ الكفار لَصَرَفَ هذا الخُلُقَ في قتال المسلمين، وهو ما سئل النبي صلى الله عليه وسلم: الرجل يقاتل رياءً ، ويقاتل شجاعة، فأيُّهما في سبيل الله؟ فقال: "من قاتل لتكون كلمة الله هي العلياء فهو في سبيل الله"

والفقه في ذلك: أن عزيمةَ القلب روحٌ، والأعمالَ أشباحٌ لها:

ترجمہ:(۲۰) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:''اعمال کا تعلق نیتوں سے ہے''

میں کہتا ہوں:نیت:قصد وارادے کا نام ہے۔اور مراد یہاں (حدیث میں) وہ علت غائی ہے جس کا انسان تصور کرتا ہے،پس ابھارتا ہے وہ تصور آدمی کو کام کرنے پر،جیسے اللہ سے ثواب چاہنا،اور اللہ کی خوشنودی چاہنا۔

اور حدیث شریف کا مطلب:یہ ہے کہ اعمال کے لئے کوئی تاثیر نہیں ہے نفس کو سنوارنے میں،اور اس کی کجی کو دور کرنے میں،مگر جب ہوں اعمال صادر ہونے والے کسی مقصد کے تصور سے،ان مقاصد میں سے جو لوٹتے ہیں نفس کو سنوارنے کی طرف،نہ کہ عادت سے،یا دکھلانے اور سنانے کے لئے یا فطرت کا تقاضا پورا کرنے کے لئے،جیسے اس

بہادر کا لڑنا جو لڑنے سے صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس اگر نہیں ہوگا کفار کے ساتھ جہاد تو خرچ کرے گا وہ اس اخلاق کو مسلمانوں کے ساتھ لڑنے میں۔ اور وہ وہ ہے کہ سوال کیے گئے نبی ﷺ: ایک شخص لڑتا ہے دکھلانے کے لئے، اور لڑتا ہے بہادری جتانے کے لئے، پس ان دونوں میں سے کون راہ خدا میں لڑنے والا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو لڑتا ہے تاکہ اللہ ہی کا بول بالا ہو، پس وہ راہ خدا میں لڑنے والا ہے''

اور گہری بات: اس سلسلہ میں یہ ہے کہ دل کا ارادہ (عمل کی) روح ہے، اور اعمال ارادے کے پیکر ہیں۔

☆ ☆ ☆

کسی چیز کا قطعی حکم معلوم نہ ہو تو احتیاط چاہئے

حدیث —— حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''حلال واضح ہے۔ اور حرام واضح ہے۔ اور دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں۔ جن کا حکم بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص شبہ والی چیزوں سے بچا تو اس نے اپنے دین کو اور اپنی آبرو کو بچایا۔ اور جو شخص شبہ والی چیزوں میں پڑا، وہ حرام میں جا پڑا۔ جیسے وہ چرواہا جو محفوظ چراگاہ کے اردگرد جانور چراتا ہے ممکن ہے چراگاہ میں جا پڑے۔ سنو! ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہے سنو! اللہ تعالیٰ کی محفوظ چراگاہ حرام امور ہیں۔ سنو! بیشک جسم میں ایک بوٹی ہے، جب وہ سنور جاتی ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو! وہ بوٹی دل ہے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ، کتاب البیوع، حدیث ۲۷۶۲)

تشریح: کبھی کسی مسئلہ میں مختلف جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک دلیل سے حلت مفہوم ہوتی ہے، دوسری دلیل اس کے معارض ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ہدایت نبوی یہ ہے کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جائے، اور دین اور آبرو کو محفوظ رکھا جائے۔ اور تعارض —— مثال کے طور پر —— تین طرح سے ہوتا ہے:

پہلی صورت: کبھی صریح روایات متعارض ہوتی ہیں: جیسے:

(۱) —— مس ذکر سے وضوء ٹوٹتی ہے یا نہیں؟ حضرت بُسرہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹوٹتی ہے۔ اسی کو امام شافعی رحمہ اللہ نے لیا ہے۔ اور حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں ٹوٹتی۔ اسی کو احناف نے لیا ہے۔ تفصیل ''موجباتِ وضوء'' میں آئے گی۔

(۲) —— حالت احرام میں عقد نکاح جائز ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک جائز ہے، اور دیگر ائمہ کے نزدیک جائز نہیں۔ اور روایات میں بھی اختلاف ہے۔ تفصیل 'صفۃ المناسک' میں آئے گی۔

دوسری صورت: کبھی نص میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے معنی کی تعیین میں دشواری پیش آتی ہے۔ کیونکہ

بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی جامع مانع تعریف ممکن نہیں ہوتی۔ بلکہ تقسیم کرکے اور اقسام کی تعریف کرکے ہی مقسم کو سمجھا جاسکتا ہے۔ جیسے اہل معانی فصاحت کی تعریف نہیں کرسکے۔ وہ اس کی تین قسمیں کرتے ہیں اور ہر قسم کی تعریف کرتے ہیں اور اس ذریعہ سے مقسم (فصاحت) کو سمجھتے ہیں۔ یا مثال کے ذریعہ ہی اس لفظ کے معنی سمجھے جاسکتے ہیں۔ تفصیل مبحث سادس کے باب ۱۳ میں گذر چکی ہے۔ پس ایسی صورت میں تین شکلیں ہوتی ہیں: ایک وہ جو یقیناً لفظ کا مصداق ہے، دوسری: وہ جو یقیناً لفظ کا مصداق نہیں ہے۔ اور تیسری: وہ جس میں تذبذب ہے کہ وہ لفظ کا مصداق ہے یا نہیں؟ یہی تیسری صورت حلال وحرام کے درمیان کی اشتباہ والی صورت ہے۔

تیسری صورت: کبھی حکم کی ایک علت ہوتی ہے۔ اور ایک اس کا منشا ہوتا ہے۔ اب ایک ایسی صورت پیش آتی ہے کہ اس میں حکم کی علت تو پائی جاتی ہے، مگر منشا نہیں پایا جاتا، تو اس صورت میں حکم کیا ہوگا؟ اس میں اشتباہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً: کوئی باندی خریدی جائے تو تبدّلِ ملک سے استبرائے رحم واجب ہوتا ہے یعنی ایک حیض آنے تک نیا مالک مقاربت نہیں کرسکتا۔ اس حکم کی علت تبدّل ملک ہے۔ اور منشا نطفوں کو اختلاط سے بچانا ہے۔ اب اگر ایسی صورت پیش آئے کہ کسی ایسے نابالغ بچہ سے، جس سے جماع متصور نہیں، کوئی شخص باندی خریدے، تو کیا اس صورت میں بھی استبراء واجب ہوگا؟ علت: تبدلِ ملک وجوب کو چاہتی ہے۔ اور منشا عدم وجوب کو۔

پس ایسی اشتباہ والی تمام صورتوں میں احتیاط لازم ہے۔ حدیث شریف میں اسی احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، تاکہ آدمی کا دین محفوظ رہے اور اس کی آبرو پر حرف نہ آئے۔

فائدہ: فقہی ضابطہ بھی یہی ہے کہ: ''جہاں مراعاتِ اختلاف سے مذہب کا مکروہ لازم نہ آتا ہو، احتیاط اولی ہے'' مثلاً: مس ذکر سے اگر وضوء نہ بھی ٹوٹتی ہو، تاہم احتیاطاً دوبارہ وضوء کرلی جائے تو کیا حرج ہے؟ اسی طرح خروج دم اور قئے وغیرہ سے۔ اور احرام کی حالت میں نکاح درست بھی ہو، تاہم تاخیر کرنے میں اور احرام کھلنے کے بعد عقد کرنے میں کیا حرج ہے؟ یعنی ان صورتوں میں مذہب کا کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ پس احتیاط والے پہلو پر عمل کرنا اولی ہے۔ البتہ مقتدی کا احتیاطاً فاتحہ پڑھنا درست نہیں۔ کیونکہ مانعین فاتحہ کے نزدیک مقتدی کی قراءت مکروہ تحریمی ہے۔ پس اس احتیاط پر عمل کرنے سے مذہب کا مکروہ لازم آئے گا۔

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے حدیث کی شرح میں اشتباہ کی جو صورتیں بیان کی ہیں، وہ سب درست ہیں۔ مگر ایک صورت جو حدیث کا ماسیق لاجلہ الکلام ہے، اس کو ظاہر ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ اسی کی وضاحت ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے:

کچھ چیزوں کی حلت ہر مسلمان جانتا ہے۔ اسی طرح کچھ چیزوں کی حرمت کا علم بھی سبھی لوگوں کو ہوتا ہے۔ مگر کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا حکم شرعی عام مسلمانوں کو یا کسی خاص شخص کو معلوم نہیں ہوتا۔ مفتی ہی اس کا حکم جانتا ہے۔ ایسی

چیزوں کے بارے میں ایک مسلمان کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ یہ اس حدیث کا اصل مدعیٰ ہے اور حدیث کا یہ جملہ کہ: لایدری کثیر من الناس، أھی من الحلال أم من الحرام؟ اس کا واضح قرینہ ہے۔ پس حدیث شریف میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب تک اس چیز کا حکم شرعی معلوم نہ ہو جائے اس سے احتراز کیا جائے۔ یہ خیال کر کے کہ ابھی اس کا ناجائز ہونا طے نہیں ہے یا ہمیں معلوم نہیں ہے، اس کام کو کر لینا احتیاط کے خلاف ہے۔ معاملات میں ایسی صورتیں بکثرت پیش آتی ہیں۔ ان میں بے احتیاطی ایک مسلمان کے شایان شان نہیں۔ اس سے دین داغدار بھی ہوسکتا ہے، اور آبرو پر بھی حرف آسکتا ہے۔ دینداری کی بات یہ ہے کہ محفوظ چراگاہ (حرام ومشتبہ امور) سے اپنے جانور دور ہی رکھے، تاکہ بے خبری میں وہ چراگاہ میں منہ نہ ماریں۔ اور ایسا احتیاط والا مزاج اسی وقت بن سکتا ہے جب آدمی کا دل سنور جائے۔ یہ بوٹی اگر سنور جائے تو بیڑا پار ہے۔ غرض اس حدیث میں ایسے امور کے سلسلہ میں جن کا حکم شرعی معلوم نہ ہو محتاط طرز عمل اپنانے کی ہدایت ہے۔

[۲۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "الحلال بَيِّنٌ، والحرام بين، وبينهما مشتبِهَات، فمن اتَّقَى الشبهاتِ فقد استبرأ لدينه وعِرْضِه"

أقول: قد تعارض الوجوهُ في المسألة، فتكون السنةُ حينئذ الاستبراءُ والاحتياط، فمن التعارض:

[الف] أن تختلف الرواية تصريحا، كمسِّ الذَّكر، هل ينقُض الوضوء؟ أثبته البعضُ، ونفاه الآخرون، ولكل واحد حديث يشهد له، وكالنكاح للمحرِم، سَوَّغه طائفة، ونفاه آخرون، واختلفت الرواية.

[ب] ومنه: أن يكون اللفظُ المستعملُ في ذلك الباب غيرَ منضبطِ المعنى، يكون معلوما بالقسمة والمثال، ولايكون معلومًا بالحدِّ الجامع المانع، فيخرج ثلاث موادَّ: مادةٌ يُطلق عليه اللفظُ يقينًا، ومادةٌ لايطلق عليها يقينا، ومادةٌ لايُدرى هل يصح الإطلاقُ عليها أم لا؟

[ج] ومنه: أن يكون الحكم منوطًا يقينًا بعلةٍ، هي مَظِنَّةٌ لمقصدٍ يقيناً، ويكون نوع لايوجد فيه المقصدُ، ويوجد فيه العلةُ، كالأمة المشتراة ممن لايجامِعُ مثلُه، هل يجب استبراؤُها؟ — فهذه وأمثالُها يتأكد الاحتياط فيها.

ترجمہ: (۲۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے، اور دونوں کے درمیان اشتباہ والی چیزیں ہیں۔ پس جو شخص بچا اشتباہ والی چیزوں سے تو یقیناً اس نے براءت (پاکی) طلب کی اپنے دین اور اپنی آبرو کے لئے"۔

میں کہتا ہوں: کبھی مسئلہ میں جہتیں متعارض ہوتی ہیں۔ پس ہوتی ہے ہدایت نبوی اس وقت میں براءت طلب کرنا اور احتیاط برتنا۔ پس تعارض (کی صورتوں میں) سے ہے:

(الف) یہ بات کہ صراحۃً روایتیں مختلف ہو جائیں۔ جیسے مس ذکر: کیا وضوء کو توڑتا ہے؟ ثابت کیا نقض کو بعض نے،

اورنفی کی اس کی دوسروں نے۔اور ہرایک کے لئے حدیث ہے جواس کے لئے گواہی دیتی ہے۔اور جیسے محرم کا نکاح۔ جائز قراردیا اس کوایک جماعت نے اورنفی کی اس کی دوسروں نے اور مختلف ہوئیں روایتیں۔

(ب)اورتعارض میں سے: یہ ہے کہ اس مسئلہ میں استعمال کیا جانے والا لفظ ایسا ہو کہ اس کے معنی منضبط نہ ہوں۔وہ لفظ جانا جاتا ہو تقسیم اور مثال کے ذریعہ،اور نہ جانا جاتا ہو جامع مانع تعریف کے ذریعہ۔پس نکلیں گی تین صورتیں: ایک صورت: جس پر لفظ یقیناً بولا جاتا ہے۔اور دوسری صورت: جس پر لفظ یقیناً نہیں بولا جاتا۔اور تیسری صورت: نہیں معلوم کہ اس پر لفظ کا اطلاق صحیح ہے یا نہیں؟

(ج)اورتعارض میں سے: یہ ہے کہ حکم معلق ہو بالیقین کسی ایسی علت کے ساتھ جو کہ یقیناً احتمالی جگہ ہو کسی مقصد کے لئے۔اور ہو ایک قسم جس میں وہ مقصد (منشأ) یقیناً نہ پایا جاتا ہو،اور اس میں علت پائی جاتی ہو۔جیسے اس شخص سے خریدی ہوئی باندی جس کا مانند جماع نہیں کرتا۔کیا واجب ہے اس کا استبراء؟ ـــــ پس یہ اور ان کے مانند مؤکد ہے ان میں احتیاط۔

☆ ☆ ☆

قرآن کی پانچ قسمیں اور ان پر عمل کا طریقہ

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''قرآن کریم پانچ صورتوں پر اتارا گیا ہے: حلال اور حرام اور محکم اور متشابہ اور امثال۔پس حلال کو حلال جانو،اور حرام کو حرام جانو،اور محکم پر عمل کرو،اور متشابہ پر ایمان لاؤ،اور امثال سے عبرت پکڑو'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۲ باب الاعتصام)

تشریح: اس حدیث میں جو قرآن کریم کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں،وہ ایک تقسیم کی اقسام نہیں ہیں،بلکہ متعدد تقسیموں کی اقسام ہیں۔اور قاعدہ یہ ہے کہ ایک تقسیم کی اقسام میں تو منافات ہوتی ہے مگر دو قسموں کی اقسام میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔وہ ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں پس ایک ہی آیت میں محکم وحلال دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔جیسے اصول فقہ والوں نے قرآن کی چار تقسیمات کی ہیں۔جن سے بیس اقسام حاصل ہوتی ہیں پس ہر تقسیم کی اقسام متبائن ہونگی۔خاص اور عام جمع نہیں ہو سکتے،مگر دو تقسیموں کی اقسام جمع ہو سکتی ہیں۔عبارۃ النص، ظاہر اور خاص تینوں ایک ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔اسی طرح ایک تقسیم کی رو سے قرآن کی دو قسمیں ہیں: حلال اور حرام اور دوسری تقسیم کی رو سے بھی دو قسمیں ہیں: محکم اور متشابہ۔پس حلال وحرام تو جمع نہیں ہو سکتے،مگر حلال اور محکم یا حرام اور محکم جمع ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بات جاننی چاہئے کہ اصول دین میں سے: متشابہ آیات واحادیث میں غور نہ کرنا ہے۔متشابہات میں سے جو آیات واحادیث امور آخرت سے متعلق ہیں ان کے بارے میں تو امت کا اجماع ہے کہ وہ ظاہر پر محمول ہیں،پس ان میں تو کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔اور نہ ان میں تاویل جائز ہے۔اور باقی متشابہات میں سے بہت سی آیات

واحادیث میں وہ باتیں مذکور ہیں جن کے بارے میں معلوم نہیں کہ ان کے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی معنی میں سے جو قریب ترین معنی ہیں وہ مراد ہیں۔ مثلاً: صفاتِ متشابہات کی آیات واحادیث جن میں وجہ، ید، استواء اور نزول وغیرہ صفات آئی ہیں: تو ان کے حقیقی معانی مراد ہیں یا ذات، مدد، غلبہ اور توجہ کا منعطف ہونا مراد ہے؟ یہ بات معلوم نہیں، پس ان میں غور کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ اس لئے حدیث میں متشابہ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

[۲۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "نزل القرآن على خمسة وجوه: حلالٌ، وحرام، ومحكم، ومتشابِه، وأمثال"

أقول: هذه الوجوه أقسام للكتاب، ولو بتقسيمات شتى، فلاجرم ليس فيها تمانعٌ حقيقي، فالحكمُ يكون تارةً حلالاً، وأخرى حرامًا.

ومن أصول الدين: تركُ الخوض بالعقل في المتشابهات من الآيات والأحاديث. ومن ذلك أمور كثيــرة، لا يُــدرى أُأُريد حقيقةُ الكلام أم أقربُ مَجازٍ إليها؟ وذلك فيما لم يُجْمِعْ عليه الأئمةُ، ولم تَرْتَفِعْ فيه الشبهةُ. والله أعلم.

ترجمہ: (۲۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "اترا ہے قرآن پانچ طرح پر: حلال اور حرام اور محکم اور متشابہ اور مثالیں"

میں کہتا ہوں: یہ صورتیں کتاب اللہ کی قسمیں ہیں، اگرچہ مختلف تقسیموں سے ہوں۔ پس یقیناً یہ بات ہے کہ ان میں حقیقی تنافی نہیں۔ پس حکم کبھی ہوتا ہے حلال اور کبھی حرام (یعنی یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے)

اور اصول اسلام میں سے ہے: غور نہ کرنا عقل کے ذریعہ متشابہ آیات واحادیث میں۔ اور ان متشابہات میں سے بہت سی چیزیں: نہیں جانا جاتا کہ آیا کلام کے حقیقی معنی مراد لئے گئے ہیں یا حقیقی معانی سے قریب ترین مجازی معنی مراد لئے گئے ہیں؟ اور یہ (نہ جاننا) ان آیات واحادیث میں ہے جن پر امت نے اتفاق نہیں کیا اور جن کے سلسلہ میں اشتباہ رفع نہیں ہوا (اور جو امورِ آخرت سے متعلق آیات واحادیث ہیں، ان کے بارے میں امت میں اتفاق ہے کہ ان کی حقیقی معانی مراد ہیں۔ پس وہ متشابہات کے زمرہ میں شامل نہیں) باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(الحمد للہ! باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ اور کتاب العلم کی احادیث کی شرح مکمل ہوئی)

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حکم کا بیان

کتاب الطہارۃ

باب (۱) طہارت کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب (۲) فضیلتِ وضوء

باب (۳) وضوء کا طریقہ

باب (۴) آدابِ وضوء

باب (۵) نواقض وضوء کا بیان

باب (۶) خفین پر مسح کا راز

باب (۷) غسل کا طریقہ

باب (۸) غسل واجب کرنے والی چیزوں کا بیان

باب (۹) جنبی اور بے وضوء کے لئے کیا کام جائز ہیں اور کیا ناجائز؟

باب (۱۰) تیمّم کا بیان

باب (۱۱) قضائے حاجت کے آداب

باب (۱۲) فطرت کی باتیں اور ان سے لگتی چیزیں

باب (۱۳) پانی کے احکام

باب (۱۴) نجاستوں کو پاک کرنے کا طریقہ

باب ـــــــ ۱

طہارت کے سلسلہ کی اصولی باتیں

طہارت کی اقسام

طہارت کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: حدث (نجاستِ حکمیہ) سے طہارت یعنی جن حالتوں میں وضوء یا غسل واجب ہوتا ہے، ان حالتوں میں وضوء یا غسل کر کے پاکی حاصل کرنا۔

دوسری قسم: ظاہری گندگی (نجاستِ حقیقیہ) سے طہارت۔ خواہ وہ بدن پر لگی ہو، یا کپڑوں پر، یا جگہ پر۔

تیسری قسم: جسم کے مختلف حصوں میں جو میل کچیل پیدا ہوتا ہے اس کی صفائی کرنا۔ جیسے منہ اور دانتوں کی صفائی، ناک کے نتھنوں کی صفائی، اور بغل اور زیر ناف کے بال اور ناخن کاٹنا۔

فائدہ: طہارت کی پہلی قسم کا تعلق اصول بِرّ سے ہے یعنی احداث سے طہارت ایک عبادت ہے۔ وضوء اور غسل شرعی احکام ہیں۔ اور طہارت کی باقی دو قسموں کا تعلق ارتفاقات (آدابِ معیشت) اور اقتضائے طبیعت سے ہے۔ چنانچہ دنیا کی تمام متمدن اقوام ان کا اہتمام کرتی ہیں۔ وہ انسان کا فطری اقتضاء ہیں اس لئے وہ تمام اقوام وملل میں رائج ہیں اور وضوء اور غسل صرف مسلمانوں میں رائج ہیں۔

حدث وطہارت کی پہچان

حدث کیا چیز ہے؟ اور طہارت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا مدار انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذوق ووجدان پر ہے۔ کیونکہ وہ ایسے عالی نفوس والے ہیں جن میں ملکوتی انوار ظاہر ہوئے ہیں۔ وہ جس حالت کے پیش آنے پر انقباض محسوس کرتے ہیں وہ حدث ہے۔ اور جس حالت میں سرور وانبساط محسوس کرتے ہیں وہ طہارت ہے۔

طہارت کی شکلوں اور موجِباتِ طہارت کی پہچان:

احداث سے پاکی کیسے حاصل کی جائے؟ اور وہ کیا اسباب ہیں جو طہارت کو لازم کرتے ہیں؟ اس کا مدار مللِ

سابقہ کے مسلمات پر ہے۔ یہود ونصاری اور مجوس میں اور ملت اسماعیلی کی باقی ماندہ تعلیمات میں جو باتیں مشہور تھیں، وہ ان دونوں باتوں کی بنیاد ہیں۔ یہ ملتیں نجاستِ حکمیہ کی دوقسمیں کرتی تھیں: اصغر اور اکبر۔ اسی طرح طہارت کی بھی دوقسمیں کرتی تھی: اصغر اور اکبر۔ اور عربوں میں غسلِ جنابت کا رواج عام تھا۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے پاکی کی دو قسموں کو حدث کی دوقسموں پر تقسیم کیا۔ حدث اکبر کی صورت میں طہارت کبری رکھی۔ کیونکہ یہ حدث (جنابت اور حیض) بہت کم پیش آتا ہے۔ اور جب وہ پیش آتا ہے تو آلودگی بہت ہوتی ہے۔ اور نفس کسی ایسے سخت عمل کے ذریعہ تنبیہ کا محتاج ہوتا ہے جو روز روز نہ کیا جاتا ہو یعنی غسل کے ذریعہ اس کو چوکنا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور حدث اصغر کی صورت میں طہارت صغری رکھی۔ کیونکہ یہ حدث (بول و براز) بکثرت پیش آتا ہے۔ اور اس میں آلودگی کم ہوتی ہے۔ اور اس میں نفس کو معمولی تنبیہ بھی کافی ہوجاتی ہے۔

حدث کیا ہے؟

حدث بہت سی چیزیں ہوسکتی ہیں۔ جن کو ذوقِ سلیم رکھنے والے جانتے ہیں۔ مثلاً: گالی بکنا، اولیاء سے عداوت رکھنا، اور گندے تصورات ان سب میں حدث کے معنی ہیں۔ ان سے بھی سلیم الفطرت لوگوں کو انقباض ہوتا ہے۔ مگر وہ چیز جس کا عام لوگوں کو مخاطب بنایا جائے یعنی جسے آئینی شکل دی جائے، وہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو حسی طور پر منضبط ہو، جس کا نفس پر اثر واضح ہو، تاکہ اس کے ذریعہ برملا روک ٹوک کی جاسکے۔ کہا جاسکے کہ تیری ریح خارج ہوگئی، وضوء کر۔ چنانچہ شریعت نے پیٹ کے قُرْ اقُر کو حدث قرار نہیں دیا۔ بلکہ درج ذیل تین وجوہ سے سبیلین سے نکلنے والی چیزوں کو حدث قرار دیا ہے:

پہلی وجہ: پیٹ کا بولنا معلوم المقدار نہیں یعنی یہ متعین نہیں کیا جاسکتا کہ کتنے اختلاج کو حدث قرار دیا جائے۔ نیز پیٹ کے گُڑگُڑانے کو حدث قرار دینے کی صورت میں جب وہ اختلاج پایا جائے گا، تو وضوء کے ذریعہ اس کا مداوا نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وضوء ایک بیرونی چیز ہے جو باطن پر اثر انداز نہیں ہوسکتی یعنی وضوء سے پیٹ کا اختلاج ختم نہیں ہوسکتا۔ اور سبیلین سے نکلنے والی چیزیں محسوس ہیں۔ اس لئے انکی مقدار کی تعیین بھی کی جاسکتی ہے، اور خارج کا خارجی تدبیر سے علاج بھی ممکن ہے۔

دوسری وجہ: جب سبیلین سے کوئی چیز نکلتی ہے تو نفس کو انقباض ہوتا ہے۔ اور اس انقباض کا آدمی میں پیکر محسوس پایا جاتا ہے۔ یعنی نجاست کے ساتھ جو جسم آلودہ ہوتا ہے وہ اس انقباض کا واضح نائب (قائم مقام) ہے۔ اس لئے سبیلین سے نکلنے والی چیز کو حدث گردانا جاسکتا ہے۔ اور پیٹ کے بولنے سے بھی اگرچہ نفس منقبض ہوتا ہے۔ مگر اس کا پیکر محسوس اور واضح نائب موجود نہیں، کیونکہ اس سے جسم آلودہ نہیں ہوتا، اس لئے اس کو حدث قرار دینا مشکل ہے۔

تیسری وجہ: وضوء کا نفس پر اثر اس وقت پڑتا ہے جب نفس کا حدث میں اشتغال ختم ہو جائے اور اس کی مصروفیت نجاست نکل جانے ہی سے ختم ہو سکتی ہے، کیونکہ پیٹ کا بولنا جب تک جاری ہے حدث کی حالت مستمر ہے۔ پس اس حالت میں وضوء اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

فائدہ: اور پیٹ کی گڑ بڑ ایک طرح سے حالتِ حدث ہے اس پر تنبیہ اُس حدیث میں آئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ''تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ اس سے دو گندی چیزیں (پیشاب اور پاخانہ) مزاحمت کر رہی ہوں'' (مسلم ۵:۴۷ مصری واللفظ لأبی عوانۃ ۲:۱۶) یعنی چھوٹی بڑی حاجت کے شدید تقاضے کی صورت میں نماز نہیں پڑھنی چاہئے کہ یہ بھی گونہ حدث کی حالت ہے، کامل طہارت کی حالت نہیں ہے۔

طہارتیں کیا ہیں؟

وہ چیزیں جن کو پاکی قرار دیا جا سکتا ہے بہت ہیں۔ جیسے خوشبو لگانا، ایسے اذکار اور ایسی دعائیں مانگنا جو پاکی کی خصلت یاد دلائیں۔ جیسے یہ دعا کرنا کہ الٰہی! مجھے گناہوں اور گندگیوں سے پاک فرما۔ اور یہ دعا کہ الٰہی! مجھے گناہوں سے ایسا پاک کر دے جیسا کپڑا میل کچیل سے پاک کیا جاتا ہے، اسی طرح متبرک جگہ میں پہنچنا، اور اس قسم کی دوسری چیزوں سے بھی نفس میں سرور وانبساط پیدا ہوتا ہے، جو وضوء وغسل سے پیدا ہونے والی حالت کے مشابہ ہے، اس لئے اس کیفیت کو بھی پاکی کہہ سکتے ہیں۔

غرض ایسی چیزیں بہت ہیں جن میں طہارت کے معنی پائے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر چیز کو پاکی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پاکی اسی چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے اور عام لوگوں کو اسی کا مخاطب بنایا جا سکتا ہے جس کے کرنے کا کوئی طریقہ متعین ہو، اور جس کو ہر جگہ ہر شخص آسانی سے کر سکے، اور جس کا اثر واضح طور پر نفس پر پڑے، اور جس کو دنیا کے تمام مذاہب نے طہارت تسلیم کیا ہو —— ایسی چیزیں صرف دو ہیں: وضوء اور غسل۔

وضوء: دراصل جسم کے اطراف کو دھونے کا نام ہے۔ شریعت نے طرف اعلی میں سے سر اور چہرے کو لیا ہے۔ سر پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ اس کو بار بار دھونے میں حرج ہے۔ اور چہرہ کو لفظ وَجْـه سے منضبط کیا ہے یعنی جس قدر حصہ سے مواجہہ (سامنا) ہوتا ہے وہ چہرہ ہے اس کو دھونے کا حکم دیا۔ اور بیچ سے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت لیا، کیونکہ اس سے کم مقدار دھونے کا طبیعت پر کوئی واضح اثر نہیں پڑتا اور طرف اسفل سے دونوں پیروں کو ٹخنوں سمیت لیا۔ کیونکہ ٹخنوں کے ساتھ قدم ایک مکمل عضو ہے، اس سے کم مقدار عضو تام نہیں۔

اور غسل: دراصل سارے بدن کو دھونے کا نام ہے۔

اور موجباتِ وضوء: دراصل وہ چیزیں ہیں جو سبیلین سے نکلتی ہیں۔ اور دیگر احداث جیسے قئے، پیپ اور خون بعض

علماء کے نزدیک اور مسِّ ذکر اور مسِّ عورت دوسرے حضرات کے نزدیک، یہ سب ماخرج من السبیلین کے ساتھ ملحق ہیں۔ اس لئے کہ ان سے بھی نفس منقبض ہوتا ہے۔

اور موجباتِ غسل: دو ہیں: صحبت اور حیض ونفاس۔ ان دونوں چیزوں کا موجبِ غسل ہونا قدیم عربوں میں تقریباً مسلّم تھا۔

فائدہ: شارع نے بھی ان دونوں پاکیوں کو مسلّم رکھا ہے۔ اور ان کے احکام متعین کئے ہیں۔ اور تعیین احکام میں نہ تو تہذیب کے ادنی درجہ کا اعتبار کیا ہے، نہ اعلی درجہ کو پیش نظر رکھا ہے، بلکہ عربوں کی متوسط تہذیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور یہ بات صرف طہارت کے باب ہی میں نہیں، بلکہ معیشت وعمرانیات کی جو بھی باتیں بیان کی ہیں، ان میں اسی متوسط حالت کا لحاظ کیا ہے۔ اور قوانین بناتے وقت اس بات کا بھی لحاظ کیا ہے کہ بالکل نئے قوانین نہ بنائے جائیں۔ بلکہ عربوں میں ان دونوں طہارتوں کے جو طریقے رائج تھے انہی کو سنوار دیا جائے، اور ان کے آداب کی تعیین کی جائے، جیسے پندرہ دن میں ناخن اور زیر ناف کاٹ لینے چاہئیں، اور چالیس دن سے زیادہ نہ کاٹنا مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح جو چیزیں مشتبہ تھیں، ان کے احکام پوری وضاحت کے ساتھ متعین کئے۔ جیسے ڈاڑھی اور مونچھ میں امتیاز کیا گیا، اول کو باقی رکھنے کا اور ثانی کو مبالغہ کے ساتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ کیونکہ لوگوں میں سے کوئی تو دونوں کو کاٹتا ہے، اور کوئی دونوں کو چھوڑتا ہے اور کوئی ڈاڑھی کاٹتا ہے اور مونچھیں بڑھاتا ہے۔ اسلام میں یہ سب صورتیں ممنوع ہیں۔

عرب ڈاڑھی اور مونچھ دونوں بڑھاتے تھے۔ عربی میں مونچھ کو شارب (پینے والی) کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کھانے پانی میں آلودہ ہوتی تھی۔ اور ایرانی ڈاڑھی مونڈھتے تھے اور مونچھیں بڑھاتے تھے۔ اسلام نے حکم دیا کہ ڈاڑھی بڑھائی جائے، اور مونچھوں کو پست کیا جائے، تاکہ اسلامی چہرہ سب سے ممتاز ہو جائے۔

اسی طرح اگر کوئی چیز مبہم تھی تو شریعت نے اس کا پیمانہ مقرر کیا۔ مثلاً: یہ بات کہ بدن میں میل کچیل پیدا ہوا یا نہیں؟ ایک مبہم چیز ہے۔ عام لوگوں کے لئے اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ کیونکہ کوئی تو روزانہ نہاتا ہے، اور کوئی ہفتوں مہینوں نام نہیں لیتا۔ اس لئے اسلام نے ہفتہ کی مقدار متعین کی۔ اور جمعہ کے دن نہانا مسنون کیا۔ کیونکہ اتنی مدت گزرنے پر عام طور پر جسم میں میل کچیل پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

﴿من أبواب الطهارة﴾

اعلم أن الطهارة على ثلاثةِ أقسامٍ:

[۱] طهارةٌ من الحدث.

[۲] وطهارةٌ من النجاسة المتعلِّقة بالبدن، أو الثوب، أو المكان.

[۳] وطهارةٌ من الأوساخ النابتةِ من البدن، كشَعر العانة، والأظفار، والدَّرَن.

أما الطهارةُ من الأحداث فمأ خوذةٌ من أصول البر.

والعمدة في معرفة الحدث وروح الطهارة: وِجدانُ أصحاب النفوس التي ظهرتْ فيها أنوارٌ مَلَكية، فأحسَّتْ بمنافرتها في الحالة التي تُسمى حدثًا، وسرورِها وانشراحِها في الحالة التي تسمى طهارةً.

وفي تعيين هيئاتِ الطهارة وموجباتِها: ما اشتهر في الملل السابقة: من اليهود والنصارى، والمجوس، وبقايا الملة الإسماعيلية؛ فكانوا يجعلون الحدث على قسمين، والطهارةَ على ضربين، كما ذكرنا من قبلُ؛ وكان الغسلُ من الجنابة سنةً سائرةً في العرب، فوزَّع النبيُّ صلى الله عليه وسلم قِسْمي الطهارةِ على نوعَي الحدث: فجعل الطهارةَ الكبرى بإزاء الحدث الأكبر، لأنه أقلُّ وقوعًا، وأكثر لَوْثًا، وأحوجُ إلى تنبيه النفس بعمل شاقٍّ، قَلَّمَا يُفعل مثلُه؛ والطهارةَ الصغرى بإزاء الحدث الأصغر، لأنه أكثر وقوعًا، وأقلُّ لَوْثًا، ويكفيه التنبيه في الجملة.

ترجمہ: طہارت سے تعلق رکھنے والی روایات: جان لیں کہ طہارت کی تین قسمیں ہیں: (۱) حدث سے طہارت (۲) اس نجاست سے طہارت جو تعلق رکھنے والی ہے بدن سے، یا کپڑے سے، یا جگہ سے (۳) اور اس میل کچیل سے طہارت جو بدن میں پیدا ہونے والا ہے۔ جیسے زیر ناف کے بال، اور ناخن اور میل کچیل ——— رہی احداث سے طہارت تو وہ لی ہوئی ہے نیکی کے اصولوں سے۔

اور مدار حدث اور طہارت کی روح کی معرفت میں: ایسے نفوس والوں کے ذوق پر ہے جن میں ملکوتی انوار ظاہر ہوئے ہیں۔ پس محسوس کی ہے ان نفوس نے اپنی عدم مناسبت اس حالت سے جو حدث کہلاتی ہے اور (محسوس کیا ہے) اپنا سرور وانبساط اس حالت سے جو طہارت کہلاتی ہے۔

اور (مدار) طہارت کی شکلوں، اور اس کو واجب کرنے والی چیزوں کی تعیین میں: اُن باتوں پر ہے جو گذشتہ ملتوں میں مشہور تھیں۔ یعنی یہود، نصاری، مجوس اور باقی ماندہ ملت اسماعیلی۔ پس وہ لوگ حدث کی دو قسمیں کیا کرتے تھے، اور طہارت کی بھی دو قسمیں کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے (رحمۃ اللہ ۲: ۴۲۷) اور جنابت کا غسل ایک عام طریقہ تھا عربوں میں۔ پس تقسیم کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت کی دونوں قسموں کو حدث کی دونوں قسموں پر۔ پس گردانا طہارت کبری کو حدث اکبر کے مقابلہ میں، اس لئے کہ حدث اکبر کم ہے واقع ہونے کے اعتبار سے، اور زیادہ ہے تلویث کے اعتبار سے۔ اور زیادہ محتاج ہے نفس کو تنبیہ کرنے کا کسی ایسے دشوار عمل کے ذریعہ جس کا مانند کم کیا جاتا ہو۔ اور (گردانا) طہارت صغری کو حدثِ اصغر کے مقابلہ میں، اس لئے کہ حدث اصغر زیادہ ہے واقع ہونے کے اعتبار سے، اور کم ہے تلویث کے اعتبار سے، اور کافی ہے اس میں فی الجملہ (کسی درجہ میں) تنبیہ۔

ترکیب: في تعيين کا عطف في معرفة الحدث پر ہے۔

تصحیح: فی الحالۃ پہلی جگہ اصل میں اور تینوں مخطوطوں میں للحالۃ تھا۔ میں نے دوسرے فی الحالۃ کے قرینہ سے تصحیح کی ہے۔

والأمورُ التی فیها معنی الحدث کثیرة جدًّا، یَعرفها أهلُ الأذواق السلیمةِ، لکنَّ الذی یصلُح أن یخاطَب به الناسُ کافةً: ما هو منضبطٌ بأمور محسوسةٍ، ظاهرةِ الأثر فی النفس، لیمکن المواخَذَةُ به جهرةً، فلذلك:

تُعُیِّنَ أن لایُدارَ الحکمُ علی اشتغال النفس بما یَخْتَلِجُ فی المعدة، ولکنْ یُدار علی خروج شیئ من السبیلین، فإن الأول غیرُ مضبوطِ المقدار، وإذا تمکّن لایرفعُه الوضوء من خارج، والثانی معلومٌ بالحس.

وأیضًا: فلمعنی انقباض النفس فیه شَبَحٌ محسوسٌ، وخلیفتُه ظاهرة، وهی التلطُّخ بالنجاسة.

وأیضاً: إنما یؤثر الوضوء عند زوال اشتغال النفس، وذلك بالخروج، وقد نَبَّهَ النبی صلی الله علیه وسلم فی قوله:" لایصلِّ أحدکم وهو یدافِعه الأخبثان": أن نفس الاشتغال فیه معنی من معانی الحدث.

ترجمہ: اور وہ چیزیں جن میں حدث کے معنی (انقباض) ہیں بہت زیادہ ہیں۔ پہچانتے ہیں ان کو سلیم ذوق رکھنے والے۔ البتہ وہ چیز جو اس قابل ہے کہ اس کے ذریعہ تمام لوگوں کو خطاب کیا جائے یعنی سب کو اس کا حکم دیا جائے، وہ وہی ہے جو محسوس چیزوں کے ساتھ منضبط ہو، جس کا اثر نفس میں واضح ہو، تاکہ اس کے ذریعہ علی الاعلان دارو گیر ہوسکے، پس اسی وجہ سے:

متعین کی گئی یہ بات کہ حکم دائر نہ کیا جائے نفس کی مشغولیت پر اس چیز کے ساتھ جو پیٹ میں گڑگڑ کرتی ہے۔ بلکہ حکم دائر کیا جائے سبیلین سے کسی چیز کے نکلنے پر۔ اس لئے کہ اول کی مقدار منضبط نہیں ہے۔ اور جب وہ پایا جائے گا تو نہیں رفع کرے گا اس کو باہر سے وضوء کرنا۔ اور دوسری چیز حسّی طور پر معلوم ہے۔

اور نیز: نفس کے انقباض کے معنی کے لئے (اس میں لفظ معنی زائد ہے، مراد انقباض ہے) آدمی میں پیکر محسوس ہے۔ اور اس کا نائب واضح ہے (عطف تفسیری ہے۔ پیکر اور خلیفہ ایک ہی چیز ہیں) اور وہ نائب نجاست کے ساتھ لت پت ہونا ہے۔

اور نیز: وضوء اثر انداز ہوتا ہے نفس کی مشغولیت کے ختم ہونے کی صورت ہی میں۔ اور وہ (مشغولیت کا ختم ہونا) نجاست نکلنے سے ہے۔ اور تحقیق آگاہ فرمایا نبی ﷺ نے اپنے ارشاد لایصل إلخ میں اس بات پر کہ خود مشغولیت، اس میں حدث کے معانی میں سے کوئی معنی ہیں (یعنی اس سے بھی گونہ انقباض ہوتا ہے)

تصحیح: لیمکن المؤاخذة اصل میں لتمکن المؤاخذة تھا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے...... یدافعه الأخبثان اصل میں یدافع الأخبثین تھا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں اور مسند ابی عوانہ سے کی ہے دَافَعَه: مزاحمت کرنا...... اخبث (اسم تفضیل) نہایت ناپاک۔ یہ فاعل ہے۔

والأمور التی فیها معنی الطهارة کثیرة، کالتطَیُّب، والأذکار المذَکِّرة لهذه الخَلّة، کقوله: "اللّٰهم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتَطَهِّرِیْن" وقوله: "اللّٰهم نَقِّنِیْ من الخطایا، کما نَقَّیْتَ الثوبَ الأبیض من الدَّنَسِ" والحلولِ بالمواضع المتبرکة، ونحوِ ذلك، لکنَّ الذی یصلُح أن یخاطَب به جماهِرُ الناس: مایکون منضبطًا متیسِّرًا لهم کلَّ حین وکلَّ مکان، والذی یُحَسُّ اثرُه بادی الرأی، والذی جری علیه طوائف الأمم.

وأصل الوضوء: غَسل الأطراف، فَضَبَطَ الوجهَ بما ضبطه، والیدین إلی المرفقین، لأن دون ذلك لایُحَس أثَرُه، والرِّجلین إلی الکعبین، لأن دون ذلك لیس بعضو تامٍّ، وجعل وظیفةَ الرأسِ المسحَ، لأن غسلَه نوعٌ من الحرج.

وأصل الغُسل: تعمیمالبدن بالغَسل.

وأصل موجِبِ الوضوء: الخارج من السبیلین، وما سوی ذلك محمولٌ علیه.

وأصل موجِب الغسل: الجماع، والحیض، وکان هذین الأمرین کانا مسلَّمین فی العرب قبل النبی صلی الله علیه وسلم.

وأما القسمان الآخران من الطهارة: فمأخوذان من الارتفاقات، فإنهما من مقتضی أصل طبیعةِ الإنسان، لاینفك عنهما قوم ولاملة، والشارع اعتمد فی ذلك علی ما عند العرب القُحِّ من الرفاهیة المتوسطة، کما اعتمد علیه فی سائر ما ضبط من الارتفاقات، فلم یزد النبی صلی الله علیه وسلم علی تعیین الآداب، وتمییز المشکل، وتقدیر المبهم.

ترجمہ: اور وہ چیزیں جن میں طہارت کے معنی (سرور وانبساط) ہیں بہت ہیں۔ جیسے خوشبو لگانا۔ اور یہ خصلت یعنی طہارت کو یاد دلانے والے اذکار، جیسے قائل کا قول: اللّٰهم اجعلنی إلخ اور قائل کا قول: اللّٰهم نقنی إلخ اور بابرکت جگہوں میں اترنا، اور اس جیسی چیزیں۔ لیکن وہ چیز جو صلاحیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعہ عام لوگوں کو مخاطب بنایا جائے یعنی ان کو بتلائی جائے، وہ ہے جو منضبط ہو، آسان ہو لوگوں کے لئے ہر وقت میں اور ہر جگہ میں اور جس کا اثر محسوس کیا جائے واضح طور پر، اور جس پر چلتے رہے ہوں تمام مذاہب۔

اور وضو کی اصل اطراف بدن کا دھونا ہے۔ پس شارع نے چہرے کو منضبط کیا اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ اس کو

منضبط کیا۔ اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت منضبط کیا۔ اس لئے کہ اس سے کم نہیں محسوس کیا جاتا اس کا اثر۔ اور دونوں پیروں کو ٹخنوں سمیت منضبط کیا، اس لئے کہ اس سے کم نہیں ہے عضو تام۔ اور گردانا سر کا حکم مسح۔ اس لئے کہ اس کا دھونا ایک طرح کی پریشانی ہے۔

اور غسل کی اصل: سارے ہی بدن کو دھونا ہے۔

اور وضوء واجب کرنے والی چیزوں کی اصل: وہ چیز ہے جو سبیلین سے نکلتی ہے۔ اور جو چیزیں اس کے علاوہ ہیں وہ اس پر محمول ہیں یعنی ان کو سبیلین سے نکلنے والی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔

اور غسل واجب کرنے والی چیزوں کی اصل: جماع اور حیض ہیں۔ اور گویا یہ دونوں چیزیں مسلّم تھیں عربوں میں نبی ﷺ سے پہلے۔

رہی طہارت کی دوسری دو قسمیں: تو وہ دونوں لی ہوئی ہیں ارتفاقات سے۔ پس بیشک وہ دونوں طہارتیں انسان کی طبیعت کی اصل کا مقتضی ہیں (اس میں لفظ اصل زائد ہے) نہیں جدا ہوتی ان دونوں سے کوئی قوم اور نہ کوئی ملت۔ اور شارع نے اعتماد کیا ہے ان دونوں طہارتوں میں اس چیز پر جو خالص عربوں کے پاس تھیں: درمیانی تمدن سے، جیسا کہ اعتماد کیا ہے اس پر دیگر ان چیزوں میں جو منضبط کی ہیں شارع نے ارتفاقات میں سے۔ پس نہیں زیادہ کیا نبی ﷺ نے آداب کی تعیین پر، اور مشتبہ کے امتیاز پر، اور مبہم کا اندازہ کرنے پر۔

تصحیح: بما ضبطه: تینوں مخطوطوں سے بڑھایا ہے۔ اصل میں نہیں تھا۔

☆　　☆　　☆

باب ——— ۲

فضیلتِ وضوء

وہ احادیث جو وضوء کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں

پاکی آدھا ایمان ہے

پہلے ابواب الایمان میں یہ حدیث گذری ہے کہ پاکی آدھا ایمان ہے۔ اور وہیں ایمان کے چار معانی بھی بیان کئے گئے ہیں۔ چوتھے معنی ہیں: ''دل کا سکون واطمینان'' یہ ایک وجدانی کیفیت ہے، جو طہارت واخبات کے انوار کا مرکب ہے۔ جب آدمی مسلسل پاکی کا اہتمام کرتا ہے، اور اس کا دل بارگاہ خداوندی میں نیاز مند بنا رہتا ہے تو یہ نورانی

کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو مؤمن کے لئے باعثِ طمانینت ہے۔ مذکورہ حدیث میں ایمان سے یہی حالت مراد ہے، تصدیقِ قلبی مراد نہیں۔ اور اس کیفیت کے لئے ایمان کے بجائے احسان کا لفظ زیادہ موزون ہے۔ اور جب یہ کیفیت دو چیزوں (پاکی اور نیازمندی) کا مجموعہ ہے تو پاکی بالیقین اس کا آدھا ہے۔

وضوء سے گناہ معاف ہوتے ہیں

حدیث ـــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جو شخص وضوء کرے، پس عمدہ وضوء کرے یعنی آداب کی رعایت کے ساتھ وضوء کرے، تو اس کے گناہ اس کے بدن سے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں یعنی وہ خطاؤں سے بالکل پاک صاف ہوجاتا ہے۔

تشریح: جب پاکی کا اثر دل کی جڑ تک پہنچ جاتا ہے یعنی آدمی کا باطن پاک ہوجاتا ہے تو تین فائدے حاصل ہوتے ہیں: اول: وہ باطنی طہارت نفس کو مقدّس بناتی ہے۔ دوم: وہ اس نفس کو ملائکہ کی لڑی میں پروتی ہے۔ سوم: وہ بہت سے گندے احوال کو فراموش کرادیتی ہے۔ پس طہارتِ باطنی کا جو خاصہ تھا یعنی گندے احوال کو فراموش کرادینا وہ وضوء کو دیدیا گیا۔ پس وہ بھی گناہوں کی معافی کا سبب بن جاتا ہے۔ کیونکہ وضوء طہارتِ باطنی کا پیکر محسوس، احتمالی جگہ اور عنوان تعبیری ہے یعنی طہارتِ باطنی وضوء کے ذریعہ بھی حاصل کی جاتی ہے اور آدمی اپنی طہارت کو وضوء سے تعبیر بھی کرتا ہے کہتا ہے کہ میں باوضوء ہوں۔

قیامت کے دن اعضائے وضو روشن ہوں گے

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میری امت قیامت کے دن بلائی جائے گی، روشن پیشانی، سفید اعضاء، وضوء کے اثر سے، پس جو چاہے کہ اپنی پیشانی کی روشنی کو دراز کرے، تو چاہئے کہ کرے'' (مشکوۃ ۲۹۰)

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مؤمن کو زیور پہنایا جائے گا جہاں تک وضوء کا پانی پہنچے گا'' (مشکوۃ ۲۹۱)

تشریح: طہارت باطنی کا پیکر محسوس اعضائے خمسہ (چہرہ، دو ہاتھ اور دو پاؤں) کو دھونا ہے۔ پس طہارت باطنی کی وجہ سے نفس کو جو خوش عیشی حاصل ہوگی، وہ اُن اعضاء کے زیور، پیشانی کی روشنی اور ہاتھ پاؤں کی چمک کی صورت میں متشکل ہوگی۔ کیونکہ واقعاتِ خارجیہ کی بھی خوابوں کی طرح تعبیر ہوتی ہے۔ پس جس طرح خواب میں بزدلی وَبْر (بلی سے چھوٹا ایک جانور جس کی دم اور کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں) اور بہادری شیر کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح

طہارت باطنی کی برکت سے نفس کی لطف اندوزی زیوراوراعضائے وضوء کی چمک کی صورت اختیار کرے گی۔

ہمیشہ باضوء رہنا ایمان کی نشانی ہے

حدیث ـــــ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اِسْتَقِیْمُوْا، وَلَنْ تُحْصُوْا، واعلموا أن خَیرَ أعمالِکم الصلاۃُ، ولایُحافِظُ علی الوضوء إلا مؤمن: ترجمہ: سیدھے رہو یعنی اعمال پر مستقیم رہواور ہمیشہ سیدھی راہ چلواور ہرگز تم اس کی طاقت نہیں رکھتے یعنی کامل استقامت تو بہت مشکل امر ہے، پس حتی الامکان مستقیم رہو۔ اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں سب سے بہتر نماز ہے (یعنی تمام اعمال پر مستقیم نہ رہ سکو، تو کم از کم نماز کا اہتمام تو ضرور کرو، کیونکہ وہ عبادات میں سب سے عمدہ ہے، اوراس کا مقدمہ وضوء ہے) اور وضوء پر محافظت نہیں کرتا مگر مؤمن (مشکوۃ ۲۹۲)

تشریح: ہمیشہ باوضوء رہنا ایک سخت دشوار عمل ہے۔اس پر مداومت وہی شخص کرسکتا ہے جو طہارت کے معاملہ میں بابصیرت ہو (اس کی تفصیل مبحث ۵ باب ۸ میں گذرچکی ہے) اور وضوء کے عظیم فوائد پر کامل یقین رکھتا ہو، اس لئے ہمیشہ باوضوء رہنے کو ایمان کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

﴿ فضلُ الوضوء ﴾

[۱] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "الطُّهور شَطْرُ الإیمان"

أقول: المراد بالإیمان ههنا: هیئة نفسانیة مرکبة من نور الطهارة والإخبات، والإحسان أوضح منه فی هذا المعنی، ولاشك أن الطُّهور شطره.

[۲] قوله صلی اللہ علیہ وسلم: "من توضَّأ، فأحسن الوضوءَ، خرجت خطایاه من جسده، حتی تَخْرُجَ من تحتِ أظفاره"

أقول: النظافةُ المؤثِّرة فی جذر النفس تُقَدِّسُ النفسَ، وتُلْحِقُهَا بالملائكة، وتُنْسِی كثیرًا من الحالات الدَّنسیة، فَجُعلت خاصیتُها خاصیةً للوضوء الذی هو شَبَحُهَا ومَظِنَّتُهَا وعنوانُها.

[۳] قوله صلی اللہ علیہ وسلم: "إن أمتی یُدْعَوْنَ یوم القیامة غُرًّا مُحَجَّلِینَ من آثار الوضوء، فمن استطاع منكم أن یُطِیلَ غُرَّته فلیفعل" وقوله صلی اللہ علیہ وسلم: "تبلغ الحلیة من المؤمن حیث یبلغ الوضوء"

أقول: لما كان شَبَحُ الطهارةِ ما یتعلق بالأعضاء الخمسة، تَمَثَّلَ تَنَعُّمُ النفسِ بها حلیةً لتلك الأعضاء، وغرةً وتحجیلا، كما یتمثل الجُبْنُ وَبَرًا، والشجاعةُ أسدًا.

[٤] قوله صلی اللہ علیہ وسلم: "لایُحافظ علی الوضوء إلا مؤمن"

أقول: لما كان المحافظة عليه شاقَّةً، لاتتأتى إلا ممن كان على بصيرة من أمر الطهارة، مُوْقِنًا بنفعِها الجسيمِ، جُعلت علامةَ الإيمان.

ترجمہ: فضیلتِ وضوء: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پاکی آدھا ایمان ہے'' میں کہتا ہوں: یہاں ایمان سے مراد وہ ہیئتِ نفسانیہ ہے جو طہارت اور اخبات کے نور سے مرکب ہے۔ اور لفظ احسان، لفظ ایمان سے اس معنی کے لئے زیادہ موزون ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ پاکی اس ایمان کا نصف ہے۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: جس نے وضوء کیا الخ'' میں کہتا ہوں: وہ پاکی جو نفس کی جڑ میں اثر انداز ہونے والی ہے، وہ مقدس بناتی ہے نفس کو، اور ملاتی ہے اس کو فرشتوں سے، اور فراموش کرادیتی ہے بہت سے ناپاک حالات کو۔ پس گردانی گئی اس باطنی پاکی کی خاصیت اس وضوء کی خاصیت جو کہ وہ ایسی باطنی نظافت کا پیکر اور احتمالی جگہ اور عنوان تعبیری ہے۔

(۳) آنحضرت ﷺ کے دو ارشادات: (جن کا ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: جب طہارت باطنی کا پیکر محسوس وہ عمل تھا جو اعضائے خمسہ کے ساتھ متعلق ہے یعنی ان کا دھونا، تو متشکل ہوئی نفس کی خوش عیشی طہارت باطنی کی وجہ سے، زیور کی شکل میں ان اعضاء کے لئے۔ اور پیشانی کی روشنی اور ہاتھ پاؤں کی چمک کی صورت میں۔ جس طرح بزدلی دَبَر جانور اور بہادری شیر کی صورت میں متشکل ہوتی ہے۔

(۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہیں مداومت کرتا وضوء پر مگر مؤمن'' میں کہتا ہوں: جب وضوء پر مداومت سخت دشوار عمل تھا، نہیں حاصل ہوتی مداومت مگر اس شخص سے جو بابصیرت ہو طہارت کے معاملہ میں، یقین رکھنے والا ہو اس کے عظیم نفع کا، تو اس مداومت کو ایمان کی نشانی گردانا گیا۔

تصحیح: عنوان فضلُ الوضوء مطبوعہ نسخہ میں فصل فی الوضوء تھا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی گئی ہے۔ اور یہ عجیب تصحیف ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۳

وضوء کا طریقہ

وضوء کا طریقہ: جس کو حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم، وغیرہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، بلکہ آپؐ سے تواتر کے ساتھ وہ طریقہ مروی ہے۔ اور جس پر امت نے اتفاق کیا ہے: وہ یہ ہے کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے دونوں ہاتھوں کو گٹوں تک تین بار دھولے۔ پھر کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے اور

اس کو جھاڑے، پھر چہرہ دھوئے پھر دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے، پھر سر کا مسح کرے، پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے۔

پیروں کے دھونے کا انکار: اَجلیٰ بدیہیات کا انکار ہے

شیعوں کا فرقۂ امامیہ (اثنا عشریہ) وضوء میں ننگے پاؤں پر مسح کا قائل ہے۔ یہ گمراہ فرقہ پیروں کے دھونے کا انکار کرتا ہے اور یہ بات ابوعلی جُبائی اور داؤد ظاہری کی طرف بھی منسوب کی گئی ہے۔ یہ لوگ آیت وضوء میں جر والی قراءت سے استدلال کرتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اَجلیٰ بدیہیات کا انکار ہے، یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کوئی غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد کا انکار کرے، جو چڑھتے سورج کے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ دونوں غزوے تواتر کے ساتھ مروی ہیں۔ اسی طرح وضوء میں خالی پیروں کا دھونا بھی تواتر سے ثابت ہے۔

البتہ دو باتیں ایسی ہیں کہ علماء ان کے فیصلہ میں اس وقت تک توقف کر سکتے ہیں، جب تک حقیقتِ حال خوب روشن نہ ہو جائے:

پہلی بات: اگر کوئی کہے کہ وضوء میں ننگے پیروں کا مسح بھی کرنا چاہئے اور ان کو دھونا بھی چاہئے یعنی دونوں چیزوں کو جمع کرنا چاہئے جیسا کہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی رائے ہے (اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضوء کے شروع میں پیر دھولے، پھر وضوء شروع کرے اور سر کے مسح کے بعد پیروں پر مسح کرے جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں، مگر یہ طریقہ غیر ثابت اور غیر مشروع ہے۔ پیروں کو ان کے نمبر پر دھونا ضروری ہے، ورنہ وضوء خلاف ترتیب ہوگا)

دوسری بات: یا کوئی کہے کہ فرض کا ادنیٰ درجہ مسح کرنا ہے۔ تاہم پیروں کا دھونا بھی ضروری ہے۔ جو شخص پیر نہیں دھوتا وہ سخت سرزنش کا حقدار ہے (معلوم نہیں یہ بات کس نے کہی ہے)

مگر جمہور علماء نے یہ دونوں باتیں قبول نہیں کیں۔ ان کے نزدیک پیروں کا قطعی حکم دھونا اور صرف دھونا ہے۔ پھر کوئی تو جر کی قراءت کو جرِّ جوار کہتا ہے اور کوئی نصب و جر کی دونوں قراءتوں کو دو حالتوں پر محمول کرتا ہے یعنی پیروں میں خفین ہوں تو جر والی قراءت کے مطابق ان پر مسح ہوگا۔ اور پیر خالی ہوں تو نصب والی قراءت کے مطابق ان کا دھونا ضروری ہے۔

اور ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ مسح کے دو معنی ہیں: (۱) تر ہاتھ کسی عضو پر پھیرنا (۲) ہلکا دھونا۔ (یہ توجیہ شاہ صاحب نے مسوّی باب وجوب الوضوء إلخ میں کی ہے) یعنی جب مسح کا تعلق سر کے ساتھ کیا جائے تو پہلے معنی مراد لئے جائیں۔ اور جب جر والی قراءت میں اس کا تعلق پیروں کے ساتھ کیا جائے تو صنعتِ استخدام کے طور پر دوسرے معنی مراد لئے جائیں۔ اور دلیل نصب والی قراءت ہے۔ کیونکہ جر کی صورت میں بھی مسح کے پہلے ہی معنی مراد لئے جائیں گے تو دونوں قراءتوں میں تعارض پیدا ہو جائے گا۔

اور صنعتِ استخدام سے کام اس لئے لیا گیا ہے کہ عرب میں پانی بہت کم تھا۔ اور لفظ غَسل میں مبالغہ ہے، اور عام

طور پر لوگ ننگے پاؤں چلتے تھے۔ پس اگر پیروں کو غسل کے تحت لایا جاتا تو ممکن تھا مخاطبین اولین کے لئے یہ حکم شاق ہوتا۔ کیونکہ پیروں کو خوب صاف کرنے کے لئے ایک لوٹا پانی درکار ہوگا۔ اس لئے رجلین کو مسح کے تحت لایا گیا، اور اشارہ کیا گیا کہ ہلکا دھونے سے بھی وضوء متحقق ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

کلی، ناک کی صفائی اور ترتیب کی اہمیت

کسی صحیح روایت میں اس کی صراحت نظر سے نہیں گذری کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کلی اور ناک صاف کئے بغیر اور ترتیبِ قرآنی کے خلاف وضوء کی ہو۔ پس یہ تینوں چیزیں وضوء میں نہایت مؤکد ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تو وضوء میں ترتیب کو فرض کہتے ہیں۔

مضمضہ اور استنشاق دراصل دو مستقل طہارتیں ہیں

منہ اور ناک کی صفائی درحقیقت دو مستقل طہارتیں ہیں۔ اور امورِ فطرت میں شامل ہیں۔ حدیثِ فطرت میں ان کا تذکرہ آیا ہے ان دونوں کو دو مقاصد سے وضوء میں شامل کیا گیا ہے۔

پہلا مقصد: دونوں کی توقیت (وقت مقرر کرنا) پیشِ نظر ہے۔ جس طرح ناخن اور زیرِ ناف کے بال کاٹنے کی مدت مقرر کی گئی ہے اسی طرح ان دونوں سنتوں کو وضوء میں لے کر ان کی توقیت کی گئی ہے کہ رات دن میں جتنی مرتبہ وضوء کرے، دونوں کی صفائی کرے۔

دوسرا مقصد: جسم کے شکنوں کا وضوء غسل میں خیال رکھنا ضروری ہے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ وضوء میں آنکھوں کے گوشوں کا بھی مسح فرماتے تھے۔ بلکہ کانوں کا مسح بھی اسی باب سے ہے۔ اور منہ کے اندر کا حصہ اور ناک کے اندر کا حصہ جسم کے شکنوں کے ذیل میں آتا ہے، اس لئے یہ دو مستقل طہارتیں وضوء میں شامل کرلی گئی ہیں۔

مضمضہ اور استنشاق میں فصل اولی ہے یا وصل؟

منہ اور ناک صاف کرنے کے پانچ طریقے ہیں۔ ان میں سے احناف کے نزدیک اَولی چھ چلو اور فصل ہے۔ یہی امام مالک کی ایک روایت ہے۔ اور یہی زعفرانی کی امام شافعی رحمہ اللہ سے روایت ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول جدید یہ ہے کہ بہتر تین چلو اور وصل ہے۔ یہی امام مالک کی ایک روایت ہے اور یہی امام احمد کا مختار قول ہے۔

احناف کی تین دلیلیں:

پہلی دلیل: صحیح ابن السکن میں روایت ہے کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے وضوء کیا ثلاثًا ثلاثًا،

وافردا المضمضة من الاستنشاق، ثم قالا: هكذا رأينا رسول الله صلى الله عليه وسلم توضأ ۔ یہ روایت حافظ ابن حجر نے التلخیص الحبیر میں ذکر کی ہے، اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا۔

دوسری دلیل: طلحہ بن مُصَرِّف کے دادا عمرو بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت ابوداؤد باب الفرق بین المضمضة والاستنشاق میں ہے۔ فرماتے ہیں: فرأيته يفصل بين المضمضة والاستنشاق ۔ ابوداؤد اور منذری نے اس باب میں اس روایت پر سکوت کیا ہے اور ابن الصلاح نے حدیث کو حَسن کہا ہے۔ اور طبرانی کی روایت کے الفاظ اور زیادہ واضح ہیں۔ اس میں ہے: فَمَضْمَضَ ثلاثًا، واستنشق ثلاثًا، يأخذ لكل واحد ماءً جديدًا.

تیسری دلیل: حضرات ابو ہریرہ، عثمان، علی، انس رضی اللہ عنہم سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ جن میں فمضمض ثلاثًا، واستنشق ثلاثا ہے۔ ثلاثًا کی تکرار فصل پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے۔

شوافع کی دلیل:

جو حضرات وصل کو اولی کہتے ہیں ان کی دلیل حضرت عبد اللہ بن زید کی حدیث ہے جس کو عمرو بن یحییٰ کے تلمیذ خالد بن عبد اللہ طحّان واسطی روایت کرتے ہیں۔ یہ متفق علیہ روایت ہے اور صحیحین میں مختلف طرق سے اس کے جو مختلف الفاظ مروی ہیں ان کو صاحب مشکوٰۃ نے باب سنن الوضوء میں جمع کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک طریق سے یہ الفاظ آئے ہیں۔ فمضمض واستنشق من كفٍّ واحدةٍ، فعل ذلك ثلاثًا.

شاہ صاحب کی رائے:

شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ وصل یعنی کلی اور ناک کی صفائی ایک ہی چلّو سے کرنے کی روایت فصل کی روایت سے اصح یعنی زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ یہ روایت متفق علیہ ہے (مگر اس روایت میں ایک علتِ خفیہ ہے جس کی وجہ سے اس سے استدلال مختلف فیہ ہو گیا ہے اور وہ علت یہ ہے کہ من كفٍّ واحدة کا اضافہ عمرو بن یحییٰ کے تلامذہ میں سے صرف خالد ہی کرتے ہیں۔ ان کے ہم رتبہ، بلکہ ان سے بھی مضبوط راوی امام مالک اور وُہیب رحمہما اللہ اپنی روایات میں یہ اضافہ نہیں کرتے۔ نہ خالد کی روایت کا کوئی شاہد ہے پس یہ قصہ ایسا ہے جیسا صدقۂ فطر کی حدیث میں امام مالک رحمہ اللہ من المسلمين کا اضافہ کرتے ہیں، مگر ان کا کوئی ثقہ متابع نہیں خالد و مالک رحمہما اللہ کی روایات مسلم شریف، کتاب الطہارۃ باب آخر فی صفة الوضوء میں ہیں)

﴿صفة الوضوء﴾

صفة الوضوء على ما ذكره عثمان، وعلي، وعبد الله بن زيد، وغيرهم رضي الله عنهم، عن

النبی صلی الله علیه وسلم، بل تواتر عنه صلی الله علیه وسلم، وتَطابَقَ علیه الأمةُ: أن يَغسل يديه قبل إدخالهما الإناءَ، ويتمضمض، ويستنثر، ويستنشق، فيغسل وجهَه، فذراعيه إلى المرفقين، فيمسح برأسه، فيغسل رجليه إلى الكعبين.

ولا عبرةَ بقوم تَجَارَتْ بهم الأهواءُ، فأنكروا غَسْلَ الرجلين، متمسكين بظاهر الآية، فإنه لافرقَ عندی بين من قال بهذا القول وبين من أنكر غزوةَ بدرٍ، أو أُحُدٍ، مماهو كالشمس فی رابعة النهار.

نعم من قال: بأن الاحتياطَ الجمعُ بين الغَسل والمسح، أو أن أدنی الفرضِ المسحُ، وإن كان الغسل مما يُلام أشدَّ الملامة علی تركه، فذلك أمر يمكن أن يتوقف فيه العلماءُ، حتی تنكشف جليلةُ الحال.

ولم أجد فی رواية صحيحة تصريحًا: بأن النبی صلی الله عليه وسلم توضأ بغير مضمضة، واستنشاق، وترتيب، فهی متأكدةٌ فی الوضوء غاية الوَكادة.

وهما طهارتان مستقلتان من خصال الفطرة، ضُمَّتا مع الوضوء، ليكون ذلك توقيتًا لهما؛ ولأنهما من باب تعهُّدِ المَغَابِنِ؛ والوصل بينهما أصح من الفصل.

ترجمہ: وضوء کا طریقہ: وضوء کا طریقہ اس طور پر جس کو روایت کیا ہے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن زید اور ان کے علاوہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ سے، بلکہ وہ طریقہ آپؐ سے تواتر کے ساتھ مروی ہے۔ اور اس پر امت نے اتفاق کیا ہے: یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو دھوئے ان کو برتن میں ڈالنے سے پہلے۔ اور کلی کرے اور ناک جھاڑے، اور ناک میں پانی ڈالے (ان میں تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے) پھر اپنا چہرہ دھوئے، پھر دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے، پھر اپنے سر کا مسح کرے۔ پھر اپنے دونوں پیر ٹخنوں تک دھوئے۔

اور ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں جن میں خواہشات سرایت کر چکی ہیں، پس انھوں نے پیروں کے دھونے کا انکار کیا۔ آیت کے ظاہر سے تمسک کرتے ہوئے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ کوئی فرق نہیں میرے نزدیک اس کے درمیان جو یہ بات کہتا ہے اور اس کے درمیان جو غزوۂ بدر یا غزوۂ احد کا انکار کرتا ہے۔ ان باتوں میں سے جو کہ وہ آفتاب نصف النہار کی طرح واضح ہیں۔

ہاں جو کہتا ہے کہ: (۱) احتیاط دھونے اور مسح کے درمیان جمع کرنے میں ہے (۲) یا یہ کہ فرض کا ادنی درجہ مسح ہے، اگرچہ دھونا اُن چیزوں میں سے ہے کہ اس کے ترک پر سخت ترین ملامت کی جاتی ہے —— پس یہ باتیں ممکن ہے کہ توقف کریں اس میں علماء تا آنکہ صورتِ حال واضح طور پر منکشف ہو جائے۔

اور نہیں پائی میں نے کسی روایت میں اس بات کی صراحت کہ نبی ﷺ نے وضوء فرمائی ہے: کلی اور ناک میں پانی

ڈالے بغیر اور ترتیب کے خلاف۔ پس وہ (تینوں باتیں) وضوء میں مؤکد ہیں غایت تاکید۔

اور وہ دونوں دو مستقل طہارتیں ہیں۔ خصالِ فطرت میں سے۔ وہ دونوں وضوء کے ساتھ ملائی گئی ہیں تاکہ ہوے وہ ملانا وقت مقرر کرنا، ان دونوں کے لئے، اور اس لئے کہ وہ دونوں شکنوں کا خیال کرنے کے قبیل سے ہیں ——— اور وصل کی روایت زیادہ صحیح ہے فصل کی روایت سے۔

لغات: تَطَابَق القوم: اتفاق کرنا ...... تجاری: ساتھ ساتھ دوڑنا، چلنا ...... مَغْبِن: جسم کی لوٹ، شکن۔

☆ ☆ ☆

باب ——— ۴

آدابِ وضوء

آداب: اَدَب کی جمع ہے۔ اصطلاح میں ادب کے معنی ہیں: **استعمال مایحمد قولاً وفعلاً**: شائستہ بات کہنا اور قابل تعریف کام کرنا۔ اور وضوء میں جو باتیں ادب قرار دی گئی ہیں، وہ چار باتوں کو پیش نظر رکھ کر تجویز کی گئی ہیں۔

پہلی بات: جسم کے ایسے شکنوں کو دھونے کا خصوصی اہتمام کرنا، جن تک خصوصی توجہ کے بغیر پانی نہیں پہنچ سکتا۔ اس بات کے پیش نظر وضوء میں چھ باتیں ادب قرار دی گئی ہیں: (۱) کلی کرنا (۲) پانی ڈال کر ناک کی صفائی کرنا (۳) ہاتھوں کی انگلیوں میں خلال کرنا (۴) پیروں کی انگلیوں میں خلال کرنا (۵) ڈاڑھی میں خلال کرنا (۶) انگوٹھی ہلا کر اس کے نیچے پانی پہنچانا۔

دوسری بات: صفائی کا پورا اہتمام کرنا۔ اس بات کے پیش نظر وضوء میں پانچ چیزیں ادب قرار دی گئی ہیں: (۱) اعضائے مغسولہ کو تین تین بار دھونا (۲) وضوء کامل کرنا یعنی چہرہ کی جو حد ہے اس سے زیادہ دھونا۔ اور ہاتھوں پیروں کو جہاں تک دھونا ضروری ہے اس سے زائد دھونا (۳) اعضاء کو رگڑ کر دھونا (۴) سر کے مسح کے ساتھ کانوں کا بھی مسح کرنا (۵) جب وضوء پرانی ہوجائے تو تازہ وضوء کرنا۔

تیسری بات: اہم کاموں کی انجام دہی میں اسلامی عرف وعادت کا لحاظ رکھنا۔ اس بات کے پیش نظر پہلے دایاں ہاتھ اور دایاں پیر دھونا ادب قرار دیا گیا ہے۔

ضابطہ کلیہ: اور اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جو کام دونوں ہاتھوں سے یا دونوں پیروں سے کئے جاتے ہیں ان میں دائیں کو ترجیح دینی چاہئے، کیونکہ دایاں اقوی اور اولی ہے۔ جیسے وضوء میں دونوں ہاتھ اور دونوں پیر دھوئے جاتے ہیں اور مسجد میں دونوں پیروں سے داخل ہوسکتے ہیں، پس ایسی جگہوں میں دائیں کو تقدیم حاصل ہوگی۔ اور جو کام اچھے برے ہیں، اور وہ صرف ایک ہاتھ سے کئے جاتے ہیں ان میں اچھے کاموں کے لئے دائیں ہاتھ کو اور گندے کاموں

کے لئے بائیں ہاتھ کو مخصوص کرنا چاہئے۔ جیسے دائیں ہاتھ سے کھانا پینا اور بائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا اور ناک جھاڑنا۔

چوتھی بات: نیت صرف دل سے نہیں کرنی چاہئے، بلکہ زبان سے بھی کرنی چاہئے، تاکہ دل اور زبان ہم آہنگ ہوجائیں نیز نیت پر دلالت کرنے والا زبان سے کوئی ذکر بھی کرنا چاہے۔ جیسے احرام میں تلبیہ، نماز میں تکبیر تحریمہ اور وضوء میں تسمیہ۔ غرض زبان سے بھی نیت کرنا اور بسم اللہ والحمد للہ کہہ کر وضوء شروع کرنا ادب ہے۔

﴿ آداب الوضوء ﴾

وآداب الوضوء ترجع إلى معانٍ:

منها: تعهدُ المغابِن التي لايصلُ إليها الماءُ إلا بعناية، كالمضمضة، والاستنشاق، وتخليل أصابع اليدين والرجلين واللحية، وتحريك الخاتَم.

ومنها: إكمال التنظيف، كتثليث الغَسل، وكالإسباغ، وهو إطالة الغُرَّةِ والتَّحْجِيْل، والإنقاءِ، وهو الدلك، ومسح الأذنين مع الرأس، والوضوءِ على الوضوء.

ومنها: موافقة عاداتِهم في الأمور المهِمَّة، كالبداءة بالأيمان، فإن اليمين أقوى وأولى، فكان أحقَّ بالبداءة فيما كان بهما، واختصاصُه بالطيبات والمحاسن، دون أضدادها، فيما كان بإحداهما.

ومنها: ضبط فعل القلب بألفاظ صريحة في المراد، وضَمُّ الذكر اللساني مع القلب.

ترجمہ: وضوء کے آداب چند باتوں کی طرف لوٹتے ہیں:

ان میں سے: جسم کے اُن شکنوں کا خیال رکھنا ہے جن تک پانی نہیں پہنچ سکتا مگر خصوصی اہتمام سے، جیسے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا۔ اور ہاتھوں پیروں کی انگلیوں اور ڈاڑھی کا خلال کرنا اور انگوٹھی کو ہلانا۔

اور ان میں سے: صفائی کی تکمیل کرنا ہے۔ جیسے تین تین بار دھونا۔ اور جیسے وضوء کامل کرنا۔ اور اسباغ چہرے کی چمک کو اور ہاتھوں پیروں کی سفیدی کو دراز کرنا ہے۔ اور جیسے صفائی۔ اور وہ انقاء رگڑنا ہے۔ اور سر کے ساتھ دونوں کانوں کا مسح کرنا اور باوضوء ہوتے ہوئے وضوء کرنا۔

اور ان میں سے: مسلمانوں کے عرف کی ہمنوائی کرنا ہے اہم کاموں میں، جیسے دائیں ہاتھ سے شروع کرنا۔ پس بیشک دایاں قوی تر اور بہتر ہے۔ پس وہ زیادہ حقدار تھا اس سے ابتداء کرنے کا اُن کاموں میں جو دونوں ہاتھوں سے کئے جاتے ہیں۔ اور دائیں کو مختص کرنا ستھری چیزوں اور عمدہ چیزوں کے ساتھ — نہ کہ ان کی اضداد کے ساتھ — اُن کاموں میں جو ایک ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔

اوران میں سے: دل کے عمل (نیت) کومنضبط کرنا ہے صراحت کے ساتھ مراد کوواضح کرنے والے الفاظ کے ذریعہ۔اورذکرلسانی کوملانا ہے ذکرقلبی (نیت) کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

وضوء میں تسمیہ کی بحث

حدیث ــــــ حضرت سعید بن زید،حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لاوُضوءَ لمن لَمْ یَذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ علیہ: جوشخص وضوء پراللہ کا نام نہ لے اس کی وضوء نہیں (مشکوۃ حدیث ۴۰۲)

تشریح: اس حدیث سے بہ صراحت یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وضوء میں تسمیہ ــــ تکبیرِ تحریمہ کی طرح ــــ رکن ہے یا شرط ہے۔حالانکہ جمہور سنّیت یا استحباب کے قائل ہیں۔کیونکہ خبر واحد اگر اعلی درجہ کی صحیح روایت ہو، اور اس کی دلالت بھی محکم ہو یعنی کوئی دوسرا احتمال نہ ہو تو احناف کے نزدیک اس سے وجوب ثابت ہوتا ہے، اور دیگر ائمہ کے نزدیک اس سے فرضیت بھی ثابت ہوسکتی ہے۔اور تسمیہ کی مذکورہ روایت نہ اعلی درجہ کی صحیح روایت ہے، نہ اس کی دلالت محکم ہے۔اس میں احتمال ہے کہ لا نفیِ کمال کا ہو یا اللہ کا نام لینے سے مراد نیت ہو۔پس اس روایت سے زیادہ سے زیادہ سنّیت یا استحباب ثابت ہوسکتا ہے۔یہ شاہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ہے۔اب تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

اس حدیث کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق نہیں۔بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی عدم صحت پر تقریباً تمام اکابر محدثین متفق ہیں، تو یہ بات زیادہ درست ہے۔امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے علم میں اس مسئلہ میں کوئی ایسی حدیث نہیں جس کی سند عمدہ ہو: لا أعلمُ فی ھذا الباب حدیثاً له إسناد جَیِّد۔علامہ مُنذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں متعدد حدیثیں ہیں، جن کی سندیں درست نہیں ہیں: فی ھذا الباب أحادیثُ، لیست أسانیدھا مستقیمةً محدث بزار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں مروی کوئی بھی روایت قوی نہیں: کلُّ ما رُوِی فی ھذا الباب فلیس بقوی۔

اور برتقدیرِ صحت یعنی اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس قولی روایت میں اور آنحضور ﷺ سے مروی وضوء کی تمام فعلی روایات میں اختلاف ہے۔اور ساتویں مبحث کے تیسرے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ سے دین اخذ کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک تلقی ظاہر۔دوم: تلقی دلالۃ۔اب ایک طرف تو یہ قولی حدیث ہے جس سے وضوء میں تسمیہ کا ضروری ہونا صراحۃً ثابت ہوتا ہے۔دوسری طرف تمام فعلی روایات ہیں۔مسلمان برابر نبی ﷺ کی وضوء نقل کرتے رہے ہیں۔اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔مگر کسی روایت میں تسمیہ کا ذکر نہیں، تا آنکہ تدوین حدیث کا دور آیا، تو یہ قولی ارشاد سامنے آیا۔غرض امت نے جو دلالۃً دین اخذ کیا ہے اس سے یہ حدیث مختلف۔پس یہ مسئلہ

ان مسائل میں سے ہے جن میں نبی ﷺ سے تلقی کے دونوں طریقے مختلف ہوگئے ہیں:

البتہ اس حدیث کی ایک ایسی توجیہ کی جاسکتی ہے، جس سے تلقی کے دونوں طریقوں کا اختلاف ختم ہوجائے۔ اور وہ یہ ہے کہ حدیث میں ''اللہ کا نام لینے'' سے دل سے اللہ کو یاد کرنا یعنی وضوء کی نیت کرنا مراد لیا جائے۔ کیونکہ عبادتوں کی صحت کے لئے نیت ضروری ہے اور وضوء بھی ایک عبادت ہے، پس اس کے لئے بھی نیت ضروری ہے۔ اس توجیہ کی صورت میں حدیث کے الفاظ **لاوضوء** اپنے ظاہری معنی پر رہیں گے یعنی **لا** نفیِ صحت کے لئے ہوگا۔ اور یہ حدیث دلالۃً اخذ شریعت کے خلاف نہیں ہوگی۔

مگر اس توجیہ پر سوال پیدا ہوگا کہ جب یہ حدیث نیت پر محمول ہے، تو پھر تسمیہ کا استحباب کیسے ثابت ہوگا؟ شاہ صاحب اس کا جواب دیتے ہیں کہ تسمیہ کا آدابِ وضوء سے ہونا حدیث **کُلُّ أمرٍ ذی بال إلخ** سے اور دیگر بہت سی جگہوں پر قیاس کے ذریعہ ثابت ہوگا۔ مثلاً: کھانا پینا امر ذی بال ہے۔ اور اس کے شروع میں تسمیہ مستحب ہے، تو وضوء تو ایک عبادت ہے، اس کے شروع میں تسمیہ بدرجۂ اولی ادب ہوگا۔

آخر میں ایک مشہور توجیہ کا رد فرماتے ہیں۔ بعض حضرات نے حدیث میں **لا** نفیِ کمال کا لیا ہے یعنی تسمیہ کے بغیر وضوء کامل نہیں ہوتی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دور کی کوڑی ہے۔ اور الفاظ حدیث کے سراسر خلاف ہے۔

فائدہ: جمہور کے نزدیک: وضوء میں تسمیہ سنت یا کم از کم مستحب ہے۔ محض ادب نہیں۔ اور حدیث **کل أمرِ ذی بالٍ إلخ** نہایت ضعیف ہے۔ بلکہ بعض نے تو اس کو موضوع تک کہا ہے۔ اور نیت مراد لینا تو اور بھی دور کی کوڑی ہے۔ **لا** نفیِ کمال کے تو شواہد بھی ہیں۔ اس کی تو کوئی نظیر ہی نہیں۔ اور عبادات کے لئے نیت بیشک ضروری ہے۔ مگر یہ بات عباداتِ مقصودہ ہی کی حد تک متفق علیہ ہے۔ عباداتِ غیر مقصودہ میں اختلاف ہے۔ پس صحیح بات یہ ہے کہ ذکر اللہ سے تسمیہ مراد ہے، نیت مراد نہیں۔ الفاظِ حدیث اس کی قطعاً موافقت نہیں کرتے۔ رہا احادیث تسمیہ کا تمام طرق سے ضعیف ہونا: تو یہ بات صحیح ہے، مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **الظاهر أن مجموع الأحاديث يحدث منها قوة، تدل على أن له أصلا**۔ اور علامہ ابن سید الناس شرح ترمذی میں فرماتے ہیں: **لايخلو هذا الباب من حَسَنٍ صريح، وصحيح غير صريح** پس حدیث مجموعۂ طرق سے حسن لغیرہ اور قابل اخذ واستدلال ہے۔ مگر حدیث چونکہ اعلی درجہ کی صحیح نہیں، نیز دلالت بھی قطعی نہیں، کیونکہ **لا** نفیِ کمال کا بھی ہوسکتا ہے، اور وضوء کی فعلی روایات تسمیہ کے تذکرہ سے خالی ہیں، اس لئے حدیث سے تسمیہ کی سنیت یا استحباب ہی ثابت ہوسکتا ہے۔ وجوب یا فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی۔

[۵] قوله صلى الله عليه وسلم: "لاوضوءَ لمن لم يَذْكُرِ اللهِ"

أقول: هذا الحديثُ لم يُجْمِعْ أهلُ المعرفة بالحديث على تصحيحه، وعلى تقدير صِحَّته: فهو من المواضع التي اختَلَفَ فيهاطريقا التلقي من النبي صلى الله عليه وسلم، فقد استمر

المسلمون يحكون وضوءَ النبي صلى الله عليه وسلم، ويعلِّمون الناس، ولايذكرون التسمية، حتى ظهر زمانُ أهل الحديث.

وهو نَصٌّ على أن التسمية ركن أو شرط، ويمكن أن يُجمع بين الوجهين: بأن المراد هو التذكر بالقلب، فإن العباداتِ لاتُقبل إلا بالنية، وحينئذ يكون صيغةُ:" لاوضوءَ" على ظاهرها.

نعم، التسميةُ أدبٌ كسائر الآداب، لقوله صلى الله عليه وسلم:"كل أمرذى بال لم يُبدأ باسم الله فهو أبتر" وقياساً على مواضعَ كثيرة.

ويحتمل أن يكون المعنى: لايَكْمُلُ الوضوءُ، لكن لا أَرْتَضِي مثلَ هذا التأويل، فإنه من التأويل البعيد الذى يعودُ بالمخالفة على اللفظ.

ترجمہ:(۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:''اس شخص کی وضوء نہیں،جس نے اللہ کا نام نہیں لیا''

میں کہتا ہوں: یہ حدیث: اتفاق نہیں کیا علم حدیث کی معرفت رکھنے والوں نے اس کی صحت پر۔اور بر تقدیر صحت: پس وہ ان جگہوں میں سے ہے جس میں مختلف ہوگئے ہیں نبی ﷺ سے دین اخذ کرنے کے دونوں طریقے۔ پس مسلمان برابر نقل کرتے رہے ہیں نبی ﷺ کی وضوء، اور سکھلاتے رہے ہیں وہ لوگوں کو۔ اور نہیں تذکرہ کرتے وہ بسم اللہ پڑھنے کا۔ یہاں تک کہ محدثین کا زمانہ آیا۔

اور وہ حدیث اس امر میں صریح ہے کہ تسمیہ یا تو رکن ہے یا شرط (یہ بات سب سے پہلے آنی چاہئے تھی) اور ممکن ہے کہ جمع کیا جائے دونوں صورتوں میں (یعنی تلقی کے دونوں طریقوں کا اختلاف ختم کیا جائے) بایں طور کہ مراد دل سے یاد کرنا ہے۔ پس بیشک عبادتیں قبول نہیں کی جاتیں مگر نیت کے ساتھ۔ اور اس وقت حدیث کے الفاظ لاوضوءَ اپنے ظاہری معنی پر رہیں گے۔

ہاں تسمیہ: وضوء کا ایک ادب ہے دیگر آداب کی طرح، اس ارشاد نبوی کی وجہ سے کہ جو بھی مہتم بالشان کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے تو وہ بے برکت ہے، اور قیاس کے ذریعہ بہت سی جگہوں پر۔

اور احتمال ہے کہ اس حدیث کے معنی ہوں: ''وضوء کامل نہیں ہوتی'' لیکن میں خوش نہیں ہوں اس قسم کی تاویل سے۔ پس بیشک وہ ایسی تاویل بعید ہے جو لوٹتی ہے لفظ کی مخالفت کے ساتھ یعنی یہ تاویل سراسر الفاظِ حدیث کے خلاف ہے۔

تصحیح: طریقا التلقی اصل میں اور مخطوطہ پٹنہ و برلین میں طریق التلقی ہے۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے یعنی یہ تثنیہ ہے اور نون: اضافت کی وجہ سے حذف ہوا ہے، مفرد نہیں ہے۔

نیند سے اٹھنے کے بعد برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُن کو دھونے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو اپنا ہاتھ برتن میں نہ ڈبوئے، یہاں تک کہ اس کو تین بار دھوئے پس بیشک وہ نہیں جانتا کہ کہاں رات گذاری ہے اس کے ہاتھ نے" (متفق علیہ، مشکوٰۃ، باب سنن الوضوء، حدیث ۳۹۱)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ میں ہاتھ دھونے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ جب ہاتھ دھوئے دیر ہو جاتی ہے، اور عرصہ تک ہاتھوں سے غفلت رہتی ہے تو احتمال پیدا ہوتا ہے کہ ان پر کوئی ناپاکی لگ گئی ہو، یا وہ میل کچیل سے ملوث ہوگئے ہوں، ایسی صورت میں دھوئے بغیر ہاتھوں کو پانی میں ڈالنا یا تو پانی کو ناپاک کرے گا یا گدلا کرے گا اور خلاف تہذیب وشائستگی ہوگا (پس یہ حکم سونے کے ساتھ خاص نہیں)

اور حدیث میں جو پینے کے برتن میں سانس لینے کی اور پھونکنے کی ممانعت آئی ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ممکن ہے منہ میں سے تھوک وغیرہ نکل کر پانی میں گر جائے، اور مشروب کو گدلا کردے اور یہ حرکت شائستگی کے بھی خلاف ہے۔ (پانی میں سانس لینے کی ممانعت کی حدیث مشکوٰۃ، کتاب الاطعمہ، باب الاشربہ میں ہے، حدیث نمبر ۴۲۷۷)

> [٦] قوله صلى الله عليه وسلم: "فإنه لايدري أين بَاتَتْ يدُه"
> أقول: معناه: أن بُعْدَ العهدِ بالتطهُّر، والغفلة عنهما مليًا مَظَنَّةٌ لوصول النجاسة والأوساخِ إليهما، ممايكونُ إدخالُ الماء معه تنجيسًا له، أو تكديرًا وشناعةً؛ وهو علة النهي عن النفخ في الشراب.

ترجمہ: (٦) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "پس وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے کہاں رات گذاری ہے؟!"
میں کہتا ہوں: اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکی حاصل کئے ہوئے عرصہ بیت جانا، اور دیر تک دونوں ہاتھوں سے بے خبری رہنا احتمالی جگہ ہے نجاست اور میل کچیل کے دونوں ہاتھوں تک پہنچنے کی ان چیزوں میں سے جو کہ ہوتا ہے پانی میں ہاتھ ڈالنا اس صورتِ حال کے ساتھ پانی کو ناپاک کرنا یا گدلا کرتا اور برائی والا کام ـــــ اور وہی مشروب میں پھونک مارنے کی ممانعت کی وجہ ہے۔

ترکیب: مظنة پہلی خبر ہے أن کی، اور مما إلخ دوسری خبر ہے..... اور إدخال الماء میں مجاز بالحذف ہے أي إدخال في الماء۔

  ☆

بانسے پر شیطان کی شب باشی کا مطلب

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو، پس وضوء کرے، تو چاہئے کہ تین بار ناک جھاڑے۔ پس بیشک شیطان رات گذارتا ہے اس کی ناک کے بانسے پر'' (مشکوٰۃ ۳۹۴)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ میں حکم کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رات میں جب تہجد یا فجر کی نماز کے لئے اٹھے گا، اور وضوء کرے گا اور اس وضوء میں ناک اچھی طرح صاف نہیں کرے گا تو شیطان کو وسوسہ اندازی کا خوب موقع ملے گا، اور وہ تہجد کی نماز میں یا فجر کی نماز میں جو اذکار وتلاوت کرے گا اس میں کماحقہ غور نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ ناک کی جڑ میں رینٹ اور غلیظ مواد کا جمع ہونا کند ذہنی اور سوچ کی خرابی کا ایک بڑا سبب ہے۔ جو لوگ بیداری میں بھی ہر وقت ناک میں غلیظ مواد بھرے رہتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ بلید اور سست خاطر ہو جاتے ہیں اور رات میں سونے کی حالت میں تو ہر شخص اس صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے۔ غلیظ مادہ ناک کے بانسہ میں جمع ہو جاتا ہے، بلکہ اکثر سوکھ بھی جاتا ہے۔ اس لئے بیدار ہونے کے بعد جب وضوء کرے تو تین بار ناک میں پانی دیکر اس مواد کو خوب جھاڑ کر صاف کرے یہی ناک کے بانسہ پر شیطان کی شب باشی کا مطلب ہے۔ یعنی حدیث میں بیان تمثیل ہے، بیان واقعہ نہیں۔ واللہ اعلم

> [۷] قوله صلى الله عليه وسلم: " فإن الشيطان يَبِيْتُ على خَيشومه"
> أقول: معناه: أن اجتماع المُخاطِ والموادِّ الغليظة فى الخيشوم سببٌ لتبلُّدِ الذهن وفساد الفكر، فيكون أمكنَ لتأثير الشيطان بالوسوسة، وصَدِّه عن تدبر الأذكار.

ترجمہ: (۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پس بیشک شیطان رات گذارتا ہے اس کی ناک کی جڑ میں'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب یہ ہے کہ رینٹ اور غلیظ مواد کا ناک کی جڑ میں جمع ہونا ایک بڑا سبب ہے ذہن کے کُند ہونے کا اور سوچ کے خراب ہونے کا۔ پس ہوتی ہے یہ بات زیادہ قدرت دینے والی شیطان کی اثر اندازی کو وسوسہ اندازی کے ذریعہ، اور اس کو روکنے کے لئے اذکار میں غور وفکر کرنے سے۔

☆ ☆ ☆

وضوء کے بعد کی دعا سے جنت کے سب دروازے کھل جانے کی وجہ

حدیث ——— حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو بھی شخص وضوء کرے، پس

آخری درجہ تک پانی پہنچائے، یا فرمایا: پس وضوء کامل کرے، پھر کہے: أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: اشهد ان لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له، وأشهد أن محمدًا عبده ورسوله اور ترمذی کی روایت میں یہ اضافہ ہے اللّٰهم اجعلنى من التوابين واجعلنى من المتطهرين تو اس کے لئے بہشت کے آٹھوں دروازے کھولدیئے جائیں گے، وہ جنت میں جس دروازے سے چاہے: جائے۔
(مشکوۃ، کتاب الطہارۃ، حدیث ۲۸۹)

تشریح: طہارت کی روح اس وقت بدست آتی ہے جب دو چیزیں پائی جائیں: ایک: نفس پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجائے دوسری: پوری کوشش کرکے خوب اچھی طرح پاکی حاصل کرے۔ چنانچہ وضوء میں اسباغ کا حکم دیا، دوسری چیز کو حاصل کرنے کے لئے۔ اور پہلی چیز کو حاصل کرنے کے لئے یہ دعا تلقین فرمائی، تاکہ بندے کی اللہ کی طرف توجہ تام ہوجائے۔ اور دخولِ جنت اُس طہارت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جو نفس کی جڑ میں پیوست ہوچکی ہے۔ چنانچہ حدیث میں طہارت بالغہ اور توجہ الی اللہ کے مجموعہ پر اس ثمرہ کو مرتب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کے لئے جنت کے سبھی دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ جس سے چاہے جنت میں جائے۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " مامنكم من أحد يتوضأ، فَيُبْلِغُ الوضوءَ، ثم يقول: أشهد إلخ وفى رواية اللّٰهم اجعلنى من التوابين واجعلنى من المتطهرين، إلا فُتحت له أبواب الجنة الثمانيةُ، يدخل من أيها شاء"

أقول: روح الطهارة لايتم إلا بتوجه النفس إلى عالم الغيب، واستفراغ الْجُهْدِ فى طلبها، فضبط لذلك ذكرًا، ورتَّب عليه ماهو فائدة الطهارة الداخلةِ فى جَذْرِ النفس.

ترجمہ: (۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہیں ہے تم میں سے کوئی جو وضوء کرے، پس آخری درجہ تک پہنچائے وہ وضوء کو (یا وضوء کے پانی کو) پھر کہے أشهد إلخ اور ایک روایت میں (یہ اضافہ) ہے: اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والے بندوں میں شامل فرما، اور مجھے خوب پاک ہونے والے بندوں میں شامل فرما، مگر کھول دیئے جائیں گے اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے، داخل ہو وہ ان میں سے جونسے سے چاہے۔

میں کہتا ہوں: طہارت کی روح تام نہیں ہوتی مگر نفس کے توجہ کرنے سے عالم غیب کی طرف (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف) اور خوب کوشش ریڑھنے سے طہارت کی طلب میں (یعنی خوب اچھی طرح وضوء کرنے سے) پس منضبط کیا آپ ﷺ نے اس مقصد (اول کو حاصل کرنے) کے لئے ایک ذکر (یعنی دعا) اور مرتب کیا اس پر اس کو جو کہ وہ اُس طہارت کا فائدہ ہے (یعنی دخول جنت کو) جو نفس کی جڑ میں داخل ہونے والی ہے (یعنی جو طہارت نفس میں رچ بس گئی

ہے،فطرت ثانیہ بن گئی ہے)

تصحیح: إلا فتحت میں إلاحدیث کے مصادر سے بڑھایا ہے۔مطبوعہ اور مخطوطوں میں نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

خشک رہنے والی ایڑیوں کے لئے عذاب الیم کی وعید

حدیث ــــ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف لوٹ رہے تھے۔قافلہ راستہ میں ایک پانی پر پہنچا۔ایک جماعت نے عصر کے وقت (تنگیٔ وقت کی وجہ سے) جلدی جلدی وضوء کی۔ان کی ایڑیوں کو پانی نہیں پہنچا۔وہ چمک رہی تھیں۔جب آنحضرت ﷺ پہنچے (اور صورتِ حال دیکھی) تو فرمایا: "ہلاکت ہے ایڑیوں کے لئے عذابِ دوزخ سے!" (رواہ مسلم،مشکوۃ، باب سنن الوضوء، حدیث ۲۹۸) اور ایک روایت میں ہے:" ہلاکت ہے ایڑیوں کے لئے اور پیروں کے تلووں کے لئے عذاب نار سے!" (مسند احمد ۴: ۱۹۱)

تشریح: ایڑیوں اور تلووں سے مراد ایڑیوں اور تلووں والے ہیں یعنی جن کی ایڑیاں اور پاؤں کے تلوے خشک رہ گئے ہیں ان کے لئے ہلاکِ عظیم ہے۔یہاں دو باتیں سمجھنی ہیں:ایک عذابِ الیم کی وعید کیوں سنائی؟ دوسری:ایڑیوں اور تلووں کو کیوں سنائی؟

پہلی بات: جب اللہ تعالیٰ نے اعضائے ثلاثہ کا دھونا واجب کیا،تو ضروری ہوا کہ ان کو پورے طور پر دھویا جائے۔پس جب کچھ دھویا اور کچھ خشک رہ گیا تو مکمل عضو کا دھونا متحقق نہیں ہوا،اور جب وضوء نہیں ہوئی تو نماز کہاں ہوئی؟ اس لئے ہلاکِ عظیم کی وعید سنائی۔نیز وعید سنانے کا یہ بھی مقصد ہے کہ لوگ احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں لاپروائی نہ برتیں۔ہر حکم کو کما حقہ بجالائیں۔

دوسری بات: ایڑیوں اور تلووں کو بالتخصیص وعید اس لئے سنائی گئی ہے کہ وہی اصالۃً ناپاک رہ گئے ہیں۔اور ناپاکی کا توبہ تو جمع ہونا،اور اس کو دور نہ کرنے پر اصرار کرنا موجب نار خصلت ہے۔اور طہارت موجب دخول جنت اور باعث کفارۂ سیئات خصلت ہے۔پس جب وضوء کرنے والے نے ایڑیوں اور تلووں کو پاک نہیں کیا۔اور ان اعضاء میں حکم الٰہی کی مخالفت کی،تو اولاً یہی اعضاء معذب ہوں گے،پھر ان کی وجہ سے نفس رنجیدہ ہوگا۔جیسے پیر میں کانٹا چبھتا ہے،تو اولاً تکلیف اس حصۂ بدن کو پہنچتی ہے جہاں کانٹا چبھا ہے۔پھر آدمی کا سارا وجود تکلیف محسوس کرتا ہے۔اسی طرح نفس میں بگاڑ ان اعضاء کے خشک رہ جانے کی وجہ سے آیا ہے۔اس لئے اولاً یہی اعضاء معذب ہوں گے۔پھر ان کی وجہ سے آدمی کا سارا وجود رنجیدہ ہوگا۔

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم لمن لم يستوعب: " ويل للأعقاب من النار"

أقول: السرُّ فيه: ان الله تعالى لما أوجَبَ غَسْلَ هذه الأعضاء، اقتضىٰ ذلك: أن يُحقِّق معناه، فإذا غسل بعضَ العضو، ولم يستوعب كلَّه، لايصحُّ أن يقال: غسل العضوَ، وأيضًا فيه سدُّ باب التهاون.

وإنما تخللت النار في الأعقاب: لأن تراكُمَ الحدثِ، والإصرارَ على عدم إزالته، خصلةٌ موجِبةٌ للنار، والطهارةَ موجِبةٌ للنجاة منها، وتكفيرِ الخطايا، فإذا لم يُحقِّقْ معنى الطهارة في عضو، وخالف حكمَ الله فيه، كان ذلك سببَ أن يظهر تألُّمُ النفس بالخصلة الموجبة لفساد النفس من قِبَلِ هذا العضو، والله أعلم.

ترجمہ: (۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد اس شخص سے جس نے پورا پیر نہیں دھویا تھا: '' وائے ایڑیوں کے لئے عذاب جہنم سے!''

میں کہتا ہوں: راز اس (وعید) میں یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اِن اعضاء (ثلاثہ) کا دھونا واجب کیا، تو اس (ایجاب) نے چاہا کہ پورے طور پر ثابت کرے آدمی اُس (دھونے) کے معنی کو۔ پس جب اس نے عضو کا کچھ حصہ دھویا، اور اس کو بالاستیعاب نہیں دھویا تو نہیں صحیح ہے کہ کہا جائے: ''اس نے عضو کو دھویا'' اور نیز اس میں لاپروائی کا دروازہ بند کرنا ہے۔

اور آگ نے ایڑیوں ہی میں نفوذ اس لئے کیا کہ ناپاکی کا ڈھیر لگنا، اور اس کو زائل نہ کرنے پر اصرار کرنا آگ کو واجب کرنے والی بات ہے۔ اور پاکی آگ سے نجات کو واجب کرنے والی اور گناہوں کا کفارہ بننے والی بات ہے۔ پس جب اس نے پورے طور پر ثابت نہیں کیا طہارت کے معنی کو کسی عضو میں، اور اللہ کے حکم کی اس عضو میں مخالفت کی، تو ہوگی یہ بات سبب نفس کی رنجیدگی ظاہر ہونے کا، اُس خصلت کے ذریعہ جو نفس کے بگاڑ کو واجب کرنے والی ہے، اُس عضو کی جانب سے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

ترکیب: من قِبَلِ متعلق ہے أن یظہر سے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۵

نواقضِ وضوء کا بیان

نماز کے لئے پاکی کیوں شرط ہے؟

حدیث ـــــ متفق علیہ روایت ہے کہ اس شخص کی نماز قبول نہیں ہوتی جس کو حدث پیش آیا ہے، یہاں تک کہ وضوء

کرے (مشکوۃ حدیث ۳۰۰)

حدیث ـــــ مسلم شریف کی روایت ہے کہ کوئی نماز پاکی کے بغیر قبول نہیں کی جاتی (مشکوۃ حدیث ۳۰۱)

حدیث ـــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نماز کی چابی پاکی ہے (مشکوۃ حدیث ۳۱۲)

تشریح: ان سب روایات سے بالتصریح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکی نماز کے لئے شرط ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: پاکی درحقیقت ایک مستقل عبادت ہے۔ اس کو نماز کے ساتھ منضم کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا فائدہ دوسری پر موقوف ہے یعنی نماز کے بغیر وضوء کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اور وضوء کے بغیر نماز ایک بے معنی عبادت ہے۔ اس لئے نماز کے لئے وضوء کو شرط ٹھہرایا گیا ہے۔

دوسری وجہ: نماز شعائر اللہ میں سے ہے جیسے قرآن کریم۔ اور شعائر اللہ کا احترام ضروری ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (سورۃ الحج آیت ۳۲ تفصیل کے لئے پانچویں مبحث کا ساتواں باب دیکھیں) اور باوضوء نماز پڑھنے میں نماز کا احترام ہے، جیسے باوضوء قرآن پاک کو ہاتھ لگانے میں قرآن کا احترام ہے۔ اس لئے نماز کے لئے وضوء شرط کی گئی ہے۔

﴿موجبات الوضوء﴾

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "لاتُقبل صلاةُ من أحدث حتى يتوضأ" وقوله صلى الله عليه وسلم: "لاتُقبل صلاةٌ بغير طُهور" وقوله صلى الله عليه وسلم: "مفتاح الصلاة الطهور"

أقول: كل ذلك تصريح باشتراط الطهارة، والطهارة طاعة مستقلة وُقِّتَتْ بالصلاة، لتوقُّف فائدةِ كلٍّ واحدةٍ منهما على الأخرى، وفيه تعظيم أمرِ الصلاة التي هي من شعائر الله.

ترجمہ: وضوء کو واجب کرنے والی چیزوں کا بیان: آنحضرت ﷺ کے تین ارشادات: (جن کا ترجمہ گذر چکا)

میں کہتا ہوں: ان سب روایات میں صراحت ہے کہ پاکی نماز کے لئے شرط ہے: (۱) اور پاکی ایک مستقل عبادت ہے، وہ نماز کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کے فائدے کے موقوف ہونے کی وجہ سے دوسری پر (۲) اور اس میں اُس نماز کے معاملہ کی تعظیم ہے جو کہ شعائر اللہ میں سے ہے۔

نوٹ: پاکی ایک مستقل عبادت ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عبادتِ مقصودہ ہے، بلکہ اس کا مطلب ایسا ہی ہے جیسا کہ پہلے فرمایا ہے کہ مضمضہ اور استنشاق دو مستقل فطری سنتیں ہیں، جن کو وضوء میں شامل کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

نواقضِ وضوء تین طرح کے ہیں

(متفق علیہ، مختلف فیہ اور منسوخ)

نواقضِ وضوء کی پہلی قسم: متفق علیہ نواقض:

شریعتِ اسلامیہ میں نواقض وضوء تین طرح کے ہیں:

اول: وہ نواقض ہیں، جن کے نواقض ہونے پر تمام صحابہ متفق ہیں۔ اور روایات اور مسلمانوں کے تعامل میں بھی ہم آہنگی ہے۔ اور وہ پیشاب، پاخانہ، ہوا، مذی، گہری نیند اور وہ چیزیں ہیں جو ان کے معنی میں ہیں۔ جیسے ودی، پیشاب کے حکم میں ہے اور جیسے اغماء اور جنون۔ یہ سب چیزیں دو راہوں سے نکلنے والی یا اس کا احتمال پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔ اور سبیلین سے نکلنے والی چیز کا ناقض طہارت ہونا متفق علیہ ہے۔ اب ذیل میں اس قسم سے تعلق رکھنے والی روایات کے رموز بیان کرتے ہیں۔ پھر قسم دوم وسوم کو بیان کریں گے۔

نیند ناقضِ وضوء کیوں ہے؟

حدیث ــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرین کی بندش دو آنکھیں ہیں، پس جو شخص سو جائے وہ وضوء کرے (مشکوٰۃ حدیث ۳۱۶)

حدیث ــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ ارشاد نبوی نقل کرتے ہیں: ''وضوء اس پر ہے جو پہلو کے بل لیٹ کر سوئے۔ کیونکہ جب آدمی پہلو کے بل لیٹ کر سوتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۱۸)

تشریح: نیند دو وجہ سے ناقض وضوء ہے:

پہلی وجہ: گہری نیند سے جسم کے تمام جوڑوں کی طرح محل براز بھی ڈھیلا پڑ جاتا ہے، اور خروج ریح کا احتمال پیدا ہوتا ہے یعنی اصل ناقض تو خروج ریح ہے، مگر گہری نیند کی حالت میں چونکہ اس کا احساس نہیں ہوسکتا، اس لئے شریعت نے سبب ظاہری (گہری نیند) کو سببِ حقیقی (خروج ریح) کے قائم مقام کر دیا ہے۔

دوسری وجہ: نیند نفس کے اندر بلادت پیدا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ حد سے زیادہ سوتے ہیں وہ کند خاطر ہو جاتے ہیں۔ پس نیند بھی حدث والا کام کرتی ہے۔ حدث: طبیعت میں انقباض واضمحلال پیدا کرتا ہے اور نیند بھی سستی اور کاہلی پیدا کرتی ہے۔ پس طبیعت میں نشاط اور انبساط وسرور پیدا کرنے کے لئے نیند کے بعد وضوء ضروری ہے۔

مذی نکلنے سے وضوء کیوں واجب ہوتی ہے؟

حدیث ــــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بہت زیادہ مذی آتی تھی۔ اور چونکہ میرے نکاح میں

آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی تھیں، اس لئے مسئلہ دریافت کرنے میں مجھے شرم محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے حضرت مقداد سے مسئلہ پوچھوایا، تو آپ نے فرمایا: ''وہ اپنے عضو کو دھولے، اور وضوء کرلے'' یعنی مذی نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا، صرف وضوء واجب ہوتی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۲)

تشریح: مذی نکلنے سے وضوء اس لئے واجب ہوتی ہے کہ جو مذی بیوی کے ساتھ ملاعبت (ہنسی مذاق) کی وجہ سے خارج ہوتی ہے، وہ مجامعت کا فروتر درجہ ہے یعنی اس سے بھی گونہ حظِ نفس حاصل ہوتا ہے، پس اس کے لازمی تقاضے کے طور پر ادنی درجہ کی طہارت (وضوء) واجب ہوگی۔

جب حدث کا یقین ہوجائے تبھی وضوء ٹوٹتی ہے

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے پیٹ میں کوئی چیز پائے (یعنی پیٹ میں ریاح کی وجہ سے قراقر ہو) پھر اس پر یہ بات مشتبہ ہوجائے کہ کوئی چیز نکلی یا نہیں؟ تو وہ (وضوء کے لئے) مسجد سے ہرگز نہ نکلے یہاں تک کہ آواز سنے یا بدبو پائے'' یعنی خروج ریح کا یقین ہوجائے، آواز سننا یا بدبو محسوس کرنا ضروری نہیں (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۶)

تشریح: نقضِ وضوء کے لئے حدث (خروج ریح) کا یقین دو وجہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ: جب نقضِ وضوء کا مدار سبیلین سے کسی چیز کے نکلنے پر ہے تو ضروری ہے کہ دو چیزوں میں امتیاز کیا جائے: ایک وہ جو واقعۃً سبیلین سے نکلی ہے، اور دوسری وہ جو یقیناً سبیلین سے نہیں نکلی، صرف اس سے مشابہ ہے۔ اس حدیث میں امتیاز کرنے کی ہدایت ہے کہ جب خروج ریاح کا یقین ہوجائے تب آدمی اپنے کو بے وضوء سمجھے۔ کیونکہ ناقض وہی ہے، اس سے مشتبہ چیز ناقض نہیں ہے۔

دوسری وجہ: حدیث کا مقصود تعمق وتشدد کی نفی کرنا ہے، کیونکہ اس قسم کے شک کا اعتبار کرکے احتیاطاً وضوء کرنے کا حکم دیا جائے گا تو معلوم نہیں شکی مزاج آدمی اور کتنی احتیاطیں شروع کردے گا!

وموجباتُ الوضوء: في شريعتنا على ثلاث درجاتٍ:

إحداها: ما اجتمع عليه جمهور الصحابة، وتَطابَقَ فيه الروايةُ والعملُ الشائعُ، وهو البول، والغائط، والريح، والمَذْيُ، والنومُ الثقيل، ومافي معناها.

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " وِكَاءُ السَّهِ العينانِ" وقوله صلى الله عليه وسلم: " فإنه إذا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مفاصلُه"

أقول: معناه: أن النوم الثقيل مَظِنَّةٌ لاسْتِرْخَاءِ الأعضاء وخروجِ الحدث، وأُرىٰ أن مع ذلك

له سبب آخرُ: هو أن النوم يُبَلِّدُ النفسَ، ويفعلُ فعلَ الأحداثِ.

[٣] قوله صلى الله عليه وسلم في المَذْيِ: "يغسل ذكَرَه، ويتوضأ"

أقول: لاشك أن الـمَذْيَ الحاصلَ من الملاعبة قضاءُ شهوة دون شهوة الجماع، فكان من حقه: أن يستوجِبَ طهارةً دون الطهارة الكبرى.

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم في الشاكِّ: "لايَخْرُجَنَّ من المسجد حتى يسمعَ صوتًا أو يجدَ ريحًا"

أقول: معناه: حتى يستيقن؛ لَمَّا أُدير الحكمُ على الخارج من السبيلين، كان ذلك مقتضيا أن يُمَيَّزَ بين ما هو هو في الحقيقة، وبين ماهو مشتبِهٌ به، وليس هو؛ والمقصودُ نفي التعمُّق.

ترجمہ: اور وضوء واجب کرنے والی چیزیں: ہماری شریعت میں تین درجوں پر ہیں:

ان کا پہلا درجہ: وہ موجبات ہیں جن پر جمہور صحابہ متفق ہیں۔ اور ان میں روایت اور عام عمل ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ اور وہ پیشاب، پاخانہ، ہوا، مذی، گہری نیند اور وہ چیزیں ہیں جو ان کے معنی میں ہیں۔

(۲) آنحضرت ﷺ کے دو ارشاد۔ میں کہتا ہوں: (۱) اس کے معنی یہ ہیں کہ نیند اعضاء کے استرخاء اور حدث کے نکلنے کی احتمالی جگہ ہے (۲) اور میں گمان کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ اس (وضوء کے ٹوٹنے) کے لئے ایک دوسرا سبب بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نیند نفس کو بلید (کمزور رائے والا) کر دیتی ہے، اور وہ (نیند) حدثوں جیسا کام کرتی ہے۔

(۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''دھولیوے وہ اپنے عضو کو، اور وضوء کر لیوے'' میں کہتا ہوں: اس میں کوئی شک نہیں کہ جو مذی ملاعبت کی وجہ سے نکلتی ہے وہ بھی ہم بستری کی شہوت سے فروتر شہوت کو پورا کرنا ہے۔ پس اس کے حق میں سے ہے کہ وہ واجب ولازم جانے طہارت کبری سے فروتر طہارت کو۔

(۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''وہ مسجد سے ہرگز نہ نکلے، یہاں تک کہ سنے آواز یا پائے بدبو'' میں کہتا ہوں: اس کے معنی: یہاں تک کہ یقین کر لے وہ ـــــ جب (نقض وضوء کا) حکم دائر کیا گیا ہے دو راہوں سے نکلنے والی چیز پر (یعنی اصل علت یہی ہے) تو تھا وہ چاہنے والا اس بات کو کہ امتیاز کیا جائے اس چیز کے درمیان جو کہ وہ وہ ہے حقیقت میں، اور اس چیز کے درمیان جو کہ وہ مشابہ ہے اس سے، اور وہ نہیں ہے۔ اور مقصود تعمق کی نفی کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

نواقضِ وضوء کی دوسری قسم ـــــ مختلف فیہ نواقض

دوسرے درجہ کے نواقض وہ ہیں جن کے ناقضِ طہارت ہونے میں فقہائے صحابہ وتابعین میں اختلاف رہا ہے۔ اور ان کے بارے میں احادیث مرفوعہ میں بھی تعارض ہے۔ ایسے نواقض پانچ ہیں: ۱- پیشاب کے عضو کو چھونا ۲- عورت کو

ہاتھ لگانا ۳-خون اور پیپ کا نکل کر بہ جانا ۴-منہ بھر کر قئے کرنا ۵-نماز میں کھل کھلا کر ہنسنا —— تفصیل درج ذیل ہے۔

۱-پیشاب کے عضو کو چھونا:

حدیث —— حضرت بُسرہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے پیشاب کے عضو کو چھوئے، تو چاہئے کہ وضو کرے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۱۹) صحابہ میں سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، اور مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے حضرت سالم اور حضرت عروہ رحمہما اللہ اور کچھ دیگر حضرات اس کے قائل تھے۔

اور حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما، اور کوفہ کے تمام فقہاء اس کے قائل نہیں تھے۔ ان کی دلیل درج ذیل حدیث ہے:

حدیث —— حضرت طَلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص وضوء کرنے کے بعد اپنے پیشاب کے عضو کو چھوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اس کے جسم کا ایک ٹکڑا ہی ہے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۰) یعنی جس طرح جسم کے کسی اور حصہ کو چھونے سے وضوء نہیں ٹوٹتی اس عضو کو چھونے سے بھی نہیں ٹوٹتی۔

اور ان دو روایتوں میں سے کسی ایک روایت کے منسوخ ہونے کی کوئی قابل اطمینان دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ ائمہ اربعہ میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے: امام اعظم رحمہ اللہ وضوء نہ ٹوٹنے کے قائل ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نقضِ وضوء کے قائل ہیں۔

۲-عورت کو ہاتھ لگانا:

حضرت عمر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور حضرت ابراہیم نَخَعی رحمہ اللہ اس بات کے قائل تھے کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے وضوء ٹوٹ جاتی ہے۔ ان حضرات کی دلیل آیت پاک: ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ تھی۔ کوئی حدیث ان کے قول کی تائید میں موجود نہیں۔ بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی درج ذیل روایت اس کے خلاف ہے۔

حدیث —— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ اپنی کسی اہلیہ کو چومتے تھے، پھر نماز پڑھتے تھے اور وضوء نہیں کرتے تھے (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۳) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کو ہاتھ لگانا ہی نہیں، چومنا بھی ناقض وضوء نہیں۔

اعتراض: مگر اس حدیث پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس کی اسناد منقطع ہے، پس اس سے استدلال درست نہیں۔ اس حدیث کی دو سندیں ہیں: (۱) حبیب بن ابی ثابت روایت کرتے ہیں حضرت عروہ سے، وہ حضرت عائشہ سے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ حبیب کا عروہ سے لقاء اور سماع نہیں (۲) ابراہیم تیمی روایت کرتے ہیں حضرت عائشہ سے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ ابراہیم تیمی کا بھی حضرت عائشہ سے لقاء اور سماع نہیں (یہ اعتراض مشکوٰۃ میں مذکور ہے)

جواب: شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس طرح کی علت (خرابی) اسی صورت میں معتبر ہونی چاہئے جبکہ احادیث میں ترجیح کا معاملہ درپیش ہو۔ لیکن اگر کسی مسئلہ میں بس ایسی ہی روایت ہو، اور اس کے معارض کوئی دوسری روایت نہ ہو، تو اس قسم کی معمولی خرابی کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ یعنی یہ حدیث باوجود اپنی علت کے قابل استدلال ہے۔

فائدہ: یہ جواب انقطاع تسلیم کرنے کی صورت میں ہے۔ اور اس تقدیر پر ہے کہ مسئلہ میں یہی ایک حدیث دلیل ہے۔ حالانکہ محدثین کے نزدیک چار حدیثوں میں حبیب کا حضرت عروہ سے سَماع ثابت ہے۔ تفصیل معارف السنن (۱:۳۰۳) میں ہے۔ نیز مسئلہ دیگر روایات سے بھی ثابت ہے۔ متفق علیہ روایت ہے کہ تہجد کی نماز میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قدم آنحضرت ﷺ کی سجدہ کی جگہ میں آجاتے تھے۔ آپؐ ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے۔ وہ پیر ہٹا لیتی تھیں (مشکوۃ باب السترۃ، حدیث ۷۸۶) اور یہ محض احتمال ہے کہ کپڑے کے اوپر سے ہاتھ لگاتے ہوں گے۔ کیونکہ گھر میں اندھیرا ہوتا تھا، پس اس کا اہتمام کیوں کر ممکن ہے؟

حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کے استدلال کا جواب:

حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما چونکہ جنابت میں تیمّم کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے وہ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ کو نواقضِ وضوء کا بیان قرار دیتے تھے۔ اور عورت کے لَمس (ہاتھ لگانے) کو ناقض وضوء کہتے تھے۔ حالانکہ جنابت میں تیمم کا ثبوت حضرت عمران، حضرت عمار اور حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کی روایات سے بہم پہنچا ہوا ہے۔ اور بعد میں جواز پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے۔ اس لئے ان دونوں حضرات کا استدلال محل نظر ہو گیا۔

فائدہ: ان حضرات کا استدلال مجاز پر مبنی تھا۔ وہ باب مفاعلہ کو مجرد کے معنی میں لیتے تھے یعنی مُلامسہ کو بمعنی لَمس لیتے تھے۔ حالانکہ حقیقت مجاز سے اولیٰ ہے۔ اور باب مفاعلہ کا خاصہ عمل میں اشتراک ہے یعنی ایک عمل دو شخص مل کر کرتے ہیں۔ جیسے مقاتلہ، مضاربہ، مجادلہ، مناظرہ وغیرہ۔ پس آیت کے معنی ہیں: مرد و زن ایک ساتھ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں یعنی پکڑیں اور یہ صورت جماع میں بوقتِ فراغ پیش آتی ہے پس آیت کنایہ ہے مقاربت سے یعنی بیوی سے صحبت کی ہو تو غسل واجب ہوگا۔ پھر اگر پانی میسر نہ ہو تو تیمم کا حکم ہے۔

حضرت ابن عمر کے مسلک کی حقیقت:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جنابت میں تیمم کے قائل تھے۔ وہ مذکورہ آیت کو نواقض وضوء کا بیان نہیں قرار دیتے تھے۔ وہ صرف احتیاطاً عورت کو ہاتھ لگانے کی صورت میں وضوء کے قائل تھے یعنی خروج عن الخلاف کے لئے وہ وضوء کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم نخعی کا مسلک اور امام اعظم کا اس سے گریز:

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پیروی میں یہ بات کہتے تھے۔ پس جو اُن کی دلیل تھی وہی ان کی بھی ہے۔ مگر جب امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ جس دلیل سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ استدلال فرماتے ہیں اس کی تقریب تام نہیں، تو آپ نے حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا قول ترک کر دیا۔ حالانکہ آپ سختی سے نخعی رحمہ اللہ کی پیروی کرتے تھے۔

خلاصۂ کلام: یہ ان دونوں مسئلوں میں دور اول کی داستان تھی۔ پھر جب امت میں دو مستقل مکاتب فکر وجود میں آئے تو عراقی مکتب فکر کی پیروی کرنے والوں نے یعنی احناف نے دونوں مسئلوں میں وضوء نہ ٹوٹنے کا قول اختیار کیا۔ اور حجازی مکتب فکر کی پیروی کرنے والوں نے یعنی ائمہ ثلاثہ نے نقض وضوء کا قول اختیار کیا۔ پھر ان میں یہ اختلاف ہوا کہ مطلقاً وضوء ٹوٹتی ہے یا خواہش پیدا ہونے کی صورت میں ٹوٹتی ہے؟ تفصیل ان کی کتابوں میں ہے۔

۳-۵ بہنے والا خون، کافی مقدار میں قئے اور نماز میں کھل کھلا کر ہنسنا:

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ دم سائل اور قئے کثیر کو ناقض وضوء مانتے تھے۔ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نماز میں قہقہہ لگانے کو ناقض وضوء مانتے تھے۔ دیگر تابعین ناقض وضوء نہیں مانتے تھے۔ ان تینوں چیزوں کے ناقض وضوء ہونے کی روایات بھی موجود ہیں، مگر ان کی صحت پر محدثین کا اتفاق نہیں۔ اور اصح بات ان تینوں نواقض کے بارے میں یہ ہے کہ جو شخص احتیاط برتے، وہ اپنے دین اور آبرو کی حفاظت کرے گا۔ اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ بھی قابل مواخذہ نہیں۔

فائدہ: شاہ صاحب نے یہ بات مجتہدین کے تعلق سے فرمائی ہے کہ احناف نے ان کو نواقض قرار دیا ہے تو انھوں نے احتیاط والا پہلو اختیار کیا ہے۔ اور دوسرے ائمہ نے جو ان چیزوں کو ناقض وضوء نہیں مانا تو انھوں نے بھی ٹھیک کیا ہے۔ کیونکہ مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے قطعی اور دوٹوک دلائل نہیں ہیں۔ رہا مقلدین کا معاملہ تو ان کے لئے التزامات عبد کی رُو سے اس مذہب پر عمل کرنا ضروری ہے جو انھوں نے اپنایا ہے۔ اور خروج عن الخلاف کے نقطۂ نظر سے احتیاط والے پہلو پر عمل کرنا بہتر ہے۔

فائدہ: مذکورہ تینوں چیزوں کے ناقض ہونے نہ ہونے میں اختلاف کی اصل بنیاد یہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾ (یا تم میں سے کوئی شخص پست زمین سے آئے یعنی استنجا کر کے آیا ہو) اس آیت میں بالاتفاق نواقض وضوء کا بیان ہے۔ مگر تنقیح مناط میں اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ نے علت ''خارج من السبیلین'' نکالی ہے۔ اور چھ چیزوں کو اس کے ساتھ ملحق کیا ہے۔ اور احناف نے علت ''خارج نجس'' نکالی ہے۔ سبیلین کی تخصیص نہیں کی۔ پس جو

بھی ناپاک چیز بدن سے نکلے گی ناقض وضوء ہوگی، خواہ وہ بہنے والا خون ہو، یا منہ بھر کرقئے ہو یا نکسیر ہو (اور قہقہہ کا ناقض ہونا ایک مستثنیٰ صورت ہے) اور احناف نے علت میں تعمیم انہی احادیث کی بناء پر کی ہے جو ان چیزوں کے ناقض ہونے کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اور وہ روایات اگرچہ علحدہ علحدہ متکلم فیہ ہیں، مگر سب مل کر ایک قوت حاصل کر لیتی ہیں۔ اور مناط کی تخریج میں ان سے کام لیا جاسکتا ہے۔ جیسے زاد وراحلہ کی روایت نہایت ضعیف ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ کے علاوہ تمام فقہاء نے ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ کی تفسیر میں اس کا اعتبار کیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ استطاعت کی حد بندی کی ہے۔ اور حج کی فرضیت کے لئے زاد وراحلہ کو شرط قرار دیا ہے۔

امور مذکورہ ناقض وضوء کیوں ہیں؟

۱ ـــــ عورت کو ہاتھ لگانا اس لئے ناقض وضوء ہے کہ وہ خواہش کو بھڑکاتا ہے، اور اس میں جماع کی حاجت سے فروتر حاجت برآری کا احتمال ہے۔

۲ ـــــ عضو تناسل کو چھونا اس لئے ناقض وضوء ہے کہ وہ ایک قبیح فعل ہے، چنانچہ استنجاء کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے پیشاب کے عضو کو چھونے کی ممانعت آئی ہے۔ خاص طور پر جب اس کو پورے ہاتھ سے مٹھی میں پکڑے تو وہ یقیناً ایک شیطانی حرکت ہے۔

۳ و۴ ـــــ بہنے والا خون یعنی جب وہ نکلنے کی جگہ سے متجاوز ہو جائے اور منہ بھر کرقئے، بدن کو تھیڑنے والے ہیں اور نفس کو غبی بناتے ہیں۔ اس لئے وہ ناقض وضوء ہیں۔

۵ ـــــ اور نماز میں قہقہہ مارنا ایک بھاری بھول ہے، جس کے لئے کفارہ کی حاجت ہے۔ اس لئے ممکن ہے شارع نے اس صورت میں کفارہ کے طور پر تجدید وضوء کا حکم دیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شریعت حکم نہ دے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وجوب کے طور پر حکم نہ دے بلکہ استحباب کے طور پر حکم دے۔

والثانية: ما اختلف فيه السلف من فقهاء الصحابة والتابعين، وتعارض فيه الرواية عن النبي صلى الله عليه وسلم، كَمَسِّ الذكر: لقوله صلى الله عليه وسلم: "من مسَّ ذَكَرَهُ فليتوضأ" قال به ابن عمر، وسالم، وعروة، وغيرهم، ورَدَّه عليٌّ، وابن مسعود، وفقهاء الكوفة، ولهم قوله صلى الله عليه وسلم: "هل هو إلا بَضْعَةٌ منه" ولم يجئ الثَّلَجُ بكون أحدهما منسوخا.

ولَمْسِ المرأةِ: قال به عمر، وابن عمر، وابن مسعود، وإبراهيم، لقوله تعالى: ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ ولايشهدُ له حديث، بل يشهد حديثُ عائشة بخلافه، لكن فيه نظرٌ، لأن في إسناده انقطاعًا.

وعندي: أن مثلَ هذه العلةِ إنما تُعتبر في مثل ترجيح أحد الحديثين على الآخر، ولاتُعتبر

في ترك حديث من غير تعارض. والله أعلم.

وكان عمر وابن مسعود لايريانِ التيممَ عن الجنابة، فتعيَّن حملُ الآيةِ عندهما على اللمس، لكن صَحَّ التيمم عنها عن عمران، وعمار، وعمرو بن العاص، وانعقد عليه الإجماع. وكان ابن عمر يذهب إلى الاحتياط، وكان إبراهيم يقلِّد ابنَ مسعود، حتى وَضَحَ على أبي حنيفة حالُ الدليل الذي تمسك به ابن مسعود، فترك قولَه مع شدَّةِ اتباعِه مذهبَ إبراهيم.

وبالجملة: فجاء الفقهاء من بعدهم في هذين على ثلاثِ طبقات: آخذٌ به على ظاهره، وتاركٌ له رأسًا، وفارقٌ بين الشهوة وغيرها.

وقال إبراهيم بالوضوء من الدم السائل، والقيئ الكثير، والحسنُ بالوضوء من القهقهة في الصلاة، ولم يقل بذلك آخرون، وفي كلِّ ذلك حديث لم يُجمِع أهل المعرفة بالحديث على تصحيحه.

والأصحُّ في هذه: أن من احتاط فقد استبرأ لدينه وعِرضه، ومن لا فلاسبيل عليه في صُراح الشريعة.

ولاشبهةَ أن لمس المرأة مُهَيِّجٌ للشهوة، مَظِنَّةٌ لقضاء شهوةٍ دون شهوة الجماع، وأن مسّ الذكر فعلٌ شنيعٌ، ولذلك جاء النهيُ عن مسِّ الذكر بيمينه في الاستنجاء، فإذا كان قبضًا عليه كان من أفعال الشياطين لامُحالةَ، والدمُ السائل والقيئ الكثير مُلَوِّثان للبدن، مُبَلِّدان للنفس، والقَهْقَهَةُ في الصلاة خطيئة، تحتاج إلى كفارة، فلا عَجَبَ أن يأمر الشارعُ بالوضوء من هذه، ولا عجبَ أن لايأمر، ولا عَجَب أن يرغِّبَ فيه من غير عزيمة.

ترجمہ: اور دوسرا درجہ: وہ (نواقض) ہیں جن میں اختلاف کیا ہے فقہائے صحابہ وتابعین میں سے متقدمین نے۔ اور متعارض ہے اس میں نبی کریم ﷺ سے روایت، جیسے پیشاب کے عضو کو چھونا آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے کہ: ''جس نے ذکر کو چھویا وہ وضوء کرے'' قائل تھے اس کے ابن عمر، سالم، عروہ اور ان کے علاوہ۔ اور ردّ کیا اس کو علی، ابن مسعود اور کوفہ کے فقہاء نے۔ اور ان کی دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''نہیں ہے وہ مگر اس کے جسم کا ایک پارہ'' اور دل مطمئن نہیں ہوا ان میں سے کسی ایک کے منسوخ ہونے پر۔

اور (جیسے) عورت کو ہاتھ لگانا: قائل تھے اس کے عمر، ابن مسعود اور ابراہیم نخعی، ارشاد باری تعالیٰ: ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ کی وجہ سے۔ اور نہیں گواہی دیتی اس کے لئے کوئی حدیث۔ بلکہ حضرت عائشہ کی حدیث اس کے برخلاف کی گواہی دیتی ہے۔ مگر اس (حدیث) میں نظر ہے۔ اس لئے کہ اس کی اسناد میں انقطاع ہے۔

اور میرے نزدیک: اس قسم کی خرابی صرف معتبر ہے دو حدیثوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینے جیسے معاملہ میں۔ اور نہیں معتبر ہے تعارض کے بغیر کسی حدیث کو چھوڑنے میں۔ اور اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والے ہیں۔

اور عمر اور ابن مسعود دونوں قائل نہیں تھے جنابت میں تیمم کے۔ پس متعین ہوگیا ان کے نزدیک آیت کو محمول کرنا ہاتھ لگانے پر۔ مگر ثابت ہوا ہے جنابت میں تیمم عمران، عمار، عَمرو بن العاص سے۔ اور منعقد ہو چکا ہے اس پر اجماع۔ اور ابن عمر احتیاط کی طرف جاتے تھے۔ اور ابراہیم پیروی کرتے تھے ابن مسعود کی، یہاں تک کہ واضح ہوا ابو حنیفہ پر اُس دلیل کا حال جس سے ابن مسعود نے استدلال کیا ہے۔ پس چھوڑ دیا ابو حنیفہ نے ابراہیم کا قول، باوجود ان کے شدت کے ساتھ اتباع کرنے کے ابراہیم کی۔

اور حاصل کلام: پس آئے (یعنی ہوگئے) فقہاء ان (صحابہ وتابعین) کے بعد، ان دونوں (مس ولمس) میں تین درجوں پر: لینے والا اس کو اس کے ظاہر پر، اور چھوڑنے والا اس کو سرے سے، اور فرق کرنے والا شہوت اور عدم شہوت کے درمیان۔

اور قائل تھے ابراہیم بہنے والے خون اور زیادہ قئے سے وضوء کے، اور حسنؒ نماز میں قہقہہ مارنے سے وضوء کے۔ اور نہیں قائل تھے اس کے دوسرے حضرات۔ اور اِن (تینوں مسئلوں) میں سے ہر مسئلہ میں ایک ایسی حدیث ہے جس کی تصحیح پر حدیث کا علم رکھنے والوں نے اتفاق نہیں کیا۔

اور صحیح تر بات ان مسائل میں یہ ہے کہ جس نے احتیاط پر عمل کیا اس نے یقیناً براءت (پاکی) طلب کی اپنے دین کے لئے اور اپنی آبرو کے لئے۔ اور جو ایسا نہ کرے تو کوئی راہ نہیں ہے اس پر خالص شریعت میں۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ عورت کو ہاتھ لگانا شہوت کو برانگیختہ کرنے والا ہے۔ جماع کی شہوت سے کم تر شہوت کو پورا کرنے کی احتمالی جگہ ہے —— اور یہ کہ عضو تناسل کو چھونا ایک برا فعل ہے۔ اور اسی وجہ سے ممانعت آئی ہے دائیں ہاتھ سے پیشاب کا عضو چھونے کی استنجاء میں۔ پس جب ہو اس کو ہاتھ سے پکڑنا تو ہوگا وہ یقیناً شیطان کے افعال میں سے (اي: إذا كان مسُّ الذكر في صورة القبض عليه، كان لامحالة من أفعال الشياطين) —— اور بہنے والا خون اور زیادہ قئے دونوں بدن کو آلودہ کرنے والے ہیں، نفس کو بلید کرنے والے ہیں —— اور نماز میں قہقہہ مارنا ایک بھاری غلطی ہے، وہ کبھی کفارہ کی محتاج ہوتی ہے۔ پس عجب نہیں کہ شارع حکم دے قہقہہ سے وضوء کا، اور عجب نہیں کہ نہ حکم دے، اور عجب نہیں کہ وضوء کی ترغیب دے، تاکید (وجوب) کے بغیر۔

☆ ☆ ☆

نواقضِ وضوء کی تیسری قسم —— منسوخ نواقض

تیسرے درجہ کے نواقض وہ ہیں جن کے بارے میں بعض احادیث کی بناء پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ نواقض ہیں، مگر ان کے ناقضِ وضوء نہ ہونے پر فقہائے صحابہ وتابعین کا اتفاق ہے۔ ایسے نواقض دو ہیں ایک: آگ پر پکی ہوئی چیز کا کھانا۔ دوسرا: اونٹ کا گوشت کھانا۔ تفصیل درج ذیل ہے:

۱- مامَسّتِ النار کا ناقضِ وضوء ہونا:

مسلم شریف میں یہ ارشاد نبوی مروی ہے کہ تَوَضَّؤُوا مما مَسَّتِ النارُ یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضوء کرو۔ مگر آنحضرت ﷺ، خلفائے راشدین، حضرت ابن عباس، حضرت ابوطلحہ اور دیگر بہت سے صحابہ سے ماست النار سے وضوء نہ کرنا ثابت ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے صاف طور پر یہ بات بیان کردی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا آخری عمل وضوء نہ کرنا ہے۔ پس مسلم شریف کی روایت یقیناً منسوخ ہے۔

ماسّتِ النار سے وضوء کرنے کی وجہ:

ماست النار سے وضوء کرنے کا حکم دو وجہ سے تھا:

پہلی وجہ: آگ پر پکی ہوئی چیز کھانا، کچی کھانے کی بہ نسبت، دنیا کی چیزوں سے کامل انتفاع ہے، جو فرشتوں کی شان کے خلاف ہے، اس لئے اس کے کھانے سے فرشتوں سے وہ مشابہت منقطع ہوجاتی ہے جو طہارت کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی پس مشابہت کی تجدید کے لئے نئی وضوء کرنے کا حکم دیا تھا۔

دوسری وجہ: جب آگ پر پکی ہوئی چیز آدمی کھاتا ہے تو اس سے جہنم کی آگ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اور اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے بغیر شدید ضرورت کے لوہا گرم کرکے اس سے داغنے کا علاج کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ پس انسان کے لئے سزاوار نہیں کہ وہ اپنا دل اس کے ساتھ مشغول کرے۔ اور جہنم کی یاد لے کر عبادت کرے۔ اور جب ضرورتِ دنیوی کی وجہ سے ایسی چیز کھانا ناگزیر ہے تو مناسب یہ ہے کہ اس کے بعد وضوء کرلے۔ تاکہ پانی کی برودت نہ صرف جہنم کی آگ کو بھلادے، بلکہ رحمت و جنت کی یاد تازہ کردے۔

۲- اونٹ کے گوشت کا ناقضِ وضوء ہونا:

اونٹ کے گوشت کا معاملہ ماسّتِ النار کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔ مسلم شریف میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا: کیا ہم بکری کا گوشت کھا کر وضوء کریں؟ آپؐ نے فرمایا: "اگر چاہو تو کرو، اور اگر نہ چاہو تو نہ کرو" سائل نے پوچھا: کیا ہم اونٹ کا گوشت کھا کر وضوء کریں؟ آپ نے فرمایا: "ہاں، اونٹ کے گوشت سے وضوء کرو" (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۵)

مگر فقہائے صحابہ میں سے اس کا کوئی قائل نہیں۔ اور نسخ کا فیصلہ کرنے کی بھی کوئی راہ نہیں، کیونکہ کسی صحابی نے نسخ کی صراحت نہیں کی۔ پھر جب مجتہدین کا زمانہ آیا تو جن حضرات پر قیاس واستنباط کی چھاپ گہری تھی وہ اونٹ کے گوشت سے نقضِ وضوء کے قائل نہیں ہوئے (یعنی ابوحنیفہ، مالک اور شافعی رحمہم اللہ) اور امام احمد اور امام اسحاق رحمہما

اللہ اس کے قائل ہوئے۔ کیونکہ ان حضرات پر ظاہر حدیث پر عمل کرنے کا جذبہ غالب تھا۔ اور شاہ صاحب کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ آدمی احتیاطاً وضوء کرلے۔

اونٹ کے گوشت سے وضوء واجب ہونے میں راز:

ان حضرات کے قول کے مطابق جو اونٹ کے گوشت سے وضوء واجب کرتے ہیں، وجوب وضوء کا راز یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت تورات میں حرام تھا۔ اور تمام انبیائے بنی اسرائیل اس کی حرمت پر متفق تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس کو ہمارے لئے حلال کیا، تو دو وجہ سے اس کے کھانے کے بعد وضوء واجب کی:

پہلی وجہ: اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضوء کرنا شکرِ نعمت کے طور پر ہے۔ جو چیز پہلے حرام تھی وہ ہم پر حلال کی گئی اس کا شکر بجالانے کے لئے وضوء واجب کی گئی ہے —— مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ شکر عبادت مقصودہ کے ذریعہ بجالایا جاتا ہے۔ اور وضوء عبادت غیر مقصودہ ہے۔

دوسری وجہ: اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وساوس کے علاج کے طور پر وضوء تجویز کی گئی ہے۔ ممکن ہے کسی کے دل میں یہ بات کھٹکے کہ جس چیز کو تمام انبیائے بنی اسرائیل نے حرام ٹھہرایا تھا، وہ ہمارے لئے حلال کیونکر ہوگئی؟! اس کھٹک کو مٹانے کے لئے اباحت کے ساتھ وضوء واجب کی۔ کیونکہ تحریم میں تبدیلی کرکے کسی چیز کو ایسا مباح قرار دینا جس کے ساتھ وضوء کو بھی واجب کیا ہو، لوگوں کے لئے زیادہ باعث اطمینان ہے۔

اور اس کو ایک نظیر سے سمجھیں: میت کو نہلانا ضروری ہے۔ مگر عام لوگ اس سے خوف کھاتے ہیں۔ ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ چنانچہ وساوس کے علاج کے طور پر حکم دیا کہ میت کو نہلانے والا فارغ ہوکر خود بھی نہالے۔

آخر میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اونٹ کے گوشت سے وضوء کا وجوب ابتدائے اسلام میں تھا، بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا تھا۔ اور اوپر جو احتیاطاً وضوء کرنے کے لئے فرمایا ہے وہ صرف استحباباً ہے۔

والثالثة: ما وُجد فيه شبهةٌ من لفظ الحديث، وقد أجمع الفقهاء من الصحابة والتابعين على تركه، كالوضوء مما مَسَّتْهُ النارُ، فإنه ظهر عملُ النبي صلى الله عليه وسلم، والخلفاءِ وابن عباس، وأبي طلحة، وغيرهم بخلافه، وبَيَّن جابر أنه منسوخ.

وكان السبب في الوضوء منه: أنه ارتفاق كامل، لايَفعل مثله الملائكةُ، فيكون سببًا لانقطاع مشابهتهم. وأيضًا: فإن ما يُطبخ بالنار يُذَكِّرُ نار جهنم، ولذلك نُهي عن الكَيِّ، إلا لضرورة، فلذلك لاينبغي للإنسان أن يُشْغِلَ قلبَه به.

وأما لحم الإبل: فالأمر فيه أشدُّ، لم يقل به أحد من فقهاء الصحابة والتابعين، ولاسبيل إلى الحكم بنسخه، فلذلك لم يقل به من يَغْلِبُ عليه التخريجُ، وقال به أحمد وإسحاق؛

وعندي: أنه ينبغي أن يَحتاطَ فيه الإنسان، واللهُ أعلم.

والسِّرُّ في إيجاب الوضوء من لحوم الإبل على قولِ من قال به: أنها كانت مَحَرَّمةً في التوراةِ، واتفق جمهور أنبياء بني إسرائيل على تحريمها، فلما أباحها الله لنا شرع الوضوء منها لمعنَيَيْنِ:

أحدهما: أن يكون الوضوء شكرًا لما أنعم الله علينا من إباحتها بعد تحريمها على من قبلنا.

وثانيهما: أن يكون الوضوء علاجاً لما عسى أن يختلج في بعض الصدور من إباحتها، بعد ما حَرَّمها الأنبياءُ من بني إسرائيل، فإن النقل من التحريم إلى كونه مباحًا يجب منه الوضوء، أقربُ لاطمئنان نفوسهم.

وعندي:أنه كان في أول الإسلام، ثم نُسخ.

ترجمہ: اور تیسرا درجہ: وہ (نواقض) ہیں جن میں حدیث کے لفظ سے (نقض کا) شبہ ہوتا ہے۔ اور اتفاق کیا ہے فقہائے صحابہ وتابعین نے وضوء کے چھوڑنے پر، جیسے اس چیز سے وضوء کرنا جس کو آگ نے چھویا ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ ظاہر ہوا ہے نبی ﷺ، خلفائے راشدین، ابن عباس، ابوطلحہ اور ان کے علاوہ کا عمل اس (حدیث) کے خلاف۔ اور بیان کیا ہے جابرؓ نے کہ وہ منسوخ ہے۔

اور مامسّت النار سے وضوء کا سبب یہ تھا کہ: (۱) وہ کامل فائدہ اٹھانا ہے۔ فرشتے ویسا کام نہیں کرتے۔ پس ہوگا وہ فرشتوں سے مشابہت کے منقطع ہونے کا سبب (۲) اور نیز: پس بیشک جو چیز آگ پر پکائی جاتی ہے، وہ نارِ جہنم کو یاد دلاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے روکا گیا ہے لوہا گرم کر کے داغ دینے سے۔ مگر ضرورت کی وجہ سے (داغنا جائز ہے) چنانچہ انسان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنا دل اس کے ساتھ مشغول کرے۔

رہا اونٹ کا گوشت: تو معاملہ اس میں زیادہ سخت ہے۔ فقہائے صحابہ وتابعین میں سے اس کا کوئی قائل نہیں تھا۔ اور اس کے نسخ کا فیصلہ کرنے کی بھی کوئی راہ نہیں۔ پس اس وجہ سے اس کے قائل نہیں ہوئے وہ فقہاء جن پر تخریج کا غلبہ ہے۔ اور احمد اور اسحاق اس کے قائل ہیں اور میرے نزدیک: یہ بات ہے کہ مناسب یہ ہے کہ انسان اس میں احتیاط برتے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

اور اونٹ کے گوشت سے وضوء واجب کرنے میں راز ـــــ اس شخص کے قول کے مطابق جو اس کو ناقض وضوء مانتا ہے ـــــ: یہ ہے کہ وہ تورات میں حرام تھا، اور تمام انبیائے بنی اسرائیل اس کی حرمت پر متفق تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ

نے اس کو ہمارے لئے حلال کیا تو اس سے وضوء کرنا شروع کیا، دو وجہ سے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ اس کے کھانے کے بعد وضوء کر لینا اللہ کی اس نعمت کا شکر بجالانا ہے کہ جو چیز پہلے حرام تھی وہ ہمارے لئے حلال کر دی گئی۔

اور ان میں سے دوسری: یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضوء کرنا علاج ہے اس بات کا جو ہوسکتا ہے کہ کسی کے دل میں کھٹکے یعنی اس کو حلال کرنا اس کے بعد کہ اس کو انبیائے بنی اسرائیل نے حرام کیا تھا۔ پس بیشک تحریم سے منتقل ہونا ایسا مباح ہونے کی طرف جس سے وضوء واجب ہو، لوگوں کے قلوب کے اطمینان سے قریب تر ہے —— اور میرے نزدیک: یہ بات ہے کہ یہ (وجوب کا) حکم ابتدائے اسلام میں تھا۔ پھر منسوخ کر دیا گیا۔

ترکیب: یجب منه الوضوء جملہ صفت ہے مباحاً کی۔ اور اقرب خبر ہے إنّ کی..... تخریج کے معنی استنباط کے ہیں۔

نوٹ: قوله: والسر في إيجاب الوضوء إلخ مخطوطہ کراچی میں نہیں ہے۔ یہ مضمون شاہ صاحب نے بعد میں بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

باب —— ۶

خُفّین (چمڑے کے موزوں) پر مسح کا راز

مشروعیت مسح کی وجہ:

چونکہ وضوء کا مدار ان اعضاء کے دھونے پر ہے جو عام طور پر کھلے رہتے ہیں، اور جن کی طرف میل کچیل سبقت کرتا ہے۔ اور جب موزے پہن لئے جاتے ہیں تو پیر ان میں چھپ جاتے ہیں، اور وہ اعضائے باطنہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور عربوں میں جوتے چپل کی جگہ خفین پہننے کا عام رواج تھا۔ اور ہر مرتبہ وضوء کے وقت ان کو نکال کر پیر دھونا تنگی سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے شریعت نے خفین پہننے کی صورت میں، کچھ وقت کے لئے، آسانی پیدا کرنے کے لئے پاؤں کے دھونے کا حکم ختم کر دیا۔ اور ان پر مسح کرنے کی اجازت دیدی۔

موزوں پر مسح کے لئے تین شرطیں —— اور اشتراط کا راز:

جب شریعت دین میں آسانی پیدا کرتی ہے تو یہ بات ملحوظ رکھتی ہے کہ تیسیر کا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے نفس مطلق العنان (بے لگام) ہو جائے، اور امر مطلوب کو بالکل ہی بھلا بیٹھے۔ پیروں میں اصل مطلوب "دھونا"

ہے۔مسح کی اجازت ایک سہولت ہے۔اب اگر بے قید اور بے مدت مسح کی اجازت دیدی جائے گی تو آدمی یہ تک بھول جائے گا کہ پیروں کا اصل حکم ''دھونا'' تھا۔اس لئے شارع نے تین شرطوں کے ساتھ مسح کی اجازت دی ہے:

پہلی شرط: مسح کی توقیت (مدت مقرر) کی۔غیر متعین مدت کے لئے مسح کی اجازت نہیں دی۔مقیم کے لئے ایک شبانہ روز اور مسافر کے لئے تین شبانہ روز مقرر کئے۔کیونکہ یہ مدتیں کسی چیز کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کی جانے والی بہترین مدتیں ہیں۔لوگ اپنے عرف میں جب کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا چاہتے ہیں تو یہی مدتیں مقرر کرتے ہیں۔مثلاً کسی مریض کی حالت نازک ہے۔اس کو شفاخانہ میں انتہائی نگہداشت والے شعبہ میں داخل کیا گیا۔ڈاکٹر پہلے ۲۴ گھنٹے تک انتظار کرتا ہے۔اگر مریض یہ مدت پوری کر دیتا ہے تو طبیب شفایابی کی امید دلاتا ہے۔پھر ۷۲ گھنٹے انتظار کرتا ہے۔اگر مریض یہ مدت بھی بخیریت پوری کر دیتا ہے تو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے کہ مریض خطرہ سے نکل گیا ہے! غرض یہی مدتیں تعہد (دیکھ بھال) کے لئے موزون ہیں اس لئے شریعت نے بھی یہی مدتیں مقرر کی ہیں۔

اور مقیم کو پہلی اور مسافر کو دوسری مدت ان کی تنگی کا لحاظ کر کے دی گئی ہے۔مقیم کو اسباب طہارت اور وقت میسر ہوتا ہے۔اور مسافر کو یہ دونوں چیزیں بہ سہولت میسر نہیں ہوتیں، اس لئے اس کو مزید سہولت دی گئی ہے۔

دوسری شرط: خفین کا طہارت کاملہ پر پہننا۔یہ شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ آدمی کے پیش نظر یہ بات رہے اور اس کے دل میں یہ نقشہ جما رہے کہ اس کے پیر گویا پاک ہیں۔وہ پیروں کو اعضائے مستورہ پر قیاس کر کے سمجھے کہ جس طرح اعضائے مستورہ تک میل کچیل کم پہنچتا ہے، اس لئے وہ گویا پاک ہیں، اسی طرح پاؤں بھی مستور ہونے کی وجہ سے گویا اسی حالت پر ہیں جس حالت میں ان کو خفین میں داخل کیا گیا تھا۔اور اس قسم کے قیاسات ان چیزوں میں کارآمد ہوتے ہیں، جن کا تعلق نفس کی تنبیہ سے ہوتا ہے۔

تیسری شرط: غسل کے عوض مسح موزوں کے اوپر کیا جائے۔صرف نیچے مسح کرنا کافی نہیں، تاکہ وہ پیروں کا دھونا یاد دلائے اور وہ غسل کا نمونہ بنے۔امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ صرف موزوں کے اوپر مسح کے قائل ہیں۔اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ اوپر بھی اور نیچے بھی مسح کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک بھی صرف نیچے مسح کافی نہیں البتہ صرف اوپر کافی ہے۔گویا نیچے مسح ان دونوں کے نزدیک مستحب ہے، ضروری نہیں۔

﴿المسح على الخُفَّين﴾

لما كان مبنى الوضوء على غسل الأعضاء الظاهرة، التي تَسْرَعُ إليها الأوساخ، وكانت الرِّجلان تدخُلان عند لُبس الخفين في الأعضاء الباطنة، وكان لُبْسُهما عادةً متعارفةً عندهم، ولايخلو الأمرُ بخلْعِهما عند كل صلاة من حرج، سقط غسلُهما عند لُبسهما، في الجملة.

ولما كان من باب التيسير الاحتيالُ بما لاتسترسل معه النفسُ بترك المطلوب، استعمله الشارع ههنا من وجوهٍ ثلاثةٍ:

أحدها: التوقيتُ بيوم وليلة للمقيم، وثلاثةِ أيام ولياليها للمسافر: لأن اليومَ بليلةٍ مقدارٌ صالحٌ للتعهُّد، يستعمله الناس في كثير مما يريدون تعهُّده، وكذلك ثلاثةُ أيام بلياليها، فَوُزِّعَ المقدارنِ على المقيم والمسافر، لمكانهما من الحرج.

والثاني: اشتراطُ أن يكون لُبسهما على طهارة: ليتمثل بين عينَي المكلَّف أنهما كالباقي على الطهارة، قياساً على قلةِ وصولِ الأوساخ إلى الأعضاء المستورة؛ وأمثالُ هذه القياسات مؤثرةٌ فيما يرجع إلى تنبيه النفس.

والثالث: أن يَمسح على ظاهرهما، عِوَضَ الغَسل، إبقاءً لمذكّرٍ ونموذج.

ترجمہ: خفین پر مسح: جب وضوء کا مدار اُن عضائے ظاہرہ کے دھونے پر تھا جن کی طرف میل کچیل سبقت کرتا ہے۔ اور دونوں پیر خفین پہننے کی صورت میں اعضائے باطنہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اور خفین کا پہننا عربوں میں ایک معروف عادت تھی۔ اور ہر نماز کے وقت ان کو نکالنا تنگی سے خالی نہیں تھا۔ تو فی الجملہ (کچھ وقت کے لئے) ان کا دھونا ساقط ہوگیا، خفین پہننے کی صورت میں۔

اور جب تھا تیسیر کے باب سے حیلہ کرنا ایسی چیز کے ذریعہ کہ نہ بے لگام ہوجائے اس کے ساتھ نفس مطلوب کو ترک کرنے میں، تو شارع نے مسح کو استعمال کیا یہاں (خفین میں) تین صورتوں سے:

ان میں سے ایک: مدت مقرر کرنا ہے مقیم کے لئے ایک رات دن کی اور مسافر کے لئے تین رات دن کی۔ اس لئے کہ ایک دن مع اس کی رات کے ایک کارآمد مقدار ہے دیکھ بھال کے لئے۔ لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں بہت سی ان چیزوں میں جن کی دیکھ بھال کا وہ ارادہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح تین دن مع ان کی راتوں کے۔ پس تقسیم کی گئیں دونوں مقداریں مقیم اور مسافر پر، ان دونوں کے حرج کا لحاظ کرکے۔

اور دوسری: اس بات کی شرط لگانا ہے کہ خفین طہارت پر پہنے گئے ہوں، تاکہ نقشہ جما رہے مکلف کی دونوں آنکھوں کے سامنے کہ وہ دونوں پیر گویا طہارت پر باقی ہیں، قیاس کرتے ہوئے میل کچیل کے کم پہنچنے پر مستور اعضاء کی طرف۔ اور اس قسم کے قیاسات اثر انداز ہوتے ہیں ان چیزوں میں جن کا تعلق نفس کو چوکنا کرنے سے ہے۔

اور تیسری: یہ ہے کہ مسح کرے خفین کے اوپر کے حصہ میں، دھونے کے بدلے کے طور پر، تاکہ پاؤں دھونے کی یاد دہانی اور اس کا نمونہ باقی رہے۔

☆

موزوں کے اوپر مسح استحسانی ہے اور نیچے قیاسی

اب شاہ صاحب رحمہ اللہ باب کے آخر میں ایک سوال مقدر کا جواب دیتے ہیں۔ موزوں پر مسح کے جواز کے لئے اوپر تین شرطیں بیان کی گئی ہیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ مسح موزوں کے اوپر کے حصہ میں کیا جائے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابو داؤد شریف (حدیث نمبر ۱۶۲) میں حضرت علیؓ کا ارشاد مروی ہے کہ: ''اگر دین کا مدار رائے (عقل و قیاس) پر ہوتا تو موزوں کے نیچے مسح کرنا، اوپر مسح کرنے سے بہتر تھا'' اس ارشاد سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ظاہر خف پر مسح خلافِ قیاس ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ جواب دیتے ہیں کہ ظاہر خف پر مسح خلافِ قیاس نہیں، بلکہ موافق قیاس ہے۔ کیونکہ موزوں پر مسح پاؤں دھونے کے نمونہ کے طور پر تجویز کیا گیا ہے۔ مسح کا اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں۔ پس اگر موزوں کے نیچے مسح کیا جائے گا یعنی بھیگا ہوا ہاتھ نیچے پھیرا جائے گا تو جب آدمی وضوء سے فارغ ہو کر چلے گا تو وہ حصہ گندہ ہو جائے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ مسح موزوں کے اوپر کیا جائے۔ اس طرح ظاہر خف پر مسح معقول اور رائے کے موافق ہو جاتا ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ احکام شرعیہ کے اسرار و رموز بخوبی جانتے تھے۔ ان کے ارشادات اور خطابات اس کی واضح دلیل ہیں۔ ان کے نزدیک بھی مسح ظاہر خف ہی پر اصل تھا۔ مگر آپؓ نے چاہا کہ لوگ عقل کا گھوڑا نہ دوڑائیں۔ اس لئے آپ نے رائے کی راہ مسدود کرتے ہوئے مذکورہ بات فرمائی، تاکہ لوگ احکام شرعیہ میں رائے زنی کر کے اپنا دین بگاڑ نہ لیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ موزوں کے نیچے مسح کرنا قیاس جلی ہے۔ کیونکہ وہی حصہ گرد و غبار سے ملوث ہوتا ہے، پس اسی کو صاف کرنا چاہئے۔ مگر قیاس جلی گو فہم کے اعتبار سے واضح ہوتا ہے۔ مگر اثر کے اعتبار سے ضعیف ہوتا ہے، غور فرمائیں! مذکورہ بات اس وقت معقول تھی جبکہ خشک ہاتھ سے گرد جھاڑی جاتی۔ مگر مسح: بھیگا ہوا ہاتھ عضو پر پھیرنے کا نام ہے۔ پس نیچے مسح کرنے سے وہ حصہ بھیگ جائے گا۔ پھر جب آدمی چلے گا تو وہ حصہ گندہ ہوگا۔ اور ''بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا'' والی کہاوت صادق آئے گی۔ نیز نیچے مسح کرنا دھونے کا نمونہ بھی نہیں بنے گا، کیونکہ وہ مسح آنکھوں سے مستور ہوگا۔

اور موزوں کے اوپر مسح کرنا استحسان ہے۔ استحسان بھی قیاس ہی ہوتا ہے، مگر وہ قیاس خفی ہوتا ہے۔ جو فہم کے اعتبار سے تو دقیق ہوتا ہے، مگر اثر کے اعتبار سے قوی ہوتا ہے۔ اور وہ قوتِ اثر یہ ہے کہ اوپر مسح کرنا دھونے کا نمونہ بنے گا، اور چلنے سے وہ حصہ گندہ بھی نہیں ہوگا۔ پس ظاہر خف پر ہی مسح اَولی ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے، مگر آپؓ نے عوام کے دین کی حفاظت کے لئے مذکورہ بالا ارشاد فرمایا تاکہ لوگ قیاس جلی کی طرف بہ نہ پڑیں اور باطن خف پر مسح کو اَولی خیال کر کے اپنا دین بگاڑ نہ لیں۔

وقال علي رضي الله عنه: '' لو كان الدينُ بالرأي لكان أسفلُ الخف أولىٰ بالمسح من أعلاه''

أقول: لما كان المسحُ إبقاءً لمنوذَجِ الغَسل، لايُراد منه إلا ذلك؛ وكان الأسفلُ مظنةَ

لتلويث الخفين عند المشي في الأرض، كان المسحُ على ظاهرهما، دون باطنهما، معقولاً، موافقا بالرأي. وكان علي رضي الله عنه من أعلم الناس بعلم معاني الشرائع، كما يظهر من كلامه وخُطَبِه، لكن أراد أن يُسُدَّ مَدْخَلَ الرأي، لئلا يُفْسِدَ العامةُ على أنفسهم دينَهم.

ترجمہ: اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر دین رائے کے ذریعہ ہوتا تو موزوں کے نیچے مسح کرنا، اوپر مسح کرنے سے بہتر تھا''

میں کہتا ہوں: جب مسح کرنا پاؤں کو دھونے کا نمونہ باقی رکھنے کے طور پر تھا، اور اس کے سوا اس سے اور کچھ مقصود نہیں تھا، اور موزوں کا نیچے کا حصہ، زمین میں چلنے کی صورت میں، تلویث کی احتمالی جگہ تھا، تو خفین کے اوپری حصہ پر، نہ کہ نیچے کے حصہ پر، مسح معقول (اور) رائے کے موافق تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے احکام کے معانی (اسرار و حکم) کو، جیسا کہ ان کے ارشادات سے اور ان کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر آپؓ نے چاہا کہ رائے کی راہ مسدود کریں، تاکہ عام لوگ اپنے اوپر اپنے دین کو بگاڑ نہ لیں۔

☆ ☆ ☆

باب ــــــ ۷

غسل کا طریقہ

غسل کا طریقہ: جس کو بخاری و مسلم نے حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے،[1] اور جس پر امت نے اتفاق کیا ہے: یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو برتن میں ڈالنے سے پہلے دھولے۔ پھر بدن پر اور شرمگاہ پر جو ناپاکی ہو اس کو دھو ڈالے۔ پھر نماز والی وضوء کرے۔ پھر سر کے بالوں میں تر انگلیاں ڈال کر بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح پانی پہنچائے۔ پھر سارے جسم پر پانی بہائے۔ غسل کا یہ پورا طریقہ متفق علیہ ہے۔ صرف ایک بات میں اختلاف ہے کہ وضوء میں پیر کب دھوئے؟ وضوء کے ساتھ یا غسل سے فارغ ہو کر؟ دونوں رائیں ہیں۔ اور بعض حضرات فرق کرتے ہیں کہ اگر ایسی جگہ نہا رہا ہے جہاں مستعمل پانی جمع ہو رہا ہے تو پیر بعد میں دھوئے۔ اور اگر وہاں سے پانی بہہ جاتا ہے تو پیر وضوء کے ساتھ ہی دھولے۔

غسل شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے کی وجہ: وہی ہے جو وضوء کے بیان میں گذر چکی ہے کہ جب ہاتھ دھوئے دیر ہو جاتی ہے اور عرصہ تک ہاتھوں سے غفلت رہتی ہے تو احتمال پیدا ہوتا ہے کہ ان پر کوئی ناپاکی لگ گئی ہو، یا

[1] یہ دونوں حدیثیں متفق علیہ ہیں مشکوۃ، باب الغسل، حدیث نمبر ۴۳۵ و ۴۳۶

میل کچیل سے ہاتھ ملوث ہو گئے ہوں، اور جنابت کے بعد غسل میں تو ہاتھوں کے ناپاک ہونے کا قوی احتمال ہے، پس ہاتھوں کو دھوئے بغیر پانی میں ڈالنا یا تو پانی کو ناپاک کر دے گا، یا گدلا کر دے گا جو خلاف تہذیب و شائستگی ہوگا۔

اور غسل شروع کرنے سے پہلے شرمگاہ کو دھونے کا حکم: دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: اگر شرمگاہ پر یا بدن پر ناپاکی ہوگی، اور اس کو دھوئے بغیر جسم پر پانی بہائے گا، تو ناپاکی جسم پر پھیل جائے گی، اور اس کو پاک کرنے میں دشواری لاحق ہوگی اور بہت زیادہ پانی درکار ہوگا، اس لئے پہلے ناپاکی کو الگ سے دھولینا چاہئے۔

دوسری وجہ: غسلِ جنابت: نجاستِ حکمیہ کے ازالہ ہی کے لئے ہے۔ اگر ناپاک بدن کے ساتھ غسل جنابت کرے گا تو غسل کا مقصد دو نجاستوں کا ازالہ ہوگا۔ پس غسل: حدث کے ازالہ کے لئے خالص نہیں رہے گا۔ اس لئے نجاستِ حقیقیہ کو الگ سے دھولینا چاہئے تاکہ غسل: نجاست حکمیہ کے ازالہ کے لئے خالص ہو جائے۔

غسل کے شروع میں وضوء: کی تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: غسل طہارت کبری (بڑی پاکی) ہے۔ اس کا مقتضی یہ ہے کہ وہ طہارتِ صغری (وضوء) اور کچھ زائد پر مشتمل ہو، تاکہ نفس پاکی کی صفت سے اچھی طرح باخبر ہو جائے۔

دوسری حکمت: غسل میں جسم کے شکنوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اور وضوء: جسم کے شکنوں کی دیکھ بھال کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ اگر وضوء کئے بغیر سر پر پانی بہائے گا تو احتمال ہے کہ پانی جسم کے اطراف تک نہ پہنچے۔ جب تک اطراف کا خیال نہ رکھا جائے اور ان تک پانی پہنچانے کا اہتمام نہ کیا جائے وہ خشک رہ سکتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ پہلے وضوء کر کے اطراف کو دھولے۔

تیسری حکمت: جب جنابت لاحق ہوتی ہے تو جسم کا ظاہری حصہ گرم ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر فوراً ٹھنڈے پانی سے نہائے گا اور یکدم سر پر ٹھنڈا پانی ڈالے گا تو اس کا ردِ عمل ہو سکتا ہے۔ نزلے زکام میں یا کسی اور بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور غسل سے پہلے وضوء کر لے گا تو گرمی اندر دب جائے گی، اور ظاہری جسم ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پس ٹھنڈے پانی کا ردِ عمل نہیں ہوگا، اور آدمی بیماری سے محفوظ رہے گا (یہ حکمت شارح نے بڑھائی ہے)

پیروں کو بعد میں دھونے: کی حکمت یہ ہے کہ اگر وضوء کے ساتھ ہی پیر دھولے گا تو غسل سے فارغ ہو کر دوبارہ پیر دھونے پڑیں گے، جبکہ پانی جمع ہونے کی جگہ میں نہا رہا ہو، پس خواہ مخواہ پاؤں کو بار بار دھونا لازم آئے گا۔ البتہ اگر کوئی وضوء کے ساتھ پیر اس لئے دھوتا ہے کہ وضوء کی صورت مکمل ہو جائے۔ اور غسل کے بعد پاک کرنے کے لئے پیروں کو دھوتا ہے تو یہ بے فائدہ تکرار نہیں ہے۔

مستحباتِ غسل: چار ہیں (۱) تمام بدن کو تین بار دھونا (۲) بدن کو ملنا اور خوب اچھی طرح سے کھال کو صاف کرنا (۳) جسم کے شکنوں کی دیکھ بھال کرنا اور اہتمام سے ان تک پانی پہنچانا (۴) اور پردہ میں نہانا —— شارع علیہ السلام نے یہ امور

غسل میں اس لئے مستحب قرار دیئے ہیں کہ غسل کامل ومکمل ہو۔

نوٹ: دنیا میں پانی سب جگہ وافر مقدار میں نہیں پایا جاتا۔ عرب میں پانی کی بہت قلت تھی، وضوء وغسل کے احکام میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ تھوڑے پانی سے کامل طہارت حاصل ہوجائے۔

﴿صفة الغسل﴾

على ما روته عائشةُ وميمونةُ، وتطابق عليه الأمةُ: أن يغسل يديه قبل إدخالهما الإناءَ، ثم يغسل ما وجد من نجاسة على بدنه وفرجه، ثم يتوضأ كما يتوضأ للصلاة، ويتعهَّد رأسه بالتخليل، ثم يصُب الماء على جسده. واختلفوا في حرفٍ واحدٍ: يؤخر غَسْلَ القدمين أو لا؟ وقيل بالفرق بين ما إذا كان في مُسْتَنْقَعٍ من الأرض، وما إذا لم يكن كذلك.

أما غَسل اليدين: فلما مر في الوضوء.

وأما غَسل الفرج: فلئلا تتكثر النجاسة بإسالة الماء عليها، فيعسر غَسلها، ويحتاج إلى ماء كثير، وأيضًا: لايصفو الغُسل لطهارة الحدث.

وأما الوضوء: فلأن من حق الطهارة الكبرى أن تشتمل على الطهارة الصغرى وزيادةٍ، ليتضاعف تنبهُ النفس لِخَلَّةِ الطهارة. وأيضًا: فالوضوء في الغُسل من باب تعهُّد المغابن، فإنه إذا أفاض على رأسه الماءَ، لايستوعب الأطرافَ إلا بتعهُّدٍ واعتناءٍ.

وأما تاخير غَسل القدمين: فلئلا يتكرر غَسلهما بلافائدة، اللهم إلا لمحافظة على صورة الوضوء.

ثم كَمَّلَ الغُسْلَ: بالندب إلى التثليث والدَّلك وتعهد المغابن وتاكيد السَّتر.

ترجمہ: نہانے کا طریقہ: اس طور پر جس کو روایت کیا ہے عائشہ اور میمونہ رضی اللہ عنہما نے، اور جس پر اتفاق کیا ہے امت نے: یہ ہے کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھولے۔ پھر اس ناپاکی کو دھو ڈالے جس کو اپنے بدن اور اپنی شرمگاہ پر پائے۔ پھر وضوء کرے جس طرح نماز کے لئے وضوء کرتا ہے۔ پھر خلال کے ذریعہ اپنے سر کی دیکھ بھال کرے (یعنی بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح پانی پہنچائے) پھر اپنے جسم پر پانی بہائے ——— اور (علماء نے) صرف ایک بات میں اختلاف کیا ہے: (وہ یہ ہے کہ) دونوں پیروں کے دھونے کو مؤخر کرے یا نہیں؟ اور بعض نے فرق کیا ہے اس صورت میں جبکہ وہ نہار ہا ہو پانی جمع ہونے کی جگہ میں اور اس صورت میں جبکہ ایسا نہ ہو۔

رہا دونوں ہاتھوں کا دھونا: تو اس کی وجہ وہ ہے جو وضوء کے بیان میں گذر چکی ہے۔

اور رہا شرمگاہ کا دھونا: پس اس لئے ہے کہ ناپاکی زیادہ نہ ہوجائے، اس پر پانی بہانے کی وجہ سے، پس دشوار ہو اس کو دھونا اور بہت پانی درکار ہو۔ اور نیز: خالص نہ رہے نہانا حدث کی پاکی کے لئے۔

اور رہا وضوء: پس اس لئے ہے کہ طہارت کبریٰ کے حق میں سے یہ بات ہے کہ وہ طہارت صغریٰ اور کچھ زیادہ (عمل) پر مشتمل ہو، تاکہ دوچند ہو نفس کا چوکنا ہونا پاکی کی خصلت پر۔ اور نیز: پس غسل میں وضوء کرنا شکنوں کی دیکھ بھال کرنے کے قبیل سے ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ جب وہ اپنے سر پر پانی بہائے گا تو وہ اطراف کو نہیں گھیرے گا مگر دیکھ بھال کرنے اور اہتمام کرنے سے۔

اور رہا دونوں پیروں کو بعد میں دھونا: پس وہ اس لئے ہے کہ خواہ مخواہ پاؤں کا بار بار دھونا لازم نہ آئے۔ اے اللہ! مگر صورتِ وضوء کی محافظت کے لئے۔

پھر کامل کیا (شارع علیہ السلام نے) غسل: تین بار دھونے کو، اور بدن کے مَلنے کو، اور شکنوں کی دیکھ بھال کرنے کو مستحب قرار دیکر، اور ستر پوشی کی تاکید کر کے۔

تصحیح: اللهم إلا لمحافظة مطبوعہ اور تینوں مخطوطوں میں اللهم إلا المحافظة تھا۔ تصحیح مطبوعہ صدیقی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

حیاداری اور پردہ پوشی

حدیث ــــــ حضرت یَعلیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو کھلے میدان میں (ننگے) نہاتے دیکھا، تو آپ منبر پر چڑھے۔ خدا کی حمد وثنا کی اور فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ بہت حیادار، بہت پردہ پوش ہیں۔ وہ حیا اور پردہ کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص نہائے تو پردہ کرے'' (رواہ ابوداؤد والنسائی، مشکوٰۃ، باب الغسل، حدیث ۴۴۷)

تشریح: جب آنحضرت ﷺ کوئی اہم بات بیان فرمانا چاہتے تھے تو منبر پر چڑھ کر باقاعدہ تقریر فرماتے تھے پہلے اللہ کی حمد کرتے، پھر وہ بات بیان فرماتے جو مقصود ہوتی ــــ مذکورہ حدیث میں آپؐ نے جو بات بیان فرمائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حیاداری اور پردہ پوشی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اور بندوں سے مطلوب یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اللہ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کریں۔ پس جب وہ نہائیں تو پردہ کا اہتمام کر کے نہائیں۔

اس حدیث کے ذیل میں شاہ صاحب نے دو مسئلے بیان کئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

مسئلہ: (۱) لوگوں کی نگاہوں سے پردہ کرنا واجب ہے یعنی بیوی کے علاوہ کسی کے سامنے بے ضرورت ستر کھولنا

جائز نہیں۔

مسئلہ: (۲) مستحب یہ ہے کہ استنجاء اور غسل اس طرح کرے اور تنہائی میں اس طرح رہے کہ اگر کوئی شخص اچانک معتاد طریقے پر آجائے تو وہ ستر نہ دیکھے۔ یعنی پردہ اور آڑ کر کے قضائے حاجت کرے اور تنہائی میں بھی ستر ڈھانپے رکھے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن الله حَيِيٌّ سِتِّيرٌ" تفسيره قوله: " يحب الحياء والسِّتر" والسَّتر من أعين الناس واجب، وكونُه بحيث لو هجم إنسان بالوجه المعتاد لم ير عورته مستحب.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بیشک اللہ تعالیٰ بہت حیادار، بہت پردہ پوش ہیں'' اس کی تفسیر آپ کا یہ ارشاد ہے کہ: ''وہ حیا اور پردہ کو پسند کرتے ہیں'' اور لوگوں کی نگاہوں سے پردہ واجب ہے۔ اور آدمی کا اس طور پر ہونا مستحب ہے کہ اگر اچانک کوئی انسان معتاد طریقے پر آجائے تو اس کا ستر نہ دیکھے۔

غسلِ حیض میں خصوصی اہتمام کی وجہ

حدیث ——— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک انصاری خاتون نے آنحضرت ﷺ سے غسلِ حیض کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے اس کو غسل کا طریقہ بتایا۔ پھر فرمایا کہ (غسل سے فارغ ہوکر): ''مشک میں بسا ہوا کپڑے کا ٹکڑا لے، اور اس سے پاکی حاصل کرے'' اس نے پوچھا: اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس سے پاکی حاصل کر'' اس نے پوچھا: اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! اس سے پاکی حاصل کر'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور میں نے اس کو سمجھایا کہ اس سے خون کے نشان کا پیچھا کر یعنی اس کو خون کی جگہ میں (ستر میں) لگا (متفق علیہ، مشکوۃ، باب الغسل، حدیث نمبر ۴۳۷)

تشریح: غسلِ حیض سے فارغ ہوکر جو آنحضرت ﷺ نے مشک میں بسایا ہوا کپڑے کا ٹکڑا یا روئی کا پھاہا اندامِ نہانی وغیرہ پر لگانے کا حکم دیا ہے اس میں تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: اس عمل سے پاکی کی زیادتی مطلوب ہے۔ کیونکہ خوشبو بھی طہارت کا کام کرتی ہے یعنی طبیعت میں انبساط و سرور پیدا کرتی ہے۔ اور ہر غسل میں اس کا حکم اس لئے نہیں دیا کہ اس میں حرج تھا۔

دوسری حکمت: مشک کا پھاہا لگانے سے اس بدبو کا ازالہ مقصود ہے جس سے حیض کا کوئی خون خالی نہیں ہوتا۔ (پس خوشبودار کریم اور پاؤڈر بھی ان شاء اللہ کسی درجہ میں اس کا قائم مقام ہوجائے گا)

تیسری حکمت: حیض کا انقطاع اور طہر کی ابتداء طلبِ اولاد کا وقت ہے۔ اس وقت مرد وزن کا ایک دوسرے کی طرف میلان ہوتا ہے اور بچہ دانی میں بھی استقرار حمل کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ اور خوشبو اس قوت (مجامعت واستقرار) کو ابھارتی ہے۔ اس لئے خوشبو کے خصوصی اہتمام کا امر فرمایا ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "خُذی فِرْصَةً من مَسْكٍ فتطَهَّرِی بها" يعنی تَتَبَّعِی بها أثرَ الدم.
أقول: إنما أمر الحائض بالفِرْصةِ الممسَّكة لمعانٍ:
منها: زيادة الطهارة، إذ الطيبُ يفعل فعلَ الطهارة، وإنما لم يُسَنَّ فی سائر الأوقات احترازًا عن الحرج.
ومنها: إزالةُ الرائحة الكريهة التی لايخلو عنها الحيضُ.
ومنها: أن انقضاءَ الحيض والشروعَ فی الطهر وقتُ ابتغاء الولد، والطِّيْبُ يُهَيِّجُ تلك القوةَ.

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "تو مشک میں بسا ہوا کپڑے کا ٹکڑا لے، پھر اس سے پاکی حاصل کر" یعنی پیچھا کر تو اس سے خون کے نشان کا۔

میں کہتا ہوں: آپؐ نے بچند وجوہ حائضہ کو مشک میں بسا ہوا کپڑے کا ٹکڑا لینے کا حکم دیا ہے:

ان میں سے: پاکی کی زیادتی ہے، کیونکہ خوشبو طہارت کا کام کرتی ہے۔ اور ہر وقت میں مسنون نہیں کیا صرف تنگی سے بچتے ہوئے۔

اور ان میں سے: اس بدبو کو زائل کرنا ہے جس سے حیض خالی نہیں ہوتا۔

اور ان میں سے: یہ بات ہے کہ حیض کا گذرنا اور طہر کا شروع ہونا اولاد چاہنے کا وقت ہے۔ اور خوشبو اُس قوت کو ابھارتی ہے۔

☆ ☆ ☆

وضوء وغسل کے لئے پانی کی مقدار

حدیث ــــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ایک مُد سے وضوء کیا کرتے تھے، اور ایک صاع سے پانچ مُد تک غسل فرمایا کرتے تھے یعنی غسل میں زیادہ سے زیادہ سوا صاع اور کم سے کم ایک صاع پانی استعمال فرماتے تھے (متفق علیہ، مشکوۃ، حدیث ۴۳۹)

تشریح: مُد: ایک پیمانہ ہے۔ جس کا وزن ۷۸۷ گرام ہوتا ہے۔ اور صاع: چار مد کا ہوتا ہے۔ پس اس کا وزن تین

کلو ۱۴۸ گرام ہوگا۔ یعنی تقریباً ۸۰۰ گرام پانی آنحضرت ﷺ وضوء میں، اور تقریباً چار کلو تک پانی غسل میں استعمال فرماتے تھے۔ پانی کی یہ مقدار متوسط جسموں کے لئے کافی ہے۔ نہ کم ہے نہ زیادہ۔

جن خطوں میں پانی کم ہے، وہاں لوگ پانی میں کنجوسی کرتے ہیں۔ طہارت میں بھی پانی کم استعمال کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ حجاز میں بھی پانی کم تھا۔ مگر آپ پانی کی معتد بہ مقدار طہارت میں استعمال فرماتے تھے۔ اور جن علاقوں میں پانی کی فراوانی ہے، وہاں لوگ پانی کا اسراف کرتے ہیں۔ یہ بھی مناسب نہیں۔ پانی کی مسنون مقدار وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی۔

[۳] واختار الصاع إلى خمسة أمدادٍ للغسل، والمُدَّ للوضوء: لأن ذلك مقدار صالح فى الأجسام المتوسطة.

ترجمہ: (۳) اور آنحضرت ﷺ نے غسل کے لئے ایک صاع کو پانچ مد تک، اور وضوء کے لئے ایک مد پانی کو پسند فرمایا۔ اس لئے کہ پانی کی یہ مقدار کافی ہے متوسط جسموں کے لئے (یعنی ان اجسام کے لئے جو نہ بہت لمبے تڑنگے ہیں، نہ پتلے دُبلے)

☆ ☆ ☆

غسلِ جنابت میں اہتمام کی وجہ

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہر بال کے نیچے جنابت ہے۔ پس بالوں کو دھوؤ، اور کھال کو صاف کرو''[۱]

تشریح: جو بال کھال پر گرتا ہے اور اس کا جو حصہ کھال سے لگتا ہے، وہ بال کا نچلا حصہ ہے۔ اس میں جنابت ہے پس سارے بال کو دھونا ضروری ہے۔ اور وہ کھال کی جس مقدار کو اپنے تلے چھپاتا ہے وہ کھال بھی جنبی ہے۔ پس اس کو بھی دھونا ضروری ہے۔ غرض بال برابر جگہ بھی خشک رہ جائے گی تو غسل جنابت نہیں ہوگا۔

حدیث ——— حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس نے بال برابر جنابت چھوڑ دی، جس کو نہیں دھویا، تو اس جنابت کو ایسی اور ایسی آگ کی سزا دی جائے گی!'' حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے میں اپنے سر کا دشمن ہوگیا ہوں![۲] (یہ جملہ تین بار فرمایا) یعنی آپ ہمیشہ سر کے بال منڈواتے تھے، تاکہ غسل

[۱] رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۴۴۳ یہ حدیث حارث بن وجیہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ مگر آئندہ حدیث اس کے لئے شاہد صحیح ہے ۱۲

[۲] رواہ ابوداؤد واحمد والدارمی مشکوٰۃ حدیث نمبر ۴۴۴

جنابت میں کوئی بال خشک نہ رہ جائے ــــــ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ سر کے بال منڈوانا جائز ہے۔اگر چہ سنت بال رکھنا ہے۔کیونکہ آنحضرت ﷺ اور تین خلفائے راشدین، حج کے علاوہ بال نہیں منڈواتے تھے (مظاہر حق)

تشریح: ان حدیثوں کا راز بھی وہی ہے جو استیعابِ وضوء کے باب میں گذر چکا ہے اور اس کا خلاصہ تین باتیں ہیں:

پہلی بات: ہر ہر بال کا دھونا غسل کے معنی کو ثابت کرتا ہے یعنی جب سارا جسم اور جسم کا ہر ہر بال دُھل جائے گا تو ہی مکمل طور پر دھونا متحقق ہوگا۔اگر ذرا سا حصہ بھی خشک رہ گیا تو سارا جسم نہیں دُھلا۔

دوسری بات: آدمی کا جنابت کی حالت میں رہنا، اور اس کو دور نہ کرنے پر اصرار کرنا موجبِ نار خصلت ہے، اور طہارت موجبِ دخولِ جنت اور باعثِ کفارۂ سیئات خصلت ہے۔اس لئے بال برابر جگہ خشک رہ جانے پر جہنم کی وعید سنائی۔

تیسری بات: غسل جنابت میں جو جگہ خشک رہ گئی ہے، چونکہ غسل کرنے والے نے اس عضو میں حکم الٰہی کی مخالفت کی ہے، اس لئے اولاً یہی عضو معذب ہوگا، پھر اس کی وجہ سے سارا نفس رنجیدہ ہوگا ــــــ حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جسم کا صرف وہی حصہ معذب ہوگا۔بلکہ مطلب یہ ہے کہ نفس میں چونکہ بگاڑ اسی عضو کے خشک رہ جانے کی وجہ سے آیا ہے، اس لئے اولاً اور بالذات وہی عضو معذب ہوگا، پھر اس کی وجہ سے آدمی کا سارا وجود رنجیدہ ہوگا۔

[٤] قال النبي صلى الله عليه وسلم: "تحتَ كلِّ شعرة جنابة، فاغسلوا الشعر، وأنقوا البشرةَ" وقوله صلى الله عليه وسلم: "من ترك موضِعَ شعرة من الجنابة، لم يَغْسِلْهَا، فُعل بها كذا وكذا"

أقول: سِرُّ ذلك مثل ما ذكرناه في استيعاب الوضوء: من أنه تحقيق لمعنى الغَسل، وأن البقاء على الجنابة والإصرارَ على ذلك موجبة للنار، وأنه يظهر تألُّمُ النفس من قِبَلِ العضو الذي جاء منه الخلل.

ترجمہ: (۴) آنحضرت ﷺ کے دو ارشادات (جن کا ترجمہ گذر چکا)

میں کہتا ہوں: ان کا راز ویسا ہی ہے جیسا ہم استیعاب وضوء میں ذکر کر چکے: (۱) یعنی یہ بات کہ ہر ہر بال کو دھونا غسل کے معنی کو ثابت کرتا ہے (۲) اور یہ کہ جنابت پر باقی رہنا، اور اس پر اصرار کرنا جہنم کی سزا کو واجب کرنے والا ہے (۳) اور یہ بات کہ نفس کی رنجیدگی ظاہر ہوگی اس عضو کی جانب سے جس کی جانب سے خلل واقع ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۸

غسل واجب کرنے والی چیزوں کا بیان

موجباتِ غسل دو چیزیں ہیں: جنابت اور حیض۔ اور انزال کے بغیر ایلاج بحکم جنابت ہے۔ اور نفاس بحکم حیض ہے۔ اور جب حیض کے ساتھ بیماری کا خون (استحاضہ) مل جائے تو دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے کہ حیض کا زمانہ کونسا ہے اور استحاضہ کا کونسا؟

صحبت سے غسل کب واجب ہوتا ہے؟

حدیث ـــــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب وہ (مرد) بیٹھ گیا، اُس (عورت) کی چار شاخوں (شرمگاہ کے چار کونوں) کے سامنے، پھر عورت کو مشقت میں ڈالا یعنی پوری سپاری اندام نہانی میں داخل کردی، تو یقیناً غسل واجب ہوگیا، گو انزال نہ ہو" (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۳۰)

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: إذا جاوزَ الْخِتانُ الْخِتانَ وَجَبَ الغسلُ یعنی جب مرد کی ختنہ کی جگہ عورت کی ختنہ کی جگہ سے آگے بڑھ جائے یعنی پورا حشفہ اندام نہانی میں چھپ جائے تو غسل واجب ہوگیا"[1] (یہ حدیث شارح نے بڑھائی ہے)

حدیث ـــــــ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پیر کے دن قُبا گیا۔ جب ہم بنوسالم قبیلہ کے محلّہ میں پہنچے تو آپ ﷺ حضرت عِتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کے دروازے پر ٹھہرے، اور ان کو آواز دی۔ وہ لنگی گھسیٹتے نکلے۔ آپؐ نے فرمایا: أَعْجَلْنَا الرَّجلَ: ہم نے آدمی کو جلدی کرادی۔ حضرت عتبان نے دریافت کیا: "اگر کوئی شخص بیوی سے جلدی علحدہ ہوجائے، اور اس کو انزال نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: إنما الماء من الماء: پانی: پانی ہی سے ہے یعنی غسل کے لئے پانی استعمال کرنا اسی وقت واجب ہوتا ہے جب منی نکلے (رواہ مسلم ۴: ۳۶ مصری)

تشریح: روایات میں اختلاف ہے کہ اکسال بحکم جماع ہے یا نہیں؟ اکسال: باب افعال کا مصدر ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں: سست کرنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: صحبت شروع کرنے کے بعد عضو سست ہوجائے یا اور کوئی ناگہانی بات پیش آئے، اور آدمی بیوی سے علحدہ ہوجائے، اور انزال نہ ہو۔ یہ اکسال: جماع کامل کے حکم میں ہے یا نہیں؟ اور جماع

[1] رواہ الترمذی، وابن ماجہ، واحمد، وسندہ صحیح علی شرط الشیخین، مشکوٰۃ حدیث ۴۴۲

کامل سے مراد وہ جماع ہے جس میں حاجت پوری ہوجاتی ہے یعنی فراغت ہوجاتی ہے۔ پہلی اور دوسری روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیبوبتِ حشفہ سے غسل واجب ہوجاتا ہے، چاہے انزال نہ ہوا ہو۔ جمہور فقہاء بھی اس پر متفق ہیں۔

رہی یہ بات کہ پہلی دو حدیثوں میں اور تیسری حدیث میں تطبیق کیسے دی جائے؟ تو اس سلسلہ میں تین رائیں ہیں:

پہلی رائے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تیسری حدیث احتلام کے بارے میں ہے۔ اور پہلی دو حدیثیں صحبت کے بارے میں ہیں۔ اور جب موضوع مختلف ہوگیا تو تعارض ختم ہوگیا۔ مگر یہ توجیہ حدیث کے شانِ ورود کے خلاف ہے۔ حضرت عتبان کا واقعہ بیداری میں صحبت کا ہے۔ اور اسی واقعہ میں آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

دوسری رائے: حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے نزدیک تیسری حدیث منسوخ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ انزال ہی سے غسل لازم آنا: ابتدائے اسلام میں ایک سہولت تھی، جو بعد میں ختم کردی گئی (مشکوۃ حدیث ۴۴۸) ــــ مگر اکابر صحابہ: حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم سے، بلکہ خود حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف مروی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اگر کوئی صحبت کرے، اور انزال نہ ہو تو نماز والی وضوء کافی ہے۔ اور شرمگاہ کو پاک کرلے۔ اور یہ بات مرفوعاً بھی روایت کی گئی ہے۔ پس نسخ کی بات بھی دل کو نہیں لگتی۔

تیسری رائے: شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک تیسری حدیث مباشرتِ فاحشہ پر محمول ہے۔ کیونکہ اس پر بھی جماع کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مباشرتِ فاحشہ کے معنی ہیں: کپڑے کی آڑ کے بغیر شرمگاہ کو شرمگاہ سے لگانا، عضو کو ستر میں داخل کئے بغیر۔ ایسی صورت میں غسل اس وقت واجب ہوگا جب انزال ہوجائے، ورنہ نہیں۔ ممکن ہے حضرت عتبان نے اسی صورت پر جماع کا اطلاق کیا ہو۔

فائدہ: شارح کے نزدیک صحیح بات وہ ہے جو جمہور نے اختیار کی ہے یعنی تیسری حدیث منسوخ ہے۔ مگر وہ ایک جزئیہ میں معمول بہ ہے یعنی احتلام کا حکم اب بھی یہی ہے کہ انزال ہوگا تو غسل واجب ہوگا، ورنہ نہیں۔ حضرت ابن عباس کے قول کا یہی مطلب ہے۔

اور یہ قول بایں وجہ راجح ہے کہ دور فاروقی میں: اکسال کی صورت میں وجوب غسل پر صحابہ کا اجماع منعقد ہوگیا تھا۔ اور اکابر صحابہ کا اختلاف ختم ہوگیا تھا۔ جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار میں تفصیل سے یہ بات بیان کی ہے۔

اور اس کی تقریر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اصل حکم الماء من الماء ہے۔ اور یہی حکم ابتدائے اسلام میں تھا۔ اور صحبت کی صورت میں چونکہ بعض مرتبہ نزول ماء کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے اس مخفی امر کی جگہ ایلاج کو رکھ دیا۔ اور اس پر حکم دائر کیا۔ اور صحبت کے علاوہ باقی صورتوں میں حکم اپنی اصل پر باقی رہا۔ جیسے سفر میں قصر کی اصل علت مشقت ہے۔

مگر چونکہ مشقت کا کوئی معیار نہیں، اس لئے نفس سفر کو مشقت کے قائم مقام کردیا۔ اور حکم اس پر دائر کیا۔ اسی طرح اصل ناقض وضوء خروج ریح ہے۔ مگر نیند کی حالت میں اس کا ادراک نہیں ہوتا، اس لئے لیٹ کر سونے کو مظنہ (احتمالی جگہ) ہونے کی وجہ سے خروج ریح کا قائم مقام گردانا ہے اور اس پر حکم دائر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

﴿موجِباتُ الغُسل﴾

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إذا جلس بين شُعبِها الأربع، ثم جَهَدَها، فقد وجب الغسل، وإن لم يُنْزِلْ"

أقول: اختلفت الرواية: هل يُحْمَل الإكسالُ — أى الجماعُ من غير إنزال — على الجماع الكامل فى معنى قضاء الشهوة، أعنى مايكون معه الإنزال؟ والذى صحَّ روايةً — وعليه جمهور الفقهاء — هو: أن من جَهَدَهَا فقد وجب عليهما الغسلُ، وإن لم يُنزل.

واختلفوا فى كيفية الجمع بين هذا الحديث، وحديثِ: "إنما الماء من الماء"، فقال ابن عباس: إنما الماء من الماء فى الاحتلام؛ وفيه ما فيه. وقال أُبَيٌّ: إنما كان الماء من الماء رخصةً فى أول الإسلام، ثم نُهى.

وقد رُوى عن عثمان، وعلى، وطلحة، والزبير، وأبىّ بن كعب، وأبى أيوب — رضى الله عنهم — فيمن جامع امرأته، ولم يُمْنِ، قالوا: يتوضأ كمايتوضأ للصلاة، ويَغْسل ذَكَرَه، ورُفِع ذلك إلى النبى صلى الله عليه وسلم.

ولا يبعد عندى: أن يُحْمل ذلك على المباشرة الفاحشة، فإنه قد يُطلق الجماعُ عليها.

ترجمہ: غسل کو واجب کرنے والی چیزیں: (۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بیٹھ گیا وہ الخ۔

میں کہتا ہوں: روایتیں مختلف ہیں: آیا اِکسال — یعنی انزال کے بغیر صحبت — کو محمول کیا جائے قضائے شہوت کے معنی میں کامل جماع پر، مراد لیتا ہوں میں اس جماع کو جس کے ساتھ انزال ہے اور جو بات روایت سے ثابت ہے — اور جس پر جمہور فقہاء ہیں — وہ یہ ہے کہ جس نے مشقت میں ڈالا عورت کو تو یقیناً اس پر غسل واجب ہوگیا، اگرچہ انزال نہ ہوا ہو۔

اور اختلاف کیا ہے انھوں نے تطبیق کے طریقہ میں: اس حدیث کے درمیان، اور حدیث: إنما الماء من الماء کے درمیان: پس ابن عباس نے فرمایا کہ حدیث إنما الماء من الماء احتلام کے حق میں ہے۔ اور اس میں وہ بات ہے جو اس میں ہے یعنی یہ توجیہ شانِ ورود کے خلاف ہے۔ اور اُبی نے فرمایا کہ انزال ہی سے غسل لازم آنا یہ ابتدائے

اسلام میں ایک سہولت تھی۔ پھر روک دیا گیا۔

اور تحقیق روایت کیا گیا ہے عثمان و علی وطلحہ وزبیر واُبی بن کعب وابی ایوب رضی اللہ عنہم سے: اس شخص کے بارے میں جو اپنی عورت سے جماع کرے اور وہ منی نہ ڈالے؟ کہا انھوں نے وضوء کرے وہ جس طرح وہ نماز کے لئے وضوء کرتا ہے۔ اور وہ اپنے پیشاب کے عضو کو دھولے۔ اور اٹھائی گئی ہے یہ بات رسول اللہ ﷺ کی طرف۔

اور بعید نہیں میرے نزدیک کہ محمول کی جائے وہ حدیث مباشرتِ فاحشہ پر۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ کبھی جماع کا اطلاق کیا جاتا ہے مباشرتِ فاحشہ پر۔

لغات: شُعَب جمع ہے شُعبۃ کی بمعنی شاخ، کنارہ ...... جَهَدَ فلانًا: بلغ مشقّته (معجم وسیط) ...... أَمْنٰى إِمْنَاءً: بہانا، گرانا۔

تصحیح: فی الاحتلام تمام نسخوں میں للاحتلام تھا۔ تصحیح مشکوٰۃ شریف سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

بدخوابی سے اس وقت غسل واجب ہوتا ہے، جب تری پائے

حدیث —— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو تری پاتا ہے، اور اس کو خواب یاد نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ: ''وہ غسل کرے'' اور اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو دیکھتا ہے کہ اس کو احتلام ہوا ہے، اور وہ تری نہیں پاتا؟ آپ نے فرمایا کہ: ''اس پر غسل نہیں ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۴۱)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے دو وجہ سے وجوبِ غسل کا حکم تری پر دائر کیا ہے۔ خواب پر دائر نہیں کیا:

پہلی وجہ: بدخوابی دو طرح کی ہوتی ہے: کبھی محض خیال ہوتا ہے۔ جس کا وجوبِ غسل میں کوئی دخل نہیں۔ اور کبھی بدخوابی میں شہوت پوری ہوتی ہے یعنی انزال ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں لامحالہ تری موجود ہوگی۔ پس تری ہی پر حکم کا مدار رکھا جاسکتا ہے۔

دوسری وجہ: تری ایک ایسی واضح چیز ہے جس کا تعین ہوسکتا ہے، کیونکہ خواب تو بارہا آدمی بھول جاتا ہے۔ اس لئے وجوبِ غسل کا مدار تری پر ہے خواب پر نہیں ہے[1]

(۱) تری پانے جانے کی صورت میں چودہ احتمال ہیں: یا منی کا یقین ہے، یا مذی کا، یا ودی کا، یا اول دو میں شک ہے، یا اخیر دو میں، یا طرفین میں، یا تینوں میں۔ یہ کل سات احتمال ہوئے۔ پھر ہر صورت میں خواب یاد ہے یا نہیں۔ پس کل چودہ صورتیں ہوئیں۔ ان میں سے چار صورتوں میں بالاتفاق غسل واجب نہیں ہے: ایک: جبکہ مذی کا یقین ہو، اور خواب یاد نہ ہو۔ دوم وسوم: جبکہ ودی کا یقین ہو، اور خواب یاد ہو یا نہ ہو۔ چہارم: مذی اور ودی میں شک ہو، اور خواب یاد نہ ہو۔ اور تین صورتوں میں طرفین کے نزدیک غسل واجب ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک واجب نہیں: اول: منی اور مذی میں شک ہو اور خواب یاد نہ ہو دوم: منی اور ودی میں شک ہو، اور خواب یاد نہ ہو۔ سوم: منی، مذی اور ودی میں شک ہو، اور خواب یاد نہ ہو۔ باقی سات صورتوں میں بالاتفاق غسل واجب ہے (حاشیہ امداد الفتاوی ۱: ۵۰)

[۲] وسُئل النبى صلى الله عليه وسلم عن الرجل يَجِدُ البلل، ولا يذكر الاحتلام؟ قال: "يغتسل"، وعن الرجل الذى يَرى أنه قد احتلم، ولايجد بللا؟ قال: " لاغسل عليه"
أقول: إنما أدار الحكم على البلل، دون الرؤيا: لأن الرؤيا تكون تارة حديثَ نفسٍ، ولا تأثير له، وتارة: تكون قضاءَ شهوةٍ، ولاتكون بغير بَلَلٍ، فلايصلح لإدارة الحكم إلا البلل.
وأيضًا: فإن البللَ شيئٌ ظاهرٌ، يصلح للانضباط، وأما الرؤيا: فإنها كثيرًا ما تُنسٰى.

ترجمہ: اور رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا الی آخرہ۔ میں کہتا ہوں: آپ ﷺ نے حکم تری ہی پر دائر کیا، نہ کہ خواب پر: اس لئے کہ خواب کبھی دل کی بات (خیال) ہوتا ہے۔ اور کوئی اثر اندازی نہیں اس (خیال) کے لئے۔ اور کبھی خواب قضائے شہوت ہوتا ہے۔ اور وہ تری کے بغیر نہیں ہوتا۔ پس حکم دائر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی مگر تری ـــــ اور نیز: پس بیشک تری ایک واضح چیز ہے، جو تعین کے قابل ہے۔ اور رہا خواب: تو وہ بار ہا بھلا دیا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

حیض وطہر کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت

احناف: کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت تین رات دن ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت دس رات دن ہے۔ پس اگر اقل مدت سے کم خون آکر بند ہو جائے، یا اکثر مدت سے زیادہ جاری رہے، تو وہ استحاضہ (بیماری کا خون) ہے۔ اور شوافع اور حنابلہ: کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت ایک رات دن ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے۔ ان حضرات کے یہاں سترہ دن کی بھی روایت ہے۔ اور مالکیہ: کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت کچھ نہیں۔ ذرا سا خون آکر بند ہو جائے تو بھی حیض ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت میں تفصیل ہے، جو ان کی کتابوں سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

اور کم سے کم طہر بالاجماع پندرہ دن ہے یعنی دو خونوں کے درمیان پندرہ دن یا زیادہ عورت پاک رہی ہو، تو وہ خون الگ الگ حیض ہیں۔ اور اگر اس سے کم پاک رہی ہو تو وہ طہر متخلل ہے اور دونوں خون مسلسل شمار ہوں گے۔ اور طہر کی زیادہ سے زیادہ مدت بالاجماع متعین نہیں۔ دو حیضوں کے درمیان سالوں کا فاصلہ بھی ہوسکتا ہے۔

اور حیض کی مدت کے سلسلہ میں احناف کا مستدل وہ روایت ہے جو چھ صحابہ سے مروی ہے۔ جس کی تخریج نصب الرایہ (۱۹۱:۱) میں کی گئی ہے۔ یہ روایت اگرچہ تمام طرق سے ضعیف ہے، مگر تعددِ اسانید سے قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کوئی روایت اس کے خلاف نہیں ہے پس اس کا اعتبار کیا جانا چاہئے۔ خود شاہ صاحب نے پہلے یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ

جب روایات میں ترجیح کا معاملہ درپیش ہوتو ضعف کا اعتبار ہوگا۔ ورنہ فی نفسہ استدلال میں معمولی ضعف مانع نہیں۔

مگر ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ نے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث سے استدلال نہیں کیا۔ انھوں نے عورتوں کے احوال کا جائزہ لے کر مدت طے کی ہے۔ شاہ صاحب کی رائے امام مالک رحمہ اللہ کی رائے سے ملتی جلتی ہے۔ فرماتے ہیں:

حیض اور طہر کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم مدت عورت کے مزاج، خوراک اور اس قسم کی دیگر چیزوں کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔ اور دونوں کے لئے کوئی ایسی عام مدت متعین کرنا ممکن نہیں جو سب عورتوں کو شامل ہو جائے۔ پس اصح یہی ہے کہ اس سلسلہ میں عورتوں کی عادت کی طرف رجوع کیا جائے۔ خود عورت جس خون کو حیض خیال کرے وہ حیض ہے۔ اور جس خون کو بیماری کا خون خیال کرے وہ استحاضہ ہے اور صحابہ و تابعین کے اقوال میں جو اختلاف ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے عورتوں کے احوال کا جائزہ لیا ہے اور ایک تخمینہ قائم کیا ہے۔

[۳] ولاشك أن طـولَ مـدة الطهر والحيض، وقِصَرَهَا يختلفان باختلاف المزاج والغذاء ونحوهما، ولايكادان يُضبطان بشيئٍ مُطَّرِدٍ، فلا جرم أن الأصح هوالرجوع إلى عادتهن، فإذا رأين: أنه حيض، فهو حيضٌ، وإذا رأين: أنه استحاضة فهو استحاضة. واختلاف الصحابة والتابعين في ذلك، منشؤه: الاستقراء والتقريب.

ترجمہ: (۳) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حیض اور طہر کی مدت کی درازی اور اس کی کمی: دونوں مختلف ہوتے ہیں مزاج، غذا اور ان کے مانند امور کے اختلاف سے۔ اور نہیں قریب ہیں دونوں کہ منضبط کئے جائیں کسی عام چیز کے ذریعہ۔ پس یقیناً یہ بات ہے کہ اصح رجوع کرنا ہے عورتوں کی عادت کی طرف۔ پس جب دیکھیں وہ کہ وہ خون حیض ہے تو وہ حیض ہے۔ اور جب دیکھیں وہ کہ وہ خون بیماری کا خون ہے تو وہ استحاضہ ہے۔ اور صحابہ و تابعین کا اس سلسلہ میں اختلاف: اس کا منشا (پیدا ہونے کی جگہ): جائزہ لینا اور تخمینہ قائم کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

مستحاضہ: اپنے حیض کو کس طرح جدا کرے؟

حدیث —— حضرت حَمنہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھے بہت ہی زیادہ خون آتا تھا۔ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مسئلہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوئی۔ آپؐ اتفاق سے میری بہن زینب رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے بہت ہی زیادہ خون آتا ہے۔ آپؐ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ میں نہ تو نماز کی رہی نہ روزے کی! آپؐ نے فرمایا: ''میں آپ کو روئی استعمال کرنے کا مشورہ دیتا ہوں، امید ہے کہ اس سے خون رک جائے

گا'' یعنی روئی کی بتی بنا کر اندام نہانی میں رکھ لی جائے۔ روئی میں خون روکنے کی خاصیت ہے۔ حضرت حمنہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ: وہ اس سے زیادہ ہے یعنی روئی سے تھوڑا خون رک سکتا ہے۔ مجھے تو بہت زیادہ خون آتا ہے۔ روئی سے اس کا علاج نہیں ہوسکتا۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو (روئی رکھ کر) لنگوٹ کس لو'' (لنگوٹ باندھنے سے جسم کَس جاتا ہے۔ پس یہ بھی خون روکنے کا علاج ہے) انھوں نے عرض کیا: وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو کپڑا رکھ لو'' یعنی روئی رکھ کر، اوپر کپڑا دوہرا چوہرا کر کے رکھ لیا جائے، پھر لنگوٹ باندھ لی جائے تو خاص جسم دبے گا اور خون رُکے گا۔ حضرت حمنہؓ نے عرض کیا: وہ اس سے بھی زیادہ ہے، مجھے تو دھڑ دھڑ خون گرتا ہے! آپؐ نے فرمایا: ''ابھی میں تمھیں دو باتیں (علاج) بتاتا ہوں۔ اُن میں سے جس پر بھی عمل کروگی کافی ہوجائے گا۔ اور اگر دونوں پر عمل کرسکو تو تم بہتر جانتی ہو'' یعنی دونوں علاجوں میں سے جس کو چاہو اختیار کرو۔

آنحضرت ﷺ نے اُن سے فرمایا: ''یہ خون بس شیطان کی ایک ایڑ ہے'' یعنی بیماری کا خون ہے۔ حیض کا خون نہیں ہے۔ ''پس خود کو چھ یا سات دن حائضہ سمجھو (صحیح صورتِ حال) اللہ کے علم میں ہے۔ پھر نہالو۔ یہاں تک کہ جب دیکھو کہ خوب پاک ہوگئیں اور صاف ہوگئیں تو ۲۳ دن یا ۲۴ دن نماز پڑھو اور روزے رکھو۔ پس بیشک یہ بات آپ کے لئے کافی ہے۔ اور اسی طرح ہر ماہ کرو: جس طرح عورتوں کو حیض آتا ہے، اور جس طرح وہ پاک ہوتی ہیں، ان کے حیض اور طہر کے وقت میں'' (یہ تو آپؐ نے اُن کو استحاضہ کا مسئلہ بتایا۔ پھر ان کو وہ دو علاج بتائے جس کا آپؐ نے وعدہ فرمایا تھا۔ راوی نے ایک کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے، جو دوسری حدیثوں میں آیا ہے۔ اور وہ روزانہ پانچ مرتبہ ہر نماز سے پہلے نہانا ہے۔ اور دوسرا علاج روزانہ تین مرتبہ نہانا ہے۔ فرمایا:)

''اگر ایسا کرسکو کہ ظہر کو مؤخر کرو، اور عصر کو جلدی پڑھو، تو نہاؤ اور دونوں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھو۔ اور مغرب کو مؤخر کرو اور عشاء کو جلدی پڑھو، تو نہاؤ اور دونوں نمازوں کو جمع کرو، ایسا کرسکو تو ایسا کرو، اور فجر کے لئے علحدہ نہاؤ۔ اور روزے رکھو'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دو باتوں میں سے مجھے زیادہ پسند ہے'' کیونکہ روزانہ پانچ مرتبہ نہانا دشوار ہے اور تین بار نہانا نسبۃً آسان ہے (رواہ احمد، وابوداؤد، والترمذی، مشکوٰۃ حدیث ۵۶۱ باب المستحاضہ)

تشریح: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اس حدیث کی جو شرح فرمائی ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے پہلے چند باتیں عرض ہیں:

پہلی بات: مذکورہ روایت عبداللہ بن محمد بن عَقیل کی روایت ہے۔ یہ راوی صدوق (سچا) ہے مگر اس کا حافظہ کمزور تھا۔ اس وجہ سے اس سے بعض روایات میں وہم ہوگیا ہے۔ مذکورہ حدیث کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: حدیثُ ابنِ عَقیل فی نفسی منه شیئ (ابوداؤد مصری حدیث ۲۸۷) یعنی ابن عقیل کی مذکورہ حدیث پر دل نہیں ٹھکتا۔ شاید اُن سے اس حدیث میں کچھ وہم ہوگیا ہے وہ وہم یہی ہے کہ انھوں نے دو باتوں میں سے پہلی بات کو چھوڑ دیا ہے۔

اور وہ روزانہ پانچ بار غسل کرنے کا امر ہے اس امر اول کو چھوڑ دینے کی وجہ سے حدیث فہمی میں غلطی ہوگئی ہے۔ اور آپ ﷺ نے جو حمنہؓ کو مستحاضہ کا مسئلہ سمجھایا ہے اس کو امر اول سمجھ لیا گیا ہے۔

دوسری بات: احناف تمیز بالدم کا اعتبار نہیں کرتے اور ائمہ ثلاثہ اس کا اعتبار کرتے ہیں (شاہ صاحب نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے) اس لئے احناف کے نزدیک مستحاضہ کی تین قسمیں ہیں: مُبتدأہ، مُعتادہ اور مُتحیِّرہ۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چار قسمیں ہیں: (۱) معتادہ غیر ممیّزہ (جس کی عادت بنی ہوئی ہے اور وہ خون کے رنگ سے تمیز نہیں کر سکتی) (۲) ممیّزہ غیر معتادہ (جس کی کوئی عادت قائم نہیں ہوئی، مگر وہ خون کے رنگ سے تمیز کر سکتی ہے) (۳) معتادہ ممیّزہ (جس کی عادت بھی ہے اور وہ خون کے رنگ سے تمیز بھی کر سکتی ہے) (۴) غیر معتادہ غیر ممیّزہ (جس کی نہ کوئی عادت ہے، نہ وہ رنگ سے تمیز کر سکتی ہے) اسی کو متحیرہ بھی کہتے ہیں۔ پھر اس کے تین حالات ہیں۔ تفصیل طویل ہے۔ ابن قدامہ کی مُغنی میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تیسری بات: مہرِ مثل کی طرح حیضِ مثل کا اعتبار ہے یا نہیں؟ احناف اعتبار نہیں کرتے بعض لوگ اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ مذکورہ حدیث میں جو چھ یا سات دن کا تذکرہ آیا ہے اس کو بعض حضرات تحری کرنے کا حکم قرار دیتے ہیں۔ اور بعض حیضِ مثل پر محمول کرتے ہیں۔

چوتھی بات: تمام فقہاء مستحاضہ کے لئے پاکی کے ایام میں ہر نماز کے لئے یا ہر نماز کے وقت کے لئے وضوء ضروری قرار دیتے ہیں۔ پانچ یا تین غسل کے امر کو علاج پر محمول کرتے ہیں۔ مگر متحیرہ کے لئے بعض صورتوں میں ہر نماز سے پہلے غسل ضروری قرار دیتے ہیں۔

اب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

استحاضہ کے بارے میں یہ بنیادی بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ بیماری کا خون ہے۔ یہ تندرست عورتوں کو جو خون آتا ہے، وہ نہیں ہے۔ اور حیض کی مدت متعین ہے مگر استحاضہ کا زمانہ متعین نہیں۔ یہ خون سالوں تک بھی جاری رہ سکتا ہے۔ اور لمبی مدت تک نماز کو چھوڑ دینا نماز کو رائیگاں کرنا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے مستحاضہ کو حیض کا زمانہ الگ کر لینے کا حکم دیا، تاکہ وہ حیض کے زمانہ میں نماز چھوڑ دے، اور باقی دنوں میں نماز ادا کرے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت حَمنہؓ کو دو باتیں بتائیں:

پہلی بات: یہ بتائی کہ استحاضہ کسی رگ کا خون ہے یعنی وہ کوئی پیچیدہ بیماری ہے۔ اور یہ خون نکسیر کے خون کی طرح ہے۔ حیض کا خون نہیں ہے۔ پس اگر عورت تندرستی کے زمانہ میں معتادہ تھی یعنی اس کی حیض کی اور پاکی کی عادت مقرر تھی تو وہ اسی کا اعتبار کرے گی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق خود کو حائضہ سمجھے گی۔ اور جب وہ دن گذر جائیں گے تو خود کو پاک تصور کرے گی۔ اور نماز روزہ شروع کر دے گی۔ وہ ہر ماہ ایسا ہی کرتی رہے گی۔ اور اس طرح وہ اپنے حیض کو

استحاضہ سے جدا کرلے گی۔اور اگر وہ ممیّزہ ہے تو خون کے رنگ کے ذریعہ اپنے حیض کو جدا کرے گی یعنی اقوی خون مثلاً سیاہ خون کو حیض سمجھے گی۔اور ضعیف خون مثلاً پیلا خون آنے لگے تو خود کو پاک تصور کرے گی۔اور نہا کر نماز روزہ شروع کردے گی۔

دوسری بات: یہ بتلائی کہ استحاضہ چونکہ بگڑا ہوا حیض ہے اس لئے مستحاضہ کے لئے روزانہ پانچ مرتبہ غسل ضروری ہے۔اور اس میں دشواری محسوس کرے تو تین بار غسل کرے۔اور چونکہ یہ صحیح حیض نہیں بلکہ بگڑا ہوا ہے اس لئے نماز معاف نہیں۔وہ اسی حالت میں نماز پڑھے گی اور روزے بھی رکھے گی۔

اور روئی اور لنگوٹ باندھنے میں دو حکمتیں ہیں: اول: یہ ایک علاج ہے۔اس سے خون کی آمد رک جائے گی۔دوم: عورت کا بدن اور کپڑے خراب نہیں ہوں گے۔

[٤] واستفتت حَمْنَةُ في الاستحاضة، فأمرها بالكُرسُف والتلجُّم، وخَيَّرها بين أمرين إلخ.

أقول: الأصل في ذلك: أنه صلى الله عليه وسلم لما رأى أن الاستحاضةَ ليست من الأمور الصِحِّيَّة، وتركَ الصلاة فيها يؤدي إلى إهمالها مدة مديدة، أراد أن يُحْمِلَها على الأمر المعروف عندهم، فبدا وجهان:

أحدهما: أنها عِرق، أي: داءٌ خفيُّ المأخذِ، وليست حيضةً، بمنزلة الرعاف، فردَّها إلى ما كان في الصحَّة من حيضها وطهرها في كل شهر، ولا بد حينئذ من تمييز الحيضة عن غيرها: إما باللون: فالأقوى كالأسود للحيض، أو بأيامها المعروفة عندها.

والثاني: أنها حيضة فاسدة، فلكونها حيضة ينبغي أن تؤمر بالغسل عند كل صلاة، وإن تعذَّر فعند كل صلاتين؛ ولكونها فاسدةً لم تمنع الصلاةَ.

والحكمةُ في الكرسف والتلجُّم: أن يُلْحِق الدمُ بما استقر في مكانه، لايَعْدُوْهُ، ولئلا يُصيب بدنها وثيابها، وأفتى جمهور الفقهاء بالأول، إلا عند تعذُّره.

ترجمہ: (۴) اور مسئلہ دریافت کیا حمنہؓ نے استحاضہ کے بارے میں۔پس آپ نے ان کو روئی اور لگام باندھنے کا حکم دیا۔اور اختیار دیا ان کو دو باتوں میں الخ۔(یہ دونوں باتیں حدیث میں مذکور نہیں ہیں۔ان میں سے ایک بات ذکر کی گئی ہے)

میں کہتا ہوں: استحاضہ کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ استحاضہ امور صحت میں سے نہیں ہے اور استحاضہ میں نماز چھوڑ دینا ایک مدت دراز تک، نماز کو رائیگاں کرنے کی طرف پہنچاتا ہے، تو آپؐ

نے چاہا کہ استحاضہ کو اس امر پر محمول کریں جوان کے نزدیک معروف تھا۔ پس دو صورتیں ظاہر ہوئیں:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ استحاضہ ایک رگ ہے یعنی کوئی پیچیدہ روگ ہے۔ اور وہ حیض نہیں ہے، بمنزلۂ نکسیر ہے۔ پس آپؐ نے اس کو پھیر دیا اس بات کی طرف جو تندرستی میں تھی، اس کے حیض اور اس کے طہر سے ہر مہینہ میں۔ اور ضروری ہے اس وقت حیض کو اس کے علاوہ سے جدا کرنا: یا تو رنگ کے ذریعہ۔ پس قوی تر جیسے سیاہ خون حیض کے لئے ہے۔ یا عورت کے ان ایام کے ذریعہ جو اس کے نزدیک معروف تھے۔

اور دوسری: یہ کہ استحاضہ فاسد حیض ہے۔ پس اس کے حیض ہونے کی وجہ سے مناسب یہ ہے کہ وہ حکم دی جائے ہر نماز کے وقت نہانے کا۔ اور اگر یہ بات دشوار ہو تو ہر دو نمازوں کے لئے۔ اور اس حیض کے فاسد ہونے کی وجہ سے نہیں روکا اس نے نماز کو۔

اور روئی اور لنگوٹ باندھنے میں حکمت یہ ہے کہ (۱) خون مل جائے اُس خون کے ساتھ جو ٹھہرا ہوا ہے اس کی جگہ میں، نہ تجاوز کرے وہ اس سے یعنی خون کی آمد رک جائے (۲) اور تا کہ خون عورت کے بدن اور کپڑوں کو نہ لگے ——— اور جمہور فقہاء نے پہلی بات پر فتوی دیا ہے، مگر اس کے دشوار ہونے کی صورت میں (اس عبارت کا مطلب واضح نہیں)

☆ ☆ ☆

باب ——— ۹

جنبی اور بے وضوء کے لئے کیا کام جائز ہیں اور کیا ناجائز؟

بے وضوء قرآن کو چھونا، نماز پڑھنا اور کعبہ کا طواف کرنا جائز نہیں۔ البتہ زبانی قرآن پاک پڑھنا جائز ہے۔ اور جنابت کی حالت میں نہ تو قرآن پڑھنا جائز ہے اور نہ جنبی اور حائضہ کے لئے مسجد میں جانا درست ہے۔ کیونکہ نماز، کعبہ اور قرآن شعائر اللہ میں سے ہیں۔ اور شعائر اللہ کی تعظیم واجب ہے۔ اور سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ کامل طہارت کے ساتھ ہی ان سے قُرب ہو یعنی پہلے کوئی ایسا عمل کر لیا جائے جس سے نفس چوکنا ہو جائے یعنی وضوء وغسل کر لیا جائے، جس سے نفس کو شعائر اللہ کی عظمت وحرمت یاد آجائے۔ اس حکمت سے مذکورہ شعائر ثلاثہ سے نزدیک ہونے کے لئے کامل طہارت ضروری ہوئی ہے۔

البتہ قرآن پڑھنے کے لئے وضوء ضروری نہیں۔ بے وضوء بھی قرآن پڑھنا جائز ہے۔ کیونکہ قرآن پڑھنے کا کوئی وقت متعین نہیں ہے۔ کسی بھی وقت آدمی قرآن پڑھ سکتا ہے۔ اور دیر تک پڑھنے میں مشغول رہ سکتا ہے۔ پس ہمہ وقت قرآن پڑھنے کے لئے وضوء ضروری قرار دینے میں حفظِ قرآن اور اس کی تعلیم وتعلم میں خلل پڑے گا۔ جبکہ ان کاموں

کا دروازہ کھولنا، ان کاموں کی ترغیب دینا اور قرآن حفظ کرنے والوں کے لئے آسانی کرنا ضروری ہے۔

البتہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت چونکہ دائمی اور دراز نہیں۔ اور یہ ناپاکی بھی سخت ہے۔ اس لئے جنابت اور حیض ونفاس کی حالت میں زبانی قرآن پڑھنا بھی جائز نہیں۔ نہ جنبی اور حائضہ کے لئے مسجد میں جانا درست ہے۔ اس لئے کہ مسجد ذکر ونماز کے لئے ہے اور یہ لوگ نماز نہیں پڑھ سکتے، پھر مسجد میں کیوں جائیں؟! نیز مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور کعبہ کے قبیل سے ہے پس اس کے احترام کے باب سے یہ بات ہے کہ یہ لوگ اس میں داخل نہ ہوں۔

سوال: پہلے مبحث پنجم کے باب ہفتم (رحمۃ اللہ ا:۷۰۹) میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بڑے شعائر اللہ چار ہیں: قرآن، کعبہ، نماز اور نبی۔ اور نبی کی نزدیکی یعنی ہم نشینی کے لئے طہارت شرط نہیں۔ جنابت کی حالت میں بھی نبی کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔ اس سے مصافحہ کرسکتے ہیں، یہ کیا بات ہے؟ یہاں شعائر اللہ کی تعظیم والا قاعدہ کیوں جاری نہیں ہوا؟

جواب: بیشک نبی شعائر اللہ میں سے ہے۔ اور شعائر اللہ کی تعظیم واجب ہے۔ مگر ہر معظَّم کی تعظیم اس کے مناسبِ حال ہوتی ہے۔ نبی کی تعظیم یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ ادب واحترام ملحوظ رکھا جائے۔ اس کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اسکی شان میں گستاخی اور بے ادبی نہ کی جائے، حتی کہ اس کے سامنے بلند آواز سے بولا بھی نہ جائے۔ مگر ہم نشینی کے لئے طہارت کو ضروری قرار دینا نبی کے مناسبِ حال نہیں۔ کیونکہ نبی بھی ایک انسان ہے۔ اور جو احوال انسانوں کو پیش آتے ہیں، وہ نبی کو بھی پیش آتے ہیں یعنی اس کو بھی حدث اصغر واکبر دونوں لاحق ہوتے ہیں۔ پس اس کی ہم نشینی کے لئے طہارت کو شرط قرار دینا قلبِ موضوع ہے یعنی برعکس معاملہ ہے کہ معظَّم یعنی بزرگ تو بے وضوء، بلکہ بے غسل ہو، اور معظِّم (تعظیم کرنے والے) کے لئے طہارت ضروری ہو۔

﴿ما يُباح للجنب والمُحْدِث، وما لايُباحُ لهما﴾

لما كان تعظيمُ شعائر الله واجبًا، ومن الشعائر الصلاة والكعبة والقرآن، وكان أعظمُ التعظيم أن لايَقْرُبَ منه الإنسان إلا بطهارة كاملة، وتَنَبُّهِ النفس بفعل مستأنف، وجب أن لايقربها إلا متطهِّر.

ولم يُشترَط الوضوء لقراءة القرآن: لأن التزام الوضوء عند كل قراءة يُخِلُّ في حفظ القرآن وتلقِّيه، ولابد من فتح هذا الباب، والترغيب فيه، والتخفيفِ على من أراد حفظَه.

ووجب أن يُؤَكَّدَ الأمرُ في الحدث الأكبر، فلايَجُوْزُ نفسُ القراءة أيضًا، ولا أن يَدْخُلَ المسجدَ جنبٌ أو حائض، لأن المسجد مُهَيَّأٌ للصلاة والذكر، وهو من شعائر الإسلام، ونموذج الكعبة.

ولـم تُشترط الطهارةُ في مجالسة النبي صلى الله عليه وسلم: لأن كل شيئ له تعظيم يناسبه، وكـان بشـرًا يَعْرُوْه من الأحداث والجنابة ما يَعْرُو البشر، فكان اشتراط الطهارة في ذلك قلبًا للموضوع.

ترجمہ: ان امور کا بیان جو جنبی اور بے وضوء کے لئے مباح کئے گئے ہیں، اور جو مباح نہیں کئے گئے: جبکہ شعائر اللہ کی تعظیم واجب تھی۔ اور منجملہ شعائر اللہ: نماز، کعبہ اور قرآن ہیں۔ اور سب سے بڑی تعظیم یہ تھی کہ نہ نزدیک ہو اس سے انسان مگر کامل پاکی کے ساتھ، اور کسی نئے عمل کے ذریعہ نفس کو چوکنا کرنے کے ساتھ، تو ضروری ہوا کہ نہ نزدیک ہو اُن (شعائر ثلاثہ) سے مگر نہایت پاک آدمی۔

اور وضوء شرط نہیں کی گئی قرآن پڑھنے کے لئے، اس لئے کہ ہر وقت قرآن پڑھنے کے ساتھ وضوء کا التزام کرنا حفظِ قرآن اور اس کے سیکھنے میں خلل انداز ہوگا، جبکہ یہ دروازہ کھولنا، اور اس کی ترغیب دینا اور جو شخص قرآن یاد کرنا چاہتا ہے اس کے لئے آسان کرنا ضروری ہے۔

اور ضروری ہے کہ معاملہ مؤکد کیا جائے حدثِ اکبر میں، پس جائز نہ رکھا جائے خود پڑھنا بھی، اور نہ یہ کہ جنبی یا حائضہ مسجد میں داخل ہوں، اس لئے کہ مسجد تیار کی ہوئی ہے نماز و ذکر کے لئے۔ اور مسجد شعائر اللہ میں سے ہے۔ اور کعبہ کا نمونہ ہے۔

اور نبی کی ہم نشینی میں طہارت شرط قرار نہیں دی گئی، اس لئے کہ ہر چیز کی تعظیم اس کے مناسبِ حال ہوتی ہے۔ اور تھا نبی ایک بشر، پیش آتے ہیں اس کو حدث و جنابت میں سے جو پیش آتے ہیں بشر کو، پس ہم نشینی میں طہارت کو شرط قرار دینا قلبِ موضوع ہے۔

لغت: عَرَا یَعْرُو عَرْوًا: پیش آنا۔

☆ ☆ ☆

جہاں تصویر، کتا یا جنبی ہو، وہاں فرشتے نہیں آتے

حدیث ـــــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں صورت یا کتا یا جنبی ہوتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۳ باب مخالطة الجنب)

تشریح: اس جگہ فرشتوں کے نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ پاک مخلوق ہیں، پاکی کو پسند کرتے ہیں۔ اور وہ اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ بت پرستوں سے ان کو نفرت ہے۔

فائدہ: فرشتوں سے رحمت کے فرشتے مراد ہیں: جو برکت لاتے ہیں۔ اور صورت سے جاندار کی تصویر مراد ہے جو بلند جگہ پر موضع اکرام میں کھلی ہوئی ہو، جو چھپی ہوئی یا موضع امتہان میں یا غیر جاندار کی ہو وہ مراد نہیں۔ اسی طرح شکاری یا کھیتی وغیرہ کی حفاظت کا کتا مراد نہیں۔ اور جنبی سے مراد وہ ہے جو کاہلی سے ترکِ غسل کی عادت بنالے، یہاں تک کہ نماز کا وقت بھی گذر جائے۔ ہر جنبی مراد نہیں (مظاہر حق)

[۱] قال النبي صلى الله عليه وسلم: " لاتدخل الملائكة بيتًا فيه صورةٌ، ولا كلبٌ، ولا جنبٌ"
أقول: المراد أن هذه تنفر منها الملائكةُ، وأنها أضداد ما فيه الملائكة: من الطهارة، والتنفُّرِ من عبدة الإصنام.

ترجمہ: (۱) نبی ﷺ نے فرمایا: "نہیں داخل ہوتے فرشتے ایسے گھر میں جس میں تصویر ہوتی ہے۔ اور نہ اس گھر میں جس میں کتا ہوتا ہے۔ اور نہ اس گھر میں جس میں جنبی ہوتا ہے"

میں کہتا ہوں: مراد یہ ہے کہ یہ چیزیں: نفرت کرتے ہیں ان سے فرشتے۔ اور یہ کہ یہ چیزیں اضداد ہیں ان احوال کے جن میں فرشتے ہیں یعنی پاکی اور بت پرستوں سے نفرت کرنا۔

☆ ☆ ☆

جنابت میں عضو دھوکر، وضو کرکے سونے کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے ذکر کیا کہ ان کو رات میں جنابت پہنچتی ہے؟ تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ: "وضوء کرو اور اپنا ستر دھولو، پھر سوؤ" (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۵۲) (ستر پہلے دھوئے وضوء بعد میں کرے)

تشریح: جنبی کے لئے افضل یہ ہے کہ نہا کر کھائے پیئے اور سوئے۔ اور اگر کسی ضرورت سے یا بے ضرورت نہانے میں تاخیر کرے تو پھر ستر دھولے، اور نماز والی وضوء کرلے، پھر کھائے پیئے یا سوئے۔ ورنہ کم از کم ستر اور ہاتھ منہ دھولے، پھر کھائے یا سوئے۔ اس کے بعد فضیلت کا کوئی درجہ نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا کمال فرشتہ صفت بننا ہے۔ اور جنابت فرشتوں کے احوال کے منافی ہے۔ پس مؤمن کے لئے پسندیدہ بات یہ ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں، جنابت کی حالت میں بے قید نہ ہو جائے۔ بلکہ خوب پاک ہوکر حاجات میں مشغول ہو۔ اور جب طہارت کبریٰ کا موقعہ نہ ہو تو کم از کم طہارتِ صغریٰ کو نہ چھوڑے کہ دونوں ہی طہارتیں ہیں، اگرچہ شریعت نے کسی حکمت سے طہارت کبریٰ کو جنابت کے لئے اور طہارت صغریٰ کو حدث کے لئے تجویز کیا ہے۔ اور ستر دھونے اور وضوء لغوی کر لینے سے بھی طمانینت

حاصل ہوتی ہے۔ آرام کی نیند آتی ہے اور پریشان خوابوں سے حفاظت ہوجاتی ہے۔

[۲] وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیمن تُصیبه الجنابةُ من اللیل: "توضأ واغسلْ ذَكرك، ثم نَمْ"

أقول: لما كانت الجنابةُ منافيةً لهيئات الملائكة، كان المرضيُّ في حق المؤمن: أن لايسترسل في حوائجه من النوم والأكل مع الجنابة؛ وإذا تعذّرت الطهارةُ الكبرى لاينبغي أن يدع الطهارة الصغرى، لأن أمرهما واحد، غير أن الشارع وَزَّعهما على الحدثين.

ترجمہ: (۲) اور نبی ﷺ نے اس شخص کے بارے میں جس کو رات میں جنابت پہنچتی ہے، ارشاد فرمایا کہ: ''وضوء کرو اور اپنا آلت دھولو، پھر سوجاؤ''

میں کہتا ہوں: جب جنابت فرشتوں کے احوال کے منافی تھی، تو مؤمن کے حق میں پسندیدہ بات یہ تھی کہ وہ بے قید نہ ہوجائے اپنی ضروریات میں یعنی سونے اور کھانے میں، جنابت کے ساتھ۔ اور جب طہارتِ کبری دشوار ہو تو نہیں مناسب ہے کہ طہارتِ صغری کو چھوڑ دے۔ کیونکہ دونوں طہارتوں کا معاملہ ایک ہے۔ البتہ شارع نے دونوں کو تقسیم کیا ہے دو حدثوں پر۔

☆ ☆ ☆

باب — ۱۰

تیمّم کا بیان

مشروعیت کی وجہ: نماز اور بعض دیگر کاموں کے لئے وضو یا غسل لازم ہے۔ مگر کبھی انسان ایسی جگہ ہوتا ہے، مثلاً سفر میں ہوتا ہے، اور وہاں پانی میسر نہیں ہوتا، اور کبھی آدمی ایسی حالت میں یا ایسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے کہ غسل یا وضوء کرنا سخت مضر ہوتا ہے، تو ایسی حالت میں حکمتِ خداوندی نے پانی سے غسل یا وضو کے بدل تیمم تجویز کیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو استطاعت کے بقدر ہی احکام کا مکلف بناتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نفس کو اسی بات کا حکم دیتے ہیں جس کی اس میں استطاعت ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی آئین نازل فرمایا ہے، اس میں سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے ہر اس کام میں آسانی پیدا فرماتے ہیں جو ان کی استطاعت میں نہیں ہوتا۔

بدل کیوں تجویز کیا؟ دین میں آسانی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ عبادت کا بدل تجویز کیا جائے، تاکہ لوگوں کے دل مطمئن رہیں۔ اور ان کے دل کسی ایسی چیز کو یکدم ترک کردینے کی وجہ سے،

جس کا انھوں نے غایت درجہ التزام کر رکھا ہے، پراگندہ نہ ہوجائیں یعنی وضوء اور غسل کی پابندی کے ذریعہ، اللہ تعالیٰ کے دربار کی حاضری کا جو اہتمام وہ کرتے رہے ہیں، اور جس کی وجہ سے اس حاضری کی عظمت وتقدس کا تصور ان کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے وہ مجروح نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کوئی یہ سوچنے لگے کہ پاکی کی شرط خواہ مخواہ تھی۔ علاوہ ازیں اگر اعذار کی صورت میں بلا غسل اور بلا وضوء نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جائے گی، تو ان اتفاقات سے طبیعتیں ترکِ طہارت کی عادی بن جائیں گی۔ اس لئے بدل تجویز کیا گیا، تاکہ ذہن پر اور عادت پر اس طرح کا کوئی غلط اثر نہ پڑے۔

تیمم اس امت کا امتیاز ہے: جب صورتِ حال یہ ہے جو اوپر بیان کی گئی تو اولاً تیمم کا فیصلۂ خداوندی ملأ اعلیٰ میں نازل ہوا۔ اور تیمم کے طہارت ہونے کو ایک وجود شبہی (وجود سے مشابہ وجود) حاصل ہوگیا یعنی تیمم بھی نفس الامر میں ایک طہارت قرار پایا۔ پھر وہاں سے یہ حکم ہماری شریعت میں نازل ہوا۔

اور یہ فیصلہ خداوندی ان چند اہم امور میں سے ہے جن کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کی ملت کو دیگر ملتوں سے امتیاز حاصل ہوا ہے مسلم شریف میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہم برتری دیئے گئے ہیں لوگوں پر تین چیزوں کے ذریعہ: (۱) ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح بنائی گئی ہیں (۲) ہمارے لئے ساری زمین کو مسجد (نماز کی جگہ) بنایا گیا ہے (۳) اور مٹی کو ہمارے لئے پاکی کا ذریعہ بنایا گیا ہے، جبکہ ہم پانی نہ پائیں''
(مشکوۃ حدیث ۵۲۶ باب التیمم)

مٹی سے تیمم کیوں تجویز کیا گیا؟: مٹی ہی سے تیمم تین وجوہ سے تجویز کیا گیا ہے:

پہلی وجہ: مٹی سہل الحصول ہے۔ سمندر کے علاوہ ہر جگہ دستیاب ہے۔ پس اسکے ذریعہ تنگی رفع کرنا زیادہ مناسب ہے۔

دوسری وجہ: مٹی بعض اور مواقع میں بھی پاکی کا ذریعہ ہے۔ چمڑے کے موزے یا جوتے پر یا تلوار یا دھات کے برتن پر کوئی جسم دار ناپاکی لگ جائے، تو پانی سے دھونے کے بجائے مٹی سے رگڑ کر صاف کرنے سے بھی پاکی حاصل ہوجاتی ہے۔ غرض مٹی بھی فی الجملہ طہارت کا سامان ہے، اس لئے اس سے تیمم تجویز کیا گیا ہے۔

تیسری وجہ: مٹی کو ہاتھ لگا کر منہ پر پھیرنے میں تذلل وخاکساری ہے۔ یہ بھی چہرے کو خاک آلود کرنے کی طرح ہے۔ پس وہ درگذر کی درخواست کے مناسب ہے یعنی عذر کی وجہ سے پانی سے طہارت حاصل نہ کرنا بھی ہماری ایک طرح کی کوتاہی ہے۔ جس کی معافی کی ہم تیمم کے ذریعہ درخواست کرتے ہیں۔

غسل اور وضوء کے تیمم میں فرق کیوں نہیں؟ شریعت نے غسل اور وضو کے تیمم کے درمیان فرق نہیں کیا۔ دونوں کا تیمم یکساں ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے معروف تیمم ہی میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ دونوں طرح کے حدثوں کا ازالہ کرسکتا ہے۔ پس تیمم اپنی خاصیت سے اثر انداز ہے۔ الگ الگ طرح سے تیمم کی حاجت نہیں۔ اور یہ بات ہر اس حکم میں مان لینی

چاہئے جس کی وجہ سرسری نظر میں ذہن میں نہیں آتی۔ لوگوں کے دل اسی سے مطمئن ہوں گے۔ موشگافی سے اور الجھن کھڑی ہوجائے گی۔ مثلاً سورۂ فاتحہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔ خواہ درد سر ہو، خواہ سانپ نے ڈسا ہو، سورۂ فاتحہ سب جگہ کام کرتی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے ایک سانپ ڈسے کو سورۂ فاتحہ سے جھاڑا تھا، اور وہ شفایاب ہوگیا تھا۔ اب اگر کوئی اس کی وجہ پوچھے تو یہی جواب دینا چاہئے کہ فاتحہ اپنی خاصیت سے مؤثر ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ ہر بیماری میں کام کرے۔ اسی طرح تیمم بھی اپنی خاصیت سے اثر انداز ہے۔ مقدار کا اس میں لحاظ نہیں کہ وضو کے لئے ایسا تیمم ہونا چاہئے، اور غسل کے لئے ایسا۔

دوسری وجہ: غسل کا تیمم کرنے کے لئے مٹی میں لوٹ لگانے میں ایک طرح کی پریشانی ہے۔ پس اس سے حرج بالکلیہ رفع نہیں ہوسکتا۔ ایک تنگی کا علاج ہوگا تو دوسری تنگی سر پڑے گی۔ اس لئے غسل کا تیمم بھی وضو کے تیمم کی طرح تجویز کیا گیا۔

سخت سردی بیماری کی طرح ہے: اگر سردی سخت ہو، اور ٹھنڈے پانی سے نہانے میں ہلاکت کا یا بیمار ہوجانے کا اندیشہ ہو، تو تیمم جائز ہے۔ درمختار میں ہے: او برد یهلك الجنب أو يمرضه اھ اور دلیل حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا درج ذیل واقعہ ہے:

حدیث —— غزوہ ذات السلاسل میں، ایک نہایت سرد رات میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو جنابت لاحق ہوئی۔ آپ میر لشکر تھے۔ آپ نے اندیشہ محسوس کیا کہ اگر نہائیں گے تو ہلاک ہوجائیں گے۔ چنانچہ آپ نے جسم کے شکن دھوئے، نماز والی وضو کی اور تیمم کر کے فجر کی نماز پڑھائی۔ جب لشکر واپس آیا تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے دریافت کیا: ''عمرو، تم نے جنابت کی حالت میں نماز پڑھادی؟!'' انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے اس وجہ سے غسل نہیں کیا کہ مجھے سردی سے ہلاکت کا اندیشہ تھا۔ اور اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ، إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾ (۲۹:۴) یعنی تم خود کو مار نہ ڈالو، بیشک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہیں۔ آنحضرت ﷺ مسکرائے، اور کچھ نہ فرمایا (رواہ ابوداؤد، جامع الاصول ۱۵۷:۸)

تیمم سفر کے ساتھ خاص نہیں: آیت تیمم میں جو فرمایا گیا ہے: ﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ ﴾ الآیۃ (۴: ۴۳ و ۶:۵) اس میں سفر قیدِ احترازی نہیں ہے۔ پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم جائز ہے۔ خواہ سفر ہو یا حضر۔ سفر محض پانی نہ پانے کی ایک شکل ہے۔ عرب کے ریگستان میں سفر کا تذکرہ سن کر فوراً ذہن پانی موجود نہ ہونے کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ اور وہی آیت پاک میں مراد ہے۔

تیمّم میں پیر کیوں شامل نہیں؟ اگرچہ پیر اعضائے مغسولہ میں سے ہیں۔ مگر تیمم میں ان کو نہیں لیا گیا، کیونکہ پاؤں میل کچیل کا محل ہیں۔ اور حکم اس چیز کا دیا جاتا ہے جو حاصل نہ ہو، تاکہ نئے عمل کے ذریعہ نفس چوکنا ہو۔ چہرہ اور ہاتھ

صاف ہوتے ہیں اس لئے ان پر مسح کرنے سے نفس کو احساس ہوگا کہ طہارت کی خاطر کوئی عمل کیا گیا۔ پیروں پر مسح کرنے سے یہ فائدہ حاصل نہ ہوگا، اس لئے ان کو خارج کیا گیا۔

﴿ التيمم﴾

لما كان من سنة الله في شرائعه: أن يسّهل عليهم كلَّ مالا يستطيعونه، وكان أحقُّ أنواع التيسير: أن يُسقط ما فيه حرجٌ إلى بدلٍ، لتطمئن نفوسُهم، ولا تختلف الخواطرُ عليهم، بإهمال ما التزموه غايةَ الالتزام مرةً واحدةً، ولا يَألَفُوْا تركَ الطهارات: أسقطَ الوضوءَ والغسلَ في المرض والسفر إلى التيمم.

ولما كان ذلك كذلك نزل القضاءُ في الملأ الأعلى بإقامة التيمم مقامَ الوضوء والغسل، وحصل وجود تَشْبِيْهِيٌّ: أنه طهارة من الطهارات؛ وهذا القضاءُ أحدُ الأمور العظام التي تميَّزتْ بها الملةُ المصطَفَوِيَّةُ من سائر الملل، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" جُعِلت تربتُها لنا طَهورًا، إذا لم نجد الماءَ"

أقول:

[۱] إنما خُصَّ الأرضُ لأنها لاتكاد تُفْقَدُ، فهي أحقُّ ما يُرفَع به الحرجُ.

[۲] ولأنها طَهور في بعض الأشياء، كالخُفّ والسَّيْفِ، بدلاً عن الغَسل بالماء.

[۳] ولأن فيه تذللاً، بمنزلة تعفير الوجه في التراب، وهو يناسب طلبَ العفو.

وإنما لم يُفَرَّقْ بين بدلِ الغُسل والوضوء، ولم يُشْرَع التمَرُّغُ: لأن من حق مالايُعقل معناه باديَ الرأي: أن يُجعل كالمؤثِّر بالخاصية، دون المقدارِ، فإنه هو الذي اطمأنت نفوسُهم به في هذا الباب، ولأن التمَرُّغَ فيه بعضُ الحرج، فلايصلح رافعاً للحرج بالكلية.

وفي معنى المرض البردُ الضارُّ، لحديث عَمرو بن العاص؛ والسفر ليس بقيد، إنما هو صورةٌ لعدم وجدانِ الماء، يتبادر إلى الذهن.

وإنما لم يُؤمر بمسح الرِّجل بالتراب: لأن الرِّجل محلُّ الأوساخ، وإنما يؤمر بما ليس حاصلاً، ليحصل به التنبُّه.

ترجمہ: جب قوانینِ خداوندی میں سنتِ الٰہی میں تھا کہ آسانی کریں اللہ تعالیٰ لوگوں پر ہر اس کام میں جس کی وہ طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اور آسانی کرنے کی انواع میں سب سے زیادہ حقدار یہ بات تھی کہ وہ ساقط کردیں اس کام کو

جس میں حرج ہے، جاتے ہوئے کسی بدل کی طرف، تاکہ لوگوں کے دل مطمئن ہوں۔ اور ان کے دل پراگندہ نہ ہوں اس چیز کو یکدم رائیگاں کرنے سے جس کا انھوں نے غایت درجہ التزام کر رکھا تھا۔ اور عادت بنالیں وہ ترکِ طہارت کی: پس ساقط کیا وضوء اور غسل کو، بیماری اور سفر میں، جاتے ہوئے تیمم کی طرف۔

اور جب تھی وہ بات ایسی، تو اُترا فیصلہ ملأ اعلی میں تیمم کو وضوء اور غسل کی جگہ میں قائم کرنے کا۔ اور وجود میں آیا ایک وجودِ شبہی کہ تیمّم منجملہ طہارات ایک طہارت ہے۔ اور یہ فیصلہ اُن امورِ عظام میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے ملتِ محمدیہ دیگر ملتوں سے ممتاز ہوئی ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''زمین کی مٹی ہمارے لئے پاکی کا سامان بنائی گئی ہے، جب ہم پانی نہ پائیں''

میں کہتا ہوں: (۱) زمین کو بس اس لئے خاص کیا ہے کہ بیشک وہ نہیں قریب ہے کہ گم کی جائے۔ پس وہ زیادہ حقدار ہے اس بات کی جس کے ذریعہ تنگی رفع کی جائے۔ (۲) اور اس لئے کہ وہ پاکی کا سامان ہے بعض چیزوں میں، جیسے چمڑے کا موزہ اور تلوار، پانی سے دھونے کے بدل کے طور پر (بدلاً کا تعلق طَھور سے ہے) (۳) اور اس لئے کہ اس میں خاکساری ہے، جیسے چہرہ کو مٹی میں آلودہ کرنا۔ اور خاکساری درگذر کی درخواست کے مناسب ہے۔

اور غسل اور وضو کے بدل کے درمیان بس اسی وجہ سے فرق نہیں کیا گیا، اور مٹی میں لوٹنا بس اسی وجہ سے مشروع نہیں کیا گیا کہ اس بات کے حق میں سے ہے جس کی وجہ سرسری نظر میں نہ سمجھی جائے کہ بنائی جائے وہ چیز خاصیت سے اثر انداز ہونے والی چیز کی طرح، نہ کہ مقدار سے (اثر انداز ہونے والی چیز کی طرح) پس بیشک اسی سے لوگوں کے دل مطمئن ہوتے ہیں اس باب میں۔ اور اس لئے کہ مٹی میں لوٹ لگانے میں کچھ پریشانی ہے، پس نہیں صلاحیت رکھتی وہ بالکلیہ تنگی کو اٹھانے کی —— اور بیماری کے معنی میں ہے سخت نقصان رساں سردی، عَمرو بن العاص کی حدیث کی وجہ سے —— اور سفر قید نہیں ہے (بلکہ) وہ پانی نہ پانے کی ایک صورت ہے، جو ذہن کی طرف سبقت کرتی ہے —— اور مٹی سے پاؤں پر مسح کرنے کا حکم اسی وجہ سے نہیں دیا گیا کہ پاؤں میل کچیل کی جگہ ہیں۔ اور حکم اسی چیز کا دیا جاتا ہے جو حاصل نہ ہو، تاکہ اس کے ذریعہ تنبیہ حاصل ہو۔

☆ ☆ ☆

تیمّم کا طریقہ

(روایات میں اختلاف اور ان میں تطبیق)

تیمم کا طریقہ آنحضرت ﷺ سے مختلف مروی ہے۔ قولی روایت میں بھی اختلاف ہے اور فعلِ نبوی بھی مختلف

مروی ہے۔ صحابہ کرام میں بھی اختلاف تھا۔ محدثین کا طریقہ ردِ عمل آیا اس سے پہلے جمہور فقہاء کے نزدیک طریقہ یہ تھا کہ طہارت کی نیت سے زمین پر ہاتھ مارے جائیں، اور پورے چہرے پر پھیرے جائیں۔ بال برابر جگہ بھی باقی نہ رہے۔ پھر دوسری مرتبہ ہاتھ مارے جائیں، اور دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیرے جائیں، ذرا بھی جگہ باقی نہ رہے۔ یہی احناف اور شوافع کا مسلک ہے۔

اور اکثر محدثین کے نزدیک تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارے جائیں۔ اور ان کو پورے چہرے پر اور دونوں ہتھیلیوں پر، اوپر نیچے، پہنچوں تک پھیرا جائے۔ محدثین کے نزدیک یہ طریقہ مسنون ہے۔ اور پہلے طریقہ پر تیمم کرے تو وہ بھی جائز ہے۔ یہی امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کا مسلک ہے۔

احادیث: تیمم کے طریقہ کے بارے میں احادیث مختلف وارد ہوئی ہیں: بعض صحیح ہیں مگر صریح نہیں اور جو صریح ہیں وہ صحیح نہیں۔ یعنی جن کی سند صحیح ہے، وہ مسئلہ باب میں دوٹوک نہیں۔ ان میں تاویل کا احتمال ہے۔ اور جو صریح ہیں ان کی سندیں صحیح نہیں۔

صحیح ترین حدیث: حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جس کو محدثین نے لیا ہے۔ یہ درج ذیل حدیث ہے:

حدیث ——— حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ اور اس نے پوچھا کہ مجھے غسل کی حاجت ہوگئی، اور پانی مجھے ملا نہیں (تو کیا کروں؟) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نماز مت پڑھ۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے (جو وہاں موجود تھے) عرض کیا کہ آپ کو یاد نہیں: ایک دفعہ میں اور آپ سفر میں تھے اور ہم دونوں کو غسل کی حاجت ہوگئی تھی، تو آپ نے اس حالت میں نماز نہیں پڑھی تھی۔ اور میں نے زمین میں لوٹ لگائی تھی (یہ سمجھ کر کہ جنابت کا تیمم غسل کی طرح سارے جسم کا ہوتا ہوگا) پھر جب ہم سفر سے واپس آئے تو میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ذکر کی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "تمہارے لئے بس اتنا کرنا کافی تھا" پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان میں پھونکا (تاکہ جو دھول لگی ہو وہ اڑ جائے، کیونکہ آپ کا مقصد تیمم کرنا نہیں تھا، صرف تیمم کا طریقہ سکھلانا مقصود تھا) پھر آپ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پر اور اپنی دونوں ہتھیلیوں پر مسح کیا۔
(متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۲۸)

اور مسلم شریف کی روایت میں یہ ساری قولی حدیث ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تمہارے لئے بس اتنا کرنا کافی تھا کہ تم اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارتے، پھر ان کو پھونک دیتے، پھر دونوں کو اپنے چہرے پر اور اپنی ہتھیلیوں پر پھیرتے" (شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مسلم شریف کی روایت کے الفاظ لکھے ہیں)

دوسری حدیث ——— جس کو جمہور نے لیا ہے، وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت

ﷺ نے ارشاد فرمایا: '' تیمم زمین پر دو مرتبہ ہاتھ مارنا ہے: ایک مرتبہ چہرے کے لئے، اور ایک مرتبہ کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے'' (رواہ الطبرانی فی الکبیر، وفیہ علی بن ظبیان، ضعفہ یحیی بن معین، فقال: کذاب خبیث و (ضعفہ) جماعة اھ مجمع الزوائد ۱: ۲۶۲)

اسی طرح آنحضرت ﷺ اور صحابہ کا عمل بھی مختلف مروی ہے۔ أبو الجُهیم کی حدیث میں جس کی سند حسن ہے، مروی ہے کہ ایک بار آپؐ نے تیمم فرمایا: فمسح وجهه و ذراعيه یعنی آپؐ نے اپنے چہرے پر اور اپنی دونوں کلائیوں پر مسح کیا۔ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں آپؐ نے صرف ہتھیلیوں پر مسح کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک مسح کرتے تھے۔ اور حضرت ابن عباسؓ صرف کفین پر مسح کے قائل تھے۔

صورتِ تطبیق: حدیث کے الفاظ: إنما يكفيك سے واضح ہے یعنی ایک بار ہاتھ مارنا اور صرف کفین پر مسح کرنا ادنی درجہ ہے یعنی اتنا کم از کم ضروری ہے۔ اور جمہور والے طریقہ کے مطابق دو مرتبہ ہاتھ مارنا اور کہنیوں تک مسح کرنا مسنون طریقہ ہے۔

حدیثِ عمار کی تاویل: مذکورہ تطبیق محدثین کے طریقہ پر تو درست ہے، مگر جمہور فقہاء کے مذہب پر درست نہیں۔ ان کے نزدیک دو مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارنا اور کہنیوں تک مسح کرنا ضروری ہے۔ ان دو باتوں کے بغیر ان کے نزدیک تیمم درست نہیں۔ یہ حضرات حدیث عمار کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ آپؐ کا مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ غسل کا تیمم بھی وہی ہے جو وضو کا ہے۔ یہ بیان کرنا مقصود نہیں تھا کہ تیمم کرنے والا کن اعضاء پر ہاتھ پھیرے اور کتنی مرتبہ زمین پر ہاتھ مارے۔ اور إنما سے جو حصر کیا گیا ہے، وہ حصر اضافی ہے یعنی خاک میں لوٹنے کی بہ نسبت حصر کرنا مقصود ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی تیمم کے سلسلہ میں دو روایتیں ہیں۔ ایک اس وقت کا واقعہ ہے جب وضو کے لئے تیمم کا حکم نازل ہوا تھا۔ اور اس وقت لوگوں نے مختلف تیمم کیا تھا[1]۔ یہ واقعہ مقدم ہے۔ دوسری زیر بحث روایت ہے۔ اس موقعہ پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ وضو کا تیمم تو جانتے تھے۔ مگر غسل کا تیمم نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ آپؓ نے غسل کے تیمم کو وضو کے تیمم پر قیاس کیا، اور زمین میں لوٹ لگائی اور سارے جسم پر مٹی ملی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بتایا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی بس یہ کافی تھا، پھر اشارہ کیا اور بتایا کہ غسل کے لئے بھی وہی تیمم ہے جو وضو کے لئے ہے۔ غسل کے تیمم میں سارے جسم پر مٹی نہیں لگائی جاتی۔ آپؐ کا مقصود تیمم کا طریقہ سکھلانا نہیں تھا۔ صرف حوالہ دینا مقصود تھا۔ پس محدثین کا اس روایت سے استدلال درست نہیں۔

شاہ صاحب کی رائے: یہ ہے کہ جمہور فقہاء کے طریقے کے مطابق ہی تیمم کرنا چاہئے۔ کیونکہ اسی صورت میں یقیناً

---

[1] رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ حدیث ۵۳۶

ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوگا یعنی بالاتفاق تیمم درست ہو جائے گا۔اور حدیث میں ہے: دَعْ مَا يُرِيْبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيْبُكَ یعنی کھٹک والی بات چھوڑ دو،اور بے کھٹک بات اختیار کرو۔

جنابت میں بھی تیمم جائز ہے: حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے نزدیک جنابت میں تیمم جائز نہیں تھا۔صرف حدثِ اصغر میں تیمم جائز تھا۔وہ آیت ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ میں لامس کو جو کہ باب مفاعلہ سے ہے لمس (مجرد) کے معنی میں لیتے تھے۔اور آیت کو نواقض وضو کا بیان قرار دیتے تھے کہ عورت کو چھونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتی ہے۔مگر درج ذیل دو حدیثوں سے جنابت میں بھی تیمم کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اسی پر اب امت کا اتفاق ہے۔

حدیث —— حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔آپؐ نے نماز پڑھائی۔جب آپؐ نماز سے فارغ ہوکر لوگوں کی طرف پھرے تو ایک شخص کو علحدہ بیٹھا ہوا دیکھا، جو نماز میں شریک نہیں ہوا تھا۔آپؐ نے اس سے دریافت کیا کہ تم نماز میں کیوں شامل نہیں ہوئے؟ اس نے کہا: مجھے جنابت لاحق ہوئی ہے،اور پانی نہیں ہے! آپؐ نے فرمایا: عَلَيْكَ بِالصَّعِيد، فإنه يكفيك :لازم پکڑ تو مٹی کو یعنی اس سے تیمم کر، پس تحقیق وہ تیرے لئے کافی ہے (متفق علیہ،مشکوۃ حدیث ۵۲۷)

دوسری حدیث: حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی ہے جو ابھی اوپر گذر چکی ہے۔ان روایات سے جنابت میں بھی تیمم کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

فقہ شافعی کے چند مسائل جو منصوص نہیں: شوافع کے نزدیک تیمم طہارت ضروریہ ہے۔طہارت کاملہ نہیں ہے، اس لئے ہر فرض نماز کے لئے تیمم کرنا واجب ہے ایک تیمم سے دو فرض نہیں پڑھ سکتے۔نیز نماز کا وقت ہونے کے بعد تیمم ہوسکتا ہے۔وقت آنے سے پہلے کئے ہوئے تیمم سے نماز درست نہیں۔اور سفر معصیت میں بھی تیمم کی رخصت نہیں۔ مولی سے بھاگا ہوا غلام یا کسی کو قتل کرنے کے ارادہ سے سفر کرنے والا تیمم نہیں کرسکتا۔شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سب استنباطی مسائل ہیں۔کسی صحیح حدیث میں، میں نے ان کی صراحت نہیں پائی۔

أما صفة التيمم : فهو أحدما اختلف فيه طريقا التلقِّي عن النبي صلى الله عليه وسلم: فإن أكثر الفقهاء من التابعين وغيرهم— قبل أن تُمَهَّدَ طريقةُ المحدثين— على أن التيمم ضربتان: ضربة للوجه، وضربة لليدين إلى المرفقين.

وأما الأحاديث : فأصحُّها حديثُ عمار:" إنما كان يكفيك أن تضرب بيديْك الأرض، ثم تنفُخ فيهما، ثم تَمْسحَ بهما وَجْهكَ وكفَّيْكَ" ورُوى من حديث ابن عمر:" التيمم ضربتان: ضربة للوجه، وضربة لليدين إلى المرفقين" وقد رُوى عملُ النبي صلى الله عليه وسلم

والصحابةِ على الوجهين.

ووجهُ الجمع ظاهر، يُرشد إليه لفظُ: " إنما يكفيك" فالأولُ أدنى التيمم، والثاني هو السنة؛ وعلى ذلك يمكن أن يُحمل اختلافُهم في التيمم.

ولايبعد أن يكون تاويلُ فعلِه صلى الله عليه وسلم: أنه علَّم عماراً أن المشروعَ في التيمم إيصالُ ما لَصِقَ باليدين بسبب الضربة، دون التمرغ، ولم يُرِدْ بيانَ قدرِ الممسوح من أعضاء المتيمم، ولا عددِ الضربة؛ ولا يبعد أن يكون قولُه لعمَّار أيضا محمولاً على هذا المعنى؛ وإنما معناه: الحصرُ بالنسبة إلى التمرغ.

وفي مثل هذه المسألة لاينبغي أن يأخذَ الإنسانُ إلا بما يخرج به من العهدة يقينا.

وكان عمر وابنُ مسعود رضي الله عنهما لايريان التيمم عن الجنابة، وحملا الآيةَ على اللمس، وأنه يَنقضُ الوضوء، لكن حديث عمرانَ وعَمَّار يشهدُ بخلاف ذلك.

ولم أجد في حديث صحيح تصريحا: بأنه يجب أن يُتَيَمَّمَ لكل فريضة، أو لا يجوز التيمم للآبق، ونحوه، وإنما ذلك من التخريجات.

ترجمہ: رہا تیمم کا طریقہ: تو وہ ان مسائل میں سے ایک ہے جس میں نبی ﷺ سے دین اخذ کرنے کے دونوں طریقے مختلف ہوئے ہیں (دین اخذ کرنے کے دونوں طریقوں کی تفصیل مبحث ہفتم، باب سوم میں گذر چکی ہے) پس بیشک تابعین وغیرہ میں سے بیشتر فقہاء ــــ محدثین کا طریقہ ہموار کیے جانے سے پہلے (تفصیل کے لئے دیکھیں تتمہ مبحث ہفتم، باب سوم) ــــ اس بات پر تھے کہ تیمم دو مرتبہ (زمین پر) ہاتھ مارنا ہے ایک مرتبہ چہرے کے لئے مارنا، اور ایک مرتبہ کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے مارنا۔

اور رہی حدیثیں: پس ان میں صحیح ترین عمارؓ کی حدیث ہے کہ: "تیرے لئے بس یہ بات کافی تھی کہ مارتا تو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر، پھر ان میں پھونکتا، پھر دونوں کو اپنے چہرے اور اپنی ہتھیلیوں پر پھیرتا" اور ابن عمرؓ کی روایت میں مروی ہے کہ: "تیمم دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا ہے: ایک مرتبہ چہرے کے لئے اور ایک مرتبہ کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے" اور تحقیق روایت کیا گیا ہے نبی ﷺ اور صحابہ کا عمل دونوں ہی طرح سے۔

اور تطبیق کی صورت واضح ہے۔ راہ نمائی کرتا ہے اس کی طرف حدیث کا لفظ: "تیرے لئے بس یہ بات کافی تھی" پس اول (یعنی پہلی حدیث میں جو طریقہ ہے وہ) تیمم کا ادنی درجہ ہے۔ اور دُوُم ہی سنت طریقہ ہے۔ اور اسی پر محمول کیا جاسکتا ہے صحابہ وتابعین کا تیمم میں اختلاف (یعنی کوئی ادنی درجہ پر عمل کرتا تھا اور کوئی سنت طریقہ پر)

اور بعید نہیں کہ ہو نبی ﷺ کے فعل کی (جو حدیث عمارؓ میں ہے) یہ تاویل کہ آپؐ نے عمارؓ کو سکھلایا ہے کہ تیمم میں

مشروع (مقصود) اس چیز (گردوغبار) کو پہنچانا ہے جو ہاتھ کے ساتھ لگی ہے (زمین پر) ہاتھ مارنے کی وجہ سے۔ زمین میں لوٹنا مقصود نہیں ہے۔ اور نہیں ارادہ کیا آپؐ نے تیمم کرنے والے کے اعضاء میں سے ممسوح کی مقدار کو بیان کرنے کا، اور نہ ہاتھ مارنے کی تعداد کو بیان کرنے کا۔ اور بعید نہیں کہ آپؐ کا عمارؓ سے ارشاد (جس کا مسلم شریف کی روایت میں ذکر ہے) بھی اس بات پر محمول ہو۔ اور اس کے معنی خاک میں لوٹنے کی بہ نسبت حصر کرنا ہی ہیں۔

اور اس طرح کے مسئلہ میں مناسب نہیں ہے کہ لے آدمی مگر اس بات کو جس کے ذریعہ یقیناً ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے ——— اور عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما جنابت سے تیمم کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اور وہ دونوں آیت کو لمس (چھونے) پر محمول کرتے تھے۔ اور اس بات پر محمول کرتے تھے کہ عورت کو چھونا ناقض وضوء ہے۔ لیکن عمران اور عمار کی حدیثیں اس کے برخلاف کی گواہی دیتی ہیں ——— اور میں نے کسی صحیح حدیث میں اس کی صراحت نہیں پائی کہ ہر فرض نماز کے لئے واجب ہے کہ تیمّم کیا جائے یا بھاگے ہوئے غلام اور اس کے مانند کے لئے تیمم جائز نہیں ہے۔ یہ سب محض تخریجات (قواعد کلیہ پر مستنبط کردہ مسائل) ہیں۔

☆ ☆ ☆

زخمی کا غسل اور تیمّم کو جمع کرنا

حدیث ——— حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر میں تھے۔ ہم میں سے ایک شخص کو پتھر لگا۔ جس سے اس کا سر زخمی ہو گیا۔ پھر اسے نہانے کی حاجت پیش آئی۔ اس نے ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا کہ میرے لئے تیمم جائز ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے نزدیک آپ کے لئے تیمم جائز نہیں، کیونکہ آپ پانی کے استعمال پر قادر ہیں۔ چنانچہ وہ نہایا پس وہ مر گیا۔ جب ہم آنحضرت ﷺ کے پاس واپس آئے تو یہ ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اُن لوگوں نے اسے مار دیا، اللہ انہیں مارے! جب وہ مسئلہ نہیں جانتے تھے تو انھوں نے پوچھا کیوں نہیں۔ مرضِ نادانی کی شفا تو پوچھنے ہی میں ہے۔ اس کے لئے بس یہ بات کافی تھی کہ وہ تیمّم کرتا اور اپنے زخم پر کوئی کپڑا باندھ لیتا، پھر اس پر مسح کرتا، اور باقی تمام بدن دھوتا'' (رواہ ابوداؤد حدیث ۳۳۶ مشکوٰۃ حدیث ۵۳۱)[1]

[1] یہ حدیث بالاتفاق ضعیف ہے۔ اس کی سند میں زبیر بن خریق جزری ہے، جو مضبوط راوی نہیں ہے۔ بیہقی نے بھی سنن کبری ۱: ۲۲۸ میں یہ حدیث زُبیر کی سند سے روایت کی ہے۔ سنن کبری کے حاشیہ میں ابن الترکمانی نے دیگر وجوہ سے بھی اس کی تضعیف کی ہے۔ یہ حدیث تیمم اور باقی بدن کے دھونے کو جمع کرنے پر دلالت کرتی ہے۔ وقال البیهقی: لایثبت عن النبی صلی الله علیه وسلم فی هذا الباب شیئ یعنی باب المسح علی العصائب والجبائر اهـ مرقات۔ یہ حدیث ابوداؤد (نمبر ۳۳۷) اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے بھی روایت کی ہے۔ اور اس کی سند ٹھیک ہے، مگر وہ مختصر ہے، اس میں دھونے اور تیمم کرنے کا تذکرہ نہیں ہے ۱۲

تشریح: حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک اگر کسی عضو میں زخم یا پھوڑا ہو، اور اس پر پٹی بندھی ہو اور اس کو ہٹانے میں ہلاکت کا اندیشہ ہو یا زخم کھلا ہو اور اس کو دھونے میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، تو پٹی پر یا زخم پر مسح کرے اور ساتھ ہی تیمم بھی کرے اور جو بدن درست ہے اس کو دھوئے۔

اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اگر بعض بدن زخمی ہو، اور بعض اچھا ہو، تو دیکھیں گے: اگر اکثر بدن اچھا ہے تو اس کو دھوئیں گے، اور زخم پر خواہ اس پر پٹی ہو یا کھلا ہو مسح کریں گے، اگر اس کو دھونے میں ہلاکت کا یا ضرر شدید کا اندیشہ ہو۔ اور اگر اکثر بدن زخمی ہے مثلاً چیچک نکلی ہوئی ہے تو صرف تیمم کریں گے، اور دھونا ساقط ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے مذکورہ حدیث کو اس کے ضعف کے باوجود لیا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہونے کے علاوہ درایت کے بھی خلاف ہے، اس لئے انھوں نے نہیں لیا۔ اور یہ حدیث درایت کے خلاف اس طرح ہے کہ بدل اور مبدل منہ (تیمم اور غُسل) کو جمع کرنا لازم آتا ہے، جو ضوابط کے خلاف ہے۔

شاہ صاحب قدس سرہ اس حدیث کی ایسی تشریح فرماتے ہیں کہ یہ حدیث درایت کے خلاف نہ رہے۔ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دو باتیں ہیں:

پہلی بات: تیمم جس طرح تمام بدن کے غُسل کا بدل ہے، ایک عُضو کے غُسل کا بھی بدل ہے یعنی تیمم جس طرح تمام بدن کی جنابت کو دور کرتا ہے، ایک عضو کی جنابت کو بھی دور کرتا ہے۔ کیونکہ تیمم مؤثر بالخاصہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تیمم میں کل اور جزء دونوں کی جنابت کو دور کرنے کی خاصیت رکھی ہے، پس مذکورہ صورت میں جو تیمم کیا گیا ہے وہ صرف زخمی عضو کی طہارت کے لئے ہے۔ اور باقی بدن کا دھونا اس کی طہارت کے لئے ہے۔ پس بدل اور مبدل منہ کو جمع کرنا لازم نہیں آتا۔

دوسری بات: ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب زخمی جگہ تیمم سے پاک ہوگئی تو اب اس پر مسح کرنے کا حکم کیوں ہے؟ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ زخم پر یا پٹی پر مسح کا حکم اُس مصلحت سے ہے جس کا تذکرہ پہلے مسح علی الخفین کے بیان میں گذر چکا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسح محض اس لئے ہے کہ اس جگہ کا دھونا یاد رہے، اور وہ مسح غُسل کا نمونہ بنے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم في الرجل المشجوج: "إنما كان يكفيه أن يتيمم ويَعْصِب على جُرْحِه خِرْقَةً، ثم يَمْسَح عليها ويغْسِل سائر جسده"

أقول: فيه: أن التيمم هو البدل عن العضو، كتمام البدن، لأنه كالشيئ المؤثر بالخاصية،

وفيه الأمرُ بالمسح، لما ذكرنا في المسح على الخفين.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد (ترجمہ اوپر گذر چکا) میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ بات ہے کہ تیمم جس طرح تمام بدن کا بدل ہے اسی طرح ایک عضو کا بھی بدل ہے، اس لئے کہ تیمم خاصیت سے اثر انداز ہونے والی چیز کی طرح ہے اور اس حدیث میں مسح کرنے کا حکم ہے، جس کی وجہ موزوں پر مسح کے بیان میں گذر چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

تیمم کامل طہارت ہے دل میں کچھ وسوسہ نہ لائے

حدیث ـــــ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پاک مٹی مسلمان کا سامانِ طہارت ہے، اگرچہ دس سال تک پانی نہ ملے۔ پس جب پانی پائے تو چاہئے کہ اس کو اپنے بدن پر لگائے۔ پس بیشک یہ (نہانا) بہتر ہے'' (مشکوۃ حدیث ۵۳۰)

تشریح: دس سال سے مراد کثرت ہے، عدد مراد نہیں۔ اور حدیث کا مقصد تعمق کا دروازہ بند کرنا ہے یعنی جب تک پانی نہ ملے وضو اور غسل کے لئے تیمم کرتا رہے۔ دل میں کچھ خیال اور وسوسہ نہ لائے۔ جتنی پاکی پانی سے ہوتی ہے اتنی ہی پاکی مٹی سے ہوتی ہے۔ یہ خیال نہ کرے کہ تیمم سے اچھی طرح پاکی نہیں ہوتی۔ ایسا خیال کرنا حدود سے تجاوز کرنا ہے اور رخصتِ شرعی کے بارے میں حکم الٰہی کی مخالفت ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ تیمم طہارتِ مطلقہ ہے۔ خروج وقت سے تیمم باطل نہیں ہوتا۔ اور ایک تیمم سے جتنے چاہے فرض اور نفل پڑھ سکتا ہے (مظاہر حق)

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "إن الصعيدَ الطيِّب وَضوء المسلم، وإن لم يجد الماءَ عشر سنين"
أقول: المقصود منه سدُّ باب التعمُّق، فإن مثلَه يتعمَّقُ فيه المتعمقون، ويخالفون حكم الله في الترخيص.

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: اس ارشاد سے مقصود تعمق (حد سے تجاوز کرنے) کا دروازہ بند کرنا ہے۔ پس بیشک اس قسم کی باتیں: حد سے تجاوز کرتے ہیں اس میں حد سے تجاوز کرنے والے، اور وہ رخصتِ شرعی کے بارے میں حکم الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں۔

باب ــــــ ۱۱

قضائے حاجت کے آداب

آداب: ادب کی جمع ہے۔ادب: پسندیدہ باتوں کو اور شائستہ کاموں کو کہتے ہیں۔مرقات میں ہے: اِستعمالُ ما یُحْمَدُ قولاً و فعلاً اور خلاء کے معنی ہیں خالی جگہ۔مراد بیت الخلاء اور استنجے کی جگہ ہے۔

مشکوۃ شریف میں اسی عنوان سے باب ہے۔اور اس میں بیالیس حدیثیں ذکر کی ہیں۔شاہ صاحب نے ان میں سے تین حدیثوں کی شرح تو اس باب کے آخر میں مستقل طور پر کی ہے۔باقی تمام حدیثوں کی ایک ساتھ شرح کی ہے۔

قضائے حاجت کے آداب کا تعلق سات باتوں میں سے کسی ایک بات سے ہے:

پہلی بات: ــــ بیت اللہ کی تعظیم ــــ بعض احکام بیت اللہ کی عظمت کے پیش نظر دیئے ہیں۔درج ذیل حدیث اسی سلسلہ کی ہے:

حدیث ــــ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم قضائے حاجت کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ کی طرف منہ کرو اور نہ پیٹھ کرو، بلکہ (مدینہ کی جہت میں) مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف رخ کرو'' (متفق علیہ) مسلم شریف کی روایت میں یہ اضافہ ہے: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر جب ہم ملکِ شام پہنچے تو ہم نے وہاں ایسے بیت الخلاء پائے جو قبلہ رخ بنے ہوئے تھے، پس ہم ایک جانب مائل ہوجاتے تھے اور استغفار کرتے تھے'' ــــ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استقبال واستدبار کی ممانعت بیت اللہ کی عظمت کی وجہ سے ہے۔یہ حکمت مثبت پہلو سے ہے۔

ایک دوسری حکمت: منفی پہلو سے یہ ہے کہ قضائے حاجت کرتے ہوئے بیت اللہ کی طرف منہ کرنا تعظیم کے منافی ہے۔اس لئے اس کی ممانعت کی گئی ہے ــــ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبادت (نماز) کے وقت دل کو اللہ کی عظمت کی طرف متوجہ رکھنا ضروری ہے۔قلبِ غافل کی عبادت مقبول نہیں۔اور قلبی توجہ ایک مخفی امر ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کسی واضح چیز کو ــــ جو تعظیم کی احتمالی جگہ ہو یعنی اس چیز سے تعظیم بدست آسکتی ہو ــــ قلبی توجہ کا قائم مقام بنایا جائے۔ گذشتہ شریعتوں میں اُن عبادت گاہوں میں پہنچنے کو قلبی توجہ کا قائم مقام بنایا گیا تھا جو اللہ کی بندگی کے لئے بنائی جاتی تھیں اور جو شعائر اللہ میں شمار ہوتی تھیں اور جو اللہ کے دین کی خاص جگہیں تھیں۔چنانچہ اُن امتوں کے لئے عبادت گاہوں کے علاوہ دوسری جگہ میں نماز ادا کرنا جائز نہیں تھا ــــ اور ہماری شریعت میں قبلہ کی طرف منہ کر کے تکبیر کہنے کو ــــ تعظیم کا

مظنہ ہونے کی وجہ سے ـــــ توجہ قلبی کا قائم مقام بنایا گیا ہے۔اس لئے اس امت کیلئے ہر جگہ نماز پڑھنا جائز ہے۔عبادت (نماز) کے لئے مسجد شرط نہیں۔اور یہ اس ملت کا ایک امتیاز ہے جیسا کہ حدیث میں گذرا۔کیونکہ اس امت کو توجہ قلبی استقبال وتکبیر سے حاصل ہوجاتی ہے۔

اور جب صورت حال یہ ہے کہ استقبال قبلہ: اللہ کی تعظیم کی طرف دل کے متوجہ ہونے اور اللہ کے ذکر میں دل کے مگن ہونے کا قائم مقام ہے۔اور یہ قائم مقام ہونا بایں وجہ تھا کہ قبلہ کی طرف رخ پھیرنا ایک ایسی حالت ہے جس سے اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے،تو آنحضرت ﷺ نے اس سے یہ بات مستنبط کی کہ استقبال قبلہ کی حالت کو تعظیم کے ساتھ خاص کرنا ضروری ہے۔اور خاص کرنے کی صورت یہ تجویز کی کہ جو حالت نماز کے بالکلیہ منافی ہے یعنی قضائے حاجت اس حالت میں استقبال قبلہ کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔

اس حدیث کا دوسری دو حدیثوں سے تعارض،اور اس کا حل:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی متفق علیہ روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ کو قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے اور شام کی طرف منہ کر کے قضائے حاجت کرتے ہوئے دیکھا (مشکوۃ حدیث ۳۳۵) اور ترمذی شریف (ص۲) میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ کو وفات سے ایک سال پہلے کعبہ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرتے دیکھا۔ان حدیثوں میں اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں تعارض ہے۔رفع تعارض کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔شاہ صاحب ان میں سے دو طریقے بیان فرماتے ہیں:

پہلا طریقہ: ـــــ ائمہ ثلاثہ نے اختیار کیا ہے کہ ممانعت جنگل میں ہے یعنی وہاں ہے جہاں سامنے کوئی آڑ نہ ہو۔اور اباحت (جواز) عمارت میں ہے۔یعنی وہاں ہے جہاں قضائے حاجت کرنے والے کے سامنے کوئی آڑ ہو۔حضرت ابن عمرؓ نے بھی یہی تطبیق دی ہے،(مشکوۃ حدیث ۳۷۳)

دوسرا طریقہ: ـــــ یہ ہے کہ ممانعت کو کراہت تنزیہی (خلاف اولی) پر محمول کیا جائے اور اباحت فی نفسہ ہو۔شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ بہتر ہے۔

فائدہ: احناف کے نزدیک اصل حضرت ابو ایوبؓ کی حدیث ہے۔اور اُس حدیث میں جو مسلم شریف کی روایت میں اضافہ ہے،وہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ممانعت عمارت میں بھی ہے اور جواز کی روایات آنحضرت ﷺ کی خصوصیت پر محمول ہیں۔یا اُن کی کوئی اور مناسب تاویل کی جائے گی۔

دوسری بات: ـــــ خوب صفائی کرنا ـــــ اس مقصد سے دو حکم دیئے ہیں:

پہلا حکم: تین پتھروں سے کم سے استنجا نہ کیا جائے۔اور تین پتھروں سے مراد تین مرتبہ محلِ استنجاء کو پونچھنا ہے۔

اگر چہ ایک بڑا پتھر لیکر تین الگ الگ حصوں سے پونچھے۔ اور تین کا عدد اس لئے ہے کہ عام طور پر تین بار سے کم پونچھنے سے محل صاف نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی بڑے استنجاء کے لئے جائے تو اپنے ساتھ تین پتھر لے جائے، جن سے صفائی حاصل کرے فإنها تُجزئُ عنه: پس تین پتھر اس لئے کافی ہو جائیں گے (مشکوۃ حدیث ۳۴۹)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تثلیث واجب نہیں، انقاء واجب ہے۔ اگر دو میں انقاء ہو جائے تو وہ بھی کافی ہیں۔ اور اگر انقاء تین میں بھی نہ ہو تو اور پتھر لینے ضروری ہیں۔

دوسرا حکم: پتھر اور پانی دونوں استعمال کرنا مستحب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانی بھی استعمال فرماتے تھے (مشکوۃ حدیث ۳۴۲ و ۳۶۰) اور سورۃ التوبہ آیت ۱۰۹ میں اہل قباء کی اسی بنیاد پر تعریف کی گئی ہے کہ وہ پانی سے بھی استنجاء کرتے تھے (مشکوۃ حدیث ۳۶۹)

فائدہ: اگر دونوں میں سے ایک استعمال کرے تو صرف پانی کا استعمال اولیٰ ہے، کیونکہ اس سے صفائی پتھر کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اور صرف ڈھیلوں کا استعمال بھی درست ہے، جبکہ صفائی ہو جائے یعنی اس کے بعد نماز درست ہے۔

تیسری بات: —— ضرر رساں چیزوں سے بچنا —— خواہ وہ دوسروں کے لئے ضرر رساں ہوں یا خود کے لئے۔ اس مقصد سے درج ذیل احکام دیئے ہیں:

لوگوں کے سایے میں اور ان کے راستہ میں پائخانہ نہ کیا جائے۔ سایہ سے مراد: درخت وغیرہ کا سایہ ہے جس میں لوگ بیٹھا سویا کرتے ہوں۔ اور راستہ سے مراد: وہ راستہ ہے جس پر لوگ عام طور پر چلتے ہوں۔ وہ راستہ مراد نہیں جس پر لوگ کبھی کبھی گذرتے ہوں (مظاہر حق) مسلم شریف میں روایت ہے کہ دو باعث لعنت چیزوں سے بچو۔ دریافت کیا گیا: وہ کیا چیزیں ہیں؟ فرمایا: ''لوگوں کا سایہ اور ان کا راستہ'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۹) اور ابوداؤد اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ: ''تین باعث لعنت چیزوں سے بچو یعنی پانی کی گھاٹوں میں، عام راستہ میں اور سایے میں پائخانہ کرنا'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۵)

اسی طرح جہاں بیٹھ کر لوگ باتیں کرتے ہوں یا دھوپ کھاتے ہوں، وہاں بھی استنجاء نہ کیا جائے۔ اسی طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں جو بہتا نہ ہو پیشاب پائخانہ نہ کیا جائے۔ اسی طرح ہڈی سے استنجاء کرنا ممنوع ہے۔ اس سے صفائی نہیں ہوتی، اور وہ جنات کی خوراک ہے۔ اسی طرح ان تمام مقامات میں استنجاء کرنے سے بچنا چاہئے جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور اوپر جو حدیث ذکر کی گئی ہے کہ: ''دو باعث لعنت چیزوں سے بچو'' اس سے ممانعت کی حکمت واضح ہوتی ہے یعنی لوگوں کی ایذا رسانی سے بچنا۔

اسی طرح ان جگہوں میں قضائے حاجت کرنے سے بچنا ضروری ہے جو خود اس کو ضرر پہنچا سکتی ہیں۔ جیسے بل میں پیشاب کرنا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے وہ سانپ کا یا کسی اور زہریلے کیڑے کا مسکن ہو۔ اس میں پیشاب کرنے سے وہ نکلے گا

اور ایذا پہنچائے گا۔

چوتھی بات: —— اچھی عادتیں اپنانا —— اس مقصد کے پیش نظر درج ذیل احکامات دیئے ہیں:

(۱) دائیں ہاتھ میں ڈھیلا لے کر اس سے محل نہ پونچھے (۲) دائیں ہاتھ سے اپنے پیشاب کے عضو کو نہ پکڑے (۳) لید گوبر سے استنجاء نہ کرے (۴) اور پتھر سے استنجاء کرنے میں طاق عدد کا خیال رکھے۔

نوٹ: عرب کی سرزمین میں مٹی کا ڈھیلا کم یاب ہے۔ وہاں کی مٹی میں سنگریزے ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے ڈھیلا بھر بھرا جاتا ہے۔ اس لئے احادیث میں حَجَر کا تذکرہ آیا ہے، مَدَر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حکم دونوں کا ایک ہے۔

پانچویں بات: —— پردے کا اہتمام کرنا —— اس مقصد سے درج ذیل احکام دیئے ہیں:

(۱) لوگوں سے دور جا کر قضائے حاجت کرے تا کہ لوگ آواز نہ سنیں اور بدبو نہ سونگھیں اور اس کا ستر کوئی نہ دیکھے (۲) اور اپنا کپڑا اسی وقت اٹھائے جب زمین سے قریب ہو جائے تا کہ دور سے کسی کی اس کے ستر پر نظر نہ پڑے (۳) کسی آڑ میں استنجاء کے لئے بیٹھے جس سے اس کا نیچے کا بدن چھپ جائے، جیسے کھجوروں کا جھنڈ یا جھاڑی وغیرہ اور اگر ایسی کوئی جگہ نہ ہو تو ریت جمع کر کے ڈھیری بنالے اور اس کی طرف پشت کر کے بیٹھے۔ کیونکہ شیطان انسانوں کی شرمگاہ سے کھلواڑ کرتا ہے یعنی لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے کہ وہ اس کا ستر دیکھیں۔ اور شیطان یہ حرکت اس لئے کرتا ہے کہ اس کا مزاج فاسد ہے، سوچ کاسد ہے اور حرکتیں ناشائستہ ہیں۔ اس کی تخلیق ہی ایسی ہوئی ہے۔

چھٹی بات: —— بدن اور کپڑوں کو نجاست سے بچانا —— مخالف ہوا میں اور سخت جگہ میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے چھینٹیں بدن اور کپڑوں پر پڑسکتی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی پیشاب کرنا چاہے تو نرم جگہ تلاش کرے (مشکوٰۃ حدیث ۳۴۵)

ساتویں بات: —— وساوس سے بچنا —— اس مقصد سے غسل خانہ میں پیشاب کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ زیادہ تر وساوس اس سے پیدا ہوتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۳)

﴿ آداب الخلاء ﴾

هي ترجع إلى معانٍ:

منها: تعظيمُ القِبلة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا أَتَيْتُمُ الغائطَ فلا تستقبِلوا القبلةَ، ولاتَستَدبِرُوْهَا".

وفيه حكمة أخرى: وهي أنه لما كان توجُّهُ القلب إلى تعظيم الله أمرًا خفياً، لم يكن بُدٌّ من إقامة مَظِنَّةٍ ظاهرةٍ مقامَه؛ وكان الشرائع المتقدِّمةُ تجعل تلك المظنةَ الحلولَ بالصوامع المبنيّةِ

لـلّه تعالى، التى صارت من شعائر اللّه ودينه، وجعلت شريعتنا المظنةَ استقبالَ القبلة والتكبير، فلما جعل الله تعالى استقبال القبلة قائما مقام توجُّهِ القلب إلى تعظيم اللّه، وجمعِ الخاطر فى ذكر اللّه، وكان سببُ إقامته أن هذه الهيئة تُذَكِّرُ اللّهَ: استنبط النبيُّ صلى الله عليه وسلم من هذا الحكم أنه يجب أن يُجعلَ هيئةُ الاستقبال مختصة بالتعظيم؛ وذلك بأن لايُستعمل فى الهيأة المباينة للصلاة كلَّ المباينة.

ورُوِىَ استقبالُه واستدبارُه، فجُمع بتنزيل التحريم على الصحراء، والإباحةِ على البنيان، وجُمع بحمل النهى على الكراهية، وهو الأظهر.

ومنها: تحقيق معنى التنظيف، فورد النهى عن الاستنجاء بأقلَّ من ثلاثة أحجار، أى ثلاث مَسَحَاتٍ، لأنها لاتُنْقِىْ غالباً، واستحبابُ الجمع بين الحجر والماء.

ومنها: الاحتراز عما يضر الناسَ، كالتخلى فى ظل الناس، وطريقهم، ومتحدَّثهم، والماء الدائم، والاستنجاءِ بالعظم، لأنه طعام الجن، وكذا سائرِ ما يُنتفع به. وأفهم قوله صلى الله عليه وسلم:" اتَّقُوْا اللاعِنَيْنِ" أن الحكمة الاحتراز عن لعنهم، وتأذيهم، أوما يضر بنفسه، كالبول فى الجُحر، فإنه قد يكون مأوى حية، أو مثلِها، فيخرج، ويؤذى.

ومنها: اختيار محاسن العادات، فلا يتمسَّحُ بيمينه، ولايأخذ ذَكره بيمينه، ولا يستنجى برجيع، ويوتر فى الاستجمار.

ومنها: رعاية السَّتر، فينبغى أن يبعُد لئلا يُسمع منه صوتٌ، أو يُشَمَّ منه ريح، أو يُرى منه عورةٌ، ولا يَرْفع ثوبَه حتى يَدْنُوَ من الأرض، ويَسْتُرُ بمثل حائشِ نخلٍ، مما يُوارى أسافلَ بدنه، فمن لم يجد إلا أن يجمع كثيبًا من رَّمْلٍ فليستدبره، فإن الشيطان يلعب بمقاعدِ بنى آدم، وذلك: لأن الشيطان جُبل على أفكار فاسدة وأعمال شنيعة.

ومنها: الاحتراز من أن يُصيب بدنَه أو ثوبَه نجاسة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا أراد أحدكم أن يبول فَلْيَرْتَدْ لبوله"

ومنها: إزالة الوسواس، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" فلايبولن أحدكم فى مُسْتَحَمِّه، فإن عامّةَ الوسواس منه"

ترجمہ: قضائے حاجت کے آداب: یہ آداب چند باتوں کی طرف لوٹتے ہیں:

ان میں سے: قبلہ کی تعظیم ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب آؤ تم نشینی جگہ میں تو قبلہ کی طرف نہ منہ کرو اور نہ اس کی طرف پیٹھ کرو''

اور اس میں ایک حکمت اور ہے: اور وہ یہ ہے کہ جب دل کا تعظیم الٰہی کی طرف متوجہ ہونا ایک پوشیدہ امر تھا، تو چارہ نہیں تھا توجہ کی جگہ میں کسی مظنۂ ظاہرہ کو قائم کرنے سے۔ اور سابقہ شریعتیں بناتی تھیں یہ مظنۃ (احتمالی جگہ) اُن گرجوں میں نازل ہونے کو جو اللہ کے لئے بنائے گئے تھے، جو اللہ اور اس کے دین کے شعائر میں سے ہو گئے تھے۔ اور ہماری شریعت نے مظنۃ بنایا ہے قبلہ کی طرف رخ کرنے کو اور تکبیر کو۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے استقبالِ قبلہ کو قائم مقام بنایا اللہ کی تعظیم کی طرف دل کے متوجہ ہونے کا اور یادِ الٰہی میں دل کو لگانے کا۔ اور اس قائم مقام بنانے کا سبب یہ بات تھی کہ یہ حالت یاد دلاتی ہے اللہ تعالیٰ کو: تو نبی ﷺ نے اس حکم سے یہ بات مستنبط کی کہ ضروری ہے استقبال کی حالت کو تعظیم کے ساتھ مختص کرنا۔ اور وہ اختصاص بایں طور ہو کہ اس کا استقبال نہ کیا جائے اُس ہیئت میں جو نماز کی ہیئت کے بالکل مبائن ہے۔

اور دیکھا گیا آپ کا رخ کرنا اور پیٹھ پھیرنا: پس جمع کیا گیا تحریم کو اتارنے کے ذریعہ جنگل پر، اور اباحت کو عمارت پر۔ اور جمع کیا گیا ممانعت کو اتارنے کے ذریعہ کراہیت پر۔ اور وہ زیادہ ظاہر ہے۔

اور ان میں سے: صفائی کے معنی کو ثابت کرنا ہے۔ پس وارد ہوئی ممانعت تین پتھروں سے کم سے استنجاء کرنے کی۔ یعنی تین مرتبہ پونچھنا، اس لئے کہ وہ (تین مرتبہ سے کم پونچھنا) عام طور پر صاف نہیں کرتا۔ اور (وارد ہوا) پتھر اور پانی کے درمیان جمع کرنے کا استحباب۔

اور ان میں سے: ان چیزوں سے بچنا ہے جو لوگوں کو ضرر پہنچاتی ہیں: جیسے لوگوں کے سایے میں اور ان کی راہ میں اور ان کی باتیں کرنے کی جگہ میں اور رُکے ہوئے پانی میں استنجاء کرنا۔ اور (بچنا ہے) ہڈی سے استنجاء کرنے سے۔ اس لئے کہ وہ جنات کی خوارک ہے۔ اور اسی طرح (بچنا ہے) اُن تمام چیزوں سے جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد کہ: ''بچو تم دو پھٹکارنے والی چیزوں سے'' اس نے سمجھایا ہے کہ حکمت بچنا ہے لوگوں کی پھٹکار سے اور ان کی ایذا رسانی سے۔ یا بچنا ہے ان چیزوں سے جو خود کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ جیسے سوراخ میں پیشاب کرنا۔ پس بیشک سوراخ کبھی ہوتا ہے کسی سانپ کا یا اس کے مانند کا ٹھکانہ، پس نکلے وہ اور ایذا پہنچائے۔

اور ان میں سے: اچھی عادات کو اختیار کرنا ہے۔ پس نہ پونچھے وہ اپنے دائیں ہاتھ سے۔ اور نہ پکڑے وہ اپنے پیشاب کے عضو کو دائیں ہاتھ سے اور نہ استنجاء کرے وہ لید گوبر سے اور طاق کرے وہ پتھر کے طلب کرنے کو۔

اور ان میں سے: پردے کا اہتمام کرنا ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ دور چلا جائے۔ پس نہ سنی جائے اس کی آواز یا نہ سونگھی جائے اس کی بدبو یا نہ دیکھا جائے اس کا ستر۔ اور نہ اٹھائے وہ اپنے کپڑے کو تا آنکہ زمین سے قریب ہو جائے۔

اور پردہ کرے وہ کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ کے مانند سے، ان چیزوں سے جو چھپائے اس کے بدن کے نیچے کے حصہ کو۔ پس جو نہ پائے مگر یہ کہ جمع کرے وہ ریت کا کوئی تودہ (تو ایسا کرے) پس چاہئے کہ اس کی طرف پشت کرے۔ پس بیشک شیطان کھیلتا ہے انسانوں کی بیٹھنے کی جگہ سے۔ اور وہ بات اس لئے ہے کہ شیطان پیدا کیا گیا ہے فاسد سوچ پر اور بری حرکتوں پر۔

اور ان میں سے: اس بات سے بچنا ہے کہ اس کے بدن یا اس کے کپڑوں کو کچھ ناپاکی پہنچے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب تم میں سے کوئی پیشاب کرنے کا ارادہ کرے تو چاہئے کہ وہ اپنے پیشاب کرنے کے لئے کوئی نرم جگہ تلاش کرے''

اور ان میں سے: وسوسوں کو دور کرنا ہے اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''پس ہرگز پیشاب نہ کرے تم میں سے کوئی اپنے نہانے کی جگہ میں، کیونکہ زیادہ تر وسوسے اس سے پیدا ہوتے ہیں''

لغات: الغائط: پست زمین، پائخانہ کرنے کی جگہ ...... رُوِیَ مجہول ہے رای کا ...... لا تُنقی: أنقی الشیئَ: نظّفه: صاف کرنا ...... مُتَحَدَّثُ القوم: قوم کی باتیں کرنے کی جگہ ...... الحائِش: النَّخل الملتفُّ المجتمع (نہایہ) کھجوروں کا جھنڈ ...... اِرْتَادَ اِرتیادًا الشیئَ: طلب کرنا۔ مادّہ: رَوْد ...... اِسْتَحَمَّ: پانی سے غسل کرنا مُسْتَحَمٌّ: غسل خانہ۔

☆ ☆ ☆

کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے کھڑے ہوکر پیشاب کرتے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ: ''کھڑے ہوکر پیشاب مت کرو'' چنانچہ میں نے پھر کبھی کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کیا (رواہ الترمذی وابن ماجہ، مشکوۃ حدیث ۳۶۳)

تشریح: کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کو تین وجوہ سے ناپسند کیا گیا ہے: (۱) اس سے بدن اور کپڑوں پر چھینٹیں پڑ سکتی ہیں (۲) یہ طریقہ متانت اور وقار کے خلاف ہے اور اچھی عادات کے منافی ہے (۳) اس میں ستر کھلنے کا اندیشہ ہے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " لاتَبُلْ قائما"

أقول: إنما كَرِهَ البولَ قائماً لأنه يُصِيبُهُ الرَّشاشُ، ولأنه ينافي الوقار ومحاسنَ العادات، وهو مَظِنَّةُ انكشاف العورة.

ترجمہ: (۱) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہ پیشاب کرتو کھڑے ہوکر'' میں کہتا ہوں: آپؐ نے کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کو ناپسند کیا، اس لئے کہ شان یہ ہے کہ اس پر چھینٹیں پڑیں گی اور اس لئے کہ وہ متانت اور اچھی عادات کے منافی ہے۔ اور وہ ستر کھلنے کی احتمالی جگہ ہے۔

☆　☆　☆

بیت الخلاء میں جانے اور نکلنے کی دعائیں اور ان کی حکمت

حدیث ــــــ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بیشک یہ بیت الخلا شیاطین کے اڈے ہیں پس جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء جائے تو چاہئے کہ کہے: پناہ چاہتا ہوں میں اللہ کی مذکر ومؤنث شیاطین سے'' (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ، مشکوۃ حدیث ۳۵۷)

حدیث ـــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تھے تو کہتے تھے: خدایا! معاف فرما! (مشکوۃ حدیث ۳۵۹)

تشریح: متفق علیہ روایت میں بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ: بیت الخلاء میں جانے کی دعا کے یہ الفاظ مروی ہیں: اللّٰھم إنی أعوذُ بك من الخُبُث والخَبائث۔ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھنا مستحب ہے۔ کیونکہ پائخانہ میں شیاطین جمع رہتے ہیں۔ ان کو ناپاکی پسند ہے۔ اور وہ منتظر رہتے ہیں کہ کوئی آئے تو اس کو ستائیں۔ کیونکہ وہاں وہ ستر کھول کر بیٹھتا ہے اور اللہ کا ذکر نہیں کر سکتا۔

اور جب بیت الخلاء سے باہر آئے تو کہے: غُفرانَكَ: خدایا! آپ سے معافی طلب کرتا ہوں۔ معافی طلب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی جب تک پائخانہ میں رہتا ہے، زبان سے اللہ کا ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہنا چاہئے۔ مگر مجبوری میں جو ذکر چھٹتا ہے وہ بھی آدمی کی کوتاہی ہے۔ نیز بیت الخلاء میں شیاطین سے اختلاط ہوتا ہے۔ اور یہ بھی مؤمن کے حق میں بری بات ہے۔ مؤمن کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ سچوں کا ساتھی بنے (التوبہ آیت ۱۱۹) اور ظالموں کے ساتھ اور برے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھے (الانعام آیت ۶۸) پس ان دونوں کوتاہیوں پر اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کی جاتی ہے۔

فائدہ: ایک حدیث میں بیت الخلاء سے نکلنے کی یہ دعا بھی مروی ہے: الحمد للّٰہ الذی أذھبَ عنی الأذی وعافانی: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے تکلیف دہ چیز دور کی یعنی پیشاب پائخانہ اور مجھے عافیت (آرام) بخشا (مشکوۃ حدیث ۳۷۴) پس دونوں میں سے کوئی بھی دعا پڑھ سکتا ہے اور دونوں کو جمع بھی کر سکتا ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "إن الْحُشُوْشَ مُحْتَضَرَةٌ، فإذا أتى أحدكم الخلاء فليقل: أعوذ بالله من الخبث والخبائث، وكان إذاخرج من الخلاء، قال: غُفْرانك"

أقول: يستحب أن يقول عند الدخول: اللّهم إني أعوذ بك من الخُبُثِ والخَبائِثِ، لأن الحشوش محتضرة، يحضرها الشياطين، لأنهم يُحبُّون النجاسةَ، وعند الخروج: غفرانك، لأنه وقتُ تركِ ذكر الله، ومخالطة الشياطين.

ترجمہ:(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد الخ (ترجمہ گذر چکا۔شاہ صاحب نے دو حدیثوں کو جمع کیا ہے)

میں کہتا ہوں: مستحب یہ ہے کہ بیت الخلاء میں جاتے وقت کہے: "الٰہی! میں مذکر ومؤنث شیاطین سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں" اس لئے کہ بیت الخلاء اڈّے ہیں۔جمع ہوتے ہیں ان میں شیاطین۔اس لئے کہ وہ پسند کرتے ہیں ناپاکی کو۔ اور جب باہر نکلے تو کہے: "خدایا! معاف فرمایا" اس لئے کہ وہ اللہ کا ذکر چھوڑنے کا اور شیاطین سے اختلاط کا وقت ہے۔

لغات: الحشّ (بتثلیث الاول) باغ، کھجور کا جھنڈ، پائخانہ، جمع حُشُوْش ...... اِحْتَضَر: حاضر ہونا۔ مُحْتَضَر: حاضر ہونے کی جگہ ...... الخُبُث: جمع الخبیث کی: گندہ آدمی، مراد مذکر شیاطین ...... الخبائث: جمع خبیثۃ کی: گندی عورت، مراد مؤنث جن ...... غفرانك: مفعول مطلق ہے فعلِ محذوف کا أی أسئل غفرانك. غفران مصدر ہے بمعنی بخشش۔

☆ ☆ ☆

پیشاب سے نہ بچنا اور آپس میں بگاڑ پھیلانا عذابِ قبر کا سبب ہے

حدیث —— حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ دو قبروں کے پاس سے گذرے، پس فرمایا کہ: "یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں۔اور کسی بڑی بات کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا" (جس سے بچنا مشکل ہو) اور ایک روایت میں ہے کہ "کیوں نہیں! ان کو ایک سنگین بات کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے" یعنی آخرت کے وبال کے اعتبار سے وہ بات سنگین ہے۔ رہا ان میں سے ایک تو وہ پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔ اور رہا دوسرا تو وہ چغلیاں کھایا کرتا تھا۔ پھر آپؐ نے کھجور کی ایک تر شاخ لی۔ پس اس کو آدھوں آدھ چیرا۔ پھر ہر قبر پر ایک ایک گاڑی۔ صحابہ نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے یہ عمل کیوں کیا؟ آپؐ نے فرمایا: "شاید ان کے عذاب میں تخفیف ہو۔ جب تک یہ خشک نہ ہوں" (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۳۸)

تشریح: اس حدیث میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی بات: پیشاب کرنے کے بعد استبراء (پاکی طلب کرنا) واجب ہے۔ اور استبراء کا طریقہ یہ ہے کہ پیشاب سے فارغ ہو کر ٹھہرا رہے، اور عضو کو جھاڑے۔ یہاں تک کہ ظن غالب ہو جائے کہ نالی میں پیشاب بالکل باقی نہیں رہا۔

فائدہ: غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ڈھیلے سے پیشاب خشک کرنا آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں۔ پس پیشاب کے بعد ڈھیلا نہیں لینا چاہئے۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں۔ جس کا مزاج قوی ہو، اور قطرہ نہ آنے کا یقین ہو، اس کو تو پانی کافی ہے۔ مگر جس کا مثانہ کمزور ہو اور اس کو دیر تک قطرہ آتا رہتا ہو، جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے، وہ اگر ڈھیلا نہیں لے گا تو ضرور اس کا کپڑا گندہ ہوگا، اور اس کی نماز باطل ہوگی۔

اور شاید یہ بات آنحضرت ﷺ سے اس لئے ثابت نہیں کہ آپؐ کا مزاج قوی تھا۔ آپؐ کو اس کی حاجت نہ تھی۔ مگر جب آپؐ نے طہارت کی تاکید کی ہے۔ اور پیشاب سے نہ بچنے پر وعید سنائی ہے تو طہارت حاصل کرنے کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈھیلا لینا ثابت ہے اور صحابی کا، خاص طور پر خلفائے راشدین کا فعل حجت ہے۔ اور وہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ اور شاہ صاحب نے ازالۃ الخفا میں لکھا ہے کہ اس پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ (یہ پورا فائدہ مظاہر حق سے مستفاد ہے۔ دیکھئے ۱:۱۳۵ طبع قدیم)

دوسری بات: نجاست کے ساتھ اختلاط اور آپس میں بگاڑ پیدا کرنے والے کام: عذاب قبر کو واجب کرتے ہیں۔

فائدہ: اور کھجور کی ٹہنی چیر کر ہر قبر پر اس لئے گاڑی تھی کہ آپؐ نے ان قبر والوں کے لئے سفارش کی تھی۔ جو موقت طور پر عذاب میں تخفیف کی قبول ہوئی تھی۔ ہمیشہ کے لئے عذاب موقوف کرنے کی یا ہمیشہ کے لئے عذاب میں تخفیف کرنے کی قبول نہیں ہوئی تھی۔ مسلم شریف کے آخر میں باب حدیث جابر الطویل (۱۸:۱۴۴ مصری) ہے۔ اس میں آپؐ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ: ''میں دو قبروں کے پاس سے گذرا، جن کو عذاب ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی سفارش سے پسند کیا کہ ان دونوں کے لئے عذاب میں تخفیف کی جائے جب تک ٹہنیاں تر رہیں'' پس جب آپؐ نے خود ٹہنیاں گاڑنے کی وجہ بیان فرمادی ہے تو اب قبر پر گل پاشی کرنے والوں کی بیان کی ہوئی وجہ کے لئے کیا وجہ جواز باقی رہتا ہے؟!

رہی یہ بات کہ ان دونوں کے لئے آپؐ کی سفارش ہمیشہ کے لئے قبول کیوں نہیں ہوئی؟ تو اس کی وجہ شاہ صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ وہ دونوں کافر تھے۔ مگر یہ وجہ قابل غور ہے۔ کیونکہ کافر کے لئے استغفار کی قرآن کریم میں مطلقاً ممانعت آئی ہے (التوبہ آیت ۱۱۳) اور شفاعت اور استغفار کی حقیقت ایک ہے۔ (تفصیل کے لئے معارف الحدیث ۱:۲۵-۳۰ دیکھیں)

---

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " أما أحدهما فكان لايستبرئ من البول " الحديث.

أقول: فيه: إن الاستبراء واجب، وهو: أن يمكث وينتُر حتى يظُنّ أنه لم يبق في قَصَبةِ

الذكر شيئٌ من البول وفيه: إن مخالطة النجاسة، والعملَ الذى يؤدى إلى فساد ذات البين يوجب عذاب القبر.

أما شقُّ الجريدة والغرز فى كل قبر، فسِرُّهُ: الشفاعة المقيدة، إذ لم تمكن المطلقة لكفرهما.

ترجمہ: (۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''رہا اُن میں سے ایک تو وہ پیشاب سے پاکی حاصل نہیں کیا کرتا تھا'' حدیث پوری پڑھیں۔ میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ حکم ہے کہ استبراء واجب ہے۔ اور استبراء یہ ہے کہ پیشاب کے بعد ٹھہرے اور جھاڑے تا آنکہ گمان کرے کہ نہیں باقی رہا نالی میں پیشاب میں سے کچھ۔ اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ نجاست سے اختلاط اور وہ کام کرنا جو پہنچاتا ہے آپس کے بگاڑ تک واجب کرتا ہے قبر کے عذاب کو۔

رہا کھجور کی ٹہنی کو چیرنا اور ہر قبر میں گاڑنا: تو اس کا راز شفاعتِ مقیدہ ہے، جبکہ ممکن نہ تھی شفاعتِ مطلقہ (کاملہ دائمہ) ان دونوں کے کفر کی وجہ سے۔

باب ـــــ ۱۲

فطرت کی باتیں اوران سے لگتی چیزیں

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دس باتیں امورِ فطرت میں سے ہیں: (۱) مونچھ تراشنا (۲) ڈاڑھی بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی لے کر صفائی کرنا (۵) ناخن تراشنا (۶) انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا (۷) بغل کے بال نوچنا (۸) زیرِ ناف مونڈنا (۹) پانی گھٹانا یعنی استنجاء کرنا۔ راوی کہتے ہیں: دسویں بات میں بھول گیا۔ اور میرا گمان ہے کہ وہ کلی کرنا ہے (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۳۷۹ باب السواک)

فطرت کی باتیں باب طہارت سے ہیں اور ملت ابراہیمی کا شعار ہیں:

مذکورہ دس باتیں طہارت ونظافت کے باب سے ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں۔ اور ابراہیمی طریقے پر چلنے والی حنفی امتوں میں عام طور پر ان باتوں کا رواج رہا ہے۔ یہ باتیں ان کے دلوں میں پیوست ہوچکی ہیں۔ اور ان کے خالص عقیدہ کا جزء لاینفک بن چکی ہیں۔ وہ قرنہا قرن سے یہ اعلان کرتے ہوئے جیتے اور مرتے رہے

ہیں۔اسی لئے ان باتوں کوفطرت یعنی گھٹی میں پڑی ہوئی باتیں کہا گیا ہے۔

اور مذکورہ باتیں ملتِ ابراہیمی کے شعائر (امتیازی علامتیں) ہیں۔اور شعائر ہر ملت کے لئے ضروری ہیں،جن کے ذریعہ ان کی شناخت ہو،اور جن میں کوتاہی کرنے پر ان کی دراوگیر کی جائے۔تاکہ لوگوں کی فرمانبرداری اور نافرمانی ایک امرِ محسوس بن جائے۔

شعار کیسی بات ہونی چاہئے؟

اور شعائر ایسی باتیں ہونی چاہئیں جو بکثرت پائی جاتی ہوں،جو نادرالوقوع نہ ہوں،اور واضح چیزیں ہوں۔اور ان میں بہت زیادہ فوائد ہوں۔اور جن کو لوگوں کے اذہان پوری طرح قبول کرلیں۔مذکورہ دس چیزیں ایسی ہی ہیں۔اس لئے وہ شعائر قرار پائی ہیں۔

امورِ فطرت کے سلسلہ میں جامع گفتگو:

امورِ فطرت کے بارے میں چند جامع اور مختصر باتیں درج ذیل ہیں:

پہلی بات: جسم میں کچھ بال ایسے اُگتے ہیں جو حدث (نجاستِ حکمی) کا کام کرتے ہیں یعنی ان سے دل منقبض ہوتا ہے۔اور سرور کافور ہوجاتا ہے۔یہ مونچھ،بغل اور زیرناف کے بال ہیں۔ناخن بڑھنے کا بھی یہی حال ہے۔اسی طرح سر اور ڈاڑھی کا پراگندہ ہونا بھی طبیعت کی کبیدگی کا باعث ہوتا ہے۔اس لئے اُن کا کاٹنا اور ان کا سنوارنا مامور بہ ہوا۔ اطباء نے جلدی امراض: پِتّی اُچھلنے اور خارش وغیرہ کے بیان میں یہ بات لکھی ہے کہ ان سے دل مغموم ہوتا ہے اور نشاط ختم ہوتا ہے۔یہ بیماریاں بھی وہ ہیں جن کے آثار جسم پر نمودار ہوتے ہیں اور حدث کا کام کرتے ہیں۔اسی طرح کھال پر نمودار ہونے والے مذکورہ بال وغیرہ بھی حدث کا کام کرتے ہیں۔پس ان کا ازالہ بابِ طہارت سے ہے۔

سوال: جب ان بالوں وغیرہ کی صورتِ حال یہ ہے تو آخر یہ بال وغیرہ جسم میں پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں؟ یا بڑھتے کیوں ہیں؟

جواب: اس میں بہت حکمتیں ہیں۔مثلاً انگلیوں کے سِروں پر ناخن پیدا کیے ہیں،تاکہ انگلیوں کے پورے سخت ہوں اور انسان ان سے کام لے۔اور انگلیوں پر حادثے بھی آتے رہتے ہیں۔پس زخم تو مندمل ہوجائیں گے مگر ناخن کیسے درست ہوں گے،وہ تو ایک ہڈی ہیں۔اس لئے قدرت نے ان میں بڑھوتری کی شان رکھی ہے۔خراب ناخن بڑھ جاتا ہے اور نیا ناخن نکل آتا ہے،جو ماؤف ناخن کا قائم مقام بن جاتا ہے۔پس مردہ ناخن کو کاٹ ڈالنا ضروری ہے —— بغل اور زیرناف کے بال تعفّن کو دور کرتے ہیں۔ان کے نکلنے اور بڑھنے سے مسامات کھلتے ہیں اور عفونت زائل ہوتی ہے۔اس لئے بغل کا نوچنا مستحب ہے تاکہ مسامات خوب کھل جائیں اور فاسد مادہ جو بالوں کی جڑوں میں ہے وہ

بھی نکل جائے۔اور زیرِ ناف کا مونڈنا قوت باہ کو بڑھاتا ہے —— اور مونچھوں کے بال اس لئے بڑھتے ہیں تاکہ لوگ اپنی پسند کی مونچھیں تراش لیں۔لوگوں کا مزاج مونچھوں کے بارے میں مختلف واقع ہوا ہے: کسی کو کیسی پسند ہیں اور کسی کو کیسی۔مگر مونچھوں کو بے اندازہ بڑھانا طہارت کے منافی ہے۔

دوسری بات: ڈاڑھی بڑھانے کا حکم چند حکمتوں سے دیا ہے: (۱) ڈاڑھی سے بالغ اور نابالغ میں امتیاز ہوتا ہے (۲) ڈاڑھی مَردوں کا جمال ہے، بغیر ڈاڑھی کے آدمی ہیجڑا معلوم ہوتا ہے (۳) ڈاڑھی ہی سے مَردانہ ہیئت کی تکمیل ہوتی ہے، اس لئے اس کا بڑھانا ضروری ہے (۴) ڈاڑھی مونڈنا مجوسیوں کا طریقہ تھا اور اب تو تمام غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔ پس ڈاڑھی رکھنے سے ان سے مشابہت ختم ہوتی ہے (۵) ڈاڑھی مونڈنا اللہ کی بناوٹ کو بدلنا ہے جو اغوائے شیطانی کا نتیجہ ہے۔شیطان نے کہا تھا کہ: ''میں ان کو تعلیم دونگا جس سے وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے'' (النساء ۱۱۹) (۶) اور سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ سرداروں اور بڑے لوگوں میں اور بازاری قسم کے لوگوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔سب ایک ہی تھیلے کے لٹو ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تیسری بات: جس کی مونچھیں بڑھی ہوئی ہوتی ہے، وہ کھانے پینے کی چیزوں سے آلودہ ہوتی ہیں، نیز ان میں میل کچیل بھی اکٹھا ہوتا ہے، پس یہ بھی طہارت کے منافی ہے۔اور مونچھیں بڑھانا مجوسیوں کا طریقہ تھا۔ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے بھی مونچھیں تراشنا ضروری ہے۔اور مشابہت سے بچنے کا حکم درج ذیل حدیث سے ثابت ہے:

حدیث —— حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مشرکین کی مخالفت کرو یعنی انکی مشابہت سے بچو، ان کے چہرے جیسا اپنا چہرہ مت بناؤ۔ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۴۲۱)

فائدہ: عرب کے مشرکین سکھوں اور سادھوؤں کی طرح ڈاڑھی اور مونچھ دونوں بڑھاتے تھے۔اس لئے ان سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے مذکورہ حکم دیا گیا ہے اور یہ حکم مونچھیں ترشوانے کے حکم کے ساتھ مل کر ایک حکم ہے۔اور مونچھیں کاٹنا باب طہارت سے ہے۔پس ڈاڑھی بڑھانے کے لئے بھی یہی بات کافی ہے۔

چوتھی بات: کلی کرنا، ناک صاف کرنا اور مسواک کرنا باب طہارت سے اس طرح ہے کہ ان سے ریزش اور گندہ دہنی کا ازالہ ہوتا ہے۔

پانچویں بات: قُلفہ کی کھال (وہ چمڑی جو ختنہ میں کاٹی جاتی ہے) ایک زائد (بے ضرورت) عضو ہے۔اس میں میل کچیل اکٹھا ہوتا ہے۔اس کی موجودگی میں صفائی بھی اچھی طرح نہیں ہوسکتی۔کچھ پیشاب اندر رہ جانے کا احتمال رہتا ہے۔اور ختنہ نہ کرانے سے مرد اور عورت دونوں کی جماع کی لذت بھی کم ہوجاتی ہے۔اور انسانی جسم بھی بدنما معلوم ہوتا

ہے اس لئے ختنہ کرا کر اس کھال کا دور کرنا ضروری ٹھہرا۔

اور تورات میں ہے کہ ختنہ کرانا حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد پر اللہ تعالیٰ کی خاص نشانی ہے یعنی جس طرح بادشاہ اپنے مخصوص جانوروں پر نشان لگاتے ہیں تاکہ وہ ممتاز ہو جائیں۔ اور ان غلاموں پر نشان لگاتے ہیں جن کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا منظور ہوتا ہے۔ بیچنے یا آزاد کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ختنہ کرانا ملت ابراہیمی کی پیروی کرنے والوں کی امتیازی علامت ہے۔

پھر ختنہ ایک ایسا شعار ہے جس میں تبدیلی مشکل ہی سے ہو سکتی ہے اور دیگر شعائر میں تبدیلی اور دھوکہ دہی بہت آسان ہے۔ غیر مسلم بھی مسلمانوں جیسی ڈاڑھی رکھ لیتے ہیں۔ اور دھوکہ دیتے ہیں۔

نوٹ: ختنہ کا ذکر اس حدیث میں نہیں ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے جو آگے آرہی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ذہن اس کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

چھٹی بات: پانی گھٹانے سے مراد پانی سے استنجاء کرنا ہے۔

فائدہ: انتقاص کے معنی ہیں گھٹانا اور الماء سے مراد پیشاب ہے۔ اور اس کو گھٹانے کے لئے پانی سے استنجاء کرنا ضروری نہیں۔ ڈھیلے یا ٹھہرنے اور جھاڑنے کے ذریعہ بھی یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تعبیر سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ الماء سے مراد استنجاء کا پانی ہے حالانکہ الماء سے مراد پیشاب ہے۔ اس لئے مناسب یہ تھا کہ شاہ صاحب یوں فرماتے کہ پانی گھٹانے سے مراد استبراء ہے۔

﴿خِصال الفطرة وما يتَّصِل بها﴾

قال النبي صلى الله عليه وسلم: " عَشْرٌ من الفطرة: قَصُّ الشارب، وإعْفاءُ اللِّحْيَةِ، والسِّوَاك، والاستنشاق بالماء، وقص الأظفار، وغَسْلُ البَرَاجِم، وَنَتْفُ الإِبط، وحلق العانة، وانتقاص الماء يعني الاستنجاء، قال الراوي: ونسيتُ العاشرةَ، إلا أن تكون المضمضةَ"

أقول: هذه الطهاراتُ منقولةٌ عن إبراهيم عليه السلام، متداولةٌ في طوائف الأمم الحنيفيةِ، أُشْرِبَتْ في قلوبهم، ودخلتْ في صَمِيْمِ اعتقادِهم، عليها مَحْياهم، وعليها مَمَاتهم، عصرًا بعد عصر، ولذلك سميت بالفطرة.

وهذه شعائرُ الملة الحنيفية، ولابدلكل ملةٍ من شعائر، يُعرفون بها، ويؤاخذون عليها، ليكون طاعتُها وعصيانُها أمرًا محسوسًا.

وإنما ينبغي أن يُجعل من الشعائر: ما كثُر وجودُه، وتكرر وقوعُه، وكان ظاهرًا، وفيه فوائدُ

جَمَّةً، تقبله أذهانُ الناس أشدَّ قبولٍ.

والجملة في ذلك:

[۱] أن بعض الشُّعور النابتةِ من جسد الإنسان يفعل فعلَ الأحداث في قبض الخاطر، وكذا شَعَثُ الرأس واللحية، ولْيَرْجع الإنسانُ في ذلك إلى ما ذكره الأطباءُ في الشَّرىٰ والْحِكَّةِ وغيرهما من الأمراض الْجِلْدِيَّةِ: أنها تُحْزِنُ القلبَ، وتُذْهِبُ النَّشاطَ.

[۲] واللِّحية هي الفارقةُ بين الصغير والكبير، وهي جمال الفحول، وتمامُ هيأتهم، فلا بد من إعفائها، وقَصُّها سنةُ المجوس، وفيه تغييرُ خَلْقِ اللّٰهِ، ولحوقُ أهلِ السؤدد والكبرياء بالرُّعَاعِ.

[۳] ومن طالت شواربُه تعلَّق الطعام والشرابُ بها، واجتمع فيها الأوساخُ، وهو من سنة المجوس، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "خالِفُوا المشركين: قُصُّوا الشوارب، واعفوا اللُّحى"

[٤] وفي المضمضة والاستنشاق والسواك إزالةُ المُخاط، والبَخَر.

[٥] والغُرْلَةُ عضو زائد، يجتمع فيها الوسخ، ويمنع الاستبراءَ من البول، ويَنْقص لذة الجماع.

وفي التوراة: إن الخِتانَ مِيْسَمُ اللّٰه على إبراهيم وذريته، معناه: أن الملوك جَرَتْ عادتُهم بأن يَسِمُوا ما يَخُصُّهم من الدواب، لتتميز عن غيرها، والعبيدَ الذين لايريدون إعتاقَهم، فكذلك جُعل الخِتانُ مِيْسَمًا عليهم.

وسائِرُ الشعائر يمكن أن يدخلها تغيير وتدليسٌ، والختانُ لايتطرَّقُ إليه تغييرٌ إلا بِجُهْدٍ.

[٦] وانتقاص الماء كناية عن الاستنجاء به.

ترجمہ: فطرت کی باتیں اور وہ امور جوان کے ساتھ جڑتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: "دس باتیں (ترجمہ اوپر گذر چکا) میں کہتا ہوں: پاکیاں ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں۔ حنفی امتوں کے گرہوں میں رائج ہیں۔ وہ ان کے دلوں میں پلادی گئی ہیں۔ اوران کے خالص عقیدے میں داخل ہوگئی ہیں۔ اُن پراُن کا جینا اوران کا مرنا ہے۔ اوراسی وجہ سے وہ "فطرت" کہلاتی ہیں ــــــ اور یہ ملت ابراہیمی کے شعائر ہیں۔ اور ہر ملت کے لئے ایسے شعائر ضروری ہیں جن کے ذریعہ وہ پہچانے جائیں۔ اور جن پراُن سے مؤاخذہ کیا جائے۔ تاکہ اس ملت کی فرمان برداری اور نافرمانی ایک محسوس چیز بن جائے ــــــ اور مناسب یہ ہے کہ شعائر وہی باتیں بنائی جائیں جن کا پایا جانا زیادہ ہو۔ اور جن کا وقوع بار بار ہوتا ہو۔ اور جو واضح چیز ہو۔ اوراس میں ڈھیر سے فائدے ہوں۔ جس کو لوگوں کے ذہن پوری طرح قبول کرلیں۔

اوران کے بارے میں مختصراور جامع بات:

(۱) یہ ہے کہ کچھ بال جوانسان کے جسم میں اُگنے والے ہیں، وہ حدثوں کا کام کرتے ہیں، دل کے منقبض کرنے میں۔ اوراسی طرح سراور ڈاڑھی کا پراگندہ ہونا۔ اور چاہئے کہ لوٹے انسان اس سلسلہ میں اس بات کی طرف جو اطباء نے ذکر کی ہے پتّی اُچھلنے کی بیماری میں اور خارش میں اوران دونوں کے علاوہ میں جلدی امراض میں سے کہ وہ دل کو مغموم کرتے ہیں اور نشاط کوختم کرتے ہیں۔ (۲) اور ڈاڑھی ہی جدائی کرنے والی ہے چھوٹے اور بڑے کے درمیان۔ اور وہ مَردوں کا جمال ہے۔ اور وہ مَردانہ ہیئت کی تکمیل کرتی ہے۔ پس ضروری ہے اس کا بڑھانا۔ اوراس کا تراشنا مجوسیوں کا طریقہ ہے۔ اوراس میں اللہ کی بناوٹ کو بدلنا ہے۔ اور سرداروں اور بڑے لوگوں کا رذیلوں کے ساتھ ملنا ہے۔ (۳) اور وہ شخص جس کی مونچھیں لمبی ہوجاتی ہیں۔ ان کے ساتھ کھانا اور پینا لگتا ہے۔ اوران میں میل کچیل اکٹھا ہوتا ہے۔ اور وہ مجوسیوں کے طریقے میں سے ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''مشرکین کی مخالفت کرو: مونچھیں تراشواور ڈاڑھی بڑھاؤ'' (۴) اور کلی کرنے میں اور ناک صاف کرنے میں اور مسواک کرنے میں رینٹ اور گندہ دَہنی کا ازالہ ہے۔ (۵) اور قُلفہ (وہ چمڑی جوختنہ میں کاٹی جاتی ہے) ایک زائد عضو ہے۔ اس میں میل اکٹھا ہوتا ہے۔ اور وہ پیشاب کی صفائی کوروکتی ہے۔ اور جماع کی لذت کوکم کرتی ہے ——— اور تورات میں ہے کہ: ''ختنہ کرنا ابراہیم اوران کی اولاد پراللہ تعالیٰ کی خاص نشانی ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہوں کی عادت جاری ہے کہ وہ نشانی لگاتے ہیں اُن جانوروں پر جوان کے مخصوص ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کے علاوہ سے ممتاز ہوجائیں۔ اور (نشان لگاتے ہیں) اُن غلاموں پرجن کوآزاد کرنا منظور نہیں ہوتا۔ پس اسی طرح ختنہ کرنا اولادِ ابراہیم پرنشانی بنایا گیا ہے ——— اور دیگر شعائر: ممکن ہے کہ ان میں کچھ تبدیلی اور دھوکہ دہی داخل ہو۔ اور ختنہ کرنا: اس میں تبدیلی راہ نہیں بناتی ہے مگرانتہائی کوشش سے۔ (۶) اور پانی کا گھٹانا کنایہ ہے پانی سے استنجاء کرنے سے۔

لغات: البُرجمة: انگلیوں کے جوڑ اوران کی پشت۔ جمع بَراجِم ...... الشَرىٰ بروزن عَلىٰ: پتّی اچھلنے کی بیماری۔ پت کے فساد کا بدن پر ظاہر ہونا۔ صفراء کے بگاڑ کا جسم پرنمایاں ہونا ...... الرُّعاع: کمینے اور رذیل لوگ۔ مفرد: رُعَاعة ...... مِیْسَم: نشان۔ داغ۔ جمع میاسم۔

☆ ☆ ☆

چاراور سنتیں جو بابِ طہارت سے ہیں

حدیث ——— حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: ''چار باتیں رسولوں (بڑے نبیوں) کی سنتوں میں سے ہیں: حیا ——— اورایک روایت میں حیا کی جگہ ختنہ کرانے کا تذکرہ ہے

ـــــ اور خوشبو لگانا اور مسواک کرنا اور شادی کرنا'' (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث ۳۸۲)

تشریح: شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ چاروں باتیں بھی بابِ طہارت سے ہیں:

حیا: تو بے شرمی، فحش گوئی اور برے کاموں کو چھوڑنے کا نام ہے۔ اور یہ سب گندگیاں ہیں، جن سے نفس ملوث اور طبیعت مکدر ہوتی ہے، پس ان کی ضد طہارت ہے۔ اور خوشبو لگانا: ایک فرحت بخش عمل ہے۔ اُس سے نفس کو سرور اور قلب کو انشراح حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی طہارت کی حقیقت ہے۔ نیز وہ پاکی کی صفت سے بھی خوب آگاہ کرتا ہے۔ جب کسی کے کپڑے گندے اور بدن میلا ہوتا ہے اور کوئی عطر پیش کرتا ہے تو آدمی کہتا ہے: کپڑے چرکیں ہیں، بدن میلا ہے، کیا عطر لگاؤں؟! معلوم ہوا کہ خوشبو سامنے آتے ہی صفتِ طہارت یاد آتی ہے۔ اور نکاح: باطن کو پاک صاف کرتا ہے۔ نفس میں جو عورتوں کی طرف اشتیاق ہوتا ہے، اور جماع کے سلسلہ میں جو خیالات دماغ میں گھومتے رہتے ہیں، نکاح سے ان کا علاج ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی باب طہارت سے ہے اور ختنہ اور مسواک کا باب طہارت سے ہونا ابھی اوپر گذر چکا ہے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " أربع من سنن المرسلين: الحياءُ ــــ ويُروى الخِتانُ ــــ والتعطُّر، والسواكُ، والنكاحُ"

أقول: أُرى أن هذه كلَّها من الطهارة. فالحياءُ ترك الوَقاحة والبَذاء والفواحش، وهي تُلَوِّثُ النفسَ وتُكدِّرُها؛ والتعطُّرُ يُهَيِّجُ سرورَ النفس وانشراحَها، وينبِّهُ على الطهارة تنبيها قويا، والنكاحُ يُطَهِّر الباطن من التَّوْقان إلى النساء، ودوران أحاديث تميل إلى قضاء هذه الشهوة.

ترجمہ: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''چار چیزیں'' ــــــ میں کہتا ہوں: میرا گمان یہ ہے کہ یہ سب چیزیں طہارت کے قبیل سے ہیں۔ پس حیا: بے شرمی اور فحش گوئی اور برے کاموں کو چھوڑنا ہے۔ اور یہ امور نفس کو ملوث اور اس کو مکدر کرتے ہیں۔ اور خوشبو لگانا: نفس کے سرور کو اور اس کے انشراح کو ابھارتا ہے۔ اور پاکی سے چوکنا کرتا ہے، خوب اچھی طرح سے چوکنا کرنا۔ اور نکاح: باطن کو پاک کرتا ہے عورتوں کے اشتیاق سے اور ایسی باتوں کے دماغ میں گھومنے سے جو اس (جماع) کی خواہش کو پورا کرنے کی طرف مائل ہیں۔

لغات: أُرى (معروف) آنکھ سے دیکھنا۔ أُرِى (مجہول) دماغ سے دیکھنا یعنی خیال کرنا...... التَّوقان: باب نصر کا مصدر ہے تَاقَ إليه: شائق ہونا۔

☆ ☆ ☆

مسواک کو تنگی کے خیال سے ضروری قرار نہیں دیا

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میری امت کے لئے دشواری نہ ہوتی تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۷۶)

تشریح: حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اگر تنگی کا اندیشہ نہ ہوتا تو وضوء کی طرح مسواک کو بھی نماز کے لئے شرط ٹھہرایا جاتا۔ کیونکہ بطور استحباب تو مسواک مأمور بہ ہے۔ حدیث میں جو انداز بیان ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ اس انداز پر اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ مثلاً: لو لا أن أشقَّ علی أمتی لأمرتهم بتأخیر العشاء اس میں عشاء کی تاخیر کے ضروری ہونے کی نفی ہے۔ بطور استحباب تو تاخیر مامور بہ ہے۔

اس حدیث سے اور اس انداز کی دوسری حدیثوں سے تین باتیں اور بھی صراحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہیں:

پہلی بات: احکاماتِ شرعیہ میں نبی ﷺ کے اجتہاد کا کچھ دخل ہے یعنی بعض احکام آپؐ اجتہاد سے دیتے ہیں۔ اور نبی کا اجتہاد وحی ہوتا ہے، بایں طور کہ اگر نبی سے اجتہاد میں چوک ہو جاتی ہے تو وحی سے اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ اور یہ بات اس حدیث سے اس طرح معلوم ہوئی کہ مسواک کا ضروری ہونا اگر حکم الٰہی ہوتا تو آپؐ اس کو روک نہیں سکتے تھے۔

دوسری بات: احکاماتِ شرعیہ کے پیچھے مقاصد و مصالح کارفرما ہیں۔ احکام بس یونہی الل ٹپ نہیں دیئے گئے۔ اور یہ بات اس طرح ثابت ہوئی کہ مسواک کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے مگر وہ حق اللہ ہے اور امت کی تنگی حق العبد ہے۔ اور بوقت تعارض حق العبد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لئے مسواک کو نماز کے لئے شرط نہیں ٹھہرایا۔

تیسری بات: اس حدیث سے یہ ثابت ہوئی کہ تیسیر یعنی دین میں آسانی کرنا اور تنگی کو رفع کرنا ایک اصولِ شرعی ہے جس کا احکام شرعیہ میں لحاظ رکھا گیا ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "لولا أن أشُقَّ على أمتي لأمرتُهم بالسواك عند كل صلاةٍ"
أقول: معناه: لولا خوفُ الحرج لجعلتُ السواكَ شرطاً للصلاة، كالوضوء؛ وقد ورد بهذا الأسلوب أحاديثُ كثيرةٌ جدا، وهي دلائلُ واضحةٌ على أن لاجتهاد النبي صلى الله عليه وسلم مَدْخَلاً في الحدود الشرعية، وأنها مَنُوْطَةٌ بالمقاصد، وأن رفعَ الحرج من الأصول التي بُنِي عليها الشرائع.

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''اگر میری امت پر دشواری نہ ہوتی تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب: اگر تنگی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں مسواک کو نماز کے لئے، وضوء کی طرح،

شرط قرار دینا۔ اور تحقیق آئی ہیں اس انداز پر بہت ہی زیادہ حدیثیں۔ اور وہ واضح دلیلیں ہیں اس بات کی کہ نبی ﷺ کے اجتہاد کے لئے کچھ دخل ہے احکامِ شرعیہ میں۔ اور اس بات کی کہ احکامات شرعیہ معلّق ہیں مقاصد (مصالح) کے ساتھ۔ اور اس بات کی کہ تنگی کو دور کرنا اُن اصولوں میں سے ہے جن پر احکام کا مدار رکھا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

منہ کے آخری حصہ تک کرنے مسواک کی حکمت

حدیث —— حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ آپؐ مسواک فرمارہے تھے۔ مسواک آپؐ کے ہاتھ میں تھی اور کہہ رہے تھے: ''اُع اُع'' درانحالیکہ مسواک آپؐ کے منہ میں تھی۔ گویا آپ قئے کررہے ہیں'' (رواہ البخاری وغیرہ جامع الاصول ۸: ۹۴)

تشریح: مناسب یہ ہے کہ مسواک منہ کے آخری حصہ تک کرے، تاکہ گلے اور سینے کا بلغم نکل جائے۔ اور منہ میں خوب اندر تک مسواک کرنے سے منہ میں اور زبان پر جو پھنسیاں ہوتی ہیں وہ ختم ہوجاتی ہیں۔ اور آواز صاف اور منہ خوشبودار ہوتا ہے۔

[۳] قولُ الراوی فی صفةِ تَسَوُّكِهِ صلی الله علیه وسلم: "یقول: أُعْ أُعْ، كأنه يَتَهَوَّعُ"
أقول: ینبغی للإنسان أن یبلُغ بالسواك أقاصِیَ الفم، فَیُخْرِجُ بلاغِمَ الحلق والصدر. والاستقصاءُ فی السواك یُذْهِبُ بالقُلَاعِ، ویصفِّی الصوتَ، ویطیِّبُ النکهة.

ترجمہ: (۳) نبی ﷺ کے مسواک کرنے کی کیفیت میں راوی کا کہنا کہ: ''آپ کہہ رہے تھے اُع اُع گویا آپ قئے کررہے ہیں'' میں کہتا ہوں: انسان کے لئے مناسب یہ ہے کہ پہنچائے وہ مسواک کو منہ کے آخری حصہ تک۔ پس نکالے وہ گلے اور سینے کے بلغم کو۔ اور خوب اندر تک مسواک کرنا مرضِ قُلاع (پھنسیاں جو منہ یا زبان پر ہوں) کو ختم کرتا ہے۔ اور آواز کو صاف کرتا ہے۔ اور منہ کو خوشبودار کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

ہفتہ میں ایک بار نہانے دھونے کی حکمت

حدیث —— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ثابت ولازم ہے ہر مسلمان پر کہ نہائے وہ ہر ہفتہ میں ایک دن یعنی جمعہ کے دن۔ دھوئے وہ اس میں اپنا سر اور اپنا بدن (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۳۹ باب الغسل المسنون)

تشریح: ہفتہ میں ایک مرتبہ نہانا ایک مستقل سنت ہے۔ پس جس پر جمعہ نہیں ہے اس کو بھی نہانا چاہئے۔ اور اس سنت کا مقصد میل کچیل کو دور کرنا اور نفس کو صفتِ طہارت پر چوکنا کرنا ہے۔ اور حدیثوں میں جو جمعہ کے دن کی اور نماز جمعہ کی تخصیص آئی ہے، وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ نماز جمعہ اور غسل میں سے ہر ایک کی دوسری سے تکمیل ہوتی ہے۔ نماز جمعہ کی وجہ سے اس دن نہانے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور نہا کر جمعہ ادا کرنے سے نماز جمعہ کو مزیت حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس تعیین میں نماز جمعہ کی تعظیم بھی پیش نظر ہے۔

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " حقٌّ على كل مسلم أن يغتسل في كل سبعة أيام يومًا، يَغسِلُ فيه جسَده ورأسَه"

أقول: هذا يدل على أن الاغتسال في كل سبعة أيام سنةٌ مستقلة، شُرِعتْ لدفع الأوساخ والأدران، وتنبيهِ النفس لصفة الطهارة. وإنما وُقِّت لصلاة الجمُعة: لأن كل واحد منهما يُكَمِّلُ بالآخر، وفيه تعظيم صلاة الجمعة.

ترجمہ: (۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''ہر مسلمان پر لازم ہے کہ نہائے وہ ہر سات دنوں میں ایک دن: دھوئے وہ اس میں اپنا بدن اور اپنا سر'' میں کہتا ہوں: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر ہفتہ نہانا ایک مستقل سنت ہے (کیونکہ اس حدیث میں جمعہ کے دن کی یا جمعہ کی نماز کی تخصیص نہیں کی گئی) مشروع کی گئی ہے یہ سنت میل کچیل دور کرنے کے لئے اور نفس کو صفتِ طہارت پر چوکنا کرنے کے لئے (یعنی نہانا اُسے یاد رہے، اس کو بھول نہ جائے) اور جمعہ کی نماز کے لئے اس کی تعیین (دیگر روایات میں) اس لئے کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک مکمل ہوتا ہے دوسرے کے ذریعہ۔ اور اس تعیین میں نماز جمعہ کی تعظیم ہے۔

☆ ☆ ☆

پچھنے لگوانے سے اور میت کو نہلانے سے غسل کرنے کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے نہایا کرتے تھے: جنابت کی وجہ سے اور جمعہ کے دن اور پچھنے لگوانے کی وجہ سے اور میت کو نہلانے کی وجہ سے'' (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ حدیث ۵۴۲)[1]

تشریح: پچھنے لگوانے کے بعد نہانے کی دو وجہیں ہیں:

---

[1] یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی مصعب بن شیبہ ہے جو جمہور کے نزدیک ضعیف ہے اور مرقات میں میرک شاہ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ کے بارے میں یہ بات منقول نہیں ہے کہ آپ نے کبھی کسی میت کو نہلایا ہو ۱۲

پہلی وجہ: سینگی لگوانے سے بارہا خون جسم پر پھیل جاتا ہے۔ اور ہر ہر چھینٹ کا علحدہ علحدہ دھونا دشوار ہوتا ہے۔ پس اگر نہالیا جائے تو سارا جسم پاک ہوجائے گا۔

دوسری وجہ: جب سینگی کے ذریعہ خون چوسا جاتا ہے تو جسم کے ہر حصہ سے خون کھینچا چلا آتا ہے۔ اور جب عمل پورا ہوجاتا ہے تو اس جگہ سے تو خون نکلنا بند ہوجاتا ہے جہاں سینگی لگائی گئی تھی۔ مگر اندر اندر خون کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس لئے ایک عضو سے خون کا بند ہونا مفید نہیں اور نہالیا جائے تو خون کا انجذاب رک جائے گا۔ اور زخم سے دوبارہ خون بہنے کا اندیشہ ختم ہوجائے گا۔ جیسے مذی نکلنے کے بعد مذاکیر کو دھولیا جائے تو مذی کی آمد کا سلسلہ رک جاتا ہے اور ہدی کا جانور دودھ والا ہو تو اس کے تھن پر ٹھنڈا پانی چھڑکنے سے دودھ کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوجاتا ہے۔

اسی طرح میت کو نہلانے کے بعد نہانے کی بھی دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: میت کو نہلاتے وقت بدن پر چھینٹیں پڑتی ہیں۔ اور وہ ناپاک ہوسکتی ہیں۔ اور کہاں کہاں پڑی ہیں اس کا اندازہ نہیں۔ اس لئے نہلانے والا نہالے تو جسم پاک ہوجائے گا۔

دوسری حکمت: جو لوگ میت کو نہلانے کے عادی نہیں ہوتے، وہ کسی میت کو نہلاتے ہیں تو ان پر خوف اور گھبراہٹ طاری ہوتی ہے۔ نہالینے سے یہ حالت بدل جاتی ہے اور وساوس منقطع ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنا ایک مشاہدہ بیان کیا ہے کہ آپ ایک بار ایک ایسے شخص کے پاس بیٹھے جو سکرات میں مبتلا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ جو فرشتے روحوں کو قبض کرنے پر مقرر ہیں، وہ حاضرین کی روحوں کو بھی عجیب طرح سے مجروح کررہے ہیں۔ یعنی مرنے والا تو مر ہی رہا تھا، حاضرین بھی خوف سے نیم جاں ہورہے تھے۔ اس وقت شاہ صاحب کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ میت کو نہلانے سے بھی نہلانے والوں کی روح مجروح ہوتی ہے۔ ان پر خوف و دہشت طاری ہوتی ہے۔ پس اس حالت کو بدلنا ضروری ہے۔ چنانچہ فارغ ہوکر نہلانے والے نہالیں تو نفس کو سابقہ حالت کے برخلاف دوسری حالت یاد آجائے گی یعنی وہ سابقہ کیفیت زائل ہوجائے گی۔

[٥] كان النبي صلى الله عليه وسلم يغتسل من أربع: من الجنابة، ويومَ الجمعة، ومن الحِجَامة، ومن غُسْلِ الميت.

أقول: أما الحِجَامةُ: فلأن الدم كثيرًا ما ينتشر على الجسد، ويَتَعَسَّرُ غَسْلُ كلِّ نُقطة على حِدَتِها، ولأن المَصَّ بالملازم جاذِب للدم من كل جانب، فلا يفيد نقصُ الدم من العضو، والغسلُ يزيل السيلانَ، ويمنع انجذابه.

وأما غسل الميت: فلأن الرَّشاش ينتشر في البدن؛ وجلستُ عند محتضر: فرأيتُ أن

المـلائـكة المُوَكّلةَ بقبض الأرواح، لها نِكاية عجيبة فى أرواح الحاضرين، ففهمتُ أنه لابد من تغيير الحالة، لِتتنبّهَ النفسُ لمخالفها.

ترجمہ:(۵) نبی ﷺ چار چیزوں سے نہایا کرتے تھے: جنابت سے اور جمعہ کے دن اور پچھنے لگوانے سے اور مردے کو نہلانے سے" میں کہتا ہوں: رہا پچھنے لگوانا: (۱) پس اس لئے کہ خون بار ہا جسم پر پھیل جاتا ہے۔ اور ہر چھینٹ کو الگ الگ دھونا دشوار ہوتا ہے (۲) اور اس لئے کہ سینگی کے ذریعہ چوسنا خون کو کھینچنے والا ہے ہر جانب سے۔ پس مفید نہیں ہوگا خون کا گھٹنا ایک عضو سے۔ اور نہانا بہاؤ کو بند کرتا ہے اور اس کے انجذاب کو روکتا ہے۔

اور رہا میت کو نہلانا: (۱) پس اس لئے کہ چھینٹیں پھیل جاتی ہیں بدن میں (۲) اور میں ایک قریب المرگ کے پاس بیٹھا۔ پس میں نے دیکھا کہ وہ فرشتے جو روحوں کو قبض کرنے پر مقرر ہیں: ان کے لئے عجیب خراش ہے حاضرین کی روحوں میں۔ پس سمجھ لیا میں نے کہ ضروری ہے اس حالت کو بدلنا، تاکہ نفس چوکنا ہو جائے اس حالت کے برخلاف حالت سے۔

☆ ☆ ☆

اسلام قبول کرنے پر نہانے کی حکمت

حدیث ـــــــ حضرت قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں سے نہالیں (مشکوۃ حدیث ۵۴۳)

حدیث ـــــ کُلیب کے ابا خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ: "کفر کے زمانہ کے بال کٹوا ڈالو" (رواہ ابوداؤد حدیث ۳۵۶)

تشریح: صابن سے نہا لینے میں اور بال کٹوا دینے میں حکمت یہ ہے کہ نومسلم کی نگاہوں کے سامنے یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح ہو کر آجائے کہ وہ کفر سے نکل آیا ہے اور اسلام میں داخل ہو گیا ہے۔ ورنہ مسئلہ کی رو سے اگر نومسلم جنابت کی حالت میں نہیں ہے تو نہانا ضروری نہیں۔ نہ بال کٹوانا ضروری ہے۔

[٦] أمر صـلـى الله عـليـه وسـلـم من أسلم بأن يغتسل بماء وسدرٍ، وقال لآخر: " ألقِ عنك شعر الكفر"

أقول: سِرُّه أن يتمثل عنده الخروج من شيئ أصرحَ ما يكون، والله أعلم.

ترجمہ:(٦) آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو حکم دیا جو اسلام لایا تھا کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں سے نہائے۔ اور آپؐ

نے ایک دوسرے شخص سے فرمایا کہ: ''ڈال تو اپنے سے کفر کے بال'' میں کہتا ہوں: اس میں حکمت یہ ہے کہ متمثل ہو (محسوس طور پر پایا جائے) اس کے نزدیک ایک چیز سے نکلنا زیادہ سے زیادہ واضح طور پر جو ممکن ہو۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۱۳

پانی کے احکام

رُکے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے اور نہانے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ـــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ہرگز پیشاب نہ کرے ٹھہرے ہوئے پانی میں، جو بہتا نہیں ہے۔ پھر نہائے وہ اس میں'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۷۴)

حدیث ـــــــ اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ: ''تم میں سے کوئی ٹھیرے ہوئے پانی میں نہ نہائے درانحالیکہ وہ جنبی ہو'' لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: پھر کس طرح نہائے؟ آپؓ نے فرمایا: ''اس میں سے کسی طرح پانی لے'' پھر علحدہ نہائے (مشکوۃ حدیث ۴۷۴)

حدیث ـــــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۴۷۵)

تشریح: شاہ صاحب رحمہ اللہ پہلی حدیث کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی بھی ممانعت ہے اور نہانے کی بھی۔ اور یہ حدیث اس حدیث کی طرح ہے جس میں آیا ہے کہ: ''نہ نکلیں دو آدمی، درانحالیکہ جارہے ہوں وہ پائخانہ کے لئے، کھولنے والے ہوں وہ اپنی شرمگاہوں کو، باتیں کررہے ہوں وہ آپس میں، پس بیشک اللہ تعالیٰ اس سے غضبناک ہوتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۶) یعنی ایک دوسرے کا ستر دیکھنا اور ننگے ہونے کی حالت میں آپس میں باتیں کرنا: دونوں باتیں مکروہ اور باعثِ غضب الٰہی ہیں ـــــــ نیز اس کی وضاحت دوسری اور تیسری روایت سے ہوتی ہے۔ دوسری میں صرف نہانے کی ممانعت ہے اور تیسری میں صرف پیشاب کرنے کی ممانعت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں باتیں ممنوع ہیں۔

فائدہ: مسئلہ کی رو سے تو شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات صحیح ہے۔ مگر آپ نے پہلی حدیث کا جو مطلب بیان کیا ہے، وہ غور طلب ہے۔ کیونکہ اس حدیث کا مقصد استبعاد کا اظہار ہے کہ عقلمند سے یہ بات بعید ہے کہ پہلے وہ اس پانی میں

پیشاب کرے، پھراسی سے نہائے (مظاہر حق) یا مقصد پیشاب کرنے کے نقصان کی طرف ذہن کو متوجہ کرنا ہے کہ ابھی تو وہ اس میں پیشاب کر رہا ہے مگر بہت ممکن ہے کہ آگے اس کو اسی سے نہانا پڑے۔ حدیث میں جو لفظ ثُــم ہے وہ اس مطلب کا واضح قرینہ ہے اور فعل مضارع بمعنی استقبال ہے (فائدہ تمام ہوا)

اور پیشاب کرنے اور نہانے کی ممانعت کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ وہ پانی دو حال سے خالی نہیں: یا تو قلیل ہوگا، تو وہ اسی وقت ناپاک ہو جائے گا۔ یا کثیر ہوگا، تو یہ حرکتیں ناپاکی کا باعث بنیں گی، بایں طور کہ دوسرے لوگ بھی اس کے دیکھا دیکھی یہی حرکتیں کرنے لگیں گے۔ پس رفتہ رفتہ پانی ناپاک ہو جائے گا۔ غرض یہ ممانعت پانی کو ناپاک ہونے سے بچانے کے لئے ہے (اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی صورت میں ممانعت کی وجہ پانی کو ناپاک ہونے سے بچانا ہو، اور دوسری صورت میں پانی کو نظیف رکھنا ہو)

دوسری وجہ: یہ ہے کہ پانی میں پیشاب کرنا یا نہانا لوگوں کے لئے ضرر رساں ہے۔ پس یہ حدیث بمنزلہ اس حدیث کے ہے، جس میں فرمایا ہے کہ: ''دو باعثِ لعنت چیزوں سے بچو'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۹) کیونکہ ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا یا نہانا بھی باعثِ لعنت امر ہے۔ یہ پانی سب لوگوں کے لئے ہے۔ پس جو یہ حرکت کرے گا اس پر لوگ پھٹکار بھیجیں گے۔

مسئلہ: اگر پانی بہت زیادہ ہو یا جاری ہو تو اس میں نہانا جائز ہے۔ اور اس میں پیشاب کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ مگر احتراز بہر حال اَولیٰ ہے۔

﴿أحكامُ المِياه﴾

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " لايبولنَّ أحدُكم في الماء الدائمِ الذي لا يَجْرِي، ثم يغتسل فيه"

أقول: معناه: النهي عن كل واحد من البول في الماء، والغُسل فيه، مثل حديث:" لايخرج الرَّجلان يضربانِ الغائطَ، كاشِفَيْنِ عن عورتهما يتحدثان، فإن اللّٰه يَمْقُتُ على ذلك". ويبيِّنُ ذلك روايةُ النهي عن البول في الماء فقط، وروايةٌ أخرى في النهي عن الاغتسال فقط.

والحكمة: أن كلَّ واحد منهما لايخلو من أحد أمرين: إما أن يغيِّرَ الماءَ بالفعل، أو يُفضي إلى التغيير، بأن يراه الناسُ يفعل، فيَتَتابَعُوا، وهو بمنزلة اللاَّعِنَيْن. اللّٰهم إلا أن يكون الماءُ مستبحرًا أو جاريًا، والعفافُ أفضلُ كلَّ حال.

ترجمہ: پانی کے احکام: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''ہرگز پیشاب نہ کرے تم میں سے کوئی ہمیشہ رہنے والے پانی میں جو بہتا نہیں ہے، پھر نہائے وہ اس میں'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب: روکنا ہے ہر ایک سے: پانی میں پیشاب کرنے سے اور اس میں نہانے سے، جیسے حدیث: ''نہ نکلیں دو آدمی، جا رہے ہوں وہ پائخانہ کے لئے، کھولنے والے ہوں وہ اپنی شرمگاہوں کو، آپس میں باتیں کر رہے ہوں وہ، پس بیشک اللہ تعالیٰ غضبناک ہوتے ہیں اس سے'' اور اس کی وضاحت کرتی ہے پانی میں صرف پیشاب کرنے کی ممانعت کی روایت۔ اور ایک دوسری روایت: صرف نہانے کی ممانعت کی۔

اور حکمت: (۱) یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک: دو باتوں میں سے ایک بات سے خالی نہیں: یا تو یہ کہ بدل دیگا وہ پانی کو اُسی وقت، یا مُفضی ہوگا وہ تغیر کی طرف، بایں طور کہ دیکھیں گے اس کو لوگ یہ کام کرتا ہوا۔ پس پے بہ پے کرنے لگیں گے وہ یہ کام (۲) اور وہ بمنزلہ دو لعنت کرنے والی چیزوں کے ہے —— اے اللہ! مگر یہ کہ ہو وہ پانی بہت ہی زیادہ یا بہتا ہوا۔ اور بچنا ہر حال میں بہتر ہے۔

لغت: مُسْتَبْحِرًا (اسم فاعل) بہت زیادہ اِسْتَبْحَرَ فی العلم أو المال: وسیع العلم یا کثیر المال ہونا۔

☆ ☆ ☆

ماءِ مستعمل پاک ہے مگر پاک کرنے والا نہیں

اگر وضوء کرنے والے اور غسل کرنے والے کے بدن پر کوئی حسی نجاست نہ ہو تو جو پانی وضوء یا غسل میں استعمال کیا گیا ہے، وہ جسم سے جدا ہونے کے بعد مستعمل ہو جاتا ہے۔ اور وہ پاک تو ہے مگر پاک کرنے والا نہیں۔ پس اس سے دوبارہ وضوء اور غسل درست نہیں۔ اس مسئلہ میں کوئی صریح حدیث نہیں ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا جہاں میں کوئی بھی مستعمل پانی کو طہارت میں استعمال نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ متروک و مہجور چیز کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس کو اسی حال پر باقی رکھا یعنی دوبارہ اس کو طہارت میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بارے میں صاف کچھ ارشاد بھی نہیں فرمایا۔ البتہ اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ وہ فی نفسہ پاک ہے، پس اس کے چھینٹے کپڑوں وغیرہ پر پڑیں تو وہ ناپاک نہیں ہوگا۔

[۲] وأما الماءُ المستعمل: فما كان أحدٌ من طوائف الناس يستعملُه في الطهارة، وكان كالمهجور المطرود، فأبقاه النبيُّ صلى الله عليه وسلم على ما كان عندهم، ولاشك أنه طاهر.

ترجمہ: (۲) اور رہا مستعمل پانی: پس نہیں استعمال کیا کرتا تھا اس کو لوگوں کی جماعتوں میں سے کوئی طہارت میں۔

اور تھا وہ چھوڑی ہوئی دُھتکاری ہوئی چیز کی طرح۔ پس باقی رکھا اس کو نبی ﷺ نے اس حالت پر جو تھی لوگوں کے نزدیک۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پاک ہے۔

☆ ☆ ☆

حدیث قلتین کا مطلب

حدیث ——— حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اُس پانی کے بارے میں دریافت کیا گیا جو وسیع بیابان میں ہوتا ہے، اور اس پر نوبت بنوبت چار پائے اور درندے آتے ہیں یعنی وہ آکر اس میں سے پیتے ہیں اور وہاں پیشاب وغیرہ کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب پانی دو مٹکے ہو جائے تو وہ ناپاکی کو نہیں اٹھاتا'' یعنی ناپاک نہیں ہوتا (مشکوۃ حدیث ۴۷۷ باب المیاہ)

تشریح: حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع کرنے سے پہلے تین باتیں عرض ہیں:

پہلی بات: ظاہریہ (ظاہر حدیث پر عمل کرنے والے یعنی غیر مقلدین) کہتے ہیں کہ پانی میں نجاست کے گرنے سے پانی مطلقاً ناپاک نہیں ہوتا۔ پانی خواہ جاری ہو یا ٹھہرا ہوا۔ اور خواہ کم ہو یا زیادہ۔ اور خواہ رنگ، بو یا مزہ بدلے یا نہ بدلے۔ پانی کی ذات پاک ہے۔ وہ ناپاک نہیں ہوسکتی۔ معلوم نہیں ان کے نزدیک پیشاب کیوں ناپاک ہے۔ وہ بھی تو اصل میں پانی ہے؟!

اور تمام محدثین وفقہاء کہتے ہیں کہ اگر پانی کثیر ہے تو ناپاک نہیں ہوگا۔ البتہ اگر پانی کا کوئی وصف بدل جائے تو ناپاک ہو جائے گا اور اگر پانی تھوڑا ہے تو ناپاک ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا کوئی وصف نہ بدلے، پھر ائمہ اربعہ میں قلیل وکثیر کی تحدید میں اختلاف ہے:

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر ناپاکی گرنے سے پانی کا کوئی وصف نہ بدلے تو وہ کثیر ہے۔ اور اگر کوئی وصف بدل جائے تو وہ قلیل ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک قلتین کی مقدار کثیر ہے، اور اس سے کم قلیل ہے۔ اور احناف کے نزدیک اگر پانی کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ ایک طرف کے ہلانے سے دوسری طرف کا پانی نہیں ہلتا تو وہ کثیر ہے۔ اور اس سے کم ہے تو قلیل ہے۔ پھر بعد میں اس کی تحدید دَہ در دہ سے کی گئی۔ یعنی یہ اصل مذہب نہیں ہے۔ بلکہ مذہب کی تفصیل وتقدیر ہے۔

دوسری بات: امام مالک رحمہ اللہ نے قلتین کی حدیث کو نہیں لیا۔ ان کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور اس اعتبار سے شاذ بھی ہے کہ بہت بعد میں ظاہر ہوئی ہے۔ صحابہ وتابعین کے دور میں یہ حدیث معروف نہیں تھی۔ حالانکہ محدثین کے خیال کے مطابق یہ حدیث برتن اور حوض کے پانی سے متعلق ہے، جو ایک عامۃ الورود مسئلہ ہے پھر یہ حدیث

مخفی کیوں رہی؟ —— اور احناف کے نزدیک یہ حدیث ایسی ضعیف نہیں ہے کہ قابل اخذ نہ ہو۔ مگر یہ حدیث برتنوں، کنوؤں اور کھڈوں کے پانی سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ بہتے ہوئے پانی سے متعلق ہے یعنی جنگلات میں جو چشمے اور آبشاریں ہیں ان سے اس حدیث کا تعلق ہے۔ حدیث کے شانِ ورود میں اس کی صراحت ہے کہ ان پانیوں پر دن میں لوگوں کے جانور پینے کے لئے پہنچتے ہیں، اور رات میں جنگل کے درندے وارد ہوتے ہیں۔ اور سوال جواب میں لوٹایا جاتا ہے۔ پس بلغ الماء میں الف لام عہدی ہے۔ اور آپ ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ پانی بتدریج جمع ہوتا ہوا دو مٹکے ہو جائے [1] (بلغ کا یہی مفہوم ہے) اور بہنے لگے تو اس میں جو ناپاکی (لعاب پیشاب وغیرہ) کرے گی وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ جائے گی۔ پانی کی سطح پر نہیں ٹھیرے گی (ناپاکی کو سر پر نہ اٹھانے کا یہی مطلب ہے) اور جب ناپاکی گرتے ہی بہہ گئی تو اس چشمہ اور آبشار کا پانی ناپاک نہ ہوگا —— اور چونکہ چشموں اور آبشاروں کا مسئلہ بہت کم لوگ دریافت کرتے ہیں، اس لئے یہ حدیث عرصہ تک مخفی رہی۔ پھر جب تدوین حدیث کا دور آیا تو یہ حدیث عام وخاص کے سامنے آئی۔

اور محدثین کرام (شوافع اور حنابلہ) نے اس حدیث کا مصداق برتنوں اور کھڈوں کے پانی کو بنایا ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے انہی کی رائے کے مطابق حدیث کی شرح کی ہے۔

تیسری بات: احناف صرف پانی کے پھیلاؤ کا اعتبار کرتے ہیں۔ مقدار کا اعتبار نہیں کرتے۔ اور احناف نے قلیل وکثیر پانی کے درمیان حدِ فاصل غدیر عظیم کی روایت کو بنایا ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار کے پہلے باب میں، شروع ہی میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ ایک تالاب میں مردار پڑا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے دوسری جانب سے پانی استعمال کرنے کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں مشکوۃ شریف میں بھی حوضوں کے سلسلہ میں دو روایتیں ہیں (حدیث ۴۸۶ و ۴۸۸) یہ سب احناف کے مستدل ہیں —— اور شوافع اور حنابلہ پانی کی مقدار کا بھی اعتبار کرتے ہیں اور پھیلاؤ کا بھی۔ دو قلّے یعنی پانچ مشکیں یعنی ۵۰۰ رطل یعنی ۲۰۳ کلو پانی ان کے نزدیک ماء کثیر ہے۔ اور چاروں طرف سے سوا سوا ہاتھ پانی ان کے نزدیک حوض کا ادنی درجہ ہے۔

ان تین ضروری باتوں کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی بات شروع کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جب پانی دو مٹکوں کی بقدر ہو، تو اس میں وضوء اور غسل کرنے سے یا اس میں ناپاکی گرنے سے وہ معنوی گندگی کو نہیں اٹھاتا یعنی ناپاک نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ حسّی طور پر گندہ معلوم ہو، اور لوگ عرف وعادت میں اس کو گندہ تصور کریں۔ مگر شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ناپاک نہیں ہے۔ البتہ اگر اس میں ناپاکی اتنی گر جائے

[1] ایک روایت میں دو مٹکے یا تین مٹکے آیا ہے اور ایک روایت میں چالیس مٹکے آیا ہے یہ اختلاف سائل کے علاقہ میں پائے جانے والے چشموں اور آبشاروں کے چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ سے ہے ۱۲

کہ پانی میں تبدیلی آجائے اور ناپاکی کمیت یا کیفیت کے اعتبار سے زیادہ ہوجائے تو وہ پانی ناپاک ہوجائے گا۔ ایسا پانی حدیث کا مصداق نہیں ہے۔ کمیت یعنی مقدار کے اعتبار سے زیادہ ہوجائے جیسے ایک کلو غیر مستعمل پانی میں سوا کلو مستعمل پانی مل جائے۔ اور کیفیت یعنی پانی کا وصف بدل جائے۔ چاہے نجاست مقدار میں کم ہو۔

تنبیہ: جو لوگ حوض سے وضو کرتے ہیں وہ یہ بے احتیاطی کرتے ہیں کہ کلی بھی حوض میں ڈالتے ہیں۔ ناک بھی اسی میں صاف کرتے ہیں۔ اور پیروں کا میل بھی اسی میں گراتے ہیں۔ اور سمجھایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ حوض ناپاک نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے ناپاک نہیں ہوتا، مگر گندہ تو ہوتا ہے۔ اس لئے یہ طریقہ مناسب نہیں۔ اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ عام طور پر حوض کے ساتھ نالی بنائی جاتی ہے۔ اس کو استعمال کرنا چاہئے۔ واللہ الموفق!

[۳] **قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا بلغ الماءُ قُلَّتين لم يحمِلْ خَبَثًا"**

أقول: معناه: لم يحمل خبثا معنويا، إنما يَحكم به الشرع، دون العرفِ والعادةِ، فإذا تغيَّر أحدُ أوصافه بالنجاسة، وفحشت النجاسة كمًّا أو كيفًا، فليس مما ذكر.

ترجمہ: (۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "جب پانی دو مٹکوں کو پہنچ جائے تو وہ گندگی کو نہیں اٹھاتا" میں کہتا ہوں: اس کا مطلب: وہ معنوی گندگی کو نہیں اٹھاتا۔ اس کے بارے میں شریعت ہی فیصلہ کرتی ہے، نہ کہ عرف وعادت ——— پس جب بدل جائے اس کے اوصاف میں سے کوئی وصف ناپاکی کی وجہ سے، اور زیادہ ہوجائے ناپاکی کمیت یا کیفیت کے اعتبار سے تو نہیں ہے وہ اس میں سے جو ذکر کیا گیا۔

☆ ☆ ☆

قُلَّتین کو قلیل وکثیر پانی کے درمیان حدّ فاصل کیوں مقرر کیا؟

قلیل وکثیر پانی کے درمیان دو قُلّوں کو حد فاصل ایک ایسی اہم وجہ سے مقرر کیا ہے جس کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ یہ تحدید زبردستی کی بات اور اٹکل پچو کا فیصلہ نہیں ہے۔ اور اسی طرح شریعت نے جو دیگر مقداریں متعین کی ہیں ان کی بھی کوئی اہم وجہ ہوتی ہے۔ مثلاً چاندی کا نصاب دو سو درہم مقرر کیا ہے تو اس کی وجہ ہے (دیکھئے رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۲۱۴)

اور اس کی تفصیل: یہ ہے کہ پانی کی دو جگہیں ہیں: ایک: مَنبع (پانی کا سرچشمہ) دوسری: برتن۔ مَنبع: کنویں اور چشمے ہیں۔ اور سیلاب کے نالے کھڈے ان کے ساتھ ملحق ہیں۔ اور برتن: چمڑے کی مشکیں، مٹکے، لگن، ٹب اور چھاگل ہیں۔ اور دونوں میں تین وجوہ سے فرق ہے:

پہلی وجہ: پانی کا منبع اگر ناپاک ہوجائے تو لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے اور ان کا پانی نکالنے میں بہت پریشانی ہوتی ہے

اور برتنوں کا حال اس سے مختلف ہے۔وہ روز بھرے جاتے ہیں اوران کا پانی پھینک دینے میں کوئی پریشانی نہیں۔

دوسری وجہ: منبع کا سر پوش نہیں ہوتا اوراس کو لید گوبر سے اور درندوں کے منہ ڈالنے سے بچانا بھی ممکن نہیں۔اور برتنوں کو ڈھانکنے میں اوران کی حفاظت کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ——— ہاں ہروقت گھر میں آنے جانے والے لوگوں کا اور جانوروں کا معاملہ الگ ہے۔

تیسری وجہ: منبع میں پانی بہت زیادہ ہوتا ہے۔بہت سی ناپاکیاں تو اس میں اثر انداز ہی نہیں ہوتیں۔اور برتنوں کا پانی کم ہوتا ہے۔اس لئے اس میں ناپاکی اثر انداز ہوتی ہے۔

غرض مذکورہ وجوہ سے ضروری ہے کہ منبع کا حکم برتنوں کے حکم سے مختلف ہو۔اور منبع میں وہ سہولت دی جائے جو برتنوں میں نہیں دی جاتی۔

اور منبعوں اور برتنوں میں حد فاصل بننے کی صلاحیت صرف دو قلّوں میں ہے۔اس لئے کہ کنوؤں اور چشموں کا پانی دو مٹکوں سے یقیناً کم نہیں ہوتا۔اور جس برساتی نالے یا کھڈے میں اس سے کم پانی ہوتا ہے وہ حوض اور گڑھا نہیں کہلاتا، بلکہ اس کو چھوٹا کھڈا کہتے ہیں ——— اور پانی کے برتنوں میں سب سے بڑا برتن مٹکا ہے۔اس سے بڑا برتن عربوں کے معاشرہ میں نہیں پایا جاتا تھا۔اور مٹکے سب یکساں نہیں ہوتے۔کوئی مٹکا بڑا ہوتا ہے جو چھوٹے ڈیڑھ مٹکے کے برابر ہوتا ہے،کوئی سوا مٹکے کے برابر اور کوئی پونے دو مٹکوں کے برابر۔مگر کوئی بڑا مٹکا چھوٹے دو مٹکوں کے برابر نہیں ہوتا۔اس لئے دو مٹکے ایک ایسی حد ہیں جس تک عام طور پر برتن نہیں پہنچتے اور جس سے کم پانی کسی منبع میں نہیں ہوتا،اس لئے دو مٹکوں کو کثیر و قلیل کے درمیان حد فاصل بنایا گیا ہے۔

خلاصہ: یہ ہے کہ پانی کی وہ مقدار جس کی کسی برتن میں سمائی نہیں وہ منبع کا پانی ہے۔اور جس کی کسی برتن میں گنجائش ہے،وہ برتنوں کا پانی ہے۔اول میں آسانی کی گئی ہے۔ثانی میں آسانی نہیں کی گئی۔

فائدہ:(۱) جب دو مٹکے پانی کسی ہموار زمین میں ہو تو وہ عموماً سات بالشت لمبا اور پانچ بالشت چوڑا ہوتا ہے (۷×۵=۳۵ بالشت مربع اور ایک بالشت نو انچ کا ہوتا ہے) اور یہ (شوافع اور حنابلہ کے نزدیک) حوض کا ادنی درجہ ہے۔

فائدہ:(۲) جو لوگ قلتین سے پانی کی تحدید نہیں کرتے،ان کو بھی ایسی ہی کوئی اور چیز ماء کثیر کو منضبط کرنے کے لئے ماننی پڑتی ہے۔جیسے حنفیہ کو دَہ دردَہ کا قائل ہونا پڑا ہے۔اور مالکیہ کو جنگلات کے کنوؤں میں اونٹوں کی مینگنیوں جیسی ناپاکی کی مطلقاً اجازت دینی پڑی ہے۔پس ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے سے بہتر یہ ہے کہ قلتین کی حدیث کو معیار مان لیا جائے۔

فائدہ:(۳) حدود شرعیہ کے معاملہ کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔شریعت نے جو بھی مقدار متعین کی ہے وہ ایک ایسی ضروری حد ہے کہ اس کو مانے بغیر چارہ نہیں۔اور عقلاً اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں۔

نوٹ: یہ تینوں فائدے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت میں موجود ہیں۔ البتہ پہلا فائدہ درجِ کلام میں آگیا ہے۔
ملحوظہ: پہلے یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ احناف: غدیرِ عظیم کی روایت سے مائے کثیر کی تحدید کرتے ہیں۔ اور مالکیہ تحدید کے قائل نہیں۔ اور جنگلات کے کنووں میں سہولت تو سبھی فقہاء دیتے ہیں۔ نیز قلتین کی روایت مائے جاری سے متعلق ہے۔ پھر اس سے تحدید کیسے ممکن ہے؟!

[٤] وإنما جُعل القلتين حدًا فاصلاً بين الكثير والقليل لأمر ضروري لابدّ منه، وليس تحكمًا ولا جُزافًا، وكذا سائرُ المقادير الشرعية.

وذلك: أن للماءِ محلّين: معدِنٌ وأوانٍ: أما المعدنُ: فالآبار والعيون، ويلحق بها الأودية، وأما الأواني: فالقِرَبُ، والقِلالُ، والجفان، والمخاضبُ، والإداوة؛ وكان المعدنُ يتضررون بتنجُّسه، ويقاسُون الحرج في نزحه؛ وأما الأواني: فتملأ في كل يوم، ولا حرج في إراقتها؛ والمعدن: ليس لها غطاء، ولايمكن سترُها من رَوْث الدواب ووَلْغ السباع، وأما الأواني: فليس في تغطيتها وحفظها كثيرُ حرج، اللّهم إلا من الطوافين والطوافات؛ والمعدِنُ كثيرٌ عزيزٌ، لا يؤثّر فيه كثيرٌ من النجاسات، بخلاف الأواني. فوجب أن يكون حكمُ المعدِنِ غيرَ حكم الأواني، وأن يُرخّص في المعدن مالا نُرخّص في الأواني.

ولايصلح فارقًا بين حدّ المعدن وحدّ الأواني إلا القلتان، لأن ماء البئر والعين لايكن أقلَّ من القلتين البتّة، وكلُّ مادون القلتين من الأودية لايسمى حوضا ولا جوبةً، وإنما يقال له حُفَيْرةٌ؛ وإذا كان قدرُ قلتين في مستوٍ من الأرض يكون غالبًا سبعةَ أشبارٍ في خمسةِ أشبارٍ، وذلك أدنى الحوض.

وكان أعلى الأواني القلّةَ، ولايُعرف اعلى منها عندهم آنيةٌ، وليست القِلال سواءً، فقلّةٌ عندهم تكون قلةً ونصفًا، وقلةً وربعا، وقلةً وثلثا، ولا تُعرف قلةٌ تكون كقلتين، فهذا حدٌّ لا تبلُغه الأواني، ولا ينزل منه المعدنُ، فضُرب حدًا فاصلا بين الكثير والقليل.

ومن لم يقل بالقلتينِ اضطُرَّ إلى مثلهما في ضبط الماء الكثير، كالمالكية، أو الرخصةِ في آبار الفلوات من نحو أَبعار الإبل، فمن هنا ينبغي أن يَعْرِفَ الإنسانُ أمرَ الحُدودِ الشرعية، فإنها نازلةٌ على وجه ضروري، لايجدون منه بدًا، ولا يجوِّز العقلُ غيرَها.

ترجمہ: (۴) اور دو مٹکے ہی حد فاصل بنائے گئے ہیں کثیر وقلیل کے درمیان ایک ایسے ضروری امر کی وجہ سے جس

سے کوئی چارہ نہیں۔ اور نہیں ہے وہ زبردستی کی بات اور نہ اٹکل پچو کا تیر۔ اور اسی طرح دیگر مقادیر شرعیہ (شریعت کے مقرر کیے ہوئے اندازے) ہیں۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ پانی کے لئے دو جگہیں ہیں: معدن (منبع) اور برتن۔ رہا منبع: تو وہ کنویں اور چشمے ہیں۔ اور برساتی نالے کھڈے ان کے ساتھ ملائے جائیں گے۔ اور رہے برتن: تو وہ مشکیں اور مٹکے اور لگن اور ٹب اور چھاگل ہیں ــــ (۱) اور لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے منبعوں کے ناپاک ہونے سے۔ اور تنگی برداشت کرتے ہیں وہ اس کا پانی کھینچنے میں۔ اور رہے برتن: تو وہ روزانہ بھرے جاتے ہیں۔ اور کوئی پریشانی نہیں ہے ان کا پانی بہانے میں ــــ (۲) اور منبع: نہیں ہے اس کے لئے سرپوش۔ اور نہیں ممکن ہے اس کو چھپانا جانوروں کی لید گوبر اور درندوں کے منہ ڈالنے سے۔ اور رہے برتن: پس نہیں ہے ان کے ڈھانکنے میں اور ان کی حفاظت میں کوئی پریشانی۔ اے اللہ! مگر ہر وقت آنے جانے والے لوگوں اور جانوروں سے ــــ (۳) اور منبع میں بہت ہی زیادہ پانی ہوتا ہے۔ اس میں اثر انداز نہیں ہوتیں بہت سی ناپاکیاں، برخلاف برتنوں کے ــــ پس ضروری ہے کہ منبع کا حکم برتنوں کے حکم کے علاوہ ہو۔ اور یہ (ضروری ہے) کہ اجازت دی جائے منبع میں اس بات کی جس کی اجازت نہیں دی جاتی برتنوں میں۔

اور نہیں صلاحیت رکھتے منبع اور برتنوں کی حدوں کے درمیان فاصل بننے کی مگر دو مٹکے۔ اس لئے کہ کنویں اور چشمہ کا پانی یقیناً دو مٹکوں سے کم نہیں ہوتا۔ اور ہر وہ چیز جو دو مٹکوں سے کم ہے برساتی نالوں کھڈوں میں سے، نہیں کہلاتی وہ حوض اور گڑھا۔ اور اسے صرف چھوٹا کھڈا ہی کہا جاتا ہے ــــ اور جب دو مٹکوں کی مقدار کسی ہموار زمین میں ہو تو وہ عموماً سات بالشت مضروب پانچ بالشت ہوتی ہے۔ اور یہ حوض کا ادنی درجہ ہے (یہ پہلا فائدہ ہے)

اور پانی کے برتنوں میں سب سے بڑا برتن مٹکا تھا۔ اس سے بڑا برتن عربوں کے نزدیک معروف نہیں تھا۔ اور مٹکے یکساں نہیں ہیں۔ پس کوئی مٹکا تو عربوں کے نزدیک ڈیڑھ مٹکے کے بقدر ہوتا تھا، اور کوئی سوا مٹکے کے بقدر، اور کوئی پونے دو مٹکوں کے بقدر۔ اور نہیں معروف تھا کوئی مٹکا جو دو مٹکوں کے بقدر ہو۔ پس یہ (دو مٹکے) ایک ایسی حد ہیں جس تک برتن نہیں پہنچتے۔ اور جس سے منبعے نیچے نہیں اترتے۔ پس وہ حد فاصل بنائی گئی قلیل و کثیر کے درمیان۔

اور جو شخص قلتین کا قائل نہیں ہے، مجبور ہوتا ہے وہ قلتین کے مانند کی طرف ماءِ کثیر کو منضبط کرنے میں۔ جیسے مالکیہ یا اجازت دینے کی طرف جنگلات کے کنوؤں میں اونٹوں کی مینگنیوں جیسی چیزوں سے (یہ دوسرا فائدہ ہے) ــــ پس یہاں سے مناسب ہے کہ آدمی پہچانے حدودِ شرعیہ کے معاملہ کو۔ پس بیشک وہ اترنے والی ہیں ایک ایسی ضروری حد پر جس سے کوئی چارہ نہیں۔ اور نہیں جائز قرار دیتی عقل اس کے علاوہ کو (یہ تیسرا فائدہ ہے)

تصحیح: تمام نسخوں میں کالمالکیۃ ہے۔ مگر یہ سبقتِ قلم معلوم ہوتی ہے۔ صحیح کالحنفیۃ ہے۔

☆ ☆ ☆

حدیث بیر بُضاعہ کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا: ''یارسول اللہ! کیا ہم بیر بضاعہ سے وضو کریں درانحالیکہ وہ ایک ایسا کنواں ہے، جس میں حیض کے چیتھڑے، کتوں کا گوشت اور بدبودار چیزیں ڈالی جاتی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک (بیر بضاعہ کا) پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۸)

حدیث ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی کسی بیوی نے ایک بڑے پیالے سے غسل کیا۔ پھر آپؐ نے اس سے وضو کرنا چاہا تو بیوی صاحبہ نے عرض کیا کہ میں جنبی تھی، تو آپؐ نے فرمایا: ''بیشک پانی جنبی نہیں ہوتا'' (مشکوۃ حدیث ۴۵۷)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بحالتِ جنابت آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی۔ آپؐ نے ان کا ہاتھ پکڑا۔ وہ آپؐ کے ساتھ چلتے رہے۔ جب آپؐ کسی جگہ تشریف فرما ہوئے تو وہ کھسک گئے۔ اپنے ڈیرے میں گئے، نہائے اور حاضر خدمت ہوئے، آپؐ ابھی تک تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے دریافت کیا: ''کہاں چلے گئے تھے؟'' انھوں نے صورت حال عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''بیشک مؤمن ناپاک نہیں ہوتا'' (مشکوۃ حدیث ۴۵۱)

حدیث ـــــ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وفدِ ثقیف کو مسجد نبوی میں اتارا دیا تاکہ ان کے دل پسیجیں۔ آپؐ سے اس سلسلہ میں عرض کیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہیں۔ آپؐ نے ان کو مسجد میں ٹھیرایا ہے! آپ نے فرمایا: ''بیشک زمین ناپاک نہیں ہوتی۔ ناپاک انسان ہی ہوتا ہے'' (سنن بیہقی ۲: ۴۴۵)

نوٹ: البدن لاینجس کے لفظ سے حدیث یاد نہیں پڑتی۔ اور سرسری تلاش میں ملی بھی نہیں۔

تشریح: بُضاعہ: ایک عورت کا نام ہے۔ یہ عورت اسلام سے پہلے گذری ہے۔ اس نے مدینہ منورہ میں ایک کنواں بنایا تھا۔ جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک موجود تھا۔ اس کنویں سے آپؐ کے استعمال کے لئے پانی لایا جاتا تھا۔ اور لوگ بھی اس کا پانی استعمال کرتے تھے۔ یہ کنواں مدینہ کے ڈھلان میں واقع تھا۔ برسات میں شہر کا پانی اس پر سے گذرتا تھا۔ اور شہر کا سارا کوڑا اس میں گرتا تھا۔ برسات کے بعد اس سے پانچ باغات کی سینچائی شروع ہوتی تھی۔ جب کنویں کا پانی سارا نکل جاتا تھا تو اس کا پانی لوگ استعمال کرنے لگتے تھے۔ اس کے بارے میں پہلی حدیث میں دریافت کیا گیا ہے۔ اور آپؐ نے مذکورہ جواب ارشاد فرمایا ہے۔

حدیث بیر بضاعہ کو مالکیہ اور ظاہریہ نے لیا ہے۔ وہ الـمـاء میں اَلْ استغراقی مانتے ہیں یعنی دنیا کا ہر پانی پاک

ہے۔البتہ مالکیہ اس حدیث کے ساتھ حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ملاتے ہیں۔اور اس کو استثناء قرار دیتے ہیں کہ اگر پانی کا کوئی وصف بدل جائے تو پانی ناپاک ہوجائے گا۔اور ابواُمامہؓ کی حدیث ابن ماجہ نے روایت کی ہے (حدیث نمبر ۵۲۱) اصحاب ظواہر اس کو نہیں لیتے۔وہ کہتے ہیں کہ اس کا ایک راوی رِشدین بن سعد ضعیف ہے۔

اور جمہور کے نزدیک حدیث بیر بضاعہ میں الْ استغراقی نہیں ہے، بلکہ عہدی ہے۔اور یہ ارشاد صرف بیر بُضاعہ کے پانی سے متعلق ہے، تمام پانیوں کے بارے میں نہیں ہے۔شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مذکورہ تمام حدیثوں میں مخصوص نجاست کی نفی ہے۔جو حالی یا مقالی قرائن سے سمجھ میں آتی ہے۔پس:

۱ــــ پانی ناپاک نہیں ہوتا یعنی منبع (سرچشمہ) میں ناپاکی گر جائے، اور وہ نکال دی جائے، اور پانی کا کوئی وصف نہ بدلے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔

۲ــــ بدن ناپاک نہیں ہوتا یعنی بدن دھوڈالا جائے تو پاک ہوجاتا ہے (یہ حدیث نہیں ملی)

۳ــــ زمین ناپاک نہیں ہوتی یعنی اس پہ بارش یا دھوپ پڑے یا اس کو پیر سے رگڑ دیں، اور ناپاکی کا اثر بالکلیہ زائل ہوجائے تو وہ پاک ہوجاتی ہے۔(یہ مطلب سیاق حدیث کے خلاف ہے)

۴ــــ پانی جنبی نہیں ہوتا یعنی جنبی کے نہانے کے بعد برتن میں بچا ہوا پانی ناپاک نہیں ہے۔

۵ــــ مؤمن ناپاک نہیں ہوتا یعنی جیسا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سمجھ رہے ہیں ایسا ناپاک نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے ساتھ مصافحہ بھی نہ کرسکے اور نہ وہ کسی کے ساتھ بیٹھ سکے۔

۶ــــ زمین ناپاک نہیں ہوتی۔انسان ہی ناپاک ہوتا ہے یعنی مشرک کے عقیدے کی گندگی اس کی ذات تک منحصر ہے۔زمین پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

نوٹ:۴-۶ شارح کا اضافہ ہے۔آگے فرماتے ہیں:

سوچئے! کیا یہ بات قابلِ تصور ہے کہ بُضاعہ نامی کنوئیں میں مذکورہ ناپاکیاں پڑی رہتی ہوں، اور لوگ پانی استعمال کرتے ہوں؟ ہرگز نہیں! بلکہ صورتِ حال یہ تھی کہ مذکورہ ناپاکیاں بلا ارادہ اس کنوئیں میں پڑتی تھیں۔ان کو اس میں کوئی ڈالتا نہیں تھا۔جیسا کہ ہم اپنے زمانہ کے کنوؤں میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔پھر وہ ناپاکیاں نکال دی جاتی تھیں۔اور اس کا پانی استعمال کیا جاتا تھا۔

پھر جب اسلام کا زمانہ آیا تو لوگوں نے اس کا شرعی حکم پوچھا کہ کیا وہی پاکی کافی ہے جو لوگ سمجھتے ہیں یا شریعت میں اس سلسلہ میں کچھ زائد حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کے نزدیک جو طہارت ہے وہی کافی ہے، اس سے زائد کچھ مطلوب نہیں۔

سوال: اگر اصحاب ظواہر کہیں کہ حدیث پر [illegible] یہ سب تاویل ہے اور حدیث کو ظاہر سے پھیرنا ہے، جو جائز نہیں۔

جواب: یہ زبردستی کا مطلب نہیں ہے، نہ حدیث کو ظاہر سے پھیرنا ہے۔ بلکہ یہ عربوں کا انداز کلام ہے۔ مثلاً:

۱— سورۃ الانعام آیت ۱۴۵ میں ہے: ''آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں، ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھاوے، مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا یہ کہ بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے، یا جو جانور شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کردیا گیا ہو'' اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بس یہی جانور حرام ہیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ جانور بھی حرام ہیں۔ بلکہ مخصوص حرمت کی نفی مقصود ہے یعنی جن جانوروں میں تم اختلاف کرتے ہو، جن کا تذکرہ اوپر کی آیات میں آیا ہے، وہ مجھ پر نازل شدہ وحی میں حرام نہیں ہیں۔

۲— کسی حکیم سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے، اور وہ کہے کہ اس کا استعمال جائز نہیں تو یہ جواز کی نفی عام نہیں ہے، بلکہ بدن کی تندرستی کے اعتبار سے ہے۔

۳— کسی مفتی سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے، اور وہ کہے کہ جائز نہیں تو اس سے شرعی جواز ہی کی نفی مقصود ہوتی ہے۔

۴— سورۃ النساء آیت ۲۳ میں ہے: ''تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں'' یعنی ان سے نکاح حرام کیا گیا۔

۵— سورۃ المائدہ آیت ۳ میں ہے: ''تم پر مردار حرام کیا گیا'' یعنی اس کا کھانا حرام کیا گیا۔

۶— حدیث شریف میں ہے کہ: ''نہیں ہے نکاح مگر ولی کے ذریعہ'' یعنی شرعاً وہ نکاح درست نہیں۔ وجود خارجی کی نفی نہیں کی گئی۔

لطیفہ: ایک عالم نے مسئلہ بیان کیا کہ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے کہا: ''چرا نمی شود، من بارہا خواندم وشد!'' کیوں نہیں ہوتی، میں نے بارہا پڑھی ہے اور ہوگئی ہے۔ حالانکہ عالم نے شرعاً صحت کی نفی کی تھی۔ اور اُن صاحب نے وجود خارجی کی نفی سمجھ لی!

الغرض: اس قسم کی چیزیں بہت ہیں۔ اور وہ از قبیل تاویل نہیں ہیں۔ (یہ بات رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۵۵۴ میں بھی گذر چکی ہے)

[۵] قوله صلى الله عليه وسلم: " الماءُ طَهور لا يُنَجِّسُه شيئ" وقوله صلى الله عليه وسلم: "الماءُ لايُجْنِبُ" وقوله صلى الله عليه وسلم: " المؤمن لايَنْجَسُ" ومثلُه مافي الأخبار: من أن

البدن لايَنْجَسُ، والأرض لا تَنْجَسُ.

أقول: معنى ذلك كلّه يرجع إلى نفي نجاسة خاصة، تدل عليه القرائن الحالية والقالية. فقوله: "الماء لايَنْجَسُ" معناه: المعادن لا تَنْجَسُ بملاقاة النجاسةِ، إذا أُخرجت ورُميت، ولم يتغير أحدُ أوصافه، ولم تَفْحُشْ، والبدنُ يُغسل فيَطْهُر، والأرضُ يُصيبها المطر والشمس وتَدْلُكها الأرجُلُ فتطْهُر.

وهل يمكن أن يُظَنَّ ببئر بُضاعة: أنها كانت تستقر فيها النجاسات؟! كيف، وقد جرت عادةُ بني آدم بالاجتناب عما هذا شأنه، فكيف يستقي بها رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ بل كانت تقع فيها النجاسات من غير أن يقصد إلقاؤها، كما نشاهد من آبار زماننا، ثم تخرج تلك النجاساتُ، فلما جاء الإسلام، سألوا عن الطهارة الشرعية الزائدة على ما عندهم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "الماء طهور، لاينجسه شيئ" يعني لايَنْجَسُ نجاسةً غير ما عندكم.

وليس هذا تأويلا، ولا صرفًا عن الظاهر، بل هو كلام العرب؛ فقوله تعالى: ﴿قُلْ: لَّآ أَجِدُ فِيمَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ﴾ الآيةَ، معناه: مما اختلفتم فيه، وإذا سئل الطبيب عن شيئ، فقال: لايجوز استعماله، عُرف أن المراد نفي الجواز باعتبار صِحَّةِ البدن، وإذا سئل فقيهٌ عن شيئ، فقال: لايجوز، عُرف أنه يريد نفي الجواز الشرعي. قوله تعالى: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ﴾ وقوله تعالى: ﴿حُرِّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ فالأول في النكاح، والثاني في الأكل. قوله صلى الله عليه وسلم: "لانكاح إلا بولي" نفي للجواز الشرعي، لا الوجودِ الخارجي، وأمثالُ هذا كثيرة، وليس من التأويل.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پانی پاک کرنے والا ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پانی جنبی نہیں ہوتا'' اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''مؤمن ناپاک نہیں ہوتا'' اور اس کے مانند وہ ہے جو روایات میں آیا ہے یعنی بدن ناپاک نہیں ہوتا اور زمین ناپاک نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں: ان سب کے معنی لوٹتے ہیں مخصوص نجاست کی نفی کی طرف۔ جس پر حالی اور مقالی قرائن دلالت کرتے ہیں۔ پس آپ کا ارشاد: ''پانی ناپاک نہیں ہوتا'' اس کا مطلب: منبعے ناپاک نہیں ہوتے ناپاکی کے ملاقات کرنے سے، جب وہ ناپاکی نکال دی جائے اور پھینک دی جائے اور پانی کا کوئی وصف نہ بدلے۔ اور ناپاکی بہت زیادہ نہ ہو —— اور بدن دھویا جاتا ہے پس پاک ہو جاتا ہے اور زمین پہنچتی ہے اس کو بارش اور دھوپ اور رگڑتے ہیں اس کو پیر پس پاک ہو جاتی ہے۔

اور کیا ممکن ہے کہ گمان کیا جائے بُضاعہ نامی کنویں کے بارے میں کہ ناپاکیاں اس میں پڑی رہا کرتی تھیں؟ کیونکر یہ گمان کیا جاسکتا ہے، حالانکہ انسانوں کی عادت جاری ہے بچنے کی ان چیزوں سے جو اس قسم کی ہیں، پس کیسے اس کا پانی منگواتے تھے رسول اللہ ﷺ؟ بلکہ پڑا کرتی تھیں اس میں ناپاکیاں، بغیر اس کے کہ ان کو ڈالنے کا ارادہ کیا جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں اپنے زمانہ کے کنوؤں کو۔ پھر نکال دی جاتی تھیں وہ ناپاکیاں۔ پس جب آیا اسلام تو پوچھا لوگوں نے اس شرعی پاکی کے بارے میں جو اس پاکی پر زائد ہے جو لوگوں کے نزدیک ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانی پاک کرنے والا ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' مراد لے رہے ہیں آپ کہ نہیں ناپاک ہوتا ہے اس ناپاکی کے علاوہ جو لوگوں کے پاس ہے۔

اور یہ تاویل (زبردستی کا مطلب) نہیں ہے اور نہ ظاہر سے پھیرنا ہے، بلکہ عربوں کا انداز کلام ہے۔ پس اللہ کا ارشاد: ''کہہ دیجئے: نہیں پاتا میں اس میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی حرام چیز کسی کھانے والے پر'' اس کا مطلب: ان چیزوں میں سے جن میں تم اختلاف کرتے ہو۔ اور جب کسی حکیم سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، پس وہ کہتا ہے: ''اس کا استعمال جائز نہیں'' تو پہچانی جاتی ہے یہ بات کہ مراد جواز کی نفی ہے بدن کی تندرستی کے اعتبار سے اور جب کسی فقیہ سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے، پس وہ کہتا ہے: ''جائز نہیں'' تو پہچانا جاتا ہے کہ وہ مراد لے رہا ہے شرعاً جواز کی نفی کو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''حرام کی گئی تم پر تمہاری مائیں'' اور اللہ پاک کا ارشاد: ''حرام کیا گیا تم پر مردار'' پس اول نکاح کے تعلق سے ہے اور ثانی کھانے کے سلسلہ میں ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نکاح نہیں ہے مگر ولی کے ذریعہ'' یہ شرعاً جواز کی نفی ہے، وجود خارجی کی نفی نہیں۔ اور اس قسم کی چیزیں بہت ہیں۔ اور وہ از قبیل تاویل نہیں ہیں۔

☆ ☆ ☆

ماءِ مقید سے حدث زائل نہیں ہوتا، خَبث زائل ہوتا ہے

پانی کی دو قسمیں ہیں: مطلق اور مقید۔ ماء مطلق: وہ پانی ہے جو لفظ ''پانی'' بولنے سے ذہن میں آتا ہے۔ جیسے بارش، چشمہ اور سمندر کا پانی۔ مطلق کے معنی ہیں: جو صرف پانی کی ذات سے بحث کرے۔ اس میں جو اضافت ہوتی ہے وہ صرف تعریف کے لئے ہوتی ہے۔ اور ماء مقید: وہ پانی ہے جو لفظ ''پانی'' بولنے سے ذہن میں نہ آئے جیسے گلاب کا پانی (عرقِ گلاب) اس میں جو مضاف الیہ ہوتا ہے وہ پانی کی صفت سے بحث کرتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ماءِ مقید سے وضوء اور غسل کرنا: ایک ایسی بات ہے جس کو سرسری نظر ہی میں ملت کی تعلیمات دفع کر دیتی ہیں یعنی یہ بات ملت کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ہاں اس سے نجاست حقیقیہ زائل کی جاسکتی ہے، بلکہ یہی راجح ہے۔

پس اگر بدن یا کپڑا ناپاک ہوجائے اور عرق گلاب وغیرہ سے اس کو دھولیا جائے تو وہ پاک ہوجائے گا۔

> [٦] وأما الوضوء من الماء المقيَّد، الذى لا يُطْلَقُ عليه اسمُ الماء بلا قيد، فأمرٌ تدفَعُهُ الملةُ باديَ الرأى،نعم، إزالةُ الخَبَث به محتمل، بل هو الراجح.

ترجمہ:(٦) اور رہا وضو کرنا ماء مقید سے جس پر بغیر قید کے لفظ ''پانی'' نہیں بولا جاتا: تو وہ ایک ایسی بات ہے جس کو سرسری نظر ہی میں ملت دفع کرتی ہے۔ ہاں اس کے ذریعہ نجاست کا ازالہ محتمل ہے۔ بلکہ وہی راجح ہے۔

تصحیح: لایُطلق تمام نسخوں میں لاینطلق تھا۔ یہ تصحیف ہے۔ میں نے گمان سے تصحیح کی ہے۔

☆ ☆ ☆

فقہ حنفی کے تین مسائل جو منصوص نہیں

احناف نے تین مسائل میں جزئیات پھیلانے میں درازنفسی سے کام لیا ہے۔ ایک: کنویں میں جانور کے مرنے کا مسئلہ۔ دوسرا: دَہ دردَہ حوض کا مسئلہ اور تیسرا: ماءِ جاری کا مسئلہ۔ حالانکہ ان تینوں مسائل میں قطعاً کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں ہے۔ اور صحابہ وتابعین سے جو آثار مروی ہیں: مثلاً زمزم کے کنویں میں ایک حبشی گر کر مر گیا، تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کنویں کا سارا پانی نکلوایا تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چوہے کے بارے میں فرمایا کہ (جب وہ پھول گیا ہوتو) سارا پانی نکالا جائے۔ اور امام عامر شعبی اور حضرت ابراہیم نخعی رحمہما اللہ نے بلی جیسے جانور کے کنویں میں مرنے کی صورت میں چالیس تا ستر ڈول نکالنے کا حکم دیا[1] ان تمام آثار کی صحت پر محدثین کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ نہ قرنِ اول کے لوگوں نے ان کو متفقہ طور پر مانا ہے۔

اور اگر ان آثار کی صحت تسلیم کرلی جائے تو احتمال ہے کہ پانی نکلوانا تطییبِ خاطر کے لئے اور پانی کی نظافت کے لئے ہو، وجوب شرعی کے طور پر نہ ہو۔ یہ احتمال مالکیہ کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس احتمال کو ختم کئے بغیر اثباتِ مدعیٰ کا خیال خار دارٹہنی کو مٹھی میں لے کر سوتنے کے برابر ہے!

حاصل کلام: یہ ہے کہ ان مسائل میں کوئی ایسی معتبر بات نہیں جس پر شرعاً عمل کرنا واجب ہو۔ اور قلتین کی حدیث اس سلسلہ میں بلاشبہ ایک پختہ بات ہے (پس اسی پر مسائل کی تفریع ہونی چاہئے) اور یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مسائل میں کوئی ایسی چیز مشروع کریں جن کی اہمیت لازمی ارتفاقات سے زیادہ ہو، جو کثیر الوقوع ہوں اور جس میں ابتلا عام ہو، پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں کوئی صریح حکم بیان نہ فرمائیں۔ اور صحابہ وتابعین میں وہ بات

---

[1] یہ تمام آثار امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار کے پہلے باب کے آخر میں روایت کئے ہیں ۱۲

شہرت یافتہ نہ ہو، اور ایک بھی شخص کی روایت اس سلسلہ میں موجود نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے؟!

فائدہ: (۱) قلتین کی روایت پر مسائل کی تفریع اس طرح کی جائے گی کہ اگر کنویں میں پانی دو قلّے یا زیادہ ہے، تو اس میں حیوان کے مرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پانی پاک ہے۔ ہاں اگر حیوان پھول پھٹ جائے اور پانی کا کوئی وصف بدل جائے تو کنواں ناپاک ہو جائے گا۔ اس کا سارا پانی نکالنا ہوگا۔

فائدہ: (۲) ابھی اوپر یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ دَہ دردَہ احناف کا اصل مذہب نہیں۔ اصل مذہب یہ ہے کہ پانی کا پھیلاؤ اتنا ہونا چاہئے کہ ایک طرف پانی ہلانے سے دوسری طرف نہ ہلے۔ اور اس کی دلیل غدیر کی حدیث ہے، جو ابن ماجہ میں ہے (حدیث نمبر ۵۲۰ باب الحیاض) اور دَہ دردَہ تو لوگوں کی سہولت کے لئے مقرر کیا ہوا ایک اندازہ ہے۔ جیسے شوافع اور حنابلہ نے بھی قلتین کی حدیث سے حوض کا اندازہ مقرر کیا ہے۔

اور شاہ صاحب کا یہ فرمانا کہ: ''قلتین کی حدیث أثبت (زیادہ مضبوط) ہے'' یہ بات اول تو مالکیہ نے رد کر دی ہے۔ انھوں نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے۔ ثانیاً: احناف کے نزدیک وہ پانی کی تحدید سے متعلق نہیں۔ مائے جاری سے متعلق ہے۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے اور یہ بعد کے احناف کی تاویل نہیں۔ بلکہ خود صاحب مذہب سے مروی ہے۔ تفصیل کے لئے معارف السنن کی مراجعت کریں۔

فائدہ: (۳) صحابہ و تابعین کے آثار کی شہرت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک آہستہ آہستہ آثار کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ اور تدوین حدیث کے تیسرے دور میں تو یہ طے کر دیا گیا تھا کہ آثار صحابہ و تابعین کو حدیث کی کتابوں میں نہ لیا جائے۔ صرف مرفوع روایات لی جائیں۔ اس لئے وہ صحاح و سنن میں موجود نہیں ہیں۔ ورنہ یہ ذہن بننے سے پہلے یہ سب آثار مشہور تھے۔ اور حدیث کی قدیم کتابوں میں موجود ہیں۔

فائدہ: (۴) مالکیہ نے صحابہ و تابعین کے آثار میں جو احتمال پیدا کیا ہے وہ محض بے دلیل ہے۔ اگر اس قسم کے احتمالات کا اعتبار کیا جائے گا تو کتے کے جھوٹے کو بھی پاک ماننا پڑے گا!

فائدہ: (۵) اور یہ سوال کہ جب چوہا مرنے سے کنواں ناپاک ہو گیا، تو سارا ہی ناپاک ہو گیا۔ پس اس میں سے دس بیس ڈول نکالنے سے کنواں کیسے پاک ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پانی نکالنا مؤثر بالخاصہ ہے یعنی شریعت نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ اتنی مقدار نکال دی جائے تو باقی سارا پانی پاک ہو جائے گا اور مؤثر بالخاصہ کی بات خود شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تیمم کے بیان میں ارشاد فرمائی ہے۔

[۷] وقد أطال القومُ في فروع موت الحيوان في البئر، والعشرِ في العشر، والماء الجاري، وليس في كل ذلك حديثٌ عن النبي صلى الله عليه وسلم ألبتة، وأما الآثار

المنقولة عن الصحابة والتابعين، كأثر ابن الزبير في الزِّنجيِّ، وعليٍّ رضي الله عنه في الفأرة، والنخعيِّ والشعبيِّ في نحوِ السِّنَّوْرِ، فليست مما يشهد له المحدثون بالصحَّة، ولا مما اتفق عليه جمهورُ أهل القرون الأولى، وعلى تقدير صِحَّتِها يمكن أن يكون ذلك تطييبًا للقلوب، وتنظيفًا للماء، لا من جهة الوجوب الشرعي، كما ذُكر في كتب المالكية، ودونَ نفيِ هذا الاحتمال خَرْطُ القَتاد!

وبالجملة: فليس في هذا الباب شيئ يُعتد به، ويجب العملُ عليه، وحديثُ القلتين أثبت من ذلك كلِّه بغير شبهة، ومن المحال أن يكون الله تعالى شرع في هذه المسائل لعباده شيئًا، زيادةً على مالا ينفكون عنه من الارتفاقات، وهي مما يكثر وقوعه، ويعم به البلوى، ثم لايَنُصُّ عليه النبي صلى الله عليه وسلم نصًا جليا، ولا يستفيض في الصحابة ومن بعدهم، ولا حديثُ واحدٍ فيه، والله أعلم.

ترجمہ: (۷) اور تحقیق دراز نفسی سے کام لیا ہے قوم نے یعنی احناف نے: کنویں میں جانور کے مرنے اور دَہ دردَہ اور آبِ جاری کی جزئیات میں۔ حالانکہ بالکل نہیں ہے اُن سب مسائل میں نبی ﷺ سے منقول کوئی حدیث۔ اور رہے وہ آثار جو صحابہ وتابعین سے منقول ہیں: جیسے ابن زبیر کا اثر حبشی کے سلسلہ میں، اور علی رضی اللہ عنہ کا اثر چوہے کے بارے میں، اور نخعی اور شعبی کے آثار بلّی کے مانند جانور کے سلسلہ میں۔ پس نہیں ہیں وہ آثار ان روایات میں سے جن کے لئے محدثین صحت کی گواہی دیتے ہوں (یعنی وہ آثار سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں) اور نہ اُن روایات میں سے ہیں جن پر قرونِ اولی کے لوگ عام طور پر متفق ہوں۔ اور ان کی صحت کی تقدیر پر ممکن ہے کہ ہوں وہ آثار دلوں کو خوش کرنے کے لئے اور پانی کی پاکیزگی کے لئے۔ نہ کہ وجوبِ شرعی کے اعتبار سے، جیسا کہ مالکیہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور اس احتمال کی نفی کئے بغیر خار دار ڈالی کو مٹھی میں لے کر سوتنا ہے یعنی مدعی ثابت ہونا مشکل ہے۔

اور حاصل کلام: پس نہیں ہے اس سلسلہ میں کوئی ایسی چیز جو قابل لحاظ ہو، اور جس پر عمل ضروری ہو۔ اور قلتین کی روایت بلاشبہ ان سب سے زیادہ پکی بات ہے۔ اور امر محال میں سے ہے یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے مشروع فرمائی ہو ان مسائل میں اپنے بندوں کے لئے کوئی چیز، جو زائد ہو ان معاشی مفید تدابیر سے جن سے لوگ جدا نہیں ہوتے (یعنی جو باتیں از قبیل ارتفاقات لازمہ ہیں ان کے سلسلہ میں تو نص وارد ہونا ضروری نہیں۔ ان کو تو لوگوں کے علوم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مگر جو باتیں اُن سے زائد ہیں اور لوگ از خود ان کو نہیں سمجھ سکتے) اور وہ ان باتوں میں سے ہیں جن کا وقوع بکثرت ہوتا ہے، اور جن میں ابتلا عام ہے، پھر نبی ﷺ اس کی صاف صاف صراحت نہ کریں، اور صحابہ اور ان کے بعد کے لوگوں میں وہ باتیں مشہور نہ ہوں، اور اس سلسلہ میں ایک شخص کی بھی روایت نہ ہو (یہ بات کیسے ممکن ہے؟!) باقی

اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: خَرَطَ (ن ض) خَرْطًا الورق: ہاتھ سے مار کر پتے جھاڑنا۔ القَتاد: ایک درخت ہے جس کے کانٹے سوئی کے مانند ہوتے ہیں۔ پس خَرْطُ القَتاد کے معنی ہیں: خاردار ڈالی کو مٹھی میں لے کر سوتنا، جس سے ہاتھ کے زخمی ہونے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہ محاورہ ہے یعنی بڑی مشکل سے یہ امر حاصل ہو سکتا ہے۔ درخت قتاد کے کانٹے سوتنا اس سے آسان ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۱۴

نجاستوں کو پاک کرنے کا بیان

نجاست کی تعریف: نجاست ہر وہ پلید چیز ہے جس سے سلیم طبیعتوں کو گھن آتی ہے، جس سے لوگ بچتے ہیں، اور اگر وہ بدن یا کپڑوں پر لگ جائے تو اس کو دھوتے ہیں۔ جیسے پاخانہ، پیشاب اور خون۔

مأخذ: تطہیر نجاسات کی بات بنیادی طور پر سلیم الطبع لوگوں کی عادات سے لی گئی ہے۔ اور جو باتیں ان کے نزدیک مشہور و مسلم تھیں اُن سے یہ طریقہ مستنبط کیا گیا ہے۔

لید کا حکم: گھوڑے گدھے کی لید ناپاک ہے۔ دلیل درج ذیل حدیث ہے:

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑے استنجاء کے لئے چلے، تو مجھے حکم دیا کہ میں آپؐ کیلئے تین پتھر مہیا کروں۔ مجھے دو پتھر ملے، تیسرا تلاش کیا مگر نہ ملا، تو میں نے ایک لید لے لی۔ اور انکو آپؐ کے پاس لایا۔ آپؐ نے دو پتھر لے لئے اور لید پھینک دی، اور فرمایا: ''یہ تو ناپاک ہے'' (رواہ البخاری وغیرہ جامع الاصول ۸: ۶۷)

ماکول اللحم جانور کا پیشاب: ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب فی نفسہ تو ناپاک ہے۔ اس سے سلیم طبیعتوں کو گھن آتی ہے۔ اور عُرَنیین کے واقعہ میں جو اونٹوں کا پیشاب پینے کے لئے فرمایا تھا وہ صرف علاج کی ضرورت سے تھا۔ اور امام مالک، امام احمد اور امام محمد رحمہم اللہ جو اس کو پاک کہتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ جو اس کو ناپاک کہتے ہیں، مگر نجاستِ خفیفہ مانتے ہیں، نجاستِ غلیظہ نہیں مانتے یہ سب باتیں صرف بر بنائے حرج ہیں۔ کیونکہ جن چیزوں میں ابتلا عام ہوتا ہے اُن میں معافی دینا یا تخفیف کرنا شرعی اصولوں میں سے ایک ہے۔

شراب کیوں ناپاک ہے: شراب پر نجاست کی تعریف صادق نہیں آتی۔ لوگ شوق سے اس کو نوش کرتے ہیں۔ تاہم اللہ پاک نے شراب کو نجاست کے ساتھ لاحق کیا ہے، اور اس کو اپنے اس ارشاد سے ناپاک قرار دیا ہے کہ: ''وہ

گندی چیز، شیطانی کام ہے'' (سورۃ المائدۃ آیت ۹۰) اوراس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے شراب کو حرام قرار دیا، اورنہایت مؤکد طور پر حرام کیا، تو حکمت خداوندی نے چاہا کہ شراب کو پاخانہ اور پیشاب کے بمنزلہ کردیا جائے، تاکہ شراب کی برائی لوگوں کی نگاہوں کے سامنے پیکر محسوس بن کرآجائے۔ اوراس کا ناپاک ہونا لوگوں کے نفوس کو شراب سے بازرکھنے میں مؤثر کردار ادا کرے۔

﴿ تطهير النجاسات ﴾

النجاسة: كلُّ شيئ يستَقْذِرُه أهلُ الطبائع السليمةِ، ويتحَفَّظون عنه، ويغسلون الثيابَ إذا أصابها، كالعَذِرَة والبول والدَّم، وأما تطهير النجاسات فهو مأخوذ عنهم، ومستنبَطٌ مما اشتهر فيهم، والروثُ رِكْسٌ لحديث ابن مسعود. وبولُ مايؤكل لحمُه: لاشبهة في كونه خبثًا، تستَقْذِرُه الطبائع السليمةُ، وإنما يرخَّص في شربه لضرورة الاستشفاء؛ وإنما يُحكم بطهارته، أو بخِفَّةِ نجاسته لدفع الحرج، وألحقَ الشارع بها الخمْرَ، وهو قوله تعالى: ﴿ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ لأنه حَرَّمها، وأكَّد تحريمها، فاقتضت الحكمة أن يجعلها بمنزلة البول والعَذِرَةِ، ليتمثَّلَ قبحُها عندهم، ويكون ذلك أكْبَحَ لنفوسهم عنها.

ترجمہ: نجاستوں کو پاک کرنا: نجاست: ہر وہ چیز ہے جس سے سلیم طبیعتیں گھن کرتی ہیں، اور جس سے لوگ بچتے ہیں۔ اور جب وہ کپڑوں کو لگ جاتی ہے تو ان کو دھوتے ہیں۔ جیسے پاخانہ اور پیشاب اور خون —— اور رہا نجاستوں کو پاک کرنا: تو وہ لیا گیا ہے سلیم الطبع لوگوں سے، اور نکالا ہوا ہے اس بات سے جو ان میں مشہور ہے —— اور لید ناپاک ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے —— اور ان جانوروں کا پیشاب جن کا گوشت کھایا جاتا ہے: کوئی شک نہیں اس کے گندہ ہونے میں، اس سے سلیم طبیعتیں گھن کرتی ہیں۔ اور اس کے پینے کی صرف علاج کی ضرورت سے اجازت دی جاتی ہے۔ اور اس کی پاکی کا اور اس کی ناپاکی کے ہلکا ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے صرف تنگی کو رفع کرنے کے لئے (یعنی یہ عارضی احکام ہیں۔ اصل اس کا ناپاک ہونا ہے) —— اور شارع نے نجاست کے ساتھ شراب کو ملایا ہے۔ اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''گندگی، شیطان کے عمل سے ہے'' (یعنی اس ارشاد کے ذریعہ شارع نے شراب کو نجاست کے ساتھ لاحق کیا ہے) اس لئے کہ شارع نے شراب کو حرام کیا ہے اور پختہ کیا ہے اس کی تحریم کو۔ پس حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ گردانیں اللہ پاک شراب کو بمنزلہ پیشاب اور پاخانہ کے، تاکہ شراب کی برائی لوگوں کے سامنے متمثل ہو اور وہ ناپاک ہونا لوگوں کے نفوس کو شراب سے زیادہ باز رکھنے والا ہو۔

کتے کا جھوٹا ناپاک کیوں ہے؟

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں پیئے، تو چاہئے کہ وہ اس کو سات مرتبہ دھوئے (متفق علیہ) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ: ''تم میں سے ایک کے برتن کی پاکی جب کتا اس میں منہ ڈال دے، یہ ہے کہ اس کو سات مرتبہ دھوئے۔ ان کا پہلا مٹی کے ساتھ''یعنی پہلی مرتبہ مٹی سے مانجھ کر دھوئے (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۰)

تشریح: سوال: کتا ایک نیم پالتو جانور ہے۔ اور پالتو جانوروں کے جھوٹے میں ضرورت کی وجہ سے پاکی کا حکم ہونا چاہئے یا کم از کم تخفیف ہونی چاہئے۔ جیسا کہ بلی کے جھوٹے کا معاملہ ہے۔ حالانکہ کتے کا جھوٹا ناپاک اور نجاست غلیظہ ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہ ہے کہ یہ مسئلہ استحسانی ہے۔ قیاس جلی کا تقاضا تو بیشک وہ ہے جو سائل نے بیان کیا۔ اور استحسان کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے کتے کے جھوٹے کو ناپاکیوں کے ساتھ لاحق کیا ہے اور اس کو نجاستِ غلیظہ قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا شریعت کی نگاہ میں ایک ملعون جانور ہے، فرشتے اس سے نفرت کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے فرشتے نہیں جاتے (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۳) اور بے ضرورت کتے کو پالنا اور اس سے خلا ملا رکھنا روزانہ ایک قیراط ثواب گھٹا دیتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۰۹۹ باب ذکر الکلب، کتاب الصید)

اور ان سب باتوں کا راز: یہ ہے کہ کتے کی فطرت شیطان کے مشابہ ہے۔ کھیل کود، غصہ، ناپاکیوں میں لتھڑنا اور لوگوں کو ستانا اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اور وہ شیطان کے الہامات قبول کرتا ہے۔ اب دو باتیں ہیں:

پہلی بات: نبی ﷺ نے دیکھا کہ لوگ کتوں سے باز نہیں رہتے، اور ان سے احتیاط نہیں برتتے۔ ان سے احتراز میں تساہل سے کام لیتے ہیں یعنی باوجود ایسا ملعون جانور ہونے کے لوگ ان کے پالنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

دوسری بات: کھیتی اور مویشی کی حفاظت کے لئے، چوکی داری کے لئے اور صید افگنی کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے ان کے پالنے کی مطلقاً ممانعت کرنا بھی مشکل ہے۔

اس لئے نبی کریم ﷺ نے تدبیر یہ نکالی کہ سات مرتبہ برتن کے دھونے کو ایک لازمی شرط قرار دیا۔ اور ایک مرتبہ مٹی سے مانجھنے کا حکم دیا تاکہ لوگ کچھ پریشان ہوں۔ یہ دونوں حکم مل کر لوگوں کو کتوں سے باز رکھنے میں کفارہ کا کردار ادا کریں گے۔

ایک سوال مقدر کا جواب: سوال یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ تو کتے کے جھوٹے کو پاک کہتے ہیں۔ وہ ظرف کو سات مرتبہ دھونے کا حکم تو دیتے ہیں مگر مظروف کو پاک کہتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کو معلوم نہیں کہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ دونوں حکم تشریعی نہیں ہیں، بلکہ ایک طرح کی تاکید ہیں یعنی ہمیں ان کے قول کی دلیل معلوم نہیں۔ مگر

دوسرے حضرات کا مختار یہ ہے کہ یہ احکام تشریعی ہیں ان کے نزدیک ظاہر حدیث کی رعایت اَولی ہے یعنی حدیث سے یہ ظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے اور نجاستِ غلیظہ ہے۔ اور احتیاط بہر حال جمہور کے مذہب میں ہے۔

فائدہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سات مرتبہ دھونا برتن کی پاکی کے لئے شرط ہے اور ایک مرتبہ مٹی سے مانجھنا مستحب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی تقریباً یہی مذہب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تین مرتبہ دھونے سے برتن پاک ہوجاتا ہے۔ راوی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہی فتوی ہے۔ اور سات مرتبہ دھونا اور ایک مرتبہ مٹی سے مانجھنا دونوں استحبابی حکم ہیں۔

[۱] قال النبي صلى الله عليه وسلم:" إذا شرب الكلبُ في إناء أحدِكم فَلْيَغْسِلْهُ سبع مرات" وفي رواية: "أُولاهُنَّ بالتراب"

أقول: ألحَقَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم سؤرَ الكلب بالنجاسات، وجعله من أشدِّها، لأن الكلب حَيَوَانٌ ملعون، تنفِّر منه الملائكة، ويَنْقُصُ اقْتِنَاؤه والمخالطةُ معه بلاعذر من الأجر كلَّ يوم قيراطاً.

والسر في كل ذلك: أنه يُشْبِهُ الشيطانَ بجبلَّته، لأن دَيْدَنَه لَعِبٌ، وغَضَبٌ، واطِّرَاحٌ في النجاسات، وإيذاءٌ للناس، ويقبل الإلهامَ من الشياطين، فرأى منهم صدودًا وتهاونًا، ولم يكن سبيلٌ إلى النهي عنه بالكلية لضرورة الزرع والماشيةِ والحِراسةِ والصيد، فعَالَجَ ذلك باشتراط أتم الطهارات وأوكدِها، وما فيها بعضُ الحرج، ليكون بمنزلة الكفارة في الرَّدْع والمنع.

واستشعر بعضُ حملةِ الملة: بأن ذلك ليس بتشريع، بل نوعُ تاكيدٍ؛ واختار بعضُهم رعايةَ ظاهرِ الحديث؛ والاحتياطُ أفضل.

ترجمہ: (۱) نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں پیئے تو چاہئے کہ وہ اس کو سات مرتبہ دھوئے'' اور ایک روایت میں ہے کہ: ''ان میں سے پہلی مرتبہ مٹی سے''

میں کہتا ہوں: نبی ﷺ نے کتے کے جھوٹے کو ناپاکیوں کے ساتھ ملایا ہے۔ اور اس کو سخت ناپاکیوں سے گردانا ہے۔ اس لئے کہ کتا ایک ملعون جانور ہے۔ اس سے فرشتے نفرت کرتے ہیں۔ اور اس کا بغیر عذر کے پالنا اور اس سے ملنا جلنا روزانہ ایک قیراط کو ثواب میں سے کم کر دیتا ہے۔

اور ان سب میں راز: یہ ہے کہ کتا اپنی فطرت سے شیطان کے مشابہ ہے۔ اس لئے کہ اس کی عادت: کھیل کود، غصہ، ناپاکیوں میں لتھڑنا اور لوگوں کو ستانا ہے۔ اور وہ شیاطین سے الہام قبول کرتا ہے۔ پس: (۱) دیکھا نبی ﷺ نے لوگوں سے باز رہنا اور سستی برتنا (۲) اور نہیں تھی کوئی راہ کتے سے بالکلیہ روکنے کی، کھیتی، مویشی، چوکیداری اور شکار کرنے کی ضرورت کی

وجہ سے ——— پس علاج کیا آپؐ نے اس کا پاکیوں میں زیادہ تام اور زیادہ مؤکد کو شرط قرار دینے کے ذریعہ (یعنی سات مرتبہ دھونا ضروری قرار دیا) اور اس چیز کے ذریعہ جس میں کچھ مشقت ہے (یعنی ایک مرتبہ مٹی سے مانجھنے کا حکم دیا تا کہ لوگ کچھ پریشان ہوں) تا کہ ہوئے وہ (یعنی دونوں باتیں مل کر) بمنزلۂ کفارہ کے باز رکھنے اور روکنے میں۔

اور بعض علم برداروں کو (یعنی امام مالک رحمہ اللہ کو) احساس ہوا کہ وہ (سات مرتبہ دھونا) کوئی تشریعی امر نہیں ہے، بلکہ ایک طرح کی تاکید ہے۔ اور پسند کیا ان کے بعض نے حدیث کے ظاہر کی رعایت کرنے کو۔ اور احتیاط بہتر ہے۔

لغت: اِطَّرَحَہ: پھینک دینا۔ تصحیح: والسر فی کل ذلك میں لفظ کل مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

☆　☆　☆

ناپاک زمین پر بہت پانی ڈالنے سے پاک ہو جاتی ہے

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک گنوار کھڑا ہوا پس اس نے مسجد نبوی میں پیشاب کیا۔ پس لے دے کی اس کو لوگوں نے۔ آپؐ نے ان صحابہ سے فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو، اور اس کے پیشاب پر پانی کا ایک بڑا ڈول ڈالو'' (مشکوۃ حدیث ۴۹۱۔ یہ پوری حدیث رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۵۵ پر گذر چکی ہے)

تشریح: ناپاک زمین پر اگر بہت سارا پانی ڈالا جائے۔ اور وہ زمین میں اتر جائے اور ناپاکی کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو زمین پاک ہو جائے گی۔ اور اس حکم کا مدار اس بات پر ہے جو بھی لوگوں کے نزدیک مسلّم ہے کہ بہت بارش سے زمین پاک ہو جاتی ہے۔ اور بہت سارا پانی ڈالنے سے بدبو بھی ختم ہو جاتی ہے اور پیشاب بے نشان ہو جاتا ہے۔

فائدہ: امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار کے باب اول میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے گنوار کے پیشاب کرنے کی یہ روایت بیان کی ہے۔ اس میں یہ بات زائد ہے کہ آپ ﷺ کے حکم سے پہلے وہ جگہ کھود ڈالی گئی تھی۔ پھر اس پر پانی ڈالا گیا تھا۔ اب اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: یا تو ناپاک مٹی کھود کر باہر ڈال دی گئی تھی تو پانی ڈالنے کا مقصد صرف بدبو ختم کرنا ہے۔ یا کھود کر مٹی نرم کی گئی تھی پھر اس پر پانی ڈالا تھا تو یہ کھودنا اس لئے تھا کہ سارا پیشاب پانی ڈالنے سے زمین میں اتر جائے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "هَرِيْقُوْا على بوله سَجْلاً من ماءٍ"

أقول: البول على الأرض: يُطَهِّره مكاثَرَةُ الماء عليه، وهو مأخوذ مما تقرر عند الناس قاطبةً: أن المطر الكثير يطَهِّرُ الأرض، وأن المكاثرة تذهب بالرائحة المنتنة، وتجعل البول متلاشيا كأن لم يكن.

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بہاؤ اس کے پیشاب پر پانی کا ایک بڑا ڈول'' میں کہتا ہوں: زمین پر

پیشاب: پاک کرتا ہے اس کو بہت زیادہ پانی ڈالنا اس پر۔ اور یہ حکم ماخوذ ہے اس بات سے جو ثابت ہے سارے ہی لوگوں کے نزدیک کہ بہت بارش زمین کو پاک کر دیتی ہے، اور یہ کہ بہت زیادہ پانی ڈالنا بدبو کو ختم کرتا ہے اور پیشاب کو مضمحل کرتا ہے، گویا وہ تھا ہی نہیں۔

لغات: هَرَقَ (ف) هَرْقًا وأهرقَ الماءَ: پانی گرانا ..... السَّجْل: بڑا ڈول جس میں پانی ہو ..... مُكاثرة: کثرت میں غالب آنا ..... تَلاشَ الشيئُ: معدوم ہونا لاشیئ بنانا، مضمحل کرنا۔

☆　☆　☆

نجاست کا اثر زائل ہونے سے پاکی حاصل ہوتی ہے

حدیث ـــــ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک خاتون نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر کسی عورت کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو وہ کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا: "جب تم میں سے کسی کے کپڑے پر حیض کا خون لگے تو وہ اس کو چٹکیوں سے ملے، پھر پانی سے دھوئے پھر اس میں نماز پڑھے" (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۹۳)

تشریح: جب نجاست اور اس کا اثر (رنگ، بو، مزہ) زائل ہو جائے تو پاکی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لئے کوئی مخصوص طریقہ نہیں۔ اوپر روایت میں جو طریقہ بتایا ہے یا فقہ کی کتابوں میں جو لکھا ہے کہ تین بار کپڑے کو دھوئے۔ اور ہر بار نچوڑے، یہ سب ایسی صورتوں کا بیان ہے جن سے ناپاکی اور اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ سرسری دھونے سے خون اگرچہ نکل جائے گا مگر اس کا اثر (دھبہ) رہ جائے گا۔ اس لئے چٹکیوں سے ملنے کا حکم دیا۔ یہ ایک تنبیہ ہے، شرط نہیں ہے۔ شرط نجاست اور اس کے اثر کا ازالہ ہے۔ الا یہ کہ اثر کا ازالہ دشوار ہو، کپڑا نجاست کا رنگ پکڑ لے تو پھر رنگ کا ازالہ ضروری نہیں۔

> [۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا أصاب ثوبَ إحداكن الدمُ من الْحيْضةِ فَلْتقرُصْهُ، ثم لْتنضَحْهُ بماء، ثم لْتُصَلِّ فيه"
>
> أقول: تحصل الطهارةُ بزوال عين النجاسة وأثرها، وسائرُ الخصوصيات بيانٌ لصورة صالحة لزوالهما، وتنبيهٌ على ذلك، لاشرط.

ترجمہ: (۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد " جب پہنچے تم میں سے کسی ایک کے کپڑے کو حیض کا خون، پس چاہئے کہ (بھگا کر) اس کو چٹکیوں سے ملے، پھر چاہئے کہ دھوئے وہ اس کو پانی سے، پھر چاہئے کہ نماز پڑھے وہ اس میں" یعنی اب کپڑا بالکل پاک ہو گیا۔ اس میں نماز پڑھ سکتی ہے۔

میں کہتا ہوں: پاکی حاصل ہوتی ہے نجاست کی عین اور اس کے اثر کے زائل ہونے سے۔ اور دیگر خصوصیات

(یعنی دھونے کے طریقے) بیان ہیں ایک مناسب صورت کا ان دونوں چیزوں کے زائل ہونے کے لئے۔ اور تنبیہ ہیں اس پر شرط نہیں ہیں۔

لغات: الحِيضة (بكسر الحاء المهملة) حیض کو بھی کہتے ہیں اور حیض کے چیتھڑے کو بھی۔ یہاں اول معنی مراد ہیں..... قَرَصَ (ن) قَرْصًا الثوب بالماء: انگلیوں کے پوروں سے دھونا..... نَضَحَ (ف ض) نَضْحًا البيتَ بالماء: پانی چھڑکنا۔ مگر اس حدیث میں بالاتفاق دھونا مراد ہے۔

☆ ☆ ☆

منی ناپاک ہے مگر خشک منی کھرچ دینے سے کپڑا پاک ہوجاتا ہے

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک منی پاک ہے یعنی اس کے ساتھ نماز ہوجاتی ہے۔ اور اس کا ازالہ ایسا ہے جیسا بلغم اور رینٹ کا ازالہ۔ اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک منی ناپاک ہے۔ پھر امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بدن اور کپڑے کو پاک کرنے کے لئے دھونا ہی ضروری ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک بدن کو تو دھونا ہی ضروری ہے۔ مگر کپڑے پر اگر منی خشک ہوجائے اور وہ جسم دار ہو یعنی پیشاب کی طرح پتلی نہ ہو تو اس کو اچھی طرح کھرچ ڈالنے سے بھی کپڑا پاک ہوجاتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اظہر[1] یہ ہے کہ منی ناپاک ہے۔ کیونکہ اس سے سلیم طبیعتیں گھن کرتی ہیں۔ اور لوگ اس سے بچتے ہیں۔ اور اگر وہ بدن یا کپڑوں پر لگ جاتی ہے تو اس کو دھوتے ہیں۔ اور یہی نجاست کی تعریف ہے جو پہلے گذر چکی ہے یعنی امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کی رائے دلیل کے اعتبار سے مرجوح ہے۔ کیونکہ کسی حدیث میں یہ بات نہیں آئی کہ آپؐ نے کبھی کسی ایسے کپڑے میں نماز پڑھی ہو جس میں منی لگی ہو۔ اور نہ تو اس کو دھویا ہو اور نہ ہی کھرچ کر صاف کیا ہو۔ اگر منی پاک ہوتی تو بیانِ جواز کے لئے ایک ہی بار سہی، ایسا عمل ضرور ہوتا۔ اور یہ بات بھی اظہر ہے کہ خشک منی کو جبکہ وہ جسم دار ہو کھرچ دینے سے بھی کپڑا پاک ہوجاتا ہے یعنی امام مالک رحمہ اللہ کی رائے بھی دلیل کے اعتبار سے مرجوح ہے۔ کیونکہ مسلم شریف کی روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ نے ایک بار ایسے کپڑے میں نماز ادا فرمائی ہے جس پر سے منی دھوئی نہیں گئی تھی، صرف کھرچ دی گئی تھی۔

[٤] وأما المني: فالأظهر أنه نَجَسٌ لوجود ما ذكرنا في حد النجاسة، وأن الفرك يُطَهِّرُ يابِسه إذا كان له حَجْمٌ.

[1] اظہر فتوی کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے دلیل کے اعتبار سے راجح۔ اس کا مقابل ظاہر ہے یعنی دلیل کے لحاظ سے مرجوح ۱۲

ترجمہ: (۴) اور رہی منی: سو اظہر یہ ہے کہ وہ ناپاک ہے۔ اس بات کے پائے جانے کی وجہ سے جس کو ہم نے ذکر کیا ہے نجاست کی تعریف میں۔ اور اظہر یہ ہے کہ کھرچنا پاک کر دیتا ہے خشک منی کو جبکہ اس کے لئے جرم ہو۔

☆ ☆ ☆

شِیرخوار بچے اور بچی کے پیشاب کا حکم

حدیث ——— حضرت ابو السمح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''لڑکی کے پیشاب سے (کپڑا) دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جاتا ہے'' (رواہ ابوداؤد حدیث ۳۷۶ والنسائی، مشکوۃ حدیث ۵۰۲)

تشریح: بچہ جب تک شیر خوار ہے یعنی اس نے باہر کی غذا دودھ وغیرہ لینی شروع نہیں کی تو بھی اس کا پیشاب بالاتفاق ناپاک ہے۔ مگر پاک کرنے کے طریقے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک لڑکے کے پیشاب پر اتنا چھینٹا دے دینا کافی ہے کہ کپڑا بھیگ جائے۔ دھونا ضروری نہیں۔ اور لڑکی کے پیشاب کو بڑے آدمی کے پیشاب کی طرح دھونا ضروری ہے۔ اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں کے پیشاب کو دھونا ضروری ہے۔ البتہ لڑکی کے پیشاب کو مبالغہ کے ساتھ یعنی اچھی طرح، دیگر نجاستوں کی طرح، دھونا ضروری ہے۔ اور لڑکے کے پیشاب کو ہلکا دھونا بھی کافی ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

لڑکی اور لڑکے کے پیشاب میں فرق کرنا ایک ایسی بات ہے جو زمانۂ جاہلیت سے مسلّم چلی آرہی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اس کو باقی رکھا ہے۔ اور یہ فرق چند وجوہ ہے:

پہلی وجہ: لڑکا جب کپڑے پر پیشاب کرتا ہے تو عضو باہر ہونے کی وجہ سے اور ہلنے کی وجہ سے پیشاب اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتا ہے اور ازالہ دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے شریعت نے اس کے معاملہ میں تخفیف کی ہے۔ اور لڑکی کی صورت حال مختلف ہے، اس لئے اس کا پیشاب ایک جگہ گرتا ہے اور اس کا دھونا آسان ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت نے اس کے معاملہ میں آسانی نہیں کی (یہ وجہ قابلِ غور ہے)

دوسری وجہ: لڑکی کا پیشاب نسبۃً زیادہ گاڑھا اور زیادہ بدبودار ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت نے دونوں کے طریقۂ تطہیر میں فرق کیا ہے۔

تیسری وجہ: لڑکے کو لوگ ہر وقت اٹھائے پھرتے ہیں، اور لڑکی سے احتراز کرتے ہیں۔ اس لئے ابتلائے عام کی وجہ سے اول میں تخفیف کی اور ثانی میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مذکورہ حدیث کو اہل مدینہ (شافعی واحمد) اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ نے لیا ہے۔ اور احناف کے یہاں مشہور یہ ہے کہ

دونوں کے پیشاب میں کوئی فرق نہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ امام محمد رحمہ اللہ نے موطا میں اس مسئلہ میں یہ بات لٹادی ہے یعنی ڈھیلی کردی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: قد جاءت رخصةٌ في بول الصبي إذا كان لم يأكلِ الطعامَ، وأُمِرَ بغسل بولِ الجارية، وغَسلهما جميعًا أحب إلينا، وهو قولُ أبي حنيفة رحمه الله یعنی لڑکے نے جب تک کھانا نہیں کھایا، اس کے پیشاب میں سہولت آئی ہے۔ اور لڑکی کے پیشاب کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: اور دونوں کو دھونا ہمیں زیادہ پسند ہے۔ اور یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے ہے یعنی دونوں پیشاب یکساں دھونا یہ صرف احتیاط کی بات ہے اور استحباب کا درجہ ہے۔ پس احناف میں جو مشہور ہے اس سے دھوکا نہ کھایا جائے۔

فائدہ: مگر شریعت نے رخصت غَسلِ خفیف کی دی ہے۔ چھینٹا دینے کی اجازت نہیں دی۔ خود امام محمد رحمہ اللہ نے مذکورہ عبارت کے بعد ایک اور حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک بچہ لایا گیا۔ اس نے آپؐ کے کپڑے پر پیشاب کردیا۔ آپؐ نے پانی منگوایا۔ اور اس کو پیشاب کے پیچھے کیا یعنی پانی پیشاب پر ڈالا۔ تاکہ پیشاب دوسری طرف نکل جائے۔ اس حدیث کو لکھ کر امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قال محمد: بهذا نأخذ، تُتبِعُه إياه غسلاحتى تُنَقِّيَه، وهو قولُ أبي حنيفة رحمه الله (موطا محمد باب الغسل من بول الصبی۔ ص ۶۵ مع حاشیہ ابی الحسنات) یعنی امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث پر ہمارا عمل ہے۔ تو پانی پیشاب کے پیچھے کر دھونے کے طور پر، یہاں تک کہ صاف کردے تو پیشاب کو۔ اور یہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے ہے۔ اس عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رخصت غَسلِ خفیف کی ہے۔ صرف چھینٹا دینے سے کپڑا پاک نہ ہوگا۔

[۵] قوله صلى الله عليه وسلم: "يُغسل من بول الجارية، ويُرَشُّ من بول الغلام"

أقول: هذا أمر كان قد تقرر في الجاهلية وأبقاه النبي صلى الله عليه وسلم، والحاملُ على هذا الفرق أمورٌ:

منها: أن بول الغلام ينتشر فَيَعْسُرُ إزالتُه، فيناسبه التخفيف، وبولَ الجارية يجتمع فيسهُل إزالتُه.

ومنها: أن بول الأنثى أغلظ وأنتن من بول الذكر.

ومنها: أن الذكر تَرْغَبُ فيه النفوسُ، والأنثى تَعافُهَا.

وقد أخذ بالحديث أهل المدينة، وإبراهيم النخعي، وأَضْجَعَ فيه القولَ محمدٌ، فلا تَغْتَرَّ بالمشهور بين الناس.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "(کپڑا اچھی طرح) دھویا جائے لڑکی کے پیشاب سے، اور پانی چھڑکا جائے (یا ہلکا دھویا جائے) لڑکے کے پیشاب سے" میں کہتا ہوں: یہ ایک ایسی بات ہے جو طے شدہ تھی زمانۂ جاہلیت

میں۔اور باقی رکھا اس کو نبی ﷺ نے۔اور اس فرق پر ابھارنے والی چند باتیں ہیں:

ان میں سے: یہ ہے کہ لڑکے کا پیشاب پھیل جاتا ہے۔پس دشوار ہوتا ہے اس کا ازالہ، پس تخفیف اس کے مناسب ہے۔اور لڑکی کا پیشاب مجتمع ہوتا ہے، پس آسان ہے اس کا ازالہ۔اور ان میں سے: یہ ہے کہ لڑکی کا پیشاب لڑکے کے پیشاب سے زیادہ گاڑھا اور زیادہ بدبودار ہوتا ہے۔اور ان میں سے: یہ ہے کہ لڑکے میں نفوس رغبت کرتے ہیں۔اور لڑکی سے نفوس احتراز کرتے ہیں۔

اور تحقیق لیا ہے حدیث کو اہل مدینہ نے اور ابراہیم نخعی نے۔اور لٹایا ہے اس مسئلہ میں بات کو امام محمد نے۔پس نہ دھوکا کھا تو لوگوں (احناف) کے درمیان مشہور بات سے۔

إفادات: قال العلامة السندي رحمه الله: قوله: والأنثى تَعافُها: بتشديد الفاء، أي: تمتنع النفوس من الأنثى، وتحترز منها، لعدم الرغبة فيها بالنسبة إلى الذكر، فغلَّظ في بولها لعدم البلوى۔ قوله: وأضجع فيه القولَ محمدٌ: الإضجاع: خسپانيدن وسست كردن أي لم يغلِّظ ولم يشدِّد في بول الغلام، بل أجرى الكلامَ فيه بنحوٍ يُفهم منه مافُهم من الحديث بالتصريح، فلا تغترَّ بالمشهور بين الناس: من أن بول الغلام نجاسة غليظة كبول الجارية عند الاحناف بلااخلاف اهـ وقال: الناس أي: الحنفية اهـ (تقریر قلمی)

☆ ☆ ☆

دباغت سے چمڑا پاک ہونے کی وجہ

حدیث ــــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''کچا چمڑا جب رنگ دیا جائے، تو وہ یقیناً پاک ہو جاتا ہے'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۴۹۸)

تشریح: یہ حکم بھی قدیم عادات سے ماخوذ ہے۔حیوانات کے رنگے ہوئے چمڑوں کے استعمال کا لوگوں میں عام رواج تھا۔اور پاکی کی وجہ یہ ہے کہ دباغت سے چمڑے کی سڑاند اور بدبو دور ہو جاتی ہے۔

جوتے موزے مٹی میں رگڑ جانے سے پاک ہو جاتے ہیں

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے چپل سے ناپاکی کو روندے تو مٹی بیشک اس کے لئے پاکی کا سامان ہے'' (یعنی ناپاکی لگنے کے بعد جب وہ پاک جگہ میں چلے گا اور وہ ناپاکی صاف ہو جائے گی تو چپل پاک ہو جائے گا) (مشکوۃ حدیث ۵۰۳)

تشریح: جوتے چپل اور موزے پر جسم دار ناپاکی جیسے پاخانہ گوبر وغیرہ لگ جائے اور ان کو مٹی سے رگڑ دیا جائے تو

وہ پاک ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ٹھوس اجسام ہیں۔ ناپاکی ان میں سرایت نہیں کرتی۔ پس ناپاکی خواہ تر ہو یا خشک ظاہر یہ ہے کہ وہ پاک ہوجائیں گے۔

نوٹ: وہ ناپاکیاں جو جسم دار نہیں ہیں جیسے پیشاب، شراب وغیرہ ان کا دھونا ہی ضروری ہے۔

[٦] قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا دُبِغَ الإهابُ فقد طَهُرَ"

أقول: استعمالُ جلود الحيوانات المدبوغةِ أمر شائع مسلمٌ عند طوائف الناس. والسِّرُّ فيه: أن الدباغ يُزيل النتنَ والرائحة الكريهةَ.

[٧] قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا وَطِئَ أحدُكم بنعله الأذى، فإن الترابَ له طَهور"

أقول: النعل والخف: يَطْهُرَان من النجاسة التي لها جِرْمٌ بالدلك، لأنه جسم صلب لايتخلل فيه النجاسة، والظاهر أنه عام في الرطبة واليابسة.

ترجمہ: (۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "کچا چمڑا جب رنگ دیا گیا تو وہ یقیناً پاک ہوگیا" میں کہتا ہوں: حیوانات کے رنگے ہوئے چمڑوں کا استعمال: لوگوں کی تمام جماعتوں کے نزدیک شائع اور ایک مسلّم امر تھا۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ دباغت سڑاند اور بدبو کو زائل کرتی ہے۔

(۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "جب تم میں سے کوئی اپنے چپل سے ناپاکی کو روندے تو بیشک مٹی اس کے لئے پاکی کا سامان ہے"۔

میں کہتا ہوں: چپل اور موزہ: دونوں پاک ہوجاتے ہیں اس ناپاکی سے جس کے لئے جسم ہے رگڑنے سے۔ اس لئے کہ وہ (یعنی ہر ایک) سخت جسم ہے، اس میں ناپاکی نہیں گھستی۔ اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم تر اور خشک ناپاکی کو عام ہے۔

☆ ☆ ☆

"بلّی ناپاک نہیں" کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت ابوقتادہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے بلّی کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد مروی ہے: إنَّها ليستْ بِنَجَسٍ؛ إنها من الطوافين عليكم أو الطَّوافات یعنی بلّی کا جھوٹا یا خود بلّی ناپاک نہیں ہے۔ بیشک وہ تمہارے پاس آنے جانے والوں اور آنے جانے والیوں میں سے ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۸۲ و ۴۸۳)

تشریح: اس حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں: پہلا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں مجاز بالحذف ہے: إنهــا ای إن ســؤرهـــا یعنی بلّی کا جھوٹا ناپاک نہیں ہے۔ اس صورت میں حدیث کے دوسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ بلّی

اگرچہ ناپاکیوں میں منہ ڈالتی ہے اور چوہے مارتی ہے، مگر اس کے جھوٹے کو پاک قرار دینے کی ضرورت ہے۔ پس رفع ضرورت کے لئے ـــــ جو ایک شرعی اصل ہے ـــــ بلی کے جھوٹے کو پاک قرار دیا کیا گیا ہے۔

دوسرا مطلب: یہ ہے کہ بلی خود ناپاک نہیں۔ اگر وہ کپڑوں پر بیٹھے یا جسم سے لگے تو کوئی حرج نہیں۔ (اس صورت میں حدیث میں کچھ محذوف نہیں ہوگا) اور حدیث کے آخری حصہ کا مطلب یہ ہے کہ بلی کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا چاہئے۔ کیونکہ شریعت نے ہر جاندار کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ایک شخص نے پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی تو اللہ نے اس کو جزائے خیر دی تھی اور اس کی بخشش فرمادی تھی۔ جب آپؐ نے یہ بات بیان کی تو صحابہ نے دریافت کیا: کیا چوپایوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: فی کلِّ کَبِدٍ رَطْبَةٍ أجر (بخاری حدیث ۲۳۶۳) یعنی ہر تر جگر والی مخلوق (جاندار) کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں ثواب ہے۔

فائدہ: طوافین اور طوافات سے مراد: مانگنے والے مرد وزن ہیں۔ آپؐ نے بلی کو ان کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم في الهرة: " إنها من الطوافين عليكم أو الطوافات"

أقول: معناه على قولٍ: إن الهرة وإن كانت تَلَغُ في النجاسات وتقتل الفأرةَ، فهنالك ضرورة في الحكم بتطهير سؤرها؛ ودفعُ الحرج أصلٌ من أصول الشرع. وعلى قولٍ آخر: حثٌّ على الإحسانِ على كل ذاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ، وشَبَّهَها بالسائلين والسائلات، والله أعلم.

ترجمہ: (۸) آنحضرت ﷺ کا بلی کے بارے میں ارشاد: ''بیشک وہ تمہارے پاس آنے جانے والوں اور آنے جانے والیوں میں سے ہے'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب ایک قول پر (یعنی ان لوگوں کے قول پر جو بلی کا جھوٹا پاک کہتے ہیں) یہ ہے کہ بلی اگرچہ ناپاکیوں میں منہ ڈالتی ہے اور چوہے مارتی ہے، پس وہاں ضرورت ہے حکم کرنے کی اس کے جھوٹے کی پاکی کا۔ اور تنگی کو رفع کرنا اصولِ شرع میں سے ایک اصل ہے۔ اور دوسرے قول پر (یعنی ان لوگوں کے قول پر جو بلی کا جھوٹا مکروہ کہتے ہیں) ترغیب دینا ہے احسان کرنے کی ہر تر جگر والے کے ساتھ ـــــ اور تشبیہ دی ہے آپؐ نے بلی کو مانگنے والوں اور مانگنے والیوں کے ساتھ۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(الحمدللہ! آج ۶ ذی قعدہ ۱۴۲۲ھ کو ابواب الطہارۃ کی شرح مکمل ہوئی)

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار وحِکم کا بیان

کتاب الصلاۃ

باب ـــــــ ۱

نماز کے سلسلہ کی ایک اصولی بات

یہ بات جان لینی چاہئے کہ نماز تمام عبادتوں میں ایک عظیم الشان عبادت ہے۔ وہ آدمی کے ایمان کی واضح دلیل ہے حدیث میں ہے کہ جو بندہ اہتمام سے نماز ادا کرے گا، تو قیامت کے دن وہ نماز اس کے لئے نور ہوگی، اور دلیل ہوگی، اور اس کی نجات کا ذریعہ بنے گی (مشکوٰۃ حدیث ۵۷۸) اور نماز لوگوں میں مشہور ومعروف عبادت ہے اور نفس کی اصلاح کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش چیز ہے۔ چنانچہ شارع علیہ السلام نے اس کی فضیلت، اس کے اوقات وشروط اور ارکان وآداب کی تعیین اور اس کی رخصتوں اور نفل نمازوں کے بیان کا ایسا اہتمام کیا ہے جیسا اہتمام دیگر طاعات کا نہیں کیا۔ اور شارع نے اس کو اہم شعائر دین میں سے قرار دیا ہے۔ اور نماز یہود ونصاری، مجوس اور ملت اسماعیل پر باقی ماندہ لوگوں میں ایک مسلمہ عبادت تھی۔ اس لئے شارع علیہ السلام نے اس کے اوقات کی تعیین میں اور اس سے تعلق رکھنے والی دیگر باتوں میں انہی باتوں کو پیش نظر رکھا ہے جو لوگوں میں یا تو متفق علیہ تھیں یا اُن پر جمہور متفق تھے۔

اور جو باتیں از قبیل تحریفات تھیں: مثلاً یہود موزوں اور جوتوں میں نماز کو جائز نہیں کہتے تھے، ایسی باتوں کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ ان کے ترک کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے، تاکہ مسلمانوں کا طریقہ ان کے طریقہ سے ممتاز ہو جائے۔ اسی طرح مجوس نے سارا ہی دین بگاڑ لیا تھا۔ وہ سورج کی پرستش کرنے لگے تھے، اس لئے ملت اسلامیہ کو ان کی ملت سے بھی پوری طرح ممتاز کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو ان کی عبادت کے اوقات میں نماز کی ممانعت کر دی گئی۔

ملحوظہ: چونکہ نماز کے احکام بہت پھیلے ہوئے ہیں اور جن اصولوں پر اس کا مدار ہے وہ بھی بہت ہیں، اس لئے یہاں کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں اُن اصولوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ کتاب الطہارہ وغیرہ کتابوں کے شروع میں ان کے اصولوں کو ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر فصل کی اصل کو اس فصل کے شروع میں ذکر کیا جائے گا۔

﴿من أبواب الصلاة﴾

اعلم: أن الصلاةَ أعظمُ العبادات شأنا، وأوضحُها برهانا، وأشهرها في الناس، وأنفعُها في

النـفـس، ولـذلك اعتَنَـى الشـارعُ ببيـانِ فـضلِها، وتعيينِ أوقاتها وشروطِها وأركانها وآدابها ورُخَـصِهـا ونـوافِلِهـا اعْتِـنـاءً عظيمًا لم يفعل مثلَه في سائر انواع الطاعات؛ وجَعَلَها من أعظمِ شعـائرِ الـديـن، وكـانـت مسلمةً في اليهود والنصارى والمجوس وبقايا الملة الإسماعيلية، فـوجب أن لايَذْهَبَ في توقيتها وسائرِ ما يتعلّق بها إلا إلى ما كان عندهم من الأمور التي اتفقوا عليها، أو اتفق عليها جمهورُهم.

وأمـا مـاكـان مـن تحريفهم، ككراهيةِ اليهود الصلاةَ في الخفاف والنعال ونحو ذلك، فمن حقِّه: أن يُسَجَّلَ على تركه، وأن يُجْعَلَ سنةُ المسلمين غيرَ سنةِ هؤلاء. وكذلك كان المجوس حَرَّفـوا دِينَهـم، وعبـدُوا الشـمـس، فوجب أن تُمَيَّزَ ملةُ الإسلام من ملّتهم غايةَ التمييز، فَنُهِيَ المسلمون عن الصلاة في أوقات صلواتهم أيضًا.

ولِاتِّسَاعِ أحكامِ الصلاة، وكثرةِ أصولها التي تُبنٰى عليها، لم نَذْكُرِ الأصولَ في فاتحةِ كتاب الصلاة، كما ذكرنا في سائر الكتب، بل ذكرنا أصلَ كلِّ فصل في ذلك الفصل.

ترجمہ: نماز کے تمام ابواب سے متعلق ایک اصولی بات: جان لیں کہ نماز تمام عبادتوں میں بڑی ہے شان کے اعتبار سے اور زیادہ واضح ہے دلیل کے اعتبار سے۔ اور عبادات میں سب سے زیادہ مشہور ہے لوگوں میں۔ اور ان میں سب سے زیادہ مفید ہے نفس کے لئے۔ اور اسی وجہ سے شارع نے اہتمام کیا ہے اس کی فضیلت اور اس کے اوقات وشروط اور اس کے ارکان وآداب اور اس کی رخصتوں اور نفلوں کو بیان کرنے کا، ایسا اہتمام کرنا کہ نہیں کیا ہے اس کے مانند طاعات کی دیگر انواع میں۔ اور اس کو دین کے اہم شعائر میں سے گردانا ہے۔ اور نماز ایک مسلّمہ عبادت تھی یہود ونصاریٰ، مجوس اور ملت اسماعیلی پر باقی ماندہ لوگوں میں۔ پس ضروری ہوا کہ نہ جائے شارع اس کے اوقات کی تعیین میں اور اُن دیگر باتوں میں جو نماز سے تعلق رکھتی ہیں، مگر اس بات کی طرف جو ان کے پاس تھی اُن امور میں سے جن پر وہ متفق تھے یا اُن پر اُن کے جمہور متفق تھے۔

رہی وہ باتیں جو ان کی تحریف سے تھیں، جیسے یہود کا موزوں، چپلوں اور اس قسم کی چیزوں میں نماز کو ناپسند جاننا، تو اس کے حق میں سے یہ بات تھی کہ اس کے چھوڑنے کا فیصلہ کردیا جائے۔ اور یہ کہ گردانا جائے مسلمانوں کا طریقہ ان کے طریقہ کے علاوہ۔ اور اسی طرح مجوس نے اپنے دین میں تحریف کر ڈالی تھی اور وہ سورج کی پوجا کرنے لگے تھے۔ پس ضروری ہوا کہ ممتاز کردیا جائے ملتِ اسلامیہ کو ان کی ملت سے پوری طرح ممتاز کرنا، چنانچہ روکے گئے مسلمان ان کی نماز کے اوقات میں نماز پڑھنے سے بھی۔

اور نماز کے احکام کے وسیع ہونے کی وجہ سے، اور اس کے اصولوں کی کثرت کی وجہ سے جن پر نماز کا مدار رکھا گیا ہے: نہیں ذکر کیا ہم نے اصولوں کو کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں، جیسا ذکر کیا ہے ہم نے دیگر کتابوں میں۔ بلکہ ذکر کریں گے ہم ہر فصل کی اصل کو اُسی فصل میں۔

تصحیح: لم یفعل مثلہ میں مثلہ اور أو اتفق میں أو مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے، پہلے واو تھا۔

☆ ☆ ☆

سات سال کی عمر میں نماز کا حکم اور دس سال کی عمر میں سختی کرنے کی وجہ

حدیث ــــــ حضرت عبداللہ بن عمر و رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی اولاد کو جب وہ سات سال کے ہوجائیں نماز کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہوجائیں تو نماز (چھوڑنے) پر ان کو مارو۔ اور خوابگاہوں میں ان کو جدا کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۷۲)

تشریح: سوال: بچہ بالغ پندرہ سال میں ہوتا ہے۔ یا جب اس سے پہلے بلوغ کی علامت پائی جائے بالغ ہوتا ہے۔ بہر حال لڑکا بارہ سال سے پہلے بالغ نہیں ہوتا۔ پھر سات سال کی عمر میں نماز کا حکم اور دس سال کی عمر میں نماز کے سلسلہ میں اس پر سختی کیوں کی گئی، جبکہ ابھی وہ مکلف نہیں ہوا؟

جواب: انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے: عقل اور جسم۔ اصل جوہر عقل ہے، جسم تو جانوروں کو بھی ملا ہے، مگر اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔ اور شعور کی ابتداء عام طور پر سات سال کی عمر میں ہوتی ہے۔ اور دس سال کی عمر میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور پندرہ سال میں عقل وجسم میں پختگی آتی ہے۔ غرض بچہ تین مرحلوں سے گذر کر مرد بنتا ہے: ابتدائی مرحلہ سات سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے، اور آخری مرحلہ پندرہ سال کی عمر ہے۔ اور درمیانی مرحلہ دس سال ہیں ــــــ

اِدھر نماز قرب خداوندی کا ذریعہ اور جہنم سے بچانے والی عبادت ہے۔ اور اسلام کا ایک ایسا لازمی شعار ہے جس سے کبھی صرف نظر نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے شعور سنبھالتے ہی نماز کا حکم دیا گیا، تاکہ انسان پہلی فرصت میں اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کی سعی اور جہنم سے بچنے کا سامان شروع کردے۔ اور اس کو مکلف آخری مرحلہ میں بنایا گیا جبکہ اس کی عقل وجسم میں پختگی آجاتی ہے۔ روزہ، زکوٰۃ کی طرح نماز بھی اسی مرحلہ میں لازم ہوتی ہے۔ اور درمیانی مرحلہ (دس سال کی عمر) چونکہ ذو جہتین ہے، اس لئے اس کے لئے دونوں مرحلوں سے حصہ رکھا گیا۔ اس عمر میں نماز کا فرض نہ ہونا یہ ابتدائی مرحلہ کا اثر ہے، اور کوتاہی پر پٹائی یہ آخری مرحلہ کا نصیب ہے۔

یہ شاہ صاحب قدس سرہ کی بات کا نچوڑ ہے۔ اب یہی بات شاہ صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

بچہ کا بلوغ دو مرحلوں میں ہوتا ہے:

ابتدائی مرحلہ: نفسیاتی تندرستی اور بیماری کی صلاحیت پیدا ہونے کا زمانہ ہے۔ بچہ میں عقل کا پیدا ہونا نفسیاتی تندرستی ہے۔ اور اس کا بے عقل رہ جانا نفسیاتی بیماری ہے۔ اور سات سال ظہور عقل کی علامت ہیں۔ اس عمر میں بچہ کی حالت میں واضح تبدیلی آتی ہے۔ اور دس سال عقل کی تکمیل کی علامت ہیں۔ اگر بچہ کا مزاج صحیح سالم ہو تو وہ دس سال کی عمر میں عقلمند ہو جاتا ہے۔ اپنا نفع ونقصان سمجھنے لگتا ہے۔ اور تجارت وغیرہ کاموں میں ہوشیار ہو جاتا ہے۔

آخری مرحلہ: وہ ہے جب بچہ میں جہاد کرنے کی اور حدود وانگیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اور اس پر داروگیر درست ہوتی ہے، جس مرحلہ میں وہ پورا مرد بن جاتا ہے اور مردوں کی طرح مشقتیں اور تکالیف برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، اور ملکی اور ملّی معاملات میں اس کا حال قابلِ لحاظ ہو جاتا ہے مثلاً ووٹ دینے اور امامت کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور صراط مستقیم پر گامزن کرنے کے لئے اس پر زبردستی کی جاسکتی ہے۔ بلوغ کے اس مرحلہ کا مدار عقل کے کمال اور جسم کے مضبوط ہونے پر ہے۔ اور یہ بات عام طور پر پندرہ سال کی عمر میں حاصل ہو جاتی ہے ——— اور اگر بچہ کی عمر معلوم نہ ہو تو احتلام اور زیر ناف اُگنے سے اس کے بلوغ کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ چیزیں بھی منجملہ علاماتِ بلوغ ہیں۔

اور نماز کی بھی دو جہتیں ہیں:

پہلی جہت: نماز قرب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ اور جہنم کے کھڈ میں گرنے سے بچانے والی عبادت ہے۔ اس لئے بلوغ کے ابتدائی مرحلہ ہی میں اس کا حکم دیا گیا۔

دوسری جہت: نماز اسلام کا ایک ایسا شعار ہے جس میں کوتاہی پر لوگوں کی داروگیر کی جاتی ہے۔ اور ان کو اُن شعائر پر مجبور کیا جاتا ہے، خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ اس اعتبار سے نماز کا معاملہ دیگر معاملات (روزے زکوۃ) کی طرح ہے۔ یعنی نماز فرض پندرہ سال مکمل ہونے پر ہوتی ہے، جیسے دیگر عبادات اسی عمر میں فرض ہوتی ہیں۔

اور دس سال کی عمر بلوغ کے دونوں مرحلوں کے درمیان کا مرحلہ ہے۔ اور یہ مرحلہ دونوں جہتوں کے لئے جامع ہے۔ اس لئے اس مرحلہ کے لئے دونوں مرحلوں میں سے حصہ رکھا گیا ہے۔

فائدہ: اور خوابگاہیں جدا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ آغاز جوانی کا زمانہ ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ ہم خوابی مجامعت کی خواہش پیدا کرے۔ اس لئے معاملہ بگڑنے سے پہلے ہی فساد کی راہ بند کردینی ضروری ہے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "مُرُوا أولادَكم بالصلاة وهم أبناءُ سَبعِ سنين، واضربوهم عليها وهم أبناءُ عشرِ سنين، وفَرِّقُوْا بينَهم في المضاجع"

أقول: بلوغُ الصبي على وجهين:

[الف] بلوغٌ في صلاحيةِ السَّقَمِ والصِّحَّةِ النفسانِيَّتَيْنِ، ويتحقَّق بالعقل فقط؛ وأمارةُ ظهورِ العقلِ السبعُ، فابنُ السبع ينتقل فيها لامحالة من حالة إلى حالة انتقالاً ظاهرًا؛ وأمارةُ تمامه العشرُ، فابنُ العشر عند سلامة المزاج يكون عاقلاً، يعرف نفعَه من ضرره، ويَحْذِقُ في التجارة وما يُشْبِهُها.

[ب] و بلوغٌ في صلاحيةِ الجهادِ والحدود، والمؤاخذةِ عليه، وأن يصير به من الرجال الذين يُعانون المكايدَ، ويُعتبر حالُهم في السياسات المَدَنية والملِّية، ويُجبرون قَسْرًا على الصراط المستقيم؛ ويَعْتمِدُ على كمالِ العقل، وتمامِ الْجُثَّةِ، وذلك بخمسَ عشرةَ سنةً في الأكثر؛ ومن علاماتِ هذا البلوغ: الاحتلام، وإنباتُ العانةِ.

والصلاةُ لها اعتباران:

فباعتبارِ كونها وسيلةً فيما بينه وبين مولاه، مُنْقِذَةً عن التَّرَدِّى في أسفل السافلين: أُمِرَ بها عند البلوغ الأول.

وباعتبار كونها من شعائر الإسلام، يُؤاخذون بها، ويُجبرون عليها، أَشاؤا أم أبوا: حكمُها حكمُ سائر الأمور.

ولما كان سنُّ العشر برزخًا بين الحدَّين، جامعًا بين الجهتين، جعلَ له نصيبًا منهما.

وإنما أمر بتفريق المضاجع: لأن الأيامَ أيامُ مراهقةٍ، فلا يَبْعُدُ أن تُفْضِيَ المضاجَعَةُ إلى شهوة المجامعة، فلا بد من سدِّ سبيلِ الفسادِ قبلَ وقوعه.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ”حکم دوتم اپنی اولاد کو نماز کا درانحالیکہ وہ سات سال کے ہوں۔ اور مارو ان کو نماز پر درانحالیکہ وہ دس سال کے ہوں۔ اور جدائی کرو ان کے درمیان خوابگاہوں میں“

میں کہتا ہوں: بچے کا بالغ (باشعور) ہونا دو طرح سے ہے:

(الف) نفسیاتی تندرستی اور نفسیاتی بیماری کی قابلیت میں بالغ ہونا۔ اور پایا جاتا ہے یہ بلوغ صرف عقل کے ذریعہ۔ اور عقل کے ظاہر ہونے کی نشانی سات سال ہیں۔ پس سات سال کا بچہ: منتقل ہوتا ہے وہ سات سال کی عمر میں یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف واضح طور پر منتقل ہونا۔ اور عقل کے پورا ہونے کی نشانی دس سال ہیں۔ پس دس سال کا بچہ —— مزاج کی سلامتی کی صورت میں —— عقل مند ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے اپنے نفع کو نقصان سے۔ اور ہوشیار ہو جاتا ہے تجارت میں اور اس کے مشابہ چیزوں میں۔

(ب) اور بالغ ہونا جہاد اور حدود کی قابلیت میں، اور اس پر دارو گیر کے معاملہ میں۔ اور اس بات میں کہ ہو جاتا ہے

وہ اس بلوغ کی وجہ سے اُن مردوں میں سے جو تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ اوران کے حال کا اعتبار کیا جاتا ہے عمرانی اور ملّی معاملات میں۔ اور مجبور کئے جاتے ہیں وہ زور جبر سے صراط مستقیم پر۔ اور مدار ہے اس بلوغ کا عقل کے کمال پر اور جسم کے مضبوط ہونے پر۔ اور یہ چیز اکثری احوال میں پندرہ سال میں حاصل ہوجاتی ہے۔ اوراس بلوغ کی نشانیوں میں سے: احتلام اور زیرناف کا اُگنا ہے۔

اور نماز کے لئے دو اعتبار ہیں:

(الف) پس اس کے وسیلہ (ذریعہ) ہونے کے اعتبار سے بچے اوراس کے آقا (اللہ تعالیٰ) کے درمیان (اور) چھڑانے والا ہونے کی وجہ سے اسفل السافلین میں گرنے سے: حکم دیا گیا بچہ نماز کا بلوغ کے پہلے مرحلہ میں۔

(ب) اوراس کے اسلام کے شعائر میں سے ہونے کے اعتبار سے۔ داروگیر کئے جاتے ہیں لوگ ان شعائر کی وجہ سے۔ اور مجبور کئے جاتے ہیں وہ ان شعائر پر، خواہ وہ چاہیں یا انکار کریں۔ نماز کا حکم دیگر امور کی طرح ہے۔

اور جب دس سال کی عمر بلوغ کی دو حدوں کی درمیانی چیز تھی، دونوں جہتوں کے درمیان جامع تھی، تو بنایا شارع نے اس کے لئے ایک ایک حصہ دونوں حدود میں سے۔

اور خواب گاہوں میں جدا کرنے کا حکم: صرف اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ زمانہ آغاز جوانی کا زمانہ ہے۔ پس بعید نہیں ہے کہ ہم خوابی مجامعت کی خواہش تک پہنچادے۔ پس ضروری ہے فساد کی راہ بند کرنا فساد کے وقوع سے پہلے۔

تصحیح: اس عبارت میں دو تصحیحیں مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہیں: (۱) أمارةُ ظهور العقل السبع میں السبع نکرہ تھا (۲) علی کمال العقل میں کمال کے بجائے تمام تھا۔

☆ ☆ ☆

باب ــــــــ ۲

نماز کی فضیلت کا بیان

نماز گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے

آیت پاک سورۂ ہود آیت ۱۱۴ میں ارشاد پاک ہے: ''بیشک نیک کام برے کاموں کو مٹادیتے ہیں'' اس آیت کی تفسیر میں دو حدیثیں مروی ہیں۔ پہلی حدیث یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی اجنبی عورت کو چوما۔ اس نے آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس شخص نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ آیت میرے ہی لئے

ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لجميع أمتي كلّهم: نہیں یہ میری ساری امت کے لئے ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵۶۶)

دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے کسی عورت کو چھیڑا۔ اور صحبت کے علاوہ فائدہ اٹھایا۔ وہ سزایابی کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کو یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ کسی نے پوچھا: اے اللہ کے نبی! کیا یہ اسی شخص کے لئے خاص ہے؟ آپؐ نے فرمایا: بل للناس كافةً: نہیں، تمام لوگوں کے لئے عام ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵۷۵)

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں حد کو پہنچا ہوں یعنی میں نے قابلِ تعزیر گناہ کیا ہے پس آپ مجھ پر حد جاری کریں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپؐ نے اس سے موجبِ حد کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اور نماز کا وقت ہو گیا۔ اس نے آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد وہ کھڑا ہوا اور اس نے پہلی بات دُہرائی۔ آپؐ نے دریافت کیا: کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ اس نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: ''تو اللہ نے تیرا گناہ معاف کر دیا'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۶۷)

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بتاؤ، اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر بہتی ہو، جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے میل میں سے کچھ باقی رہے گا؟'' صحابہ نے جواب دیا: اس کے میل میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا! آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ پانچوں نمازوں کی مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ گناہوں کو معاف فرماتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۶۵)

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانچ نمازیں اور جمعہ تا جمعہ اور رمضان تا رمضان: ان گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جو ان کے درمیان ہوئے ہیں، جب گناہ کبیرہ نہ کئے ہوں (اس آخری جملہ کے دو مطلب سمجھے گئے ہیں: پہلا مطلب یہ ہے کہ نماز سے گناہوں کی معافی کے لئے کبیرہ گناہوں سے پاک ہونا شرط ہے۔ اگر کسی نے کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے تو اب نماز سے اس کے صغیرہ گناہ بھی معاف نہ ہوں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نماز سے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ کبیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے۔ ان کی معافی کے لئے توبہ شرط ہے)

تشریح: نماز صفتِ طہارت اور صفتِ اخبات کے لئے جامع ہے یعنی نمازی بندہ پاکی کا اہتمام کرتا ہے اور بارگاہ خداوندی میں نیازمند بنا رہتا ہے اور پاکیزگی اور نیازمندی نماز کے ذریعہ بدست آتی ہیں۔ اور نماز نفس کو پاک کر کے فرشتوں کی دنیا تک پہنچا دیتی ہے۔

اور نفس کی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کسی صفت کے ساتھ پوری طرح متصف ہوتا ہے اور وہ صفت اس میں گھر کر لیتی ہے تو اس کی ضد سے بالکل کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اور اس ضد سے ایسا دور ہو جاتا ہے: جیسے وہ کوئی قابلِ تذکرہ چیز ہی نہیں ہے۔ مثلاً جب وہ عدل و سخاوت کے ساتھ متصف ہوگا تو ظلم و بخل کا اس میں نام و نشان تک نہ رہے گا۔ اور اسی طرح اس کا برعکس۔ پس جب نماز نمازی میں طہارت اور اخبات کی صفات پیدا کر دے گی تو نجاست اور

استکبار کا بندہ میں نام ونشان تک نہ رہے گا۔

غرض جب مؤمن بندہ اہتمام اورفکر کے ساتھ نماز اچھی طرح ادا کرے گا۔ اور نماز کی روح اور اس کی حقیقت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، تو وہ ضرور بحر رحمت میں غوطہ زن ہوگا۔ اور دریائے رحمت اس کی خطاؤں کو دھودے گا۔

﴿فضل الصلاة﴾

قوله تعالى: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾

وقوله صلى الله عليه وسلم لمن صلّى في الجماعة بعد الذنب: "فإن الله قد غفرلك ذنبك"

وقوله صلى الله عليه وسلم: "أرأيتم لو أنّ نهرًا بباب أحدِكم، يغتسلُ فيه كلَّ يوم خمسًا، هل يبقىٰ من دَرَنه شيئ؟" قالوا: لا يبقى من درنه شيئ! قال: "فذلك مَثَلُ الصلوات الخمس: يَمْحُو اللّٰهُ بهنَّ الخطايا"

وقوله صلى الله عليه وسلم: "الصلواتُ الخمس، والجمعةُ إلى الجمعة، ورمضانُ إلى رمضانَ: مكفِّراتٌ لما بينهن، إذا اجْتُنِبَتِ الكبائرُ"

أقول: الصلاةُ جامعةٌ للتنظيف والإخباتِ، مُقَدِّسَةٌ للنفس إلى عالَم الملكوت؛ ومن خاصية النفس: أنها إذا اتصفَتْ بصفةٍ رَفَضَتْ ضِدَّها، وتباعدتْ عنه، وصار ذلك منها كأن لم يكن شيئًا مذكورًا؛ فمن أدّى الصلوات على وجهها، وأحسنَ وضوءَ هن، وصلاهنَّ لوقتهنَّ، وأتم ركوعهن وخشوعهن وأذكارهن و هيئاتهن، وقصدَ بالأَشْبَاح أرواحَهَا، وبالصُّوَرِ معانيها، لابد أنه يخوض في لُجَّةٍ عظيمةٍ من الرحمة، ويمحو اللّٰه عنه الخطايا.

ترجمہ: آیت اور روایات کا ترجمہ گذر چکا۔ میں کہتا ہوں: نماز پاکیزگی اور بارگاہ خداوندی میں نیازمندی کے لئے جامع ہے (وہ) نفس کو پاک کرنے والی، فرشتوں کی دنیا کی طرف پہنچانے والی ہے یعنی انسان کو فرشتہ صفت بنادیتی ہے ـــــ اور نفس کی خصوصیات میں سے یہ بات ہے کہ جب وہ کسی صفت کے ساتھ متصف ہوتا ہے تو وہ اس کی ضد کو چھوڑ دیتا ہے، اور وہ اس ضد سے دور ہوجاتا ہے۔ اور وہ ضد اس نفس سے ایسی ہوجاتی ہے گویا وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہیں تھی ـــــ پس جو شخص نمازوں کو صحیح طریقہ پرادا کرے اور اچھی طرح سے وضو کرے اور وقت پر ان کو پڑھے۔ اور رکوع اور خشوع کا اہتمام کرے۔ اور ان کے اذکار اور اشکال کو تام کرے۔ اور ان کے پیکروں سے ان کی ارواح کا اور ان کی صورتوں سے ان کے حقائق کا ارادہ کرے، تو ضروری ہے کہ وہ رحمت الٰہی کے بڑے دریا میں غوطہ لگائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی خطائیں مٹادیں (مقدسة میں رافعة کی تضمین ہے)

نوٹ: نصوص میں بعض الفاظ ان کے مصادر سے بڑھائے ہیں۔ اور بعض الفاظ کی تصحیح بھی کی ہے۔

☆ ☆ ☆

ترکِ نماز ایمان کے منافی اور کافرانہ عمل ہے

حدیث ــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندے اور کفر کے درمیان (پُل) نماز چھوڑنا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵۹۶)

تشریح: نماز چھوڑ دینا ایمان کے منافی اور کافرانہ عمل دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: نماز دین کا عظیم ترین شعار ہے۔ اور مسلمانوں کی ایسی علامت ہے کہ اگر وہ نہ رہے تو گویا اسلام ہی نہ رہا۔ کیونکہ دونوں میں گہرا تعلق ہے۔

دوسری وجہ: اسلام کے معنی ہیں: احکام الٰہی کے سامنے سر جھکا لینا۔ اور یہ معنی نماز ہی کے ذریعہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ پس جس کا نماز میں کوئی حصہ نہیں اس کا اسلام سے تعلق بس برائے نام ہے۔

قوله صلى الله عليه وسلم: "بين العبد وبين الكفر تركُ الصلاة"

أقول: الصلاةُ من أعظم شعائر الإسلام، وعلاماته التي إذا فُقِدَتْ ينبغي أن يُحْكَمَ بفقده، لقوة الملابسة بينها وبينه، وأيضًا: الصلاةُ هي المُحَقِّقَةُ لمعنى إسلام الوجه لله، ومن لم يكن له حَظٌّ منها، فإنه لم يَبُؤْ من الإسلام إلا بمالايُعْبَأُ به.

ترجمہ: آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بندے کے درمیان اور کفر کے درمیان (جوڑنے والی چیز) نماز کا چھوڑنا ہے''

میں کہتا ہوں: نماز اسلام کے عظیم ترین شعائر میں سے ہے۔ اور اس کی اُن علامتوں میں سے ہے کہ جب وہ گم ہو جاتی ہے تو مناسب ہے کہ حکم لگایا جائے اسلام کے گم ہونے کا، تعلق کے مضبوط ہونے کی وجہ سے نماز اور اسلام کے درمیان۔ اور نیز: نماز ہی اچھی طرح ثابت کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے کے معنی کو۔ اور وہ شخص جس کے لئے نماز میں سے کوئی حصہ نہیں، تو بیشک وہ نہیں لوٹا اسلام سے مگر ایسی چیز کے ساتھ جس کا کچھ اعتبار نہیں۔

لغات: بَاءَ يَبُوْءُ بَوْءًا إليه: لوٹنا..... عَبَأَ (ف) عَبْأً المتاعَ: سامان کرنا۔ عَبَأَ به: پروا کرنا لايُعْبَأُ به: اس کی پرواہ نہیں۔ وہ قابل لحاظ نہیں۔

ترکیب: بين العبد خبر مقدم ہے اور ظرف بین کا متعلق محذوف ہے۔ اور وہ وُصْلَة (پُل، ملانے والی چیز) ہے اور ترك الصلاة مبتدا مؤخر ہے۔

باب ـــــ ۳

نماز کے اوقات

وقفے وقفے سے نمازیں رکھنے کی حکمت

نماز سے جو منفعت وابستہ ہے ـــــ یعنی شہود وحضور کے سمندر میں غوطہ زن ہونا یعنی قُرب خداوندی کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونا۔ اور ملائکہ کی لڑی میں منسلک ہونا یعنی پوری طرح سے فرشتہ صفت بن جانا ـــــ وہ اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب زندگی کے تمام لمحات نماز کی نذر کردیئے جائیں۔ آدمی ہر وقت نماز سے چمٹا رہے۔ اور اتنی کثرت سے نمازیں پڑھے کہ گناہوں کے بوجھ سے سبکدوش ہوجائے۔ مگر انسان کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا جاسکتا جس سے دنیا کے دوسرے ضروری کام ٹھپ ہوجائیں، اور وہ مادیت کے تقاضوں سے بالکلیہ دامن جھاڑ لے۔ اس لئے حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ لوگوں کو وقفہ وقفہ سے نماز کی نگہداشت اور دیکھ بھال کا حکم دیا جائے۔ تاکہ نماز سے پہلے نماز کا انتظار اور نماز کے لئے تیاری اور نماز کے بعد اس کا باقی رنگ اور بچا ہوا نور نماز کے حکم میں ہوجائے۔ اور درمیانی وقفہ جو غفلت کا وقت ہے چونکہ اس میں بھی اس کی نگاہ یادِالٰہی کی طرف اٹھی رہے گی اور دل طاعتِ الٰہی سے جڑا رہے گا، اس لئے وہ بھی نماز کے ساتھ ملایا ہوا ہوجائے گا۔ غرض مؤمن کا حال اس گھوڑے جیسا ہے جس کی پچھاڑی بندھی ہوئی ہو۔ دو ایک بار کودے پھاندے، پھر اپنے تھان پر آکھڑا ہو۔ اسی طرح مؤمن کا دل نماز سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ کچھ وقت مشاغل میں گذار کر، پھر نماز کے لئے آکھڑا ہوتا ہے۔ اور کوتاہیوں اور غفلت کی تاریکی اس کے دل کی تھاہ میں گھسنے نہیں پاتی۔ اور یہی (حکمی) مداومت آسان ہے۔ جب حقیقی مداومت ممکن نہیں تو یہی سہی!

خلاصہ: یہ ہے کہ پانچوں نمازیں ایک ساتھ نہ رکھنے میں یا بے ضرورت نمازوں کو جمع کرنے کی اجازت نہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ یہ دنیا دارِ غفلت ہے۔ یہاں ذرا دیر میں دل پر غفلت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ پس چاہئے تو یہ تھا کہ بندہ ہمہ وقت اپنے خالق و مالک کی یاد میں مشغول رہتا۔ مگر جب یہ بات دنیوی جھمیلوں کی وجہ سے ممکن نہ تھی، تو ترکیب یہ نکالی گئی کہ وقفہ وقفہ سے نمازیں رکھ دیں۔ تاکہ نماز سے پہلے کچھ وقت نماز کے انتظار اور تیاری میں گذرے، اور نماز کے بعد کچھ دیر تک اس کا اثر باقی رہے۔ اور ایک مختصر وقفہ کے بعد آدمی پھر اگلی نماز کے لئے کھڑا ہوجائے اور اس طرح سارا ہی وقت ذکرِالٰہی میں مشغول ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ تمام نمازیں ایک ساتھ پڑھ لینے میں یا دو نمازوں کو جمع کرنے میں یہ مصلحت فوت ہوجاتی ہے۔ طویل وقفہ کرنے میں دل اللہ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے۔ اور غفلت دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اور بندہ اپنے مولیٰ سے بے گانہ ہوجاتا ہے۔

﴿أوقاتُ الصلاة﴾

لما كانت فائدةُ الصلاة —— وهي الخوض في لُجّة الشهود، والانسلاكُ في سِلك الملائكة ——لاتحصل إلا بمداومةٍ عليها، وملازمةٍ بها، وإكثارٍ منها، حتى تَطْرَحَ عنهم أثقالَهم، ولايمكن أن يُؤْمَرُوْا بما يُفْضِي إلى ترك الارتفاقات الضرورية، والانسلاخ عن أحكام الطبيعة بالكلية: أوجبت الحكمةُ الإلٰهيةُ: أن يُؤْمَرُوْا بالمحافظة عليها، والتعهُّدِ لها، بعدَ كل بُرْهَةٍ من الزمان، ليكون انتظارُهم للصلاة، وتَهَيُّؤُهُمْ لها قبلَ أن يفعلوها، وبقيةُ لونها وصُبابةُ نورها بعد أن يفعلوها: في حكم الصلاة، وتكونُ أوقاتُ الغفلة مضمومةً بطمحِ بصرٍ إلى ذكر الله، وتعلُّقِ خاطرٍ بطاعة الله، فيكون حالُ المسلم كحال حصانٍ مربوطٍ بآخِيَّةٍ، يَسْتَنُّ شَرَفًا أو شرفَيْنِ، ثم يرجع إلى آخِيَّتِه، ويكون ظلمةُ الخطايا والغفلة لاتدخل في جذر القلوب؛ وهذا هو الدوامُ المُتيَسَّرُ عند ما امْتَنَعَ الدوامُ الحقيقي.

ترجمہ: نماز کے اوقات کا بیان: جب نماز کا فائدہ —— اور وہ شہود کے سمندر میں گھسنا اور فرشتوں کی لڑی میں منسلک ہونا ہے —— نہیں حاصل ہوتا تھا مگر نماز کی مداومت کرنے سے، اور نماز کے ساتھ چپٹے رہنے سے، اور بکثرت نماز پڑھنے سے یہاں تک کہ نماز لوگوں سے ان کے بوجھوں کو ڈالدے۔ اور نہیں ممکن ہے کہ لوگ حکم دیئے جائیں ایسی بات کا جو پہنچائے ضروری تدابیرِ نافعہ کو تج دینے تک اور مادیت کے احکام سے پوری طرح نکل جانے تک: تو واجب کیا حکمتِ خداوندی نے کہ لوگ حکم دیئے جائیں نماز کی نگہداشت کرنے کا اور نماز کی دیکھ بھال کرنے کا زمانہ کے ہر ایک حصہ کے بعد یعنی وقفہ وقفہ سے، تاکہ ان کا نماز کے لئے انتظار کرنا، اور نماز کے لئے ان کا تیاری کرنا، نماز کو ادا کرنے سے پہلے اور اس کے رنگ کا باقی ماندہ اور اس کے نور کا تھوڑا سا بچا ہوا، نماز کو ادا کرنے کے بعد: نماز کے حکم میں ہو یعنی حکماً یہ بھی نماز شمار ہو۔ اور غفلت کے اوقات (دو نمازوں کے درمیان کا وقفہ) ملائے ہوئے ہوں (نماز کے ساتھ) نگاہ کے اٹھانے کی وجہ سے اللہ کی یاد کی طرف، اور دل کے جڑنے کی وجہ سے اللہ کی اطاعت کے ساتھ۔ پس مسلمان کا حال اس گھوڑے کے حال جیسا ہے جو ایک کھونٹی سے بندھا ہوا ہو۔ کودے پھاندے ایک قدم یا دو قدم، پھر لوٹ آئے اپنے کھونٹے کی طرف اور نہ داخل ہو خطاؤں اور غفلت کی تاریکی دلوں کی تھاہ میں۔ اور یہی وہ آسان مداومت ہے، مداومتِ حقیقی ممکن نہ ہونے کی صورت میں۔

لغات: اللُّجّة: پانی کا بڑا حصہ...... الصُبابة: برتن میں بچا ہوا پانی...... الأخِيَة و الآخِيّة: وہ رسی جس کے دونوں سرے زمین میں گاڑ دیتے ہیں، اور اوپر کو حلقہ سا نکلا ہوا ہوتا ہے جس میں جانوروں کو باندھتے ہیں...... اِسْتَنَّ الفرسُ:

گھوڑے کا بھاگنا، کودنا پھاندنا...... الشَّرَف: ٹیلہ، بلند جگہ۔

☆ ☆ ☆

نمازوں کے لئے مناسب اوقات

مذکورہ بالا مصلحت سے جب نمازوں کو وقفہ وقفہ سے رکھنا ضروری ہوا، تو اب تعیین اوقات کا مسئلہ پیش آیا۔ مبحث ششم کے باب ہشتم میں یہ بات تفصیل سے گذر چکی ہے کہ روحانیت کے پھیلنے کے اوقات چار ہیں۔ ان اوقات میں رحمتِ الٰہی کا فیضان ہوتا ہے۔ فرشتے اترتے ہیں، اللہ کے سامنے بندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں، بندوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، اور وہ اوقات تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک ایک مسلّمہ امر کی طرح ہیں۔ یہ اوقات دونوں جانب شب وروز کے اجتماع اور دونوں کے آدھا ہونے کے اوقات ہیں یعنی فجر کا وقت، غروب کا وقت، زوال کا وقت اور آدھی رات کا وقت۔ مگر آدھی رات میں لوگوں کو نماز کا مکلّف بنانا باعثِ پریشانی ہے۔ جس کو ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے نمازوں کے لئے تین اوقات بچے: ایک: صبح کا وقت۔ دوسرا: عَشِی یعنی زوال کے بعد سے شروع ہونے والا وقت اور تیسرا: جب رات آجائے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۸ میں ان کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہے:

''اہتمام کرتو نماز کا سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک، اور فجر میں قرآن کا پڑھنا۔

بیشک فجر میں قرآن پڑھنا ہوتا ہے (فرشتوں کے) روبرو''

تفسیر: سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک چار نمازیں وقفہ وقفہ سے رکھی گئی ہیں یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ اور فجر میں قرآن پڑھنا یعنی فجر کی نماز ادا کرنا۔ اور اس تعبیر میں اشارہ ہے کہ فجر کی نماز میں لمبی قراءت مطلوب ہے۔ اور فجر میں قرآن پڑھنا روبرو ہوتا ہے یعنی فرشتوں کے روبرو ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ عصر اور فجر میں رات اور دن کے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ اور نماز پڑھ کر اور قرآن سن کر جن کی ڈیوٹی ختم ہوئی ہے، وہ آسمان پر چڑھ جاتے ہیں اور دوسرے کام پر لگ جاتے ہیں۔ (مشکوٰۃ حدیث ۶۲۶ و ۶۳۵)

فائدہ: ''رات کے اندھیرے تک'' اس لئے فرمایا کہ زوال سے نمازوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہ بلا فصل رات چھانے تک چلتا رہتا ہے۔ اور چونکہ یہ نمازیں ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں اس لئے بوقت ضرورت ظہر وعصر کے درمیان اور مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرنا جائز ہے۔ اور یہ آیت جوازِ جمع کی ایک دلیل ہے ــــ لیکن غور کیا جائے تو اس آیت کا دو نمازوں کو جمع کرنے کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اگر اس آیت سے جمع کرنے کا اشارہ نکالا جائے گا، تو دو نہیں چار نمازوں کو جمع کرنے کی مشروعیت نکلے گی (فوائد عثمانی)

ثم لما آلَ الأمرُ إلى تعيين أوقاتِ الصلاة: لم يكن وقتٌ أحقَّ بها من الساعاتِ الأربع التى تنتشِرُ فيها الروحانيةُ، وتنزِل فيها الملائكةُ،ويُعرض فيها على الله اعمالهم، ويُستجابُ دعاؤهم، وهى كالأمر المسلَّمِ عند جمهور اهل التلقِّى من الملأ الأعلى، لكن وقتَ نصفِ الليل لايمكن تكليفُ الجمهور به، كما لايخفى، فكانت أوقاتُ الصلاة فى الأصل ثلاثة: الفجر، والعَشِيُّ، وغَسَقُ الليل؛ وهو قوله تبارك وتعالى: ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ، إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾

وإنما قال: ﴿إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ﴾ لأن صــلاة العَشِيِّ ممتدَّةٌ إليه حكمًا، لعدم وجود الفصل، ولذلك جاز عند الضرورة الجمعُ بين الظهر والعصر، وبين المغرب والعشاء؛ فهذا أصلٌ.

ترجمہ: اور جب معاملہ نماز کے اوقات کی تعیین کی طرف لوٹا: تو نہیں تھا کوئی وقت نمازوں کا زیادہ حقدار اُن چار اوقات سے جن میں روحانیت (رحمت) پھیلتی ہے اور جن میں فرشتے اترتے ہیں۔ اور جن میں اللہ کے سامنے بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ اور بندوں کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ اور وہ اوقات ایک مسلمہ امر کی طرح ہیں ملأ اعلیٰ سے علوم حاصل کرنے والے عام حضرات کے نزدیک یعنی انبیاء کرام کے نزدیک مگر آدھی رات کا وقت ممکن نہیں تھا عام لوگوں کو اس کا مکلّف بنانا، جیسا کہ مخفی نہیں ہے، پس نماز کے اوقات درحقیقت تین رہے: صبح کا وقت، شام کا وقت اور رات کے چھانے کا وقت۔ اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''نمازیں ادا کیجئے آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کا اندھیرا ہونے تک اور صبح کی نماز بھی۔ بیشک صبح کی نماز حاضر ہونے کا وقت ہے''

اور ''رات کا اندھیرا ہونے تک'' صرف اس وجہ سے فرمایا کہ شام کی نمازوں کا سلسلہ دراز ہے رات کے چھانے تک، فصل نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور اس وجہ سے جائز ہے بوقتِ ضرورت ظہر اور عصر اور مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرنا، پس یہ ایک بنیاد ہے (جوازِ جمع کی)

 ☆ ☆

نمازوں کے اوقات کی تشکیل

پہلے دو باتیں سمجھ لی جائیں:

پہلی بات: دو نمازوں کے بیچ میں فاصلہ نہ تو بہت زیادہ ہونا چاہئے، نہ بہت کم۔ بہت زیادہ فصل کا نقصان یہ ہے کہ نماز کی نگہداشت کا حکم بے معنی ہو جائے گا۔ اور سابقہ نماز سے اللہ تعالیٰ کی جو یاد دل میں پیدا ہوئی تھی بندہ اس کو بھول

جائے گا۔ یہ دنیا بھول نگری ہے۔ کچھ وقت کے بعد آدمی بات بھول جاتا ہے۔ اور بہت کم فصل ہونے کا نقصان یہ ہے کہ لوگوں کو کاروبار کا وقت نہیں ملے گا۔ حالانکہ نمازوں کے درمیان میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ وقت ملنا چاہئے۔ اور نمازوں کی حد بندی ایسے معتد بہ وقت کے ذریعہ کرنی چاہئے جو واضح اور محسوس ہو، جس کو عام وخاص لوگ جان سکتے ہوں۔ اگر دو نمازوں کے درمیان بہت کم وقت ہوگا تو عام لوگ دو نمازوں میں فصل نہیں پہچان سکیں گے۔ اور وہ معتد بہ وقت: اوقات کا اندازہ کرنے کے سلسلہ میں عرب وعجم میں مستعمل اجزائے وقت میں سے جو "بہت وقت" ہے: وہ ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ وہ بہت ہی زیادہ نہ ہو۔ لوگ کم وقت کا اندازہ: لمحہ بھر، تھوڑی دیر، ایک گھنٹہ وغیرہ سے کرتے ہیں۔ اور بہت زیادہ وقت کا اندازہ: دن بھر، سال بھر وغیرہ سے کرتے ہیں۔ اور معتد بہ مقدار کا اندازہ: گھنٹوں سے کرتے ہیں۔ پس دو نمازوں میں معتد بہ فاصلہ کرنے کے لئے چوتھائی دن یعنی تین گھنٹے مناسب ہیں۔ کیونکہ رات دن کو بارہ بارہ گھنٹوں میں تقسیم کرنے کا عام معمول ہے۔ جس پر معتدل ممالک کے تمام لوگ متفق ہیں۔

دوسری بات: آرام کا اور کاروبار کا وقت مستثنیٰ رکھنا چاہئے۔ اس میں کوئی نماز فرض نہیں کرنی چاہئے، تاکہ لوگ پریشانی سے دوچار نہ ہوں۔ عشاء کے بعد سے فجر تک چونکہ عام طور پر لوگ آرام کرتے ہیں۔ اس لئے اس وقت میں کوئی نماز فرض نہیں کی گئی۔ البتہ تہجد کی نماز بطور استحباب رکھی گئی اور اس کی خوب ترغیب دی گئی۔ اوابین (اللہ کی طرف لو لگانے والے بندے) اس کی قدر پہچانتے ہیں۔ اسی طرح فجر کی نماز کے بعد سے دوپہر تک کا وقت خالی رکھا گیا، تاکہ لوگ لمبے کام اس وقت میں نمٹالیں۔ اس وقت میں بھی کوئی نماز فرض نہیں کی گئی۔ البتہ چاشت کی نماز بطور استحباب رکھی گئی اور اس کی بھی خوب ترغیب دی گئی، تاکہ نیک بندے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

کھیتی باڑی والے اور تجارت پیشہ لوگ، اسی طرح صنعت وحرفت والے اور نوکری پیشہ لوگ اپنے مشاغل صبح سے دوپہر تک میں نمٹاتے تھے[1]۔ یہ روزی تلاش کرنے کا وقت ہے۔ نقلی اور عقلی دلائل سے یہ بات مؤید ہے:

نقلی دلیل: سورۃ النساء آیت گیارہ میں ارشاد پاک ہے: "اور بنایا ہم نے دن کو معاش (رزق) کا وقت" یعنی عموماً کاروبار اور کمائی کے دھندے دن میں کئے جاتے ہیں۔ اور اللہ پاک نے دن اسی مقصد سے بنایا ہے۔ اور سورۃ القصص آیت ۷۳ میں ارشاد پاک ہے: "اور اللہ نے اپنی مہربانی سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا، تاکہ تم رات میں آرام کرو، اور تاکہ (دن میں) اس کی روزی تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر بجالاؤ"

عقلی دلیل: کام دو طرح کے ہیں: ایک وہ جو مختصر وقت میں نمٹائے جاسکتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے لئے لمبا وقت

---

[1] اس وقت دنیا میں کافروں کا جاری کیا ہوا مارکیٹ ٹائم اور آفس ٹائم رائج ہے۔ جو صبح نو دس بجے سے شام پانچ چھ بجے تک جاری رہتا ہے۔ اس لئے کاروباری لوگوں کو نمازوں کی ادائیگی میں دشواری پیش آتی ہے۔ اسی طرح رات میں سونے کا اور صبح میں اٹھنے کا نظام بھی غلط ہوگیا ہے۔ اس لئے فجر کی ادائیگی بھی لوگوں کے لئے دشوار ہوگئی ہے۔ یہ بگڑے ہوئے ماحول کے اثرات ہیں فالی اللہ المشتکی!

درکار ہے۔ پہلی قسم کے کام تو نمازوں کے درمیانی وقفوں میں بھی نمٹائے جاسکتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کے کاموں کے لئے لمبا وقت درکار ہے۔ کیونکہ ان کاموں کے درمیان نماز کے لئے وقت نکالنا اور نماز کے لئے تیاری کرنا بھی لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہے۔ اس لئے صبح کا وقت ان لمبے کاموں کے لئے فارغ رکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی نماز فرض نہیں کی گئی۔

پس نمازوں کے اوقات کی تشکیل: اس طرح کی گئی ہے کہ رات کا وقت آرام کے لئے اور صبح کا وقت کاروبار کے لئے خالی رکھا گیا۔ اور زوال کے بعد سے رات چھانے تک کا وقت اولاً دو حصوں میں تقسیم کیا گیا: ایک: شام کا وقت یعنی زوال سے سورج غروب ہونے تک کا وقت۔ دوسرا: غروب کے بعد سے رات چھانے تک کا وقت۔ پھر ہر ایک کو دو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، اور ہر حصہ میں ایک نماز رکھی گئی: زوال کے بعد پہلے تین گھنٹوں میں ظہر، اور اس کے بعد کے تین گھنٹوں میں عصر، اور غروب کے بعد مغرب پھر اس کے بعد عشاء۔ اور صبح تڑکے فجر کی نماز رکھی گئی۔ اور آرام اور کاروبار کے اوقات کے درمیان میں تہجد اور چاشت کی نمازیں بطور استحباب رکھی گئیں[1]۔

فائدہ: چونکہ زوال سے رات تک کی چاروں نمازوں کی اوقات بندی کردی گئی ہے اس لئے ان میں سے کسی بھی دو کے درمیان جمع کرنا جائز نہیں۔ کوئی بھی دو نمازیں ایک وقت میں پڑھی جائیں گی تو تعیین اوقات میں جو مصلحت ہے وہ باطل ہوجائے گی۔ سورۃ النساء آیت ۱۰۳ میں خوف کی نماز کے بعد ارشاد ہے: ''پھر جب تم مطمئن ہوجاؤ تو نماز کو قاعدے کے موافق پڑھنے لگو۔ بیشک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے''۔

اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہاں اگر کوئی ضرورت پیش آئے کہ جمع کئے بغیر چارہ ہی نہ ہو تو ظہر وعصر میں اسی طرح مغرب وعشاء میں جمع کرنا جائز ہے کیونکہ یہ نمازیں ایک وقت کی دو پھانکوں میں رکھی گئی ہیں۔ پس مجبوری کی صورت میں ان کو جمع کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ جواز جمع کی ایک اور دلیل ہے۔ (اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو صلوٰۃ المعذورین میں آئے گی)

ولايجوز أن يكون الفصلُ بين كلِّ صلاتين كثيرًا جدًا، فيفوتُ معنى المحافظة، وينسى ما كسبه أولَ مرةٍ؛ ولاقليلاً جدًا، فلا يتفرَّغون لابتغاء معاشِهم؛ ولايجوز أن يُضرب في ذلك إلا حدًا ظاهرًا محسوسًا، يَتَبيَّنُهُ الخاصَّةُ والعامةُ، وهو كثيرةُ ما للجزء المستعمَل عند العرب والعجم في باب تقدير الأوقات، وليست بالكثرة المُفْرَطَةِ، ولايصلح لهذا إلا ربعُ النهار، فإنه ثلاثُ ساعاتٍ، وتَجْزِئَةُ الليل والنهار إلى ثِنْتَي عشرةَ ساعةً أمرٌ أجمع عليه أهل الاقاليم الصالحة.

وكان أهل الزِّراعة والتجارة والصِّناعة وغيرُهم يعتادون غالباً أن يتفرَّغوا لِأشْغالهم من

[1] اور اشراق کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ فقہاء محدثین کے نزدیک: اشراق وچاشت ایک ہی نماز ہیں۔ اگر سورج نکلنے کے بعد جلدی پڑھ لی جائے تو اس کا نام اشراق (سورج چمکنے کے وقت کی نماز) ہے اور دن چڑھے پڑھی جائے تو اس کا نام صلوٰۃ الضحیٰ ہے ۱۲

البُكرة إلى الهاجرة، فإنه وقتُ ابتغاءِ الرزق، وهو قوله تعالىٰ: ﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾ وقوله تعالىٰ: ﴿لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ﴾

وأيضًا: فكثير من الأشغال يَنْجَرُّ إلى مدة طويلة، ويكون التَّهَيُّؤُ للصلاة والتفرُّغ لها من الناس أجمَعِهم في أثناء ذلك حرجًا عظيمًا، فلذلك أَسْقَطَ الشارعُ الضُّحىٰ، ورغّب فيها ترغيبًا عظيمًا من غير إيجاب.

فوجب أن تُشْتَقَّ صلاةُ الْعَشِيِّ إلى صلاتين، بينهما نحوٌ من ربع النهار، وهما الظهر والعصر، وغَسَقِ الليل إلى صلاتين، بينهما نحوٌ من ذلك، وهما المغرب والعشاء.

ووجب أن لايُرَخَّصَ في الجمع بين كلٍّ من شِقَّيِ الوقتين إلا عند ضرورة،لايجد منها بُدًّا، وإلا لبطلت المصلحةُ المعتبرةُ في تعيين الأوقات؛ وهذا أصلٌ آخر.

ترجمہ: اور جائز نہیں کہ ہر دو نمازوں کے درمیان بہت زیادہ فصل ہو، پس فوت ہوجائیں نگہداشت کے معنی۔ اور بھول جائے وہ اس چیز کو جس کو اس نے پہلی بار میں حاصل کیا ہے۔ اور نہ بہت ہی تھوڑا (فصل ہو) پس نہ فارغ ہوں لوگ اپنی معاش تلاش کرنے کے لئے۔ اور جائز نہیں کہ مقرر کی جائے اس سلسلہ میں مگر کوئی واضح محسوس حد، جس کو معلوم کرلیں عام وخاص۔ اور وہ اس جزء کا ''بہت'' (معتد بہ) ہے جو اوقات کا اندازہ کرنے کے سلسلہ میں عرب وعجم کے نزدیک استعمال ہونے والا ہے، درانحالیکہ نہ ہو وہ حد سے بڑھی ہوئی زیادتی۔ اور نہیں مناسب ہے اس کے لئے مگر چوتھائی دن، پس بیشک وہ تین گھنٹے ہے۔ اور رات دن کو بارہ گھنٹوں میں تقسیم کرنا ایک ایسی بات ہے جس پر قابل رہائش خطوں کے باشندوں نے اتفاق کیا ہے۔

اور کاشتکاری اور تجارت اور کاریگری والے اور ان کے علاوہ لوگوں کا دستور تھا کہ فارغ ہوجائیں وہ اپنے مشاغل کے لئے صبح سے دوپہر تک۔ پس بیشک وہ روزی تلاش کرنے کا وقت ہے۔ اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''اور بنایا ہم نے دن کو معاش کا وقت'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''تاکہ (دن میں) اس کی روزی تلاش کرو''

اور نیز: پس بہت سے مشاغل کھنچ جاتے ہیں ایک لمبی مدت تک۔ اور ہوتا ہے نماز کے لئے تیاری کرنا اور نماز کے لئے وقت نکالنا سارے ہی لوگوں کے لئے اس کے درمیان: بڑی تنگی۔ پس اس وجہ سے شارع نے چاشت کی نماز کو ختم کردیا۔ اور اس کی ترغیب دی بہت زیادہ ترغیب دینا، واجب کئے بغیر۔

پس ضروری ہوا کہ شام کی نماز کو دو نمازوں میں تقسیم کیا جائے۔ دونوں کے درمیان تقریباً چوتھائی دن ہو، اور وہ ظہر اور عصر ہیں۔ اور رات کے آنے کو دو نمازوں میں تقسیم کیا جائے، ان کے درمیان بھی تقریباً اتنا ہی وقت ہو، اور وہ مغرب اور عشاء ہیں۔

اور ضروری ہوا کہ نہ اجازت دی جائے دونوں وقتوں کی دو پھانکوں میں سے ہر ایک کے درمیان جمع کرنے کی، مگر ایسی ضرورت کے وقت کہ نہ پائے وہ اس سے کوئی چارہ۔ ورنہ یقیناً باطل ہو جائے گی وہ مصلحت جس کا اوقات کی تعیین میں اعتبار کیا گیا ہے۔ اور یہ ایک اور اصل ہے۔

لغات: اِنْجَرَّ: کھنچا...... تَهَيَّأَ تَهَيُّؤاً للأمر: تیار ہونا، آمادہ ہونا، مستعد ہونا...... اِشْتَقَّ الشيئَ من الشيئ: مشتق کرنا، نکالنا...... العَشِيّ: امام راغب نے اس کے معنی: زوال سے لے کر صبح صادق تک کا وقت لکھا ہے: العَشِيُّ: من زوال الشمس إلی الصَّباح اھ

ترکیب: ولاقليلا جدًا کا عطف کثیرًا جدًا پر ہے...... کثیرةُ ما میں اضافت ہے اور ما موصولہ ہے...... حرجًا عظيمًا خبر ہے یکون کی...... غسقِ الليل کا عطف العَشِيّ پر ہے۔

تصحیح: وهو كثيرةُ ما اصل میں اور مخطوطہ پٹنہ میں وهو كثرة ما اور مخطوطہ برلین میں كثيره ما تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے...... وأیضًا: فكثيرمن الأشغال اصل میں واتصاف كثير من الأشغال تھا، تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

نمازوں کے تین خاص اوقات

معتدل ممالک کے باشندے اور معتدل مزاج والے عام لوگ ـــــــ جن کو احکام کی تشریع میں پیش نظر رکھا گیا ہے ـــــــ ہمیشہ سے صبح تڑکے بیدار ہوتے ہیں اور رات گئے تک کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ اور وہ اوقات جن کا بہت زیادہ حق ہے کہ ان میں نمازیں ادا کی جائیں: تین ہیں:

ایک: جب دل و دماغ معاشی مشاغل سے خالی ہوں ـــــــ معاشی مصروفیات اللہ کی یاد کو بھلا دیتی ہیں۔ اور جس وقت دماغ خالی ہو اور دل فارغ ہو، نماز ادا کی جائے تو اللہ کی یاد دل میں جگہ بنائے گی اور وہ قلب پر بہت زیادہ اثر انداز ہوگی۔ چنانچہ صبح اٹھتے ہی نماز فرض کی گئی۔ ارشاد پاک ہے: ''اور (اہتمام کرو) فجر کے پڑھنے کا یعنی فجر کی نماز کا۔ بیشک فجر کا پڑھنا حضوری کا وقت ہے''

دوم: سونے سے پہلے ـــــــ تاکہ اللہ کی یاد ان گناہوں کا کفارہ بن جائے جو دن بھر میں سرزد ہوئے ہیں۔ اور دل کا زنگ دور ہو جائے۔ حدیث میں ہے: ''جس نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی تو وہ شروع کی آدھی رات نوافل پڑھنے کی طرح ہے۔ اور جس نے عشاء اور فجر دونوں نمازیں باجماعت ادا کیں، تو وہ پوری رات نوافل پڑھنے کی طرح ہے'' (ترمذی ۱:۳۰ مگر اس میں الأول نہیں ہے)

سوم: جب کاروبار خوب زوروں پر ہو، جیسے دن چڑھے کا وقت ـــــ اس وقت نماز پڑھنا دنیا میں انہماک کو گھٹاتا ہے۔ اور دنیا کے زہر کے لئے تریاق کا کام کرتا ہے۔ مگر یہ نماز لوگوں پر لازم نہیں کی جاسکتی۔ ایسا کیا جائے گا تو لوگ یا تو کام چھوڑ دیں گے یا نماز۔ پہلی صورت میں دنیا کا نقصان ہوگا اور دوسری صورت میں دین کا ـــــ اور یہ بھی ایک دلیل ہے جمع بین الصلاتین کے جواز کی۔ کیونکہ مجبوری میں آدمی کسی نماز کو ضرور قضا کرے گا۔ پس اس سے بہتر یہ ہے کہ دونوں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھ لیا جائے۔

ملحوظہ: لیکن جب قرآن کریم نے صراحت کردی ہے کہ نمازوں کے اوقات محدود ہیں۔ یعنی ہر نماز کا وقت الگ الگ تجویز کیا گیا ہے، تو اب کسی صحیح صریح حدیث ہی سے جمع کا جواز پیدا ہوگا جیسا کہ عرفات اور مزدلفہ میں حاجیوں کے لئے جمع کی روایات ہیں۔ مگر دیگر مواقع میں ایسی کوئی روایت نہیں۔ پس محض عقلی اصولوں سے یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے نقلی دلیل درکار ہے (تفصیل آگے آئے گی)

وكان جمهورُ أهلِ الأقاليم الصالحة والأمزجةِ المعتدلة ـــ الذين هم المقصودون بالذات في الشرائع ـــ لايزالون متيقِّظين متردِّدين في حوائجهم من وقت الإسفار إلى غسق الليل. وكان أحقَّ ما يُؤدّى فيه الصلاةُ:

[۱] وقتُ خُلُوِّ النفس عن ألوان الأشغال المعاشية المُنْسِيةِ ذكرَ الله، ليُصادِفَ قلبًا فارغًا فتمكَّنُ منه، ويكون أشدَّ تأثيرًا فيه، وهو قوله تعالى: ﴿وَقُرْآنَ الْفَجْرِ، إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾

[۲] ووقتُ الشروع في النوم ليكون كفارةً لما مضى، وتَصْقِيْلاً للصَّدأ، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "من صلّى العشاء في جماعة كان كقيام نصفِ الليل الأول، ومن صلّى العشاء والفجر في جماعةٍ كان كقيام ليلة"

[۳] ووقتُ اشتغالِهم كالضُّحى، ليكون مُهَوِّنًا للانهماك في الدنيا، وترياقًا له، غير أن هذا لايجوز أن يُخَاطَبَ به الناسُ جميعًا، لأنهم حينئذ بين أمرين: إما أن يتركوا هذا أوذاك، وهذا أصلٌ آخرُ.

ترجمہ: اور قابل رہائش خطوں کے اور معتدل مزاج والے عام لوگ ـــــ جو کہ وہی بالذات احکام کی تشریع میں پیش نظر رہتے ہیں ـــــ ہمیشہ سے بیدار ہوتے ہیں اور اپنے کاروبار میں مصروف ہوتے ہیں صبح کا تڑکا پھیلنے کے وقت سے رات کی تاریکی چھانے تک۔ اور تھا زیادہ حقدار اس بات کا کہ اس میں نماز ادا کی جائے:

(۱) نفس کے فارغ ہونے کا وقت طرح طرح کی معاشی مصروفیات سے، جو بھلانے والی ہیں اللہ کی یاد کو۔ تاکہ

۔۔۔ کر فارغ دل کو پس جگہ بنالے وہ اس میں۔اور ہوئے وہ بہت زیادہ اثر انداز دل میں۔اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے:''اور فجر کا پڑھنا۔ بیشک فجر کا پڑھنا حضوری کا وقت ہے''

(۲) اور جو سونا شروع کرنے کا وقت ہے: تاکہ ہوجائے ذکر کفارہ ان گناہوں کا جو ہو چکے ہیں۔اور مانجھنا زنگ کے لئے۔اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:''جس نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی، ہوگی وہ شروع کی آدھی رات تک نوافل پڑھنے کی طرح۔اور جس نے عشاء اور فجر دونوں باجماعت ادا کیں، ہوگا وہ پوری رات نوافل پڑھنے کی طرح''

(۳) اور لوگوں کی مشغولیت کا وقت، جیسے دن چڑھے کا وقت: تاکہ ہوئے وہ دنیا میں انہماک کو ہلکا کرنے والا۔اور تریاق اس انہماک کے لئے۔البتہ یہ بات ہے کہ یہ حکم جائز نہیں ہے کہ مخاطب بنایا جائے اس کا عام لوگوں کو۔اس لئے کہ لوگ اس وقت دو باتوں کے درمیان ہوں گے: یا تو یہ کہ چھوڑ دیں گے وہ اس کو یا اُس کو۔اور یہ ایک اور بنیاد ہے (جمع بین الصلاتین کے جواز کی)

☆ ☆ ☆

انبیائے سابقین کی نمازوں کے اوقات کالحاظ

نمازوں کے اوقات کی تعیین میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھی گئی ہے کہ وہ انبیائے سابقین کی نمازوں کے اوقات ہوں۔ کیونکہ یہ چیز نفس کو عبادت کی ادائیگی پر بہت زیادہ چوکنا کرنے والی اور لوگوں کو منافست پر ابھارنے والی ہے۔ اور نیک لوگوں کا ذکر خیر باقی رکھنے کا باعث ہے۔چنانچہ اس امت کے لئے نمازوں کے جو اوقات تجویز کئے گئے ہیں وہ گذشتہ پیغمبروں کی نمازوں کے اوقات ہیں۔امامت جبرئیل کی حدیث میں ہے کہ:''یہ گذشتہ پیغمبروں کے اوقات ہیں''(مشکوۃ حدیث ۵۸۳)

اعتراض: یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے جبکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے:''اس نماز (عشاء) میں تاخیر کرو، پس بیشک تم برتری دیئے گئے ہو اس نماز کے ذریعہ دیگر تمام امتوں پر، اور نہیں پڑھی ہے یہ نماز تم سے پہلے کسی امت نے''(رواہ ابوداود، مشکوۃ حدیث ۶۱۲) یعنی عشاء کی نماز خاص اسی امت پر فرض کی گئی ہے۔گذشتہ امتوں پر یہ نماز فرض نہیں تھی۔پھر عمومی طور پر یہ دعوی کیسے درست ہوسکتا ہے کہ ہماری نمازوں کے اوقات گذشتہ نبیوں کی نمازوں کے اوقات ہیں؟

جواب: یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث: ایک رات عشاء کی نماز میں تاخیر کرنے کے واقعہ میں مروی ہے۔اور یہ واقعہ صحاح وسنن کی کتابوں میں سات صحابہ سے مروی ہے۔اور ان میں واقعہ کے اس خاص جزء کے بیان میں اختلاف ہے۔حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں وہ الفاظ ہیں جو اوپر گذرے۔اور صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ

کی روایت میں ہے: إن الناس قد صلُّوا وناموا: لوگ نماز پڑھ پڑھ کر سو گئے۔ اس میں گذشتہ امتوں کا ذکر نہیں ہے۔ اور صحیحین ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے: ولا يُصَلّٰى يومئذ إلا بالمدينة: اس وقت مدینہ ہی میں یہ نماز پڑھی جاتی تھی۔ کیونکہ ابھی تک اسلام کی اشاعت عام نہیں ہوئی تھی۔ مدینہ کے علاوہ جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی بستی نہیں تھی۔ اس روایت میں بھی گذشتہ امتوں کا ذکر نہیں ہے۔ پس یہ روایت بالمعنی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کے الفاظ کونسے ہیں یہ بات متعین نہیں، اس لئے اشکال بے معنی ہے (اس اشکال کے اور بھی جوابات دیئے گئے ہیں)

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جمع بین الصلاتین کی ایک اور دلیل ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ نے عشاء کی نماز تہائی رات تک مؤخر کی یعنی مغرب وعشاء کے درمیان تین گھنٹوں کا فاصلہ کیا۔ مگر عام طور پر آپ ﷺ عشاء کو مقدم کیا کرتے تھے، مغرب اور عشاء کے درمیان اتنا وقفہ نہیں کیا کرتے تھے۔ پس اگر بوقت ضرورت مطلق فصل نہ کیا جائے اور دونوں کو ایک ساتھ پڑھ لیا جائے تو یہ بھی درست ہے۔ اور یہی حکم ظہر وعصر کا ہے (مگر یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ عشاء کو مغرب سے قریب کرنے کا معمول تو تھا۔ مگر اس کو مغرب کے حدود میں داخل کرنے کا کوئی ثبوت نہیں۔ پس اس سے اگر ثابت ہوتی ہے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بوقت ضرورت جمع صوری کر سکتے ہیں۔ جمع حقیقی کا جواز ثابت نہیں ہوتا)

وأيضًا: لاأحقَّ في باب تعيين الأوقات من أن يُنْهَب إلى المأثور من سُنن الأنبياء المقرَّبين من قبلُ، فإنه كالـمُنَبِّهِ للنفس على أداء الطاعة تنبيها عظيمًا، والمُهَيِّج لها على منافسة القوم، والباعث على أن يكون للصالحين فيهم ذكرٌ جميلٌ، وهو قول جبريل عليه السلام: "هذا وقتُ الأنبياء من قبلك"

لايقال: ورد في حديث معاذ في العشاء: "ولم يصلِّها أحد قبلكم" لأن الحديث رواه جماعة، فقال بعضُهم: "إن الناسَ صلُّوا ورَقَدُوْا" وقال بعضهم: "ولايُصَلِّيها أحد إلا بالمدينة،" ونحوُ ذلك: فالظاهر أنه من قِبَلِ الرواية بالمعنى، وهذا أصلٌ آخرُ.

ترجمہ: اور نہیں ہے (کوئی چیز) اوقات کی تعیین کے سلسلہ میں زیادہ حقدار اس بات سے کہ جایا جائے سابقہ انبیائے مقربین سے منقول طریقوں کی طرف۔ پس بیشک وہ چوکنا کرنے والی چیز کی طرح ہے نفس کو عبادت کے ادا کرنے پر بہت زیادہ چوکنا کرنا۔ اور ابھارنے والی چیز کی طرح ہے نفس کو قوم کی منافست پر۔ اور برانگیختہ کرنے والی چیز کی طرح ہے اس بات پر کہ ہو نیک لوگوں کے لئے لوگوں کے درمیان ذکر خیر۔ اور وہ جبرئیل علیہ السلام کا قول ہے: "یہ آپ سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء کا وقت ہے"

اعتراض: نہ کیا جائے کہ نماز عشاء کے بارے میں معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے: "اور نہیں پڑھی عشاء کی

نماز تم سے پہلے کسی نے'' اس لئے کہ روایت کیا ہے اس حدیث کو صحابہ کی ایک جماعت نے، پس کہا ان میں سے بعض نے: '' بیشک لوگ نماز پڑھ چکے اور سو گئے'' اور کہا ان میں سے بعض نے: '' اور نہیں پڑھتا تھا اس کو کوئی مگر مدینہ میں'' اور اس قسم کی باتیں۔ پس ظاہر یہ ہے کہ یہ بات (حضرت معاذ کی تعبیر) روایت بالمعنی کی جانب سے آئی ہے۔ اور یہ ایک اور دلیل ہے (جمع بین الصلاتین کے جواز کی)

☆ ☆ ☆

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ نمازوں کے لئے تعیینِ اوقات میں بہت سی دقیق حکمتیں ہیں۔ اور نمازوں کے لئے اوقات کی نہایت درجہ اہمیت ہے۔ اسی لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے خود آکر نہایت اہتمام سے اوقات کی تعلیم دی ہے۔ اور ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ضرورت کے وقت نمازوں کے درمیان جمع کرنا جائز ہے۔ اور اس بات کی وجہ بھی معلوم ہوگئی جو بعض حضرات نے ذکر کی ہے کہ نبی ﷺ اور دیگر انبیاء پر تہجد اور چاشت کی نمازیں واجب تھیں۔ اور امت کے لئے مستحب ہیں۔ اور نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کی نہایت تاکید کیوں ہے؟ ان سب باتوں کی وجوہ معلوم ہوگئیں۔

سوال: جب اوقات کی اس قدر اہمیت ہے تو سب لوگوں کے لئے ایک ہی وقت میں نمازیں ادا کرنا کیوں ضروری قرار نہیں دیا؟ جیسے روزے: تمام مسلمان ایک ساتھ رکھتے ہیں اور ایک ساتھ کھولتے ہیں، نمازیں ایک ہی وقت میں ادا کرنا کیوں ضروری نہیں؟

جواب: نمازوں کے اوقات موسّع ہیں، روزوں کی طرح مضیّق نہیں۔ یعنی بالکلیہ آزادی بھی نہیں ہے کہ جب چاہیں نمازیں ادا کریں۔ بلکہ نمازوں کے اوقات کا اول وآخر متعین ہے۔ مگر ایک ہی وقت میں اور ایک ہی ساتھ نمازوں کی ادائیگی بھی ضروری نہیں، کیونکہ ایسا حکم دینے میں نہایت تنگی ہے۔ اس لئے فی الجملہ گنجائش رکھی گئی ہے۔ اور اول وآخر کی تعیین کی گئی ہے۔ یہی قانون سازی کا تقاضا ہے۔ تشریع عام کے لئے ضروری ہے کہ نمازوں کے لئے ایسے واضح اور محسوس پیکر مقرر کئے جائیں جن کو سب عرب یکساں طور پر جان سکیں کہ نماز کا وقت آگیا اور نماز کا وقت گذر گیا۔ پس وہ وقت ہوتے ہی نمازوں کی ادائیگی کی فکر کریں۔ اور وقت ختم ہونے سے پہلے ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوجائیں۔

وبالجملة: ففي تعيين الأوقات سرٌّ عميقٌ من وجوه كثيرة، فَتَمَثَّل جبريلُ عليه السلام، وصلّى بالنبي صلى الله عليه وسلم، وعلّمه الأوقات.

ولِمَا ذكرنا: ظهر وجهُ مشروعيةِ الجمع بين الصلاتين في الجملة، وسببُ وجوب التهجد والضُّحى على النبي صلى الله عليه وسلم والأنبياءِ، على ما ذكروا، وكونِها نافلةً للناس،

وسببُ تاكيدِ أداءِ الصلوات على أوقاتها، واللّٰهُ أعلم.
ولما كان في التكليف بأن يُصَلِّيَ جميعُ الناس في ساعة واحدة بعينها، لايتقدّمون ولايتاخرون: غايةُ الحرج، وُسّع في الأوقات توسعةً مّا.
ولما كان لايصلح للتشريع إلا المظِنّاتُ الظاهرةُ عند العرب، غيرَ الخفية على الأداني والأقاصي، جُعل لأوائل الأوقات وأواخرها حدودًا مضبوطةً محسوسةً.

ترجمہ: اور حاصل کلام: پس اوقات کی تعیین میں گہرا راز ہے بہت سی وجوہ سے پس تشریف لائے جبرئیل اور نبی ﷺ کو نماز پڑھائی اور آپ کو اوقات کی تعلیم دی اور ظاہر ہوئی اس بات کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی: فی الجملہ (کسی درجہ میں یعنی بوقتِ ضرورت) دونمازوں کے درمیان جمع کرنے کے جواز کی وجہ اور تہجد اور چاشت کے وجوب کی وجہ نبی ﷺ پر اور دیگر انبیاء پر، جیسا کہ علماء نے ذکر کیا ہے۔ اور ان کے نفل ہونے کی وجہ لوگوں کے لئے اور نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کی تاکید کی وجہ۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(سوال مقدر کا جواب) اور جب انتہائی تنگی تھی اس بات کا مکلّف بنانے میں کہ تمام لوگ نماز ادا کریں ایک معین گھڑی میں، نہ آگے بڑھیں اور نہ پیچھے رہیں، تو گونہ گنجائش رکھی گئی اوقات میں —— اور جب قابل نہیں تھے قانون سازی کے لئے مگر عربوں کے نزدیک پیکر ہائے محسوس، جو مخفی نہ ہوں قریب والوں پر اور دور والوں پر، تو بنائی گئیں نماز کے اوقات کی ابتداء کے لئے اور ان کی انتہاء کے لئے منضبط اور محدود حدیں۔

☆ ☆ ☆

اسباب میں تزاحم اور نمازوں کے چار اوقات

اسباب میں تزاحم ہے۔ ہر سبب دوسرے کو ہٹا کر خود آگے آنا چاہتا ہے۔ مثلاً:

۱ —— نمازوں کے اوقات محدود ہیں اس لئے دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا جائز نہیں۔ اور بندوں کی مجبوریاں متقاضی ہیں کہ فی الجملہ اس کی اجازت ہو، گو جمع صوری ہی سہی!

۲ —— امر کا مقتضی یہ ہے کہ مامور بہ کا امتثال اولین فرصت میں کیا جائے۔ نیز ﴿لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ میں اشارہ بھی ہے کہ ظہر کی نماز اول وقت میں ادا کی جائے۔ مگر سخت گرمیوں میں ظہر کے اول وقت میں کچھ خرابی ہوتی ہے، جیسا کہ آگے آئے گا۔ پس اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت میں نماز نہ پڑھی جائے۔

۳ —— جب نماز کا اول وآخر ہے تو آخر وقت تک نماز پڑھنا درست ہونا چاہئے، جیسے فجر میں۔ مگر عصر کے آخری

وقت میں سورج کی پرستش شروع ہوجاتی ہے، اس لئے اس وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

۴ ـــــ مطلوب یہ ہے کہ مامور بہ کو بروقت ادا کیا جائے، مگر کبھی آدمی نماز بھول جاتا ہے یا سوتا رہ جاتا ہے۔ ایسی نادانستہ کوتاہیوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں سہولت دی جائے۔

۵ ـــــ ﴿إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ﴾ میں اشارہ ہے کہ عشاء کی نماز دیر سے پڑھی جائے، مگر حقِ مصلیان (نمازیوں کی پریشانی) کی وجہ سے عشاء جلدی ادا کی جاتی ہے۔

غرض اسباب میں اس طرح کے تزاحم کے نتیجہ میں نمازوں کے لئے چار اوقات حاصل ہوئے۔ جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

پہلا وقت: وقتِ مختار

مختار: یعنی پسندیدہ وقت۔ یہ وہ وقت ہے جس میں بغیر کراہیت کے نماز پڑھنا درست ہے۔ اور اس میں معتمد علیہ دو حدیثیں ہیں: ایک: امامتِ جبرئیل کی حدیث: جبرئیل علیہ السلام نے دو دن آنحضرت ﷺ کو نماز پڑھائی تھی[1]۔ دوسری: حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: اس میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے نمازوں کے اوقات دریافت کئے تھے تو آپؐ نے دو دن اول وآخر نماز پڑھا کر اس کو اوقات کی تعلیم دی تھی[2]

ضابطہ ترجیح: اگر مذکورہ روایتوں میں کسی بات میں اختلاف ہو، تو جو واضح ہو وہ ناطق ہوگی۔ مبہم کو نہیں لیا جائے گا۔ اور دونوں واضح ہوں تو حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو لیا جائے گا، کیونکہ اس میں جو واقعہ مذکور ہے وہ مدینہ منورہ کا ہے۔ اور امامتِ جبرئیل کا واقعہ مکہ کا ہے جبکہ پانچ نمازیں فرض ہوئیں تھیں۔ اور **الأولُ فالأولُ** کی طرح **الآخِرُ فالآخر** بھی ایک ضابطہ ترجیح ہے یعنی واقعات کی تاریخیں متعین ہوں تو بعد کی روایت لی جائے گی۔

مذکورہ روایات میں دو باتوں میں اختلاف ہے:

پہلی بات: مغرب کا وقت غروبِ شفق تک رہتا ہے۔ یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوسرے دن مغرب کی نماز شفق غائب ہونے سے پہلے پڑھی تھی۔ اور حضرت عبداللہ

---

[1] یہ حدیث تفصیل سے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے اور مشکوٰۃ باب المواقیت میں حدیث نمبر ۵۸۳ ہے۔ صحیحین میں بھی امامت جبرئیل علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ مگر اس میں اوقات کی تفصیل نہیں ہے۔ مشکوٰۃ حدیث نمبر ۵۸۲

[2] یہ روایت مسلم شریف میں ہے۔ مشکوٰۃ حدیث ۵۸۲ ان کے علاوہ ایک قولی روایت اور بھی ہے جو اوقات کے سلسلہ میں اہم ہے، جس کو امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔ اور جو مشکوٰۃ میں حدیث ۵۸۱ ہے۔ اور امام ترمذی نے اس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں خود آنحضرت ﷺ نے اوقات نماز کی تحدید کی ہے۔ آگے قولی روایت سے یہی روایت مراد ہے ۱۲

بن عمرو کی قولی حدیث میں ہے: وقتُ صلاۃِ المغرب مالم یَغِبِ الشمسُ ۔مگر امامت جبرئیل کی حدیث میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے دونوں دن سورج ڈوبتے ہی مغرب کی نماز پڑھائی تھی۔یعنی مغرب کا بس ایک ہی وقت ہے۔وقت موسّع نہیں ہے اس مسئلہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث لی جائے گی۔اورامامت جبرئیل کی حدیث کی تاویل کی جائے گی۔

اور تاویل: یہ ہے کہ بعید نہیں حضرت جبرئیل نے دوسرے دن مغرب کی نماز بس کچھ ہی تاخیر سے پڑھائی ہو۔اور وقت کے مختصر ہونے کی وجہ سے راوی نے کہہ دیا ہو کہ: ''دونوں دن ایک ہی وقت میں مغرب کی نماز پڑھائی'' پس یہ یا تو راوی کی اجتہادی چوک ہے۔یا راوی کا مقصد انتہائی قلت کو بیان کرنا ہے۔

دوسری بات: بہت سی روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر فقہاء کا اتفاق بھی ہے کہ عصر کا آخری وقتِ جواز یہ ہے کہ دھوپ میں تغیر آجائے۔حضرت عبداللہ کی قولی روایت میں ہے: ووقتُ العصر مالم تَصْفَرَّ الشمسُ ۔مگر امامتِ جبرئیل کی روایت میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے دوسرے دن عصر کی نماز دو مثل پر پڑھائی تھی۔پس اس کی تاویل کی جائے گی۔اور تاویلیں دو ہیں:

پہلی تاویل: یہ کہا جائے کہ شاید امامت جبرئیل کی روایت میں مستحب وقت کے آخر کا بیان ہے۔یا یہ کہا جائے کہ شاید شریعت نے اولاً یہ دیکھا ہو کہ عصر کو ظہر سے الگ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دو نمازوں میں تقریباً چوتھائی دن (تین گھنٹوں) کا فصل ہو جائے، کیونکہ اگر عصر کو ظہر سے الگ نہیں کیا جائے گا تو ظہر اور مغرب کے درمیان چوتھائی دن سے زیادہ فصل ہو جائے گا۔اس لئے کہ ظہر کا وقت ایک مثل تک تھا۔اور اس کے بعد مغرب تک تین گھنٹوں سے زیادہ وقت ہے۔اس لئے عصر کا آخری وقت دو مثل تک قرار دیا، تاکہ عصر اور مغرب کے درمیان چوتھائی دن کا فصل رہے، پھر لوگوں کی حاجتیں اور مشاغل سامنے آئے تو عصر کی آخری حد میں اضافہ کر دیا گیا۔اور سورج پیلا پڑنے تک اس کا وقتِ جواز دراز کیا گیا۔

فائدہ: اور ممکن ہے جب عصر کا آخری وقت بڑھا دیا ہو تو ظہر کا آخری وقت بھی ایک مثل سے بڑھا کر دو مثل کر دیا گیا ہو۔کیونکہ بہت سی روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ظہر کا وقت ایک مثل کے بعد بھی رہتا ہے جیسا کہ حدیثِ ابراد کے ذیل میں آرہا ہے۔

دوسری تاویل: دو مثل کا ادراک مشکل ہے۔اس کے لئے غور وفکر کی، سایۂ زوال کو محفوظ رکھنے کی، اور بڑھتے ہوئے سایہ کو برابر دیکھتے رہنے کی ضرورت ہے۔اور عوام کو ایسا حکم دینا مناسب نہیں جس کا ادراک مشکل ہو۔عام لوگوں کو تو حکم ایسا ہی دینا چاہئے جو محسوس اور واضح ہو۔پس اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ آپؐ عصر کا آخری وقت سورج کے بدلنے کو یا دھوپ کے پیلا پڑنے کو قرار دیں۔باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

فائدہ: عصر کا وقت تو مغرب سے اُس وجہ سے متصل ہو گیا جو اوپر گذری۔اور ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کے درمیان

چوتھائی دن کا فصل اس لئے نہیں کہ یہ ایک وقت کی دو پھانکیں ہیں۔ جیسا کہ تفصیل سے گذرا ہے۔

ولِتزَاحُمِ هذه الأسباب حصل للصلوات أربعة أوقات:

[۱] وقت الاختيار، وهو الوقتُ الذى يجوز أن يُصلّٰى فيه من غير كراهية؛ والعمدةُ فيه حديثان: حديثُ جبريل، فإنه صلى بالنبى صلى الله عليه وسلم يومين، وحديثُ بُريدة، ففيه: أنه صلى الله عليه وسلم أجابَ السائلَ عنها، بأن صلّٰى يومين؛ والمفسَّرُ منهما قاضٍ على المبهم، وما اختلف يُتَّبَعُ فيه حديثُ بريدةَ، لأنه مدنى متأخر، والأولُ مكى متقدِّم، وإنما يُتَّبَعُ الآخِرُ فالآخِرُ.

وذلك: أن آخرَ وقتِ المغرب: هو ما قبلَ أن يغيب الشفقُ، ولايبعد أن يكون جبريلُ أخَّرَ المغرب فى اليوم الثانى قليلاً جدًّا لِقِصَرِ وقتِه، فقال الراوى: "صلّٰى المغرب فى يومين فى وقت واحد"، إما لخطأٍ فى اجتهاده، أو بيانًا لغاية القلّة، والله اعلم.

وكثير من الأحاديث يدل على أن آخِرَ وقت العصر: أن تتغير الشمسُ، وهو الذى أطبق عليه الفقهاءُ، فلعل المثلين بيانٌ لآخر الوقت المختار، والذى يُستحب فيه، أو نقول: لعل الشرعَ نظر أولاً إلى أن المقصودَ من اشتقاق العصر: أن يكونَ الفصلُ بين كلِّ صلاتين نحوًا من ربع النهار، فجعل الأمدَ الآخِرَ بلوغَ الظل إلى المثلين، ثم ظهر من حوائجهم وأشغالهم ما يوجب الحكم بزيادة الأمد.

وأيضًا :معرفةُ ذلك الحد تحتاج إلى ضرب من التأمل، وحفظٍ لِلْفَيْءِ الأصلى،ورصدٍ، وإنما ينبغى أن يُخَاطَب الناس فى مثل ذلك بما هو محسوس ظاهر، فنفث الله فى رُوعه صلى الله عليه وسلم أن يَجعلَ الأمدَ تغيُّرَ قُرْصِ الشمس او ضوئها، والله أعلم.

ترجمہ: اور ان اسباب کے ایک دوسرے کو ڈھکیلنے کی وجہ سے نمازوں کے لئے چار اوقات حاصل ہوئے:

(۱) مختار (پسندیدہ) وقت: اور وہ وہ وقت ہے کہ جائز ہے کہ اس میں نماز پڑھی جائے بغیر کسی کراہت کے۔ اور معتمد علیہ اس میں دو حدیثیں ہیں: جبرئیل کی حدیث: پس بیشک انھوں نے نماز پڑھائی تھی دو دن۔ اور بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: پس اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے اوقات کے بارے میں پوچھنے والے کو جواب دیا بایں طور کہ آپ نے نماز پڑھی دو دن۔ اور اُن دونوں میں سے جو واضح ہے وہ فیصلہ کن ہے مبہم پر۔ اور اگر مختلف ہوں تو اس اختلاف میں پیروی کی جائے گی بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی۔ اس لئے کہ وہ مدنی متاخر ہے۔ اور پہلی حدیث مکی متقدم ہے۔ اور پیروی بعد والی کی کی جاتی ہے پھر اس کے بعد والی کی۔

اوراس (اختلاف) کی تفصیل یہ ہے کہ مغرب کا آخر وقت: وہ وہ ہے جو شفق غائب ہونے سے پہلے ہے۔ اور بعید نہیں کہ جبرئیل نے مغرب کو مؤخر کیا ہو دوسرے دن میں بہت ہی تھوڑا۔ اس کے وقت کے مختصر ہونے کی وجہ سے۔ پس کہا راوی نے: ''مغرب کی نماز پڑھی دونوں دنوں میں ایک ہی وقت میں'' یا تو اپنے اجتہاد میں چوکنے کی وجہ سے یا انتہائی کمی کو بیان کرنے کے لئے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

اور بہت سی حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عصر کے وقت کا آخر یہ ہے کہ سورج میں تغیر آجائے۔ اور یہی وہ قول ہے جس پر تمام فقہاء متفق ہیں۔ پس شاید دو مثل بیان ہے پسندیدہ وقت کے آخر کا اور اس وقت کا جس میں عصر پڑھنا مستحب ہے (عطف تفسیری ہے) یا کہیں ہم: شاید شریعت نے دیکھا ہو پہلے اس بات کی طرف کہ عصر کو مشتق کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہر دو نمازوں میں تقریباً چوتھائی دن کی جدائی ہو۔ پس مقرر کی آخری حد دو مثل تک سایہ کے پہنچنے کو۔ پھر ظاہر ہوئی لوگوں کی حاجتوں اور مشاغل میں سے وہ بات جس نے آخری حد کے بڑھانے کے فیصلہ کو واجب کیا۔

اور نیز: اس حد (مثلین) کا پہچاننا محتاج ہے ایک طرح کے غور کی طرف، اور اصلی سایۂ زوال کو محفوظ رکھنے کی طرف، اور گھات میں بیٹھنے کی طرف، اور مناسب بات یہی ہے کہ لوگوں کو مخاطب بنایا جائے اس قسم کی چیزوں میں اُس بات کا جو کہ وہ محسوس (اور) واضح ہو۔ پس پھونکا اللہ نے آنحضرت ﷺ کے دل میں کہ بنائیں آپ آخری مدت سورج کی ٹکیہ کی یا دھوپ کی تبدیلی کو۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

دوسرا وقت: وقتِ مستحب

مستحب وقت: وہ ہے جس میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ اور وہ دو نمازوں کو مستثنیٰ کرکے اوائل اوقات ہیں یعنی نمازوں کو وقت ہوتے ہی پڑھ لینا بہتر ہے۔ اور وہ دو وقت یہ ہیں:

پہلا وقت: ـــــ عشاء کی نماز ـــــ عشاء میں اصل مستحب تاخیر کرنا ہے۔ اور اس کی وجہ وہ ہے جو پہلے گذر چکی ہے کہ تین اوقات اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان میں نماز ادا کی جائے۔ ان میں سے ایک سونے کا وقت ہے۔ انسان کی فطری حالت یہی ہے کہ جب تمام کاموں سے فارغ ہوجائے اور سونے کا وقت ہوجائے تو نماز ادا کرکے سوجائے۔ درج ذیل حدیث میں اس اصلی مستحب کا بیان ہے۔

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میری امت کے لئے دشواری نہ ہوتی تو میں ان کو حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز تہائی رات یا آدھی رات تک مؤخر کریں'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۱۱)

تاخیر سے عشاء پڑھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ دن بھر کی مصروفیات جو اللہ کی یاد کو بھلانے والی ہیں اُن کے اثرات سے باطن صاف ہوجائے گا۔ اور جلدی پڑھے گا تو عشاء کے بعد بھی کام کرے گا۔ اور دل کا حال پھر ویسا ہی ہوجائے گا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ باتیں کرنے کا موقعہ نہیں رہے گا۔ فوراً ہی پڑ کر سو جائے گا۔ اور عشا جلدی پڑھے گا تو چونکہ ابھی سونے کا وقت نہیں ہوا اس لئے گپ شپ میں لگ جائے گا۔ اور معلوم نہیں اس کا سلسلہ کب تک دراز ہو۔

مگر تاخیر کرنے میں یہ نقصان بھی ہے کہ جماعت میں لوگوں کی حاضری گھٹ جائے گی اور لوگ بدک جائیں گے۔ اور معاملہ برعکس ہوجائے گا، کیونکہ جماعت سے نماز پڑھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ شریکِ نماز ہوں۔ اس لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ معمول نبوی مروی ہے کہ: ''جب لوگ زیادہ تعداد میں آجاتے تھے، تو آپ جلدی نماز عشاء پڑھ لیتے تھے۔ اور جب لوگ کم ہوتے تھے تو دیر کرکے پڑھتے تھے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۸۸)

دوسرا وقت: ـــــ گرمیوں کے ظہر ـــــ جب جھلسا دینے والی گرمی پڑ رہی ہو تو ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنا مستحب ہے۔ درج ذیل حدیث اس کی دلیل ہے:

حدیث ـــــ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب گرمی سخت ہو تو ظہر کو ٹھنڈے وقت پڑھا کرو۔ کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی وسعت سے ہے'' یعنی جہنم کے اثرات پھیلتے ہیں (رواہ البخاری۔ مشکوٰۃ حدیث ۵۹۱)

تشریح: دنیا میں ہم جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اس کے کچھ تو ظاہری اسباب ہیں۔ جنھیں ہم جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اور کچھ باطنی اسباب ہیں جو ہمارے احساس وادراک کی دسترس سے ماوراء ہیں۔ اس حدیث میں باطنی سبب کی طرف اشارہ ہے۔ گرمی کی شدت کا ظاہری سبب آفتاب ہے، مگر عالم غیب میں اس کا تعلق جہنم سے بھی ہے اور یہ حقائق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ ہی معلوم ہوسکتے ہیں۔

درحقیقت ہر راحت ولذت کا مرکز اور سرچشمہ جنت ہے۔ اور ہر تکلیف ومصیبت کا اصل خزانہ اور سرچشمہ جہنم ہے۔ اس دنیا میں جو بھی راحت یا تکلیف ہے یا جو بھی اچھی یا بری چیز ہے وہ وہیں کی ہواؤں کا جھونکا یا بھوکا ہے۔ اور جہنم غضب خداوندی کا مظہر ہے اور خنکی رحمتِ خداوندی کی لہر ہے۔ اس لئے جب گرمی کی شدت سے فضا جہنم بن رہی ہو تو ظہر کی نماز کچھ تاخیر کرکے ایسے وقت پڑھی جائے جب گرمی کی شدت ٹوٹ جائے۔ اور وقت کچھ ٹھنڈا ہوجائے (ماخوذ از معارف الحدیث ۱:۱۲۸)

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی اپنی مختصر شرح میں یہی بات فرمائی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ جنت وجہنم ہی اس چیز کا مرکز ومنبع ہیں جس کا اس عالم میں فیضان کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ کیفیات مناسبہ یعنی راحت ولذت کی باتیں ہوں، یا کیفیاتِ نامناسبہ یعنی رنج وتکلیف کی چیزیں ہوں۔ اور تاریخی روایات میں جو آیا ہے کہ کاسنی کے پتوں پر روزانہ جنت کا

قطرہ گرتا ہے۔اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ کاسنی کا اس مرکز ومنبع سے تعلق ہے[1]

فائدہ:(۱) یہ جو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عشا میں مستحب اصلی تاخیر کرنا ہے۔ یہ بات مذکورہ روایت سے نہیں نکلتی۔ اور شاہ صاحب نے جو تاخیر عشاء کے فوائد بیان کئے ہیں، وہ بھی عارضی استحباب پر دلالت کرتے ہیں ــــ اصل بات یہ ہے کہ تمام نمازیں شروع اوقات ہی میں ادا کرنا مستحب ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ اور اول وقت کی فضیلت میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں سے کوئی صریح روایت صحیح نہیں ہے۔ جیسے یہ روایت کہ نماز کا اول وقت اللہ کی خوشنودی کا وقت ہے۔ اور آخر وقت اللہ کے درگذر کا وقت ہے (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ حدیث ۶۰۶) یہ روایت نہایت ضعیف ہے، بلکہ بعض نے تو اس کو موضوع کہا ہے۔ مگر یہ مسئلہ عقلی ہے۔ امر کا امتثال اولین فرصت میں کرنا ایک معقول بات ہے۔ نماز کا وقت ہوتے ہی اَقِیموا الصلاۃ کا خطاب متوجہ ہوتا ہے۔ پس اس کا حق یہ ہے کہ فوراً نماز ادا کی جائے۔ اور یہ حق اللہ ہے۔ مگر جب تین حقوق میں سے کوئی اس سے معارض یا موافق ہوجاتا ہے تو فضیلت آگے پیچھے ہوتی ہے۔ اور وہ تین حقوق یہ ہیں: حقِ مصلّیان، حقِ وقت اور حقِ صلوٰۃ۔

عشا، فجر اور جمعہ میں جب لوگ اول وقت میں جمع ہوجائیں تو حق اللہ اور حق مصلیان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ یہ نمازیں جلدی ادا کرلی جائیں۔ تاکہ فوراً امر کا امتثال بھی ہوجائے اور لوگ پریشانی سے بھی بچ جائیں۔ اور فجر اور عشا میں لوگ اول وقت میں جمع نہ ہوں یا نہ ہوسکتے ہوں تو حق مصلیان کی وجہ سے تاخیر مستحب ہے۔ اور یہ تاخیر اصلی مستحب نہیں، عارضی حکم ہے۔ اور اسفار کا حکم ایسی ہی صورت میں دیا گیا ہے۔ کیونکہ جب حق اللہ اور حق العبد متعارض ہوتے ہیں تو اللہ کے مستغنی ہونے کی وجہ سے اور بندوں کے محتاج ہونے کی وجہ سے حق العبد کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اور سخت گرمیوں میں چونکہ ظہر کے اول وقت میں کچھ خرابی ہے۔ وہ وقت غضب خداوندی کے مظہر جہنم کی وسعت اور اس کے اثرات کے پھیلنے کا ہے اس لئے حق وقت کی وجہ سے ظہر کی نماز میں تاخیر کرنا مستحب ہے۔ اور یہ بھی اصلی حکم نہیں، عارضی استحباب ہے۔ اصلی ہوتا تو سردیوں میں بھی تاخیر مستحب ہوتی۔

اور عصر میں چونکہ فرض ادا کرنے کے بعد نوافل ممنوع ہیں اور فرض مختصر پڑھے جاتے ہیں اس لئے جب عصر مجمع میں پڑھی جائے تو ہمیشہ عصر کی نماز تھوڑی تاخیر سے پڑھنا مستحب ہے۔ تاکہ جن لوگوں کو نوافل پڑھنے ہیں، وہ فرضوں سے پہلے پڑھ لیں۔ اور یہ تاخیر کا استحباب حق صلوٰۃ (نوافل) کی وجہ سے ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے فرمایا تھا: ''رسول اللہ ﷺ آپ لوگوں سے بہت جلدی ظہر پڑھتے تھے یعنی آپ لوگ ظہر میں دیر

---

[1] کاسنی کے بارے میں روایات ابن القیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد (۴: ۴۰۰) میں یہ کہہ کر ذکر کی ہیں کہ: ھِندبا: وردفیھا ثلاثۃُ أحادیث، لاتَصِحُّ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ولایثبُت مثلھا، بل ھی موضوعۃ اس لئے شاہ صاحب نے الأحادیث کے بجائے لفظ الأخبار استعمال کیا ہے ۱۲

کرتے ہیں اور آپ لوگ عصر میں آنحضرت ﷺ سے زیادہ جلدی کرتے ہیں" (مشکوٰۃ حدیث ۶۱۹) ظاہر ہے یہ حضرات عصر کی نماز وقت ہونے کے بعد ہی پڑھتے ہوں گے۔ مگر اس کو ام سلمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کے وقت سے جلدی پڑھنا قرار دے رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ معمولِ نبوی ہمیشہ عصر میں کچھ تاخیر کرنے کا تھا۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: (۲) اس روایت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ظہر کا وقت ایک مثل کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ کیونکہ عرب میں وقت ٹھنڈا اس وقت ہوتا ہے، جب سمندر کی طرف سے ہوائیں چلنی شروع ہوتی ہیں۔ مشہور ثقہ تابعی: محمد بن کعب قُرظی (ولادت ۴۰ھ وفات ۱۲۰ھ) فرماتے ہیں: نحن نكون في السفر، فإذا فاءتِ الأفياءُ، وهبّتِ الأرواحُ، قالوا: أبْرِدْتُم فالرَّواحُ: ترجمہ: جب ہم سفر میں ہوتے ہیں۔ پس جب سایے پلٹ جاتے ہیں یعنی مشرق کی طرف خوب لمبے ہو جاتے ہیں۔ اور ہوائیں چلنے لگتی ہیں، تو اعلان کیا جاتا ہے کہ وقت ٹھنڈا ہو گیا اب شام کا سفر شروع کرو۔

اور میں نے خود مکہ مکرمہ میں بارہا تجربہ کیا ہے، اور ہر شخص وہاں پہنچ کر خود تجربہ کر سکتا ہے۔ وہاں سمندر کی جانب سے خنک ہوائیں مثل اول کے ختم تک نہیں چلتیں۔ مثل ثانی شروع ہونے کے بعد ہی چلتی ہیں۔ جب وہاں لوگ عصر کی نماز سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں۔

ایک سوالِ مقدر کا جواب: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے صرف دو نمازوں کا استثناء کیوں کیا، فجر کی نماز کا بھی استثناء کرنا چاہئے کیونکہ اس کا بھی اسفار میں پڑھنا مستحب ہے۔ اور درج ذیل حدیث اس کی دلیل ہے:

حدیث ـــــ حضرت رافع بن خَدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نماز فجر اسفار میں پڑھو (یعنی صبح کا اُجالا پھیل جانے پر فجر کی نماز پڑھو) کیونکہ اس میں زیادہ اجر وثواب ہے" (مشکوٰۃ حدیث ۶۱۴)

جواب: شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مطلقاً فجر کی نماز میں تاخیر کا استحباب ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حدیث کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔

پہلا مطلب: اس حدیث میں ان لوگوں سے خطاب ہے جن کو اندیشہ ہو کہ اگر سویرے فجر کی نماز پڑھی جائے گی تو جماعت میں بہت ہی کم لوگ شریک ہوں گے ایسی صورت میں حکم دیا گیا ہے کہ اُجالا ہونے کا انتظار کیا جائے۔ مطلقاً یہ حکم نہیں ہے۔

دوسرا مطلب: یا یہ ایسی بڑی مسجد والوں سے خطاب ہے جہاں بوڑھے، کمزور اور بچے بھی نماز میں شریک ہوتے ہوں ایسی مسجد میں اسفار میں نماز پڑھنے کا حکم نمازیوں کے ساتھ تخفیف کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث میں امام کو ہلکی نماز پڑھانے کا حکم دیا گیا ہے:

حدیث ـــــ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنے امام کی شکایت کی کہ وہ لمبی نماز پڑھاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نماز میں شریک نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ نے اس دن نہایت غصہ میں وعظ فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا

کہ: "تم میں سے کچھ لوگ مقتدیوں کو متنفر کرنے والے ہیں! پس تم میں سے جو نماز پڑھائے چاہئے کہ ہلکی پڑھے۔ کیونکہ جماعت میں ضعیف، بوڑھے اور حاجت مند ہوتے ہیں" (مشکوۃ حدیث ۱۱۳۲ باب ما علی المأموم)

تیسرا مطلب: یا یہ مطلب ہے کہ نماز شروع تو کی جائے تاریکی میں مگر لمبی کی جائے تا آنکہ وہ اسفار میں ختم ہو۔ جیسا کہ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہی معمول نبوی مروی ہے کہ آپ ﷺ فجر کی نماز سے پھرتے تھے جب آدمی اپنے ہم نشین کو پہچانتا تھا۔ اور آپ ساٹھ آیتوں سے سو آیتوں تک پڑھتے تھے (مشکوۃ حدیث ۵۸۷)

غرض اس روایت سے مطلقاً اسفار کا استحباب نہیں نکلتا کہ ہمیشہ اور ہر جگہ اُجالا کر کے فجر کی نماز پڑھی جائے اور اجالے ہی میں شروع بھی کی جائے۔ پس اس حدیث میں اور غلس (اندھیرے) کی روایت میں کوئی تعارض نہیں۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ کی مذکورہ بالا تاویلات تشفی بخش نہیں۔ تشفی بخش بات یہ ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے مطابق افضل تو اسفار ہی میں نماز پڑھنا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا غلس میں فجر پڑھنے کا معمول اس لئے تھا کہ اس زمانہ میں زیادہ تر لوگ تہجد پڑھتے تھے۔ اور ایسے ہی لوگ مسجد نبوی میں جمع ہوتے تھے اس وقت مسجد نبوی مدینہ شریف کی عام آبادی سے ہٹ کر ایک طرف قبرستان کے قریب واقع تھی۔ اور مدینہ کے محلوں میں نو مساجد علحدہ تھیں حضرت رافع کی حدیث میں خطاب انہی مساجد کے لوگوں سے ہے اور جو لوگ تہجد گذار تھے اور اپنے محلوں سے چل کر مسجد نبوی میں آکر تہجد پڑھتے تھے۔ اور ان کا اصل مقصد فجر کی نماز میں شرکت کرنا ہوتا تھا۔ ان حضرات کی سہولت اسی میں تھی کہ نماز فجر تاخیر سے نہ پڑھی جائے، اس لئے رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز زیادہ تر سویرے غلس ہی میں ادا فرماتے تھے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی ایسا اندھیرا رہتا تھا کہ نماز پڑھ کر گھر واپس جانے والی خواتین پہچانی نہیں جاتی تھیں۔

غرض جس طرح آپ عشا عموماً سویرے پڑھتے تھے اور سخت گرمیوں میں بھی جمعہ اول وقت ادا فرماتے تھے حالانکہ مستحب تاخیر تھی اسی طرح فجر میں بھی لوگوں کی سہولت کے لئے اندھیرے میں پڑھتے تھے، اگرچہ افضل اجالے میں پڑھنا تھا۔ پس اگر نمازی فجر میں اول وقت ہی میں جمع ہو جائیں جیسا کہ رمضان میں لوگ سحری کھا کر مسجد میں آجاتے ہیں تو اس وقت اول وقت میں نماز پڑھنا افضل ہے، کیونکہ دیر کرنے میں تقلیل جماعت کا اندیشہ ہی نہیں، مشاہدہ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

[۲] ووقتُ الاستحباب الذی یُستحب أن یصلّی فیه، وهو أوائل الأوقات:

[الف] إلا العشاءَ، فالمستحب الأصلی تأخیرها، لما ذکرنا من الوضع الطبیعی، وهو قوله صلی الله علیه وسلم: "لو لا أن أشُقَّ علی أمتی لأمرتُهم أن یؤخروا العشاء" ولأنه أنفعُ فی تصفیة الباطن من الأشغال المُنْسیة ذکرَ الله، وأقطعُ لمادة السمر بعد العشاء، لکن التأخیر ربما یُفضی إلی تقلیل الجماعة، وتنفیر القوم، وفیه قلب الموضوع، فلهذا کان النبی صلی الله علیه وسلم إذا کثُر الناسُ عَجَّلَ، وإذا قلّوا أخّرَ.

[ب] وإلا ظُهرَ الصيفِ، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا اشتدَّ الحَرُّ فأبردوا بالظهر، فإن شدة الحر من فَيْحِ جَهَنَّمَ"

أقول: معناه: معدِن الجنة والنار هو معدِن ما يُفَاضُ في هذا العالم من الكيفيات المناسبة والمنافرة، وهو تأويل ما ورد في الأخبار في الهِنْدَ بَاءِ وغيره.

قوله صلى الله عليه وسلم:" أَسْفِرُوْا بالفجر، فإنه أعظم للأجر"

أقول: هذا خطاب لقوم خَشَوا تقليلَ الجماعة جدًّا: أن ينتظروا إلى الإسفار؛ أو لأهل المساجد الكبيرة التي تجمع الضعفاءَ والصبيانَ وغيرهم، كقوله صلى الله عليه وسلم:" أيُّكم صلَّى بالناس فَلْيُخَفِّفْ، فإن فيهم الضعيفَ" الحديثَ؛ أو معناه: طَوِّلُوا الصلاةَ حتى يقع آخِرُها في وقت الإسفار، لحديث أبي برزةَ:" كان يَنْفَتِلُ في صلاة الغداة حين يعرف الرجل جليسَه، ويقرأ بالستين إلى المائة" فلامنا فاةَ بينه وبين حديثِ الغَلَس.

ترجمہ: (۲) اور مستحب وقت: وہ وقت جو کہ مستحب ہے کہ اس میں نماز پڑھی جائے۔ اور وہ اوائل اوقات ہیں:

(الف) مگر عشاء: پس اصلی مستحب اس میں تاخیر ہے۔ اس بات کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی فطری حالت سے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''اگر میری امت کے لئے دشواری نہ ہوتی تو میں ان کو حکم دیتا کہ وہ عشاء کو مؤخر کریں'' اور اس لئے کہ تاخیر زیادہ نافع ہے باطن کو صاف کرنے میں، اُن مشاغل سے جو اللہ کی یاد کو بھلانے والے ہیں۔ اور وہ عشاء کے بعد قصہ گوئی کے عنصر کو زیادہ کاٹنے والی ہے۔ مگر تاخیر کبھی پہنچاتی ہے جماعت کو کم کرنے کی طرف اور لوگوں کو بدکانے کی طرف۔ اور اس میں معاملہ برعکس ہو جاتا ہے۔ پس اسی وجہ سے جب لوگ زیادہ (جمع) ہو جاتے تھے تو نبی ﷺ جلدی کرتے تھے۔ اور جب لوگ کم ہوتے تھے تو تاخیر کرتے تھے۔

(ب) اور مگر گرمی کے ظہر۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب گرمی سخت ہو جائے تو ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھو، پس بیشک گرمی کی شدت جہنم کی وسعت (اثرات کے پھیلنے) سے ہے''

میں کہتا ہوں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت و جہنم کا سرچشمہ ہی اس چیز کا سرچشمہ ہے، جس کا اس عالم میں فیضان کیا جاتا ہے، موافق اور ناموافق احوال میں سے۔ اور یہی مطلب ہے اس کا جو خبروں میں آیا ہے کاسنی وغیرہ کے بارے میں۔

(سوالِ مقدر کا جواب) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''اُجالا کر کے فجر پڑھا کرو (یعنی مسجد نبوی کے معمول کے مطابق غلس میں نہ پڑھو) پس بیشک وہ زیادہ بڑا ہے ثواب کے لئے (یعنی اسفار کر کے پڑھنے میں جماعت بڑی ہوگی۔ اور جتنی جماعت بڑی ہوگی، ثواب زیادہ ہوگا)

میں کہتا ہوں: یہ ایسے لوگوں سے خطاب ہے جو ڈرتے ہیں جماعت کے بہت ہی کم ہو جانے سے کہ انتظار کریں وہ

اُجالا ہونے کا ——— یا ایسی بڑی مساجد والوں سے خطاب ہے جو اکٹھا کرتی ہیں کمزوروں کو اور بچوں کو اوران کے علاوہ کو۔ جیسے آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''تم میں سے جو لوگوں کو نماز پڑھائے، پس چاہئے کہ وہ ہلکی نماز پڑھے۔ پس بیشک لوگوں میں کمزور ہیں'' آخر حدیث تک ——— یا اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو دراز کردتا آنکہ اس کا آخر واقع ہو، اسفار کے وقت میں، ابو برزہؓ کی حدیث کی وجہ سے کہ: ''آپ ﷺ صبح کی نماز سے پھرا کرتے تھے جب پہچانتا تھا آدمی اپنے ہم نشیں کو۔ اور آپؐ ساٹھ سے سو آیتوں تک پڑھا کرتے تھے'' ——— پس کوئی تضاد نہیں اسفار کی حدیث اور غلس کی حدیث کے درمیان۔

☆ ☆

تیسرا وقت: وقتِ ضرورت

وقتِ ضرورت: وہ ہے جس تک نماز کو بغیر عذر کے مؤخر کرنا جائز نہیں۔ درج ذیل تین حدیثوں میں اسی کا تذکرہ ہے:

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے صبح کی ایک رکعت پائی سورج نکلنے سے پہلے تو یقیناً اس نے صبح پالی۔ اور جس نے عصر کی ایک رکعت پائی سورج ڈوبنے سے پہلے تو یقیناً اس نے عصر پالی'' (مشکوۃ حدیث ۶۰۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نے کسی نماز کے وقت کے آخر میں صرف ایک رکعت پائی اس نے وہ نماز پالی، پس وہ اس نماز کو پورا کرے۔ مگر ظاہر ہے کہ نماز میں اتنی تاخیر کرنا بغیر عذر کے درست نہیں! اور عذر یہ ہے کہ آدمی ایسے ہی وقت میں بیدار ہو یا نماز یاد آئے۔

فائدہ: اس حدیث کا یہ مطلب بھی سمجھا گیا ہے کہ یہ حدیث اس شخص کے حق میں ہے جو کسی نماز کے وقت کے آخر میں نماز کا اہل ہوا ہو۔ مثلاً حائضہ پاک ہوئی ہو یا بچہ بالغ ہوا ہو، یا غیر مسلم ایمان لایا ہو تو اگر وہ نماز کا اتنا وقت پائے کہ طہارت حاصل کر کے ایک رکعت یا ایک سجدہ یعنی ایک رکن وقت میں ادا کرسکتا ہو تو اس پر وہ نماز واجب ہوگئی۔

حدیث ——— حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ منافق کی نماز ہے: بیٹھا رہا، سورج کی نگرانی کرتا رہا، یہاں تک کہ جب سورج پیلا پڑ گیا اور شیطان کے دوسینگوں کے درمیان چلا گیا تو اٹھا اور چار ٹھونگیں ماریں۔ یاد نہیں کرتا وہ نماز میں اللہ تعالیٰ کو مگر تھوڑا سا'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۵۹۳) اس روایت سے معلوم ہوا کہ سورج پیلا پڑنے کے بعد بھی عصر کا وقت باقی رہتا ہے۔ مگر یہ وقت ضرورت ہے۔ بے ضرورت اتنی تاخیر مکروہ تحریمی ہے۔

حدیث ——— مسلم، ترمذی اور موطا مالک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کے درمیان جمع کیا: في غیر خوف ولا سفر (وفي حديث وكيع:) ولا مطر یعنی نہ تو دشمن کا کوئی ڈر تھا، نہ سفر تھا اور نہ ہی بارش تھی۔ حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپؐ نے یہ

عمل کیوں کیا؟ ابن عباسؓ نے فرمایا: أراد ان لایُحْرِجَ أحدا من أمته یعنی آپؐ نے یہ عمل اس لئے کیا تھا کہ امت میں سے کسی کے لئے تنگی نہ ہو یعنی آپؐ نے یہ عمل بیان جواز کے لئے کیا تھا (مسلم باب صلاۃ المسافرین ۵:۲۱۵ مصری) ظاہر ہے کہ یہ جمع حقیقی بوقتِ ضرورت ہی جائز ہے۔ اور ضرورت: سفر، بیماری اور بارش ہے۔ اور عشاء میں وقتِ ضرورت نصف رات کے بعد سے صبح پو پھٹنے تک کا وقت ہے۔ مجبوری کی صورت ہی میں عشاء کو اس وقت تک مؤخر کرنا چاہئے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جمع حقیقی پر محمول کیا ہے۔ مگر آپ نے جمع حقیقی کے جواز کے لئے جو تین اعذار بیان فرمائے ہیں، ان میں سے کوئی عذر اُس جمع میں موجود نہیں تھا۔ پھر جمع کیسے جائز ہوا؟ صحیح بات یہ ہے کہ وہ جمع صُوری تھی اور بیان جواز کے لئے آپ نے وہ عمل کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

چوتھا وقت: وقتِ قضاء

اگر کوئی نماز بھول جائے یا سوتا رہ جائے اور نماز فوت ہو جائے یعنی ہاتھ سے نکل جائے تو جب یاد آئے یا آنکھ کھلے اس نماز کی قضاء واجب ہے اور یہی وقتِ قضاء ہے، درج ذیل حدیث سے یہ بات ثابت ہے۔

حدیث ـــــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کوئی نماز بھول گیا یا اس سے سو گیا پس اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب وہ یاد آئے (یا جب بیدار ہو) اس نماز کو پڑھ لے'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۶۰۳)

تشریح: فوت شدہ نماز کی قضا کیوں ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں جامع مختصر بات یہ ہے کہ دو وجہ سے اس کی قضا ضروری ہے: ایک: اس وجہ سے کہ اگر قضا واجب نہیں کی جائے گی تو نفس بے لگام ہو جائے گا اور وہ خواہشات کے ساتھ بہتا چلا جائے گا اور نماز چھوڑنے کا عادی ہو جائے گا۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ قضا پڑھنے سے وہ فوائد حاصل ہو جائیں گے جو ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

فائدہ: تفویت یعنی جان بوجھ کر نماز چھوڑنے کی صورت میں بھی قضا واجب ہے۔ علماء نے تفویت کو فوت کے حکم میں رکھا ہے۔ کیونکہ جب نماز فوت ہونے کی صورت میں قضا کے ذریعہ اس کی تلافی ضروری ہے تو تفویت تو اس سے سنگین گناہ ہے۔ اس کی تلافی تو بدرجہ اولی ضروری ہوگی۔ اور یہ دلالۃ النص سے استدلال ہے۔ جیسے اُف کہنے کی ممانعت سے ضرب وشتم کی تحریم ثابت کی گئی ہے۔

[۳] ووقتُ الضرورة، وهو ما لایجوز التأخیر إلیه إلا بعذر، وهو قوله صلی الله علیه وسلم: "من أدرك ركعةً من الصبح قبل أن تطلع الشمسُ فقد أدرك الصبحَ، ومن أدرك ركعةً من العصر قبلَ أن تغرُبَ الشمسُ فقد أدرك العصر" وقوله: صلی الله علیه وسلم: "تلك صلاة

المنافق: يَرْقُبُ الشمس حتى إذا اصفرَّتْ" الحديث، وهو حديثُ ابن عباس في الجمع بين الظهر والعصر، وبين المغرب والعشاء؛ والعذرُ: مثلُ السفر والمرض والمطر؛ وفي العشاء إلى طلوع الفجر، والله أعلم.

[٤] ووقتُ القضاء: إذا ذكر، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" من نَسِيَ صلاةً، أو نام عنها، فَلْيُصَلِّها إذا ذكرها"

أقول: والجملةُ في ذلك: أن لا تَسْتَرْسِلَ النفسُ بتركها، وأن يُدْرِكَ مافاته من فائدة تلك الصلاة، وأَلْحَقَ القومُ التفويتَ بالفوتِ، نظرًا إلى أنه أحقُّ بالكفارة.

ترجمہ:(۳)اوروقتِ ضرورت:اوروہ وہ ہے کہ جائز نہیں اس تک تاخیر مگرکسی عذر کی وجہ سے(اس کے بعد تین حدیثیں ذکرفرمائی ہیں جن کا ترجمہ اوپر گذر چکا)اورعذر:جیسے سفراور بیماری اور بارش۔اورعشاء میں(وقت ضرورت)پَو پھٹنے تک ہے۔باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(۴)اورقضاء کا وقت:جب اس کونماز یادآجائے(اس کے بعدحدیث ذکرفرمائی ہے جس کا ترجمہ گذر چکا ہے)

میں کہتا ہوں:اورمختصر جامع بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ نفس نہ بہتا جائے اس کو چھوڑنے کے ساتھ۔اور یہ کہ پالے وہ اس چیزکوجواس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے اس نماز کے فائدہ میں سے ——— اورعلماء نے ملایا ہے نماز فوت کرنے کونماز فوت ہونے کے ساتھ۔اس بات کی طرف نظر کرتے ہوئے کہ فوت کرنا کفارہ کا زیادہ حقدار ہے(یعنی حدیث میں قضا کوفوت شدہ نماز کا کفارہ کہا گیا ہے۔پس نماز کو فوت کرنے کی صورت میں یہ کفارہ بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے)

☆ ☆ ☆

نماز قضا کی جارہی ہواورآدمی بےبس ہوتو کیا کرے؟

حدیث ——— حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:"تیرا کیا حال ہوگا جب تجھ پرایسے سردار مسلط ہوں گے جونماز کو ماردیں گے؟!"یعنی قضاء کرکے پڑھیں گے۔یا یہ فرمایا کہ:"نماز کواس کے وقت سے پیچھے ڈال دیں گے؟!"حضرت ابوذرغفاریؓ نے دریافت کیا کہ ایسے وقت کے لئے مجھے کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا:"تو وقت پرنماز پڑھ لینا۔پھراگرتواس نماز کوامیر کے ساتھ پائے تو(دوبارہ)پڑھ لینا۔پس بیشک وہ تیرے لئے نفل ہے"(مشکوۃ حدیث ۶۰۰)

تشریح:جب اس نے وقت پرنماز پڑھ لی تواب امیر کے ساتھ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ

نماز میں دو اعتبار ہیں یعنی دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے: ایک: اللہ اور بندہ کے درمیان وسیلہ ہونے کا۔ اس اعتبار سے ضروری ہے کہ بروقت نماز ادا کی جائے تاکہ اللہ پاک ناراض نہ ہوں۔ اور دوسرا اعتبار یہ ہے کہ نماز دین کا ایک ایسا شعار ہے جس کے ترک پر سرزنش کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ضروری ہے کہ امیر کے ساتھ بھی پڑھ لی جائے، تاکہ اس کی طرف سے کوئی گزند نہ پہنچے۔

اختیار کی صورت میں نماز مکروہ وقت میں پڑھنا کیسا ہے؟

حدیث ــــــ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت برابر بھلائی پر ــــــ یا فرمایا کہ فطرت پر یعنی طریقۂ اسلام پر ــــــ رہے گی، جب تک وہ مغرب کی نماز میں ستاروں کے گنجان ہونے تک دیر نہیں کرے گی'' (مشکوۃ حدیث ۶۰۹)

تشریح: اختیاری احوال میں نماز مکروہ وقت میں پڑھنا احکام شرعیہ میں لاپرواہی برتنا ہے، جو تحریف ملت کا باعث ہے۔ کیونکہ اس طرح لوگ احکام شرعیہ میں لاپرواہی برتتے رہیں گے تو ملتِ اسلامیہ کے نقوش مٹ جائیں گے۔

تین نمازوں کی نگہداشت کا حکم کیوں دیا؟

آیت کریمہ: سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۸ میں ارشاد پاک ہے: ''نگہداشت کرو تم تمام نمازوں کی اور درمیانی نماز کی''۔ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ جیسا کہ ابن مسعود اور سَمُرَۃ بن جندب کی مرفوع روایت میں آیا ہے (مشکوۃ حدیث ۶۳۴)

حدیث ــــــ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دو ٹھنڈے وقتوں کی نمازیں (فجر اور عصر) پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوگا'' (مشکوۃ حدیث ۶۲۵)

حدیث ــــــ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے اعمال یقیناً باطل ہوگئے'' (مشکوۃ حدیث ۵۹۵)

حدیث ــــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی، تو گویا اس کی آل اور مال پر حادثہ پڑ گیا'' (مشکوۃ حدیث ۵۹۴)

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''منافقین پر فجر اور عشاء سے زیادہ بھاری کوئی نماز نہیں۔ اور اگر وہ جان لیں اس ثواب کو جو اُن میں ہے تو وہ ضرور اُن میں آئیں، خواہ گھسٹ کر ہی آنا پڑے'' (مشکوۃ حدیث ۶۲۹)

تشریح: مذکورہ بالا نصوص میں عصر، عشاء اور فجر کی نمازوں کی نگہداشت کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور ان میں کوتاہی پر

وعید سنائی گئی ہیں۔سوال یہ ہے کہ نمازیں تو پانچ فرض ہیں۔ پھر تین ہی نمازوں کی نگہداشت کی تاکید کیوں کی گئی؟ جواب یہ ہے کہ یہ نمازیں سستی اور لاپرواہی کی احتمالی جگہیں ہیں۔ فجر اور عشا سونے کے وقت میں پڑھی جاتی ہیں۔اس وقت نرم گرم لحاف گدے کو چھوڑ کر اور مزے دار نیند اور غنودگی کو قربان کر کے نماز کے لئے متقی مؤمن ہی کھڑا ہوتا ہے۔اور عصر کا وقت: بازاروں کے عروج اور خرید وفروخت میں مشغولیت کا وقت ہے۔اور زراعت پیشہ لوگ اس وقت تھکن سے چور چور ہوتے ہیں۔اس لئے ان نمازوں میں کوتاہی کا احتمال تھا اس لئے ان کی حفاظت کی خصوصی تاکید فرمائی۔

اسلامی اصطلاحات کی حفاظت ضروری ہے

حدیث ــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہرگز تم پر گنوار غالب نہ آئیں، تمہاری نمازِ مغرب کے نام پر'' اور ایک دوسری حدیث میں ہے: ''ہرگز تم پر گنوار غالب نہ آئیں: تمہاری نماز عشاء کے نام پر۔ پس بیشک وہ کتاب اللہ میں عشاء ہے۔اور اعراب رات تاریک ہونے کے بعد اونٹ دوہتے تھے'' (مشکوۃ حدیث ۶۳۱ و ۶۳۲)

تشریح: عرب کے گنوار مغرب کے وقت کو عشاء کہتے تھے۔اور عشاء کے وقت کو عَتَمَة کہتے تھے عَتَمَ عَتْمًا کے معنی ہیں: رات تاریک ہونے کے بعد اونٹ دوہنا۔ چونکہ وہ رات تاریک ہونے کے بعد اونٹوں کا دودھ نکالتے تھے، اس لئے وہ عشاء کے وقت کو عتمہ کہتے تھے۔ اگر ان کی یہ اصطلاح چل پڑی تو نصوص فہمی میں دشواری پیش آئے گی۔سورۃ النور آیت ۵۸ میں ہے ﴿مِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ﴾ اس کا مفہوم غلط سمجھا جائے گا۔اس لئے اسلامی اصطلاحات کی حفاظت ضروری ہے۔شاہ صاحب فرماتے ہیں:

قرآن وحدیث میں جن چیزوں کے جو نام آئے ہیں ان میں تبدیلی کرنا اور ان کے دوسرے نام رکھنا مکروہ ہے۔ نئے نام رکھے جائیں گے تو پرانے نام متروک ہوجائیں گے اور لوگوں پر دین کی باتیں مشتبہ ہوجائیں گی اور قرآن وحدیث مبہم ہوجائیں گے یعنی ان کا سمجھنا دشوار ہوجائے گا۔

[۱] ووَصّى صلى الله عليه وسلم أبا ذَرٍّ إذا كان عليه أُمَرَاءُ يُميتون الصلاةَ: '' صَلِّ الصلاةَ لوقتها، فإن أدركتها معهم فصلِّها، فإنها لك نافلة''

أقول: رَاعىٰ في الصلاة اعتبارين: اعتبارَ كونِها وسيلةً بينه وبين الله، وكونِها من شعائر الله يُلام على تركها.

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: '' لاتزال أمتي بخيرٍ مالم يؤخِّروا المغربَ إلى أن تَشْتَبِكَ النجومُ''

أقول: هذا إشارة إلى أن التهاون في الحدود الشرعية سببُ تحريف المِلَّة.

[۳] قال الله تعالى: ﴿حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلاةِ الْوُسْطَى﴾ والمراد بها العصر. وقوله صلى الله عليه وسلم: " من صَلَّى الْبَرْدَيْنِ دخل الجنة" قوله صلى الله عليه وسلم: " من ترك صلاة العصر حَبِطَ عملُه" وقوله صلى الله عليه وسلم: " الذى تفوته صلاةُ العصر فكانما وُتِرَ أهلَه ومالَه" وقوله صلى الله عليه وسلم: " ليس صلاةٌ أثقلَ على المنافقين من الفجر والعشاء، ولو يعلمون مافيهما لأتوهما ولو حَبْوًا"

أقول: إنما خَصَّ هذه الصلواتِ الثلاث بزيادة الاهتمام ترغيبًا وترهيبًا، لأنها مظِنَّةُ التهاون والتكاسل: لأن الفجر والعشاءَ وقتُ النوم، لا ينتهض إليه من بين فراشه ووِطائه عند لذيذِ نومِه ووَسَنِه إلا مؤمنٌ تقيٌّ؛ واما وقتُ العصر: فكان وقتُ قيام أسواقهم، وإشتغالِهم بالبيوع، وأهلُ الزراعة أتعبُ حالِهم هذه.

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " لايَغْلِبَنَّكم الأعرابُ على اسمِ صلاتِكم المغربِ" وفى حديث آخر: " على اسمِ صلاةِ العشاءِ"

أقول: يكره تسميةُ ماورد فى الكتاب والسنة مسمًّى بشيئٍ: اسمًا آخرَ، بحيث يكون ذريعةً لهجر الاسم الأول، لأن ذلك يُلَبِّسُ على الناس دينهم، ويُعْجِمُ عليه كتابَهم.

ترجمہ: (۱) اور تاکید فرمائی آنحضرت ﷺ نے ابوذر کو جب ہوں ان پر ایسے سردار جو نماز کو ماردیں کہ: "پڑھ تو نماز کو اس کے وقت میں، پھر اگر پائے تو اس کو ان کے ساتھ تو (دوبارہ) پڑھ لے اس کو، پس بیشک وہ تیرے لئے نفل ہے" میں کہتا ہوں: آپؐ نے نماز میں دو اعتبار ملحوظ رکھے ہیں: اس کے وسیلہ ہونے کا اعتبار بندہ اور اللہ کے درمیان اور اس کے اللہ کے دین کے ایسے شعائر میں سے ہونے کا اعتبار، جس کے ترک پر سرزنش کی جاتی ہے۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ احکام شرعیہ میں لاپروائی ملت (کی تعلیمات) کے بگاڑنے کا سبب ہے۔

(۳) (پانچ نصوص ذکر فرمائی ہیں، جن کا ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: ان تین نمازوں کو آپؐ نے خاص کیا زیادہ اہتمام کے ساتھ ترغیب اور ترہیب کے طور پر، صرف اس وجہ سے کہ وہ نمازیں لاپروائی اور سستی برتنے کی احتمالی جگہ ہیں۔ اس لئے کہ فجر اور عشا سونے کا وقت ہے۔ نہیں کھڑا ہوتا اس کی طرف اپنے بستر اور اپنے گدے کے بیچ سے، اپنی مزہ دار نیند اور اپنی غنودگی کے وقت میں، مگر پرہیزگار مؤمن۔ اور رہا عصر کا وقت: تو وہ ان کے بازاروں کے عروج کا اور ان کے خرید وفروخت میں مشغول ہونے کا وقت ہے۔ اور کھیتی والے ان کی تھکن کی سب سے بُری حالت اس وقت میں ہوتی ہے۔

(۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: مکروہ ہے کوئی دوسرا نام رکھنا اس چیز کا جو وارد

ہوئی ہے قرآن وحدیث میں کسی چیز کے ساتھ نام رکھی ہوئی، بایں طور کہ ہوے وہ ذریعہ پہلے نام کو چھوڑ دینے کا۔ اس لئے کہ یہ بات مشتبہ کردے گی لوگوں پر ان کے دین کو۔ اور مبہم کردے گی ان پر ان کی کتاب کو۔

لغات: وَتَرَ يَتِرُ وَتْرًا وتِرَةً مالَه: گھٹادینا اور وُتِرَ (مجہول) بمعنی اُصیب ہے یعنی حادثہ پیش آنا۔ اور اهلَه و مالَه مفعول ثانی ہیں..... حبَا (ن) حبْوًا الصبيُّ: چوتڑوں کے بل گھسٹنا..... عَجَمَ عليه الكلامُ: دشوار ہونا، مبہم ہونا۔

☆ ☆ ☆

باب ——— ۴

اذان کا بیان

اذان کی تاریخ، اہمیت اور معنویت

جب صحابہ کے علم میں یہ بات آئی کہ جماعت سے نماز ادا کرنا مطلوب ومؤکد ہے۔ اور ایک وقت میں اور ایک جگہ میں اعلان وآگہی کے بغیر سب لوگوں کا جمع ہونا آسان نہیں، تو انھوں نے باہم مشورہ کیا۔ کسی نے رائے دی کہ بلند جگہ پر آگ روشن کردی جائے، جسے دیکھ کر لوگ جمع ہوجایا کریں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ نر سنگا بجایا جائے، جیسے یہود بجاتے ہیں۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ ناقوس (نقارہ) بجایا جائے، جیسے عیسائی بجاتے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب تجاویز کو رد فرمادیا۔ کیونکہ ان میں غیروں سے مشابہت تھی۔ اس گفتگو پر مجلس برخاست ہوگئی اور سب لوگ منتشر ہوگئے۔ چند دن بعد حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ نے اذان واقامت کے بارے میں خواب دیکھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''یہ برحق خواب ہے!''[1]

اذان کے اس واقعہ سے درج ذیل پانچ باتیں ثابت ہوئیں:

۱ ——— احکام: مصالح کی بنا پر ہی مشروع کئے جاتے ہیں یعنی اذان واقامت میں حکمتیں تھیں اس لئے ان کو خواب کے ذریعہ مشروع کیا گیا۔

۲ ——— اجتہاد نبوی کے لئے احکام شرعیہ میں کچھ دخل ہے یعنی بعض احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی جلی کے بغیر اجتہاد سے مقرر فرماتے ہیں۔

---

[1] شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اذان واقامت کی تاریخ نہایت اختصار سے بیان کی ہے۔ اس کی مکمل تفصیل جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند کی کتاب: ''آداب اذان واقامت'' میں ہے۔ شائقین اس کی مراجعت کریں ۱۲

۳ــــــ دین میں آسانی کرنا شریعت کا ایک بنیادی ضابطہ ہے اسی ضابطہ کی رو سے اذان مشروع کرکے نماز کے لئے جمع ہونا آسان کیا گیا ہے۔

۴ــــــ شعائر میں ایسے لوگوں کی مخالفت کرنا جو عرصۂ دراز سے گمراہی کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں مطلوب و مستحسن ہے۔ اس لئے کہ شعائر ہی سے دین وملت کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ تمام تجاویز ردّ فرمادیں جو غیروں کا شعار تھیں۔

۵ــــــ غیر نبی بھی خواب یا الہام کے ذریعہ اللہ کی مراد سے واقف ہوسکتا ہے۔ مگر وہ شرعاً حجت نہیں، جب تک کہ نبی کی اس کو تائید حاصل نہ ہوجائے پس اذان واقامت کی مشروعیت صرف خواب سے نہیں ہوئی، بلکہ تائید نبوی سے ہوئی ہے۔ پھر قرآن کریم نے سورۃ الجمعہ کی آیت ۹ میں اس حکم کی توثیق کردی۔

اذان کی اہمیت ومعنویت: اذان مشروع کرتے ہوئے حکمتِ خداوندی نے یہ بھی چاہا کہ اذان صرف اعلان وآگہی کا ذریعہ نہ ہو، بلکہ وہ دین کا ایک شعار بھی ہو۔ اور وہ اس طرح کہ جب کس وناکس کے سامنے اذان کی صدا بلند کی جائے گی تو اس سے دین کی شان بلند ہوگی۔ اور جب لوگ اذان سن کر نماز کے لئے آئیں گے تو وہ دین کی تابعداری کی ایک علامت ہوگی۔ اس لئے اذان اللہ کی کبریائی کے اعلان سے شروع کی جاتی ہے۔ پھر اسلام کے دو بنیادی عقیدوں (توحید ورسالتِ محمدی) کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور یہ اعلان گواہی کی شکل میں کیا جاتا ہے، جس میں دوسروں کو ترغیب دینا ہے کہ وہ بھی یہ گواہیاں دیں۔ پھر اسلام کی بنیادی عبادت نماز کی طرف لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اور ساتھ ہی اس کا فائدہ بھی بتایا جاتا ہے کہ دارین کی کامیابی نماز میں مضمر ہے۔ پھر آخر میں دوبارہ اللہ کی عظمت وکبریائی اور توحید کا اعلان کرکے اذان پوری کی جاتی ہے تاکہ اذان کا جو مقصد ہے اس کو اذان پوری صراحت کے ساتھ بیان کردے۔

﴿الأذان﴾

لَمَّا عَلِمَتِ الصحابةُ أن الجماعةَ مطلوبةٌ مؤكدةٌ، ولايتيسر الاجتماع في زمان واحد ومكان واحد بدون إعلام وتنبيهٍ: تكلّموا فيما يحصل به الإعلامُ، فذكروا النارَ، فردَّها رسولُ الله صلى الله عليه وسلم لمشابهة المجوسِ؛ وذكروا القرنَ، فردَّه لمشابهة اليهود؛ وذكروا الناقوسَ، فردَّه لمشابهة النصارى، فرجعوا من غير تعيين، فأُرِي عبدُ الله بنُ زيد الأذانَ والإقامةَ في منامه، فذَكر ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم، فقال: "رؤيا حقٌّ!"

وهذه القصةُ دليل واضح على أن الأحكام إنما شُرعت لأجل المصالح، وأن للاجتهاد فيها مدخلاً، وأن التيسير أصل أصيل، وأن مخالفةَ أقوام تمادَوْا في ضلالتهم فيما يكون من شعائر

الدين: مطلوبٌ، وأن غير النبي صلى الله عليه وسلم قد يَطَّلِعُ بالمنام أو النفث في الرُّوع على مراد الحق، لكن لا يُكَلَّفُ الناسُ به، ولا تنقطع الشبهةُ حتى يُقَرِّرَهُ النبي صلى الله عليه وسلم.

واقتضتِ الحكمةُ الإلٰهيةُ: أن لايكون الأذان صِرْفَ إعلامٍ وتنبيهٍ، بل يُضَمُّ مع ذلك: أن يكون من شعائر الدين، بحيث يكونُ النداءُ به على رءوس الخامل والنبيه تنويها بالدين، ويكونُ قبولُه من القوم آية انقيادهم لدين الله، فوجب أن يكون مركبًا من ذكر الله ومن الشهادتين والدعوة إلى الصلاة، ليكون مُصَرِّحًا بما أريد به.

ترجمہ: اذان کا بیان: جب صحابہ نے جان لیا کہ جماعت مطلوب ومؤکد ہے۔ اور ایک وقت میں اور ایک جگہ میں اعلان وآگہی کے بغیر اکٹھا ہونا آسان نہیں تو انھوں نے گفتگو کی اس طریقہ کے بارے میں جس کے ذریعہ اعلان حاصل ہو جائے۔ پس تذکرہ کیا انھوں نے آگ کا۔ پس نامنظور فرمایا اس کو رسول اللہ ﷺ نے مجوس کی مشابہت کی وجہ سے۔ اور تذکرہ کیا انھوں نے نرسنگھے کا۔ پس نامنظور کیا اس کو رسول اللہ ﷺ نے یہود کی مشابہت کی وجہ سے۔ اور تذکرہ کیا انھوں نے ناقوس (گھنٹے) کا، پس نامنظور فرمایا اس کو رسول اللہ ﷺ نے عیسائیوں کی مشابہت کی وجہ سے۔ پس لوٹے لوگ بغیر کوئی بات طے کئے ہوئے۔ پس دکھلائے گئے عبداللہ بن زید اذان واقامت خواب میں۔ پس تذکرہ کیا انھوں نے اس کا نبی ﷺ سے۔ پس آپؐ نے فرمایا: ''سچا خواب ہے!''

اور یہ واقعہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ احکام مصالح کی بنا پر ہی مشروع کئے جاتے ہیں۔ اور اس بات کی کہ اجتہاد کے لئے احکام میں کچھ دخل ہے، اور اس بات کی کہ آسانی کرنا ایک مضبوط ضابطہ ہے اور اس بات کی کہ ایسے لوگوں کی مخالفت کرنا جو اپنی گمراہی میں عرصۂ دراز سے مبتلا ہیں، ان باتوں میں جو شعائر دین سے ہیں: مطلوب ہے۔ اور اس بات کی کہ نبی ﷺ کے علاوہ کوئی اور بھی، کبھی خواب کے ذریعہ یا دل میں بات ڈالنے کے ذریعہ، اللہ کی مراد سے واقف ہوسکتا ہے۔ لیکن لوگوں کو اس کا مکلف نہیں کیا جاسکتا۔ اور (خیال یا القائے شیطانی ہونے کا) شبہ ختم نہیں ہوسکتا تا آنکہ نبی ﷺ اس کی تائید کریں۔

اور حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ اذان صرف اعلان وآگہی نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ یہ بات ملائی جائے کہ اذان دین کے شعائر میں سے ہو۔ بایں طور کہ اس کے ذریعہ بانگ لگانا ہر کس وناکس کے سامنے دین کی شان بلند کرنا ہو۔ اور لوگوں کا اس کو قبول کرنا ان کی اللہ کے دین کی تابعداری کی علامت ہو۔ پس ضروری ہوا کہ اذان مرکب ہو اللہ کے ذکر سے اور دو شہادتوں سے اور نماز کی دعوت سے، تا کہ اذان اس مقصد کو صراحت کے ساتھ بیان کرنے والی ہو جو اس سے مقصود ہے۔

لغات: تَمَادیٰ فی غَیِّہٖ :اصرار کرنا...... الخامل: گمنام، بے قدر...... النبیہ: سمجھدار، شریف...... نَوَّہَ تنویھًا: شان بلند کرنا۔

☆ ☆ ☆

اذان واقامت کے کلمات کی تعداد

کلماتِ اذان: امام شافعی: ۱۹کلمات (شروع میں تکبیر میں تربیع اور شہادتین میں ترجیع کے ساتھ) امام مالک: ۱۷کلمات (شروع میں تکبیر میں تثنیہ یعنی صرف دومرتبہ اللہ اکبر کہا جائے اور شہادتین میں ترجیع کے ساتھ) امام ابوحنیفہ اورامام احمد: ۱۵کلمات (تکبیر میں تربیع اور بغیر ترجیع کے) امام ابویوسف: ۱۳کلمات (بغیر تربیع اور بغیر ترجیع) اور فجر کی اذان میں بالاتفاق دومرتبہ الصلاۃ خیر من النوم بڑھایا جائے۔

کلماتِ اقامت: مالک: ۱۰کلمات (شروع اور آخر میں اللّٰہ اکبر دومرتبہ۔ باقی ہرکلمہ ایک مرتبہ، حتی کہ قد قامت الصلاۃ بھی ایک مرتبہ) شافعی واحمد: ۱۱کلمات (قد قامت الصلاۃ دومرتبہ باقی مثلِ مالک) ابوحنیفہ: ۱۷ کلمات (اقامت مثلِ اذان ہے مع اضافہ دومرتبہ قد قامت الصلاۃ)

شاہ صاحب قدس سرہ نے یہ مسئلہ بہت ہی مختصر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

اذان واقامت کے چند طریقے ہیں یعنی ائمہ مجتہدین کی آراء میں اختلاف ہے۔ سب نے الگ الگ طریقے تجویز کئے ہیں۔ اور دلیل سے قوی وہ طریقہ ہے جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ان کی اذان میں پندرہ کلمات اور تکبیر میں گیارہ کلمات تھے۔ پھر وہ طریقہ ہے جو حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ان کی اذان میں انیس کلمات اور تکبیر میں سترہ کلمات تھے۔ ان کو اسی طرح اذان واقامت رسول اللہ ﷺ نے سکھائی تھی۔ اس اختلاف میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اختلاف: اختلاف مباح ہے یعنی جواز وعدم جواز کا اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ہر طرح اذان واقامت کہنا درست ہے۔ اختلاف صرف افضل صورت میں ہے۔ اور اس کی نظیر سات قراءتیں ہیں۔ جس طرح ان میں سے ہر قراءت جائز ہے اور کافی شافی ہے اسی طرح اذان واقامت کے طریقوں کو سمجھنا چاہئے (شاہ صاحب کی بات پوری ہوئی)

مگر مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر قدرے تفصیل ناگزیر ہے۔ درحقیقت یہ اختلاف: اختلافِ ادلہ کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ یہ نصوص فہمی کا اختلاف ہے۔ اور دوجگہوں میں اختلاف ہوا ہے:

پہلی جگہ: آنحضور ﷺ نے ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو شہادتین میں ترجیع کروائی تھی یعنی مکرر کہلوائی تھیں۔ اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ مگر اختلاف اس میں ہوا ہے کہ یہ ترجیع سنتِ اذان تھی یا کسی عارضی مصلحت سے کروائی تھی۔ امام

مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ یہ سنتِ اذان تھی۔ اور ابومحذورہ بھی یہی کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے مجھے اذان انیس کلمات سکھائی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ترجیع سنت اذان نہیں تھی۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے شہادتین مکرر اس لئے کہلوائی تھیں کہ ان کے دل سے توحید و رسالتِ محمدی کی نفرت ختم ہو، اور ایمان کی محبت پیدا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا: شہادتین کی یہ تکرار ان کے ایمان کا سبب بن گئی۔

اور بات قرینِ صواب یہی ہے کیونکہ ملَک نازل کی اذان میں ترجیع نہیں تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان میں بھی ترجیع نہیں تھی۔ اگر اذان میں اس سنت کا اضافہ ہوا ہوتا تو آپؐ حضرت بلال کو بھی ترجیع کرنے کا حکم دیتے۔ حالانکہ ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ اور وہ آخر تک آنحضور ﷺ کی مسجد میں بغیر ترجیع کے اذان دیتے رہے۔ اور اب اس اختلاف کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں، کیونکہ مالکیہ اور شافعیہ نے عملاً ترجیع ختم کر دی ہے۔ اب وہ حضرات بغیر ترجیع کے اذان دیتے ہیں۔

دوسری جگہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: أُمِرَ بلالٌ أن يَّشْفَعَ الأذانَ ويُوْتِرَ الإقامةَ یعنی حضرت بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان دُوہری اور اقامت اکہری کہیں (مسلم شریف ۱:۱۶۴) اس حدیث کا مطلب ائمہ ثلاثہ یہ سمجھتے ہیں کہ اقامت میں ہر کلمہ ایک ایک مرتبہ کہا جائے۔ بجز تکبیر کے، شروع میں اور آخر میں۔ وہ دو دو بار کہی جائے۔ پھر امام مالک فرماتے ہیں کہ قد قامت الصلاة بھی ایک ہی مرتبہ کہا جائے۔ اس لئے ان کے نزدیک اقامت میں دس کلمات ہیں۔ اور شافعی و احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ قد قامت الصلاة دو مرتبہ کہا جائے۔ اس لئے ان کے نزدیک اقامت میں گیارہ کلمات ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ مذکورہ روایت میں إلا الإقــــامة کا استثناء آیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ استثناء متکلم فیہ ہے[1]۔ اور ان حضرات نے جو مذکورہ حدیث کا مطلب سمجھا ہے اس کا قرینہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ: ''دورِ نبوی میں اذان دو دو بار اور اقامت ایک ایک بار تھی۔ البتہ مؤذن قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة کہا کرتا تھا'' (مشکوۃ حدیث ۶۴۳)

اور احناف کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا تھا کہ اذان میں وہ متماثل کلمات کو دو سانس میں کہا کریں اور تکبیر میں ایک ہی سانس میں کہیں۔ مگر قد قامت الصلاة کو دو الگ الگ سانسوں میں کہیں کہ یہی اقامت میں مقصود جزء ہے۔ اور فرق کی وجہ یہ ہے کہ اذان میں ترسّل (ٹھیر ٹھیر کر کہنا) مطلوب ہے۔ کیونکہ اذان کا مقصد اُن غائبین کو اطلاع دینا ہے جو مشاغل میں منہمک ہیں۔ اور اقامت کا مقصد حاضرین کو آگاہ کرنا ہے، جو پہلے سے تیار بیٹھے ہیں۔

---

[1] بخاری شریف میں جو إلا الإقــــامة کا استثناء آیا ہے اس پر ابن مندہ نے اعتراض کیا ہے کہ یہ ایوب سختیانی کا قول ہے، جس کو انھوں نے حدیث میں داخل کر دیا ہے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ نے فتح (۲:۸۳) میں اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے ۱۲

اوراحناف نے حدیث کا جومطلب سمجھا ہےاس کے تین قرائن ہیں:

پہلاقرینہ: ترمذی (۱: ۲۷) میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: قال: كان أذانُ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم شَفْعًا شَفْعًا في الأذان والإقامة: رسول اللہ ﷺ کی اذان دُوہری دُوہری تھی: اذان بھی اوراقامت بھی ــــــ اب اِس حدیث میں اوراُس حدیث میں جمع کی صورت یہی ہے کہ ایتار کلماتی مراد نہ لیا جائے، بلکہ ایتارصوتی مرادلیا جائے۔

دوسراقرینہ: اوپر یہ روایت گذرچکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کواقامت سترہ کلمات سکھلائی تھی (مشکوۃ حدیث ۶۴۴) اورشاہ صاحب رحمہ اللہ بھی یہ قاعدہ بیان کرچکے ہیں کہ: المفسَّر قاضٍ على المبهم: جوحدیث واضح ہووہ مبہم کے مقابل میں فیصلہ کن ہوتی ہے۔حضرت ابومحذورہؓ کی روایت میں عددِخاص مذکور ہے۔جس میں کوئی تاویل ممکن نہیں، پس وہی ناطق ہوگی۔

تیسراقرینہ: ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک اقامت کے شروع میں بھی اورآخر میں بھی تکبیر دودومرتبہ ہے۔اس پراعتراض واردہوتا ہے کہ یہ ایتار کے منافی ہے؟ حافظ رحمہ اللہ نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ دومرتبہ الله أكبر ایک ہی سانس میں کہا جاتا ہے، اس لئے یہ ایک ہی کلمہ شمار ہوگا۔ پس ایتارصوتی مراد لینا تاویل بعید نہیں ہے۔دوسرے حضرات بھی بوقتِ ضرورت یہ تاویل کرنے پرمجبور ہوئے ہیں۔

الغرض: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کا مطلب سمجھنے میں اختلاف ہوا ہے۔اس لئے اقامت کے کلمات کی تعداد میں اختلاف ہوا ہے۔

وللأذان طُرُقٌ:

أصحها: طريقةُ بلالٍ رضي الله عنه، فكان الأذانُ على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم مرتين مرتين، والإقامةُ مرةً مرةً، غير أنه كان يقول: قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة. ثم: طريقةُ أبي محذورةَ: علّمه النبي صلى الله عليه وسلم الأذان تسع عشرة كلمةً، والإقامةَ سبعَ عشرةَ كلمةً؛ وعندي: أنها كأحرف القرآن: كلُّها شافٍ كافٍ.

ترجمہ: اوراذان کے لئے چندطریقے ہیں: ان میں صحیح ترین: بلال رضی اللہ عنہ کا طریقہ ہے، پس تھی اذان رسول اللہ ﷺ کے عہد میں دودومرتبہ،اوراقامت ایک ایک مرتبہ۔البتہ بلالؓ قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة کہا کرتے تھے (یہ بعینہ حضرت ابن عمرؓ کے الفاظ ہیں۔مشکوۃ حدیث ۶۴۳) پھر: ابومحذورہ کا طریقہ ہے: نبی ﷺ نے ان کواذان انیس کلمات اوراقامت سترہ کلمات سکھلائے ہیں (یہ بھی بعینہ حدیث کے الفاظ ہیں، مشکوۃ حدیث ۶۴۴) اور

میرے نزدیک: یہ بات ہے کہ وہ طریقے قرآن کی قراءتوں کی طرح ہیں۔ سب کے سب کافی شافی ہیں۔

☆　☆　☆

فجر کی اذان میں اضافہ کی وجہ

حدیث ——— ابوداؤد شریف میں حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان کی تعلیم کی روایت (حدیث ۵۰۰) ہے۔ اس میں ہے: ''پھر اگر صبح کی نماز ہو تو آپ کہیں: الصلاۃ خیر من النوم، الصلاۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے!)

تشریح: چونکہ فجر کا وقت نیند اور غفلت کا وقت ہے اور اس وقت نماز کا محض فائدہ بتانا کافی نہیں۔ اس سے زیادہ قوی تنبیہ کی ضرورت ہے، اس لئے فجر کی اذان میں اس جملہ کا اضافہ پسند کیا گیا۔ (اور اس جملہ کو کہنا بھول جائے اور اذان ختم کرنے سے پہلے یاد آجائے تو بہتر یہ ہے کہ یہ جملے کہہ کر اللہ اکبر اللہ اکبر، لا إلٰه إلا الله کو بھی دہرالے۔ اور اگر اذان ختم کرنے کے بعد دیر سے یاد آئے تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں فتاوی رحیمیہ ۴: ۲۹۷)

اقامت: اذان کہنے والے کا حق کیوں ہے؟

حدیث ——— ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیاد صدائی کو فجر میں اذان کہنے کا حکم دیا (حضرت بلال موجود نہیں تھے) انھوں نے اذان کہی۔ جب جماعت کا وقت ہوا تو حضرت بلال نے اقامت کہنے کا ارادہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''صُدائی آدمی نے اذان کہی ہے، اور جو اذان کہے وہی اقامت کہے (مشکوۃ حدیث ۶۴۸)

تشریح: اذان واقامت ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ اور ہر ایک کو ان کے کہنے کا حق ہے۔ حضرت مالک بن الحُویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: إذا سافرتما فأذّنا وأقيما (مشکوۃ حدیث ۶۸۲) اس حدیث میں جو تثنیہ ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ اذان واقامت کہنے کا حق ہر ایک کو ہے۔

اور اموالِ مباحہ کے سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جس کا قبضہ اس پر پہلے ہو جائے وہی اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی ضابطہ ہے کہ جو مباح مال لینے سے قریب ہو جائے، اخلاقاً دوسرے کو اس سے مزاحمت نہیں کرنی چاہئے۔ جیسے شادی میں چھوہارے لٹائے جائیں۔ اور کوئی چھوہارا کسی کی گود میں پڑے۔ اور وہ دیکھ لے اور لینے کا ارادہ کرے تو اب دوسرے کے لئے اس کا اٹھا لینا مناسب نہیں۔ کیونکہ پہلا اگرچہ اس کا مالک نہیں ہوا، مالک اس وقت ہوگا جب اس پر قبضہ کرلے یعنی ہاتھ میں لے لے یا سمیٹ لے، مگر وہ لینے سے قریب ہو گیا ہے، اس لئے دوسرے کو اس میں مزاحمت نہیں کرنی چاہئے۔

اسی ضابطہ سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ: ''آدمی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ ڈالے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۴۴) یعنی جب ایک

کی شادی کی بات چل پڑی تو اب دوسرے کو بیچ میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہئے۔ یہ بات اخلاق ومروّت کے خلاف ہے اور آپس میں رنجش کا باعث ہے۔

اسی طرح جب ایک شخص نے اذان کی ابتدا کی تو شریعت نے اقامت کہنے کا حق اسی کو دیدیا۔ کیونکہ وہ اقامت سے قریب ہوگیا۔ پس دوسرے کو اس میں مزاحمت نہیں کرنی چاہئے (البتہ اگر مؤذن غیر حاضر ہو یا اس کی صراحۃً یا دلالۃً اجازت سے دوسرا شخص اقامت کہے تو بلا کراہت جائز ہے)

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " فإن كانَ صلاةُ الصبح قلتَ: الصلاة خير من النوم، الصلاة خير من النوم"

أقول: لما كان الوقتُ وقتَ نوم وغفلة، وكانت الحاجةُ إلى التنبيه القوى شديدةً: اسْتُحِبَّ زيادةُ هذه اللفظة.

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " من أذَّنَ فهو يُقيم"

أقول: سِرُّهُ: أنه لما شَرَعَ في الأذان وجب على اخوانه ان لايزاحموه فيما أراد من المنافع المباحة، بمنزلة قوله عليه الصلاة والسلام: " لايَخطُبُ الرجلُ على خِطْبة أخيه"

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پس اگر صبح کی نماز ہو تو آپ کہیں: الصلاة خير من النوم، الصلاة خير من النوم''

میں کہتا ہوں: جب وہ وقت نینداور غفلت کا وقت تھا اور قوی تنبیہ کی سخت ضرورت تھی تو اس لفظ کا اضافہ پسند کیا گیا۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جس نے اذان کہی، پس وہ اقامت کہے'' میں کہتا ہوں: اس کا راز: یہ ہے کہ جب کسی نے اذان کی ابتدا کی تو ضروری ہوا اس کے (دینی) بھائیوں کے لئے کہ نہ مزاحمت کریں وہ اس سے اُن مباح فوائد میں جن کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ جیسے آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہ منگنی بھیجے آدمی اپنے بھائی کی منگنی پر''

☆　☆　☆

فضائلِ اذان کی بنیادیں

احادیث میں اذان دینے کے جو فضائل وارد ہوئے ہیں، ان کی دو بنیادیں ہیں:

پہلی بنیاد: اذان اسلام کا ایک امتیازی نشان ہے۔ اس کی وجہ سے ملک دارالاسلام محسوس ہوتا ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ نبی ﷺ صبح صادق کے بعد حملہ کیا کرتے تھے یعنی شب خون نہیں مارا کرتے تھے۔ اور صبح کے بعد بھی اذان

سنا کرتے تھے، اگر اذان کان میں پڑتی تو حملہ کرنے سے رک جاتے یعنی مسلمانوں کو علحدہ ہونے کا موقعہ دیتے۔ ورنہ حملہ کرتے (مشکوۃ حدیث ۶۶۲ باب فضل الاذان) پس جو کام اس درجہ اہمیت کا حامل ہو، اس کے فضائل ہونے ہی چاہئیں۔

دوسری بنیاد: اذان نبوت کا ایک اہم شعبہ ہے۔ نبوت کا کام لوگوں کو دین کی دعوت دینا ہے، اور اذان کے ذریعہ لوگوں کو نماز کی دعوت دی جاتی ہے، جو اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے اور عبادات میں مرکزی عبادت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند اور شیطان کو سب سے زیادہ ناپسند دین کے وہ کام ہیں جن کا فائدہ دوسروں تک پہنچتا ہے، اور جن سے اللہ کا بول بالا ہوتا ہے۔ ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ: ''ایک فقیہ (دین کا ماہر) شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۱۷ کتاب العلم) کیونکہ فقیہ لوگوں کو دین بتلاتا ہے اور دین پر گامزن کرتا ہے اور عبادت گذار اپنے فائدہ میں لگا ہوا ہے۔ اور شیطان کے لئے اول کو بچلانا آسان نہیں اور دوسرے کو چٹکی بجا کر رام کر سکتا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ: ''جب نماز کے لئے ندا دی جاتی ہے تو شیطان گوز کرتا ہوا پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے'' (یہ لمبی حدیث ہے اور متفق علیہ ہے مشکوۃ حدیث ۶۵۵) ان دونوں حدیثوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ خیر متعدی والے کام اور اُن کاموں کو کرنے والے اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہیں۔ اور شیطان کے لئے وہ سوہانِ روح ہیں۔

وفضائلُ الأذان: ترجع إلى:

[۱] أنه من شعائر الإسلام، وبه تصير الدارُ دارَ الإسلام، ولهذا كان النبي صلى الله عليه وسلم إن سمع الأذان أمسك، وإلا أغار.

[۲] وأنه شعبةٌ من شُعَبِ النبوة، لأنه حثٌّ على أعظم الأركان وأُمِّ القُرُباتِ، ولايَرْضَى الله ولايغضب الشيطانُ مثلَ مايكون في الخير المتعدِّي وإعلاءِ كلمةِ الحق، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "فقيهٌ واحدٌ أشدُّ على الشيطان من ألفِ عابد" وقوله صلى الله عليه وسلم: "إذا نودي للصلاة أدبر الشيطانُ، له ضُراطٌ"

ترجمہ: اور اذان کے فضائل: اس بات کی طرف لوٹتے ہیں کہ اذان شعائرِ اسلام میں سے ہے، اور اس کی وجہ سے ملک دار الاسلام ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے نبی ﷺ اگر اذان سنتے تو رُک جاتے، ورنہ حملہ کرتے۔ اور یہ کہ اذان نبوت کے شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ ابھارتا ہے سب سے بڑے رکن پر اور بنیادی عبادت پر۔ اور نہیں خوش ہوتے اللہ تعالیٰ اور نہیں غضبناک ہوتا شیطان ویسا جیسا وہ خیر متعدی سے اور حق کا بول بالا کرنے سے ہوتا ہے اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد الخ (ترجمہ گذر چکا)

مؤذن کی گردن فرازی اور آواز کی درازی تک بخشش اور گواہی کی وجہ

حدیث ——— حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اذان دینے والے: لوگوں میں سب سے زیادہ لمبی گردن والے ہوں گے'' (مشکوۃ حدیث ۶۵۴)

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مؤذن کی بخشش کی جاتی ہے اس کی آواز کی درازی تک'' یعنی وہ جس قدر آواز بلند کرتا ہے مغفرت بھی اسی قدر ہوتی ہے۔'' اور اس کے لئے ہر تر اور خشک چیز گواہی دیتی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۶۶۷)

حدیث ——— حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جہاں تک مؤذن کی آواز جنات، انسان اور ان کے علاوہ مخلوقات سنتی ہیں وہ سب قیامت کے دن اس کے لئے گواہی دیں گے'' (مشکوۃ حدیث ۶۵۶)

تشریح: مجازات کا مدار مشابہت پر ہے یعنی عمل اور اس کی حقیقت کے درمیان جو مناسبت ہے اور روح اور اس کے پیکر کے درمیان جو تعلق ہے اس کے لحاظ سے جزاؤ سزا ہوگی۔ پس اس ضابطہ سے ضروری ہے کہ مؤذن کی سر بلندی اس کی گردن اور اس کی آواز کی جہت سے ظاہر ہو، چنانچہ مؤذن آخرت میں بلند گردن ہوگا اور اس کی آواز کی درازی تک جن وانس اور دیگر مخلوقات گواہی دیں گی۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ رحمتِ خداوندی اسی قدر وسیع ہو جس قدر اس کی دین کی دعوت میں وسعت ہے۔ چنانچہ اس کی آواز کی درازی کے بقدر اس کی بخشش کی جائے گی۔

> [۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " المؤذنون أطولُ الناس أعناقًا" وقوله صلى الله عليه وسلم: " المؤذن يُغفَرُ له مَدَىٰ صوتِه، ويشهد له الجنُّ والإنس"
>
> أقول: أمر المجازاة مبنيٌّ على مناسبة المعاني بالصُّوَرِ، وعلاقةِ الأرواح بالأشباح، فوجب أن يَظْهر نباهةُ شأن المؤذن من جهةِ عنقِه وصوته، وتَتَّسِعُ رحمةُ اللهِ عليه، اتِّسَاعَ دعوتِه إلى الحق.

ترجمہ: (دو روایتیں ذکر فرمائی ہیں۔ ان میں سے دوسری روایت دو روایتیں ہیں) میں کہتا ہوں: مجازات کا معاملہ مبنی ہے معانی (حقائق) کی صورتوں کے ساتھ مناسبت اور ارواح کی پیکروں کے ساتھ تعلق پر (عطف تفسیری ہے۔ معانی، حقائق اور ارواح ایک ہی چیز ہیں اور صورتیں اور پیکر ایک چیز ہیں اور مناسبت اور تعلق تفنن ہے، ان کا مطلب بھی ایک ہے یعنی مجازات میں نہ عمل کی ظاہری صورت دیکھی جاتی ہے، نہ اس کی حقیقت، بلکہ دونوں میں جو مناسبت ہے اس کے لحاظ سے مجازات ہوتی ہے) پس ضروری ہوا کہ ظاہر ہو مؤذن کی شان کی بلندی اس کی گردن اور اس کی آواز کی جہت سے (یعنی گردن اور آواز کے ساتھ کوئی امتیازی معاملہ کیا جائے) اور کشادہ ہو اللہ کی مہربانی اس پر

اس کی حق کی طرف دعوت کے کشادہ ہونے کے بقدر۔

☆ ☆ ☆

سات سال اذان دینے پر پروانۂ براءت ملنے کی وجہ

حدیث ــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے سات سال بہ امید ثواب اذان دی اس کے لئے دوزخ سے خلاصی لکھی جائے گی'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۶۴[1])

تشریح: سات سال تک ثواب کی نیت سے اذان دینے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردیا جاتا ہے کہ اب دوزخ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عمل اس کے ایمان کی درستگی کو واضح کرنے والا ہے۔ اتنے لمبے عرصہ تک اذان دینے پر مداومت وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دیا ہو، اور پوری طرح منقاد ہوگیا ہو۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے دل میں رحمتِ خداوندی پہاڑ کے بقدر جگہ بنالیتی ہے۔ اور جو مہر الٰہی کا مورد بن جاتا ہے، دوزخ کی آگ اس کو نہیں چھوسکتی۔

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: "من أذَّنَ سبعَ سنين محتسبًا كُتب له براءةٌ من النار" وذلك: لأنه مُبَيِّنُ صِحَّةِ تصديقِه، لا تُتَصَوَّرُ المواظبةُ عليه لله إلا ممن أسلم وجْهَهُ لله، ولأنه أمكن من نفسه غاشيةً عظيمةً من الرحمة الإلٰهية.

(۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) اور یہ بات: اس لئے ہے کہ وہ (سات سال تک اذان دینا) اس کی ایمان کی درستگی کو واضح کرنے والا ہے: تصور میں نہیں آتا اتنی مدت تک اذان دینے پر مداومت کرنا اللہ کی خوشنودی کے لئے، مگر اس شخص سے جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لئے منقاد کرلیا ہو۔ اور اس لئے کہ اتنی مدت تک اذان دینا اس کے دل میں رحمتِ الٰہی کے ایک بڑے پردہ کو جما دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اخلاص سے اذان دینا اور نماز کا اہتمام کرنا مغفرت کا سبب ہے

حدیث ــــ حضرت عُقبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تعجب کرتے ہیں تیرے

[1] یہ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے اور نہایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں جابر جُعفی ہے جو متروک ہے۔ مگر فضائل کے باب میں ضعیف حدیث معتبر ہے البتہ بارہ سال اذان دینے کی جو فضیلت وجبت له الجنة آئی ہے۔ وہ روایت اس کی بہ نسبت ٹھیک ہے۔ یہ حدیث مشکوٰۃ (حدیث ۶۷۸) باب فضل الأذان کے آخر میں ہے ۱۲

پروردگار پہاڑ کی چوٹی میں بکریاں چرانے والے سے (یعنی لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے پہاڑ کی چوٹی پر جا بسا ہے) نماز کے لئے اذان دیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے۔ پس اللہ عز وجل فرماتے ہیں: میرے اس بندے کو دیکھو! اذان دیتا ہے اور نماز کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ مجھ سے ڈرتا ہے (یعنی میرے عذاب سے ڈر کر یہ کام کرتا ہے کیونکہ یہاں کسی کو دکھانے کا موقعہ نہیں ہے) یقیناً بخش دیا میں نے اس کو، اور داخل کیا میں نے اس کو جنت میں'' (مشکوۃ حدیث ٦٦٥)

تشریح: اللہ پاک کا ارشاد: ''وہ مجھ سے ڈرتا ہے'' اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں: ایک: یہ کہ جیسی نیت اور دل کا تقاضا ہوتا ہے ویسا عمل ہوتا ہے کیونکہ اعمال انہی تقاضوں سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ دوسری: یہ کہ اعمال ظاہری شکلیں ہیں، اور ان کی ارواح وہی دل کی نیتیں اور قلبی تقاضے ہیں ــــــ پس جب اس چرواہے نے اللہ کے ڈر سے اور اخلاص سے اذان دی اور نماز کا اہتمام کیا تو یہ چیز اس کی مغفرت کا سبب بن گئی۔

[٥] قولُ اللّٰه في راعي غنمٍ في رأس شَظِيَّةٍ: " انظروا إلى عبدي هذا! يؤذن ويقيم الصلاةَ، يخاف مني، قد غفرتُ له، وأدخلتُه الجنة"

قوله: " يخاف مني" دليل على أن الأعمال تُعتبر بدواعيها المنبعثة هي منها، وأن الأعمال أشباح، وتلك الدواعي أرواح لها؛ فكان خوفُه من الله وإخلاصُه له سببَ مغفرته.

ترجمہ: (٥) اللہ پاک کا ارشاد: پہاڑ کی چوٹی کے بالا حصہ میں بکریاں چرانے والے کے حق میں الخ اللہ کا ارشاد: ''وہ مجھ سے ڈرتا ہے'' اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال موازنہ کئے جائیں گے اُن کے اُن دواعی کے ساتھ جن سے وہ برانگیختہ ہونے والے ہیں۔ اور اس بات کی کہ اعمال پیکر ہائے محسوس ہیں۔ اور وہ دواعی ان کی ارواح ہیں۔ پس چرواہے کا اللہ سے ڈرنا اور اس کا خالص اللہ کے لئے عمل کرنا اس کی مغفرت کا سبب ہے۔

لغت: شَظِيَّة: قطعة مرتفعة في رأس الجبل: پہاڑ کی چوٹی کا بلند حصہ۔

☆ ☆ ☆

اذان کے جواب کی حکمت

اذان نماز کے لئے آنے کی لوگوں کو دعوت ہے۔ اس بلاوے پر مسجد پہنچنا اجابتِ فعلی ہے۔ اور منہ سے اذان کا جواب دینا اجابتِ قولی ہے اور دونوں ہی مطلوب ہیں۔ اول کی تاکید زیادہ ہے، کیونکہ اذان سے وہی اصل مقصود ہے۔ اور ثانی سنت ہے۔ دونوں طرح سے جواب دینے کا الگ الگ حدیثوں میں حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اذان کی دو حیثیتیں ہیں: ایک: یہ کہ وہ جماعت میں آنے کا بلاوا ہے دوسرے: یہ کہ وہ ایمان کی دعوت عام ہے۔ پہلی

حیثیت سے اذان سننے والے ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اذان سنتے ہی نماز میں شرکت کے لئے تیار ہوجائے۔ اور ایسے وقت مسجد میں پہنچ جائے کہ جماعت میں شریک ہوسکے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی بیان الجماعة کے عنوان سے آرہا ہے۔ یہاں شاہ صاحب نے اس اجابت کا تذکرہ نہیں کیا۔

اور دوسری حیثیت سے ہر مسلمان کو حکم ہے کہ جب وہ اذان سنے تو اپنے ایمان کی تجدید کرے، اور اذان کے ہر کلمہ کا جواب دے اور اپنے دل اور زبان سے ان باتوں کی تصدیق کرے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اذان دین کا شعار اور اس کی امتیازی علامت ہے۔ اور یہ شعار اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ پتہ چلے کہ قوم نے ہدایت الٰہی یعنی دین اسلام کی دعوت قبول کی یا نہیں؟ جو اذان سن کر نماز کے لئے آئے گا اس نے دعوت قبول کی اور جس نے کان بہرے کرلئے اس کے کان پھوٹے۔ غرض اجابتِ قولی اس تسلیم کو واضح کرتی ہے جس کا حصول لوگوں سے مطلوب ہے۔

حیعلتین کا جواب حوقلہ کیوں ہے؟

اذان کے جواب میں وہی کلمات دُہرائے جاتے ہیں جو مؤذن پکارتا ہے۔ مگر حَيَّ على الصلاة اور حَيَّ على الفلاح کا جواب لاحولَ ولاقوَّةَ إلا باللّٰه کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ مسلم شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی طریقہ مروی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۶۵۸)

اذان کے شروع اور آخر میں جو ذکر ہے (تکبیرات اور لاإلٰہ إلا اللّٰہ) جواب میں انہی کو دُہرانے کی حکمت تو ظاہر ہے کہ ذکر کے جواب میں ذکر ہی مناسب ہے۔ اور شہادتین کے جواب میں شہادتین اس لئے دُہرائی جاتی ہیں کہ تجدید ایمان ہوجائے، جو اس خاص موقعہ پر مطلوب ہے۔ اور حیعلتین کا جواب حوقلہ سے اس لئے دیا جاتا ہے کہ حوقلہ میں توحید کا مضمون ہے۔ اس میں طاقت ومقدرت اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کی گئی ہے یعنی ایک ہی خدا کے لئے حول وقوت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس خاص موقعہ پر یہ بات اس لئے یاد کی جاتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عبادت پر اقدام کرتے وقت واہمہ میں فخر چٹکی لینے لگے اور شیطان اس کی راہ مار دے۔ پس اس موقعہ پر اللہ کی قوت وطاقت کا تصور کرنا فخر وغرور کا علاج ہے۔ نماز کے لئے جانے والا یہ سوچ کر چلے کہ میں جو عبادت کرنے جارہا ہوں وہ مولی کی توفیق ہی سے ہے، میرا اس میں کچھ کمال نہیں۔

فائدہ: (۱) فجر کی اذان میں جب مؤذن الصلاة خير من النوم کہے تو اس کے جواب میں صَدَقْتَ وبَرَرْتَ کہنا چاہئے۔ یعنی تو نے سچ کہا کہ نماز نیند سے بہتر ہے اور تو نے نیکی کا کام کیا کہ مجھے آگاہ کیا۔ اس سلسلہ میں کوئی حدیث تو نظر سے نہیں گذری۔ مگر تصدیق کرنے کے لئے عربی میں یہی جملہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسند احمد (۱: ۴۰۵) میں اس

سلسلہ کی روایت بھی ہے غالباً اس سے یہ جواب تجویز کیا گیا ہے۔

فائدہ: (۲) ابوداؤد کی ایک نہایت ضعیف حدیث میں اقامت کا جواب بھی اذان کی طرح آیا ہے۔ اور قد قامت الصلاۃ کے جواب میں آپ ﷺ کا أقامها الله و أدامها (اللہ نماز کو قائم ودائم رکھیں) کہنا مروی ہے (ابوداؤد حدیث ۵۲۸، مشکوٰۃ حدیث ۶۷۰) پس کوئی اس پر عمل کرے اور اقامت کا بھی جواب دے تو دے سکتا ہے۔

جوابِ اذان کی فضیلت اور اس کی وجہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے آیا ہے کہ جو اذان کا جواب تلقین کئے ہوئے طریقہ کے مطابق دل سے یعنی اخلاص سے دے گا وہ جنت میں جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا جواب دینا فرمانبرداری اور اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کرنے کا پیکر محسوس ہے۔ دخولِ جنت اسی تسلیم وانقیاد کا صلہ ہے۔

اذان کے بعد دعا کی حکمت

بخاری شریف میں روایت ہے کہ جو شخص اذان سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے لئے وسیلہ، فضیلہ اور مقام محمود کی دعا کرے گا، قیامت کے دن وہ شفاعتِ محمدی کا حقدار ہوگا (مشکوٰۃ حدیث ۶۵۹)

اذان کے بعد یہ دعا اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ وہ اعتراف وانقیاد کا پیکر ہے اور زبانی اقرار مکنون جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے انسانیت کو اللہ کے دین سے آشنا کر کے لوگوں پر احسان عظیم فرمایا ہے اور محسن سے محبت کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ پس جب مؤمن اذان سننے کے بعد آنحضرت ﷺ کے لئے وسیلہ، فضیلہ اور مقام محمود کی دعا کرے گا تو اس سے آپؐ کے لائے ہوئے دین کو قبول کرنے کی اور دل میں آپؐ سے محبت کی حقیقت کامل طور پر متحقق ہوگی۔

[٦] ولما كان الأذانُ من شعائرِ الدين، جُعل لِيُعْرَفَ به قبولُ القوم للهدايةِ الإلٰهية: أمر بالإجابة، لتكون مُصَرِّحَةً بما أريد منهم.

فَيُجيب الذكرَ والشهادتين بهما، ويُجيب الدعوةَ بما فيه توحيدٌ في الحول والقوة، دفعًا لما عسى أن يُتَوَهَّمَ عند إقدامه على الطاعة من العُجْب.

من فعل ذلك خالصًا من قلبه دخل الجنة، لأنه شَبَحُ الانقياد وإسلامِ الوجه لله.

وأُمر بالدعاء للنبي صلى الله عليه وسلم تكميلاً لمعنى قبولِ دينه واختيارِ حُبِّه.

ترجمہ: (۶) جب اذان دین کے شعائر میں سے تھی۔ مقرر کیا گیا ہے یہ شعار تا کہ پہچانا جائے اس کے ذریعہ لوگوں کا ہدایت الٰہی کو قبول کرنا: تو حکم دیا گیا اذان کے جواب دینے کا تا کہ جواب واضح کرنے والا ہو اس چیز (قبولیت) کو جو

ان سے مراد لی گئی ہے (یعنی جس کا حصول لوگوں سے مطلوب ہے)

پس جواب دے ذکر کا اور شہادتین کا انہی دو کے ذریعہ۔ اور جواب دے (نماز کی) دعوت کا اس چیز کے ساتھ جس میں طاقت وقدرت میں توحید ہو (یعنی ایک ہی خدا کے لئے حول ومقدرت ثابت کی گئی ہو) ہٹانے کے لئے اس عُجب کو جو ہوسکتا ہے کہ اس کے واہمہ میں پیدا ہو عبادت پر پیش قدمی کرتے وقت۔

جس نے کیا یہ (یعنی مذکورہ طریقہ پر جواب دیا) اپنے دل کے اخلاص سے تو وہ جنت میں گیا، اس لئے کہ وہ (جواب دینا) فرمانبرداری اور اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کرنے کا پیکر محسوس ہے (یعنی وہ جنت میں گیا ہے اپنی فرمانبرداری اور اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کرنے کی وجہ سے۔ مگر یہ حکم اس کے پیکر محسوس پر لگایا گیا ہے)

اور حکم دیا گیا نبی ﷺ کے لئے دعا کرنے کا: آپؐ کے دین کو قبول کرنے کی اور آپؐ کی محبت کو پسند کرنے کی حقیقت کی تکمیل کرنے کے لئے (یعنی جس قدر دعا کرے گا، ان دو چیزوں کی ماہیت کامل سے کامل تر ہوتی جائے گی)

☆ ☆ ☆

اذان واقامت کے درمیان دعا قبول ہونے کا راز

حدیث ــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اذان واقامت کے درمیان دعا رد نہیں کی جاتی، پس دعا مانگو (رواہ ابوداؤد والترمذی واحمد، مشکوٰۃ حدیث ۶۷۱ اور آخری ٹکڑا مسند احمد ۳: ۱۵۵ و ۲۲۵ میں ہے)

تشریح: اذان واقامت کے درمیان کا وقت شمولِ رحمت کا وقت ہے یعنی اس وقت رحمت کا فیضان عام ہوتا ہے۔ پس جو حکم نبوی پر عمل کرے گا اور اس وقت دعا مانگے گا وہ محروم نہیں رہے گا۔

سحری اور تہجد کے لئے مستقل اذان

حدیث ــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بلال رات میں اذان دیں گے، پس کھاتے پیتے رہو تا آنکہ ابن اُمّ مکتوم اذان دیں'' حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: ''ابن ام مکتوم نابینا آدمی تھے۔ وہ جب تک یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ صبح ہوگئی! صبح ہوگئی!! اذان نہیں دیتے تھے'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۸۰)

تشریح: نبی ﷺ نے پہلے سحری کے وقت اذان دینے کے لئے حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو تجویز فرمایا تھا۔ یہ آنکھ کے نابینا صحابی تھے۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ حسب معمول فجر کے لئے اذان دیتے تھے، جس پر سحری بند کی جاتی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں کچھ کمزوری تھی۔ ایک بار انھوں نے صبح صادق سے پہلے اذان دے دی۔ چونکہ اس سے سحری کھانے والوں کو غلط فہمی کا اندیشہ تھا، اس لئے آپؐ نے انہی سے اعلان کرایا کہ:

''اذان قبل از وقت ہوگئی ہے'' ۔مگر جب یہ صورت پیش آئی تو احتیاط کے نقطۂ نظر سے آپ نے ڈیوٹیاں بدل دیں۔ حضرت بلال کو سحری کی اذان کے لئے مقرر کیا اور حضرت ابن ام مکتوم کو فجر کی اذان کے لئے تجویز فرمایا۔ کیونکہ ابن ام مکتوم نابینا تھے۔ وہ اس وقت اذان دیتے تھے جب لوگ ان سے کہتے کہ صبح ہوگئی! صبح ہوگئی!! اس لئے غلطی کا امکان کم تھا۔ غرض جب آپؐ نے ڈیوٹیاں تبدیل کیں اس وقت لوگوں کو یہ اطلاع دی تھی۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اس سلسلہ میں ایک مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ:

امیر المؤمنین کے لئے، اگر وہ ضرورت محسوس کرے، مستحب یہ ہے کہ سحری اور نماز فجر کے لئے دو الگ الگ مؤذن مقرر کرے، جن کی آوازیں لوگ پہچانتے ہوں۔ اور لوگوں کو اس کی اطلاع کردے کہ فلاں کی اذان سحری کے لئے ہوگی اور فلاں کی اذان فجر کے لئے۔ پہلی اذان پر تہجد میں مشغول حضرات گھر لوٹ جائیں تاکہ سحری کھائیں اور جو لوگ محوِ خواب ہیں وہ بیدار ہوجائیں۔ ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث (نمبر ۱۶۹۶) ہے کہ: ''بلال کی اذان ہرگز کسی کو سحری سے نہ روکے فإنه يُؤَذِّنُ لِيَنْتَبِهَ نائِمُكم، ولِيَرْجِعَ قائمُكم وہ اذان دیتے ہیں تاکہ سویا ہوا بیدار ہوجائے اور نماز میں کھڑا لوٹ جائے۔

نماز میں ہولے ہولے آئے، بھاگتا ہوا نہ آئے

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب نماز کھڑی کی جائے تو بھاگتے ہوئے نماز میں نہ آؤ، اور چلتے ہوئے آؤ، درانحالیکہ تم پر سکون ہو۔ پس جو پالو وہ پڑھ لو، اور جو فوت ہوجائے اس کو پورا کرلو'' (مشکوۃ حدیث ۶۸۶)

تشریح: جب نماز شروع ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس اندیشہ سے کہ نماز کا کچھ حصہ فوت نہ ہوجائے، بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ اس سے مسجد کا منظر خراب ہوتا ہے، اور کبھی سانس پھول جاتی ہے، اور نماز کا کچھ حصہ بے اطمینانی سے ادا ہوتا ہے۔ اور یہ عبادت میں ایک طرح کا تکلف بھی ہے۔ نبی ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ اس کا قلع قمع کیا ہے۔ ہاں لپک کر چلنے کی بعض علماء نے اجازت دی ہے۔

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم: " لايُرَدُّ الدعاءُ بين الأذان والإقامة"
أقول: ذلك لشمول الرحمة الإلٰهية، ووجودِ الانقياد من الداعي.
[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن بلالاً ينادي بليل، فكلوا واشربوا حتى ينادي ابنُ أم مكتوم"
أقول: يستحب للإمام إذا رأى الحاجة: أن يتخذ مؤذنَيْن، يعرفون أصواتهما، ويبين للناس: أن فلانًا ينادي بليلٍ، فكلوا واشربوا حتى ينادي فلان، ليكون الأولُ منهما للقائم والمتسحِّر

أن يرجعا، وللنائم أن يقوم إلى صلاته، ويتدارك ما فاته من سُحوره.

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا أُقيمت الصلاةُ فلا تأتوها تَسْعَوْنَ، وأتوها تمشون"

أقول: هذا إشارةٌ إلى ردِّ التعمُّقِ في التَنَسُّكِ.

ترجمہ: (۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: یہ بات (یعنی دعا کا ردّ نہ کیا جانا) رحمتِ الٰہی کے شمول (عموم) اور دعا کرنے والے کی طرف سے فرمانبرداری کے پائے جانے کی وجہ سے ہے۔

(۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: امام (امیر المؤمنین) کے لئے مستحب ہے، جب وہ ضرورت محسوس کرے کہ وہ دو مؤذن مقرر کرے، جن کی آوازوں کو لوگ پہچانتے ہوں۔ اور لوگوں پر یہ بات واضح کردے کہ فلاں رات میں اذان دے گا، پس تم کھاؤ پیو یہاں تک کہ فلاں اذان دے۔ تاکہ ان میں سے پہلی اذان ہو نماز پڑھنے والے کے لئے۔ اور سحری کھانے والے کے لئے کہ وہ دونوں گھر لوٹیں اور سونے والے کے لئے کہ وہ اٹھ کر اپنی نماز میں لگے اور تلافی کرے اس چیز کی جو فوت ہوگئی ہے اس کی سحری میں سے۔

(۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے عبادت میں تعمق (آخری حد تک جانے کی کوشش کرنے) کو رد کرنے کی طرف۔

☆　☆　☆

باب ـــــــ ۵

مساجد کا بیان

مسجد بنانے، اس سے لگے رہنے

اور

اس میں نماز کا انتظار کرنے کی فضیلت کی بنیادیں

مسجد بنانے، اس سے چپٹے رہنے اور اس میں ٹھہر کر نماز کا انتظار کرنے کی فضیلت چار وجوہ سے ہے:

پہلی وجہ: مسجد اسلام کا شعار (امتیازی علامت) ہے۔ حضرت عصام مُزنی فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک سَرِیّہ میں بھیجا تو فرمایا: ''جب تم کوئی مسجد دیکھو یا کسی مؤذن کی اذان سنو، تو کسی کو قتل نہ کرو'' (مشکوۃ حدیث ۳۹۳۵ کتاب الجہاد) یعنی مسلمانوں کو جدا ہونے کا موقعہ دو۔ اندھا دھند جنگ شروع نہ کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ

مسجد اور اذان اسلام کے شعائر ہیں۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہاں مسلمان بستے ہیں۔

دوسری وجہ: مسجد نماز کی جگہ، عبادت گزاروں کی قیام گاہ، رحمت کے نزول کی جگہ ہے۔ اور یک گونہ کعبہ کے مشابہ ہے۔ درج ذیل دو حدیثیں اس کی دلیل ہیں:

حدیث ——— حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو گھر سے باوضو کسی فرض نماز کے لئے نکلا تو اس کا ثواب احرام باندھنے والے حاجی کی طرح ہے۔ اور جو شخص چاشت کی نماز کے لئے نکلا، نہیں زحمت میں ڈالا اس کو مگر اسی (نماز چاشت) نے تو اس کا ثواب عمرہ کرنے والے کے ثواب کی طرح ہے'' (مشکوۃ حدیث ۷۲۸) اس حدیث سے مسجد کی گونہ کعبہ سے مشابہت ثابت ہوتی ہے۔ اور اس حدیث میں نسبت کا بیان ہے، مقدار کا بیان نہیں یعنی فرض نماز کے لئے مسجد جانا اور نفل نماز کے لئے جانا ایسا ہے جیسا حج اور عمرہ۔ ایک بڑی عبادت ہے دوسری اس سے چھوٹی۔ اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نوافل: اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد وغیرہ مسجد میں پڑھنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ باعثِ اجر ہے۔

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم بہشت کے باغوں کے پاس سے گذرو تو اس کے میوے کھاؤ'' دریافت کیا گیا: اے اللہ کے رسول! بہشت کے باغات کیا ہیں؟ فرمایا: ''مسجدیں'' (مشکوۃ حدیث ۷۲۹) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''ذکر کی مجلسیں''

تیسری وجہ: نماز کے اوقات میں کاروبار اور گھر والوں کو چھوڑ کر نماز ہی کے ارادے سے مسجد کا رخ کرنا دین میں اخلاص اور دل کی تھاہ میں انقیادِ خداوندی کا پتہ دیتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مسجد میں نماز ادا کرنے کا بڑا ثواب ہے۔ جو درج ذیل حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کی باجماعت نماز اس کی گھر کی اور اس کی دوکان کی نماز سے پچیس گنا بڑھائی جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی نے وضو کیا۔ پس اچھی طرح وضو کیا۔ پھر مسجد کے لئے نکلا، نہیں نکالا اس کو مگر نماز نے یعنی خاص نماز ہی کے لئے نکلا، تو وہ کوئی قدم نہیں چلتا مگر اس کا اس قدم کی وجہ سے ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے۔ اور اس سے اس قدم کی وجہ سے ایک برائی اتاری جاتی ہے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاتا ہے تو ملائکہ اس کیلئے برابر دعا میں لگے رہتے ہیں جب تک وہ اپنی نماز کی جگہ میں یعنی مسجد میں رہتا ہے (وہ یہ دعا کرتے ہیں:) الٰہی! اس بندہ پر رحمتِ خاص نازل فرما! الٰہی! اس پر مہربانی فرما! اور آدمی برابر نماز میں رہتا ہے جب تک وہ نماز کا انتظار کرتا رہتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۷۰۲) یہ آخری جز وقوع کے اعتبار سے مقدم ہے۔ اور حدیث کا حاصل یہ ہے کہ گھر میں اور دکان میں نماز پڑھنے سے وہ ذیلی فوائد حاصل نہیں ہوتے جو مسجد میں جا کر پڑھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

چوتھی وجہ: مسجد سے اللہ کا بول بالا ہوتا ہے اور اسلام کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ پس جو شخص مسجد بناتا ہے وہ اس عظیم

مقصد میں معاونت کرتا ہے۔اس لئے مساجد بنانے کی فضیلت آئی ہے۔

﴿ المساجد ﴾

فضلُ بناءِ المسجد وملازمته وانتظار الصلاة فيه ترجع إلى.

[۱] أنه من شعائر الإسلام، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا رأيتم مسجدًا، أو سمعتم مؤذنا، فلا تقتلوا أحدًا"

[۲] وأنه محلُّ الصلاة، ومعتكَفُ العابدين، ومطرَحُ الرحمة، ويُشْبِهُ الكعبة من وجه. وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" من خرج من بيته مُتطهِّرًا إلى صلاة مكتوبة، فأجره كأجر الحاجِّ المُحْرِم، ومن خرج إلى تسبيح الضُحى، لايُنْصِبُه إلا إياه، فأجره كأجر المعتمر" وقوله صلى الله عليه وسلم:" إذا مررتم برياض الجنة فارْتَعُوْا" قيل: وما رياض الجنة؟ قال:" المساجدُ"

[۳] وأن التوجه إليه في أوقات الصلاة، من بين شُغْلِهِ وأهله، لايقصد إلا الصلاة، مُعرِّفٌ لإخلاصه في دينه، وانقياده لربه من جذرِ قلبه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا توضأ، فأحسن الوضوءَ، ثم خرج إلى المسجد، لا يُخرجه إلا الصلاةُ، لم يخْطُ خُطوةً إلا رُفعت له بها درجةٌ، وحُطَّ عنه بها خطيئةٌ، فإذا صلّى، لم تزل الملائكة تصلّي عليه، مادام في مصلاه: اللهم صلِّ عليه! اللّهم ارْحمه! ولايزال أحدكم في صلاة ما انتظر الصلاة"

[٤] وأن بناءه إعانةٌ لإعلاء كلمة الحق.

ترجمہ. مساجد کا بیان مسجد بنانے کی اور اس سے چمٹے رہنے کی اور اس میں نماز کے انتظار کی فضیلت لوٹتی ہے:

(۱) اس طرف کہ مسجد اسلام کے شعائر میں سے ہے۔اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا)

(۲) اور اس طرف کہ مسجد نماز کی جگہ، عبادت گذاروں کے جاپڑنے کی جگہ، رحمت کے نزول کی جگہ ہے۔اور وہ من وجہ کعبہ کے مشابہ ہے (حدیثوں کا ترجمہ گذر گیا)

(۳) اور اس طرف کہ نماز کے اوقات میں مسجد کی طرف متوجہ ہونا، اپنے مشاغل اور اپنے گھر والوں کے درمیان میں سے نہیں ارادہ کرتا وہ مگر نماز کا، پہچنوانے والا ہے اس کے دین میں اس کے اخلاص کو، اور اس کے دل کی جڑ سے اس کے پروردگار کی تابعداری کو (اس کے بعد حدیث ہے۔جس کا ترجمہ گذر گیا)

(۴) اور اس طرف کہ مسجد کی تعمیر اللہ کا بول بالا کرنے میں تعاون ہے۔

☆ ☆ ☆

مسجد کی حاضری ملکیت کو بہیمیت پر غالب کرتی ہے

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو صبح یا شام مسجد گیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے بہشت کی مہمانی تیار کرتے ہیں۔ جب بھی وہ صبح یا شام جاتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۹۸)

تشریح: جنت کی مہمانی سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔ اور کلما غدا او راح (جب بھی وہ صبح یا شام جاتا ہے) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسجد کی ہر بار کی حاضری ملکیت کو بہیمیت پر غالب کرتی ہے[1] یعنی ہر حاضری میں بہیمیت کا زور ٹوٹتا ہے اور ملکیت ابھرتی ہے اور بندہ جہنم سے دور اور جنت سے قریب ہوتا ہے۔ غرض جس طرح تنکا تنکا مل کر چٹائی بنتی ہے اسی طرح یہ بار بار کی حاضری مل کر بہیمیت کو ملکیت کے قابو میں کرتی ہے۔

مسجد بنانے کا ثواب جنت کی حویلی!

حدیث ــــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ کے لئے کوئی مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک حویلی بناتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۹۷)

تشریح: بندہ جب اپنی گنجائش یا لوگوں کی حاجت کے مطابق مسجد بناتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق اس کے لئے جنت میں حویلی بناتے ہیں۔ اور مسجد بنانے کا خاص یہی بدلہ اس لئے ہے کہ جزاء جنسِ عمل سے ہوتی ہے۔ جیسے روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھلانے والے کو اللہ تعالیٰ حوض کوثر سے سیراب کرتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۶۵)

مسجد میں حدث کرنے سے نماز کے انتظار کا ثواب ختم ہو جاتا ہے

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**لایزال العبدُ فی صلاۃٍ ما کان فی المسجد، ینتظر الصلاۃ، مالم یُحدِثْ**: بندہ برابر نماز میں رہتا ہے جب تک وہ مسجد میں ٹھیر کر نماز کا انتظار کرتا ہے۔ جب تک وہ حدث نہ کردے یعنی ریح خارج نہ کرے (بخاری حدیث ۱۷۶)

تشریح: مسجد میں ٹھیر کر نماز کا انتظار کرنے والا حکماً نماز میں ہوتا ہے۔ یعنی اس کو بھی نماز پڑھنے والے کی طرح ثواب ملتا ہے لیکن اگر وہ مسجد میں ریح خارج کردے اور اس کی وضو نہ رہے تو انتظارِ نماز کا ثواب ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اب وہ حقیقۃً نماز پڑھنے کے قابل نہیں رہا، اس لئے حکماً بھی نہیں رہا۔

[۱] قولہ صلی اللہ علیہ وسلم: '' من غدا إلی المسجد أو رَاحَ، أعدَّ اللّٰہ لہ نُزُلَہ من الجنۃ، کلما غدا أو راح''

أقول: هذا إشارة إلى ان كل غُدوة ورَوحةٍ تُمَكِّنُ من انقياد البهيمية للملكية.
[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " من بنى لله مسجدًا بنى الله له بيتًا فى الجنة"
أقول: سِرُّه: أن المجازاةَ تكون بصورة العمل.
[۳] وإنما انقضى ثوابُ الانتظار بالحدث: لأنه لايبقى مُتَهَيِّئًا للصلاة.

ترجمہ:(۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (حدیث کا ترجمہ آچکا) میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہر صبح کا جانا اور شام کا جانا قادر بناتا ہے بہیمیت کی تابعداری کو ملکیت کے لئے (مَکَّن من الشیئ: قادر بنانا، غالب کرنا، بس میں کرنا)

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: اس کا راز: یہ ہے کہ مجازات بصورتِ عمل ہوتی ہے یعنی جو عمل کی صورت ہوتی ہے کبھی مجازات (بدلہ) کی بھی وہی صورت ہوتی ہے۔

(۳) اور حدث کرنے سے انتظارِ نماز کا ثواب اسی لئے ختم ہوتا ہے کہ اب وہ نماز کے لئے تیار کرنے والا باقی نہ رہا۔

☆ ☆ ☆

مسجد حرام اور مسجد نبوی میں ثواب کی زیادتی کی وجہ

متفق علیہ روایت ہے کہ: "مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا، دیگر مساجد میں ہزار نمازیں ادا کرنے سے بہتر ہے، مگر مسجد حرام مستثنیٰ ہے" یعنی اس میں اس سے بھی زیادہ ثواب ہے (مشکوٰۃ حدیث ۶۹۲) اور ایک نہایت ضعیف حدیث میں ہے کہ: "گھر میں نماز پڑھنے میں ایک نماز کا ثواب ہے اور محلّہ کی مسجد میں پچیس نمازوں کا، اور جامع مسجد میں پانچ سو نمازوں کا، اور مسجد اقصی میں پچاس ہزار نمازوں کا، اور مسجد نبوی میں (بھی) پچاس ہزار نمازوں کا اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے (رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ حدیث ۷۵۲) اسی طرح مسجد قبا میں بھی نماز کی فضیلت آئی ہے۔ اس فضیلت کی چند وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: خاص ان مساجد میں ایسے فرشتے مقرر کئے گئے ہیں جو ان میں عبادت کرنے والوں کو گھیر لیتے ہیں۔ اور جو وہاں عبادت کے لئے پہنچتا ہے اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں یعنی ملائکہ کے وجود اور ان کی دعاؤں کی برکت سے فضیلت پیدا ہوئی ہے۔

دوسری وجہ: ان مساجد کو عبادت سے آباد کرنا شعائر اللہ کی تعظیم اور اللہ کا بول بالا کرنا ہے یعنی تعظیم اور اعلاء سے جو نہایت بلند مقاصد ہیں یہ فضیلت پیدا ہوئی ہے۔

تیسری وجہ: ان مساجد میں نماز کے لئے پہنچنا اکابرینِ ملت کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا ارشاد ہے یا حدیث ہے کہ: عند ذكر الصالحين تَنْزِل الرحمةُ (کشف الخفاء ۲: ۹۱) نیک لوگوں کو یاد کیا جائے تو

رحمت خداوندی نازل ہوتی ہے۔(یہ تین وجوہ شاہ صاحب نے بیان کی ہیں آگے شارح کا اضافہ ہے)

چوتھی وجہ: ان مساجد میں ثواب کی زیادتی بانیوں کی برکت سے ہے۔ دنیا میں چار ہی مسجدیں ایسی ہیں جو بالیقین نبیوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ایک: مسجد حرام: جس کے بانی خلیل اللہ ہیں۔ دوسری: مسجد نبوی: اس کے بانی حبیب اللہ ہیں۔ تیسری: مسجد اقصی: جس کے بانی سلیمان علیہ السلام ہیں۔ چوتھی: مسجد قُبا: اس کے بانی بھی رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور بانی کی برکت بناء میں اور مبنی میں ایک مسلمہ حقیقت ہے۔اسی وجہ سے نیک لوگوں سے مکان وغیرہ کا لوگ افتتاح کراتے ہیں)

پانچویں وجہ: نمازیوں کی کثرت وقلت اور نمازیوں کے احوال کی عمدگی بھی فضیلت کا باعث ہے۔ مسجد حرام میں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے اور مسجد نبوی میں نمازی لاکھ دو لاکھ سے کم نہیں ہوتے اور مسجد اقصی میں بھی بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اور یہ سب نیک لوگ ہوتے ہیں یا ان کی اکثریت نیک لوگوں کی ہوتی ہے۔

چھٹی وجہ: کس مسجد میں کس پیغمبر نے کتنا عرصہ عبادت کی ہے اس کا بھی فضیلت میں اور اس کی کمی بیشی میں دخل ہے۔ مسجد حرام میں تمام نبیوں اور رسولوں نے عبادت کی ہے۔اس لئے اس کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اور مسجد نبوی میں دس سال تک مسلسل آنحضرت ﷺ نے قیام فرمایا ہے۔ اور وہاں شب و روز عبادت کی ہے، اس لئے اس کا دوسرا نمبر ہے۔ اور مسجد اقصی میں انبیائے بنی اسرائیل نے عبادتیں کی ہیں اس لئے اس کا بھی دوسرا نمبر (ضعیف روایت کے مطابق) یا تیسرا نمبر (ایک دوسری روایت کے مطابق) ہے۔ اور قُبا میں آنحضرت ﷺ نے چودہ دن قیام فرمایا ہے۔ پھر گاہے گاہے تشریف لے جاتے تھے۔ اس لئے اس کا چوتھا نمبر ہے۔ اور جامع مسجد کی فضیلت نمازیوں کی کثرت کی بنا پر ہے۔ اور محلہ کی مسجد کی فضیلت جماعت کی بنا پر ہے۔

[٤] وإنما فُضِّلَ مسجدُ النبي صلى الله عليه وسلم والمسجدُ الحرامُ بمضاعفة الأجر لمعانٍ:
منها: أن هنالك ملائكةً موكلةً بتلك المواضع يَحُفُّوْن بأهلها، ويدعون لمن حَلَّها.
ومنها: أن عمارةَ تلك المواضع من تعظيم شعائر الله، وإعلاءِ كلمة الله.
ومنها: أن الحلول بها مُذَكِّرٌ لحالِ أئمة الملة.

ترجمہ: (۴) اور برتری بخشی ہے مسجد نبوی اور مسجد حرام کو ثواب دوچند کرنے کے ذریعہ۔ چند وجوہ: ان میں سے: یہ ہے کہ وہاں ایسے فرشتے ہیں جو ان جگہوں میں مقرر کئے گئے ہیں: گھیر لیتے ہیں وہ ان کے لوگوں کو اور دعا کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے لئے جو وہاں پہنچتے ہیں۔ اور ان میں سے: یہ ہے کہ ان جگہوں کو آباد کرنا شعائر اللہ کی تعظیم اور اعلائے کلمۃ اللہ کے باب سے ہے۔ اور ان میں سے: یہ ہے کہ ان جگہوں میں پہنچنا یاد دلانے والا ہے ملت کے اکابر کی حالت کو۔

مساجدِ ثلاثہ کے علاوہ مقامات کے لئے سفر ممنوع ہونے کی وجہ

حدیث ——— حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کجاوے مضبوط نہ باندھے جائیں یعنی لمبا سفر نہ کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف: مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۶۹۳)

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کوہِ طور پر اس جگہ کی زیارت کے لئے گئے، جہاں موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔ واپسی میں ان کی ملاقات حضرت بَصرۃ بن ابی بَصرۃ غفاری رضی اللہ عنہ سے ہوئی[1]۔ حضرت بصرہ نے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا: طور سے۔ حضرت بصرہ نے کہا: اگر طور پر جانے سے پہلے آپ سے میری ملاقات ہوتی تو میں آپ کو نہ جانے دیتا۔ میں نے آنحضرت ﷺ سے یہ ارشاد سنا ہے الخ (پھر آپ نے مذکورہ حدیث سنائی موطا مالک ۱:۱۰۸ باب فی الساعۃ التی فی یوم الجمعۃ)

تشریح: زمانۂ جاہلیت میں لوگ ایسے مقامات کی زیارت اور برکتیں حاصل کرنے کے لئے جاتے تھے، جو ان کے گمان میں معظم ومحترم تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ دین کی تحریف اور بگاڑ کا سبب ہے۔ اس لئے نبی ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ فساد کا یہ دروازہ بند کردیا یعنی تین مساجد کے علاوہ حقیقی یا فرضی متبرک مقامات کے لئے سفر کرنا ممنوع قرار دیا، تاکہ غیر شعائر اللہ، شعائر کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اور یہ سلسلہ غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ نہ بن جائے۔

فائدہ: سفر کر کے اولیاء کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا مختلف فیہ ہے: بعض مباح کہتے ہیں بعض حرام۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اَشِعَّۃ اللمعات (۱:۳۲۴) میں لمبی گفتگو کے آخر میں اپنی رائے لکھی ہے[2]:

''مقصود بیانِ اہتمام شانِ ایں سہ بقعہ وسفر کردن بجانبِ آنہا است کہ متبرک ترین مقامات است یعنی اگر سفر کنند بایں سہ مسجد کنند، وبغیر آں گرانی مشقت کشیدن نمی کنند۔ نہ آنکہ سفر بجز ایں مواضع درست نباشد''

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ مقصدِ حدیث ان جگہوں کا مہتم بالشان ہونا بیان کرنا ہے۔ اور ان تین مساجد کی طرف سفر کر کے نماز پڑھنے کے لئے جانے کی ترغیب دی ہے کیونکہ یہ متبرک جگہیں ہیں۔ پس اگر لوگ سفر کی زحمت اٹھائیں تو ان تین مقامات میں حاضری دینے کے لئے اٹھائیں۔ ان کے علاوہ بارِ مشقت اٹھانا بے فائدہ ہے۔ اس

[1] حافظ صاحب نے تقریب میں لکھا ہے کہ باپ بیٹے دونوں صحابی ہیں۔ اور محفوظ یہ ہے کہ یہ واقعہ والد سے ملاقات کا ہے ۱۲

[2] محدث دہلوی رحمہ اللہ کی بات میں نے اس موقعہ پر اس لئے ذکر کی ہے کہ آپ کا زمانہ شاہ صاحب سے مقدم ہے آپ کی وفات ۱۰۵۲ھ میں ہوئی ہے یعنی شاہ صاحب کی ولادت سے ۶۲ سال پہلے محدث دہلوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ پس ان کی کتاب شاہ صاحب کے سامنے ضرور ہوگی۔ کیونکہ شاہ صاحب ان کے ہم وطن ہیں پس شاہ صاحب کی بات کا مَصَب (گرنے کی جگہ) آسانی سے متعین کیا جاسکے گا ۱۲

حدیث کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ان مقامات کے علاوہ کہیں اور سفر کر کے جانا جائز نہیں۔

مگر شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ خواہ اولیاء کی قبریں ہوں یا کسی ولی کا تکیہ (بزرگ کی رہنے اور عبادت کرنے کی جگہ) یا کوہِ طور: ممنوع ہونے میں سب برابر ہیں۔

وضاحت: کوہِ طور کی وہ جگہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا ہے یقیناً ایک متبرک جگہ ہے۔ سورۃ طٰہٰ آیت ۱۲ میں اس کو وادی مقدس (پاک میدان) اور سورۃ القصص آیت ۳۰ میں اس کو بقعہ مبارکہ (مبارک مقام) کہا گیا ہے۔ پھر بھی اس کی زیارت کے لئے سفر کرنے کو حضرت ابو بصرہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کی رو سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اور اولیاء کے مزارات پر حاضری کا جو سلسلہ اہل بدعت میں جاری ہے، اور اس کے پیچھے جو فاسد عقائد پنہاں ہیں، وہ یقیناً دین کی تحریف کا باعث ہیں۔ پس شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات چونکہ فہم صحابی سے مؤید ہے اس لئے وہی برحق ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کا جواز یا عدم جواز ایک مستقل مسئلہ ہے۔ مگر چونکہ قبر اطہر مسجد نبوی کے اندر ہے اس لئے دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے پس یہ محض ایک مسئلہ ہے، اس کا ثمرہ کچھ نہیں۔ کیونکہ کوئی بھی شخص محض قبر پاک کی زیارت کے لئے سفر نہیں کرتا۔ بہر حال علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کے لئے بھی سفر کرنے کو ناجائز کہتے ہیں۔ اور وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حدیث میں استثناء مُفرَّغ ہے یعنی اس کا مستثنیٰ منہ مذکور نہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ استثناء مفرغ میں مستثنیٰ منہ عام مقدر مانا جاتا ہے۔ پس تقدیر عبارت ہے: لاتُشَدُّ الرحالُ إلی مکان مّا ہوگی یعنی کسی جگہ کا سفر نہ کیا جائے۔ اور عموم میں قبر اطہر بھی شامل ہے پس اس کی زیارت کے لئے بھی سفر کرنا جائز نہیں ـــــ مگر تجارت وغیرہ مقاصد کے لئے دور دراز کے اسفار جائز ہیں۔ پھر اس قدر عام مستثنیٰ منہ کیسے مقدر مانا جا سکتا ہے؟ اور قاعدہ بیشک صحیح ہے، مگر اس کو سمجھا نہیں گیا۔ استثناء مفرغ میں جو مستثنیٰ منہ عام مقدر مانا جاتا ہے وہ مستثنیٰ کی جنس سے عام ہوتا ہے۔ اور مسند احمد (۶۴:۳) میں وہ مصرح بھی ہے۔ شَہر بن حَوشَب: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہی روایت بایں الفاظ روایت کرتے ہیں: لاینبغی للمَطِیِّ أن تُشَدَّ رحالُہ إلی مسجدٍ یبتغی فیہ الصلاۃ غیر المسجد الحرام والمسجد الأقصی ومسجدی ھذا۔ اور شَہر بن حوشب میں اگرچہ کلام ہے، مگر مجمع الزوائد (۴:۳) میں صراحت ہے کہ ان کی حدیث حَسَن کے درجہ کی ہوتی ہے۔

اور جمہور امت یہ کہتے ہیں کہ قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ اہم عبادتوں میں سے اور بڑا کار ثواب ہے۔ جمہور امت نے تعامل امت سے استدلال کیا ہے کہ امت کا اجماع ہے: ہر حاجی مکہ کا ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھوڑ کر چار سو میل کا طویل سفر کر کے جو مدینہ جاتا ہے وہ صرف مسجد نبوی کی زیارت کے لئے نہیں جاتا، بلکہ قبر اطہر پر حاضری بھی مقصود ہوتی ہے۔ راقم کی ناقص رائے میں جمہور کی رائے ہی صحیح ہے۔ اور قبر اطہر کا معاملہ ایک استثنائی

صورت ہے جیسے گھر میں تدفین حدیث کی رو سے ممنوع ہے مگر آپ کی تدفین اس سے مستثنیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

[٥] قوله صلى الله عليه وسلم: "لاتُشَدُّ الرحال إلا إلى ثلاثة مساجدَ: المسجدِ الحرام، والمسجد الأقصىٰ، ومسجدى هذا"

أقول: كان أهل الجاهلية يقصُدون مواضِعَ معظَّمةً بزعمهم، يزورونها ويتبركون بها، وفيه من التحريف والفساد مالايخفىٰ، فسدَّ النبيُّ صلى الله عليه وسلم الفسادَ، لئلا يلتحق غير الشعائر بالشعائر، ولئلا يصيرَ ذريعةً لعبادة غير الله والحقُّ عندى: أن القبر ومحلَّ عبادةِ وليٍّ من أولياءِ الله والطورَ كلُّ ذلك سواءٌ فى النهى، والله أعلم.

ترجمہ:(۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ آ گیا) میں کہتا ہوں: زمانۂ جاہلیت کے لوگ ایسی جگہوں کا قصد کرتے تھے، جو ان کے گمان میں معظَّم تھیں۔ وہ ان کی زیارت کرتے تھے اور ان سے برکتیں حاصل کرتے تھے۔ اور اس میں دین کی وہ تحریف اور بگاڑ ہے جو مخفی نہیں ہے۔ پس نبی ﷺ نے اس فساد کو بند کیا، تاکہ غیر شعائر، شعائر کے ساتھ مل نہ جائیں، اور تاکہ نہ ہو جائے وہ غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ۔ اور برحق بات: میرے نزدیک یہ ہے کہ قبر اور اولیاء اللہ میں سے کسی ولی کی عبادت کی جگہ اور کوہ طور سب کے سب ممنوع ہونے میں برابر ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

فصل

آدابِ مسجد کی بنیادیں

آداب: ادب کی جمع ہے۔ ادب کے معنی ہیں: پسندیدہ کام۔ روایات میں مسجد کے جو آداب آئے ہیں ان کی تین بنیادیں ہیں:

پہلی بنیاد: مسجد کی تعظیم ضروری ہے۔ پس جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو اس کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ وہ کسی محترم جگہ میں داخل ہو رہا ہے۔ اس احساس کو بیدار کرنے کے لئے مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا تلقین کی گئی ہے: ''الٰہی! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے!'' پھر مسجد میں پہنچ کر اپنے خیالات جمع کر لینے چاہئیں۔ اب نفس پراگندہ خیالات میں بے لگام نہیں رہنا چاہئے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم دیا، تاکہ ذہن ایک طرف ہو جائے۔

دوسری بنیاد: مسجد کو کوڑے کرکٹ، گرد وغبار، میل کچیل اور قابل نفرت چیزوں سے صاف رکھنا چاہئے۔ اس سلسلہ کی تین حدیثیں ملاحظہ فرمائیں:

حدیث ــــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (مدینہ کے) محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا۔ اور یہ حکم دیا کہ وہ صاف اور خوشبودار رکھی جائیں (مشکوۃ حدیث ۷۱۷)

حدیث ــــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے ثواب میرے روبرو پیش کئے گئے۔ یہاں تک کہ وہ تنکا جسے آدمی مسجد سے نکالے'' یعنی اس کا ثواب بھی مجھے دکھلایا گیا (مشکوۃ حدیث ۷۲۰) اس روایت سے معلوم ہوا کہ کوڑا کرکٹ مسجد سے نکال دینا چاہئے، یہ کار ثواب ہے۔

حدیث ــــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ اور اس کا کفارہ اس کو دفن کردینا یعنی صاف کردینا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۷۰۸)

تیسری بنیاد: مسجد میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے جس سے عبادت میں مشغول لوگوں کے دل پراگندہ ہوں اور مسجد میں بازاروں جیسا شور بھی نہیں کرنا چاہئے۔ پہلی بات کی دلیل درج ذیل حدیث ہے۔ اور دوسری بات کی دلیل اس لئے ذکر نہیں کی کہ حدیث کے الفاظ بھی بعینہ یہی ہیں (مشکوۃ حدیث ۱۰۸۹)

حدیث ــــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص تیر لے کر مسجد میں گذرا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا: ''اس کا پیکان پکڑلے'' (بخاری حدیث ۷۰۷۳) تاکہ کسی کو لگ نہ جائے۔ ظاہر ہے کہ کوئی کھلا چاقو، تیر کھول سونت کر مسجد میں سے گذرے گا تو ہر عبادت میں مشغول آدمی پریشان ہوگا۔ وہ سوچے گا کہ کہیں اُسے لگ نہ جائے۔

وآداب المسجد: ترجع إلى معانٍ:

منها: تعظيمُ المسجد، ومؤاخذةُ نفسِه أن يَجمع الخاطِرَ ولايسترسل عند دخوله، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا دخل أحدكم المسجد فليقل: " اللّهم افتح لي أبوابَ رحمتك" و قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا دخل أحدكم المسجدَ فليركع ركعتين، قبل أن يجلس"

ومنها: تنظيفُه مما يُتقذَّرُ ويُتنفَّرُ منه، وهو قولُ الراوي: " أَمَرَ - يعني النبي صلى الله عليه وسلم - ببناء المسجد، وأن يُنَظَّفَ ويُطَيَّبَ" وقوله صلى الله عليه وسلم: " عُرِضَتْ عليَّ أجورُ أمتي، حتى القَذَاةَ،يخرجها الرجل من المسجد" وقوله صلى الله عليه وسلم: " البزاقُ في المسجد خطيئةٌ،وكفارتُها دفنُها"

ومنها: الاحترازُ عن تشويش العُبَّادِ وهَيْشَاتِ الأسواق، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "أَمسِكْ بِنِصَالِها"

ترجمہ: اور مسجد کے آداب: چند باتوں کی طرف لوٹتے ہیں۔ ان میں سے: مسجد کی تعظیم ہے اور اپنے نفس کو پکڑنا ہے کہ وہ دل کو جمع کرے، اور بہتا نہ چلا جائے مسجد میں داخل ہونے کے وقت (اس کے بعد دو حدیثیں ہیں) اور ان میں سے: مسجد کو صاف رکھنا ہے اس چیز سے جو میلی ہونے کی وجہ سے مکروہ سمجھی جاتی ہے اور جس سے نفرت کی جاتی ہے (اس کے بعد تین حدیثیں ہیں) اور ان میں سے: باز رہنا ہے عبادت کرنے والوں کے دلوں کو پراگندہ کرنے سے اور بازاروں جیسا شور کرنے سے (اس کے بعد حدیث کا ایک ٹکڑا ہے)

تصحیح: قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا دخل أحدكم المسجد فليقل: اللهم افتح لي أبواب رحمتك" یہ عبارت مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے مخطوطہ کراچی و پٹنہ سے بڑھائی ہے۔

☆ ☆ ☆

چند امور جو مسجد میں ممنوع ہیں

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو سنے کسی کو کہ وہ کسی گم شدہ چیز کا مسجد میں اعلان کر رہا ہے، تو چاہئے کہ کہے: ''نہ پھیرے اللہ تعالیٰ اس کو تجھ پر'' (اور اردو محاورہ میں کہے: ''خدا کرے نہ ملے!) پس بیشک مساجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں'' (مشکوۃ حدیث ۷۰۶)

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دیکھو تم اس شخص کو جو بیچتا ہے یا خریدتا ہے مسجد میں، تو کہو: ''اللہ تعالیٰ تیرے سودے کو سودمند نہ بنائیں!'' (مشکوۃ حدیث ۷۳۲)

حدیث ——— حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع کیا اس سے کہ قصاص لیا جائے مسجد میں یعنی قاتل کو قصاصاً مسجد میں قتل نہ کیا جائے اور اس بات سے کہ مسجد میں اشعار پڑھے جائیں اور اس بات سے کہ مسجد میں سزائیں جاری کی جائیں (مشکوۃ حدیث ۷۳۴ اس حدیث میں أن يُنْشَد فيه الأشعارُ ہے جس کا ترجمہ کیا گیا اور حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت میں عن تناشُد الأشعارِ في المسجد ہے، جس کا ترجمہ: مسجد میں بیت بازی سے منع کیا۔ مشکوۃ حدیث ۷۳۲)

مذکورہ احادیث کی رو سے مساجد میں چار باتیں ممنوع ہیں:

(۱) ——— مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان ممنوع ہونے کی دو وجہیں ہیں: ایک: یہ کہ اس سے مسجد میں شور و شغب ہوگا۔ اور شور نمازیوں کو اور معتکفین کو پریشان کرے گا۔ دوسری وجہ: حدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ مسجد اس مقصد سے نہیں بنائی گئی۔ مسجد ذکر الٰہی اور نماز ہی کے لئے بنائی گئی ہے (پس ہر وہ کام مسجد میں ممنوع ہے جو مسجد کے موضوع

کے خلاف ہے)

فائدہ: اگر کوئی مسجد میں اعلان کرے تو مستحب یہ ہے کہ اعلان کرنے والے کے مقصد کے خلاف دعا کرے، تاکہ وہ ناراض ہو۔ اور اپنی حرکت سے باز آئے (مگر دل سے چاہے کہ اس کی چیز اس کو مل جائے)

(۲) ——— اور مسجد میں خرید وفروخت ممنوع ہونے کی دو وجہیں ہیں: ایک: یہ کہ اس سے مسجد مارکیٹ بن جائے گی۔ اور جب لوگ مسجد میں کاروبار کرنے لگیں گے تو مسجد کا احترام ختم ہو جائے گا۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ اس سے بھی نمازیوں کو اور معتکفین کو پریشانی لاحق ہوگی۔

(۳) ——— اور ایک دوسرے کو اشعار سنانا دو وجہ سے ممنوع ہے: ایک: یہ کہ اس سے مسجد میں شور وشغب ہوگا۔ دوسری: یہ کہ بیت بازی کرنے والے خود بھی ذکر سے اعراض کر رہے ہیں، اور دوسروں کو بھی اعراض کی دعوت دے رہے ہیں کہ ذکر ونماز کو رہنے دو، آؤ ہماری شاعری سنو!

فائدہ: مسجد میں ایک شخص کا زور سے اشعار پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ اس سے بھی شور ہوتا ہے اور اس میں بھی ذکر سے اعراض ہے اور اعراض کی دعوت ہے۔ ہاں کوئی حمد یا نعت پڑھے جس میں رسول اللہ ﷺ کی منقبت ہوتی ہے (یا تقریر میں اصلاحی شعر یا اشعار پڑھے) یا جب کفار سے معرکہ آرائی جاری ہو، اس وقت ایسے اشعار پڑھے جن سے کفار کو غیظ آئے تو یہ جائز ہے، کیونکہ یہ ایک شرعی مقصد ہے۔ پس یہ ممانعت سے مستثنیٰ ہے اور تخصیص کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں بلند جگہ پر کھڑے ہو کر ایسے اشعار سناتے تھے جن میں آنحضرت ﷺ کی منقبت، اسلام اور مسلمانوں کی تعریف اور کفار کی ہجو ہوتی تھی۔ اور آپ خود سماعت فرماتے تھے اور دعا دیتے تھے کہ: ''الٰہی! حسان کی جبرئیل کے ذریعہ مدد فرما!'' (بخاری حدیث ۴۵۳)

(۴) ——— اور مسجد میں قصاص لینا اور سزائیں جاری کرنا دو وجہ سے ممنوع ہے: ایک: یہ کہ ممکن ہے مسجد خون پیشاب وغیرہ سے پلید ہو جائے یا مجرم جزع فزع کرے، روئے دھوئے اور شور مچائے۔ دوسری وجہ: مسجد والوں کی پریشانی ہے عبادت گذاروں کے کاموں میں اس سے خلل پڑے گا۔

ملحوظہ: پہلے قاضی مسجد میں بیٹھ کر مقدمات فیصل کیا کرتے تھے۔ پس حدود وقصاص کے فیصلے تو مسجد میں ہو سکتے ہیں مگر ان پر عمل درآمد مسجد میں جائز نہیں۔ سزائیں مسجد سے باہر جاری کی جائیں گی۔

فائدہ: یہاں کوئی خیال کر سکتا ہے کہ معتکفین کا بار بار ذکر آ رہا ہے، حالانکہ اعتکاف کرنے والے تو صرف رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتے ہیں! تو یہ دورِ زوال کی صورت حال ہے۔ دورِ عروج میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ اس وقت رات دن مساجد میں مسجد والے اعمال جاری رہتے تھے۔ دینی تعلیم اور وعظ ونصیحت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ لوگ ہر وقت نوافل میں مشغول رہتے تھے اور کوئی نہ کوئی اعتکاف میں بھی ہوتا تھا۔ اب دورِ زوال میں رات دن میں

صرف دو گھنٹے مسجد کھلتی ہے، پھر تالا پڑ جاتا ہے فالی اللہ المشتکی!

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " من سمع رجلاً يَنْشُدُ ضالةً في المسجد، فَلْيقل: لاردَّها اللّٰه عليك! فإن المساجد لم تُبْنَ لهذا" قوله: " إذا رأيتم من يبيع أو يبتاع في المسجد، فقولوا: لا أَرْبَحَ اللّٰهُ تجارتَك!" ونهى عن تناشد الأشعار في المسجد، وأن يُسْتَقادَ في المسجد، وأن تُقَامَ فيه الحدودُ.

أقول:

[الف] أما نَشْدُ الضالَّةِ، أى رفع الصوت بطلبها: فلأنه صَخَبٌ ولَغَطٌ يُشَوِّشُ على المصلين والمعتكفين؛ ويستحبُّ ان يُنكر عليه بالدعاء بخلافِ مايطلبه، إرغاماً له؛ وعَلَّلَهُ النبيُّ صلى الله عليه وسلم بأن المساجد لم تُبْنَ لهذا، أى إنما بُنيت للذكر والصلاة.

[ب] وأما الشراءُ والبيع: فلئلا يصير المسجدُ سوقًا يتعاملُ فيه الناسُ، فتذهبُ حرمتُه، ويحصل التشويشُ على المصلين والمعتكفين.

[ج] وأما تناشُدُ الأشعار: فلما ذكرنا، ولأن فيه إعراضاً عن الذكر، وحثًّا على الأعراض عنه.

[د] وأما القَوَدُ والحدود: فلأنها مَظِنَّةٌ للألواث والجَزَع والبكاء والصَّخَبِ والتشويش على أهل المسجد.

ويُخَصُّ من الأشعار ماكان فيه الذكرُ ومدحُ النبى صلى الله عليه وسلم وغيظُ الكفار، لأنه غرض شرعى، وهو قوله صلى الله عليه وسلم لحَسَّانٍ: " اللّٰهم أيِّدْه بروح القدس!"

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (تین حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔ جن کا ترجمہ آگیا)

میں کہتا ہوں: (الف) رہا گم شدہ چیز کا ڈھونڈنا یعنی اس کی طلب میں آواز بلند کرنا۔ پس اس لئے کہ وہ شور وغل مچانا ہے، جو نمازیوں اور معتکفین کو پریشان کرے گا۔ اور مستحب ہے کہ نکیر کی جائے اس پر اس مقصد کے برخلاف دعا کر کے جس کو وہ چاہ رہا ہے، اس کو ناراض کرنے کے لئے (یعنی حقیقت میں بددعا مقصود نہ ہو) اور وجہ بیان کی ہے اس کی نبی ﷺ نے کہ مسجدیں اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں یعنی وہ ذکر اور نماز ہی کے لئے بنائی گئی ہیں۔

(ب) اور رہی خرید وفروخت: پس اس لئے کہ مسجد ایسا بازار نہ بن جائے جس میں لوگ کاروبار کرنے لگیں، پس اس کا احترام ختم ہوجائے اور نمازیوں اور معتکفین کو پریشانی بھی لاحق ہوگی۔

(ج) اور رہا ایک دوسرے کو اشعار سنانا: پس اس کی ممانعت کی ایک وجہ تو وہ ہے جو ہم نے ذکر کی۔ اور اس لئے کہ

اس میں ذکر سے روگردانی ہے اور ذکر سے روگردانی پر ابھارتا ہے۔

(د) اور رہا قصاص اور سزائیں: پس اس لئے کہ پلیدیوں اور گھبراہٹ اور رونے اور شور مچانے اور اہل مسجد کی پریشانی کی احتمالی جگہ ہیں۔

اور خاص کیا گیا ہے اشعار میں سے ان کو جن میں ذکر الٰہی اور آنحضور ﷺ کی منقبت اور کفار کو غیظ دلاتا ہو۔ اس لئے کہ وہ شرعی مقصد ہے۔ اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے حسانؓ کے حق میں: ''اے اللہ! تو قوی فرما اس کو پاکیزہ روح (جبرئیل) کے ذریعہ!''

لغات: نَشَدَ الضالّةَ: گم شدہ کو ڈھونڈھنا، پوچھ پاچھ کرنا۔ یہی معنی أَنْشَدَ (باب افعال) کے ہیں اور تَناشَدَ الأشعارَ (باب تفاعل) کے معنی ہیں: ایک دوسرے کے سامنے شعر پڑھنا۔

تصحیح: لاردھا اللہ علیك اصل میں لا ردَّ اللہ إلیك تھا۔ تصحیح مشکوٰۃ شریف سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

جنبی اور حائضہ مسجد میں کیوں داخل نہیں ہوسکتے؟

حدیث —— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں مسجد کو حلال نہیں کرتا کسی بھی حائضہ کے لئے، اور نہ کسی بھی جنبی کے لئے'' (ابوداؤد حدیث ۲۳۲)

تشریح: جنبی اور حائضہ کو مسجد میں جانے کی ممانعت دو وجہ سے ہے: ایک: اس وجہ سے کہ یہ بات مسجد کی تعظیم کے خلاف ہے۔ مسجد کی سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ آدمی پاکی کے ساتھ ہی اس کے قریب جائے۔ اور بے وضو جانا اس لئے منع نہیں کہ ایسا حکم دینے میں بڑی تنگی تھی۔ اور جنبی اور حائضہ کے لئے کوئی تنگی نہیں۔ اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ مسجد صرف نماز کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور حائضہ اور جنبی کا نماز سے دور کا بھی واسطہ نہیں، فی الحال دونوں نماز کے نااہل ہیں۔ پھر وہ مسجد میں کیوں جائیں؟!

بدبودار چیزوں سے مسجد کو بچانے کی حکمت

حدیث —— حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اس بدبودار درخت میں سے کھایا، پس وہ ہرگز ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔ پس بیشک فرشتے تکلیف اٹھاتے ہیں اس چیز سے جس سے انسان تکلیف اٹھاتے ہیں'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۷۰۷)

تشریح: اس بدبودار درخت سے مراد یا تو پیاز ہے یا لہسن۔ اور انہی کے حکم میں ہر بدبودار چیز ہے۔ اور فرشتوں

کے تکلیف اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ عمدہ اخلاق کو اور ستھری چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور برے اخلاق اور گندی اور بدبودار چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

فائدہ: اس حدیث سے بدبودار چیزوں سے مسجد کو بچانے کی یہ حکمت واضح ہوئی کہ بدبودار چیزوں کو مسجد میں لے جانا یا خود بدبودار ہوکر مسجد میں جانا جہاں احترام مسجد کے منافی ہے، وہاں اللہ کے نیک بندوں (فرشتوں اور نمازیوں) کو تکلیف پہنچانا بھی ہے۔ اور ایذائے مسلم حرام ہے پس اس سے احتراز ضروری ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "إني لا أُحل المسجد لحائض ولا جنب"

أقول: السببُ في ذلك تعظيمُ المسجد، فإن أعظم التعظيم: أن لايقْرَبه إنسانٌ إلا بطهارة؛ وكان في منع دخول المحدث حرجٌ عظيم، ولا حرج في الجنب والحائض، ولأنهما أبعد الناس عن الصلاة، والمسجدُ إنما بُنى لها.

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: "من أكل من هذه الشجرة الْمُنْتِنَة فلايقربنّ مسجدنا، فإن الملائكةَ تتأذّى مما يتأذى منه الإنسُ"

أقول: هى البصلُ أو الثوم، وفي معناه كلُّ مُنْتِن؛ ومعنى تتأذى: تَكْرَهُ وتتنفر، لأنه تُحبّ محاسنَ الأخلاق والطيبات، وتكرهُ أضدادها.

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: اس نہی کا سبب مسجد کی تعظیم ہے۔ پس بیشک سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ نہ نزدیک جائے مسجد سے کوئی انسان مگر پاکی کے ساتھ۔ اور بے وضو کو داخل ہونے سے منع کرنے میں بڑی تنگی تھی، اور کوئی تنگی نہیں جنبی اور حائضہ (کو منع کرنے) میں۔ اور اس لئے کہ وہ دونوں لوگوں میں سب سے زیادہ دور ہیں نماز سے۔ اور مسجد بنائی گئی ہے صرف نماز کے لئے۔

(۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد (ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: بدبودار درخت پیاز ہے یا لہسن۔ اور اس کے معنی میں ہے ہر بدبودار چیز۔ اور ''تکلیف اٹھانے'' کے معنی ہیں ناپسند کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ فرشتے عمدہ اخلاق اور ستھری چیزوں کو دوست رکھتے ہیں اور ان کی اضداد کو ناپسند کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مسجد میں داخلے کے وقت دعا میں رحمت اور نکلتے وقت فضل کی تخصیص کی وجہ

حدیث ــــــ حضرت ابواُسید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی

شخص مسجد میں داخل ہوتو چاہئے کہ کہے: ''اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے!'' اور جب باہر نکلے تو چاہئے کہ کہے: ''اے اللہ! بیشک میں آپ سے آپ کا فضل چاہتا ہوں'' (مشکوۃ حدیث ۷۰۳)

تشریح: مسجد میں جاتے وقت رحمت اور باہر آتے وقت فضل طلب کرنے کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں رحمت کا لفظ روحانی اور اخروی نعمتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ روحانی اور اخروی نعمتیں: جیسے ولایت (قرب خداوندی) نبوت، جنت اور دیدار الٰہی وغیرہ۔ سورۃ الزخرف آیت ۳۲ ہے: ''تیرے رب کی رحمت اس (دنیوی مال ومنال) سے بہتر ہے، جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں'' سورۂ یونس آیت ۵۸ میں بھی یہ مضمون ہے۔ اور فضل کا اطلاق دنیوی نعمتوں پر کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۸ ہے: ''تم پر اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) اس معاش کو تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے'' اور سورۃ الجمعہ آیت ۱۰ ہے: ''پھر جب تم نماز جمعہ پوری کرلو تو زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو'' ـــــ اور مسجد اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے ہی کی جگہ ہے اس لئے فتح باب رحمت کی دعا تعلیم فرمائی۔ اور مسجد سے نکل کر عام طور پر آدمی معاش کی تلاش میں لگتا ہے۔ اس لئے فضل خداوندی یعنی دنیوی نعمتیں طلب کرنے کی تلقین فرمائی۔

تحیۃ المسجد کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو چاہئے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھے'' (مشکوۃ حدیث ۷۰۴)

تشریح: مستحب یہ ہے کہ جب آدمی مسجد میں پہنچے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھے۔ یہ نماز تین وجوہ سے مقرر کی گئی ہے:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ مسجد میں پہنچ کر بھی ـــــ جو کہ خاص نماز ہی کے لئے تیار کی گئی ہے ـــــ نماز میں مشغول نہ ہونا محرومی اور افسوس کی بات ہے۔

دوسری وجہ: مسجد میں آدمی فرض نماز ادا کرنے کے لئے پہنچتا ہے۔ اور تحیۃ المسجد ایک محسوس چیز کے ذریعہ فرض کی رغبت متعین کرنے کے لئے مشروع کی گئی ہے۔ یعنی دو رکعتیں پڑھنے سے فرض کی رغبت محسوس ہو کر سامنے آجائے گی ـــــ اس کی نظیر[1]: وہ سننِ مؤکدہ ہیں جو فرائض سے پہلے رکھے گئے ہیں۔ یہ صرف فجر اور ظہر میں ہیں۔ کیونکہ یہ دو نمازیں نیند سے بیدار ہو کر پڑھی جاتی ہیں، جو سستی اور کاہلی کا وقت ہے۔ اور اس حالت میں فرض پڑھنا منافقوں کا شیوہ ہے۔ اور جب آدمی سنتیں ادا کرے گا تو طبیعت میں نشاط پیدا ہوگا اور سستی دور ہوگی اور آدمی رغبت کے ساتھ فرض ادا

---

[1] نظیر اور مثال میں یہ فرق ہے کہ مثال، ممثّل لہ کا فرد ہوتی ہے۔ اور نظیر اس کا فرد نہیں ہوتی۔ ایک متماثل (ملتی جلتی) چیز ہوتی ہے، جو مسئلہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے ۱۲

کرے گا۔ اور فجر میں کاہلی کا احتمال زیادہ تھا، اس لئے اس کی سنتوں کی تاکید زیادہ آئی ہے۔ اور دوسری تین نمازوں میں کاہلی کا تو کوئی موقع نہیں۔ البتہ کاروباری مشغولیت کی وجہ سے رغبتیں پراگندہ ہوتی ہیں۔ ان میں نماز کی رغبت کو کسی محسوس چیز کے ذریعہ متعین کرنے کے لئے تحیۃ المسجد مشروع کی گئی۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ یہ مسجد کے احترام کے لئے ہے مسجد کو اللہ تعالیٰ سے ایک خاص نسبت ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو خانۂ خدا کہتے ہیں۔ پس اس کا یہ حق ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ اور تحیۃ المسجد اسی حق کی ادائیگی کے لئے ہے۔

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: إذا دخل أحدُكم المسجد فليقل: "اللهم افتح لي أبواب رحمتك" فإذا خرج فليقل: "اللهم إني اسألك من فضلك"

أقول: الحكمةُ في تخصيص الداخل بالرحمة والخارجِ بالفضل: أن الرحمة في كتاب الله أريدبها النِّعَمُ النفسانيةُ والأخرويةُ، كالولاية والنبوة، قال تعالى: ﴿وَرَحْمَةُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ والفضلَ على النعم الدنيوية، قال تعالى: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ وقال تعالى: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلاَةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ ومن دخل المسجدَ إنما يطلب القُرْبَ من الله، والخروجُ وقتُ ابتغاء الرزق.

[٥] قوله صلى الله عليه وسلم: إذا دخل أحدكم المسجدَ فليركعْ ركعتين قبل أن يجلس"

أقول: إنما شرع ذلك: لأن ترك الصلاة ـــــ إذا حَلَّ بالمكان المُعَدِّ لها ـــــ ترةٌ وحسرةٌ، وفيه ضبطُ الرغبة في الصلاة بأمر محسوس، وفيه تعظيم المسجد.

ترجمہ: (۴) (حدیث شریف کا ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: داخل ہونے والے کو رحمت کے ساتھ اور باہر آنے والے کو فضل کے ساتھ خاص کرنے میں حکمت یہ ہے کہ قرآن کریم میں رحمت کے لفظ سے روحانی اور اخروی نعمتیں مراد لی گئی ہیں۔ جیسے ولایت اور نبوت (اس کے بعد آیت ہے) اور لفظ فضل کا اطلاق دنیوی نعمتوں پر کیا گیا ہے (اس کے بعد دو آیتیں ہیں) اور جو مسجد میں داخل ہوتا ہے وہ اللہ کی نزدیکی ہی طلب کرتا ہے۔ اور باہر نکلنا روزی تلاش کرنے کا وقت ہے۔

(۵) (حدیث کا ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: تحیۃ المسجد مشروع کی گئی ہے اس لئے کہ نماز کا چھوڑنا ـــــ جب اترے آدمی ایسی جگہ میں جو نماز کے لئے تیار کی گئی ہے ـــــ محرومی اور پچھتاوا ہے۔ اور اس میں نماز کی رغبت کو ایک محسوس چیز کے ذریعہ متعین کرنا ہے۔ اور اس میں مسجد کی تعظیم ہے۔

☆

سات جگہوں میں نماز ممنوع ہونے کی وجہ

حدیث ——— حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ساری زمین مسجد ہے بجز قبرستان اور حمام کے'' (رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی، مشکوۃ حدیث ۷۳۷)

فائدہ: اس حدیث کی سند تو صحیح ہے۔ مگر مضمون صحیح نہیں۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے جو چند امتیازات ہیں ان میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ آپؐ کے لئے ساری زمین نماز پڑھنے کی جگہ بنائی گئی ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں۔ اور آئندہ روایت میں جو چند جگہوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے وہ نہی لغیرہ ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اس حدیث پر جو کلام فرمایا ہے، اس کا حاصل یہی ہے۔

حدیث ——— حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سات جگہوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے: گوبر وغیرہ ڈالنے کی جگہ میں، قبرستان میں، مذبح میں، راستہ کے بیچ میں، نہانے کی جگہ میں، اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں اور بیت اللہ کی چھت پر'' (مشکوۃ حدیث ۷۳۸)

حدیث ——— حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ''میرے حبیب ﷺ نے مجھے قبرستان میں نماز پڑھنے سے منع کیا اور مجھے اس بات سے بھی منع کیا کہ بابل کی سرزمین میں نماز پڑھوں، کیونکہ وہ ملعون ہے'' (ابوداؤد حدیث ۴۹۰)

گوبر وغیرہ ڈالنے کی جگہ میں اور مذبح میں نماز کی ممانعت کی وجہ: جگہ کی ناپاکی ہے۔ اور مصلی کی جگہ کا پاک ہونا نماز کے لئے شرط ہے۔ اور کوئی کپڑا وغیرہ بچھا کر نماز پڑھے تو بھی نجاست کے قرب کی وجہ سے، مجبوری کے بغیر، مناسب نہیں۔ گو نماز ہو جائے گی۔ نماز کے لئے مناسب نہایت پاکیزگی اور خوب صفائی ہے۔ پس ناپاکی کے قریب بھی نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔

قبرستان میں نماز کی ممانعت کی وجہ: شرک کا چور دروازہ بند کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ جس طرح مورتیوں کو سامنے رکھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے، اسی طرح علماء اور بزرگوں کی قبروں کو بھی قبلۂ توجہ بنا کر اگر نماز پڑھی جائے گی یا صرف سجدہ کیا جائے گا تو یہ شرک جلی (خالص شرک) ہے۔ اور اگر تبرک کے لئے قبروں کے قریب نماز پڑھی جائے گی تو یہ شرکِ خفی ہے یعنی اس میں بھی شرک کا شائبہ ہے۔ درج ذیل حدیث کا یہی مفہوم ہے:

حدیث ——— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض وفات میں ارشاد فرمایا: ''اللہ نے لعنت فرمائی یہود و نصاری پر۔ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا'' (مشکوۃ حدیث ۷۱۲) یعنی ان لوگوں میں قبر پرستی کا رواج ہو گیا، تو اللہ پاک نے ان کو دھتکار دیا ——— اور اس کی نظیر اوقاتِ ثلاثہ میں نماز کی ممانعت ہے۔ یہ ممانعت کفار کی مشابہت سے بچنے کے لئے ہے۔ اسی طرح قبرستان میں نماز کی ممانعت یہود و نصاری کی

مشابہت اور ان میں پیدہ شدہ بیماری (قبر پرستی) سے بچنے کے لئے ہے۔

حمام میں نماز کی ممانعت کی وجہ: یہ ہے کہ وہاں کسی کا ستر بھی کھل سکتا ہے۔ اور بہت لوگ ایک ساتھ نہانے آجائیں تو بھیڑ بھی ہوسکتی ہے پس یہ چیزیں نماز میں دل کی حضوری میں خلل انداز ہوں گی۔

فائدہ: حمام: نہانے کے ہوٹل ہوتے ہیں۔ جن ملکوں میں پانی کی قلت ہوتی ہے، وہاں لوگ گھروں میں پانی کی وافر مقدار نہیں رکھتے۔ جب نہانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو حمام میں چلے جاتے ہیں اور پیسے دیکر نہا آتے ہیں۔

اونٹوں کو بٹھانے کی جگہ میں نماز کی ممانعت کی وجہ: یہ ہے کہ اونٹ بڑے ڈیل ڈول کا جانور ہے، اس کا حملہ بھی سخت ہوتا ہے اور اس میں جرأت بھی بہت ہوتی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ وہ نماز میں پریشان کرے۔ اور یہ اندیشہ جمعیت خاطر میں خلل ڈالے گا۔ اور بکریوں کا حال اونٹوں سے مختلف ہے، وہ بیچاری کیا ستائے گی؟! اس لئے حدیث میں مرابض غنم (بکریوں کو بٹھانے کی جگہ) میں نماز کی اجازت دی گئی (مشکوٰۃ حدیث ۷۳۹)

بیچ راستہ میں نماز ممنوع ہونے کی تین وجوہ ہیں: ایک: یہ کہ وہاں نماز میں اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔ بار بار گذرنے والوں کی طرف توجہ منعطف ہوگی۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے سے گذرنے والوں پر راستہ تنگ ہوگا، جو ان کے لئے باعثِ اذیت ہوگا۔ اور تیسری وجہ: یہ ہے کہ راستے درندوں اور زہریلے جانوروں کی بھی گذرگاہ ہیں۔ پس وہ گزند پہنچائیں گے۔ یہ وجہ ایک روایت میں صراحۃً آئی ہے۔ ابن ماجہ (حدیث ۳۳۰) میں ایک ضعیف روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: إیاکم والتعریسَ فی جَوَادِّ الطریق، والصلاةَ علیها، فإنها مأوَی الحَیَّاتِ والسِّباع: بچو تم راستہ کے بیچ میں آخری رات میں آرام کے لئے پڑاؤ ڈالنے سے، اور راستہ پر نماز پڑھنے سے، پس راستے سانپوں اور درندوں کا ٹھکانہ ہیں۔ یعنی رات میں درندے راستوں پر آبیٹھتے ہیں اور زہریلے جانور بھی آپڑتے ہیں۔

بیت اللہ کی چھت پر نماز کی ممانعت: دو وجہ سے ہے: ایک: اس وجہ سے کہ بے ضرورت بیت اللہ کی چھت پر چڑھنا مکروہ ہے۔ اس سے بیت اللہ کی عظمت پامال ہوتی ہے۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے میں شک رہے گا کہ استقبالِ قبلہ ہوا یا نہیں؟ کیونکہ وہاں نظر کو روکنے والی کوئی چیز نہیں۔

ملعون زمینوں میں نماز کی ممانعت: دو وجہ سے ہے: ایک: اس وجہ سے کہ کسی جگہ میں نماز پڑھنا اس جگہ کی عزت بڑھانا ہے۔ اور ملعون زمین عزت کی حقدار نہیں بلکہ اس کی اہانت ضروری ہے۔ پس وہاں نماز ممنوع قرار دینے سے اہانت مقصود ہے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ اللہ کی ناراضی خواہ مخواہ مول نہیں لینی چاہئے۔ ملعون جگہ میں نماز پڑھنے میں احتمال ہے کہ اللہ پاک ناراض ہوجائیں۔ پس اللہ کی ناراضگی کے اندیشہ سے ایسی جگہوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ تبوک جاتے ہوئے جب آپ ﷺ حجر (ثمود کی بستیوں) سے گذرے تو فرمایا: لاتدخلوا مساکنَ الذین ظلموا أنفسهم، إلا

أن تكونوا باكين، أن يصيبكم ما أصابهم: تباہ شدہ کافروں کی بستیوں میں داخل نہ ہو مگر روتے ہوئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو بھی وہ عذاب پہنچے جو ان کو پہنچا تھا! پھر آپؐ نے سر پر کپڑا ڈالا اور سواری کو تیز ہانکا یہاں تک کہ اس میدان سے نکل گئے (مشکوۃ حدیث ۵۱۲۵ باب الظلم، کتاب الآداب)

فائدہ: ملعون زمین وہ ہے جہاں کفار پر عذاب نازل ہوا ہو۔ زمین دھنسادی گئی ہو یا پتھروں کی بارش برسائی گئی ہو۔

[۶] قال النبي صلى الله عليه وسلم: "الأرضُ كلُّها مسجدٌ، إلا المَقْبُرَةَ والحَمَّامَ" ونهى أن يصلّي في سبعةِ مواطنَ: في المَزْبَلَةِ، والمقبرة، والمَجْزَرَةِ، وقارعةِ الطريق، وفي الحمام، وفي معاطنِ الإبل، وفوقَ ظهرِ بيت الله؛ ونهى عن الصلاة في أرض بابِلَ، فإنها ملعونة.

أقول:

[الف] الحكمةُ في النهي عن المزبلة والمجزرة: أنهما موضِعا النجاسة، والمناسبُ للصلاة هو التَطَهُّر والتنظُّف.

[ب] وفي المقبرة: الاحترازُ عن أن يُتَّخَذَ قبورُ الأحبار والرهبان مساجدَ، بأن يُسْجَدَ لها، كالأوثان، وهو الشركُ الجليُّ، أو يُتقرب إلى الله بالصلاة في تلك المقابر، وهو الشرك الخفيّ؛ وهذا مفهومُ قوله صلى الله عليه وسلم: "لعن الله اليهودَ والنصارى اتَّخَذُوا قبورَ أنبيائهم مساجدَ" ونظيره: نهيُه صلى الله عليه وسلم عن الصلاة في وقت الطلوع والاستواء والغروب، لأن الكفار يسجدون للشمس حينئذ.

[ج] وفي الحمام: أنه محلُّ انكشاف العوراتِ، ومَظِنَّةُ الازدحام، فيُشغله ذلك عن المناجاة بحضور القلب.

[د] وفي معاطن الإبل: أن الإبلَ لِعِظَمِ جُثَّتِهَا وشدَّةِ بطشها وكثرةِ جُرْأتِها كادت تُؤذي الإنسانَ، فيُشغله ذلك عن الحضور، بخلاف الغنم.

[ه] وفي قارعة الطريق: اشتغالُ القلب بالمارِّين، وتضييق الطريق عليهم، ولأنها مَمَرُّ السباع، كما ورد صريحًا في النهي عن النزول فيها.

[و] وفوقَ بيت الله: أن الترقِّيَ على سطح البيت، من غير حاجة ضرورية، مكروهٌ، هَاتِكٌ لحرمتِه، وللشكِّ في الاستقبال حالتئذٍ.

[ز] وفي الأرض الملعونة بنحوِ خسفٍ أو مطرِ الحجارة: إما نتنها، والبُعْدُ عن مظانِّ الغضب هيبةً منه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "ولاتدخلوه إلا باكين"

ترجمہ: (٦) تین حدیثیں ذکر فرمائی ہیں ۔ اس کے بعد: میں کہتا ہوں: (الف) گوبر ڈالنے کی جگہ اور کمیلہ میں نماز کی ممانعت کی حکمت: یہ ہے کہ وہ دونوں ناپاک جگہیں ہیں۔ اور نماز کے لئے مناسب نہایت پاکی اور خوب صفائی ہے (ب) اور قبرستان میں: بچنا ہے اس سے کہ علماء اور بزرگوں کی قبریں مسجدیں بنائی جائیں، بایں طور کہ ان کو سجدہ کیا جائے، جیسے مورتیاں، اور وہ شرک جلی ہے یا اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کی جائے اُن مقابر میں نماز ادا کرکے۔ اور وہ شرک خفی ہے۔ اور یہ مفہوم ہے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا کہ اللہ نے رحمت سے دور کر دیا یہود ونصاریٰ کو: انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنالیا" اور اس کی نظیر: آپ ﷺ کا منع فرمانا ہے نماز پڑھنے سے طلوع، استواء اور غروب کے وقت میں اس لئے کہ اس وقت کفار سورج کو سجدہ کرتے ہیں ——— (ج) اور حمام میں: کہ وہ ستروں کے کھلنے کی جگہ ہے اور بھیڑ کی احتمالی جگہ ہے۔ پس غافل کرے گی یہ چیز دل کو حضوری کے ساتھ سرگوشی کرنے سے ——— (د) اور اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں: کہ اونٹ اس کی جسامت کے بڑا ہونے کی وجہ سے اور اس کی پکڑ کے مضبوط ہونے کی وجہ سے اور اس کی بے باکی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے قریب ہے کہ وہ انسان کو ستائے۔ پس غافل کرے اس کو یہ بات دل کی حضوری سے، برخلاف بکریوں کے ——— (ھ) اور بیچ راستہ میں: دل کا مشغول ہونا ہے گذرنے والوں کے ساتھ، اور راستہ تنگ کرنا ہے ان پر، اور اس لئے کہ وہ درندوں کی گذرگاہ ہے۔ جیسا کہ صراحۃً آیا ہے بیچ راستہ میں پڑاؤ ڈالنے کی ممانعت کی حدیث میں ——— (و) اور بیت اللہ کی چھت پر: کہ بیت اللہ کی چھت پر چڑھنا، بغیر کسی اہم ضرورت کے، مکروہ ہے، بیت اللہ کے احترام کو پامال کرنے والا ہے۔ اور اس حالت میں استقبال کعبہ میں شک ہونے کی وجہ سے ——— (ز) اور ملعون سرزمین میں دھنسنے جیسے عذاب کے ذریعہ یا پتھروں کی بارش کے ذریعہ: اس کی اہانت ہے اور غضب کی احتمالی جگہوں سے دور ہونا ہے، ڈرتے ہوئے غضبِ الٰہی سے۔ اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "اور نہ داخل ہو تم مگر روتے ہوئے"

☆ ☆ ☆

باب ——— ٦

نمازی کا لباس

نماز میں لباس پہننا کیوں ضروری ہے؟

لباس انسان کا ایک امتیاز ہے۔ اس سے انسان حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور لباس سے مزین ہونا انسان کی بہترین حالت ہے۔ لباس میں طہارت کا پہلو بھی ہے، کیونکہ لباس سے بھی فرحت وانبساط حاصل ہوتا ہے۔ اور لباس پہن کر نماز پڑھنے میں نماز کی تعظیم ہے۔ اور رب العالمین کی بارگاہ میں مناجات کے لئے باادب حاضری دینے کی

حقیقت آشکارہ ہوتی ہے۔ ننگا کسی کے سامنے پہنچ جانا بڑی بے ادبی شمار کیا جاتا ہے۔ لباس پہننا نماز سے قطع نظر ایک مستقل شرعی واجب بھی ہے۔ اور جس طرح کلی اور ناک کی صفائی مستقل پاکیاں تھیں جن کو وضوء میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح لباس پہننے کو نماز کے لئے شرط ٹھہرایا گیا ہے پس کپڑوں کی موجودگی میں ننگے نماز پڑھنا درست نہیں۔ کیونکہ لباس نماز کی حقیقت کی تکمیل کرتا ہے۔

لباس کی دو حدیں: واجب اور مستحب

شریعت نے لباس کی دو حدیں مقرر کی ہیں۔ ایک: حدّ واجب: جس کے بغیر چارہ نہیں۔ یہ حد نماز کی صحت کے لئے شرط ہے۔ دوم: حدّ مستحب، جس کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ دونوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

لباس کی حد واجب: منجملۂ حد واجب دو شرمگاہیں ہیں، یہ دونوں حدوں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں یعنی اصل ننگا پا یہی دو اعضا ہیں۔ ان کا چھپانا سب سے زیادہ مؤکد ہے۔ اور مرد کی رانیں اور عورت کا سارا بدن سبیلین کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے:

دلیل نقلی: حدیث شریف میں ہے الفخذُ عورةٌ: ران ستر ہے (بخاری کتاب الصلاۃ باب ۱۲) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لاتنظر إلی فخِذِ حیّ ولا میت: نہ کسی زندہ کی ران کی طرف دیکھ اور نہ کسی مردہ کی ران کی طرف (سنن بیہقی ۲: ۲۲۸)

اور گھٹنا ران کے ساتھ ملحق ہے اور وہ بھی ستر ہے۔ کیونکہ گھٹنا فی نفسہ کوئی عضو نہیں۔ وہ دو ہڈیوں کا سنگم ہے: ایک: ران کی ہڈی، دوسری پنڈلی کی ہڈی۔ پس مجموعہ کو ران کا حکم دیا گیا۔ اور دلیل وہ روایت ہے جس میں آیا ہے کہ ایک واقعہ میں جب حضرت عثمان آئے تو آنحضرت ﷺ نے اپنا گھٹنا ڈھانک لیا (بخاری حوالہ بالا)

اور عورت کا سارا جسم ستر ہے اس کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: "حائضہ عورت کی نماز قبول نہیں کی جاتی مگر اوڑھنی کے ساتھ" (مشکوۃ حدیث ۷۶۲) اور حائضہ سے مراد بالغہ ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کے سر کے بال بھی ستر ہیں۔ پس اسی سے پورے بدن کا ستر ہونا مفہوم ہوا (اور چہرے، ہتھیلیوں اور پیروں کے پنجوں کا جو نماز میں کھلا رکھنا جائز ہے وہ ضرورت کی وجہ سے ہے، ورنہ حجاب میں یہ بھی شامل ہیں حدیث شریف میں ہے: المرأۃُ عورۃٌ، فإذا خرجتِ استشرفَها الشیطان: عورت (سراپا) ستر ہے، پس جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو گھورتا ہے (مشکوۃ حدیث ۳۱۰۹) اس حدیث میں کوئی استثناء نہیں نیز: بدقماش لوگ سب سے زیادہ چہرہ ہی گھورتے ہیں)

دلیل عقلی: مرد کی رانیں اور عورت کا سارا جسم (بشمول چہرہ و ہاتھ و پیر) محل شہوت ہیں۔ اس لئے ان کو سبیلین

ساتھ لاحق کیا گیا ہے۔

لباس کی حد مستحب: نیچے کی طرف گھٹنوں تک تو حد واجب ہے۔ ان سے نیچے کوئی حد مستحب نہیں۔ اور اوپر کی طرف پیٹ، پیٹھ، سینہ اور مونڈھوں تک حد مستحب ہے۔ جسم کا یہ حصہ ڈھانک کر نماز پڑھنا مستحب ہے۔

دلیل نقلی: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہرگز تم میں سے کوئی نماز نہ پڑھے ایک کپڑے میں کہ نہ ہو اس کے دونوں کندھوں پر اس میں سے کچھ'' (مشکوۃ حدیث ۷۵۵) یعنی ایک ہی کپڑا ہو تو بھی اس سے کندھوں تک بدن کو چھپانا چاہئے۔ صرف لنگی کی طرح کپڑا باندھ کر نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ: ''اگر کپڑا چھوٹا ہو تو لنگی کی طرح باندھ لے۔ اور کپڑے میں گنجائش ہو تو اس کے دونوں کناروں کو اِدھر اُدھر کر لے'' یعنی گاتی باندھ لے (گاتی: چادر یا دوپٹے کو کندھوں کے اوپر لے جا کر سینے پر یا گردن کے پیچھے باندھنے کا ایک خاص انداز)

دلیل عقلی: لوگوں میں لباس کے معاملہ میں بہت کچھ اختلاف ہے: کوئی اچکن پہنتا ہے، کوئی کرتا اور کوئی دو چادریں اوڑھتا ہے۔ مگر سب عرب وعجم اور معتدل مزاج والے اس پر متفق ہیں کہ آدمی کی عمدہ ہیئت اور کامل لباس یہ ہے کہ دونوں کندھے اور پیٹھ چھپی ہوئی ہو۔

فائدہ: قرآن کریم نے سورۃ الاعراف آیت ۲۶ میں لباس کو انہی دو حدوں میں تقسیم کیا ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا﴾ (اے بنی آدم! ہم نے تم پر وہ پوشاک اتاری ہے جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانکتی ہے، اور آرائش کے کپڑے اتارے ہیں) پھر آیت ۳۱ میں ارشاد پاک ہے: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ یعنی اے بنی آدم! تم اپنی آرائش لے لو ہر نماز کے وقت ـــــــ ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایک حد تو وہ ہے جس کا ڈھانکنا واجب ہے۔ اور وہ دو شرمگاہیں اور ان کے ملحقات ہیں۔ اور دوسری حد: آرائش کا لباس ہے۔ یہ بھی نماز میں مطلوب ہے۔ اور اس کی حد صرف مونڈھوں تک نہیں۔ یہ تو ایک درمیانی صورت ہے۔ کامل آرائش یہ ہے کہ سر اور ٹخنوں کے اوپر تک جو بھی آرائش وزینت کا لباس ہے اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کھلے سر نماز پڑھنا سنت یا مستحب ہے۔ کیونکہ اس میں تذلل (عاجزی اور فروتنی) ہے، جو نماز میں مطلوب ہے۔ نیز ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا ثابت نہیں۔ ان حضرات کا یہ خیال صحیح نہیں۔ یہ قرآن کے مقابلہ میں قیاس ہے۔ مذکورہ بالا آیت سے نماز میں تزیّن (مزین ہونا) مطلوب ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ عمامہ باندھنا ثابت ہے اور ٹوپی کا تذکرہ بھی آیا ہے، پھر عام حالات میں تو آپ تزیین کے لئے یہ لباس زیب تن فرماتے ہوں اور جب نماز کا وقت آتا ہو تو ان کو اتار کر نماز پڑھتے ہوں۔ یہ محض من گھڑت بات ہے! اور یہ خیال کہ اب تو کھلے سر رہنا ہی عام رواج ہے تو جاننا چاہئے کہ یہ ایک فیشن ہے۔ اس کا اعتبار نہیں۔ اعتبار اسلامی تہذیب کا ہے۔

﴿ثيابُ المصلّي﴾

اعلم أن لُبس الثياب مما امتاز به الإنسانُ عن سائر البهائم، وهو أحسن حالاتِ الإنسان، وفيه شعبةٌ من معنى الطهارة، وفيه تعظيمُ الصلاة، وتحقيقُ أدب المناجاة بين يدَيْ ربِّ العالمين، وهو واجبٌ أصليٌّ، جُعل شرطًا في الصلاة لتكميلِهِ معناها.

وجعله الشرع على حدين: حدٌّ لابد منه، وهو شرط صحة الصلاة، وحدٌّ هو مندوب إليه:

فالأول: منه السوأتان، وهو آكدُ هما، وأُلحق بهما الفخذان؛ وفي المرأة سائِرُ بدنها، لقوله صلى الله عليه وسلم: "لاتُقبل صلاةُ حائضٍ إلا بخمار" ـــ يعني البالغة ـــ لأن الفخِذَ محلُّ الشهوة، وكذا بدن المرأة، فكان حكمها حكمَ السوأتين.

والثاني: قوله صلى الله عليه وسلم: "لايُصَلِّيَنَّ أحدُكم في الثوب الواحد، ليس على عاتِقَيْهِ منه شيئٌ" وقال: "إذا كان واسعاً فَخَالِفْ بين طرفيه"

والسر فيه: أن العرب والعجم وسائِرَ أهلِ الأمزجه المعتدلة، إنما تمامُ هيئتهم، وكمالُ زِيِّهم ـــ على اختلاف أوضاعهم في لباس القباء، والقميصِ، والحُلَّةِ وغيرها ـــ: أن يُسْتَرَ العاتقان والظَّهْرُ.

ترجمہ: نمازی کے کپڑے: جان لیں کہ کپڑے پہننا اُن باتوں میں سے ہے جس کے ذریعہ ممتاز ہوتا ہے انسان دیگر جانوروں سے۔ اور وہ انسان کے حالات میں بہترین حالت ہے اس میں طہارت کے معنی کی ایک شاخ (پہلو) ہے۔ اور اس میں نماز کی تعظیم ہے۔ اور رب العالمین کے روبرو سرگوشی کے ادب کو ثابت کرنا ہے۔ اور وہ اصلی (مستقل) واجب ہے جو نماز میں شرط کیا گیا ہے، اس کے کامل کرنے کی وجہ سے نماز کی حقیقت کو۔

اور بنایا ہے اس کو شریعت نے دو حدوں پر: ایک حد: جس کے بغیر چارہ نہیں۔ اور وہ شرط ہے نماز کی صحت کے لئے۔ اور دوسری حد: جس کی طرف بلایا گیا ہے۔

پس اول: منجملہ ازاں دو شرمگاہیں ہیں۔ اور وہ یعنی سبیلین کو ڈھانکنا دونوں حدوں میں سب سے زیادہ مؤکد ہے۔ اور ملائی گئی ہیں ان دونوں کے ساتھ دورانیں، اور عورت میں اس کا سارا بدن، آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے کہ: "کسی حائضہ عورت کی نماز قبول نہیں کی جاتی مگر اوڑھنی کے ساتھ" ـ مراد بالغہ ہے۔ اس لئے کہ ران شہوت (خواہش) کی جگہ ہے، اور اسی طرح عورت کا بدن (بھی خواہش کی جگہ ہے) پس عورت کا حکم دو شرمگاہوں کا حکم ہے۔

اور دوم: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "ہرگز نماز نہ پڑھے تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں کہ نہ ہو اس کے دونوں کندھوں پر اس میں سے کچھ" اور فرمایا: "جب کپڑے میں گنجائش ہو تو اس کے دونوں کناروں کو اِدھر اُدھر کر لے"

اور راز اس میں: یہ ہے کہ عرب وعجم اور دیگر تمام معتدل مزاج والے: ان کی ہیئت کی تمامیت اور ان کی پوشاک کا کمال ــــ ان کے احوال کے مختلف ہونے کے باوجود قبا، قمیص اور حلّہ وغیرہ پہننے میں ــــ یہ ہے کہ چھپائے جائیں دونوں کندھے اور پیٹھ (حُلّہ: دو چادریں اوڑھنا)

☆ ☆ ☆

نماز کے لئے کتنے کپڑے ضروری ہیں؟

(جوابِ نبویؐ اور جوابِ عمرؓ میں اختلاف اور اس کی توجیہات)

حدیث ــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہیں؟!'' اس زمانہ میں جواب یقیناً نفی میں تھا۔ پھر دو کپڑے نماز کے لئے کیسے شرط کئے جا سکتے ہیں؟ جواب نبوی کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت کی وجہ سے ایک کپڑے میں یعنی صرف لنگی یا پانجامہ میں بھی نماز درست ہے۔

پھر (حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں) کسی نے یہی سوال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا۔ آپؓ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے وسعت کی تو تم بھی وسعت کرو (یعنی اب تنگی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے وسعت فرما دی ہے۔ پس لوگوں کو بھی وسعت کرنی چاہئے۔ ایک کپڑے میں نہیں، بلکہ ایک سے زائد کپڑوں میں نماز پڑھنی چاہئے) اکٹھا کیا ایک آدمی نے اپنے اوپر اپنے کپڑوں کو (یعنی اس نے ایک سے زیادہ کپڑے پہنے) نماز پڑھی ایک آدمی نے (۱) لنگی اور چادر میں (۲) لنگی اور کرتے میں (۳) لنگی اور اچکن میں (۴) پائجامہ اور چادر میں (۵) پائجامہ اور کرتے میں (۶) پائجامہ اور اچکن میں (۷) جانگیہ اور اچکن میں (۸) جانگیہ اور کرتے میں۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں: میں گمان کرتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: (۹) جانگیہ اور چادر میں (یہ ایک سے زیادہ کپڑے پہننے کی نو صورتیں حضرت عمرؓ نے بتلائیں) (بخاری حدیث ۳۶۵)

تشریح: مذکورہ روایات میں جوابِ نبوی اور جوابِ فاروقی میں بظاہر تخالف نظر آتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کی دو توجیہیں کی ہیں۔ اور ایک توجیہ شارح نے بڑھائی ہے:

پہلی توجیہ: یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے سوال لباس کی حدِ اول کے بارے میں کیا گیا تھا۔ اس لئے آپ نے اسی کا جواب دیا۔ اور جوابِ فاروقی میں لباس کی حدِ ثانی کی تفصیل ہے یعنی نماز کی صحت کے لئے تو ایک کپڑا بھی کافی ہے، مگر تجمل ایک سے زائد کپڑوں میں ہے۔

دوسری توجیہ: احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ سے بھی سوال لباس کی حدِ ثانی کے بارے میں کیا گیا ہو جو مستحب

لباس ہے۔ مگر آپؐ نے وہ جواب نہیں دیا جو حضرت عمرؓ نے دیا ہے، کیونکہ اگر آپؐ دو کپڑوں کے بارے میں ارشاد فرماتے تو وہ مسئلہ بن جاتا۔ اور تنگی ہو جاتی۔ جس کے پاس دو کپڑے نہیں ہیں وہ دل میں پریشانی محسوس کرتا۔ اور ایک کپڑے میں اس کی نماز کامل نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے گمان میں کامل لباس پہن کر نماز نہیں پڑھ رہا! ـــــ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ میں جانتے تھے کہ نزول شریعت کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نماز میں کامل لباس مستحب ہے۔ اس لئے آپ نے مستحب لباس کی تفصیل بیان فرمائی۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تیسری توجیہ: دونوں سوال مطلق ہوں یعنی لباس کی کسی معین حد کے بارے میں سوال نہ ہوں تو پھر توجیہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ کا لحاظ کر کے تنگی کے دور کا مسئلہ بتایا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے مستحب لباس کی تفصیل بیان کی ہے۔ کیونکہ مفتی جواب میں زمانہ کا لحاظ کرتا ہے۔ درج ذیل روایت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی یہی فرق سمجھایا ہے۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنا سنت ہے۔ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک کپڑے میں نماز پڑھا کرتے تھے اور ہم پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”یہ بات اس وقت کی ہے جب کپڑوں میں قلت تھی۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے گنجائش کر دی تو دو کپڑوں میں نماز پڑھنا زیادہ اچھی بات ہے“ (رواہ احمد، مشکوٰۃ حدیث ۷۷۱)

فائدہ: اگر کوئی یہ سوال کرے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مستحب لباس: دو دو کپڑے بتائے ہیں۔ اس سے ٹوپی کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لباس میں عرف وعادت میں جو اصل کپڑے ہوتے ہیں، وہی بیان کئے ہیں۔ جو تابع ہوتے ہیں، جیسے ٹوپی، جرابیں وغیرہ ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ اور جانگیہ اگر پائجامہ کے ساتھ ہے تو تابع ہے، ورنہ وہ مستقل لباس ہے۔

[۱] وسُئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الصلاۃ فی ثوب واحد، فقال: ”أو لکلکم ثوبان؟“ ثم سُئل عمر رضی اللہ عنہ، فقال: ”إذا وَسَّعَ اللّٰہ فَوَسِّعُوْا: جَمَعَ رجلٌ إلخ.

أقول: الظاہر أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سُئل عن الحد الأول، وقولُ عمر رضی اللہ عنہ بیان للحد الثانی. ویحتمل أن یکون السؤال فی الثانی: الذی ہو مندوب، فلم یَأْمُرْ بثوبین، لأن جَرَیَانَ التشریع ـــ ولو بالحد الثانی ـــ باشتراط الثوبین حرجٌ، ولعل من لایجد ثوبین یجد فی نفسہ، فلا تَکْمُلُ صلاتُہ، لِمَا یجد فی نفسہ من التقصیر؛ وعَرَفَ عمرُ رضی اللہ عنہ: أن وقت التشریع انقضیٰ ومضیٰ، وکان قد عَرَفَ استحبابَ إکمالِ الزیِّ فی الصلاۃ، فَحَکَمَ علی حسب ذلک، واللّٰہ أعلم.

ترجمہ: (۱) رسول اللہ ﷺ سے ایک کپڑے میں نماز کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپؐ نے فرمایا: ”کیا اور تم

میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں؟!" پھر عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا، تو فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے وسعت کی تو تم بھی وسعت کرو: جمع کیا ایک آدمی نے آخر حدیث تک۔

میں کہتا ہوں: ظاہر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے لباس کی حد اول کے بارے میں پوچھا گیا ہے۔ اور عمر رضی اللہ عنہ کا قول حد ثانی کی تفصیل ہے ـــــ اور احتمال ہے کہ (نبی ﷺ سے) سوال حد ثانی کے بارے میں ہو، جو کہ وہ مستحب ہے۔ پھر بھی نہیں حکم دیا آپؐ نے دو کپڑوں کا۔ اس لئے کہ قانون سازی کا جاری ہونا ـــــ اگرچہ لباس کی حد ثانی کے متعلق ہو ـــــ دو کپڑوں کو شرط ٹھہرانے کے ساتھ تنگی ہے۔ اور شاید جو دو کپڑے نہیں پاتا وہ اپنے دل میں محسوس کرے۔ پس نہ کامل ہو اس کی نماز اُس کوتاہی کی وجہ سے جس کو وہ اپنے دل میں پاتا ہے (کیونکہ بندوں سے معاملہ ان کے گمان کے مطابق کیا جاتا ہے) اور عمر رضی اللہ عنہ نے جانا کہ قانون سازی کا زمانہ بیت گیا اور گذر گیا، اور وہ جانتے تھے نماز میں پوشاک کے مکمل کرنے کا استحباب، پس آپ نے اس کے مطابق حکم دیا۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں!

☆ ☆ ☆

نماز میں تزئین میں کمی مکروہ ہے

حدیث ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عبداللہ بن الحارث کو نماز پڑھتے دیکھا۔ ان کا پیچھے چونڈا بندھا ہوا تھا۔ پس ابن عباسؓ کھڑے ہو کر اس کو کھولنے لگے۔ نماز پوری کر کے ابن الحارث ابن عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: آپ کو میرے سر سے کیا لینا تھا؟! ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حدیث سنائی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "اس کا حال اس شخص جیسا ہے جو مشکیں کسا ہوا نماز پڑھ رہا ہو" (مسلم شریف ۴: ۲۰۸ مصری)

تشریح: اس حدیث میں کراہیت کی وجہ بھی سمجھائی ہے "کہ جس طرح مشکیں کسے ہوئے یعنی مونڈھوں کے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے نماز پڑھنا بھونڈا پن ہے، اسی طرح چونڈا باندھ کر نماز پڑھنے میں بھی تجمل (آرائش) کی کمی اور ہیئت (صورت) اور ادب کے لباس میں ناتمامیت ہے پس یہ بھی مکروہ ہے۔

تزئین اتنی بھی نہ ہو کہ نماز کھودے

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی چادر میں نماز پڑھی جس میں پھول بوٹے تھے۔ نماز میں آپؐ کی ان پر اُچٹتی نظر پڑی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: "میری یہ چادر ابو جَھم کے پاس لے جاؤ، اور ان کی انبجانی چادر لے آؤ، پس بیشک اس چادر نے مجھے غافل کیا ابھی میری نماز میں"
(مشکوٰۃ حدیث ۷۵۷)

حدیث ــــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک پردہ تھا، جس سے انھوں نے اپنے گھر کے ایک حصہ کو ڈھانک رکھا تھا۔ آپؐ نے ان سے فرمایا: ''اپنا یہ پردہ ہم سے دور کرو۔ اس کی تصویریں برابر میرے سامنے آتی رہتی ہیں میری نماز میں'' (مشکوۃ حدیث ۷۵۸)

حدیث ــــــ حضرت عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک ریشمی قبا آنحضرت ﷺ کو ہدیہ کی گئی۔ آپؐ نے اس کو زیب تن فرمایا پھر اس میں نماز پڑھی، پھر جب نماز سے فارغ ہوئے تو اسے یکدم اتار دیا جیسے وہ آپؐ کو ناگوار ہو۔ پھر فرمایا: ''یہ پرہیزگاروں کے شایانِ شان نہیں!'' (مشکوۃ حدیث ۷۶۹)

تشریح: نماز میں زیبائش وآرائش اتنی بھی نہیں ہونی چاہئے کہ آدمی اپنی حالت پر اترائے اور ناز کرے۔ ایسی صورت میں نماز کا مقصد فوت ہوجائے گا۔ پس نمازی کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے ہر اس چیز کو ہٹادے جو نماز میں اس کو غافل کرسکتی ہو۔ خواہ وہ اپنی ہیئت کی عمدگی ہو یا ایسی چیز ہو جس پر نفس ناز کرے۔ تاکہ نماز کا مقصد تکمیل پذیر ہو۔ نماز کا مقصد اخبات اور خشوع ہے۔

[۲] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الذی یصلی، ورأسہ معقوص من ورائہ: " إنما مَثَلُ ھذا مَثَلُ الذی یصلی وھو مکتوف"

أقول: نَبَّہَ علی أن سبب الکراھیۃ: الإخلالُ بالتجمُّل، وتمامِ الھیئۃ وزِیِّ الأدب.

[۳] قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی خَمِیْصَۃٍ لھا أعلامٌ: " إنھا أَلْھَتْنِیْ آنفًا عن صلاتی" وفی قِرَام عائشۃَ: " أَمِیْطِیْ عنا قِرامَكِ ھذا، فإنہ لایزال تصاوِیْرُہ تَعْرِضُ لی فی صلاتی" وفی فَرُّوْجِ الحریر: " لاینبغی ھذا للمتقین"

أقول: ینبغی للمصلِّی أن یدفع عن نفسہ کلَّ ما یُلْھِیہ عن الصلاۃ، لحسنِ ھیئتہ، أو لعُجْب النفس بہ، تکمیلاً لما قُصِد لہ الصلاۃ.

ترجمہ: (۲) (حدیث کا ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: چوکنا کیا آپؐ نے اس بات پر کہ کراہیت کا سبب: تجمل (خوبصورت ہونے) میں اور ہیئت کی تمامیت میں اور ادب کے پوشاک میں کوتاہی کرنا ہے۔

(۳) (تینوں حدیثوں کا ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: نمازی کے لئے یہ بات مناسب ہے کہ وہ اپنی ذات سے ہر اُس چیز کو دور کرے جو اس کو غافل کرے نماز سے، اس کی ہیئت کی عمدگی کی وجہ سے یا اس چیز پر نفس کے اترانے کی وجہ سے۔ تکمیل پذیر کرتے ہوئے اس چیز کو جس کے لئے نماز کا ارادہ کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

چپل موزے تزئین میں داخل ہیں یا نہیں؟

یہود موزے چپل پہن کر نماز نہیں پڑھتے تھے۔ان کے خیال میں یہ تعظیم کے خلاف تھا۔کیونکہ لوگ جب بڑوں کے دربار میں جاتے ہیں تو چپل نکال دیا کرتے ہیں۔سورہ طٰہٰ آیت ۱۲ میں موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا:''پس تم اپنی جوتیاں اتار ڈالو (کیونکہ) تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو''

مگر یہاں ایک دوسرا نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ موزہ اور چپل پیر کے پوشاک کی تمامیت ہے۔ ننگے پیر آدمی اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے پہلا نقطۂ نظر چھوڑ دیا،اور یہود سے امتیاز کرنے کے لئے دوسرا نقطۂ نظر پیش کیا۔اور فرمایا:''یہود کی مخالفت کرو: وہ اپنے چپلوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے''(مشکوٰۃ حدیث ۷۶۹) اور صحیح بات یہ ہے کہ چپل پہن کر اور اتار کر دونوں طرح نماز پڑھنا یکساں ہے۔یہی بات عبداللہ بن عمرو کی روایت میں آئی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ننگے پیروں اور چپل پہنے ہوئے دونوں طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے(مشکوٰۃ حدیث ۷۶۹)

فائدہ: آیت کریمہ میں اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو چپل اتارنے کا حکم دیا گیا تھا وہ جگہ کی پاکی کی بنا پر تھا۔پس مسجد میں چپل یا جوتے پہن کر جانا ممنوع ہے چپل جوتے پہن کر آپ کا اور صحابہ کا نماز پڑھنا میدان جہاد وغیرہ میں ہوتا تھا۔

[٤] وكان اليهود يكرهون الصلاة في نعالهم وخفافهم، لمافيه من ترك التعظيم، فإن الناس يخلَعون النعال بحضرة الكُبراء، وهو قوله تعالى: ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ، إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ وكان هنا وجهٌ آخرُ: وهو أن الخف والنعل تمامُ زِيِّ الرَّجل، فترك النبي صلى الله عليه وسلم القياس الأول، وأبدى الثاني مخالفةً لليهود، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " خالفوا اليهود، فإنهم لايصلون في نعالهم وخفافهم" فالصحيح: أن الصلاة متنعِّلاً وحافيًا سواءٌ.

ترجمہ: (۴) اور یہود اپنے چپلوں اور چمڑے کے موزوں میں نماز کو مکروہ سمجھتے تھے، بایں وجہ کہ اس میں تعظیم کو چھوڑنا ہے۔پس بیشک لوگ چپل نکالدیتے ہیں بڑوں کے دربار میں۔اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے:''پس نکال دیجئے آپ اپنے چپل۔بیشک آپ طویٰ نامی پاک میدان میں ہیں'' اور تھی یہاں ایک اور جہت: اور وہ یہ کہ موزہ اور چپل پیر کی پوشاک کی تمامیت ہے۔پس چھوڑ دیا نبی ﷺ نے پہلا قیاس۔اور ظاہر کیا دوسرا قیاس یہود کی مخالفت کے طور پر۔اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:''یہود کے خلاف کرو: پس بیشک وہ اپنے چپلوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے ہیں''۔اور صحیح بات: یہ ہے کہ چپل پہن کر اور ننگے پیر نماز یکساں ہے۔

تصحیح: أبدى مختلف نسخوں میں مختلف طرح ہے۔مولانا سندھی نے أبدٰ صحیح قرار دیا ہے یعنی آپؐ نے ہمیشہ

کے لئے یہ مسئلہ بیان کیا۔ مخطوطہ کراچی میں ابدا لکھا ہے۔ میں نے اسی کو برقرار رکھا ہے۔ البتہ ہمزہ کے بجائے ی لکھی ہے۔ یہی رسم الخط مناسب ہے أبْدى الأمر: ظاہر کرنا۔

☆ ☆ ☆

سَدْل کی ممانعت کی وجہ

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سَدْل سے اور منہ ڈھانکنے سے منع فرمایا (مشکوۃ حدیث ۷٦۴)

تشریح: سَدْل: کے لغوی معنی ہیں: لٹکانا۔ اور حدیث میں اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ اور دونوں تفسیروں پر سدل اور منہ ڈھانکنے کی ممانعت تجمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے ہے:

پہلی تفسیر: سَدْل کے معنی ہیں: کپڑے میں لپٹ جانا۔ اور دونوں ہاتھ اندر لے لینا۔ اس تفسیر پر سدل کی ممانعت دو وجہ سے ہے.

پہلی وجہ: سدل کی یہی صورت اشتمالِ صماء کہلاتی ہے۔ اور وہ کپڑا پہننے کی بہت بری ہیئت ہے۔ کیونکہ یہ صورت انسانی فطرت اور عادت کے خلاف ہے۔ فطری طریقہ اور عادت انسانی یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کپڑے سے باہر رہیں۔

دوسری وجہ: اس طرح کپڑا پہننے میں ستر کھلنے کا احتمال رہتا ہے۔ پس اگر ہاتھ اندر دبے ہوئے ہوں گے تو کپڑے کو سنبھالنا مشکل ہوگا اور آدمی ننگا ہوجائے گا۔

دوسری تفسیر: سدل کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں: سر پر یا مونڈھوں پر کپڑا اوڑھ کر دونوں جانبوں کو لٹکا دینا۔ ان کو باہم نہ ملانا، اور سدل بایں معنی اس لئے ممنوع ہے کہ یہ تجمل اور ہیئت کی تمامیت میں کوتاہی ہے۔ کیونکہ کپڑا اوڑھنے کا یہ طریقہ بے ڈھنگا ہے۔

فائدہ: اور تمام ہیئت کا مطلب یہ ہے کہ عرف وعادت فیصلہ کرے کہ مناسب کپڑوں میں، یا ان کو پہننے کے طریقہ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اور لوگ اگرچہ مختلف طریقوں سے لباس پہنتے ہیں لیکن اگر آپ جائزہ لیں گے تو ہر قوم میں تمام ہیئت کا لحاظ ملے گا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں اس زمانہ کے عربوں کے عرف کا اعتبار کیا ہے۔ اور اسی پر اپنے ارشادات کا مدار رکھا ہے۔

[٥] ونهى النبى صلى الله عليه وسلم عن السدل فى الصلاة:

فقيل: هو أن يَلتحف بثوبه، ويُدخل يدَيه فيه، وسيجيئ أن اشْتِمالَ الصَّمَّاءِ أقبح لِبْسةٍ، لأنه

مخالفٌ لما هو أصلُ طبيعة الإنسان وعادتِه من إبقاء اليدين مُسْتَرْسَلَتَيْنِ، ولأنه على شَرَفِ انكشافِ العورة، فإنه كثيرًا مَّا يحتاج إلى إخراج اليدين للبطش، فتنكشفُ.

وقيل: أرسالُ الثوب من غير أن يَّضُمَّ جانبيه، وهو إخلالٌ بالتجمُّل وتمام الهيئة؛ وإنما نعني بتمام الهيئة: ما يحكم العرفُ والعادةُ: أنه غير فاقدٍ ما ينبغي أن يكون له، وأوضاعُ لباسهم مختلفة، ولكن في كل لبسةٍ تمامُ هيئةٍ يُعرف بالسَّبْرِ، وقد بنى النبي صلى الله عليه وسلم الأمْرَ على عرف العرب يومئذ.

ترجمہ: (۵) اور نبی صَلَّالِلّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ نے نماز میں کپڑا لٹکانے سے منع کیا۔ میں کہتا ہوں: پس کہا گیا کہ سدل یہ ہے کہ لپٹ جائے آدمی اپنے کپڑے میں اور داخل کرلے اپنے دونوں ہاتھ اس میں۔ اور عنقریب آئے گا کہ اشتمال صَمّاء کپڑا پہننے کا نہایت بھونڈا طریقہ ہے۔ اس لئے کہ وہ مخالف ہے اس بات کے جو کہ وہ انسان کی اصل فطرت اور اس کی عادت ہے یعنی دونوں ہاتھوں کو لٹکا ہوا باقی رکھنا —— اور اس لئے کہ وہ (یعنی کپڑا پہننے کی یہ صورت) ستر کھلنے کے کنارے پر ہے۔ پس بیشک آدمی بارہا محتاج ہوتا ہے دونوں ہاتھ نکالنے کی طرف پکڑنے کے لئے، ورنہ ستر کھل جائے گا۔

اور کہا گیا: (سدل) کپڑے کا چھوڑنا ہے بغیر اس کے کہ ملائے وہ اس کی دونوں جانبوں کو۔ اور وہ کوتاہی کرنا ہے تجمل میں اور تمام ہیئت میں —— اور مراد لیتے ہیں ہم تمام ہیئت سے اس کو جو فیصلہ کرتا ہے عرف اور عادت کہ وہ شخص گم کرنے والا نہیں ہے اس لباس کو جو مناسب ہے کہ ہو اس کے لئے۔ اور لوگوں کی لباس پہننے کی حالتیں مختلف ہیں۔ مگر پہننے کی ہر حالت میں ایک تمام ہیئت ہے جو جائزہ لینے سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اور تحقیق مدار رکھا ہے نبی صَلَّالِلّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ نے معاملہ کا اس زمانہ کے عربوں کے عرف پر۔

لغات: اِشْتَمَلَ بالثوب: سارے جسم پر لپیٹنا ...... الصَّمَّاء: مؤنث أَصَمُّ: ٹھوس، سخت ...... اشتمال صَمّاء: ایک کپڑے میں جکڑ جانا۔

☆ ☆ ☆

باب —— ۷

قبلہ کا بیان

ہجرت سے پہلے کعبہ شریف قبلہ تھا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہے کہ ہجرت سے پہلے بیت المقدس قبلہ تھا، یہ رائے جمہور نے قبول نہیں کی۔ پھر جب آنحضرت صَلَّالِلّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں فروکش ہوئے

تو قبلہ بدلا گیا۔ بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا۔ سولہ یا سترہ مہینے آپؐ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ پھر دوسری مرتبہ تحویل ہوئی۔ اور کعبہ شریف کے استقبال کا حکم دیا گیا۔ اور معاملہ اسی پر ٹھہر گیا یعنی وہی تا قیامت قبلہ قرار پایا۔

نماز میں قبلہ کی ضرورت: تمام شریعتوں میں کسی نہ کسی قبلہ کی طرف منہ کرنا نماز میں شرط رہا ہے۔ اور قبلہ کی ضرورت دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: اللہ کے گھروں کی تعظیم واجب ہے، کیونکہ وہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ خاص کر نماز میں، جو ارکان اسلام میں بنیادی رکن ہے، جو تمام عبادات میں مرکزی عبادت ہے، جو شعائر دین میں سب سے مشہور شعار ہے۔ اس لئے نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کرنا شرط کیا گیا کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی تعظیم نہیں ہوسکتی۔

دوسری وجہ: نماز میں ایسی چیز کی طرف منہ کر کے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کرنا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہنا: بہت زیادہ جمعیتِ خاطر کا ذریعہ ہے، اور اس سے صفتِ خشوع خوب بدست آتی ہے۔ اور حضور قلب کی دولت بھی آسانی سے میسر آتی ہے۔ جیسے بادشاہ کی طرف متوجہ ہو کر عرض معروض کرنا زیادہ مفید مطلب ہوتا ہے۔ اسی طرح بارگاہ خداوندی میں نیازمندی کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے ان کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ اور اُس ذات بے چگوں کی طرف متوجہ ہونے کی یہی صورت ہے کہ ان کے گھر کی طرف رخ کیا جائے۔

مذکورہ بالا وجوہ سے حکمتِ الٰہی نے چاہا کہ تمام شریعتوں میں نماز کے لئے کوئی نہ کوئی قبلہ شرط ہو۔ اور اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دیا جائے۔

ہر قوم کا قبلہ اس کے اکابر کا قبلہ ہے: تمام شریعتوں میں یہ مسلّمہ امر ہے کہ ہر قوم کا قبلہ اس کے بڑوں کا قبلہ ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کا، اور ان لوگوں کا جنھوں نے ان کا دین اختیار کیا ہے: قبلہ کعبہ شریف تھا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ یہی قبلے ان اقوام میں متوارث چلے آرہے تھے۔

پہلی بار تحویل قبلہ کی وجہ: کعبہ شریف سے بیت المقدس کی طرف پہلی بار تحویل: انصار کے قبائل اَوس وخزرج اور ان کے حلیف یہودی قبائل کی دلجوئی کے لئے تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہربانی اوس وخزرج اور ان کے حلیف یہودی قبائل کی دلجوئی کی طرف متوجہ ہوئی۔ کیونکہ اب انصار ہی آپؐ کی مدد کے لئے کمربستہ ہوئے تھے۔ اور وہی وہ امت بن کر سامنے آئے تھے جو دنیا جہاں کے مقابلہ میں اعلان حق کرنے والی تھی۔ آپؐ کا خاندان یعنی مُضر قبائل اور وہ قبائل جنھوں نے مضر سے دوستی کی تھی، آپؐ کے سب سے بڑے دشمن بن گئے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے خوب غور وفکر کر کے بیت المقدس کو قبلہ تجویز فرمایا اور نماز میں اس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

اور اوس وخزرج کی دلجوئی کے لئے جو کہ مشرک قبائل تھے، بیت المقدس کو دو وجہ سے قبلہ تجویز کیا گیا تھا:

پہلی وجہ: عبادات میں اُس امت کا حال ملحوظ رکھا جاتا ہے جس کی طرف رسول کی بعثت ہوتی ہے، جو رسول کی نصرت کے لئے کمر کس لیتی ہے، اور جو سارے جہاں کے مقابلہ میں اعلانِ حق کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اور بوقت ہجرت یہ لوگ اوس وخزرج ہی تھے۔ اور ان کے لئے یہود کا قبلہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ وہ یہود کے علوم کے سامنے بہت زیادہ سرافگندہ تھے۔ یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ البقرہ آیت ۲۲۳ کی تفسیر میں بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: ''انصار کے یہ قبائل (اوس وخزرج) درانحالیکہ وہ بت پرست تھے، یہود کے ان قبائل کے ساتھ تھے، درانحالیکہ وہ اہل کتاب تھے (یعنی دونوں کے مذاہب مختلف تھے) وہ ان کو اپنے سے علم میں برتر خیال کرتے تھے۔ اور بہت سے اعمال میں ان کی پیروی کرتے تھے'' اس وجہ سے قبلہ بنانے کے لئے یہود کے قبلہ کا انتخاب عمل میں آیا۔

دوسری وجہ: بعد کی شریعت سابقہ برحق شریعت کی باتوں کو اپناتی ہے، بشرطیکہ وہ بات از قبیل تحریف یا تعمق نہ ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اتمام حجت میں آسانی ہوتی ہے۔ اور دل اس بات پر زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ اور بیت المقدس کا قبلہ ہونا یہود کی تحریف یا تعمق نہیں تھا، بلکہ وہ برحق قبلہ تھا۔ اس لئے جب کسی مصلحت سے عارضی طور پر دوسرا قبلہ اختیار کرنا پڑا تو یہود کا قبلہ اختیار کیا گیا۔ وہی لوگ اس وقت آسمانی کتاب کے حامل اور تورات پر عامل تھے۔ کوئی دوسری ملت ایسی نہیں تھی جس کا قبلہ اپنایا جاتا۔

دوسری اور آخری بار تحویل قبلہ کی وجہ: پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو مضبوط کیا۔ اور شریعتِ محمدیہ کا جو اصل قبلہ تھا اس کی طرف نماز میں منہ کرنے کا حکم دیا۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ مصلحت کے موافق اور قوانین تشریع سے زیادہ ہم آہنگ بات یہ ہے کہ اس امت کا قبلہ کعبہ شریف ہو۔ چنانچہ آپؐ اس کی آرزو سے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے، اور جبرئیل علیہ السلام کا انتظار کرتے تھے کہ وہ یہ حکم لے کر آئیں۔ پھر ثانیاً یعنی بالآخر قرآن کریم میں یہ حکم صراحۃً نازل کیا گیا۔

اور کعبہ کو اس امت کا دائمی قبلہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ عرب میں مبعوث ہوئے تھے۔ اور عرب ملت اسماعیلی پر عمل پیرا تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں دو باتیں تھیں: ایک: یہ کہ عرب ہی آپؐ کے دین کے مددگار ہوں گے۔ وہی آپؐ کے بعد روئے زمین پر حق کا اعلان کریں گے اور وہی آپؐ کی امت میں آپؐ کے جانشین ہوں گے۔ دوسری: یہ کہ یہود میں سے بس برائے نام ہی کچھ لوگ ایمان لائیں گے ــــ اور عربوں کے نزدیک کعبہ شعائر اللہ میں سے تھا۔ اور نماز میں اس کی طرف منہ کرنا ان میں شائع ذائع تھا۔ پس اس سے عدول کا کوئی جواز نہیں تھا، اس لئے اسی کو ہمیشہ کے لئے قبلہ تجویز کیا گیا۔

فائدہ: پہلی بار تحویل وحی جلی سے ہوئی تھی یا اجتہادِ نبوی سے؟ حضرت حسن بصری، عکرمہ اور ابوالعالیہ کے نزدیک ــــ

جوتینوں اکابر تابعین میں سے ہیں ـــــ اجتہاد ورائے سے تحویل ہوئی تھی۔ جو حکماً وحی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ مگر جمہور کے نزدیک وہ تحویل بھی اللہ کے حکم اور وحی صریح سے ہوئی تھی، اگرچہ وہ وحی غیر متلو تھی۔ اور آیت پاک: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا﴾ کے اشارہ سے جمہور ہی کی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے اگرچہ ﴿جَعَلْنَا﴾ میں اسناد کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ "گفتہ او گفتہ اللہ بود" کے قبیل سے ہے۔ مگر حقیقت مجاز سے اولی ہے۔ پھر جب یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب رائے عالی بدلی اور اس امت کے لئے کعبہ کا قبلہ ہونا مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ نظر آیا تو آپ نے اجتہاد سے قبلہ کیوں نہیں بدلا، وحی کا انتظار کیوں کیا؟ تو اس کا کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم۔

﴿القبلة﴾

لما قَدِمَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم المدينةَ صلى إلى بيت المقدس ستةَ أو سبعةَ عشر شهرًا، ثم أُمر أن يستقبل الكعبةَ، فاستقر الأمر على ذلك:

أقول: السر في ذلك: أنه لما كان تعظيمُ شعائر الله وبيوتِه واجبًا، لاسِيَّمَا فيما هو أصلُ أركانِ الإسلام، وأُمُّ القُرُبات، وأشهرُ شعائر الدين، وكان التوجهُ في الصلاة إلى ماهو مختص بالله بطلب رِضَا الله بالتقرب منه: أَجْمَعَ للخاطر، وأَحَثَّ على صفة الخشوع، وأقربَ لحضور القلب، لأنه يُشبه مواجَهَةَ المِلك في مناجاته: اقتضت الحكمةُ الإلٰهية أن يُجعل استقبالُ قبلةٍ مَّا شرطًا في الصلاة في جميع الشرائع.

وكان إبراهيم وإسماعيلُ عليهما السلام، ومن تَدَيَّنَ بدينهما، يستقبلون الكعبة، وكان إسرائيلُ عليه السلام وبنوه يستقبلون بيتَ المقدس، هذا هو الأصل المسلَّمُ في الشرائع.

فلما قدِم النبيُّ صلى الله عليه وسلم المدينةَ، وتوجَّهَتِ العنايةُ إلى تأليف الأوس والخزرج، وحلفائِهم من اليهود، وصاروا هم القائمين بنصرته، والأمةَ التي أُخرجت للناس، وصارت مُضَرُ وماوالاها أعدائ أعاديه، وأبعدَ الناس عنه: اجتهد وحكم باستقبال بيت المقدس.

إذا الأصلُ أن يُراعَى في أوضاع القربات حالُ الأمة التي بُعث الرسول فيها، وقامت بنصرته، وصارت شهداءَ على الناس، وهم الأوس والخزرج يومئذ.

وكانوا أخضعَ شيئ لعلوم اليهود، بَيَّنَهُ ابنُ عباس رضي الله عنه في تفسير قوله تعالى: ﴿فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ﴾ حيث قال: " إنما كان هذا الحيُّ من الأنصار، وهم أهلُ وَثَنٍ، مع هذا الحيِّ من اليهود، وهم أهل الكتاب، فكانوا يَرَوْنَ لهم فضلاً عليهم في العلم، فكانوا يقتدون بكثير

من فعلهم'' الحديث.

وأيضاً: الأصلُ أن تكون الشرائعُ موافِقةً لما عليه المللُ الحقةُ، مالم تكن من تحريفات القوم وتعمُّقاتهم، ليكون أتمَّ لإقامة الحجة عليهم، وأشدَّ لطُمَأْنِيْنَةِ قلوبهم. واليهودهم القائمون برواية الكتاب السماوى، والعمل بما فيه.

ثم أحكم الله آياتِه، وأَطْلَعَ نبيَّه على ماهو أوفقُ بالمصلحة من هذا، وأقعدُ بقوانين التشريع، بالنفث فى رُوعه أولاً، فكان يتمنّٰى أن يؤمر باستقبال الكعبة، وكان يقلِّب وجْهَهُ فى السماء، طمعًا أن يكون جبرائيلُ نزل بذلك، وبما أنزل فى القرآن العظيم ثانياً.

وذلك: لأن النبى صلى الله عليه وسلم بُعث فى الأميين الآخذين بالملة الإسماعيلية، وقدَّر الله فى سابق عليه: أنهم هم القائمون بنصرة دينه، وهم شهداءُ الله على الناس من بعدِه، وهم خلفاؤُه فى أمته، وأن اليهودَ لايؤمنُ منهم إلا شِرْذِمَةٌ قليلة، والكعبةُ من شعائر الله عند العرب، أُذْعَنَ لها أقاصيهم وأدانيهم، وجرتِ السنةُ عندهم باستقبالها شائعًا ذائعًا، فلا معنى للعدول عن ذلك.

ترجمہ: قبلہ کا بیان: جب نبی ﷺ مدینہ میں تشریف لائے، تو سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ پھر آپؐ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیئے گئے۔ پھر معاملہ اس پر ٹھہر گیا۔

میں کہتا ہوں: کہ جب شعائر اللہ اور بیت اللہ کی تعظیم واجب تھی۔ خاص طور پر اس عبادت میں جو ارکانِ اسلام کی اصل ہے، اور تمام عبادتوں کی ماں ہے اور شعائر دینیہ میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اور نماز میں اس چیز کی طرف رخ پھیرنا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے، اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، ان کے تقرب کے ذریعہ: (یہ بات) زیادہ جمع کرنے والی تھی دل کو، اور زیادہ ابھارنے والی تھی صفتِ خشوع پر، اور زیادہ قریب تھی حضورِ قلب سے۔ اس لئے کہ نماز بادشاہ سے رُوبرو گفتگو کے مشابہ ہے اس سے سرگوشی کرنے میں: تو (مذکورہ دووجوہ سے) حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ کسی نہ کسی قبلہ کی طرف منہ کرنا نماز میں شرط کیا جائے سبھی شریعتوں میں۔

اور ابراہیم واسماعیل علیہما السلام اور وہ لوگ جنھوں نے ان کا دین اختیار کیا تھا: کعبہ کی طرف منہ کیا کرتے تھے۔ اور اسرائیل علیہ السلام اور ان کے بیٹے بیت المقدس کی طرف منہ کیا کرتے تھے۔ اور یہی وہ مسلّمہ اصل ہے شریعتوں میں۔

پس جب نبی ﷺ مدینہ میں فروکش ہوئے۔ اور توجہ عالی منعطف ہوئی اوس وخزرج اور یہود میں سے ان کے حلیفوں کی تالیف کی طرف۔ اور وہی آپؐ کی نصرت کے لئے کھڑے ہونے والے ہوگئے۔ اور وہی وہ امت بن گئے جو وجود میں لائی گئی ہے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے۔ اور مضر قبیلہ اور وہ قبائل جنھوں نے ان سے دوستی کی تھی، آپؐ کے سب سے بڑے دشمن بن گئے، تو آپؐ نے اجتہاد فرمایا۔ اور بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ لحاظ رکھا جائے عبادتوں کے احوال میں اُس امت کی حالت کا جس کی طرف رسول مبعوث کیا گیا ہے، اور جو اس رسول کی نصرت کے لئے کھڑی ہوئی ہے، اور جو لوگوں پر گواہ بن گئی ہے (یعنی دنیا جہاں کے لوگوں کے سامنے اعلانِ حق کے لئے تیار ہوگئی ہے) اور وہ اس وقت میں اوس وخزرج تھے۔

اور وہ ہر چیز سے زیادہ فرمانبرداری کرنے والے تھے یہود کے علوم کی۔ یہ بات بیان کی ہے ابن عباسؓ نے اللہ کے ارشاد: ''پس آؤ تم تمہاری کھیتی میں جدھر سے چاہو'' کی تفسیر میں۔ چنانچہ آپؓ نے فرمایا: ''انصار کا یہ قبیلہ، درانحالیکہ وہ بت پرست تھے، یہود کے اس قبیلہ کے ساتھ تھے درانحالیکہ وہ اہل کتاب تھے پس وہ ان کے لئے اپنے اوپر برتری دیکھا کرتے تھے، پس پیروی کرتے تھے وہ ان کی بہت سے کاموں میں' حدیث آخر تک پڑھیں (آگے حدیث میں ابن عمرؓ پر رد ہے۔ ابن عمرؓ اولاً أنی کا مطلب یہ بیان کرتے تھے کہ بیوی سے دونوں راہوں میں صحبت جائز ہے۔ ابن عباس نے فرمایا: اللہ ان کی مغفرت فرمائے! آیت کا یہ مطلب نہیں ہے الی آخرہ۔ یہ روایت ابوداؤد وغیرہ میں ہے)

اور نیز: ضابطہ یہ ہے کہ قوانین موافق ہوں اس بات کے جس پر برحق ملتیں ہیں (یعنی اوس وخزرج کے مندروں کو ان کی دل جوئی کے لئے قبلہ بنانا جائز نہیں۔ برحق ملتوں میں جو باتیں ہیں انہی کو نئی شریعت میں لیا جائے گا) بشرطیکہ نہ ہو وہ بات لوگوں کی تحریفات سے اور ان کے تعمقات سے (یعنی یہود کی شریعت کی بھی ہر بات نہیں لی جاسکتی۔ کیونکہ انھوں نے اپنی شریعت میں بہت کچھ تحریف کر دی ہے اور بہت سی باتیں غلو کرتے ہوئے بڑھادی ہیں) تاکہ ہو وہ زیادہ تمام ان پر دلیل قائم کرنے کے لئے اور مضبوط بات ان کے دلوں کے اطمینان کے لئے۔ اور یہود ہی کھڑے ہونے والے تھے آسمانی کتاب کی روایت کے ساتھ اور اس بات پر عمل کرنے کے ساتھ جو اس میں ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی آیتیں پختہ کیں۔ اور نبی ﷺ کو اس بات سے واقف کیا جو کہ وہ مصلحت سے زیادہ موافق ہے اِس (بیت المقدس) سے، اور قانون سازی کے ضوابط سے زیادہ ہم آہنگ ہے، پھونکنے کے ذریعہ دل میں اولاً۔ پس تمنا کیا کرتے تھے آپؐ کہ حکم دیئے جائیں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا۔ اور اٹھایا کرتے تھے آپؐ رخ مبارک آسمان کی طرف اس طمع سے کہ ہوسکتا ہے جبرئیل یہ حکم لے کر اتریں۔ اور ثانیاً ان آیات کے ذریعہ جو اللہ پاک نے قرآن عظیم میں اتاریں (دوسرے پارے کے شروع کی آیتیں مراد ہیں)

اور یہ بات اس لئے ہے کہ نبی ﷺ مبعوث کئے گئے ہیں اُمیوں میں، جو ملّتِ اسماعیل کے پیروکار تھے۔ اور اللہ نے اپنے علم ازلی میں طے فرمایا تھا کہ وہی (امی لوگ) کھڑے ہونے والے ہیں آپؐ کے دین کی نصرت کے لئے۔ اور وہی اللہ کے گواہ ہیں لوگوں پر آپؐ کے بعد، اور وہی آپؐ کے نائبین ہیں آپؐ کی امت میں۔ اور یہ کہ یہود نہیں ایمان لائیں گے ان میں سے مگر بہت تھوڑے لوگ۔ اور کعبہ عربوں کے نزدیک شعائر اللہ میں سے تھا۔ فروتنی کرتے تھے اس کے سامنے ان کے دور کے لوگ اور ان کے قریب کے لوگ۔ اور ان کے نزدیک طریقہ جاری تھا کعبہ کی طرف منہ کرنے

کا شائع ذائع طور پر۔ پس کوئی معنی نہیں تھے اس سے روگردانی کرنے کے۔

ترکیب: مختص باللہ میں جارمجرور مختص سے متعلق ہیں اور بطلب رضا اللہ متعلق ہے التوجہ سے اور بالتقرب منہ متعلق ہے طلب سے...... اولاً کا تعلق أطلع سے ہے اور ثانیاً کا بما أنزل سے۔

☆ ☆ ☆

استقبالِ قبلہ شرط ہے تو تحری میں غیر قبلہ کی طرف نماز کیوں ہوجاتی ہے؟

باب کے آخر میں ایک سوال مقدر کا جواب دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نماز میں استقبالِ قبلہ شرط ہے تو جس طرح طہارت، ستر پوشی کے بغیر اور نماز کا وقت ہونے سے پہلے نماز درست نہیں، اسی طرح استقبالِ قبلہ کے بغیر بھی نماز درست نہ ہونی چاہئے۔ حالانکہ قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں تحری کرکے نماز پڑھ لی جائے، پھر خطا ظاہر ہو تو نماز ہوجاتی ہے۔ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب: یہ ہے کہ شرط اور شرط میں فرق ہے۔ طہارت وغیرہ تو اس لئے شرط ہیں کہ ان کے بغیر نماز کی حقیقت ہی متحقق نہیں ہوتی۔ اور استقبالِ قبلہ کی صورت حال یہ نہیں ہے۔ یہ صرف نماز کی تکمیل اور نماز میں ملت کی شیرازہ بندی کے لئے شرط ہے۔ نماز کا اصل فائدہ اس کے بغیر بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ایک اندھیری رات میں صحابہ نے تحری کرکے نماز تہجد پڑھی۔ صبح خطا ظاہر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا آپؐ نے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۵ تلاوت فرمائی: ''تم لوگ جس طرف منہ کرو اُدھر اللہ تعالیٰ کا رخ ہے'' یہ آیت تلاوت فرما کر اشارہ کیا کہ پیش آمدہ صورت میں بربنائے ضرورت نماز ہوگئی۔

[۱] ولما كان استقبال القبلة شرطًا، إنما أريد به تكميلُ الصلاة، وليس شرطًا لايتأتّى أصلُ فـائـدة الصلاة إلا به، تلا رسول الله صلى الله عليه وسلم فيمن تحرّى في ليلةٍ مُظْلِمة، وصلّى لغير القبلة، قولَه تعالىٰ: ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ يُوْمِي إلى أن صلاتهم جائزة للضرورة.

ترجمہ: (۱) اور جب استقبالِ قبلہ شرط تھا، مراد لی گئی تھی اس سے صرف نماز کی تکمیل۔ اور نہیں تھی ایسی شرط کہ نہ حاصل ہو نماز کا اصل فائدہ مگر اس کے ذریعہ، تو پڑھی رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے حق میں جس نے تحری کی تھی تاریک رات میں، اور نماز پڑھی تھی قبلہ کے علاوہ جہت کی طرف سورۃ البقرہ کی یہ آیت: ''پس جدھر بھی تم رخ پھیرو، اسی جانب اللہ کا چہرہ ہے'' اشارہ فرمارہے ہیں آپؐ اس طرف کہ ان کی نماز درست ہے، بربنائے ضرورت۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۸

سُترہ کا بیان

نمازی کے سامنے سے گذرنا کیوں منع ہے؟

حدیث ـــــ حضرت ابوجُہیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر نمازی کے سامنے سے گذرنے والا جان لے اس گناہ کو جو اس پر لازم آتا ہے تو البتہ یہ بات کہ وہ چالیس (سال) ٹھہرا رہے بہتر ہے اس سے کہ وہ اس کے سامنے سے گذرے'' (مشکوۃ حدیث ۷۷۶)

تشریح: نمازی کے سامنے سے گذرنے کی ممانعت تین وجوہ سے ہے:

پہلی وجہ ـــــ حقِ شعائر کی وجہ سے ـــــ نماز شعائر اللہ میں سے ہے۔ اور شعائر اللہ کی تعظیم واجب ہے۔ پس جو نمازی کے سامنے سے گذرتا ہے وہ شعائر اللہ کی توہین کرتا ہے۔ اور یہ بات کسی مؤمن کے شایانِ شان نہیں۔

دوسری وجہ ـــــ حقِ نماز کی وجہ سے ـــــ جس طرح آقا کے سامنے اس کے غلام باادب کھڑے ہوتے ہیں، اور دست بستہ حاضری دیتے ہیں، اسی طرح نماز میں بھی ان کی مشابہت اختیار کرنا پیش نظر ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ: ''جب کوئی نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ پروردگار ہی سے سرگوشی کرتا ہے۔ اس کا پروردگار اس کے اور قبلہ کے درمیان ہے'' اس کے بعد قبلہ کی طرف تھوکنے کی ممانعت کا تذکرہ ہے (مشکوۃ حدیث ۷۴۶) پس نماز کی تعظیم میں سے یہ بات ہے کہ کوئی نمازی کے سامنے سے نہ گذرے، کیونکہ آقا اور اس کے سامنے کھڑے ہوئے غلاموں کے بیچ میں سے گذرنا بڑی بے ادبی کی بات ہے۔

تیسری وجہ ـــــ حقِ نمازی کی وجہ سے ـــــ نمازی کے سامنے سے گذرنے کی وجہ سے کبھی نمازی کا دل پراگندہ ہوجاتا ہے۔ اور اس کا نماز کا سارا لطف ختم ہوجاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے نمازی کو یہ حق دیا گیا ہے کہ گذرنے والے سے لڑے۔ متفق علیہ روایت ہے کہ: ''جب کوئی کسی چیز کا سترہ بنا کر نماز پڑھ رہا ہو، پھر کوئی سامنے سے گذرنا چاہے تو اس کو دفع کرے۔ پس اگر وہ نہ مانے تو اس سے لڑے، کیونکہ وہ شیطان ہے'' (مشکوۃ حدیث ۷۷۷)

﴿ السُّترة ﴾

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " لو يعلَم المارُّ بين يَدَىِ المصلي: ماذا عليه؟ لكان أن يقِفَ أربعين خيرًا له من أن يَمُرَّ بين يدَيْهِ"

أقول: السرُّ في ذلك: أن الصلاة من شعائر الله، يجب تعظيمُها، ولما كان المنظورَ في الصلاةِ

التشبهُ بقيام العبيد بخدمة مواليهم، ومُثُولِهم بين أيدهم، كان من تعظيمها: أن لا يَمُرَّ المارُّ بين يدى المصلِّى، فإن المرورَ بين السيِّد وعبيدِه القائمين إليه سوءُ أدبٍ، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " إن أحدَكم إذا قام في الصلاة، فإنما يناجي ربَّه، وأن ربَّه بينه وبين القبلة" الحديثَ.

وضُمَّ مع ذلك: أن مروره ربما يؤدِّى إلى تشويش قلب المصلِّى، ولذلك كان له حقٌّ فى دَرْئِه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "فَلْيُقَاتِلْه فإنه شيطان"

ترجمہ: سترہ کا بیان: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر گیا) میں کہتا ہوں: اس میں راز یہ ہے کہ نماز شعائر اللہ میں سے ہے۔ اور اس کی تعظیم واجب ہے ——— اور جب نماز میں پیش نظر تھا مشابہت اختیار کرنا غلاموں کے کھڑے ہونے کے ساتھ اپنے مالکوں کی خدمت میں، اور ان کے حاضر ہونے کے ساتھ ان کے سامنے، تو نماز کی تعظیم میں سے یہ بات تھی کہ نہ گذرے گذرنے والا نمازی کے سامنے سے۔ پس بیشک آقا اور اس کے اُن غلاموں کے درمیان سے گذرنا جو اس کے سامنے کھڑے ہیں: بے ادبی ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے (ترجمہ گذر چکا ہے)

اور ملائی گئی ہے اس کے ساتھ یہ بات کہ اس کا گذرنا کبھی پہنچاتا ہے نمازی کے دل کو پراگندہ کرنے تک۔ اور اسی وجہ سے اس کے لئے حق ہے، اس کو دفع کرنے کا اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''پس چاہئے کہ لڑے وہ اس سے، پس بیشک وہ شیطان ہے''

☆ ☆ ☆

عورت، گدھے اور کالے کتّے کے گذرنے سے نماز فاسد ہوتی ہے؟

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز کو عورت، گدھا اور کالا کتا کاٹتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۷۷۸)

تشریح: حدیث کا مدعی یہ ہے کہ نماز کی صحت کے لئے نماز کی جگہ کا عورت، گدھے اور کتے سے خالی ہونا شرط ہے (اگر ان میں سے کوئی آس پاس ہوگا تو نماز نہیں ہوگی) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز سے مقصود اللہ پاک کے ساتھ سرگوشی اور رب العالمین کے روبرو حاضری ہے۔ اور عورت، گدھا اور کتا اس مقصد میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے نماز فاسد ہو جاتی ہے:

(۱) ——— عورت تو اس لئے کہ عورتوں سے اختلاط، ان کی نزدیکی اور ان کی مصاحبت میں احتمال ہے کہ توجہ اصل مقصد سے ہٹ جائے۔

(۲) ——— اور کتا شیطان اُس وجہ سے ہے جس کا تذکرہ تطهير النجاسات کے عنوان کے تحت آچکا ہے کہ وہ

دھتکارا ہوا جانور ہے اور فرشتے اس سے نفرت کرتے ہیں، اور اس کے پالنے کی ممانعت ہے۔ اور کالا کتا اور بھی بُرا ہے۔ اس کا مزاج خراب ہوتا ہے۔ اور جنونِ سگ (ہڑک) سے وہ جلدی متاثر ہوتا ہے۔

(۳)——— اور گدھا بھی شیطان کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ اکثر انسانوں کے سامنے ہی اپنی مادہ پر چڑھتا ہے اور کبھی اس کے آلہ میں انتشار ہوتا ہے۔ جس کو دیکھنا اس مقصد میں خلل ڈالتا ہے جو نمازی کے پیش نظر ہے۔

مگر اس حدیث سے جو نماز کا فساد مفہوم ہوتا ہے اس کو حفاظ وفقہائے صحابہ نے نہیں لیا۔ جیسے حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، اور حضرت ابوسعید خدری اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم۔ ان حضرات کے خیال میں یہ روایت منسوخ ہے۔ مگر جن روایات سے انھوں نے نسخ پر استدلال کیا ہے اس میں بھی کلام ہے۔ کیونکہ ان روایات کا مؤخر ہونا متعین نہیں۔ وہ مقدم بھی ہوسکتی ہیں۔

غرض: اخذ شریعت کے جو دو طریقے ہیں: اخذ ظاہر یعنی آنحضور ﷺ سے حکم روایت کرنا۔ اور اخذ دلالۃً یعنی آپؐ کے طرز عمل سے حکم اخذ کرنا جسکی تفصیل مبحث ۷ باب ۳ میں گذری ہے۔ یہ دونوں طریقے اس مسئلہ میں مختلف ہوگئے ہیں۔ روایت تو وہ ہے جو اوپر گذری کہ نماز فاسد ہوجاتی ہے[1]۔ مگر آپؐ کا عمل اسکے خلاف تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کے سامنے جنازہ کی طرح پڑی رہتی تھی اور آپ نماز پڑھتے تھے (مشکوۃ حدیث ۷۷۹) اور ابن عباسؓ نے ایک مرتبہ اپنی گدھی نمازیوں کی صف کے سامنے چھوڑ دی تھی اور کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا (مشکوۃ حدیث ۷۸۰)

فائدہ: اگر مذکورہ حدیث میں قطع صلاۃ سے فساد صلوٰۃ مراد نہ لیا جائے۔ بلکہ قطعِ وُصلہ (ربط) مراد لیا جائے تو روایات میں کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ اور عورت سے مراد مرغوبات اور گدھے سے مراد مستقذرات (گھناؤنی چیزیں) اور کالے کتے سے مراد مخوفات (ڈراؤنی چیزیں) ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں خنزیر، یہودی اور مجوسی کا تذکرہ آیا ہے (مشکوۃ حدیث ۷۸۹) اور عورت کا تذکرہ مرغوبات کا اعلیٰ فرد ہونے کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں حائضہ یعنی بالغہ ہونے کی قید بھی آئی ہے، کیونکہ رغبت بالغہ عورت ہی کی طرف ہوتی ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا کہ تم نے ہمیں گدھوں اور کتوں کے برابر کردیا، اس کا جواب بھی نکل آیا کہ برابر نہیں کیا۔ بلکہ عورت کو اس کی نوع (مرغوبات) کا اعلیٰ فرد قرار دیا ہے۔ غرض اس قسم کی چیزیں جب نمازی کے سامنے آتی ہیں تو یقیناً توجہ بٹتی ہے اور یہی قطع صلوٰۃ سے مراد ہے۔ واللہ اعلم

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "تقطعُ الصلاةَ المرأةُ، والحمار، والكلب الأسود"
أقول: مفهوم هذا الحديث: أن من شروط صحة الصلاة خلوصُ ساحَتِها عن المرأة، والحمار،

[1] یہ روایت مسلم شریف کی ہے۔ اور ابوداؤد (حدیث ۷۱۹) میں جو اس کے خلاف روایت ہے کہ: "نماز کو کوئی چیز نہیں کاٹتی" (مشکوۃ حدیث ۷۸۴) یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کا ایک راوی مجالد بن سعید ضعیف ہے۔ یہ راوی سیئُ الحفظ ہے یعنی اس کو روایات ڈھنگ سے یاد نہیں تھیں۔ پھر اس حدیث میں اضطراب بھی ہے ۱۲

والكلب، والسر فيه: أن المقصود من الصلاة هو المناجاة، والمواجهةُ مع ربّ العالمين؛ واختلاط النساء، والتقرُّب منهن، والصحبة معهن: مظنة الالتفات إلى ما هو ضدُّ هذه الحالة؛ والكلب: شيطان لما ذكرنا، لاسيما الأسودُ، فإنه أقرب إلى فساد المزاج وداءِ الكلب؛ والحمار أيضًا بمنزلة الشيطان، لأنه كثيرًا مَّا يُسافِدُ بين ظهرانَيْ بني آدم، أو ينتشر ذكره، فتكون رؤيةُ ذلك مخلةً بما هو بصدده.

لكن لم يعمل به حفاظ الصحابة وفقهاؤ هم، منهم علي، وعائشةُ، وابنُ عباس، وأبو سعيد، وغيرُهم رضي الله عنهم، ورأوه منسوخًا، وإن كان في استدلالهم على النسخ كلام، وهذا أحد المواضع التي اختلف فيها طريقا التلقي من النبي صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ”نماز کو کاٹتی ہے عورت، گدھا اور کالا کتا“ میں کہتا ہوں: اس حدیث کا مدعیٰ یہ ہے کہ نماز کی صحت کی شرطوں میں سے نماز کے میدان کا عورت، گدھے اور کتے سے خالی ہونا ہے ——— اور راز اس میں یہ ہے کہ نماز سے مقصود مناجات ہے۔ اور رب العالمین کے روبرو حاضری ہے۔ اور عورتوں سے اختلاط، ان کی نزدیکی اور ان کی مصاحبت: احتمالی جگہ ہے اُس چیز کی طرف التفات کی جو کہ وہ اس حالت (مناجات ومواجہہ) کے برخلاف ہے۔ اور کتا شیطان ہے اُس وجہ سے جو ہم نے ذکر کی۔ بالخصوص کالا کتا (وہ بڑا شیطان ہے) پس بیشک وہ زیادہ نزدیک ہے فسادِ مزاج سے، اور کتے کی بیماری (ہڑک) سے۔ اور گدھا بھی بمنزلۂ شیطان ہے، اس لئے کہ وہ بار بار جفتی کرتا ہے انسانوں کے سامنے یا اس کے آلہ میں انتشار ہوتا ہے۔ پس اس کا دیکھنا خلل ڈالنے والا ہوتا ہے اُس مقصد میں جس کے درپے نمازی ہے۔

لیکن نہیں عمل کیا اس حدیث پر حفاظ صحابہ اور ان کے فقہاء نے ان میں سے علی، عائشہ، ابن عباس، ابو سعید اور ان کے علاوہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہو۔ اور دیکھتے ہیں وہ اس کو منسوخ، اگرچہ ان کے نسخ پر استدلال میں کلام ہے۔ اور یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے، جس میں مختلف ہوئے ہیں نبی ﷺ سے اخذ شریعت کے دونوں طریقے۔

☆ ☆ ☆

سُترہ کی حکمت

حدیث ——— حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی شخص اپنے سامنے کجاوے کی پچھلی لکڑی جیسی چیز رکھ لے تو چاہئے کہ نماز پڑھے، اور نہ پرواہ کرے اس کی جو اس کے پرے سے گذرے“ (مشکوۃ حدیث ۷۷۵)

تشریح: نمازی کے سامنے سے گذرنے کی جو اوپر ممانعت آئی ہے اس پر عمل کرنے میں بعض مرتبہ تنگی پیش آتی ہے۔ اس لئے اس حدیث میں نمازی کو حکم دیا کہ وہ سترہ قائم کر کے نماز پڑھے تا کہ کسی گذرنے والے کو پریشانی نہ ہو۔

کیونکہ سترہ سے نمازی کی جگہ سرسری نظر ہی میں ممتاز ہوجاتی ہے۔ پس گذرنے والا نمازی کے سامنے سے نہیں گذرے گا۔ بلکہ سترہ کے پرے سے گذرے گا۔ اور سترہ کے پرے سے گذرنے والا گویا بہت دور سے گذرنے والا ہے، پس اس کی پروا کئے بغیر نماز جاری رکھنی چاہئے۔

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا وضع أحدُكم بين يديه مثلَ مُؤْخِرَةِ الرَّحل، فليصلِّ، ولايبالِ بمن مَرَّ وراء ذلك"

أقول: لَمَّا كان في ترك المرور حرجٌ ظاهر، أَمَرَ بنصب السترة، لتتميز ساحةُ الصلاة باديَ الرأى، فَيُلْحَقَ بالمرور من بُعْدٍ.

ترجمہ: (۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ آ گیا) میں کہتا ہوں: جب ترک مرور میں کھلا حرج تھا، تو آپؐ نے حکم دیا سترہ قائم کرنے کا، تاکہ نماز کی جگہ سرسری نظر ہی میں ممتاز ہوجائے۔ پس ملایا جائے وہ (گذرنے والا) دور سے گذرنے والے کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

باب ــــــ ۹

نماز میں ضروری امور

نماز میں بنیادی چیزیں تین ہیں: خضوع، ذکر اور تعظیم

نماز میں بنیادی چیزیں تین ہیں: اول: دل سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا۔ دوم: زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا۔ سوم: بدن سے غایت درجہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم بجالانا ـــــ دنیا کی تمام امتیں اس پر متفق ہیں کہ یہ تین چیزیں نماز کی اصل حقیقت ہیں۔ اس لئے دیگر چیزوں میں مثلاً رکوع وسجود میں تو امتوں میں اختلاف ہے، مگر ان تین چیزوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور اسی وجہ سے عذر کی صورت میں نبی کریم ﷺ نے ان تین چیزوں کے علاوہ بھی ارکان نماز میں رخصت دی ہے۔ مگر ان تین میں کوئی سہولت نہیں دی۔ دارمی (۱:۳۷۱) اور مسند احمد (۵:۴۱۸) میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پانچ رکعت وتر پڑھو، پس اگر اس کی استطاعت نہ ہوتو تین رکعت پڑھو، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہوتو ایک رکعت پڑھو، پھر اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہوتو کچھ اشارہ کرلو"

فائدہ: مذکورہ روایت قابل استدلال نہیں۔ یہ سفیان بن حسین واسطی کی امام زہری سے روایت ہے۔ اور یہ راوی

اگر چہ ثقہ اور مسلم شریف کا راوی ہے، مگر امام زہری کی روایتوں میں بالاتفاق ضعیف ہے (تقریب) اور ابوداؤد شریف (حدیث ۱۴۲۲) میں بکر بن وائل کی جو روایت امام زہری سے ہے اس میں یہ آخری جزء اشارہ کرنے کا نہیں ہے۔ اور بکر امام زہری سے روایت کرنے میں بھی ثقہ ہیں اور مسلم شریف کے راوی بھی ہیں اور کسی فقیہ نے بھی صرف اشارہ کر لینے کی اجازت نہیں دی۔

﴿الأمور التي لابد منها في الصلاة﴾

اعلم: أن أصلَ الصلاة ثلاثةُ أشياءَ: أن يَخْضَعَ لله تعالى بقلبه، ويذكرَ اللّٰهَ بلسانه، ويعظِّمَه غاية التعظيم بجسده؛ فهذه الثلاثة: أجمع الأممُ على أنها من الصلاة، وإن اختلفوا فيما سوى ذلك، وقد رخَّص النبيُّ صلى الله عليه وسلم عند الأعذار في غير هذه الثلاثة، ولم يرخِّص فيها، وقد قال النبيُّ صلى الله عليه وسلم في الوتر: "إن لم تستطع فأَوْمِ إيماءً"

ترجمہ: نماز میں ضروری امور: جان لیں کہ نماز کی اصل تین چیزیں ہیں: یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے دل سے عاجزی کرے اور اپنی زبان سے اللہ کو یاد کرے اور اپنے جسم سے اللہ تعالیٰ کی انتہائی تعظیم بجالائے۔ پس یہ تین باتیں: امتوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ وہ نماز سے ہیں۔ اگر چہ انھوں نے اختلاف کیا ہے ان کے علاوہ میں۔ اور تحقیق سہولت دی ہے نبی صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اعذار کی صورت میں ان تین کے علاوہ میں۔ اور نہیں سہولت دی ان تین میں۔ اور تحقیق فرمایا ہے نبی صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے وتر کے سلسلہ میں کہ: ''اگر نہ طاقت رکھے تو، تو اشارہ کر اشارہ کرنا''

☆ ☆ ☆

نماز دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے

(ضروری اور مستحب)

شریعت نے نماز میں دو قسم کی چیزیں شامل کی ہیں: ایک: ضروری امور، جن کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ دوم: مستحب چیزیں، جن کی وجہ سے نماز اتم و اکمل ہوتی ہے اور نماز کا فائدہ بخوبی بدست آتا ہے: ضروری امور کا بیان اس باب میں ہے اور مستحب امور کا بیان آئندہ باب میں دیکھیں:

نماز میں ضروری امور ـــــ تین قسم کی چیزیں ہیں: فرض، واجب اور سنتِ مؤکدہ غایتِ تاکید:

فرض: وہ ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چھوٹ جائے، خواہ عمداً چھوٹ جائے یا بھول سے، تو نماز باطل ہوجاتی ہے اور اس کا دوبارہ اعادہ ضروری ہوتا ہے، جیسے رکوع وسجود وغیرہ۔

اور واجب: وہ امور ہیں، جن کے چھوڑنے سے نماز میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ پھر اگر بھول سے چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو سے اس کی تلافی ہوجائے گی۔ اور اگر بالقصد چھوڑ دیا ہو تو سجدۂ سہو سے اس کی تلافی نہ ہوگی۔ بلکہ وقت میں اس کا اعادہ واجب ہے۔ اور وقت نکل جانے کے بعد اعادہ مستحب ہے۔ جیسے فاتحہ پڑھنا اور سورت ملانا احناف کے نزدیک۔

اور سنتِ مؤکدہ غایتِ تاکید: وہ امور ہیں جن کے ترک پر سخت وعید آئی ہے۔ مگر اس سے نماز میں کمی واقع ہونے کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے تعدیلِ ارکان احناف کے قول پر۔

مذکورہ تینوں مراتب کے درمیان فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ اور ایسی کوئی صریح نص بھی موجود نہیں جو مذکورہ مراتب کی تعیین کرتی ہو۔ نہ اس سلسلہ میں اجماع ہے۔ بلکہ اکثر امور میں شدید اختلاف ہے۔ مثلاً نماز میں فاتحہ فرض ہے یا واجب؟ یہی طے نہیں۔ صرف چند چیزیں متفق علیہ ہیں مثلاً قیام اور رکوع وسجود کی فرضیت متفق علیہ ہے۔

وہ قرائن جن سے ضروری امور کی تعیین کی جاسکتی ہے: درج ذیل ہیں:

① —— بنیادی روایت اس سلسلہ میں حضرت خلاد بن رافع رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ جنھوں نے بے ڈھنگی نماز پڑھی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہوکر صحابہ کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے کہ حضرت خلاد آئے اور ایک طرف نماز پڑھنے لگے۔ نماز سے فارغ ہوکر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''واپس جاؤ، دوبارہ نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی!'' وہ گئے اور حسب سابق نماز پڑھ کر پھر حاضر ہوئے۔ آپؐ نے پھر یہی فرمایا۔ اس طرح دو یا تین بار لوٹایا۔ آخر میں انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے ایسی ہی نماز پڑھنی آتی ہے۔ آپؐ مجھے سکھلائیں کہ نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جب آپ نماز کا ارادہ کریں تو پہلے کامل وضو کریں، پھر قبلہ کی طرف منہ کریں، پھر تکبیر کہیں، پھر تمہیں جو قرآن یاد ہو، اس میں سے جتنا آسانی سے پڑھ سکتے ہو، پڑھو۔ پھر باطمینان رکوع کرو، پھر بالکل سیدھے کھڑے ہوجاؤ۔ پھر باطمینان سجدہ کرو، پھر اٹھ کر باطمینان بیٹھ جاؤ، پھر باطمینان دوسرا سجدہ کرو، پھر باطمینان بیٹھ جاؤ۔ اسی طرح پوری نماز پڑھو''[1]

اور ترمذی کی روایت میں ہے: ''اگر تم نے اس طرح نماز پڑھی تو تمہاری نماز کامل ہوئی۔ اور اگر تم نے اس میں کمی کی تو تمہاری نماز ناقص ہوئی'' راوی کہتے ہیں: صحابہ کے لئے یہ بات پہلی بات سے آسان تھی یعنی تعدیل ارکان میں

[1] بخاری شریف حدیث ۶۲۵۱ کتاب الاستئذان باب من ردّ، فقال: علیك السلام یہ واقعہ حضرت خلاد کے بھائی حضرت رافع اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور بہت مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ کتاب میں مذکور الفاظ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ہیں۔ یہ روایت بخاری شریف میں متعدد جگہ آئی ہے۔ مگر جلسۂ استراحت کا ذکر عام طور پر روایات میں نہیں ہے۔ صرف اسی روایت میں ہے ۱۲

کمی کی تو نماز ناقص ہوئی باطل نہیں ہوئی۔

وضاحت: حضرت خلاد کی نماز میں تعدیل ارکان کی کمی تھی۔ جس پر آپؐ نے فرمایا کہ: ''تم نے نماز نہیں پڑھی'' حاضرین اس ارشاد سے یہ سمجھے کہ تعدیل ارکان فوت ہونے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ مگر آپؐ کے آخری ارشاد سے صحابہ کو اطمینان ہوا کہ تعدیل ارکان فوت ہونے سے نماز باقی رہتی ہے، اگرچہ ناقص ہوتی ہے —— یہ روایت تعدیل ارکان کی غایت درجہ اہمیت پر دلالت کرتی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ فرض ہے یا واجب یا غایت درجہ مؤکد سنت؟ یہ بات فقہائے امت کے طے کرنے کی ہے۔ اور اس کی تعیین میں اختلاف بھی ہوا ہے۔

فائدہ: فرائض سے عبادت کا قوام ہوتا ہے۔ واجبات عبادت کی صورت کی تکمیل کرتے ہیں اور سنتیں اس کی حقیقت کی تکمیل کرتی ہیں۔ حقیقت تو تمام عبادتوں میں مطلوب ہے، مگر صورت صرف نماز اور حج میں مطلوب ہے۔ اس لئے واجبات صرف ان دو عبادتوں میں ہیں۔ اور سنتیں تمام عبادات میں ہیں مثلاً وضو میں صرف اس کی حقیقت (طہارت) مطلوب ہے۔ اس کی کوئی معین صورت ضروری نہیں۔ کسی بھی طریقہ سے طہارت حاصل ہو جائے تو مطلوب حاصل ہو گیا۔ اس لئے وضوء میں سنتیں ہیں۔ واجبات نہیں ہیں۔ پس یہ بات طے کرنے میں اختلاف ہوا ہے کہ تعدیل ارکان نماز کی حقیقت کی تکمیل کرتا ہے یا صورت کی؟ احناف کا خیال ہے کہ وہ نماز کی حقیقت کی تکمیل کرتا ہے اس لئے سنت ہے اور مذکورہ حدیث کی وجہ سے اس کا درجہ عام سنتوں سے زیادہ مؤکد ہے۔ دیگر فقہاء کی رائے میں اس سے نماز کی صورت کی تکمیل ہوتی ہے، بلکہ اسی سے نماز کا قوام ہوتا ہے، اس لئے ان کے نزدیک تعدیل ارکان رکن ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) —— وہ باتیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکنیت پر دلالت کرنے والے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے: وہ باتیں یا تو فرض ہونگی یا واجب یا غایت درجہ سنت مؤکدہ۔ جیسے سورۂ فاتحہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اس کے بغیر نماز نہیں۔ یہ اگر نماز کے قوام کی نفی ہے تو فاتحہ رکن ہے، ورنہ واجب یا سنتِ مؤکدہ۔ اسی طرح تعدیل ارکان کے بارے میں فرمایا کہ جو رکوع وسجود میں پیٹھ سیدھی نہیں کرتا اس کی نماز کافی نہیں ہوتی۔ اس میں بھی یہی دونوں احتمال ہیں غرض اس طرح کی تعبیرات سے بھی مذکورہ بالا امور ثلاثہ کی تعیین ہو سکتی ہے۔

(۳) —— جز بول کر کل مراد لینا زبانوں کا عام قاعدہ ہے۔ مگر ہر جزء سے کل مراد نہیں لیتے، بلکہ اہم جزء ہی سے کل مراد لیتے ہیں۔ مثلاً جان سے ختم کرنے کے لئے کہیں گے کہ: ''گردن اڑا دونگا'' مگر یہ نہیں کہیں گے کہ: ''ناخن توڑ دونگا''۔ پس نصوص میں نماز کے جن اجزاء کو بول کر پوری نماز مراد لی گئی ہے، وہ اطلاق بھی ان اجزاء کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے، پس اس سے بھی مذکورہ امور کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ جیسے تراویح کے بارے میں ارشاد ہے کہ: ''جو رمضان میں کھڑا ہوا'' اور سورۃ البقرہ آیت ۲۳۸ میں ارشاد پاک ہے کہ: ''کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے'' ان میں لفظ قیام بول کر پوری نماز مراد لی گئی ہے۔ یا تحیۃ المسجد کو لفظ رکوع سے تعبیر کیا ہے اور سورۃ البقرہ آیت ۴۳ میں بھی نماز کو لفظ

رکوع سے تعبیر کیا ہے۔ اور سورۂ ق آیت ۴۰ میں نماز کو سجدہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۸ میں نماز فجر کا تذکرہ قراءت کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ یہ سب تعبیرات ان اجزاء کی غایت درجہ اہمیت پر دلالت کرتی ہیں۔

(۴) ——— وہ تعبیرات جو اس بات کی آگہی دیتی ہیں کہ اُس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ ایسی تعبیرات سے بھی امور ثلاثہ کی تعیین ہوسکتی ہے۔ جیسے حصر کے ساتھ فرمایا کہ: ''نماز کا تحریمہ تکبیر ہی ہے، اور نماز سے نکلنے کا طریقہ تسلیم ہی ہے'' اور قعدۂ اخیرہ کے بارے میں فرمایا کہ: ''ہر دو رکعت پر قعدہ ہے'' اور: ''جب تو نے یہ (قعدہ) کیا تو تیری نماز تام ہوئی''

(۵) ——— وہ باتیں جو مذکورہ چار باتوں کی طرح ہیں۔ پس ان کو قیاساً واجب یا سنتِ مؤکدہ قرار دیا گیا ہے۔

(۶) ——— وہ باتیں جن کی اہمیت پر امت کا اجماع ہے۔ اور وہ باتیں لوگوں میں متوارث چلی آرہی ہیں اور لوگ ان کو چھوڑنے کے روادار نہیں۔ یہ بات بھی ان کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے۔

وأراد النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن يشرع لهم في الصلاة حدَّين: حداً لا يخرُج من العهدة بأقلَّ منه، وحدًا هو الأتمُّ الأكملُ المستوفِي لفائدة الصلاة.

والحدُّ الأول: يشتمل على ما يجب إعادة الصلاة بتركه، ومايحصل فيها نقص بتركه ولايجب الإعادة، ومايُلام على تركه أشدَّ الملامة من غير جزم بالنقص. والفرقُ بين هذه المراتب الثلاثِ صَعْبٌ جدًا، وليس فيه نص صريح ولا إجماع، إلا في شيئ يسير؛ ولذلك قوِيَ الخلاف بين الفقهاء في ذلك.

والأصل فيه:

[۱] حديثُ الرجل المُسيئِ في صلاته، حيث قال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ارجع فصلِّ فإنك لم تصلِّ" مرتين أوثلاثا، ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: "إذا قمتَ إلى الصلاة فأسبغ الوضوء، ثم استقبل القبلة، فكبر، ثم اقرأ بما تيسَّر معك من القرآن، ثم اركع حتى تطمئن راكعًا، ثم ارفعْ رأسك حتى تستوي قائما، ثم اسجدْ حتى تطمئن ساجدًا، ثم ارفع حتى تطمئن جالسًا، ثم اسجدْ حتى تطمئن ساجدًا، ثم ارفع حتى تطمئن جالسًا، ثم افعَل ذلك في صلاتك كلِّها"

وفي رواية الترمذي: "فإذا فعلتَ ذلك فقد تمتْ صلاتُك، وإن انتقصت منها انتقصت من صلاتك" قال: "كان هذا أهونَ عليهم من الأول: أنه من انتقص من ذلك شيئًا انتقص من صلاته، ولم تذهب كلُّها"

[۲] وماذكره النبيُّ صلى الله عليه وسلم بلفظ الركنية، كقوله صلى الله عليه وسلم: "لاصلاةَ إلا بفاتحة الكتاب" وقولُه صلى الله عليه وسلم: "لاتجزئ صلاةُ الرجل حتى يُقيم ظهره في

الركوع والسجود"

[۳] وما سمَّى الشارعُ الصلاةَ به، فإنه تنبيهٌ بليغ على كونه ركنًا في الصلاة، كقوله صلى الله عليه وسلم:" من قام رمضان" وقوله صلى الله عليه وسلم:" فليركع ركعتين" وقوله تعالى: ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ﴾ وقوله تعالى: ﴿وَأَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ وقوله تعالى: ﴿وَقُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ وقوله تعالى: ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ﴾

[٤] وما ذكره بما يُشعر بأنه لابد منه، كقوله صلى الله عليه وسلم:" تحريمُها التكبير، وتحليلُها التسليم" وقوله صلى الله عليه وسلم:" في كل ركعتين التحيَّةُ" وقوله صلى الله عليه وسلم في التشهُّد:" إذا فعلتَ ذلك تمتْ صلاتك"

[٥] ونحو ذلك.

[٦] ومالم يختلف فيه المسلمون: أنه لابد منه في الصلاة، وتوارثوه فيما بينهم، وتلاوموا على تركه.

ترجمہ: اور نبی ﷺ نے چاہا کہ لوگوں کے لئے نماز میں دو حدیں مقرر کریں: ایک: وہ حد کہ نہ نکلے آدمی ذمہ داری سے اس سے کم سے۔ اور دوسری: وہ حد جو زیادہ تام، زیادہ کامل اور نماز کے فائدے کو پوری طرح وصول کرنے والی ہو۔

اور حد اول: مشتمل ہے: (۱) ان چیزوں پر کہ واجب ہوتا ہے نماز کا لوٹانا اس کے چھوڑنے کی وجہ سے (اسی کو شارح نے فرض سے تعبیر کیا ہے) (۲) اور اس چیز پر کہ پیدا ہوتا ہے نماز میں نقص اس کے چھوڑنے کی وجہ سے، اور نہیں واجب ہوتا لوٹانا (بلکہ سجدۂ سہو سے اس نقص کی تلافی ہو جاتی ہے۔ شارح نے اسی کو واجب سے تعبیر کیا ہے) (۳) اور اس چیز پر جس کے ترک پر ملامت کی جاتی ہے، بہت زیادہ ملامت کرنا، نقص کا یقین کئے بغیر (شارح نے اس کو غایت درجہ مؤکد سنت سے تعبیر کیا ہے) ـــــ اور ان تین مراتب کے درمیان فرق بہت ہی مشکل ہے (یعنی یہ طے کرنا مشکل امر ہے کہ کس نص میں کس مرتبہ کا حکم ہے) اور اس (سلسلہ) میں کوئی صریح نص نہیں ہے، اور نہ اجماع ہے مگر چند چیزوں میں۔ اور اس وجہ سے فقہاء کے درمیان اس سلسلہ میں بہت زیادہ اختلاف ہوا ہے۔

اور بنیادی باتیں اس بارے میں:

(۱) اس شخص کا واقعہ ہے جس نے اپنی نماز خراب طریقہ پر پڑھی تھی، چنانچہ اس سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "واپس جا، پھر نماز پڑھ، بیشک تو نے نماز نہیں پڑھی" دو بار یا تین بار۔ پھر فرمایا نبی ﷺ نے: "جب کھڑا ہو تو نماز کے لئے تو کامل وضوء کر، پھر قبلہ کی طرف منہ کر، پھر تکبیر کہہ، پھر پڑھ وہ جو آسان ہو قرآن میں سے، جو تیرے ساتھ ہے (یعنی تجھے یاد ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھنا جائز نہیں) پھر رکوع کر، یہاں تک کہ تجھے رکوع میں

اطمینان حاصل ہوجائے۔ پھر اپنا سر اٹھا، یہاں تک کہ تو سیدھا کھڑا ہوجائے۔ پھر سجدہ کر۔ یہاں تک کہ تجھے سجدہ میں اطمینان حاصل ہوجائے۔ پھر اپنا سر اٹھا۔ یہاں تک کہ تو باطمینان بیٹھ جائے۔ پھر سجدہ کر۔ یہاں تک کہ تجھے سجدہ میں اطمینان حاصل ہوجائے۔ پھر سر اٹھا۔ یہاں تک کہ تو اطمیان سے بیٹھ جائے۔ پھر تو اسی طرح کر تیری ساری نماز میں''

اور ترمذی (۳۹:۱ باب صفة الصلاة) میں روایت ہے: ''پس جب تو نے یہ کیا تو تیری نماز پوری ہوگئی۔ اور اگر تو نے اس میں کمی کی تو تو نے اپنی نماز میں کمی کی'' راوی نے کہا: ''یہ بات زیادہ ہلکی تھی لوگوں پر پہلی بات سے کہ جس نے اس میں سے کچھ کم کیا تو اس کی نماز میں سے کم ہوا۔ اور ساری نہیں گئی''

(۲) اور وہ بات جس کو نبی ﷺ نے رکنیت پر دلالت کرنے والے لفظ سے ذکر کیا ہے۔ جیسے آپ کا ارشاد: ''نماز نہیں مگر سورۂ فاتحہ کے ذریعہ'' اور آپ کا ارشاد: ''آدمی کی نماز کافی نہیں ہوتی جب تک رکوع وسجود میں اپنی پیٹھ سیدھی نہ کرے''

(۳) اور وہ چیز جس کے ساتھ شارع نے نماز کا نام رکھا ہے (یعنی جس جزء کے ذریعہ شارع نے نماز کو تعبیر کیا ہے) پس بیشک وہ تعبیر بلیغ تنبیہ ہے اس چیز کے نماز میں رکن ہونے پر۔ جیسے آپ کا ارشاد: ''جو کھڑا ہوا رمضان میں'' اور آپ کا ارشاد: ''پس چاہئے کہ پڑھے وہ دو رکعتیں'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''اور عاجزی کر تو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''اور سجدوں کے بعد'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''اور فجر میں قرآن کا پڑھنا'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''اور کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے''

(۴) اور وہ چیز جس کو آپؐ نے ذکر فرمایا ہے ایسے لفظ سے جو آگاہی دیتا ہے اس بات کی کہ اس چیز کے بغیر چارہ نہیں۔ جیسے آپ کا ارشاد: ''نماز کا تحریمہ تکبیر ہی ہے اور اس سے نکلنے کا طریقہ تسلیم ہی ہے'' اور آپ کا ارشاد: ''اور ہر دو رکعت پر تحیۃ (تشہد) ہے'' اور آپ کا ارشاد تشہد (قعدۂ اخیرہ) کے حق میں: ''جب تو نے یہ کیا تو تیری نماز پوری ہوگئی''

(۵) اور وہ چیزیں جو ان کے مانند ہیں۔

(۶) اور وہ چیزیں جن میں مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہے کہ نماز میں ان کے بغیر چارہ نہیں۔ اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے رہے ہیں (یعنی وہ باتیں ان میں بطور توارث چلی آرہی ہیں) اور وہ ان کے چھوڑنے پر ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ نماز جو متوارث چلی آرہی ہے

نبی ﷺ سے جو نماز بطور تعامل چلی آرہی ہے اور جوامت میں بطور توارث جاری ہے وہ یہ ہے:

پہلے خوب پاکی حاصل کرے اور ستر پوشی کرے۔ پھر کھڑا ہو اور قبلہ کی طرف منہ کرے اور دل سے اللہ پاک کی طرف متوجہ ہو، اور خالص اللہ کے لئے نماز پڑھنے کا ارادہ کرے۔ پھر اپنی زبان سے اللہ اکبر کہے۔ پھر سورۂ فاتحہ پڑھے۔ اور فرض کی تیسری اور چوتھی کے علاوہ میں کوئی سورت بھی ملائے۔ پھر رکوع کرے اور یہاں تک جھکے کہ اپنی انگلیوں سے دونوں گھٹنوں کو چھو سکے اور رکوع میں بہ اطمینان تھوڑی دیر ٹھیرے۔ پھر سر اٹھا کر باطمینان کھڑا ہو جائے۔ پھر سات اعضاء: دو ہاتھ، دو پیر، دو گھٹنے اور چہرہ پر سجدہ کرے (اور سجدہ میں باطمینان تھوڑی دیر ٹھیرے) پھر سر اٹھا کر باطمینان بیٹھ جائے۔ پھر اسی طرح دوسرا سجدہ کرے۔ یہ ایک رکعت ہوئی۔ پھر ہر دو رکعتوں پر قعدہ کرے اور تشہد پڑھے۔ اور آخری قعدہ میں نبی ﷺ پر درود بھیجے۔ پھر جو دعا اس کو سب سے زیادہ پسند ہو وہ مانگے۔ پھر جو اس کے آس پاس فرشتے یا مسلمان ہیں ان کو سلام کرے۔

یہ نبی ﷺ، صحابہ، تابعین اور بعد کے ائمۂ مجتہدین کا نماز پڑھنے کا طریقہ ہے۔ اور کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے ان میں سے کوئی بھی چیز کبھی بھی جان بوجھ کر بغیر کسی عذر کے کسی فرض نماز میں چھوڑی ہو۔ اور امت میں بطور توارث یہ بات چلی آرہی ہے کہ لفظ صلوٰۃ (نماز) کا مصداق یہی چیز ہے۔ اور ملت کے نزدیک یہ باتیں بدیہی باتیں ہیں۔ کسی دلیل کی محتاج نہیں۔

ہاں چند باتوں میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ وہ نماز میں فرض ہیں، جن کے بغیر نماز معتبر نہیں، یا واجب ہیں، جن کے ترک سے نماز ناقص ہوتی ہے، یا وہ نماز کے ایسے اجزاء ہیں جن کے چھوڑنے پر سرزنش کی جاتی ہے۔ اور سجدۂ سہو سے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے؟ مثلاً اس میں اختلاف ہے کہ فاتحہ نماز میں فرض ہے یا واجب؟ اور تعدیل ارکان واجب ہے یا غایت درجہ سنت مؤکد؟ اسی طرح کی چند اور چیزوں میں اختلاف ہے۔ مگر اس پر سب متفق ہیں کہ یہ باتیں نماز میں ضروری ہیں۔ فاتحہ کو رکن کہنے والے بھی اور واجب ماننے والے بھی سبھی نماز میں فاتحہ پڑھتے ہیں۔

وبالجملة: فالصلاة على ماتواتر عنه صلى الله عليه وسلم، وتوارثه الأمة: أن يتطهَّر، ويستُر عورته، ويقومَ، ويستقبل القبلة بوجهه، ويتوجه إلى الله بقلبه، ويُخلص له العملَ، ويقول: "الله أكبر" بلسانه، ويقرأ فاتحة الكتاب، ويَضُمَّ معها ــــ إلا فى ثالثةِ الفرض ورابعتِه ــــ سورةً من القرآن، ثم يركع وينحني بحيث يقتدر على أن يمسح ركبتيه برءوس أصابعه حتى يطمئنَّ راكعًا، ثم يرفع رأسه حتى يطمئن قائما، ثم يسجد على الآراب السبعة: اليدين، والرجلين، والركبتين، والوجه، ثم يرفع رأسه حتى يستوى جالسًا، ثم يسجد ثانيًا كذلك، فهذه ركعة. ثم يقعد على رأس كل ركعتين، ويتشهد، فإن كان آخرُ صلاته صلّى على النبى صلى الله عليه

وسلم، ودعا أحبَّ الدعاء إليه، وسلَّم على من يليه من الملائكة والمسلمين.

فهذه صلاة النبي صلى الله عليه وسلم، لم يثبت أنه ترك شيئًا من ذلك قطُّ، عمدًا، من غير عذر، في فريضة، وصلاةُ الصحابة والتابعين ومن بعدَهم من أئمة المسلمين، وهي التي توارثوا أنها مسمَّى الصلاة، وهي من ضروريات الملة.

نعم اختلف الفقهاء في أحْرُفٍ منها: هل هي أركان الصلاة، لا يُعتد بها بدونها، أو واجباتُها التي تنقص بتركها، أو أبعاضٌ يُلام على تركها، وتُجْبَرُ بسجدة السهو؟

ترجمہ: اور حاصل کلام: پس وہ نماز جو نبی ﷺ سے بطور تواتر منقول ہوتی ہوئی آرہی ہے اور جوامت میں بطور توارث جاری ہے یہ ہے کہ خوب پاکی حاصل کرے اور اپنی ستر پوشی کرے۔ اور کھڑا ہو۔ اور قبلہ کی طرف اپنا منہ کرے۔ اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ اور اس کے لئے عمل (نماز) کو خالص کرے۔ اور اپنی زبان سے اللہ اکبر کہے۔ اور سورۂ فاتحہ پڑھے۔ اور ملائے اس کے ساتھ ــــــ مگر فرض کی تیسری اور اس کی چوتھی میں ــــــ قرآن کی کوئی سورت۔ پھر رکوع کرے اور یہاں تک کہ جھکے کہ قادر ہو جائے اس پر کہ چھوئے اپنے دونوں گھٹنوں کو اپنی انگلیوں کے سروں سے، یہاں تک کہ رکوع میں اس کو اطمینان حاصل ہو جائے۔ پھر اپنا سر اٹھائے، یہاں تک کہ اطمیان سے کھڑا ہو جائے۔ پھر سجدہ کرے سات اعضاء: دو ہاتھ، دو پیر، دو گھٹنے اور چہرہ پر۔ پھر اپنا سر اٹھائے، یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جائے۔ پھر دوسری مرتبہ اسی طرح سجدہ کرے۔ پس یہ ایک رکعت ہے۔ پھر بیٹھے ہر دو رکعتوں کے سرے پر۔ اور تشہد پڑھے۔ پھر اگر اس کی نماز کا آخر ہو تو نبی ﷺ پر درود بھیجے۔ اور وہ دعا مانگے جو دعاؤں میں سب سے زیادہ اس کو پسند ہے۔ اور ان لوگوں کو سلام کرے جو فرشتوں اور مسلمانوں میں سے اس کے قریب ہیں۔

پس یہ نبی ﷺ کی نماز ہے۔ نہیں ثابت ہوئی یہ بات کہ آپؐ نے چھوڑی ہو ان میں سے کوئی چیز، کبھی بھی، جان کر، کسی عذر کے بغیر، کسی بھی فرض نماز میں۔ اور صحابہ اور تابعین کی نماز ہے۔ اور مسلمانوں کے اُن اماموں کی نماز ہے جو اُن (صحابہ وتابعین) کے بعد ہوئے۔ اور وہی وہ ہے جس کے متعلق بطور توارث یہ بات چلی آرہی ہے کہ وہ نماز کا مصداق ہے۔ اور وہ باتیں ملت کے بدیہی امور میں سے ہیں۔

ہاں فقہاء میں اختلاف ہوا ہے نماز کی چند باتوں میں کہ آیا وہ نماز کے ارکان ہیں، جن کے بغیر نماز معتبر نہیں، یا وہ نماز کے ایسے واجبات ہیں جن کے ترک سے نماز ناقص ہوتی ہے، یا وہ نماز کے ایسے اجزاء ہیں جن کے چھوڑنے پر ملامت کی جاتی ہے، اور سجدۂ سہو سے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے؟

خضوع کا انضباط: استقبالِ قبلہ اور تکبیر تحریمہ کے ذریعہ

باب کے شروع میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ نماز میں بنیادی باتیں تین ہیں: خضوع، ذکر اور تعظیم۔ اب اس کی تفصیل شروع کرتے ہیں کہ خضوع کے انضباط کے لئے استقبال قبلہ اور تکبیر تحریمہ، اور ذکر کی تعیین کے لئے فاتحہ اور سورت کا ملانا، اور جسم سے تعظیم کے اظہار کے لئے رکوع وسجود اور قیام تجویز کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

خضوع یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے دل کا عاجزی کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف دل کا تعظیم، رغبت اور ہیبت سے متوجہ ہونا چونکہ ایک مخفی امر ہے، آدمی کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا، اس لئے ظاہری علامت سے اس کی تعیین ضروری ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے دو چیزوں کے ذریعہ اس کا انضباط فرمایا: ایک: استقبالِ قبلہ دوم تکبیر تحریمہ۔ تفصیل درج ذیل ہے:

فطرت انسانی یہ ہے کہ جب دل میں کوئی بات بیٹھ جاتی ہے تو زبان اور اعضاء اس کے مطابق چل پڑتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جسم میں ایک بوٹی (دل) ہے: جب وہ سنور جاتی ہے تو جسم سنور جاتا ہے۔ اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو جسم بگڑ جاتا ہے (بخاری حدیث ۵۲) غرض زبان اور اعضاء کے افعال جذباتِ قلبی کے پائے جانے کی قریب ترین احتمالی جگہیں ہیں۔ اور دل کے فعل کے ترجمان ہیں۔ اور کسی مخفی امر کا انضباط ایسی ہی چیز سے ہونا چاہئے۔

استقبالِ قبلہ کی حکمتیں: بیت اللہ شریف کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے میں متعدد حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: چونکہ اللہ تعالیٰ جہات سے ماوراء ہیں، اس لئے ان کی طرف توجہ کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ان کے گھر کی طرف، جو سب سے بڑا دینی شعار ہے، منہ کرکے نماز پڑھی جائے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ حضرت عُقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جو شخص تحیۃ الوضوء کی دو رکعتیں اس طرح پڑھے کہ اپنے دل اور چہرے سے ان کی طرف متوجہ ہو تو اس کے لئے یقیناً جنت واجب ہوگئی (ابوداؤد حدیث ۱۶۹) اور نماز کی طرف توجہ اللہ کی طرف توجہ ہے۔

دوسری حکمت: بیت اللہ کی تعظیم کے لئے اس کی طرف منہ کرنا ضروری ہے، جیسے تعظیم ہی کی خاطر استنجا کرتے وقت اس کی طرف منہ کرنے سے احتراز ضروری ہے۔ اس لئے اس کی طرف منہ کرنے کی توقیت نماز کے ذریعہ کی گئی۔ یعنی نماز میں اس کی طرف منہ کرنا متعین کیا گیا، تاکہ ایک کی دوسرے کے ذریعہ تکمیل ہو۔ یعنی نماز میں کعبہ کی طرف منہ کرنے سے کعبہ کی عظمت دوبالا ہو، اور کعبہ کے ذریعہ نماز میں یگانگت اور خوبی پیدا ہو۔

تیسری حکمت: کعبہ شریف ملت ابراہیمی کا سب سے مشہور شعار ہے۔ اس کے ذریعہ اسماعیلی ملت دوسری ملتوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ پس ایسی چیز کو اسلام میں داخل ہونے کی علامت مقرر کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ سب سے بڑی اور سب سے مشہور عبادت نماز میں اس کی طرف منہ کرنے کو مسلمان ہونے کی علامت گردانا گیا ہے۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ جو ہماری طرح نماز پڑھتا ہے، ہمارے قبلہ کی طرف (نماز میں) منہ کرتا ہے اور ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے، وہ

ایسا مسلمان ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے، پس تم اللہ کی ذمہ داری میں رخنہ اندازی مت کرو یعنی ایسے مسلمان کو مت ستاؤ (مشکوۃ حدیث ۱۳)

چوتھی حکمت: نماز میں قیام اللہ کی تعظیم کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ مگر قیام: تعظیم اس وقت بنتا ہے جب اس کے ساتھ استقبالِ قبلہ بھی ہو، ورنہ محض کھڑا ہونا کوئی فعلِ تعظیم نہیں۔

تکبیر تحریمہ کی حکمتیں: تکبیر تحریمہ کے ذریعہ نماز شروع کرنے میں بھی متعدد حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: دل اللہ پاک کی تعظیم کے لئے تیار ہے، اس کی ترجمانی کے لئے فصیح ترین تعبیر الله أكبر کہنا ہے۔ یہ کلمہ کہنے والا اللہ کی عظمت وکبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس لئے نماز شروع کرنے کے لئے اس کلمہ کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

دوسری حکمت: دو جدا جدا حالتوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ نماز کی حالت دوسری حالتوں سے متبائن ہے۔ اس لئے اس کی ابتداء اور انتہاء متعین کرنی ضروری ہے۔ اسی امتیاز کے لئے تکبیر تحریمہ اور سلام پھیرنا تجویز کیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ نماز کی تحریم اللہ کی بڑائی بیان کرنا ہے اور اس کی تحلیل سلام کرنا ہے۔ تحریم کے معنی ہیں حرام کرنا اور تحلیل کے معنی ہیں حلال کرنا۔ یعنی اللہ اکبر کہتے ہی وہ تمام کام حرام ہو جاتے ہیں جو پہلے حلال تھے۔ اور سلام پھیرتے ہی وہ سب کام جائز ہو جاتے ہیں جو نماز میں حرام تھے۔ غرض تکبیر وتسلیم نماز کی حالت کو دوسری حالتوں سے جدا کرنے کے لئے مقرر کی گئیں ہیں۔

نوٹ: تقریر میں کتاب کی ترتیب بدل گئی ہے۔ خیال کر کے ملائیں۔

والأصل في ذلك:

[۱] أن خضوع القلب لله، وتوجُّهه إليه تعظيمًا ورغبةً ورهبةً: أمرٌ خفيٌّ، لابد له من ضبطٍ، فضبطه النبي صلى الله عليه وسلم بشيئين: أن يستقبلَ القبلة بوجهه وبدنه، وأن يقول بلسانه: "اللّٰه أكبر"

وذلك: لأن من جبلة الإنسان أنه إذا استقر في قلبه شيئ جرى حسب ذلك الأركانُ واللسانُ، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "إن في جسد ابن آدم مضغةً" الحديث، ففعلُ اللسان والأركان أقربُ مظنةٍ وخليفةٍ لفعل القلب، ولايصلُح للضبط إلا مايكون كذلك.

ولما كان الحق متعاليًا عن الجهة نُصب التوجه إلى بيته، وأعظمِ شعائره مقامَ التوجه إليه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "مُقبلاً إلى اللّٰه بوجهه وقلبه"

ولما كان التكبير أفصحَ عبارةٍ عن انقياد القلب للتعظيم، لم يكن لفظٌ أحقَّ أن يُنْصب مقامَ توجهِ القلب منه.

وفيها وجوهٌ أخرى:

منها : أن استقبال القبلة واجب من جهة تعظيم بيت الله، وُقِّتَ بالصلاة، ليكمل كل واحد بالآخر.

ومنها : أنه أشهر علامات الملة الحنيفية، التى يتميز بها الناس عن غيرها، فلا بد من أن يُنْصَبَ مثلُه علامةً للدخول فى الإسلام، فَوُقِّتَ بأعظم الطاعات وأشهرِها، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" من صلّى صلاتَنا، واستقبلَ قبلتنا، وأكل ذبيحتنا، فذلك المسلمُ الذى له ذِمَّةُ الله وذمة رسوله"

ومنها: أن القيام لايكون تعظيمًا إلا إذا كان مع استقبالٍ.

ومنها : أنه لابد لكل حالة تُباين سائرَ الحالات فى الأحكام: من ابتداء وانتهاء، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: تحريمها التكبير، وتحليلها التسليم"

ترجمہ: اور بنیادی بات اس سلسلہ میں یعنی باب کے شروع میں جو نماز کی تین بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں اُس سلسلہ میں: (۱) یہ ہے کہ دل کا اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا، اور دل کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا، تعظیم، رغبت اور ہیبت کے طور پر: ایک پوشیدہ چیز ہے۔ ضروری ہے اس کی کچھ تعیین۔ پس منضبط کیا اس کو نبی ﷺ نے دو چیزوں کے ذریعہ: (۱) یہ کہ اپنے منہ اور بدن سے قبلہ کی طرف متوجہ ہو (۲) اور اپنی زبان سے کہے اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے)

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ فطرتِ انسانی میں سے یہ بات ہے کہ جب اس کے دل میں کوئی بات جم جاتی ہے تو اعضاء اور زبان اس کے مطابق چل پڑتے ہیں اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''بیشک انسان کے جسم میں ایک بوٹی ہے'' آخر حدیث تک پڑھیں۔ پس زبان اور اعضاء کا فعل قریب ترین احتمالی جگہ اور دل کے فعل کے لئے نائب ہے۔ اور تعیین کے قابل نہیں ہے مگر وہ چیز جو ایسی ہو۔

اور جب اللہ تعالیٰ جہت سے بلند ہیں تو بیت اللہ کی طرف، اور شعائر اللہ میں سے سب سے بڑے شعار کی طرف منہ کرنا قائم کیا گیا اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی جگہ میں۔ اور وہ آپؐ کا ارشاد ہے: ''درانحالیکہ وہ اللہ کی طرف اپنے چہرے اور اپنے دل سے متوجہ ہونے والا ہو'' (مگر حدیث میں إلی اللّٰہ نہیں ہے، بلکہ إلیھما ہے یعنی دو رکعتوں کی طرف)

اور جب تکبیر فصیح ترین تعبیر تھی تعظیم کے لئے دل کے فرمانبردار ہونے کی تو تکبیر سے زیادہ کوئی لفظ حقدار نہیں تھا کہ وہ دل کے متوجہ ہونے کی جگہ میں کھڑا کیا جائے۔

اور اس کے اندر (یعنی استقبال اور تکبیر دونوں میں) دوسری وجوہ (حکمتیں) ہیں:

ان میں سے: یہ ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا واجب ہے، بیت اللہ کی تعظیم کی جہت سے۔ (تو) متعین کیا (استقبال

قبلہ کو) نماز کے ساتھ۔ تاکہ ہر ایک کی دوسرے کے ذریعہ تکمیل ہو۔

اور ان میں سے: یہ ہے کہ بیت اللہ ملتِ حنفی کی علامتوں میں مشہور ترین علامت ہے۔ جس کے ذریعہ لوگ دیگر ملتوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ پس ضروری ہوا کہ ایسی چیز علامت مقرر کی جائے اسلام میں داخل ہونے کے لئے۔ پس تعیین کی گئی عبادتوں میں سے بڑی اور مشہور ترین عبادت کے ساتھ۔ اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کیا، اور ہمارا ذبیحہ کھایا، پس وہ: وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے''

اور ان میں سے: یہ ہے کہ قیام تعظیم نہیں ہوتا مگر جب وہ استقبال کے ساتھ ہو۔

اور ان میں سے: یہ بات ہے کہ ہر اس حالت کے لئے جو احکام میں دیگر احوال سے بالکل جدا ہو، ضروری ہے کوئی ابتداء اور انتہاء۔ اور وہ آپ کا ارشاد ہے: نماز کا تحریمہ تکبیر ہے اور اس کی تحلیل سلام کرنا ہے''

☆ ☆ ☆

تعظیم جسمانی کا انضباط: قیام، رکوع اور سجود کے ذریعہ

جسم سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرنے کی تین صورتیں ہیں: قیام یعنی اللہ پاک کے سامنے کھڑا ہونا، رکوع یعنی اللہ پاک کے سامنے جھکنا اور سجدہ یعنی اللہ پاک کے سامنے زمین پر سر رکھنا۔ اور اعلیٰ درجہ کی تعظیم وہ ہے جو تینوں طرح سے کی جائے۔ اس لئے تعظیم کے یہ تینوں طریقے نماز میں جمع کئے گئے ہیں۔ اور پہلے قیام، رکوع اور آخر میں سجدہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ ادنی سے اعلیٰ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنا نفس کو عاجزی کرنے کے لئے تیار کرنے میں زیادہ کارگر ہے۔ اور سجدے دو اس لئے ہیں کہ زمین پر سر رکھنا سب سے بڑی اور آخری درجہ کی تعظیم ہے، گویا وہی مقصود بالذات ہے، اور قیام اور رکوع اس تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ پس سجدہ جو مقصود بالذات چیز جیسا ہے، اس میں مشابہت کا حق ادا کرنا ضروری ہے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ وہ کام بار بار کیا جائے۔ مثلاً: کوئی بہت ہی اچھا شعر ہو تو آدمی بار بار پڑھتا ہے اور ہر بار نیا مزہ لیتا ہے۔ اور کوئی بہت ہی لذیذ کھانا ہو تو اسے بار بار کھاتا ہے اور پیٹ نہیں بھرتا۔ اسی طرح جب سجدہ آخری درجہ کی تعظیم ہے تو ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ بار بار اللہ تعالیٰ کی توقیر کی جائے۔

نوٹ: قاعدے سے دوسرے نمبر پر ذکر اللہ کا بیان آنا چاہئے تھا۔ مگر چونکہ ذکر قیام میں تجویز کیا گیا ہے، اس لئے جسم کے ذریعہ تعظیم کرنے کو مقدم کیا گیا ہے۔

[۲] أما التعظيم بجسده: فالأصل فيه ثلاث حالاتٍ: القيام بين يديه، والركوع، والسجود؛ وأحسنُ التعظيم ما جمع بين الثلاث، وكان التدريجُ من الأدنى إلى الأعلى أنفعَ في تنبيه

النفس للخضوع من غيره؛ وكان السجودُ أعظمَ التعظيم، يُظَنُّ أنه المقصود بالذات، وأن الباقيَ طريق إليه، فوجب أن يؤدِّى حقُّ هذا الشَّبَهِ، وذلك بتكراره.

ترجمہ: (۲) رہا نمازی کا بدن سے تعظیم کرنا: پس اس میں اصل تین حالتیں ہیں: اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا، اور رکوع کرنا اور سجدے کرنا۔ اور اعلیٰ درجہ کی تعظیم وہ ہے جو ان تینوں کے درمیان جامع ہو۔ اور ادنیٰ سے اعلیٰ طرف آہستہ آہستہ بڑھنا عاجزی کرنے کے لئے نفس کو چوکنا کرنے میں اس کے علاوہ سے زیادہ مفید تھا۔ اور زمین پر سر رکھنا سب سے بڑی تعظیم ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ وہی مقصود بالذات ہے۔ اور یہ کہ باقی (یعنی قیام ورکوع) اس کی راہ ہے۔ پس ضروری ہوا کہ اس مشابہت کا حق ادا کیا جائے۔ اور وہ (حق کی ادائیگی) اس کی تکرار کے ذریعہ ہے۔

☆ ☆ ☆

ذکر اللہ کا انضباط: فاتحہ اور ضم سورت کے ذریعہ

نماز میں تیسری بنیادی چیز ذکر اللہ ہے۔ اس کی تعیین بھی ضروری ہے۔ کیونکہ تعیین لوگوں کے متفرق امور کو جمع کرنے والی ہے یعنی اگر کوئی ذکر متعین نہیں کیا جائے گا تو کوئی کچھ ذکر کرے گا، کوئی کچھ۔ اور ذکر متعین کر دیا جائے گا تو سب وہی ذکر کریں گے۔ علاوہ ازیں ذکر متعین ہو تو لوگوں کے دل بہت زیادہ اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ اور تعیین کا یہ فائدہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنی رائے نہیں چلائے گا۔ ہر رائے کا ہمیشہ اچھا ہونا ضروری نہیں۔ وہ نامناسب بھی ہو سکتی ہے۔ بغیر تعیین کے تو صرف نفلی اذکار چل سکتے ہیں۔ مگر وہ سابقین کا حصہ ہیں۔ ہر کوئی نفلی اذکار میں حصہ دار نہیں ہوتا۔ تاہم شریعت نے نفلی اذکار بھی متعین کر دیئے ہیں۔ جیسے رکوع وسجود کی تسبیحات یا نماز کے بعد کے اذکار۔ اگرچہ یہ تعیین استحبابی ہے یعنی ان کی جگہ دیگر اذکار بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اور بالکل ہی ذکر نہ کیا جائے تو بھی جائز ہے۔

فاتحہ کی تعیین کی حکمت: اور جب اذکار کی تعیین ضروری ہوئی تو فاتحہ سے بہتر کوئی ذکر نہیں۔ کیونکہ وہ ایک جامع دعا ہے۔ بندوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے۔ اس میں بندوں کو یہ سکھایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی حمد وثنا کیسے کریں؟ اور وہ صرف اسی کے لئے بندگی کا اعتراف کیسے کریں؟ اور صرف اسی سے مدد کیسے چاہیں؟ اور صراط مستقیم کی، جو خیر کی تمام انواع کے لئے جامع ہے: درخواست کیسے کریں؟ اور جن پر خدا کا غصہ بھڑکا اور جو راہِ راست سے دور جا پڑے ان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کیسے چاہیں؟ اور بہترین دعا وہ ہے جو جامع ترین ہو۔ اور فاتحہ ایسی ہی دعا ہے۔ اس لئے اس کو متعین کیا گیا ہے۔

ضم سورت کی حکمت: قرآن کریم کی تعظیم اور اس کی تلاوت ملّت کا فریضہ ہے۔ اور تعظیم کا سب سے بہتر طریقہ یہ

ہے کہ مشہور دینی شعار، مرکزی عبادت اور اسلام کے رکنِ اعظم نماز میں تلاوت کر کے اس کی شان بلند کی جائے۔ اور قرآن کی تلاوت ایک مستقل عبادت ہے۔ اور اس سے نماز کی تکمیل و تتمیم بھی ہوتی ہے۔ اس لئے نماز میں فاتحہ کے بعد قرآن کی کوئی سورت پڑھنا بھی تجویز کیا گیا۔ کیونکہ ہر سورت کلام تام ہے۔ اس کی فصاحت کے ذریعہ نبی ﷺ نے منکرین نبوت کو چیلنج کیا ہے۔ سورہ یونس آیت ۳۸ میں ہے: ''کفار کہتے ہیں کہ آپؐ نے اس کو خود گھڑ لیا ہے۔ آپؐ کہہ دیجئے: پھر تم اس کے مانند ایک ہی سورت بنالاؤ'' اور ہر سورت اپنے آغاز اور انتہاء اور حیرت انگیز اسلوب کے ساتھ منفرد ہے۔ اس لئے فاتحہ کے ساتھ ایک مکمل سورت کا ملانا تجویز کیا گیا۔ مگر چونکہ گاہے نبی ﷺ سے سورت کا بعض حصہ پڑھنا بھی ثابت ہے، اس لئے علماء نے تین چھوٹی آیتوں کو اور ایک بڑی آیت کو پوری سورت کے حکم میں رکھا ہے۔

[۳] وأما ذكر الله: فلابد من توقيته أيضًا، فإن التوقيت أجمعُ لِشَمْلِهم، وأطوعُ لقلوبهم، وأبعدُ من أن يذهبِ كلُّ أحد إلى ما يقتضيه رأيُه، حسنًا كان أو قبيحًا؛ وإنما تُفَوَّضُ إليهم الأدعيةُ النافلةُ التي يخاطَب بمثلها السابقون، على أنها أيضًا لم يتركها النبيُّ صلى الله عليه وسلم بغير توقيتٍ، ولو استحبابًا.

وإذا تعيَّنَ التوقيتُ: فلا أحقَّ من الفاتحة، لأنها دعاء جامع، أنزله الله تعالى على ألسنة عباده، يعلِّمهم: كيف يحمدون الله، ويُثنون عليه، ويُقرون له بتوحيد العبادة والاستعانة؟ وكيف يسألونه الطريقةَ الجامعةَ لأنواع الخير، ويتعوَّذون به من طريقة المغضوب عليهم والضالين؟ وأحسنُ الدعاء أَجْمَعُه!

ولما كان تعظيمُ القرآن وتلاوتُه واجبًا في الملة، ولا شيئ من التعظيم مثلُ أن يُنَوَّهَ به في أعظم أركان الإسلام، وأمِّ القُرُبَاتِ، وأشهرِ شعائر الدين؛ وكانت تلاوتُه قربةً كاملةً تكمِّل الصلاةَ وتُتِمُّها شُرِّع لهم قراءةُ سورة من القرآن، لأن السورةَ كلامٌ تامٌّ، تَحَدَّى النبيُّ صلى الله عليه وسلم ببلاغته المنكرين للنبوَّة؛ ولأنها مُنفرِزَةٌ بمبدئها ومنتهاها، ولكل واحد منها أسلوبٌ أنيقٌ، وإذ قد ورد من الشارع قراءةُ بعض السورة في بعض الأحيان، جعلوا في معناها ثلاث آياتٍ قصارٍ، أو آيةً طويلةً.

ترجمہ: (۳) اور رہا اللہ کا ذکر: پس اس کی تعیین بھی ضروری ہے۔ پس بیشک تعیین زیادہ اکٹھا کرنے والی ہے لوگوں کے متفرق امور کو، اور وہ لوگوں کے دلوں کو بہت زیادہ مطیع بنانے والی ہے۔ اور وہ بہت دور ہے اس سے کہ ہر ایک اس چیز کی طرف جائے جو اس کی رائے چاہتی ہے، خواہ اچھی ہو یا بری۔ اور سپرد کی جاتی ہیں لوگوں کی طرف صرف نفلی

دعائیں۔جن کے مانند کے سابقین مخاطب بنائے جاتے ہیں۔علاوہ ازیں:اس کو بھی نبی ﷺ نے بغیر تعیین کے نہیں چھوڑا۔گو وہ تعیین استحبابی ہو۔

اور جب طے پاگئی تعیین تو سورۂ فاتحہ سے زیادہ حقدار کوئی ذکر نہیں۔اس لئے کہ وہ ایک جامع دعا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے بندوں کی زبانوں پر نازل فرمایا ہے۔سکھایا ہے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کہ وہ اللہ کی کیسے تعریف وستائش کریں۔اور کیسے اقرار کریں اللہ تعالیٰ کے لئے عبودیت اور استعانت کی یکتائی کا۔اور کیسے درخواست کریں اللہ تعالیٰ سے اس راہ کی جو خیر کی انواع کو جامع ہے۔اور کیسے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہیں مغضوب علیہم اور ضالین کی راہ سے؟ اور بہترین دعا وہ ہے جو جامع ترین ہو۔

اور جب قرآن کریم کی تعظیم اور اس کی تلاوت ملت میں واجب تھی۔اور تعظیم کے سلسلہ میں کوئی چیز نہیں تھی اس کے مانند کہ اس کے ذریعہ شان بلند کی جائے اسلام کے سب سے بڑے رکن میں اور مرکزی عبادت میں اور دینی شعائر میں سے مشہور ترین شعار میں (تلاوت کے ذریعہ) اور اس کی تلاوت ایسی کامل عبادت تھی جو نماز کو کامل اور تام کرتی تھی، تو لوگوں کے لئے مشروع کیا قرآن کی کسی سورت کا پڑھنا۔اس لئے کہ سورت کلام تام ہے۔نبی ﷺ نے اس کی فصاحت کے ذریعہ منکرین نبوت کو چیلنج کیا ہے۔اور اس لئے کہ ہر سورت علحدہ ہونے والی ہے اپنی ابتداء اور انتہاء کے ساتھ۔اور ان میں سے ہر سورت کے لئے تعجب میں ڈالنے والا اسلوب ہے۔اور جب شارع کی جانب سے وارد ہوا ہے سورت کے کچھ حصہ کا پڑھنا بعض اوقات میں تو علماء نے اس کے حکم میں تین چھوٹی یا ایک لمبی آیت کے پڑھنے کو رکھا۔

☆ ☆ ☆

رکوع وسجود اور قومہ وجلسہ کا انضباط اور ان میں طمانینت کی حکمت:

① —— رکوع کی ہیئت کذائی کا انضباط: —— نماز میں کھڑے ہونے والوں کا حال یکساں نہیں: کوئی تو بالکل سیدھا کھڑا ہوتا ہے، کوئی ذرا سر جھکا کر اور کوئی جسم کا بالائی حصہ جھکا کر کھڑا ہوتا ہے۔اور یہ سبھی صورتیں قیام شمار کی جاتی ہیں۔اس لئے رکوع کے لئے جھکنے کو قیام کی ان مختلف حالتوں سے جدا کرنا ضروری ہے۔چنانچہ اس کی تعیین اس طرح کی گئی کہ اتنا زیادہ جھکنا کہ انگلیوں کے سرے گھٹنوں کو چھو سکیں رکوع کی حالت ہے۔اس سے کم جھکنے سے رکوع نہیں ہوگا۔

② —— رکوع وسجود میں طمانینت کیوں ضروری ہے؟: —— رکوع وسجود یعنی جھکنا اور زمین پر سر رکھنا تعظیم اس وقت شمار ہوتا ہے جب اس حالت پر تھوڑی دیر ٹھہرے، رب العالمین کے سامنے عاجزی کرے اور اس کا دل تعظیم کو شعار بنائے۔چنانچہ باطمینان رکوع وسجدہ کرنا رکن لازم قرار دیا گیا۔

(۳) ـــــ سجدہ کی ہیئتِ کذائی کا انضباط : ـــــ سجدہ یعنی زمین پر سر رکھنا اور زمین پر پیٹ کے بل لیٹنا اور ایسی ہی دیگر ہیئتیں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ اور اول یعنی سجدہ تعظیم کی صورت ہے، اور باقی صورتیں تعظیم شمار نہیں کی جاتیں۔ اس لئے سجدہ کی ہیئت کی تعیین بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں سات اعضاء پر سجدہ کرنا ضروری قرار دیا گیا یعنی پیشانی، دو ہاتھوں، دو گھٹنوں اور دو پیروں کے اطراف پر سجدہ کرے گا تو سجدہ شمار ہوگا، ورنہ وہ سجدہ نہیں، جمناسٹک ہے یا لیٹنا پڑتا ہے۔

(۴) ـــــ قومہ کیوں ضروری ہے؟ : ـــــ جو شخص سجدہ کرتا ہے وہ پہلے جھکتا ہے، بشرطیکہ بیچ میں نہ رُک جائے یعنی رکوع کی حالت میں ٹھہر نہ جائے۔ رکوع کی حالت تو سجدہ تک پہنچنے کی راہ ہے۔ پس رکوع سے سیدھا سجدہ میں جانا درست نہیں، بلکہ دونوں حالتوں کے درمیان کسی ایسے اجنبی فعل سے جو نہ رکوع ہو نہ سجدہ، فصل کرنا ضروری ہے۔ تاکہ رکوع وسجود ایک دوسرے سے علحدہ بھی ہو جائیں اور دونوں ایسی مستقل عبادتیں بھی بن جائیں جن کا آدمی بالاستقلال ارادہ کرے، تاکہ نفس دونوں کے فائدے سے متمتع ہو۔ چنانچہ رکوع کے بعد قومہ یعنی بالکل سیدھا کھڑا ہونا ضروری قرار دیا تاکہ اس کے بعد مستقل سجدہ کے ارادے سے زمین پر گرے۔

(۵) ـــــ جلسہ کیوں ضروری ہے؟ : ـــــ سجدے دو اسی وقت بنتے ہیں جب درمیان میں کوئی اجنبی فعل واقع ہو، جو سجدہ کی حالت نہ ہو۔ وہی اجنبی فعل جلسہ ہے جو دو سجدوں کے درمیان ضروری ہے۔ ورنہ خواہ کتنی ہی دیر سجدہ میں پڑا رہے وہ ایک ہی سجدہ شمار ہوگا۔

(۶) ـــــ قومہ وجلسہ میں طمانینت کیوں ضروری ہے؟ ـــــ قومہ وجلسہ اگر باطمینان نہیں کئے جائیں گے تو وہ اٹھ بیٹھ لگانا اور ڈنڈ پیلنا ہو کر رہ جائے گا اور یہ بات عبادت کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے دونوں کو باطمینان ادا کرنا ضروری ہے۔

ولـمـا كـان الـقيـامُ لاتستـوى أفرادُه: فمنهم من يقوم مُطْرِقًا، ومنهم من يقوم مُنْحنيًا، ويُعَدُّ جـمـيـعُ ذلك من الـقيـام: مست الحاجةُ إلى تمييز الانحناءِ المقصودِ مما يسمى قيامًا، فَضَبَطَ بالركوع، وهو الانحناء المفرط الذى تصل به رءوس الأصابع إلى الركبتين.

ولـمـا لـم يـكـن الـركـوع ولا السجود تعظيمًا إلا بأن يَلْبث على تلك الهيئة زمانًا، ويَخْضَعَ لرب العالمين، ويستشعر التعظيمَ قلبُه فى تلك الحالة، جعل ذلك ركنًا لازمًا.

ولـمـا كان السجودُ، والاستلقاءُ على البطن، وسائرُ الهيئات القريبةُ منه: مشتركةً فى وضع الرأس على الأرض، والأولُ تعظيم، دون الباقى: مست الحاجةُ إلى أن يُضبط الفارق بينهما، فقال: " أمرتُ أن أَسْجُدَ على سبعة آرَابٍ" الحديث.

ولما كان كلُّ من يهوى إلى السجود، لابدّ له من الانحناء، حتى يصل إليه، وليس ذلك ركوعًا، بل هو طريق إلى السجدة: مست الحاجة إلى التفريق بين الركوع والسجود، بفعل أجنبيّ يتميز به كلٌّ من الآخرِ، ليكون كلُّ واحد طاعةً مستقلةً، يقصدها مستأنفاً، فتتنبَّهُ النفسُ لثمرةِ كلِّ واحد بانفرادها، وهو القومة.

ولما كان السجدتانِ لاتصيران اثنين إلا بتخلل فعلٍ أجنبي، شُرعتِ الجلسةُ بينهما.

ولما كان القومة والسجدةُ بدون الطُّمَأْنِيْنَةِ طَيْشًا ولَعِبًا، مُنافيا للطاعة، أمرنا بالطُّمأنينة فيهما.

ترجمہ: (۱) اور جب قیام کے تمام افراد مساوی نہیں تھے: پس کوئی تو سر جھکا کر کھڑا ہوتا ہے اور کوئی جھک کر کھڑا ہوتا ہے۔ اور یہ سب قیام شمار کئے جاتے ہیں تو ضرورت پیش آئی انحنائے مقصود کو جدا کرنے کی اس سے جو قیام کہلاتا ہے۔ پس منضبط کیا (اس انحنائے مقصود کو) رکوع سے۔ اور رکوع بے حد جھکنا ہے جس سے پہنچ جاتے ہیں انگلیوں کے سرے دونوں گھٹنوں تک۔

(۲) اور جب جھکنا اور زمین پر سر رکھنا تعظیم نہیں تھا مگر بایں طور کہ اس حالت پر کچھ دیر ٹھیرے اور رب العالمین کے سامنے عاجزی کرے اور اس کا دل اس حالت میں تعظیم کا احساس کرے، تو وہ چیز (طمانینت) لازمی رکن قرار دی گئی۔

(۳) اور جب سجدہ اور پیٹ کے بل لیٹنا اور دوسری وہ ہیئتیں جو اس سے قریب ہیں: زمین پر سر رکھنے میں مشترک تھیں۔ اور اول تعظیم ہے اور باقی تعظیم نہیں ہیں، تو ضرورت پیش آئی اس بات کی کہ متعین کیا جائے دونوں کے درمیان جدائی کرنے والی چیز کو۔ پس فرمایا: ''میں حکم دیا گیا ہوں کہ سات اعضاء پر سجدہ کروں'' حدیث آخر تک پڑھیں۔

(۴) اور جب ہر وہ شخص جو سجدے میں گرتا ہے، اس کے لئے اتنا جھکنا ضروری ہے کہ وہ سجدہ میں پہنچ جائے، اور وہ جھکنا رکوع نہ ہو، بلکہ وہ سجدہ کی راہ ہو، تو ضرورت پیش آئی رکوع وسجود کے درمیان تفریق کرنے کی کسی ایسے اجنبی فعل سے جس کے ذریعہ ہر ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائے۔ تاکہ ہر ایک ایسی مستقل عبادت بن جائے جس کا نمازی از سرنو قصد کرے، تاکہ نفس ہر ایک کے فائدے سے علحدہ چوکنا ہو۔ اور وہ (اجنبی فعل) قومہ ہے۔

(۵) اور جب دو سجدے، دو نہیں بنتے تھے مگر کسی اجنبی فعل کے درمیان میں آنے سے تو مشروع کیا گیا دو سجدوں کے درمیان جلسہ۔

(۶) اور جب قومہ اور جلسہ اطمینان کے بغیر اوچھا پن اور کھیل تھے، عبادت کے منافی تھے تو ان دونوں میں طمانینت کا حکم دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

سلام کے ذریعہ نماز سے نکلنے کی حکمت

وضوء توڑ کر یا کھا پی کر یا کسی بھی مُفسدِ نماز کے ذریعہ نماز سے نکلنا نہایت برا اور تعظیم کے منافی ہے۔ اور کوئی ایسا عمل بھی ضروری ہے جس سے نماز پوری ہو، اور جو چیزیں نماز میں حرام ہوئی تھیں وہ حلال ہو جائیں۔ پھر ایسی چیز کی تعیین بھی ضروری ہے تا کہ ہر شخص من مانی نہ کرے۔ چنانچہ نماز سے نکلنے کا طریقہ بہترین کلام یعنی سلام تجویز کیا گیا۔ اور اس کو واجب گردانا گیا۔ حدیث میں ہے کہ: ''نماز سے نکلنا سلام کرنا ہے''۔

> ولـمـا كـان الـخـروج من الصلاة بنقض الطهارة، أو غير ذلك من موانع الصلاة ومفسداتها: قبيحًا مستنكرًا، منافيًا للتعظيم، ولا بدّ من فعل تنتهي به الصلاةُ، ويُباح به ما حُرِّمَ في الصلاة، ولو لـم يُضبط لـذهـب كـلُّ واحد إلى هواه: وجب أن لايكون الخروجُ إلا بكلام، هو أحسنُ كلامِ الناس، أعني السلامَ، وأن يوجَب ذلك، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ''تحليلها التسليم''

ترجمہ: اور جب طہارت توڑنے کے ذریعہ یا اس کے علاوہ نماز کے موانع ومفسدات کے ذریعہ نماز سے نکلنا نہایت ہی برا، تعظیم کے منافی تھا۔ اور ضروری تھا کوئی ایسا عمل جس پر نماز منتہی ہو۔ اور اس کی وجہ سے وہ کام جائز ہو جائے جو نماز میں حرام تھا۔ اور اگر وہ متعین نہیں کیا جائے گا تو ہر ایک اپنی خواہش کی طرف جائے گا۔ پس ضروری ہوا کہ نہ ہو نکلنا مگر کسی کلام کے ذریعہ، جو لوگوں کے کلام میں سب سے عمدہ ہو، میری مراد سلام ہے اور ضروری ہوا کہ اس کو واجب کیا جائے۔ اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''نماز سے نکلنا سلام کرنا ہے''

 ☆

تشہد کی تجویز اور اس کے اجزاء کی معنویت

صحابہ کو یہ بات پسند تھی کہ نماز ختم کرنے سے پہلے اللہ پاک کو اور اللہ کے نیک بندوں کو سلام کریں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ روایت ہے کہ جب ہم نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو کہتے تھے: ''اللہ کو اس کے بندوں کی جانب سے سلام! جبرئیل کو سلام! میکائیل کو سلام! اور فلاں کو سلام!'' نبی ﷺ نے اس کی جگہ تشہد تجویز فرمایا۔ اور تبدیلی کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ: ''اللہ کو سلام!'' نہ کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو خود ہی سلام ہیں۔ یعنی سلامتی کی دعا تو اس کو دی جاتی ہے جو خطرے میں ہو، عدم اور اس کے مبادیات یعنی آفات و بلیات سے محفوظ نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ تو خود ہی سلام ہیں۔ سلامتی ان کی خانہ زاد صفت ہے۔ سورۃ الحشر آیت ۲۳ میں یہ صفت آئی ہے۔ پس اللہ کو سلام ایک بے معنی

بات ہے۔اس کے بجائے حمد کرنی چاہئے۔اوراس کے لئے یہ جملہ تجویز کیا گیا: التحیات للہ، والصلوات، والطیبات : تحیہ سے تمام قولی عبادتیں ،صلوات سے تمام فعلی عبادتیں اورطیبات سے تمام مالی عبادتیں مراد ہیں۔ یہ سب عبادتیں اللہ پاک ہی کا حق ہیں۔کوئی دوسرا ان میں شریک وسہیم نہیں!

پھر تین مقاصد سے نبی ﷺ کو سلام کرنا مناسب خیال کیا گیا۔اوراس کے لئے یہ جملہ تجویز کیا گیا: السلام علیك أیها النبیُّ ورحمة الله وبرکاته۔اوروہ تین مقاصد یہ ہیں:

پہلا مقصد: نماز میں آپ کا ذکر خیر کرکے آپ کی شان دوبالا کرنا مقصود ہے۔جیسے اذان میں توحید کی شہادت کے بعد، رسالتِ محمدی کی شہادت پکاری جاتی ہے اس کا بھی ایک مقصد یہی ہے کہ آپ کا آوازہ بلند ہو۔اور یہ بھی رفع ذکر کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت ہے(سورۃ الم نشرح آیت۴)

دوسرا مقصد: آپ کو سلام کرنے سے آپ کی رسالت کا اقرار پختہ کرنا ہے۔کیونکہ سلام کرنے سے عقیدت بڑھتی ہے۔اوروابستگی پختہ ہوتی ہے۔

تیسرا مقصد: امت پر آپ کے جو عظیم احسانات ہیں ان کا کچھ حق ادا کرنا بھی پیش نظر ہے۔

پھر تشہد میں خصوصی سلام کے بعد عمومی سلام رکھا گیا ہے۔اوروہ یہ جملہ ہے: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین : ہم پر سلام!اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام! آنحضرت ﷺ نے فرمایا:''یہ جملہ کہنے سے آسمان وزمین میں اللہ کا جو بھی نیک بندہ ہے اس کو دعا پہنچ جاتی ہے'' پھر آخر میں کلمۂ شہادت جوڑا گیا ہے،کیونکہ وہ اللہ کا عظیم وبلیغ ذکر ہے۔اس طرح تشہد کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔

وكان الصحابةُ استحبوا أن يقدِّموا على السلام قولَهم:" السلام على الله قِبل عباده، السلام على جبرائيل، السلام على فلان" فغيَّر رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ذلك بالتحيات، وبيَّن سببَ التغيير، حيث قال:" لاتقولوا: السلام على الله! فإن الله هو السلام" يعني أن الدعاءَ بالسلامة إنما يناسب من لاتكون السلامة من العدم ولواحِقِه ذاتيًا له.

ثم اختار بعدَه السلامَ على النبيِّ تنويهًا بذكره، وإثباتًا للإقرار برسالته، وأداءً لبعض حقوقه، ثم عَمَّمَ بقوله:" السلامُ علينا وعلى عباده الله الصالحين" قال:" فإذا قال ذلك، أصاب كلَّ عبدٍ صالح في السماء والأرض"، ثم أمَرَ بالتشهد، لأنه أعظم الأذكار.

ترجمہ:اور صحابہ نے پسند کیا تھا کہ مقدم کریں وہ سلام پھیرنے پر اپنے اس قول کو:''اللہ پر سلام اس کے بندوں کی جانب سے۔جبرئیل پر سلام!فلاں پر سلام!'' پس رسول اللہ ﷺ نے اس کو التحیات سے بدلدیا۔اور تبدیلی کا سبب

بیان کیا، چنانچہ فرمایا: ''نہ کہو: اللہ کو سلام! پس بیشک اللہ ہی سلام ہیں'' یعنی سلامتی کی دعا اس کے لئے مناسب ہے کہ عدم اور اس کے متعلقات سے محفوظ ہونا اس کی ذاتی صفت نہ ہو۔

پھر پسند کیا التحیات کے بعد نبی ﷺ پر سلام کو: آپؐ کے ذکر کے ذریعہ آپؐ کی شان بلند کرنے کے طور پر اور آپؐ کی رسالت کے اقرار کو پختہ کرنے کے طور پر اور آپؐ کے کچھ حقوق کی ادائیگی کے طور پر۔ پھر سلام کو عام کیا اس قول کے ذریعہ: ''ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام!'' فرمایا: ''پس جب کہا اس نے یہ تو پہنچا ہر نیک بندے کو آسمان زمین میں'' پھر حکم دیا کلمۂ شہادت ملانے کا، اس لئے کہ وہ سب سے بڑا ذکر ہے۔

☆ ☆ ☆

دعا اور دعا سے پہلے درود شریف کی حکمت

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا روایت کے آخر میں ہے: ''پھر (تشہد کے بعد) چاہئے کہ وہ دعا منتخب کرے جو اس کو سب سے زیادہ پسند ہو'' کیونکہ نماز سے فراغت کا وقت دعا کا وقت ہے۔ اس وقت میں رحمتِ الٰہی کا ایک بڑا پردہ نمازی کو ڈھانک لیتا ہے۔ اور اس وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

اور دعا کے آداب میں سے ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے، جو وہ التحیات میں کر چکا۔ اور نبی ﷺ کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرے یعنی آپؐ پر درود کا تحفہ بھیجے، پھر دعا مانگے، تا کہ دعا قبول ہو۔

فائدہ: (۱) سورۃ الاحزاب آیت ۵۶ میں اللہ پاک نے مؤمنین کو حکم دیا ہے کہ نبی ﷺ پر رحمت بھیجا کرو، اور خوب سلام بھیجا کرو۔ اس حکم پر عمل کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ صلوٰۃ وسلام کو نماز میں شامل کرلیا جائے۔ چنانچہ سلام تو تشہد کے ضمن میں آگیا۔ اور درود بھیجنے کا طریقہ جب صحابہ نے دریافت کیا تو آپؐ نے درود ابراہیمی سکھلایا۔ پس تشہد کے بعد یہ درود یا کوئی اور درود پڑھ کر دعا مانگنی چاہئے۔

فائدہ: (۲) توسُّل: باب تفعُّل کا مصدر ہے۔ جس کے معنی ہیں: نزدیکی حاصل کرنا۔ اور وسیلہ کے معنی ہیں: نزدیکی کا ذریعہ۔ اور وسیلہ ڈھونڈھنے کے معنی ہیں: کسی بھی نیک عمل کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرنا۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے سورۃ المائدہ آیت ۳۵ میں جو وسیلہ ڈھونڈھنے کا حکم آیا ہے اس کی تفسیر کی ہے: أی تقرَّبوا إلیہ بطاعتہ والعملِ بما یُرْضیہ: خدا کی نزدیکی حاصل کرو اس کی فرمانبرداری اور پسندیدہ عمل کے ذریعہ۔ اور درود شریف اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے مسلم شریف کی روایت ہے کہ جو آنحضرت ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمتِ خاصہ نازل فرماتے ہیں۔ اور نسائی کی روایت میں اضافہ ہے کہ اس کے دس گناہ معاف فرماتے ہیں اور دس درجے بلند کرتے ہیں۔ پس نبی ﷺ کے ذریعہ نزدیکی حاصل کرنے کا مطلب آپؐ پر درود بھیجنا ہے۔

فائدہ:(۳) ماثورہ تمام دعائیں بہترین دعائیں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی دعا مانگ سکتا ہے۔ اوران کے علاوہ بھی دعا مانگ سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ عربی میں مانگے اور ایسی کوئی چیز نہ مانگے جو بندوں سے مانگی جاسکتی ہے، ورنہ نماز فاسد ہوجائے گی۔

اور جو عربی زبان نہیں جانتا یا کما حقہ اس سے واقف نہیں ہے وہ کوئی بھی دعائے ماثورہ بطور ذکر پڑھ لے۔ پھر سلام کے بعد متصلاً بغیر فصل کے اپنی زبان میں دعا مانگے۔ کیونکہ دعا عبادت کا مغز ہے۔ اور اللہ سے مانگنے کا تعلق ہی بندہ کا اصل سرمایہ ہے۔

قال: "ثم لْيَتَخَيَّرْ من الدعاء أعجَبَه إليه" وذلك: لأن وقت الفراغ من الصلاة وقتُ الدعاء، لأنه تغشّى بغاشيةٍ عظيمةٍ من الرحمة، وحينئذ يُستجاب الدعاء.

ومن أدب الدعاء: تقديمُ الثناء على الله، والتوسُّلُ بنبيِّ الله، ليستجابَ.

ترجمہ: فرمایا: "پھر چاہئے کہ چُنے دعا میں سے جو اس کو سب سے زیادہ پسند ہے" اور وہ اس لئے کہ نماز سے فارغ ہونے کا وقت دعا کا وقت ہے۔ اس لئے کہ اس پر چھایا ہے رحمت کا بڑا پردہ۔ اور اس وقت دعا قبول کی جاتی ہے۔

اور دعا کے ادب میں سے پہلے اللہ کی تعریف کرنا اور نبی ﷺ کے ذریعہ تقرب حاصل کرنا ہے، تاکہ دعا قبول کی جائے۔

☆ ☆ ☆

قعدۂ اخیرہ کی حکمت

قعدۂ اخیرہ نماز کا اصلی رکن نہیں ہے۔ ورنہ ہر رکعت کے آخر میں ہوتا۔ کیونکہ ہر رکعت مستقل نماز ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ بلکہ قعدۂ اخیرہ ایک مستزاد رکن ہے۔ اور اس کا اضافہ اس لئے کیا گیا ہے کہ تشہد، درود اور دعا کی بڑی اہمیت ہے، جیسا کہ ابھی واضح ہوا۔ قعدۂ اخیرہ انہی امور کی ادائیگی کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اگر قعدۂ اخیرہ کرکے اور مذکورہ امور انجام دے کر نماز سے نہیں نکلیں گے، بلکہ سجدہ سے سر اٹھاتے ہی نماز ختم کردیں گے تو وہ اعراض کرنے والے کے فارغ ہونے کی طرح یا پچھتانے والے کے کام تج دینے کی طرح ہوکر رہ جائے گا۔ جو کسی بھی طرح نماز کے شایانِ شان نہیں۔

فائدہ:(۱) اس باب میں نماز کے اجزاء کی جو حکمتیں بیان کی گئی ہیں، وہ حرفِ آخر نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔ ان میں سے بعض کا ماخذ (بنیاد) خفی ہے اور بعض واضح ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے ان کو اس لئے بیان نہیں کیا کہ جو حکمتیں بیان کردی ہیں وہی کافی ہیں۔

فائدہ:(۲) اس باب میں نماز کے اجزاء کے سلسلہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں اور کتاب کی قسم اول میں

جو قواعد کلیہ بیان کئے گئے ہیں ان میں غور کیا جائے تو دو باتیں سمجھ میں آجائیں گی:

پہلی بات: یہ ہے کہ نماز کو اسی ہیئت کذائی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس سے بہتر اور کامل تر بندگی کی کوئی صورت عقل میں نہیں آتی۔

دوسری بات: یہ ہے کہ نماز غنیمت کبری ہے اس شخص کے لئے جو اس کو غنیمت سمجھے۔ اس لئے شب معراج میں یہی تحفہ نبیؐ امت کے ذریعہ امت کے پاس بھیجا گیا ہے۔ پس آگے آئیں اس خوانِ یغماں سے خواہش مند۔ واللہ ولی التوفیق!

ثم تقرر الأمرُ على ذلك، وجعلَ التشهد ركنًا، لأنه لولا هذه الأمورُ لكان الفراغُ من الصلاة مثلَ فراغ المُعرض أو النادم. وهنالك وجوهٌ كثيرةٌ، بعضُها خفيُّ المأخذ، وبعضُها ظاهرة، لم نذكرها اكتفاءً بما ذكرنا.

وبالجملة: من تأمل فيما ذكرنا، وفي القواعد التي أسلفناها: علِم قطعاً: أن الصلاة بهذه الكيفية هي التي ينبغي أن تكون؛ وأنها لايتصورُ العقلُ أحسن منها، ولا أكمل، وأنها هي الغنيمة الكبرى للمغتنم.

ترجمہ: پھر معاملہ اس پر ٹھہر گیا۔ اور تشہد (قعدۂ اخیرہ) کو رکن بنایا۔ اس لئے کہ اگر یہ امور (التحیات، درود شریف اور دعا) نہیں ہوں گے تو نماز سے فارغ ہونا اعراض کرنے والے کے فارغ ہونے کی طرح یا پشیمان کے فارغ ہونے کی طرح ہوجائے گا اور یہاں بہت سی وجوہ (حکمتیں) ہیں۔ ان میں سے بعض کا ماخذ سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ اور ان میں سے بعض واضح ہیں۔ ہم ان کو ذکر نہیں کرتے اکتفا کرتے ہوئے اس پر جو ہم نے ذکر کیں۔

اور حاصل کلام: جو غور کرے گا اُن باتوں میں جو ہم نے ذکر کیں، اور ان قواعد میں جو ہم نے پہلے بیان کئے تو وہ یقینی طور پر جان لے گا کہ اس کیفیت کے ساتھ نماز: وہ وہ ہے جو مناسب ہے کہ ہو۔ اور عقلاً متصور نہیں اس سے بہتر اور کامل تر صورت۔ اور یہ کہ نماز غنیمت کبری ہے غنیمت سمجھنے والوں کے لئے۔

☆ ☆ ☆

نماز درحقیقت ایک رکعت ہے مگر دو سے کم پڑھنا جائز نہیں

اصل نماز ایک ہی رکعت ہے، کیونکہ دوسری رکعت میں سابقہ ارکان ہی کی تکرار ہے۔ مگر عام طور پر دو رکعتوں سے کم پڑھنا جائز نہیں۔ کیونکہ دونوں رکعتیں مل کر ایک نماز ہوگئی ہیں۔ اور یہ بات تین وجوہ سے ہے:

پہلی وجہ: جو آسان ہے: یہ ہے کہ بہت تھوڑی نماز (صرف ایک رکعت) معتد بہ فائدہ نہیں دیتی۔ اور بہت زیادہ

مقدار کی ادائیگی بھی دشوار ہے اس لئے حکمت خداوندی نے چاہا کہ لوگوں کے لئے کم از کم دو رکعتیں مشروع کی جائیں۔ اس سے کم کی اجازت نہ دی جائے۔ پس اب کم از کم نماز دو رکعتیں ہیں چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ: ''ہر دو رکعت پر قعدہ ہے'' (مسلم، احمد ۶:۳۱) اور قعدہ نماز کے آخر میں ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ نماز کم از کم دو رکعتیں ہیں۔

دوسری وجہ: جوڑ را دقیق ہے: یہ ہے کہ قانونِ قدرت افراد واشخاص کی تخلیق میں ——— خواہ وہ حیوانات ہوں یا نباتات ——— یہ جاری ہے کہ ہر چیز کی دو جانب ہوں، جو مل کر ایک چیز بنیں۔ سورۃ الفجر میں جفت اور طاق کی قسم کھائی گئی ہے۔ یہ جفت وہی دو جانب رکھنے والی چیزیں ہیں۔ حیوانات کی دو جانب (دایاں بایاں) معلوم ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک جانب فالج زدہ ہو جاتی ہے، اور دوسری جانب صحیح رہتی ہے۔ یہ علامت ہے کہ وہ دونوں جانب علحدہ علحدہ دو چیزیں ہیں، جو مل کر ایک جسم بن گئی ہیں۔ اور نباتات میں کھجور کی گٹھلی اور غلہ کا دانہ دیکھیں۔ ان میں بھی آپ دو جانب پائیں گے۔ چنانچہ جب کونپل نکلتی ہے تو اس میں دو ہی پتے ہوتے ہیں۔ ہر پتہ ایک جانب کی میراث ہے۔ پھر اسی انداز پر بڑھوتری ہوتی ہے۔

پھر یہ سنت الٰہی بابِ خلق سے حظیرۃ القدس میں بابِ تشریع کی طرف منتقل ہوئی یعنی نازل ہونے والی شریعتوں میں بھی اس سنت کا لحاظ رکھا گیا۔ کیونکہ تدبیر، خلق ہی کی ایک شاخ ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے کائنات پیدا کی تو اس کا نظام استوار کرنا بھی ضروری ہوا۔ پس انتظام عالم خلق ہی کی فرع ہے۔ اور شریعتیں نظام انسانی کی درستگی ہی کے لئے نازل کی جاتی ہیں۔ پس انبیاء پر نازل ہونے والے آئین بھی خلق کی فرع ہوئے۔ اور اصل کا فرع میں اثر ناگزیر ہے، اس لئے وہ سنت جو بابِ تخلیق میں جاری تھیں، قانون سازی میں پیش نظر رہی۔ پھر حظیرۃ القدس سے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر مترشح ہوئی، تو آپ نے احکام میں اس کا لحاظ رکھا۔ اور نماز کی کم از کم دو رکعتیں تجویز فرمائیں۔ یہی نماز کی دو جانب ہیں۔ جو دونوں مل کر شئ واحد یعنی ایک نماز بنی ہیں۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ نماز تو درحقیقت ایک ہی رکعت ہے، مگر انسان اپنے احوال کی پراگندگی کی بنا پر ایک رکعت کما حقہ پڑھنے پر قادر نہیں، اس لئے دو کی جوڑی تجویز کی گئی تاکہ ایک دوسری کے نقصان کی تلافی کرے اور دونوں مل کر ایک کامل نماز بنیں۔ اور دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں ایک رکعت پڑھنے کی ممانعت اس تعلیل کے ساتھ آئی ہے کہ وہ بُتَیْراء (ناقص) ہے۔ اور اس کی نظیر یہ ہے کہ ہل اور گاڑی میں دو بیل جوڑے جاتے ہیں۔ کیونکہ ایک بیل اس کو نہیں کھینچ سکتا۔ اس لئے دو کی جوڑی جوڑی جاتی ہے، تاکہ دونوں مل کر بیڑا پار کریں (یہ وجہ شارح نے بڑھائی ہے)

ولما كان القليلُ من الصلاة لايفيد فائدة معتدًا بها، والكثيرُ جدًا يعسُر إقامته: اقتضت حكمةُ الله أن لايَشرع لهم أقلَّ من ركعتين، فالركعتان أقلُّ الصلاة، ولذلك قال: " في كل

ركعتين التحيةُ"

وههنا سِرٌّ دقيق : وهو: أن سنة الله تعالى في خلق الأفراد والأشخاص من الحيوان والنبات: أن يكون هنالك شِقَّان، يُضَمُّ كلُّ واحد بالآخر، ويُجعلانِ شيئًا واحدًا، وهو قوله تعالى: ﴿ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ أما الحيوان فشِقَّاه معلومان، وربما تُعرض الآفةُ شقًا دون شق، كالفالج؛ أما النباتُ: فالنواة والحبة فيهما شقان، وإذا نبت الخامةُ، فإنما تنبتُ ورقتان، كلُّ ورقةٍ ميراثُ أحدِ شِقَّي النواة والحبة، ثم يتحقق النموّ على ذلك النمط.

فانتقلت هذه السنّة من باب الخلق إلى باب التشريع في حظيرة القدس، لأن التدبير فرع الخَلْق، وانْعَكَسَ من هناك في قلب النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

فأصلُ الصلاة هو ركعة واحدة، ولم يُشْرع أقلّ من ركعتين في عامة الصلاة، وضُمَّتْ كلُّ واحدة بالأخرى، وصارتا شيئًا واحدًا.

ترجمہ: اور جب تھوڑی نماز معتد بہ فائدہ نہیں پہنچاتی تھی، اور بہت ہی زیادہ کی بجا آوری دشوار تھی، تو حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ لوگوں کے لئے دو رکعتوں سے کم مشروع نہ کی جائیں۔ پس دو رکعتیں کم از کم نماز ہیں۔ اور اس وجہ سے فرمایا: ''ہر دوگانہ پر قعدہ ہے''۔

اور یہاں ایک باریک راز ہے (یعنی دوسری وجہ دقیق ہے) اور وہ یہ ہے کہ اللہ پاک کی سنت اشخاص وافراد کے پیدا کرنے میں، حیوانات ونباتات میں سے یہ ہے کہ ہوں وہاں دو جانب۔ ہر ایک دوسری کے ساتھ ملائی جائے اور دونوں ایک چیز بنائی جائیں۔ اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''قسم ہے جفت کی اور طاق کی''۔ پس رہا حیوان تو اس کی دو جانب معلوم ہیں۔ اور کبھی ایک جانب کو آفت پیش آتی ہے، نہ کہ دوسری جانب کو، جیسے فالج۔ رہی گھاس: تو کھجور کی گٹھلی اور دانہ: ان میں دو جانب ہیں۔ اور جب کونپل نکلتی ہے تو دو ہی پتے اگتے ہیں۔ ہر پتہ گٹھلی اور دانہ کی دو جانبوں میں سے ہر ایک کی میراث ہے (یعنی دَین ہے) پھر اسی انداز پر بڑھوتری پائی جاتی ہے (یعنی دو دو پتے نکلتے رہتے ہیں)

پس یہ سنت بابِ خلق سے حظیرۃ القدس میں بابِ تشریع کی طرف منتقل ہوئی، اس لئے کہ تدبیر، خلق کی فرع (شاخ) ہے۔ اور منعکس ہوئی وہاں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر۔

پس اصل نماز وہ ایک ہی رکعت ہے۔ اور عام نمازوں میں دو رکعتوں سے کم جائز نہیں رکھی گئی۔ اور ایک دوسری کے ساتھ ملائی گئی اور وہ دونوں ایک چیز ہو گئیں (عام نمازوں میں اس لئے کہا کہ بعض ائمہ کے نزدیک وتر کی صرف ایک رکعت بھی جائز ہے)

☆

مغرب کے علاوہ نمازیں دو دو رکعتیں فرض کی گئی تھیں پھر اضافہ عمل میں آیا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب نمازیں فرض کیں تو سفر وحضر میں دو دو رکعتیں فرض کیں۔ پھر سفر کی نماز تو بحالہ باقی رکھی گئی۔ اور حضر کی نماز میں اضافہ کیا گیا (بخاری حدیث ۳۵۰ کتاب الصلاۃ کا پہلا باب) اور مسند احمد (۲۶۵۰۶) کی روایت میں مغرب کی نماز کا استثناء ہے، اس کی شروع ہی سے تین رکعتیں فرض کی گئی ہیں۔ اور اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ وہ دن کا وتر ہے۔

تشریح: رکعتوں کی وہ تعداد جو اصلی واجب ہے، جو کسی حال (سفر وحضر) میں ساقط نہیں ہوتی: گیارہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ کوئی درمیانی بابرکت عدد مشروع کیا جائے۔ جو نہ تو بہت زیادہ ہو اور نہ بہت کم۔ کیونکہ بہت زیادہ ہوگا تو سب مکلفین اس کو ادا نہیں کرسکیں گے، اور بہت کم ہوگا تو نماز کا مطلوبہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

اور پہلے مبحث ۶ باب ۹ میں یہ بات آچکی ہے کہ وتر حقیقی ایک ہے، اور اس سے قریب ترین مشابہت رکھنے والا عدد گیارہ ہے۔ کیونکہ حقیقی اوتار ایک، تین اور سات ہیں۔ اور گیارہ ایک کا ترقی یافتہ عدد ہے۔ اس لئے نمازوں کی اولین تعداد فرض کی گئی۔

پھر جب آنحضرت ﷺ نے ہجرت فرمائی اور اسلام کو جماؤ حاصل ہوگیا اور مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہوگئی اور عبادات میں لوگوں کی رغبتیں بڑھ گئیں، تو فرائض میں چھ رکعتوں کا اضافہ کیا گیا۔ اور سفر کی نمازیں بحالہ باقی رکھی گئیں۔

اور اتنی ہی تعداد اس لئے بڑھائی گئی کہ دو چند یا اس سے بھی زائد کا اضافہ مناسب نہیں۔ لوگ تنگی میں پڑ جائیں گے۔ مناسب بات یہ ہے کہ اصل کا نصف بڑھایا جائے۔ مگر وہ ساڑھے پانچ ہے، اور کسر کی گنجائش نہیں، تو دو عدد نمودار ہوئے: پانچ اور چھ یعنی کسر کی دونوں جانب کے دو سالم عدد۔ مگر پانچ بڑھانے میں یہ دشواری ہے کہ مجموعہ سولہ ہو جائے گا، اور نمازیں طاق نہیں رہیں گی۔ پس چھ کا اضافہ متعین ہوگیا۔ اس طرح فرائض کی کل رکعتیں سترہ ہوگئیں۔

پانچوں نمازوں پر رکعتوں کی تقسیم کی بنیاد

رہا رکعتوں کی تقسیم کا معاملہ یعنی کس نماز میں کتنی رکعتیں رکھی جائیں تو یہ بات دو بنیادوں پر طے کی گئی ہے:

پہلی بنیاد: اس سلسلہ میں گذشتہ نبیوں کے آثار کی پیروی کی گئی ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے ابن عائشہ عبید اللہ بن محمد (متوفی ۲۲۸ھ) کا قول نقل کیا ہے کہ فجر کے وقت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تو آپ نے دو رکعتیں پڑھیں، جو فجر کی نماز بن گئیں۔ ظہر کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام کا فدیہ آیا (روایت میں ایسا ہی ہے۔ حالانکہ فدیہ اسماعیل علیہ السلام کا آیا تھا) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شکریہ کی چار رکعتیں پڑھیں تو

وہ ظہر کی نماز بن گئیں۔ عصر کے وقت حضرت عُزیر علیہ السلام زندہ کئے گئے تو انھوں نے چار رکعتیں پڑھیں تو وہ عصر کی نماز بن گئیں۔ اور غروب کے وقت حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تو آپ چار رکعتیں پڑھنے کھڑے ہوئے، مگر بُکا غالب آگیا تو تین رکعتوں پر بیٹھ گئے، پس وہ مغرب کی نماز بن گئی اور عشاء کی نماز سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے پڑھی تو آپؐ کی پیروی میں وہ عشا کی نماز بن گئی (امانی الاحبار ۲:۳۶۳) اور زندوسی کی روضۃ العلماء میں ہے کہ عشا کی چار رکعتیں سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام نے ادا فرمائی ہیں۔ ان کی پیروی میں عشا کی چار رکعتیں مقرر ہوئیں (امانی)

فائدہ: یہ سب روایات بے پایہ ہیں۔ ابن عائشہ نے کوئی سند بیان نہیں کی۔ اس لئے شاہ صاحب نے الأحادیث کے بجائے الأخبار لفظ استعمال کیا ہے۔ البتہ حضرت جبریل کا یہ قول ثابت ہے کہ ھذا وقت الأنبیاء قبلك پس نمازیں تو گذشتہ امتوں میں بھی تھیں، مگر ان کی رکعتوں کی تعداد کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

دوسری بنیاد: مغرب کی نماز رات دن کی نمازوں میں ایک اعتبار سے آخری نماز ہے۔ کیونکہ عرب رات کو آئندہ دن کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور رات صحیح معنی میں اس وقت شروع ہوتی ہے، جب وہ چھا جاتی ہے۔ غروب شفق تک کا وقت ان کے نزدیک دن میں شمار ہوتا ہے۔ اس لئے سترہ میں سے ایک کا عدد جو نمازوں کو طاق بنانے والا ہے، مغرب میں رکھا گیا۔ اور مغرب میں یہ عدد شروع ہی سے رکھا گیا ہے پھر جب رکعتوں میں اضافہ کیا گیا تو مغرب میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس کا وقت مختصر ہے۔

اور فجر کا وقت نیند اور سستی کا وقت ہے، اس لئے اس کی رکعتوں میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ البتہ جو قراءت طویل کرسکتا ہے اس کے لئے لمبی قراءت کرنا مستحب قرار دیا گیا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں اس کا اشارہ ہے۔ اور باقی نمازوں میں دو دو رکعتوں کا اضافہ کیا گیا۔

فائدہ: یا یہ کہا جائے کہ دو دو رکعتوں کے اضافہ کی وجہ بھی وہی ہے جو دوگانہ مشروع کرنے کی ہے۔ کیونکہ ظہر کے وقت میں آدمی سو کر اٹھتا ہے یا کاروبار میں مشغول ہوتا ہے۔ اور عصر کا وقت تو کاروبار کے عروج کا وقت ہے اور عشاء کے وقت نیند سر پر سوار ہوتی ہے۔ ایسے اوقات میں دو رکعتیں بھی اتنی ناقص ہوں گی کہ مل کر ایک کامل نماز نہیں بنیں گی۔ اس لئے مزید دو کا اضافہ کیا گیا تاکہ چار مل کر ایک کامل نماز بن جائیں۔

اور مغرب کا وقت بھی مشغولیت کا وقت ہے، مگر وہ دن کا وتر ہے۔ اور اس کی رعایت شریعت کی نظر میں زیادہ اہم ہے۔ اس لئے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ اور فجر کا وقت دلجمعی کا وقت ہے۔ اس وقت تک کاروبار کے بکھیڑے شروع نہیں ہوتے۔ اس لئے جب لمبی قراءت کے ساتھ دو رکعتیں ادا کی جائیں گی تو وہ مل کر ایک کامل نماز بن جائیں گی۔ اس لئے اس میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: اور اضافہ کو اصل سے ممتاز اس طرح کیا گیا کہ اصل رکعتیں بھری پڑی جاتی ہیں اور مستزاد خالی۔ یعنی ان میں

سورت تو ملائی ہی نہیں جاتی، فاتحہ پڑھنا بھی صرف سنت ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی اور مسند اسحاق بن راہویہ میں حضرت رفاعہ بن رافع انصاریؓ کی روایات ہیں، جن سے یہ بات ثابت ہے (فتح القدیر ۱:۴۷۴)

قالت عائشة رضي الله عنها: "فرض الله الصلاةَ، حين فرضها ركعتين ركعتين، في الحضر والسفر، فأُقِرَّت صلاة السفر، وزِيدَ في صلاة الحضر" وفي رواية: "إلا المغرب، فإنها كانت ثلاثًا"

أقول: الأصلُ في عدد الركعات: أن الواجب الذي لايسقط بحالٍ، إنما هو إحدى عشرة ركعةً، وذلك: لأنه اقتضت حكمة الله أن لايُشْرع في اليوم والليلة إلا عددًا مباركًا متوسِّطًا، لايكون كثيرًا جدًا، فيعسُر إقامتُه على المكلفين جميعًا، ولا قليلاً جدًا، فلا يفيد لهم ما أريد من الصلاة. وقد علمتَ فيما سبق أن الأحد عشر من بين الأعداد أشبهُهَا بالوتر الحقيقي.

ثم لما هاجر النبيُّ صلى الله عليه وسلم، واستقر الإسلام، وكثر أهلُه، وتوفرت الرغباتُ في الطاعة، زيدت ستُّ ركعات، وأُبقيت صلاةُ السفر على النمط الأول.

وذلك: لأن الزيادة لاينبغي أن تصل إلى مِثْلِ الشيئ أو أكثره، وكان المناسب أن يُجعل نصفَ الأصل؛ لكن ليس لأحد عشر نصف بغير كسر، فبَدَا عددانِ: خمسةٌ وستةٌ، وبالخمسة يصير عدد الركعات شَفْعًا، غير وتر، فتعينتِ الستَّةُ.

وأما توزيعُ الركعات على الأعداد: فمبنيٌّ على آثار الأنبياء السابقين، على ما يُذكر في الأخبار.

وأيضًا: فالمغرب: آخر الصلاة من وجهٍ، لأن العرب يَعُدُّوْن الليالِيَ قبل الإيام، فناسب أن يكون الواحدُ المُوْتر للركعات فيها، ووقتُها ضيقٌ، فلا تناسب زيادة ما زيد فيها آخرًا؛ ووقت الفجر وقتُ نوم وكسل، فلم يزد في عدد الركعات، وزاد فيها استحبابَ طول القراء ة لمن أطاقه، وهو قوله تعالى: ﴿وَقُرْآنَ الْفَجْرِ، إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ والله أعلم.

ترجمہ: عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اللہ نے نماز فرض کی، جب اس کو فرض کیا، دو دو رکعتیں، حضر و سفر میں۔ پس سفر کی نماز اپنے حال پر باقی رکھی گئی اور حضر کی نماز میں اضافہ کیا گیا'' اور ایک روایت میں ہے: ''مگر مغرب کی نماز، پس وہ شروع ہی سے تین رکعتیں ہے''

میں کہتا ہوں: رکعتوں کی تعداد میں اصل یہ ہے کہ وہ واجب جو کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتا: وہ گیارہ رکعتیں ہی ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے چاہا کہ نہ مشروع کیا جائے رات دن میں مگر کوئی درمیانی مبارک عدد، جو نہ ہو بہت ہی زیادہ، پس دشوار ہو جائے سارے ہی مکلفین پر اس کا ادا کرنا۔ اور نہ بہت ہی تھوڑا، پس نہ

فائدہ پہنچائے لوگوں کو اس بات کا جو نماز سے مقصود ہے۔ اور آپ ماسبق میں جان چکے ہیں کہ گیارہ کا عدد، اعداد کے درمیان سے وترِ حقیقی کے ساتھ دیگر اعداد سے زیادہ مشابہ ہے۔

پھر جب نبی ﷺ نے ہجرت فرمائی اور اسلام جم گیا اور مسلمان زیادہ ہو گئے اور عبادات کی رغبتیں بڑھ گئیں تو چھ رکعتیں بڑھادی گئیں اور سفر کی نماز پہلی روش پر باقی رکھی گئی۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ زیادتی مناسب نہیں کہ پہنچ جائے چیز کے مانند کو یا اس سے بھی زائد ہو جائے۔ اور مناسب یہ تھا کہ مقرر کیا جاتا اصل کا آدھا۔ مگر نہیں تھا گیارہ کے لئے ٹوٹے بغیر آدھا۔ پس نمودار ہوئے دو عدد: پانچ اور چھ۔ اور پانچ سے ہو جاتی تھیں رکعتوں کی تعداد جفت، طاق باقی نہیں رہتی تھی۔ پس متعین ہو گئے چھ۔

اور رہا رکعتوں کو تقسیم کرنا اعداد پر، تو وہ مبنی ہے گذشتہ انبیاء کے آثار پر، جیسا کہ خبروں میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور نیز: پس مغرب: بایں وجہ آخری نماز ہے۔ کیونکہ عرب شمار کرتے ہیں راتوں کو دنوں سے پہلے۔ پس مناسب ہوا کہ رکعتوں کو طاق بنانے والا ایک کا عدد مغرب میں ہو۔ اور اس کا وقت تنگ ہے۔ پس مناسب نہیں ہے اس چیز کا اضافہ جو نمازوں میں بعد میں کیا گیا——— اور فجر کا وقت نیند اور سستی کا وقت ہے۔ پس نہیں اضافہ کیا رکعتوں کی تعداد میں۔ اور اضافہ کیا اس میں قراءت کی درازی کا استحباب، اس کے لئے جو اس کی طاقت رکھتا ہے۔ اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''اور اہتمام کر تو فجر میں قرآن پڑھنے کا۔ بیشک فجر میں قرآن پڑھنا فرشتوں کی حاضری کا وقت ہے'' باقی اللہ پاک بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

باب ——— ۱۰

نماز کے اذکار اور مستحب ہیئتیں

گذشتہ باب کے شروع میں بیان کیا گیا تھا کہ نماز میں دو قسم کی چیزیں شامل ہیں: ضروری اور مستحب۔ ضروری امور کا تذکرہ گذشتہ باب میں آچکا۔ اب مستحب امور کا تذکرہ فرماتے ہیں:

نماز کا پورا فائدہ حاصل کرنے کے لئے گذشتہ باب میں جو ضروری امور ذکر کئے گئے ہیں، ان کے علاوہ مزید چند مستحبات ہیں۔ اور یہ دو قسم کی چیزیں ہیں۔ ایک: کا تعلق نماز کی کیفیت سے ہے یعنی اس کی رعایت سے نماز شاندار ہوتی ہے۔ اور دوسری کا تعلق نماز کی کمیت یعنی مقدار سے ہے یعنی فرائض کے علاوہ بھی کچھ نوافل ہیں جن کی ادائیگی مطلوب ہے۔

کیفیت کا بیان: نماز کو عمدہ بنانے کے لئے اس میں چند باتیں شامل کی گئی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱) ـــــ نماز میں جگہ جگہ اذکار متعین کئے گئے ہیں۔ ان سے نماز میں جان پڑتی ہے۔

(۲) ـــــ ارکانِ نماز: قیام، رکوع، سجدہ، قومہ، جلسہ اور قعدہ کی ادائیگی کی بہترین ہیئتیں متعین کی گئی ہیں۔ ان کی رعایت سے نماز میں خوبی پیدا ہوتی ہے۔

(۳) ـــــ نماز کو شاندار بنانے کا اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ نماز صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے پڑھی جائے، اور اس طرح پڑھی جائے کہ گویا نمازی اللہ پاک کو دیکھ کر نماز ادا کر رہا ہے۔ اس طرح نماز پڑھی جائے گی تو نماز میں ذرہ بھر کمی نہیں رہے گی۔ حدیث جبریل میں احسان (نکوکردن) کا یہی طریقہ بتایا ہے۔

(۴) ـــــ نماز میں اِدھر اُدھر خیالات دوڑانا نماز کو خراب کرتا ہے۔ اس لئے اس سے احتراز ضروری ہے۔

(۵) ـــــ نماز میں مستحب ہیئتوں کی رعایت نماز کو عمدہ بناتی ہے۔ کیونکہ بے ڈھنگے طریقہ پر ارکان کی ادائیگی سے نماز کی صورت بگڑتی ہے۔ اور صورت کا بگاڑ حقیقت کے بگاڑ کو مستلزم ہے۔

(۶) ـــــ اور اس قسم کی دیگر باتیں جو نماز کو عمدہ بناتی ہیں، ان کی رعایت کرنا اور جو نماز کو بگاڑتی ہیں، ان سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

کمیت کا بیان: فرائض کے علاوہ چند نفل نمازیں ہیں۔ جیسے سنن مؤکدہ، غیر مؤکدہ، تحیۃ المسجد، اشراق، چاشت اور تہجد وغیرہ۔ ان نوافل کی ادائیگی بھی نماز سے پوری طرح متمتع ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ان کی تفصیل آگے ''نوافل'' کے عنوان سے آئے گی۔

اذکار کی بنیاد: یہ روایات ہیں: (۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت، جس میں نماز کے تقریباً سارے ہی اذکار آئے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۸۱۳ باب مایقرأ بعد التکبیر) (۲) دعائے استفتاح یعنی قراءت شروع کرنے سے پہلے کا ذکر جو حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ، حضرت جُبیر بن مطعم، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کی روایات میں اور ان کے علاوہ دیگر حضرات کی روایات میں آیا ہے (۳) حضرت عائشہ، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ثوبان اور حضرت کعب بن عُجرۃ رضی اللہ عنہم کی روایات جو نماز کے دیگر مواقع کے اذکار میں وارد ہوئی ہیں (۴) اور ان کے علاوہ صحابہ کی روایات جو آگے مفصل ذکر کی جائیں گی۔

ارکان کی ہیئتوں کی بنیاد: یہ روایات ہیں: (۱) حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث، جو انھوں نے دس صحابہ کی موجودگی میں بیان کی تھی۔ اور سب نے اس کو تسلیم کیا تھا اور حضرت عائشہ اور حضرت وائل بن حُجر رضی اللہ عنہما کی روایات جن میں ارکانِ نماز کی تمام ہیئتیں مذکور ہیں (۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی رفع یدین کی روایت (۳) اور ان کے علاوہ بھی روایات ہیں جو عنقریب ذکر کی جائیں گی۔

﴿أذكار الصلاة وهيئاتها المندوب إليها﴾

اعلم: أن الحدَّ الأكملَ الذى يَسْتَوفِى فائدةَ الصلاة كاملةً: زائدٌ على الحدّ الذى لابد منه بوجهين: بالكيف والكم:

أما الكيف: فأعنى به الأذكار، والهيئاتِ، ومؤاخذةَ الإنسانِ نفسَه: بأن يصلّى للّٰه كأنه يراه، ولايُحدِّثُ فيها نفسَه، وأن يحترز من هيئاتٍ مكروهة، ونحوَ ذلك.

وأما الكم: فصلواتٌ يتنفَّلون بها، وسيأتيك ذكرُ النوافل من بعدُ، إن شاء اللّٰه تعالىٰ.

والأصل فى الأذكار: حديثُ على رضى الله عنه فى الجملة، وأبى هريرةَ، وعائشةَ، وجبير بن مُطعِمٍ، وابن عمر، وغيرهم — رضى الله عنهم — فى الاستفتاح؛ وحديثُ عائشة، وابن مسعود، وابى هريرةَ، وثوبانَ، وكعب بن عُجْرَةَ — رضى الله عنهم — فى سائر المواضع، وغيرِ هؤلاء، مما نذكره تفصيلاً.

والأصل فى الهيئات: حديثُ أبى حميدٍ الساعدى الذى حَدَّثه فى عشرة من أصحاب النبىِّ صلى الله عليه وسلم، فسلّموا له، وحديثُ عائشة، ووائل بن حُجْرٍ رضى الله عنهما فى الجملة، وحديثُ ابن عمر رضى الله عنه فى رفع اليدين، وغيرِ هؤلاء مماسنذكره.

ترجمہ: نماز کے اذکار اور اس کی وہ ہیئتیں جن کی ترغیب دی گئی ہے: جان لیں کہ کامل تر حد جو نماز کا پورا فائدہ حاصل کرنے والی ہے، وہ دوطرح سے اُس حد سے زائد ہے جو نماز کے لئے ضروری ہے: کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے:

رہی کیفیت: تو میں اس سے مراد لیتا ہوں: (۱) اذکار کو (۲) اور ہیئتوں کو (۳) اور انسان کا اپنے نفس کو پکڑنا (پابند بنانا) کہ وہ اللہ کے لئے نماز پڑھے گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے (۴) اور وہ نماز میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے (۵) اور یہ کہ احتراز کرے ناپسندیدہ ہیئتوں سے (۶) اور اس قسم کی دوسری باتوں کو۔

اور رہی کمیت: تو چند نمازیں ہیں، جن کو لوگ نفل کے طور پر پڑھتے ہیں۔ اور عنقریب نوافل کا تذکرہ آئے گا کچھ دیر بعد اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

اور اذکار میں بنیاد: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے تمام اذکار میں۔ اور ابوہریرہ، عائشہ، جُبیر بن مُطعِم اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ کی روایات ہیں دعائے استفتاح (ثناء) میں اور عائشہ، ابن مسعود، ابوہریرہ، ثوبان اور کعب بن عُجرۃ رضی اللہ عنہم کی روایات ہیں دیگر مواقع کے اذکار میں، اور ان کے علاوہ صحابہ کی روایات ہیں ان میں سے جن کو ہم تفصیلاً ذکر کریں گے۔

اور ہیئتوں میں بنیاد: ابوحمید ساعدی کی حدیث ہے، جس کو انھوں نے دس صحابہ کی موجودگی میں بیان کیا تھا، پس انھوں نے اس کو مان لیا تھا، اور عائشہ اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہما کی روایتیں ہیں تمام ہیئتوں میں۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی رفع یدین کے سلسلہ میں روایت ہے اور ان کے علاوہ صحابہ کی روایات ہیں، جن کو ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

☆ ☆ ☆

ہیئتوں میں ملحوظ چار باتیں

نماز کی مستحب ہیئتوں میں چند باتیں ملحوظ ہیں:

پہلی بات: خضوع کو پورے طور پر ثابت کرنا یعنی ہر رکن میں ایسی ہیئت اختیار کرنا جس سے عاجزی خود بخود ٹپکے۔ اور اعضاء سمیٹ لینا۔ اور نفس کو اس طرح کی حالت سے آگاہ کرنا جو رعیت کو بادشاہوں سے ہم کلامی کے وقت پیش آتی ہے یعنی ان پر ہیبت اور دہشت طاری ہوتی ہے۔ ان مقاصد سے نماز میں دست بستہ کھڑا ہونا، دونوں پیروں کو برابر رکھنا، نگاہ پست کرنا۔ اور ادھر اُدھر نہ دیکھنا شامل کیا گیا ہے۔

دوسری بات: جب آدمی زبان سے کوئی ذکر کرے یا دل سے اس کا تصور کرے تو ہاتھ اور انگلی سے اُس ذکر اور تصور کی محاکات کرے یعنی نقل اتارے اور ماسوی اللہ پر ذکر کو ترجیح دے۔ یعنی ہاتھ اور انگلی کو بھی اسی ذکر میں لگائے۔ جیسے تکبیرات کے ساتھ رفع یدین کرنا اور تشہد میں انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنا، تاکہ قول وفعل ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

تیسری بات: نماز میں باوقار ہیئتوں اور عمدہ عادتوں کو اختیار کرنا۔ اور اوچھا پن اور ایسی ہیئتوں سے احتراز کرنا جن کو سمجھ دار لوگ برا خیال کرتے ہیں۔ اور ان کو جانوروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جیسے مرغ کی طرح ٹھونگیں مارنا، کتے کی طرح بیٹھنا، لومڑی کی طرح سجدہ میں سمٹنا، اونٹ کی طرح بیٹھنا اور درندوں کی طرح کلائیاں بچھانا۔ اسی طرح اُن ہیئتوں سے احتراز کرنا جو سرگشتہ اور مصیبت زدہ لوگوں کی ہوتی ہیں۔ مثلاً پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونا۔

چوتھی بات: عبادت اطمینان، سکون اور آہستگی کے ساتھ کرنا۔ جیسے جلسۂ استراحت کر کے باطمینان کھڑا ہونا۔ اور پہلے قعدہ میں افتراش کرنا تاکہ اٹھنے میں سہولت ہو اور آخری قعدہ میں تورّک کرنا کیونکہ اس میں راحت زیادہ ہے۔

والهيئاتُ المندوبة: ترجع إلى معانٍ:

منها: تحقيقُ الخضوع، وضَمُّ الأطراف، والتنبيهُ للنفس على مِثْلِ الحالةِ التي تَعْتَرِي السُّوْقَةَ عند مناجاة الملوك: من الهيبة والدَّهَش، كصفِّ القدمين، ووضع اليمنى على اليسرى، وقَصْر النظر، وترك الالتفات.

ومنها: محاكاةُ ذكرِ الله، وإيثارُه على من سواه، بأصابعه ويده، حذوَ ما يعقلُه بجنانه،

ويقوله بلسانه، كرفع اليدين، والإشارةِ بالمسبِّحة، ليكون بعضُ الأمر معاضِدًا لبعض.

ومنها: اختيارُ هيئاتِ الوقار ومحاسن العادات، والاحترازُ عن الطَّيْش، والهيئات التى يَذُمُّهَا أهلُ الرأى، ويُنسبونها إلى غير ذوى العقول، كنقر الديك، وإقعاء الكلب، واحْتِفازِ الثعلب، وبُروك البعير، وافتراش السَّبُع، والتى تكون للمتحيِّرين وأهل البلاء، كالاختصار.

ومنها: أن تكون الطاعة بِطُمَانِينةٍ وسكون وعلى رِسْلٍ، كجلسة الاستراحة، ونصب اليمنى وافتراش اليسرى فى القعدة الأولى، لأنه أيسر لقيامه، والقعودِ على الورِك فى الثانية، لأنه أكثرُ راحةً.

ترجمہ: اور مستحب ہیئتیں چند معانی (باتوں) کی طرف لوٹتی ہیں:

ان میں سے: خضوع کو پوری طرح ثابت کرنا، اور اعضاء کو سکوڑ لینا اور نفس کو چوکنا کرنا اس حالت جیسی پر جو رعیت کو پیش آتی ہے بادشاہوں سے سرگوشی کے وقت یعنی ہیبت اور دہشت۔ جیسے دونوں پیروں کو برابر رکھنا اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا (یعنی ہاتھ باندھنا) اور نگاہ کو پست کرنا اور ادھر اُدھر نہ دیکھنا۔

اور ان میں سے: اللہ کے ذکر کی محاکات کرنا اور اس کو ماسوی اللہ پر ترجیح دینا، اپنی انگلیوں اور اپنے ہاتھ سے، اُس چیز کے مقابل جس کو وہ سمجھتا ہے اپنے دل سے اور جس کو وہ کہتا ہے اپنی زبان سے، جیسے دونوں ہاتھوں کو اٹھانا اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنا، تاکہ بعض معاملہ بعض کا مددگار بن جائے۔

اور ان میں سے: وقار کی ہیئتوں کو اور عمدہ عادتوں کو اختیار کرنا ہے۔ اور اوچھاپن اور ان ہیئتوں سے احتراز کرنا ہے جن کو سمجھ دار لوگ برا خیال کرتے ہیں۔ اور ان کو حیوانات کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جیسے مرغ کا ٹھونگیں مارنا، اور کتے کی بیٹھک اور لومڑی کا سمٹنا، اور اونٹ کا بیٹھنا، اور درندوں کا بچھانا۔ اور (ان ہیئتوں سے احتراز کرنا) جو حیران اور اہل بلاء کی ہیں۔ جیسے پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونا۔

اور ان میں سے: یہ ہے کہ عبادت اطمینان، سکون اور آہستگی سے ہو۔ جیسے جلسۂ استراحت۔ اور دایاں پیر کھڑا کرنا اور بایاں پاؤں بچھانا (اور اس پر بیٹھنا) پہلے قعدہ میں، کیونکہ وہ اس کے کھڑے ہونے کے لئے زیادہ آسان ہے۔ اور سرین پر بیٹھنا دوسرے قعدہ میں، کیونکہ اس میں راحت زیادہ ہے۔

☆ ☆ ☆

اذکار میں ملحوظ تین باتیں

اذکار میں تین باتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں:

پہلی بات: نفس کو بیدار کرنا تاکہ وہ چوکنا ہو اور اس خضوع کو بدست لائے جس کے لئے وہ عمل مقرر کیا گیا ہے۔

جیسے رکوع وسجود تعظیم بجالانے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ پس اگر خاموشی سے یہ ارکان ادا کئے جائیں گے تو ممکن ہے نفس کو مقصد کا خیال تک نہ آئے۔ اور رکوع وسجود کی تسبیحات پڑھے گا تو نفس بیدار ہوگا اور اس کو خیال آئے گا کہ وہ یہ ارکان عاجزی کرنے کے لئے کر رہا ہے۔

دوسری بات: امام جھکتے اٹھتے تکبیرات انتقالیہ بلند آواز سے کہے، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ امام ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ پس وہ بھی اس کی پیروی کریں۔

تیسری بات: یہ بھی پیش نظر ہے کہ نماز کی کوئی حالت ذکر سے خالی نہ رہے تکبیرات انتقالیہ اور قومہ وجلسہ کے اذکار اسی مقصد سے مقرر کئے گئے ہیں۔

> وأما الأذكار: فترجع إلى معانٍ:
> منها: إيقاظ النفس، لتتنبَّه للخضوع الذى وُضع له الفعل، كأذكار الركوع والسجود.
> ومنها: الجهر بذكر الله، ليكون تنبيهًا للقوم بانتقال الإمام من ركن إلى ركن، كالتكبيرات عند كل خفض ورفع.
> ومنها: أن لاتخلو حالةٌ في الصلاة من ذكر، كالتكبيرات، وكأذكار القومة والجلسة.

ترجمہ: اور رہے اذکار: تو وہ چند معانی کی طرف لوٹتے ہیں:

ان میں سے: نفس کو بیدار کرنا ہے، تاکہ وہ اس خضوع کے لئے چوکنا ہو جس کے لئے عمل مقرر کیا گیا ہے۔ جیسے رکوع وسجود کے اذکار۔ اور ان میں سے: اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرنا ہے، تاکہ وہ لوگوں کے لئے تنبیہ ہو امام کے ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے پر، جیسے ہر جھکنے اور اٹھنے کے وقت تکبیرات۔ اور ان میں سے: یہ ہے کہ نماز کی کوئی حالت ذکر سے خالی نہ رہے۔ جیسے تکبیرات اور جیسے قومہ اور جلسہ کے اذکار۔

☆ ☆ ☆

تکبیر تحریمہ میں رفع یدین کی حکمت

جب تکبیر تحریمہ کہے تو دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ہاتھوں کو اٹھانے کا مقصد یہ جتلانا ہے کہ اس نے ماسوی اللہ سے اعراض کیا یعنی ہر چیز کو پس پشت ڈالدیا۔ اور وہ مناجات کے محل میں داخل ہوگیا یعنی خدا تعالیٰ کے حضور میں آگیا یعنی یہ تحرم فعلی ہے جیسا کہ تکبیر تحرم قولی ہے۔ دونوں کو ملایا گیا ہے تاکہ قول اور فعل ایک دوسرے کے مطابق ہو جائیں۔

اور ہاتھ کانوں تک یا مونڈھوں تک اٹھائے۔ دونوں ہی سنت ہیں۔

وضاحت: تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں؟ اس میں روایتیں مختلف ہیں۔ حضرت ابوحمید ساعدی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایات میں مونڈھوں تک اٹھانے کا ذکر ہے۔ اور حضرت مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ کی روایت میں دونوں کانوں کی محاذات تک اٹھانے کا تذکرہ ہے۔ اور انہی کی ایک دوسری روایت میں کانوں کے اوپر کے کناروں تک اٹھانے کا بیان ہے۔ یہ سب روایات مشکوٰۃ شریف: باب صفة الصلاة میں ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے ان میں تخییر کا راستہ اختیار کیا ہے اور سب کو سنت قرار دیا ہے۔

فائدہ: دوسری رائے تطبیق کی ہے یعنی ہاتھ اس طرح اٹھائے جائیں کہ گٹے مونڈھوں کے مقابل، انگوٹھے کان کی لو کے مقابل اور انگلیوں کے سرے کانوں کے اوپر کے کناروں کے مقابل ہوجائیں۔ یہ بھی ایک اچھی تجویز ہے۔

ہاتھ باندھنے، پیر برابر رکھنے اور نظر سجدہ کی جگہ میں روکنے کی حکمت

تکبیر کے بعد دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر باندھ لے، اور دونوں پیروں کو ایک قطار میں رکھے یعنی آگے پیچھے نہ رکھے اور نظر کو سجدہ کی جگہ میں روک لے اور اس میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: اس طرح کھڑا ہونا تعظیم کے لئے ہے۔ یعنی معظم ہستی کے سامنے دست بستہ، باسلیقہ، نظریں جھکا کر کھڑا ہونا عرف میں تعظیم شمار کیا جاتا ہے۔

دوسری حکمت: ظاہر کا باطن پر اثر پڑتا ہے پس نماز میں جمعیت خاطر کی دولت اسی وقت حاصل ہوگی جب بدن کے اطراف کو سمیٹ لے۔ اگر ہاتھ ہلتے رہے، قدم بے ترتیب رہے اور نگاہیں بھٹکتی رہیں تو دلجمعی اور سکون قلبی میسر نہیں ہوگا۔

استفتاح کے اذکار اور اس کی حکمت

تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے استفتاح پڑھے۔ اِسْتَفْتَحَ الْأَمْرَ بكذا کے معنی ہیں: کسی چیز سے شروع کرنا۔ تکبیر تحریمہ کے بعد جو ذکر کیا جاتا ہے اور جس سے نماز شروع کی جاتی ہے اس میں تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: یہ اذکار دل کی حضوری کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ حضوری کی دولت یکدم حاصل نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ توجہ سمٹتی ہے۔ اس لئے قراءت شروع کرنے سے پہلے یہ اذکار رکھے گئے ہیں تاکہ دل حاضر ہو۔

دوسری حکمت: فاتحہ مناجات ہے۔ اس میں خدا کی تعریف اور اپنی عاجزی کا اظہار کر کے دعا مانگی جاتی ہے۔ دعائے استفتاح کے ذریعہ اس مناجات کے لئے دل کو ابھارا جاتا ہے۔

تیسری حکمت: پہلے سے موجود تمام مقتدی امام کے ساتھ نماز شروع نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ پس اگر امام تکبیر کے ساتھ ہی قراءت شروع کردے گا تو کچھ مقتدی سننے سے محروم رہیں گے۔ اس لئے دعائے استفتاح رکھی گئی

تاکہ اتنے امام یہ ذکر کرے، سب مقتدی شامل نماز ہو جائیں، پھر امام قراءت شروع کرے (یہ حکمت شارح نے بڑھائی ہے)
نماز شروع کرنے کے لئے روایات میں متعدد اذکار آئے ہیں۔ ان میں سے چار اذکار درج ذیل ہیں:
پہلا ذکر: بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر اور قراءت کے درمیان تھوڑی دیر خاموش رہتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! جب آپ تکبیر اور قراءت کے درمیان خاموش رہتے ہیں تو کیا پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں کہتا ہوں:

اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خطايای كما باعدتَ بَيْنَ الْمشرقِ والْمَغرِبِ، اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنَ الْخطايا كما يُنقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنسِ، اَللّٰهُمَّ اغسِلْ خَطَايَایَ بِالْماءِ وَالثَّلجِ وَالْبرَدِ (مشکوۃ حدیث ۸۱۲)

ترجمہ: الٰہی! دوری فرما میرے اور میرے گناہوں کے درمیان، جیسی دوری رکھی آپ نے مشرق و مغرب کے درمیان۔ الٰہی! پاک فرما مجھے گناہوں سے جیسا پاک کیا جاتا ہے سفید کپڑا میل سے۔ الٰہی! دھو ڈال میرے گناہوں کو پانی، برف اور اُولوں سے۔

تشریح: برف اور اُولوں سے دھونا کنایہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ میرے گناہوں کو بخش دے اور دل کو اطمینان و سکون نصیب فرما۔ حقیقۃً دھونا مراد نہیں۔ عربی محاورہ ہے: بَرَدَ قلبُه: اس کا دل ٹھنڈا ہوا یعنی اس کو سکون و اطمینان حاصل ہوا۔ اور أتَاهُ الثَّلْجُ: اس کے پاس برف آیا یعنی یقین آ گیا۔

دوسرا ذکر: مسلم شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت مروی۔ جس میں نماز کے سبھی اذکار ہیں۔ اس میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کے بعد کہتے تھے:

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فطَرَ السَّماوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا، وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعالمِيْنَ، لاشرِيْكَ لَهُ، وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ وفی رواية: وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (مشکوۃ حدیث ۸۱۳)

ترجمہ: میں نے اپنا منہ پھیر لیا اس ذات کی طرف جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، درانحالیکہ میں ایک طرف کا ہو کر رہنے والا ہوں۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ بیشک میری نماز، میری عبادت، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور اسی کا حکم دیا گیا ہوں میں اور میں سب سے پہلا ماننے والا ہوں اور ایک روایت میں ہے: اور میں ماننے والوں میں سے ہوں۔

نوٹ: یہ دعا لفظ أوَّل کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں اور اس کے بغیر بھی۔ دونوں ثابت ہیں۔ کیونکہ اول شمار کے اعتبار سے مراد نہیں، بلکہ مستعدی کے اعتبار سے مراد ہے۔

تیسرا ذکر: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تھے تو کہتے تھے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ، وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ، وَلَا إِلٰـهَ غَيْرُكَ (مشکوۃ حدیث ۸۱۵)

ترجمہ: پاک ہے آپ کی ذات! الٰہی! اور آپ اپنی خوبیوں کے ساتھ ہیں۔ اور بابرکت ہے آپ کا نام۔ اور بلند ہے آپ کی بزرگی۔ اور آپ کے علاوہ کوئی معبود نہیں!

چوتھا ذکر: حضرت جبیر بن مُطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو کوئی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپؐ نے کہا:

اَللّٰـهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا، اَللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا، اَللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا. (مشکوۃ ۸۱۷)

ترجمہ: اللہ پاک بے حد سب سے بڑے ہیں۔ اللہ پاک بے حد سب سے بڑے ہیں۔ اللہ پاک بے حد سب سے بڑے ہیں اور بے حد تعریفیں ہیں اللہ کے لئے۔ اور بے حد تعریفیں ہیں اللہ کے لئے۔ اور بے حد تعریفیں ہیں اللہ کے لئے اور اللہ کے لئے پاکی ہے صبح وشام۔ اور اللہ کے لئے پاکی ہے صبح وشام۔ اور اللہ کے لئے پاکی ہے صبح وشام یعنی ہمیشہ کے لئے۔

نوٹ: یہ اذکار اعراب اور ترجمہ کے ساتھ اس لئے لکھے گئے ہیں کہ قارئین ان کو یاد کریں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ سب کو توفیق دے (آمین)

فإذا كَبَّرَ رفع يديه، إيذانًا بأنه أعرض عما سوى الله تعالى، ودخل في حَيِّزِ المناجاة، ويرفع يديه إلى أذنيه أو منكبيه، وكلُّ ذلك سنة، ووَضَعَ يده اليمنى على اليسرى، وصَفَّ القدمين، وَقَصَرَ النظرَ على محلِّ السجدة، تعظيمًا، وجمعًا لأطراف البدن حَذْوَ جمعِ الخاطر. ودَعَا دعاء الاستفتاح، تمهيدًا لحضور القلب، وإزعاجًا للخاطر إلى المناجاة، وقد صحّ في ذلك صِيَغٌ.

منها: ﴿اللّٰهم باعِدْ بيني وبين خطاياىَ كما باعدتَ بين المشرق والمغرب، اللّٰهم نَقِّنِيْ من الخطايا كما يُنَقَّى الثوبُ الأبيضُ من الدَّنَسِ، اللّٰهم اغْسِلْ خطاياىَ بالماء والثَّلْج والبرد﴾

أقول: الغسل بالثلج والبرد كناية عن تكفير الخَطَايَا مع إيجاد الطُّمَأْنينة وسُكون القلب، والعربُ تقول: بَرَدَ قلبُه: أى سكن واطمأنَّ؛ وأتاه الثلج: أى اليقين.

ومنها: ﴿وَجَّهْتُ وجهى للذى فطر السماوات والأرض حنيفًا وما أنا من المشركين، إن صلاتى ونسكى ومحياىَ ومماتى لله رب العالمين، لاشريك له، وبذلك أمرت وأنا أول المسلمين) وفى رواية: ﴿وأنا من المسلمين﴾

ومنها: ﴿سبحانك اللّٰهم وبحمدك وتبارك اسمك، وتعالى جدك، ولا إلٰه غيرك﴾

ومنها: ﴿الله أكبر كبيرًا — ثلاثًا — والحمد لله كثيرًا — ثلاثًا — وسبحان الله بكرة وأصيلاً — ثلاثًا —﴾

ترجمہ: پس جب تکبیر تحریمہ کہے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے۔ آگاہی دیتے ہوئے کہ اس نے روگردانی کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ سے اور داخل ہوا وہ مناجات کی جگہ میں۔ اور اٹھائے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں کانوں تک یا اپنے دونوں مونڈھوں تک۔ اور یہ سب سنت ہے۔ اور رکھے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر، اور قطار میں رکھے دونوں پیروں کو، اور کوتاہ کرے نگاہ کو سجدہ کی جگہ میں، تعظیم کے طور پر اور بدن کے اطراف کو اکٹھا کرنے کے طور پر دل کو جمع کرنے کے مقابلہ میں یعنی باہر اطراف کو جمع کرنے سے، اندر جمعیت خاطر حاصل ہوگی۔

اور استفتاح کی دعا مانگے دل کی حضوری کو ہموار کرنے کے طور پر۔ اور مناجات کی طرف دل کو برانگیختہ کرنے کے طور پر۔ اور تحقیق ثابت ہوئے ہیں اس سلسلہ میں بہت سے صیغے (دعا کا ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: برف اور اُولوں سے دھونا کنایہ ہے گناہوں کو مٹانے سے اطمینان اور سکونِ قلب پیدا کرنے کے ساتھ اور عرب کہتے ہیں بَرَدَ قلبُه یعنی سکون پایا اور مطمئن ہوا۔ اور اَتَاهُ الثلج: یعنی یقین آیا (باقی اذکار کا ترجمہ بھی آگیا ہے)

☆ ☆ ☆

قراءت سے پہلے استعاذہ کی حکمت

دعائے استفتاح کے بعد شیطان لعین سے پناہ مانگے۔ اور اس کے لئے تین جملے ہیں:

۱-: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ: میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں مردود شیطان سے۔

۲-: أَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ: میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں مردود شیطان سے۔

۳-: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ: مِنْ نَفْخِه، وَنَفْثِهِ، وَهَمْزِهِ: میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان سے: اس کے پھونکنے سے (یعنی دل میں تکبر پیدا کرنے سے) اور اس کے تھوک چھینکنے سے (یعنی اس کے جادو کرنے سے) اور اس کے چھونے سے (یعنی دل میں وسوسہ ڈالنے سے)

اور قراءت شروع کرنے سے پہلے تعوذ کی دلیل سورۃ النحل کی آیت ۹۸ ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''پس جب آپ قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں''۔ استعاذہ کی حقیقت: دل سے اللہ تعالیٰ پر نظر رکھنا ہے، جو واجب ہے۔ اور زبان سے أَعُوْذُ پڑھنا سنت ہے۔

اور قراءت سے پہلے استعاذہ میں حکمت یہ ہے کہ شیطان قرآن پڑھنے والے کے دل میں کسی آیت کا غلط مطلب بھی بٹھا سکتا ہے، اور قرآن میں تدبر کرنے سے روک بھی سکتا ہے۔ اور یہ شیطان کا سب سے بڑا ضرر ہے، اس لئے اس سے پناہ مانگ کر قراءت شروع کرنی چاہئے۔

ثم يتعوّذ لقوله تعالى: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ﴾

أقول: السر في ذلك: أن من أعظم ضرر الشيطان أن يُوَسْوِسَ له في تأويل كتاب الله ما ليس بمرضيّ، أو يصدّه عن التدبر.

وفي التعوُّذ صِيَغٌ: منها:" أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، ومنها: أستعيذ بالله من الشيطان الرجيم، ومنها: أعوذ بالله من الشيطان: من نفخه، ونفثه، وهمزه.

ترجمہ: پھر پناہ لے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی وجہ سے:''پس جب آپ قرآن پڑھیں تو اللہ کی پناہ لے لیں مردود شیطان سے'' میں کہتا ہوں: رازاُس (استعاذہ) میں یہ ہے کہ شیطان کے ضرروں میں سے سب سے بڑا ضرر یہ ہے کہ وہ قرآن پڑھنے والے کے لئے اللہ کی کتاب کے مطلب میں وسوسہ ڈالے، جو پسندیدہ نہیں ہے یا روکے اس میں غور کرنے سے۔ اور پناہ لینے کے لئے کئی جملے ہیں الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی حکمت

شاہ صاحب قدس سرہ کی عبارت میں چند اشارے ہیں۔ ان کو کماحقہ سمجھنے کے لئے تین باتیں عرض ہیں:

پہلی بات: امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک فرض نماز میں نہ دعائے استفتاح ہے، نہ تعوذ، نہ تسمیہ۔ تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہی الحمد للہ رب العالمین سے پڑھنا شروع کردے۔ باقی تین ائمہ کے نزدیک فاتحہ سے پہلے اذکار مستحب ہیں۔

دوسری بات: سورۃ النمل کی بسم اللہ کے علاوہ بسم اللہ میں اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ ـــــ وہ قرآن کی ایک مستقل آیت ہے، جو ہر سورت کے شروع میں ـــــ سوائے سورۃ البراءۃ کے ـــــ لکھی گئی ہے۔ وہ کسی سورت کا جز نہیں ہے۔ اور سورۂ فاتحہ کی ساتویں آیت غیر سے شروع ہوتی ہے۔

امام مالک ـــــ بسم اللہ نہ کسی سورت کا جز ہے، نہ قرآن کی مستقل آیت ہے۔

امام شافعی ـــــ بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جز ہے اور شوافع کے درمیان یہ مسئلہ متفق علیہ ہے اور یہ سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت ہے۔ اور ساتویں آیت صراط سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر سورت کے شروع میں جو بسم اللہ ہے وہ بھی اس سورت کا جز ہے۔ اور یہ شوافع کے نزدیک اصح قول ہے۔

امام احمد ـــــ سے تینوں طرح کی روایات مروی ہیں۔

تیسری بات: جہری نمازوں میں بسم اللہ جہراً پڑھی جائے یا سراً؟ اس میں اختلاف ہے:

امام ابوحنیفہ اور امام احمد ـــــ الحمد سے پہلے سراً بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے۔ ان کے مستدلات صحیح ترین روایات ہیں۔

امام مالک ـــــ فرض نماز میں فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ نہ سراً پڑھی جائے نہ جہراً۔ نوافل میں پڑھ سکتے ہیں۔ ان

کے مستدلات بھی صحیح روایات ہیں، مگر مجمل ہیں۔

امام شافعی —— فاتحہ اور سورت دونوں کے شروع میں جہراً بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔ان کا مستدل چودہ روایات ہیں۔مگر سب ضعیف ہیں۔البتہ صحابہ کی ایک جماعت بسم اللہ کے جہر کی قائل تھی۔پس یہ روایات بھی بے اصل نہیں ہیں۔

اب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع کی جاتی ہے۔فرماتے ہیں:

تعوذ کے بعد سراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے۔اوراس میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: قراءت شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ برکت کے لئے پڑھی جاتی ہے۔شریعت نے ہمارے لئے ایسا ہی تجویز کیا ہے۔

وضاحت: ہر اہم کام بسم اللہ سے شروع کرنا چاہئے۔ایک ضعیف حدیث میں ہے: **کلُّ امرٍ ذی بالٍ لایُبدأ فیه ببسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم أَقطعُ:** ہر اہم کام جو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے، ہاتھ کٹا ہے یعنی ناقص (کنز العمال حدیث ۲۴۹۱) مگر اذکار جیسے اذان و اقامت وغیرہ کو بسم اللہ سے شروع نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ خود ذکر ہیں۔اگر ان کے لئے بھی بسم اللہ ہوگی تو بسم اللہ کے لئے بھی بسم اللہ ہوگی، اوراسی طرح سلسلہ چلے گا۔البتہ جہاں ثبوتِ شرعی ہو، جیسے فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنا ثابت ہے، وہاں برکت کے لئے پڑھی جائے گی۔ شَرَعَ: مقرر کیا کا یہی مطلب ہے۔

دوسری حکمت: فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنا احتیاط کی بات ہے۔کیونکہ روایات مختلف ہیں کہ بسم اللہ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں؟ بعض روایات سے جز ہونا ثابت ہوتا ہے۔پس احتیاطاً بسم اللہ پڑھنی چاہئے تاکہ ان روایات پر بھی عمل ہوجائے۔نیز امام شافعی رحمہ اللہ کے اختلاف کی رعایت بھی ہوجائے گی۔

بسم اللہ جہراً پڑھی جائے یا سراً؟

نہایت قوی روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ الحمد للہ رب العالمین سے قراءت شروع کرتے تھے۔بسم اللہ الرحمٰن الرحیم زور سے نہیں پڑھتے تھے۔اور جہراً بسم اللہ پڑھنے کی جو روایات ہیں وہ ضعیف ہیں۔تاہم جہر کا ثبوت تسلیم کرنا پڑے گا۔کیونکہ صحابہ کی ایک جماعت جہر کی قائل تھی۔اگر جہر کا ثبوت نہ ہوتا تو وہ حضرات کیسے قائل ہوتے؟ اور روایات میں تعارض کا حل یہ ہے کہ آپؐ نے کبھی تعلیم امت کے لئے جہر فرمایا ہے، آپؐ کا یہ دائمی معمول نہیں تھا۔پس اصل سنت سراً بسم اللہ پڑھنا ہے۔

اذکار کی تعلیم خواص کو دی جاتی تھی

اس کے بعد شاہ صاحب نے ایک نہایت قیمتی فائدہ بیان کیا ہے کہ روایات سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ

آنحضرت ﷺ نماز کے اذکار کی تعلیم اپنے مخصوص اصحاب ہی کو دیا کرتے تھے۔ عام لوگوں کو ان کا مکلف نہیں کرتے تھے۔ نہ اس سلسلہ میں ان کی داروگیر کی جاتی تھی، نہ سرزنش کی جاتی تھی۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے جو دعائے استفتاح وغیرہ کا انکار مروی ہے، اس کا مطلب بھی شاہ صاحب کے نزدیک یہی ہے کہ وہ عام لوگوں کے لئے ان اذکار کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، یہ اذکار ان کے نزدیک صرف خواص کے لئے تھے۔ اور باجماعت نماز چونکہ عوام کے مجمع میں پڑھی جاتی ہے، اس لئے وہ فرائض میں ان اذکار کی ممانعت کرتے ہیں۔ ورنہ نوافل میں وہ بھی اجازت دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اذکار کی روایات ان کے سامنے بھی تھیں۔ اور وہ فی الجملہ اس کے قائل بھی تھے۔ اور یہ بات حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے مفہوم ہوتی ہے جو پہلے آچکی ہے کہ آنحضرت ﷺ تکبیر اور قراءت کے درمیان تھوڑی دیر خاموش رہتے تھے۔ ابو ہریرہؓ نے دریافت کیا کہ آپ اس وقت کیا پڑھتے؟ آپؐ نے فرمایا کہ **اللّٰھم باعد إلخ** پڑھتا ہوں۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب تک حضرت ابو ہریرہؓ نے دریافت نہیں کیا آپؐ نے ازخود ان کو اس ذکر کی تعلیم نہیں دی۔

فائدہ: احناف کا بھی یہی رجحان ہے۔ وہ لمبے اذکار کو نوافل اور تہجد کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ کیونکہ روایات میں ان اذکار کے ساتھ اس کی صراحت بھی ہے۔ اور فرائض میں صرف ثنا پڑھنے کو پسند کرتے ہیں اور قومہ وجلسہ کے اذکار بھی عوام کو نہیں بتلاتے۔ کیونکہ ان کا تحمل عوام کے لئے دشوار ہے۔

ثم يُبَسْمِلُ سِرًّا، لِمَا شَرَعَ الله لنا من تقديم التبرك باسم الله على القراء ة، ولأن فيه احتياطًا، إذقد اختلفت الروايةُ: هل هي آيةٌ من الفاتحة أم لا؟ وقد صحَّ عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان يفتتح الصلاةَ — أي القراء ة — بالحمد لله رب العالمين، ولايجهر ببسم الله الرحمن الرحيم.

أقول: ولايبعد أن يكون جَهَرَ بها في بعضِ الأحيان، ليعلِّمهم سُنَّةَ الصلاة.

والظاهر: أنه صلى الله عليه وسلم كان يخصُّ بتعليم هذه الأذكار الخواصَّ من أصحابه، ولا يجعلها بحيث يُؤاخَذ بها العامةُ، ويلامون على تركها؛ وهذا تأويل ما قاله مالك رحمه الله عندي، وهو مفهومُ قولِ أبي هريرةَ رضي الله عنه: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يسكتُ بين التكبير وبين القراء ة إسكاتةً، فقلتُ: بأبي وأمي! إسكاتَكَ بين التكبير والقراء ة ماتقول فيه؟

ترجمہ: پھر سراً بسم اللہ پڑھے، بایں وجہ کہ مقرر کیا ہے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے قراءت پر اللہ کے نام سے برکت حاصل کرنے کی تقدیم کو، اور اس لئے کہ اس میں احتیاط ہے، کیونکہ تحقیق روایتیں مختلف ہوئی ہیں: آیا بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟ اور تحقیق ثابت ہوا ہے نبی ﷺ سے کہ آپ نماز یعنی قراءت الحمد للہ رب العالمین سے شروع کیا کرتے تھے۔ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم زور سے نہیں پڑھتے تھے۔

میں کہتا ہوں: اور بعید نہیں کہ آپؐ نے بسم اللہ پڑھی ہو بعض اوقات میں، تا کہ آپؐ لوگوں کو نماز کا طریقہ سکھلائیں۔ اور ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ خاص کیا کرتے تھے ان اذکار کی تعلیم کے ساتھ اپنے اصحاب میں سے مخصوص حضرات کو۔ اور نہیں گردانتے تھے وہ ان اذکار کو بایں طور کہ داروگیر کئے جائیں ان کے ساتھ عام لوگ اور سرزنش کئے جائیں وہ ان اذکار کے چھوڑنے پر۔ اور میرے نزدیک یہی مطلب ہے اس بات کا جو امام مالک رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ اور وہی مفہوم ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول کا کہ نبی ﷺ خاموش رہتے تھے تکبیر اور قراءت کے درمیان تھوڑی دیر۔ پس میں نے کہا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! آپؐ کا خاموش رہنا تکبیر اور قراءت کے درمیان: کیا پڑھتے ہیں آپؐ اس میں؟

☆ ☆ ☆

مقتدی کے لئے قراءت کی ممانعت

اور

سرّی اور جہری نمازوں کی حکمت

اس عبارت میں بھی چند اشارے ہیں، اس لئے تمہید کے طور پر عرض ہے:

تمام ائمہ متفق ہیں کہ مقتدی سورت نہیں پڑھے گا۔ نہ جہری نماز میں اور نہ سری نماز میں۔ اور فاتحہ میں اختلاف ہے۔

احناف ——— کے نزدیک ہر صورت میں ——— خواہ جہری نماز ہو یا سرّی اور خواہ مقتدی امام کی قراءت سن رہا ہو یا نہ سن رہا ہو ——— مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں۔ مکروہ تحریمی ہے۔ اور صاحبِ ہدایہ نے امام محمد کی جو ایک روایت نقل کی ہے کہ سرّی نماز میں مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا مستحسن ہے اس کو علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار اور موطا کی عبارتیں اس کے خلاف ہیں۔

مالکیہ ——— کے نزدیک بھی جہری نماز میں مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے، چاہے وہ امام کی قراءت سن رہا ہو یا نہ سن رہا ہو۔ اور سرّی نماز میں فاتحہ پڑھنا مستحب ہے۔ فرض نہیں۔

شوافع ——— کے نزدیک ہر نماز میں ——— خواہ جہری ہو یا سری ——— مقتدی پر فاتحہ پڑھنا فرض ہے۔

امام احمد ——— کے نزدیک جہری نماز میں اگر مقتدی امام کی قراءت سن رہا ہے تو فاتحہ پڑھنا جائز نہیں۔ اور اگر اتنا دور ہے کہ امام کی آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تو فاتحہ پڑھنا جائز ہے، واجب نہیں، اور جہری نماز میں امام کے سکتوں میں اور سری نماز میں فاتحہ پڑھنا مستحب ہے ——— شاہ صاحب نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع کی جاتی ہے، فرماتے ہیں:

بسم اللہ کے بعد سورۂ فاتحہ اور قرآن کریم کی کوئی سورت خوب صاف صاف پڑھے۔ اس طرح پڑھے کہ ایک ایک حرف الگ الگ معلوم ہو، فَرفَر نہ پڑھے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ حروف کو کھینچ کر صاف طور پر ادا کرے۔ اور سورۂ فاتحہ کی ہر ہر آیت پر ٹھہرے۔ بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ حروف کو کھینچ کر ادا فرماتے تھے (مشکوۃ حدیث ۲۱۹۱ باب آداب التلاوۃ) اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ سورۂ فاتحہ کی ہر آیت پر ٹھہرتے تھے (مشکوۃ حدیث ۲۲۰۵)

اور ظہر اور عصر میں آہستہ قراءت کرے، خواہ امام ہو یا منفرد۔ ان دونمازوں میں سِرّاً پڑھنا واجب ہے۔ اور فجر اور مغرب وعشا کی پہلی دو رکعتوں میں امام زور سے قراءت کرے اور یہ جہر کرنا واجب ہے۔ اور منفرد کو اختیار ہے خواہ زور سے پڑھے خواہ آہستہ۔ اس پر نہ جہر واجب ہے نہ سِرّ۔

اور مقتدی پر خاموش رہنا اور امام کی قراءت سننا واجب ہے۔ اور جہری نماز میں مقتدی کے لئے امام کی قراءت کے ساتھ ساتھ پڑھنا تو جائز نہیں۔ البتہ جب امام سانس لے، اس وقفہ میں پڑھ سکتا ہے۔ اور سِرّی نماز میں مقتدی کو اختیار ہے۔ چاہے پڑھے، چاہے نہ پڑھے۔ مگر صرف فاتحہ پڑھنا جائز ہے، سورت پڑھنا جائز نہیں۔ اور سِرّی نماز میں فاتحہ پڑھے تو اس طرح پڑھے کہ امام کو اُلجھن نہ ہو۔ شاہ صاحب کے نزدیک مجتہدین کے اقوال میں سے یہ قول سب سے بہتر ہے۔ اور شاہ صاحب کے نزدیک اس قول کو اختیار کرنے سے باب کی مختلف روایتوں میں تطبیق کی راہ نکل آتی ہے۔

مذکورہ عبارت میں جو دو مسائل ذکر کئے گئے ہیں، ان کی حکمتیں درج ذیل ہیں:

پہلا مسئلہ: — مقتدی کے لئے قراءت ممنوع ہے — اور اس کی تین وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: امام کے ساتھ مقتدی بھی پڑھیں گے تو امام کو تشویش ہوگی۔ اس کے لئے پڑھنا دشوار ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک جہری نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپؐ نے دریافت کیا: ''کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ پڑھا؟'' ایک صاحب نے عرض کیا: ہاں! اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا: ''میں بھی تو کہوں، کیا بات ہے میں قرآن سے چھینا جھپٹی کر رہا ہوں!'' یعنی میں قرآن پڑھنا چاہتا ہوں اور قرآن ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے یعنی قرآن پڑھنے میں اُلجھن اور تشویش ہو رہی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سنی تو جہری نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھنے سے رُک گئے'' (مشکوۃ حدیث ۸۵۵)

دوسری وجہ: مقتدی پڑھنے میں مشغول ہوگا تو امام کی قراءت میں غور وفکر نہیں کر سکے گا۔ سورۃ الاعراف آیت ۲۰۴ میں کان لگا کر سننے کے ساتھ جو خاموش رہنے کا حکم دیا ہے وہ اسی مقصد سے ہے۔

تیسری وجہ: سب کا ایک ساتھ پڑھنا عظمتِ قرآن کے منافی ہے۔ قرآن پڑھنے کا ادب یہ ہے کہ جب ایک پڑھے تو دوسرے خاموش ہو کر بغور سنیں۔

اور اگر کوئی کہے کہ جب مقتدی سراً پڑھیں گے تو امام سے کیا منازعت ہوگی؟! شاہ صاحب جواباً فرماتے ہیں کہ شریعت نے مقتدیوں پر سراً پڑھنا بھی واجب نہیں کیا۔ کیونکہ اس صورت میں بھی امام سے منازعت ہوگی۔ اور وہ اس طرح کہ جب سبھی لوگ پڑھیں گے اور عوام حروف کو صحیح طور پر ادا کر کے پڑھیں گے تو لوگوں کی آوازوں میں اختلاط ہوگا اور ہلکا سا ہمہمہ پیدا ہوگا اور وہ امام کے لئے باعثِ الجھن ہوگا۔ اس لئے تشویش پیدا کرنے کی تاکید کے ساتھ ممانعت کردی کیونکہ اگر لوگوں پر سراً پڑھنا واجب کیا جاتا تو وہ امر ممنوع (تشویش) تک مُفضی ہوتا۔ البتہ جو شخص اس طرح پڑھ سکتا ہو کہ امام کو تشویش نہ ہو تو اس کو اجازت دی۔ اور یہ امت پر بہت بڑی مہربانی ہے کہ امام کو الجھن سے بچالیا اور سلیقہ مندوں کے لئے پڑھنے کی راہ کھول دی۔

دوسرا مسئلہ: —— سرّی اور جہری نمازوں کا راز —— یہ ہے کہ پند و موعظت کا مقتضی تو یہ تھا کہ سب نمازیں جہراً پڑھی جاتیں۔ مگر دن میں چونکہ بازاروں اور گھروں میں شور و شغب کا احتمال تھا، اور ایسے وقت میں جہری قراءت میں کچھ خاص فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ لوگوں کو کان پڑی سنائی نہیں دیتی اور طبیعت میں انبساط بھی نہیں ہوتا، نہ پڑھنے میں مزہ آتا ہے نہ سننے میں۔ اس لئے ظہر اور عصر میں آہستہ قراءت کرنے کا حکم ہوا۔ اور رات میں آوازیں تھم جاتی ہیں اور ماحول پر سکون ہوجاتا ہے، اس لئے جہراً پڑھنا مفید مطلب ہے اور طبیعت میں سرور و نشاط بھی ہوتا ہے۔ خوب پڑھنے کو اور سننے کو جی چاہتا ہے۔ اس لئے باقی تین نمازیں جہراً ادا کرنے کا حکم ہوا۔ اسی طرح نماز جمعہ و عیدین وغیرہ چونکہ خاص مواقع میں پڑھی جاتی ہیں۔ اور اس وقت کاروبار کی مشغولیت ختم ہوجاتی ہے یا کرادی جاتی ہے تو شور و شغب بھی کم ہوجاتا ہے اور ان نمازوں میں مجمع بھی بڑا ہوتا ہے اور ایسے مواقع روز روز نہیں آتے اس لئے پند و موعظت کے پہلو کو پیش نظر رکھ کر دن کی یہ نمازیں بھی جہراً ادا کی جاتی ہیں۔

فائدہ: نماز میں فاتحہ کی فرضیت یا وجوب کا مسئلہ، اسی طرح مقتدی پر فاتحہ کی فرضیت، جواز یا ممانعت کا مسئلہ یہ بات طے کرنے پر موقوف ہے کہ نماز کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی نماز کے ارکان میں سے اصلی اور بنیادی رکن کیا ہے؟

ایک نقطۂ نظر: یہ ہے کہ نماز کی حقیقت قراءت ہے یعنی بارگاہ خداوندی میں ہدایت کی درخواست پیش کرنا اور اس کا جو جواب ملے اس کو بغور سننا۔ باقی قیام، رکوع و سجود وغیرہ دربار خداوندی میں حاضری کے آداب ہیں۔

اور دوسرا نقطۂ نظر: یہ ہے کہ نماز کی حقیقت فاتحہ پڑھنا ہے۔ سورت ملانا اس میں شامل نہیں۔ وہ صرف سنت ہے۔

بہ الفاظ دیگر: اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ قراءت، فاتحہ کو شامل ہے یا فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے؟

ایک نقطۂ نظر: یہ ہے کہ قراءت، فاتحہ کو نہ صرف شامل ہے، بلکہ اس کا اہم جز ہے۔ اس لئے خاص طور پر فاتحہ واجب ہے اور کوئی سورت ملانا یعنی درخواست کا جواب سننا بھی واجب ہے اور دونوں کا مجموعہ یعنی علی الاطلاق قرآن پڑھنا فرض ہے۔ اور حدیث میں ہے: إذا قرأ فأنصتوا: جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو اور دوسری حدیث

میں ہے: من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة: جوامام کے پیچھے نماز پڑھتا ہے تو امام کی قراءت ہی اس کے لئے قراءت ہے۔ یہ دونوں حدیثیں فاتحہ اور سورت دونوں کو شامل ہیں۔ پس مقتدی کا فاتحہ پڑھنا امام کو الجھن میں ڈالنے کے علاوہ تحصیل حاصل بھی ہے۔ اس لئے ممنوع ہے۔

اور دوسرا نقطۂ نظر: یہ ہے کہ قراءت، فاتحہ پڑھنے کو شامل نہیں۔ فاتحہ پڑھنا ایک مستقل فرض ہے اور قراءت کا مصداق صرف سورت ملانا ہے۔ پس مذکورہ روایات فاتحہ پڑھنے کو مس نہیں کرتیں۔ حتی کہ سورۃ المزمل کی آیت ۲۰ کا بھی فاتحہ سے تعلق نہیں، جس میں فرمایا ہے کہ: ''جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو'' ـــــ مگر جب سورۃ الاعراف کی آیت ۲۰۴ سامنے آئی تو پریشانی لاحق ہوئی۔ کیونکہ إذا قرئ القرآن میں سے فاتحہ کو کیسے علحدہ کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ اس نقطۂ نظر والوں نے اس کی مختلف راہیں سوچیں اور ان کی راہیں الگ الگ ہوگئیں ـــــ غرض یہ مسئلہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا، جو تطبیق کی راہ سوچی جائے۔ بلکہ یہ نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

ثم يُرَتِّلُ سورةَ الفاتحة وسورةً من القرآن، ترتيلاً يَمُدُّ الحروفَ، ويقفُ على رء وس الآيِ، ويُخافت في الظهر والعصر، ويجهر الإمامُ في الفجر، وأُولَيَي المغرب والعشاء، وإن كان مأمومًا وجب عليه الإنصاتُ والاستماعُ، فإن جهر الإمامُ لم يقرأ إلا عند الإسكاتة، وإن خافتَ فله الخِيَرَةُ، فإن قرأ فليقرأ الفاتحةَ قراءةً لايشوِّش على الإمام، وهذا أولى الأقوال عندي، وبه يُجمع بين احاديث الباب.

والسر فيه: ما نُصَّ عليه: من أن القراءةَ مع الإمام تُشَوِّشُ عليه، وتُفَوِّتُ التدبر، وتُخالِف تعظيمَ القرآن، ولم يَعْزِمْ عليهم أن يَقْرَءُ وْا سرًا، لأن العامة متى ارادوا أن يُصَحِّحُوا الحروفَ بأجمعِهم، كانت لهم لَجَّةٌ مُشَوِّشَةٌ، فسجَّل في النهي عن التشويش، ولم يعزِمْ عليهم ما يؤدي إلى المنهيِّ، وأبقىٰ خِيَرَةً لمن استطاع، وذلك غايةُ الرحمة بالأمة.

والسر في مخافتة الظهر والعصر: أن النهار مَظِنَّةُ الصَّخَبِ واللَّغَطِ في الأسواق والدُّوْرِ، وأما غيرُهما: فوقتُ هُدُوِّ الأصوات، والجهرُ أقربُ إلى تذكر القوم واتِّعاظهم.

ترجمہ: پھر صاف صاف پڑھے سورۂ فاتحہ اور قرآن کی کوئی سورت۔ ایسا صاف پڑھنا کہ حروف کو کھینچے اور آیتوں کے سروں پر ٹھہرے۔ اور ظہر اور عصر میں آہستہ پڑھے۔ اور فجر میں اور مغرب وعشا کی پہلی دو رکعتوں میں امام زور سے پڑھے۔ اور اگر مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور سننا واجب ہے۔ پس اگر امام زور سے پڑھے تو مقتدی نہ پڑھے مگر خاموشی کے وقت۔ اور اگر امام آہستہ پڑھے تو مقتدی کو اختیار ہے۔ پس اگر مقتدی پڑھے تو چاہئے کہ سورۂ فاتحہ پڑھے،

ایسا پڑھنا کہ امام کو تشویش نہ ہو۔ اور یہ بات میرے نزدیک تمام اقوال میں بہتر ہے اور اس کے ذریعہ تطبیق دی جاسکتی ہے باب کی حدیثوں میں۔

اور راز اس میں: وہ ہے جس کی تصریح کردی گئی ہے (یعنی حدیث میں صراحۃً وہ وجہ آئی ہے اور یہ اشارہ ہے حدیث: مَا لِی أُنَازِعُ القرآن کی طرف) کہ امام کے ساتھ پڑھنا امام کے لئے باعث تشویش ہے (مصرّح بات یہاں تک ہے) اور تدبر کو فوت کردیتا ہے اور عظمتِ قرآن کے خلاف ہے۔ اور واجب نہیں کی لوگوں پر یہ بات کہ وہ سراً پڑھیں۔ کیونکہ عوام جب چاہیں گے کہ وہ سارے ہی حروف کو درشتگی کے ساتھ ادا کریں تو ان کے لئے پراگندہ کرنے والا شور ہوگا۔ پس تاکیداً ممانعت کردی تشویش پیدا کرنے کی۔ اور نہیں واجب کیا لوگوں پر وہ جو ممنوع تک پہنچادے (یعنی سراً پڑھنا بھی واجب نہیں کیا) اور اختیار باقی رکھا اس کے لئے جو طاقت رکھتا ہے۔ اور یہ امت کے حق میں بہت بڑی مہربانی ہے۔

اور ظہر وعصر میں آہستہ قراءت کرنے میں راز یہ ہے کہ دن بازاروں اور گھروں میں شور وشغب کا احتمالی موقع ہے۔ اور رہی ان دونوں کے علاوہ نمازیں تو وہ آوازوں کے تھمنے کا وقت ہے۔ اور زور سے پڑھنا اقرب ہے لوگوں کو پند وموعظت کرنے سے۔

تصحیح: لَجَّۃٌ اصل میں لَجَبَۃ تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

ملائکہ کے آمین کہنے کی اور امام کے ساتھ آمین کہنے کی حکمت

حدیث — حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ پس جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے ساتھ موافق ہوجاتا ہے اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۸۲۵ باب القراءۃ فی الصلاۃ)

تشریح: امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک جہری نمازوں میں بھی سراً آمین کہنا سنت ہے۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک جہری نمازوں میں جہراً آمین کہنا سنت ہے اسی وجہ سے موافقت کی تفسیر میں بھی اختلاف ہے۔ پہلے قول کے مطابق موافقت فی الوقت مراد ہے یعنی جس وقت فرشتے آمین کہیں اسی وقت جو آمین کہے گا اس کے گناہ معاف ہوں گے۔ اور جو خیالات میں کھویا رہے گا اور دیر سے آمین کہے گا تو اس کی آمین فرشتوں کی آمین سے موافق نہیں ہوگی۔ کیونکہ فرشتے غافل نہیں ہوتے، وہ فاتحہ پوری ہوتے ہی آمین کہتے ہیں۔ پس جو شخص پیچھے رہ گیا وہ گناہوں کی بخشش سے محروم رہا — اور دوسرے قول کے مطابق موافقت فی الاخلاص مراد ہے یعنی جس طرح فرشتوں

نے اخلاص سے آمین کہی ہے اسی طرح جو مقتدی اخلاص سے آمین کہے گا اس کی مغفرت ہوگی۔ اور جو دکھانے سنانے کے لئے یا کسی کو چڑانے کے لئے چلائے گا اس کی مغفرت نہ ہوگی۔ اور ان حضرات کو موافقت کی یہ دوسری تفسیر اس لئے کرنی پڑی کہ جہراً آمین کہنے کی صورت میں کسی کے پیچھے رہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سویا ہوا بھی جاگ جاتا ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع کی جاتی ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی مختصر سی تشریح میں تین باتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی بات: یہ آمین کہنے والے فرشتے کون ہیں؟ کہا گیا ہے کہ یہ اعمال نامہ لکھنے والے اور حفاظت پر مامور فرشتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے علاوہ بھی کچھ فرشتے ہیں جو اللہ کے ذکر سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ذکر کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب بھی کچھ لوگ اللہ کے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں۔ اور قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ اور باہم اس کو پڑھتے ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے۔ اور فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کرّوبیوں میں ان بندوں کا تذکرہ کرتے ہیں (ابوداؤد حدیث ۱۴۵۵) یہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔

دوسری بات: فرشتے آمین کیوں کہتے ہیں؟ آمین کے معنی ہیں: الٰہی! میری دعا قبول فرما۔ اور خاص فاتحہ کے بعد آمین کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی! میری ہدایت طلبی کی دعا قبول فرما۔ اور فرشتے ہدایت مآب اور معصوم ہیں، ان کی گمراہی کا کوئی سوال نہیں۔ پھر وہ اس خاص دعا پر آمین کیوں کہتے ہیں؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرشتے بندوں کے مفاد میں آمین کہتے ہیں۔ اور ان پر فائدہ رسانی کا یہ جذبہ ملأ اعلیٰ سے ٹپکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ نیک بندوں کی قبولیت ومحبت کا جذبہ ملأ سافل پر ملأ اعلیٰ سے مترشح ہوتا ہے۔

تیسری بات: امام کے ساتھ مقتدی آمین کیوں کہتے ہیں؟ وہ تو قائلینِ فاتحہ کے نزدیک اپنی فاتحہ خود پڑھیں گے؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مقتدی امام کی متابعت میں آمین کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات مناسب نہیں ہے کہ صرف قاری آمین کہے۔ سننے والوں کو بھی آمین کہنے میں شریک رہنا چاہئے۔ چاہے وہ بعد میں اپنی فاتحہ خود پڑھیں۔ غرض اس حدیث میں امام کو اسوہ بنانے کا اشارہ ہے اور پیروی کے طریقہ کی تعلیم دی گئی ہے۔

قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا أَمَّنَ الإمامُ فأمِّنوا، فإنه من وافَقَ تأمينُه تأمينَ الملائكة، غفر له ما تقدَّم من ذنبه"

أقول: الملائكة يحضرون الذكر، رغبةً منهم فيه، ويؤمِّنون على ادعيتهم، لأجل ما يترشَّح عليهم من الملأ الأعلى، وفيه إظهارُ التأسِّي بالإمام، وإقامةٌ لسنة الاقتداء.

ترجمہ: آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: فرشتے ذکر میں شریک ہوتے ہیں، ان کی طرف

سے ذکر میں رغبت کے طور پر۔ اور وہ ذاکرین کی دعاؤں پر آمین کہتے ہیں۔ اس وجہ سے جوان پر ملأاعلی سے ٹپکتی ہے۔ اور اس حدیث میں امام کو اُسوہ (نمونہ) بنانے کے لئے اشارہ ہے، اور پیروی کے طریقہ کو روبعمل لانے کا بیان ہے۔

☆ ☆ ☆

ہر رکعت میں دو سکتوں کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے دو سکتے یاد ہیں یعنی آپؐ ہر رکعت میں دو جگہ خاموشی اختیار فرماتے تھے: ایک تکبیر تحریمہ کے بعد، دوسرے فاتحہ ختم کرنے کے بعد۔ حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ نے اس کا انکار کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہمیں ایک ہی سکتہ یاد ہے یعنی تکبیر تحریمہ کے بعد۔ فاتحہ کے بعد کے سکتہ کا انھوں نے انکار کیا۔ پھر دونوں نے مل کر مدینہ خط لکھا۔ اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے استصواب کیا تو ان کا جواب آیا کہ سمرہ کو ٹھیک یاد ہے (رواہ الترمذی، وابوداؤد وابن ماجہ۔ نسائی میں یہ روایت نہیں ہے)

تشریح: حنفیہ کی کتابوں میں ہر رکعت میں تین سکتوں کا ذکر ہے: ایک: تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء وغیرہ پڑھنے کے لئے دوسرا: سورۂ فاتحہ کے بعد، آمین کہنے کے لئے۔ اور تیسرا: سورت ختم کرنے کے بعد سانس کی بحالی کے لئے ـــــ اور شوافع کی کتابوں میں چار سکتوں کا ذکر ہے: پہلا: تکبیر تحریمہ کے بعد، جس میں دعائے استفتاح پڑھی جاتی ہے۔ دوسرا: فاتحہ اور آمین کے درمیان ہلکا سا سکتہ۔ تاکہ امام کا سانس بحال ہوجائے اور امام اور مقتدی ایک ساتھ جہراً آمین کہہ سکیں۔ تیسرا: آمین کے بعد سکتہ طویلہ کیا جاتا ہے، تاکہ مقتدی فاتحہ پڑھ سکیں۔ اس سکتہ کا کوئی ثبوت نہیں۔ شاہ صاحب نے اس کا رد کیا ہے اور چوتھا: سورت کے بعد، سانس کی بحالی کے لئے۔

شاہ صاحب قدس سرہ پہلے سکتہ کی حکمت بیان کرتے ہیں کہ وہ خاموشی اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ سب لوگ تحریمہ باندھ لیں۔ کیونکہ کچھ لوگ جو پہلے سے موجود ہوتے ہیں، وہ بھی امام کے ساتھ نماز شروع نہیں کرپاتے۔ ان کو موقعہ دیا گیا ہے کہ وہ نماز میں شریک ہوجائیں تو امام قراءت شروع کرے تاکہ وہ پوری توجہ اور عزم کے ساتھ قراءت کی سماعت کرسکیں۔

اور سورۂ فاتحہ کے بعد جو سکتہ ہے اس کی حکمت قائلین فاتحہ نے یہ بیان کی ہے کہ یہ مقتدیوں کو فاتحہ پڑھنے کا موقعہ دیا گیا ہے تاکہ وہ امام کو اُلجھن میں ڈالے بغیر اور انصات کا امر ترک کئے بغیر فاتحہ پڑھ لیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کا رد فرمایا ہے کہ مذکورہ حدیث سے صراحۃً یہ سکتہ طویلہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس روایت سے بظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ مختصر سا سکتہ ہے جو ـــــ آمین بالسر کے قائلین کے نزدیک ـــــ آمین کہنے کے لئے ہے۔ اور آمین بالجہر کے قائلین کے نزدیک وہ مختصر وقفہ یا تو فاتحہ اور آمین کے درمیان فصل کرنے کے لئے ہے، تاکہ قرآن، غیر قرآن کے ساتھ مشتبہ نہ ہوجائے یا وہ سکتہ سانس کی بحالی کے لئے ہے تاکہ اس کے بعد سب مل کر آمین کہہ سکیں۔ بہرحال وہ فاتحہ

پڑھنے کے لئے سکتہ طویلہ نہیں ہے ـــــ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ وہ سکتہ طویلہ تھا تو حضرت عمران رضی اللہ عنہ کا انکار کرنا اور اس کو ایک انوکھی بات قرار دینا اس پر دلالت کرتا کہ وہ نبی ﷺ کی کوئی دائمی سنت نہیں تھی۔ ممکن ہے کبھی کبھار لمبا سکتہ کیا ہو۔ اور وہ انکار اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اس وقت عام مسلمانوں کا اس پر عمل نہیں تھا۔ واللہ اعلم۔

ورُوِيَتْ إسكاتتان: إسكاتةٌ بين التكبير والقراءة، ليَتَحَرَّمَ القومُ بأجمعِهم فيما بين ذلك، فَيُقبلوا على استماع القراءة بعزيمة، وإسكاتةٌ بين قراءة الفاتحة والسورة، قيل: ليتسير لهم القراءةُ من غير تشويش، وتركِ إنصاتٍ.

أقول: الحديث الذى رواه أصحاب السنن ليس بصريح فى الإسكاتة التى يفعلها الإمامُ لقراءة المأمومين، فإن الظاهر: أنها للتلفظ بآمين عند من يُسِرُّ بها؛ أو سكتة لطيفة تَمَيَّزُ بين الفاتحة وآمين، لئلا يشتبه غيرُ القرآن بالقرآن عند من يَجْهَرُ بها، أو سكتةٌ لطيفة لِيَرُدَّ إلى القارئ نَفَسُه، وعلى التنزُّل: فاستغرابُ القرنِ الأول إياها يدلُّ على أنها ليست سنةً مستقرةً، ولا مما عمل به الجمهورُ، والله أعلم.

ترجمہ: اور روایت کئے گئے ہیں دو سکتے: ایک سکتہ تکبیر اور قراءت کے درمیان تاکہ تحریمہ باندھ لیں سارے ہی لوگ ان کے درمیان۔ پس متوجہ ہوں وہ قراءت کے سننے کی طرف پختہ ارادہ کے ساتھ۔ اور دوسرا سکتہ: فاتحہ کی قراءت اور سورت کے درمیان۔ کہا گیا: تاکہ آسان ہو لوگوں کے لئے فاتحہ پڑھنا امام کو الجھن میں ڈالے بغیر اور انصات کا امر ترک کئے بغیر۔ میں کہتا ہوں: وہ حدیث جس کو اصحابِ سنن نے روایت کیا ہے وہ صریح نہیں ہے اس سکتہ طویلہ میں جس کو (شافعی) امام مقتدیوں کے پڑھنے کے لئے کرتا ہے۔ پس ظاہر یہ ہے کہ وہ سکتہ آمین کہنے کے لئے ہے اُن لوگوں کے نزدیک جو آمین آہستہ کہتے ہیں یا معمولی وقفہ ہے جو فاتحہ اور آمین کے درمیان جدائی کرتا ہے تاکہ غیر قرآن یعنی آمین قرآن کے ساتھ یعنی فاتحہ کے ساتھ مشتبہ نہ ہو، ان لوگوں کے نزدیک جو آمین زور سے کہتے ہیں یا وہ بہت ہی معمولی سکتہ ہے تاکہ قاری کی طرف اس کا سانس لوٹ آئے۔ اور نیچے اترنے کے طور پر: پس قرن اول یعنی صحابی کا اس کو نئی بات سمجھنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ سنتِ مستمرہ نہیں تھی۔ اور نہ ان باتوں میں سے ہے جن پر جمہور عمل پیرا ہیں۔ واللہ اعلم۔

☆　☆　☆

فجر میں لمبی قراءت کی حکمت

فجر کی نماز میں دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے علاوہ کم از کم ساٹھ آیتیں اور زیادہ سے زیادہ سو آیتیں پڑھے۔ صحابہؓ

کرام رضی اللہ عنہم نے جو آنحضرت ﷺ کی قراءت کے مختلف اندازے کئے ہیں ان میں ایک اندازہ یہ بھی ہے۔ یہ کافی لمبی قراءت ہے۔ ساٹھ آیتیں تقریباً پہلا آدھا پارہ ہوتا ہے اور سو آیتیں تقریباً پون پارہ ہوتا ہے۔ فجر میں اتنی لمبی قراءت کرنے میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: پہلے یہ بات آچکی ہے کہ اصل نماز دو رکعتیں تھیں۔ پھر بعد میں جب اضافہ عمل میں آیا تو فجر کی نماز میں رکعتوں میں اضافہ نہیں کیا گیا، اس کے بجائے قراءت کو طول دیا گیا تاکہ رکعتوں کی کمی کی تلافی ہو جائے۔

دوسری حکمت: صبح کے وقت معاشی جھنجھٹ کا میل دل پر جما ہوا نہیں ہوتا۔ ایسے وقت میں قرآن میں تدبر کیا جائے تو زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ اس لئے موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے لمبی قراءت تجویز کی گئی۔

عشا میں ہلکی قراءت کی وجہ

عشا کی نماز میں سورۃ الاعلی اور سورۃ اللیل اور ان کے مانند یعنی اوساطِ مفصل پڑھنے چاہئیں۔ کیونکہ اس وقت کچھ لوگ تھکے ماندے ہوتے ہیں۔ اگر لمبی قراءت کی جائے گی تو وہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ درج ذیل واقعہ سے یہ بات عیاں ہے:

حدیث ——— حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اپنی قوم میں امامت کرتے تھے۔ ایک دن وہ دیر سے پہنچے اور عشاء کی نماز میں سورۃ البقرۃ شروع کر دی۔ ایک شخص سے جب برداشت نہ ہوا تو اس نے سلام پھیر کر نماز توڑ دی۔ اور اکیلے نماز پڑھی اور چلا گیا۔ لوگوں نے اس کو منافق کا طعنہ دیا۔ اس نے جواب دیا: میں منافق نہیں ہوں۔ البتہ میں اس کی رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دونگا۔ اس نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم اونٹ والے ہیں دن بھر پانی کھینچتے ہیں اور درختوں اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ رات یہ واقعہ پیش آیا۔ تو آپ ﷺ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور فرمایا: "اے معاذ! کیا فتنے میں ڈالنے والا!" یعنی لوگوں سے جماعت چھڑواتا ہے۔: "عشا میں سورۃ الشمس، سورۃ الضحی، سورۃ اللیل اور سورۃ الاعلی پڑھ" (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۸۳۳)

ظہر، عصر اور مغرب میں قراءت کی مقدار اور اس کی حکمت

بعض روایات میں ظہر کی نماز میں فجر کے بقدر، اور عصر کی نماز میں عشا کے بقدر قراءت مروی ہے۔ اور بعض میں ظہر میں عشا کے بقدر اور عصر میں مغرب کے بقدر قراءت مروی ہے۔ پس دونوں مقداروں پر عمل کر سکتا ہے۔ اور مغرب کی نماز میں قصارِ مفصل یعنی چھوٹی سورتیں پڑھنی چاہئیں۔ کیونکہ مغرب کا مستحب وقت مختصر ہے۔ اس لئے لمبی قراءت

نہیں رکھی گئی۔ اور جن روایات میں مغرب میں سورۃ الاعراف، سورۃ الطور اور سورۃ المرسلات پڑھنا مروی ہے، ان کی تاویل کی گئی ہے کہ ایسا بیانِ جواز کے لئے کیا گیا ہے یا ان کا کچھ حصہ پڑھا گیا ہے۔

اور ظہر وعصر میں قراءت مختصر اس لئے رکھی گئی ہے کہ ان میں رکعتوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور یہ مشغولیت کے اوقات بھی ہیں۔ ظہر تو عام طور پر قیلولہ سے بیدار ہو کر ادا کی جاتی ہے، اس لئے نسبۃً مشغولیت کم ہوتی ہے۔ مگر عصر تو کاروبار کی ہماہمی میں ادا کی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی رعایت کی گئی ہے۔

قراءت میں معمولِ نبوی اور لوگوں کے لئے ہدایت

نبی ﷺ موقعہ اور مصلحت کا لحاظ کر کے کبھی قراءت لمبی کرتے تھے، کبھی مختصر۔ نسائی (۸:۲۵۲) میں روایت ہے کہ آپؐ نے فجر کی نماز معوذتین سے بھی پڑھائی ہے۔ اور آپؐ کسی عورت کا بچہ رونا شروع کر دیتا تو قراءت مختصر کر دیا کرتے تھے۔ اور لوگوں کو درج ذیل ہدایت دی ہے۔

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص نماز پڑھائے تو چاہئے کہ ہلکی پڑھائے اس لئے کہ جماعت میں بیمار، ضعیف اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں۔ اور جب اکیلا پڑھے تو جتنی چاہے لمبی پڑھے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۳۱)

بعض نمازوں میں بعض سورتوں کی تخصیص کی وجہ

نبی ﷺ کا معمول بعض نمازوں میں بعض مخصوص سورتیں پڑھنے کا تھا۔ مگر یہ تخصیص شرعاً نہ واجب ہے نہ سنت مؤکدہ۔ چند فوائد کے پیش نظر یہ تخصیص کی گئی ہے۔ پس اگر کوئی بغیر التزام کے اس کی پیروی کرے تو یہ بھی ٹھیک ہے، اور کوئی دوسری سورتیں پڑھے تو یہ بھی درست ہے:

عیدین میں معمول اور اس کی وجہ: عیدین کی نمازوں میں لمبی قراءت کا ارادہ ہوتا تو آپؐ سورۂ ق اور سورۃ القمر پڑھتے تھے۔ اور ہلکی قراءت کرنا مقصود ہوتا تو سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ تلاوت فرماتے۔ ان سورتوں کا انداز بڑا ہی دلچسپ اور دل موہ لینے والا ہے۔ اور پہلی دو سورتوں میں اختصار کے ساتھ قرآن کے تمام مقاصد سمیٹ لئے گئے ہیں۔ اور بہت بڑے اجتماع کے موقعہ پر اسی کی ضرورت ہوتی ہے کہ جامعیت کے ساتھ دین کا خلاصہ لوگوں کے سامنے آجائے۔ اور آخری دو سورتوں میں آخرت کی منظر کشی کی گئی ہے اور آخرت کی زندگی کو بنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ مضامین بھی اہم اجتماع کے لئے موزون ہیں۔

نماز جمعہ میں معمول اور اس کی وجہ: اور جمعہ کی نماز میں کبھی سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقین پڑھتے تھے، اور کبھی

تخفیف کے لئے سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے۔ آخری دو سورتیں پڑھنے کی وجہ تو اوپر آ گئی۔ اور پہلی دو سورتیں اس لئے پڑھتے تھے کہ سورۃ الجمعہ کو تو جمعہ سے مناسبت ہے۔ اور سورۃ المنافقین تحذیر (وارننگ) کے طور پر پڑھی جاتی تھی۔ کیونکہ نمازِ جمعہ میں منافقین اور اُن جیسے کمزور ایمان والے بھی شریک ہوتے تھے ان کو اس سورت کے ذریعہ طرزِ عمل بدلنے کا اشارہ دیا گیا ہے۔

جمعہ کے دن فجر کی نماز میں معمول اور اس کی وجہ: جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۃ السجدۃ اور سورۃ الدہر پڑھنے کا معمول تھا۔ ان دونوں سورتوں میں قیامت اور اس کے بعد پیش آنے والے احوال کا تذکرہ ہے۔ اور قیامت جمعہ کے دن برپا ہوگی اسی لئے چوپایے جمعہ کے دن کان لگاتے ہیں کہ آج قیامت کا صور تو نہیں پھونکا جا رہا۔ پس جمعہ کے روز مؤمنین کو بھی قیامت اور اس کے احوال یاد آنے چاہئیں اور انسانوں کو بھی چوپایوں کی طرح قیامت کے تصور سے گھبرانا چاہئے۔

جواب طلب آیات کا جواب اور اس کی حکمت

قرآن کریم میں کچھ آیات جواب طلب ہیں یا ان کے کچھ تقاضے ہیں۔ وہاں جواب دینا چاہئے۔ اور کلام کا تقاضا پورا کرنا چاہئے۔ مثلاً: سورۃ الاعلیٰ کی پہلی ہی آیت میں ارشاد پاک ہے کہ: ''آپ اپنے عالیشان پروردگار کے نام کی پاکی بیان کیجئے'' آپ ﷺ تہجد میں اور خارج نماز میں یہ آیت پاک پڑھ کر رک جاتے تھے، اور فرماتے: سبحان ربی الأعلی: میرا عالیشان پروردگار ہر کمی سے پاک ہے! اور سورۃ التین کی آخری آیت ہے: ''کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟'' تو آپؐ جواب دیتے: ''کیوں نہیں! اور میں اس پر گواہ ہوں!'' اور سورۃ القیامۃ کی آخری آیت ہے: ''تو کیا وہ (اللہ تعالیٰ) اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ (قیامت میں) مُردوں کو زندہ کردے؟'' تو آپؐ جواب دیتے: ''کیوں نہیں!'' یعنی وہ ضرور قادر ہیں۔ اور سورۃ المرسلات کی آخری آیت ہے: ''تو پھر اس (قرآن) کے بعد وہ (کفار) کونسی بات پر ایمان لائیں گے؟'' تو آپؐ جواب دیتے: ہم اللہ پر ایمان لائے'' اور ایسی آیات قرآن میں اور بھی ہیں، جن کے جوابات مطلوب ہیں، یا ان کے تقاضے ہیں، وہ پورے کرنے چاہئیں۔ یہ ادب کی بات ہے اور خیر کے کاموں کی طرف دوڑنا ہے۔

کیا یہ ادب کی بات ہے کہ اللہ پاک سوال کریں اور بندہ بت بنا رہے۔ یا ایک آیت ایک عمل کا تقاضا کرے اور بندہ سرد مہری کا مظاہرہ کرے۔ حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو سورۃ الرحمان سنائی۔ اس سورت میں اللہ پاک کی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ اور ہر نعمت کے تذکرہ کے بعد دریافت کیا گیا ہے: ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ یعنی اے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے؟'' صحابہ خاموشی سے سنتے رہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں نے لیلۃ الجن میں یہ سورت جنات کو سنائی تو ان کا جواب تم سے بہتر تھا'' یعنی تم نے خاموشی سے سن کر انقیاد کا

اظہار کیا۔ زبان سے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر جنات نے منہ سے بھی جواب دیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں نے جب بھی یہ آیت پڑھی تو جنات نے جواب دیا: لابشیئ من نِعَمِك ربَّنا نكذِّب، فلك الحمد! یعنی اے ہمارے رب! ہم آپ کی نعمتوں میں سے کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، پس آپ ہی کے لئے ستائش ہے! (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث ۸۶۱)

ويقرأ في الفجر ستين آيةً إلى مائةٍ، تداركًا لقلَّة ركعاته بطول قراء ته، ولأن رَيْنَ الأشغال المعاشية لم يَستحكم بعدُ، فيغتنم الفرصةَ لتدبر القرآن. وفي العشاء ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ﴾ و﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ﴾ ومثلَها؛ وقصةُ معاذٍ، وما كَرِهَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم من تنفير القوم، مشهورة، وحُمِلَ الظهرُ على الفجر، والعصرُ على العشاء في بعض الروايات؛ والظهرُ على العشاء، والعصرُ على المغرب في بعضها. وفي المغرب بقصار المفصَّل لضيق الوقت.

وكان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يطوِّل ويخفِّف على ما يرى من المصلحة الخاصة بالوقت، وإنما أمر الناس بالتخفيف: فإن فيهم الضعيفَ، وفيهم السقيمَ، وفيهم ذا الحاجة.

وقد اختار رسولُ الله صلى الله عليه وسلم بعضَ السور في بعض الصلوات لفوائد، من غير حتمٍ ولا طلبِ مؤكَّدٍ، فمن اتَّبع فقد أحسن، ومن لا فلاحرج، كما اختار في الأضحى والفطر ﴿ق﴾ و﴿اقتربت﴾ لبديع أسلوبها، وتجمعِهما لعامة مقاصِد القرآن في اختصار، وإلى ذلك حاجةٌ عند اجتماع الناس، أو: ﴿سبح اسم﴾ و﴿هل أتاك﴾ للتخفيف وأسلوبهما البديع، وفي الجمعة: سورةَ الجُمعة والمنافقين، للمناسبة والتحذير، فإن الجمعةَ تجمع من المنافقين وأشباههم من لايجمَعُه غيرُ الجمعة. وفي الفجر يومَ الجمعة: ﴿الٓمٓ تنزيل﴾ و﴿هل أتى﴾ تذكيرًا للساعة ومافيها، والجمعةُ تكون البهائم فيها مُسِيْخَةً أن تكون الساعةُ، فكذلك ينبغي لبني آدم أن يكونوا فَزِعين بها.

وإذا مَرَّ القارى على: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ﴾ قال: سبحان ربي الأعلى، ومن قرأ: ﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ﴾ فليقل: بلى، وأنا على ذلك من الشاهدين. ومن قرأ: ﴿أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ؟﴾ فليقل: بلى! ومن قرأ: ﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ؟﴾ فليقل: آمنا بالله. ولايخفى ما فيه من الأدب، والمسارعة إلى الخير.

ترجمہ: اور فجر میں پڑھے ساٹھ آیتیں سو تک، فجر کی رکعتوں کی کمی کے تدارک کے طور پر اس کی قراءت لمبی کرنے کے ذریعہ، اور اس لئے کہ معاشی مشغولیات کا میل اب تک پختہ نہیں ہوا۔ پس غنیمت جانے فرصت کو قرآن میں غور کرنے کے لئے۔ اور عشاء میں سورۃ الاعلی اور سورۃ اللیل پڑھے اور ان کے مانند۔ اور معاذؓ کا واقعہ اور وہ بات جس کو نبی ﷺ نے ناپسند کیا یعنی لوگوں کو بھگانا، مشہور ہے۔ اور محمول کی گئی ہے ظہر فجر پر۔ اور عصر عشا پر بعض روایات میں۔ اور (محمول کی گئی

ہے) ظہر عشاپراور عصر مغرب پر بعض روایات میں۔ اور مغرب میں قصارِ مفصل پڑھے وقت کی تنگی کی وجہ سے۔

اور رسول اللہ ﷺ قراءت لمبی کیا کرتے تھے اور ہلکی کیا کرتے تھے اس مصلحت کے مطابق جس کو آپؐ دیکھتے جو اس وقت کے ساتھ خاص ہوتی تھی۔ اور آپؐ نے لوگوں کو ہلکی نماز پڑھانے ہی کا حکم دیا ہے۔ اس لئے کہ جماعت میں کمزور ہوتے ہیں اور ان میں بیمار ہوتے ہیں اور ان میں حاجت مند ہوتے ہیں۔

اور تحقیق انتخاب کیا رسول اللہ ﷺ نے بعض سورتوں کا بعض نمازوں میں چند فوائد کی وجہ سے، بغیر وجوب اور بغیر مؤکد طلب کے۔ پس جو پیروی کرے تو یقیناً اس نے اچھا کیا اور جو نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ چن لیا آپؐ نے عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں سورۂ ق اور سورۃ القمر کو، ان دونوں کے اندازِ بیان کے انوکھاپن کی وجہ سے۔ اور ان دونوں کے جمع کرنے کی وجہ سے اختصار کے ساتھ قرآن کے عمومی مضامین کو۔ اور اس کی حاجت ہے لوگوں کے اجتماع کے وقت۔ یا چن لیا سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ کو نماز کو ہلکا کرنے کے لئے اور ان دونوں کے اسلوب کی عمدگی کی وجہ سے۔ اور چن لیا جمعہ میں سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقین کو جمعہ سے مناسبت کی وجہ سے اور چوکنا کرنے کے لئے۔ پس بیشک نماز جمعہ اکٹھا کرتی ہے منافقین اور ان جیسوں سے ان لوگوں کو جن کو غیر جمعہ اکٹھا نہیں کرتا۔ اور فجر میں چنا جمعہ کے دن سورۃ السجدہ اور سورۃ الدہر کو یاد کرنے کے طور پر قیامت کو اور ان باتوں کو جو قیامت میں پیش آئیں گی۔ اور جمعہ کے دن میں چوپایے کان لگانے والے ہوتے ہیں کہ کہیں قیامت برپا نہ ہو۔ پس اسی طرح انسانوں کے لئے مناسب ہے کہ ہوں وہ گھبرائے ہوئے قیامت سے۔

اور جب گذرے پڑھنے والا (یا سننے والا) سورۃ الاعلیٰ کی پہلی آیت پر تو کہے: ''میرا عالی شان رب پاک ہے!'' اور جو پڑھے سورۃ التین کی آخری آیت تو چاہئے کہ کہے: ''کیوں نہیں، اور میں اس پر گواہوں میں سے ہوں'' اور جو پڑھے سورۃ القیامۃ کی آخری آیت تو چاہئے کہ کہے: ''کیوں نہیں!'' اور جو پڑھے سورۃ المرسلات کی آخری آیت تو چاہئے کہ کہے: ''ایمان لائے ہم اللہ پر!'' اور نہیں پوشیدہ ہے وہ جو اس میں ہے ادب سے اور خیر کی طرف سبقت کرنے سے۔

☆ ☆ ☆

رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے رفع یدین کی حکمت

پھر جب رکوع میں جانے کا ارادہ کرے تو دونوں ہاتھ مونڈھوں تک یا کانوں تک اٹھائے[1]۔ اسی طرح جب رکوع سے کھڑا ہو تو ہاتھ اٹھائے۔ مگر جب قومہ سے سجدہ میں جائے تو ہاتھ نہ اٹھائے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ ہاتھوں کو اٹھانا ارکانِ ثلاثہ: قیام، رکوع اور سجود کی طرح ایک تعظیمی عمل ہے۔ جو نفس کو چوکنا کرتا ہے کہ نمازی نے تمام منافی اعمال پس پشت ڈال دیئے ہیں۔ اور اب وہ مناجات کے محل میں داخل ہوگیا ہے۔ اس لئے نبی ﷺ نے قیام، رکوع اور سجود سے پہلے رفع یدین مشروع کیا، تاکہ نفس ازسرِنو اس رکن کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

اور رفع یدین ایک ایسا عمل ہے جس کو نبی ﷺ نے کبھی کیا ہے۔اور کبھی نہیں کیا۔اس لئے دونوں سنت ہیں۔اور صحابہ وتابعین،اور بعد کے لوگوں میں بھی دونوں طرح متواتر عمل جاری رہا ہے۔اور یہ اُن مسائل میں سے ہے جس میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ میں اختلاف ہوا ہے[۲]۔اور دونوں کی بنیاد مضبوط ہے۔رفع یدین کرنے والوں کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب آپؐ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔اور آپ یہی عمل کرتے تھے جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے تھے۔اور یہی عمل کرتے تھے جب رکوع سے سر اٹھاتے تھے اور تسمیع کہتے تھے۔مگر سجدوں کے درمیان یہ عمل نہیں کرتے تھے ـــــــ اور رفع یدین نہ کرنے والوں کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔انھوں نے ایک مرتبہ اپنے تلامذہ سے فرمایا:"کیا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں؟" پھر آپ نے نماز پڑھی تو پہلی مرتبہ یعنی تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہ کیا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس قسم کے مسائل میں ـــــــ جن میں دونوں طرف روایات اور عمل ہو ـــــــ حق یہ ہے کہ دونوں ہی عمل سنت ہیں۔اور اس کی نظیر:ایک رکعت اور تین رکعت وتر پڑھنے کا مسئلہ ہے یعنی دونوں طرح پڑھنا درست ہے(وتر کا تفصیلی تذکرہ نوافل کے بیان میں آئے گا) پھر فرماتے ہیں کہ جو شخص رفع کرتا ہے وہ مجھے اس شخص سے زیادہ پسند ہے جو رفع نہیں کرتا۔یعنی راجح آپ کے نزدیک رفع ہے۔کیونکہ رفع کی روایتیں زیادہ بھی ہیں،اور مضبوط بھی[۳]۔

پھر ایک قیمتی بات یہ بیان کی ہے کہ اس قسم کے مسائل میں یہ ہرگز مناسب نہیں کہ کوئی شخص اپنے خلاف اپنے شہر کے

---

[۱] یہ مسئلہ پہلے آچکا ہے کہ ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے روایات میں اختلاف کی وجہ سے اختیار دیا ہے ۱۲

[۲] کوفہ میں جو عساکر اسلامی کی چھاؤنی تھا۔اور جس میں پانچ سو صحابہ کرام کا فروکش ہونا ثابت ہے کوئی بھی رفع یدین نہیں کرتا تھا۔امام محمد بن نصر مروزی فرماتے ہیں:"ہم کسی شہر کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہاں کے تمام باشندوں نے رکوع میں جھکتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کو ترک کر دیا ہو،سوائے کوفہ والوں کے"(التعليق الممجد ص ۹۱) اور باقی بلاد اسلامیہ میں رفع کرنے والے بھی تھے۔اور رفع نہ کرنے والے بھی۔مدینہ کی اکثریت رفع یدین نہیں کرتی تھی۔اور امام مالک رحمہ اللہ کے زمانہ میں بھی رفع نہ کرنے والے غالب تھے۔علامہ کشمیری فرماتے ہیں: وقد كان في سائر البلاد تاركون، وكثير من التاركين في عهد مالكؒ، وعليه بنى مختارَه (نیل الفرقدین ص ۲۲)

[۳] مولانا بنوری نے معارف السنن (۲:۴۹۳) میں لکھا ہے کہ عراقی نے پچاس صحابہ کی روایات رفع یدین کے سلسلہ میں جمع کی ہیں۔مگر اس میں ان صحابہ کو بھی شمار کر لیا ہے جن سے صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین مروی ہے۔صحیح تعداد شوکانی کی تصریح کے مطابق بیس ہے۔اور اس میں بھی نقد کی گنجائش ہے۔اور علامہ کشمیریؒ کی تحقیق کے مطابق پندرہ یا اس سے بھی کم رہ جاتی ہے۔اور ترک رفع کی صریح روایات پانچ ہیں۔البتہ اگر وہ روایات جن میں نماز کا پورا طریقہ مروی ہے،اور رفع یدین کے بارے میں سکوت ہے،شامل کر لی جائیں تو ترک رفع کی روایات بہت ہو جائیں گی ـــــــ اور ابن عمرؓ کی روایت اعلی درجہ کی صحیح ہے۔اور ابن مسعودؓ کی روایت کو امام ترمذی نے حسن اور ابن حزم نے صحیح کہا ہے ۱۲

عوام کا فتنہ بھڑکائے[1]۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جب قریش نے کعبہ شریف کی تعمیر جدید کی تو چندہ کی کمی کی وجہ سے کعبہ کو بنائے ابراہیمی سے چھوٹا بنایا۔ اور حطیم کا حصہ باہر کر دیا۔ اور دروازہ اونچا کیا، تاکہ جسے چاہیں داخل ہونے دیں، اور جسے چاہیں روک دیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: پھر آپؐ اس کو بنائے ابراہیمی پر کیوں نہیں بناتے؟ آپؐ نے فرمایا: ''قوم ابھی نئی اسلام میں داخل ہوئی ہے، اس لئے فتنہ کا اندیشہ ہے، ورنہ میں کعبہ کو توڑ کر از سرِ نو اصلی بنیادوں پر تعمیر کرتا'' (بخاری شریف حدیث ۱۵۸۳ و ۱۵۸۴)

اسکے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے جو رفع یدین نہیں کیا تو اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

پہلی وجہ: یہ ہوسکتی ہے کہ آپ نے ترکِ رفع کو آنحضرت ﷺ کا آخری عمل خیال کیا ہو، اور یہ بات آپ نے اس وجہ سے سمجھی ہو کہ نماز کا مدار اعضاء کے سکون پر ہے۔ اور بار بار ہاتھ اٹھانا اس کے منافی ہے۔ مگر آپ نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ رفع ایک تعظیمی عمل ہے۔ تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین اسی بنا پر رکھا گیا ہے کہ تعظیم قولی اور تعظیم فعلی ایک دوسرے کی مددگار بن جائیں۔ اگر آپ اس پہلو پر غور کرتے تو آگے بھی رفع یدین کرتے[2]

دوسری وجہ: یہ ہوسکتی ہے کہ آپ نے رفع یدین کو تحرم فعلی خیال کیا ہو یعنی اس کا مقصد ماسوی اللہ کو پس پشت ڈالنا ہے۔ اور یہ بات نماز کے شروع میں تو معقول ہے، درمیان میں مناسب نہیں۔ اس لئے آپ نے رفع نہ کیا۔ مگر یہ پہلو آپ کی نظر سے مخفی رہ گیا کہ نماز کے ہر اصلی رکن کو شروع کرنے سے پہلے تحرم فعلی کی تجدید مطلوب ہے۔ اگر آپ اس پہلو پر غور کرتے تو آگے بھی رفع کرتے[3]

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ سجدہ میں جھکتے وقت رفع یدین نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قومہ کی مشروعیت ہی رکوع و سجود

---

[1] بیان کرتے ہیں کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے جب رفع یدین اور آمین بالجہر شروع کیا تو دہلی میں ایک ہنگامہ بپا ہوا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے جوان کے چچا اور استاذ تھے پوچھا کہ تم نے یہ عمل کیوں شروع کیا ہے؟ شاہ اسماعیل نے جواب دیا: ''یہ سنت مردہ ہوگئی تھی میں اس کو زندہ کرتا ہوں۔ اور جو مردہ سنت کو زندہ کرتا ہے اس کو شہید کا رتبہ ملتا ہے'' شاہ عبد القادر نے فرمایا: ''یہ ثواب اس سنت کو زندہ کرنے کا ہے جس کے مقابل بدعت ہو۔ اور جس سنت کے مقابل بھی سنت ہو اس کا یہ اجر نہیں'' بھتیجے کی سمجھ میں بات آگئی اور انھوں نے اپنا عمل موقوف کر دیا ۱۲

[2] یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھنے سے پہلے فرمایا تھا کہ الا اصلی بکم صلاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو اب آپ کی پڑھی ہوئی نماز حکماً مرفوع ہو جاتی ہے۔ اور حدیث مرفوع میں قیاس کا دخل نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت ﷺ کی طرف کسی بات کی نسبت علم و مشاہدہ پر ہی مبنی ہوسکتی ہے خیال پر مبنی نہیں ہوسکتی۔ واللہ اعلم۔

[3] رفع یدین بیشک تحرم فعلی ہے۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے بھی تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کی حکمت میں بیان کیا ہے۔ اور پہلے یہ عمل خفض و رفع کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ پھر حرکت ہونے کی جہت کا لحاظ کر کے رفتہ رفتہ یہ عمل موقوف کیا گیا۔ جیسے اندیشہ افساد کی وجہ سے پہلے زیارت قبور سے منع کیا گیا تھا۔ پھر جب عقیدۂ توحید راسخ ہوگیا تو ایصال ثواب اور تذکیر بالموت کی جہت کا لحاظ کر کے اجازت دیدی گئی۔ ایسا ہی رفع یدین کا معاملہ ہے۔ تمام ائمہ فی الجملہ نسخ کے قائل ہیں۔ اب اختلاف صرف اس میں ہے کہ یہ نسخ باؤر (تکبیر تحریمہ) تک چلا گیا ہے یا بیچ میں رک گیا ہے ۱۲

میں فرق کرنے کے لئے ہے۔ پس رکوع سے کھڑے ہوکر جو رفع کیا گیا ہے وہ سجدہ کے لئے بھی ہے۔ اس لئے سجدہ میں جاتے وقت رفع تکرار محض ہے[1]

اور آخر میں فرماتے ہیں کہ سجدہ میں جاتے وقت رفع یدین تو نہیں ہے، مگر تکبیر ہے۔ اور وہ دو وجہ سے ہے: ایک: اس وجہ سے کہ نفس کو تنبیہ ہو جائے کہ اب نیا تعظیمی عمل شروع ہو رہا ہے، پس اس میں بھی تعظیم کا حق بجالانا چاہئے۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ مقتدیوں کو امام کی نقل و حرکت کا پتہ چلے، تاکہ وہ امام کی پیروی کریں۔ اس لئے تکبیر تو ہر رفع وخفض میں رکھی گئی ہے، مگر رفع یدین سب جگہ نہیں ہے۔

فائدہ: (۱) رفع یدین کے بارے میں دو نقطۂ نظر ہیں۔ اور دونوں متضاد ہیں:

ایک خیال: یہ ہے کہ رفع تکبیر فعلی یعنی تعظیم عملی ہے۔ اور وہ نماز کے لئے زینت ہے۔ یہ رائے امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کی ہے۔ اس لئے وہ رفع کو سنتِ مؤکدہ کہتے ہیں۔ ایک موقعہ پر خود امام شافعی رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا تھا کہ رکوع میں جاتے وقت رفع یدین کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جس وجہ سے تکبیر تحریمہ میں ہے یعنی اللہ کی تعظیم مقصود ہے۔ اور یہ ایک معمول بہ سنت ہے۔ اور اس میں ثواب کی امید ہے۔ اور جیسے صفا مروہ پر اور دوسرے موقعوں پر رفع یدین کیا جاتا ہے'' (نیل الفرقدین ص ۴) اور حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے رفع یدین کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ اپنی نماز کو مزین کرتا ہے (نیل ص ۵)

دوسرا خیال: یہ ہے کہ رفع یدین کا مقصد تحرّم (ممنوع ہونا) ہے۔ جیسے کے سلام کے ساتھ دائیں بائیں منہ پھیرنے کا مقصد تحلّل (حلال ہونا) ہے۔ نماز کے شروع میں تحرّم قولی یعنی تکبیر تحریمہ کو اور تحرم فعلی یعنی رفع یدین کو اسی طرح جمع کیا گیا ہے، جس طرح نماز کے ختم پر تحلّل قولی یعنی سلام کو اور تحلّل فعلی یعنی تحویل وجہ کو جمع کیا گیا ہے۔ تاکہ قول وفعل ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔ یہ رائے امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین خلافِ اولی ہے۔ شامی (۱: ۳۷۴) میں حنفیہ کے نزدیک اور کتاب الفقہ (۱: ۲۵۰) میں مالکیہ کے نزدیک کراہیت کی صراحت ہے۔ اور تکبیر تحریمہ چونکہ نماز کے باڈر پر ہے، بلکہ امام اعظم کے نزدیک شرط ہے یعنی نماز سے خارج ہے بلکہ تکبیر تحریمہ میں رفع نماز شروع کرنے سے پہلے کیا جاتا ہے، تکبیر کے ساتھ تو ہاتھ باندھ لئے جاتے ہیں اس لئے اس میں رفع یدین باقی رکھا گیا ہے۔ اسی طرح نماز کے آخر میں جب سلام پھیر کر نماز ختم ہو جاتی

---

[1] یہ حکمت اس پر مبنی ہے کہ ابن عمرؓ کے قول: لایفعل ذلك فی السجود کا مطلب یہ ہو کہ آپ سجدہ میں جاتے ہوئے، رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ مگر ترمذی میں الفاظ ہیں: و کان لایرفع بین السجدتین۔ پس اس جملہ کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ آپ دو سجدوں کے درمیان رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ اور یہ بات مالک بن الحویرث کی حدیث کے خلاف ہے۔ نسائی نے صحیح سند سے یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس میں ہے کہ آپ رکوع سے اٹھ کر بھی رفع یدین کرتے تھے، پھر سجدہ میں جاتے وقت بھی کرتے تھے اور دو سجدوں کے درمیان بھی کرتے تھے۔ پس نسخ کی راہ اختیار کئے بغیر چارہ نہیں ۱۲

ہے تب دائیں طرف منہ پھیرا جاتا ہے۔ اگر پہلے منہ پھیر دیا جائے گا تو وہ نماز میں جھانکنا ہوگا اور اس سے نماز ناقص ہوگی۔ ترمذی شریف میں ایک ضعیف حدیث زہیر بن محمد کی ہے۔ اس میں یہ مضمون آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں ایک سلام سامنے کی طرف پھیرتے تھے، پھر دائیں جانب منہ پھیرتے تھے۔ اس کا یہی مطلب ہے۔

غرض: شاہ صاحب قدس سرہ نے حکمتیں بیان کرتے ہوئے ان دونوں نقطہائے نظر کو الگ الگ نہیں رکھا۔ تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع کی حکمت میں تو دوسرا نقطۂ نظر لیا ہے۔ اور رکوع میں جاتے اور اٹھتے رفع یدین میں دونوں کو جمع کردیا ہے۔ اگر بات ایک ہی نقطۂ نظر سے ہوتی تو بہتر تھا۔

فائدہ: (۲) آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں نسخ کی صورتِ حال یہ تھی کہ جب کوئی حکم منسوخ ہوتا تھا تو اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا جاتا تھا۔ جوں جوں لوگوں کو اطلاع ہوتی جاتی تھی عمل بدل جاتا تھا جیسے تحویل قبلہ ظہر کی نماز میں ہوئی ہے۔ اور مدینہ میں کل نو مساجد تھیں ان کو آسانی سے اطلاع کی جاسکتی تھی، مگر نہیں کی گئی۔ چنانچہ ایک مسجد میں عصر کی نماز کے دوران اطلاع پہنچی۔ اور انھوں نے قبلہ بدل لیا۔ اور قبا میں جو مدینہ سے متصل ہی آبادی تھی، دوسرے دن صبح کی نماز میں اطلاع پہنچی ہے۔ رفع یدین کی صورتِ حال بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے ہر رفع وخفض میں رفع کیا جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بند کیا گیا۔ مگر اس کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا۔ لوگوں کو جوں جوں اس کی اطلاع ہوتی رہی عمل موقوف ہوتا گیا۔ پس رفع کی روایات استصحاب حال پر یعنی نسخ کا علم نہ ہونے پر مبنی ہیں۔ اور ترک رفع کی روایات نسخ کے علم پر مبنی ہیں۔ جیسے رکوع میں ابن مسعود کی تطبیق کی روایت نسخ کا علم نہ ہونے پر مبنی ہے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت نسخ کے علم پر مبنی ہے۔ واللہ اعلم۔

فإذا أراد أن يركع رفع يدين حذوَ منكِبيه أو أذنيه، وكذلك إذا رفع رأسه من الركوع، وكان لايفعل ذلك في السجود.

أقول: السُّر في ذلك: أن رفعَ اليدين فعلٌ تعظيمي، ينبه النفس على ترك الاشغال المنافية للصلاة، والدخولِ في حيز المناجاة، فَشَرَعَ ابتداءَ كلِّ فعلٍ من التعظيمات الثلاث به، لتنتبَه النفسُ لثمرة ذلك الفعل مستأنفا.

وهو من الهيئات: فعله النبي صلى الله عليه وسلم مرةً، وتركه مرةً، والكلُّ سنة، وأخذ بكل واحدٍ جماعةٌ من الصحابة والتابعين ومن بعدهم، وهذا أحد المواضع التي اختلف فيها الفريقان: أهلُ المدينه وأهل الكوفة، ولكل واحد أصل أصيلٌ.

والحق عندي في مثل ذلك: أن الكل سنة، ونظيره: الوتر بركعة واحدة، أو بثلاث؛ والذي يرفع أحبُّ إليّ ممن لايرفع، فإن أحاديث الرفع أكثر وأثبت؛ غير أنه لاينبغي لإنسان في مثل

هـذه الـصـور: أن يُثير على نفسه فتنةَ عوامّ بلده، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "لو لا حِدْثَانُ قومِكِ بالكفر لنقضتُ الكعبةَ"

ولايبعُدُ أن يكون ابنُ مسعود رضي الله تعالى عنه ظَنَّ أن السنة المتقررة آخرًا: هو تركُه، لِمَا تَلَقَّن من أن مبنى الصلاة على سكون الأطراف، ولم يظهر له أن الرفع فعل تعظيمي، ولذلك ابْتُدِأَ به في الصلاة، أو لِمَا تَلَقَّن من أنه فعلٌ ينبئ عن الترك، فلايناسبُ كونه في أثناء الصلاة، ولم يظهر له أن تجديدَ التنبُهِ لتركِ ماسوى الله عند كل فعل أصليٍّ من الصلاة مطلوب، والله أعلم.

قوله: "لايفعل ذلك في السجود" أقول: القومةُ شُرِعت فارقةً بين الركوع والسجود، فالرفعُ معها رفعٌ للسجود، فلامعنى للتكرار، ويكبر في كل خفضٍ ورفع للتنبيه المذكور، وليَسْمع الجماعةُ فيتنبهوا للانتقال.

ترجمہ: پس جب رکوع کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اپنے دونوں مونڈھوں کے مقابل یا اپنے دونوں کانوں کے مقابل۔ اور اسی طرح جب رکوع سے اپنا سر اٹھائے۔ اور نہ کرے یہ سجدوں میں۔

میں کہتا ہوں: راز اس میں یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کا (تکبیر کے ساتھ) اٹھانا ایک تعظیمی عمل ہے۔ چوکنا کرتا ہے (یہ عمل) نفس کو اُن مشغولیات کے چھوڑنے سے جو نماز کے منافی ہیں۔ اور (چوکنا کرتا ہے) مناجات کے محل میں داخل ہونے سے۔ پس مشروع کیا آپؐ نے تعظیمات ثلاثہ (قیام، رکوع اور سجود) میں سے ہر فعل کی ابتداء کرنے کو اس (تعظیمی عمل: رفع یدین) کے ذریعہ۔ تاکہ نفس ازسرِنو چوکنا ہو اس فعل کے فائدہ کے لئے۔

اور وہ (رفع یدین) ان ہیئتوں میں سے ہے جس کو نبی ﷺ نے کبھی کیا ہے، اور کبھی چھوڑا ہے۔ اور سب سنت ہے۔ اور ہر ایک کو لیا ہے صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کی ایک جماعت نے۔ اور یہ ان جگہوں میں سے ایک ہے جس میں دونوں فریق: اہل مدینہ اور اہل کوفہ میں اختلاف ہوا ہے۔ اور ہر ایک کے لئے مضبوط بنیاد ہے۔

اور حق میرے نزدیک اس قسم کے مسائل میں یہ ہے کہ سب سنت ہے۔ اور اس کی نظیر: ایک رکعت اور تین رکعت وتر پڑھنے کا مسئلہ ہے۔ اور جو شخص رفع یدین کرتا ہے وہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے جو رفع یدین نہیں کرتا۔ کیونکہ رفع کی حدیثیں زیادہ اور پختہ ہیں۔ البتہ یہ بات ہے کہ کسی کے لئے بھی مناسب نہیں کہ اس قسم کی صورتوں میں: اپنے خلاف اپنے شہر کے عوام کا فتنہ بھڑکائے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "اگر نہ ہوتا تیری قوم کا قُرب کفر سے تو میں کعبہ کو توڑ دیتا"

اور بعید نہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے گمان کیا ہو کہ وہ طریقہ جو آخر میں ٹھہر گیا ہے: وہ رفع یدین نہ کرنا ہے، اس بات کی وجہ سے جو انھوں نے سمجھی کہ نماز کا مدار اعضاء کے سکون پر ہے۔ اور نہیں ظاہر ہوئی ان کے لئے یہ بات کہ رفع یدین ایک تعظیمی عمل ہے۔ اور اسی وجہ سے آغاز کیا گیا ہے رفع یدین کے ذریعہ نماز میں ——— یا اس وجہ سے جو انھوں

نے سمجھی کہ وہ ایک ایسا فعل ہے جو ترک کی آگاہی دیتا ہے (یعنی تحرّم فعلی ہے) پس اس کا نماز کے درمیان میں ہونا مناسب نہیں۔ اور نہیں ظاہر ہوئی ان کے لئے یہ بات کہ ماسوی اللہ کو چھوڑنے کی آگہی کی تجدید، نماز کے ہر اصلی رکن کے پاس مطلوب ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

ابن عمرؓ کا قول: ''نہ کرے وہ سجدوں میں'' میں کہتا ہوں: قومہ مشروع کیا گیا ہے رکوع وسجود کے درمیان جدائی کرنے کے لئے۔ پس قومہ کے ساتھ رفع سجدوں کے لئے رفع ہے۔ پس کوئی معنی نہیں تکرار کے ـــــ اور تکبیر کہے ہر جھکنے اور اٹھنے میں اس تنبیہ کے لئے جو پہلے ذکر کی جا چکی ہے اور تا کہ جماعت سنے، پس وہ چوکنا ہو انتقال کے لئے۔

☆ ☆ ☆

رکوع کا طریقہ اور اس کے اذکار

رکوع کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہتھیلیاں دونوں گھٹنوں پر رکھے۔ انگلیاں پھیلا کر گھٹنوں کو پنجوں میں لے لے، گویا پکڑ رکھے ہیں، مگر پکڑے نہیں۔ کہنیاں پہلوؤں سے علحدہ رکھے۔ سر کو پیٹھ کے لیول پر رکھے: نہ اونچا نہ نیچا۔ پیر سیدھے رکھے: گھٹنے نہ موڑے۔ اور ہاتھ بھی بالکل سیدھے رکھے، کہنیاں نہ موڑے۔ بالکل مثلث متساوی الاضلاع بن جائے۔ اور اطمینان سے رکوع میں ٹھہر کر ذکر کرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ رکوع کرتے تھے تو اپنے سر کو نہ اونچا رکھتے تھے، نہ جھکاتے تھے، بلکہ دونوں کے درمیان رکھتے تھے۔ اور حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ رکوع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر جما کر رکھتے، اور اپنی پیٹھ کو ٹہنی کی طرح جھکا لیتے اور ان کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب آپؐ رکوع کرتے تو دونوں ہتھیلیاں اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھتے۔ پھر ٹھیک ٹھیک رکوع کرتے یعنی اپنے سر کو نہ تو (پیٹھ سے) جھکاتے اور نہ اونچا رکھتے۔ اور انہی کی ایک تیسری روایت میں ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھتے، گویا آپؐ ان کو پکڑنے والے ہیں۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو تانت بناتے، پس ان دونوں کو اپنے دونوں پہلوؤں سے جدا کرتے۔

اور رکوع کے اذکار یہ ہیں:

پہلا ذکر: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ بکثرت رکوع وسجود میں کہا کرتے تھے: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ (اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! آپ کی ذات پاک ہے۔ آپ اپنی خوبیوں کے ساتھ ہیں۔ اے اللہ! میرے گناہ بخش دیجئے) اس تسبیح ودعا کے ذریعہ آپؐ اللہ پاک کے اس حکم کی تعمیل کرتے تھے، جو آپؐ کو سورۃ النصر کی آخری آیت میں دیا گیا تھا کہ: ''آپؐ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیا کیجئے اور گناہوں کی مغفرت طلب کیجئے''

دوسرا ذکر: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ رکوع وسجود میں کہا کرتے تھے: سُبُّوحٌ

قُدُّوْسٌ، رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ (بہت پاک! نہایت پاک! ہمارا پروردگار۔ اور فرشتوں اور جبریل کا پروردگار)

تیسرا ذکر: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ (میرا بڑا مرتبہ والا پروردگار پاک ہے) فرائض میں یہی تسبیح بہتر ہے۔ رکوع میں یہ تسبیح کم از کم تین بار باطمینان کہنی چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ جب آیت پاک: ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ نازل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: ''اسے رکوع میں لے لو'' اور دوسری روایت میں ہے کہ جس نے یہ تسبیح تین بار کہی اس کا رکوع تام ہوا۔

چوتھا ذکر: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپؐ نے رکوع کیا تو کہا: اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ، وَبِكَ آمَنْتُ، وَلَكَ أَسْلَمْتُ، خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ، وَبَصَرِيْ، وَمُخِّيْ، وَعَظْمِيْ وَعَصَبِيْ (اے اللہ! آپ کے لئے میں نے رکوع کیا، اور آپ پر میں ایمان لایا، اور آپ کی میں نے تابعداری کی، اور آپ کے لئے عاجزی کی میرے کانوں نے، میری آنکھوں نے، میرے دماغ نے، میری ہڈیوں نے اور میرے پٹھوں نے)

نوٹ: اس عنوان کے تحت مذکور تمام حدیثیں مشکوۃ شریف باب الرکوع میں ہیں۔ البتہ آخری حدیث باب مایقرأ بعد التکبیر میں ہے۔

> ومن هيئات الركوع: أن يضع راحتيهِ على ركبتيه، ويجعَل أصابعَه أسفلَ من ذلك، كالقابض، ويُجافِيْ بمرفقيه، ويعتدل، فلا يُصَبِّيْ رأسَه ولا يُقْنِعُ؛ ومن اذكاره: " سبحانك اللهم ربَّنا وبحمدك، اللّٰهم اغفرلى" وفيه العملُ بقوله تعالى: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ ومنها: "سُبُّوْحٌ قدوس ربُّنا وربُّ الملائكة والروح" ومنها:" سبحان ربى العظيم — ثلاثا — ومنها: "اللّٰهم لك ركعتُ، وبك آمنتُ، وبك أسلمتُ، خشع لك سمعى وبصرى ومُخِّى وعظمى وعصبى"

ترجمہ: اور رکوع کی ہیئتوں میں سے یہ ہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیاں رکھے اپنے دونوں گھٹنوں پر، اور کرے اپنی انگلیاں اس سے نیچے، جیسے پکڑنے والا، اور علحدہ رکھے اپنی دونوں کہنیاں اور ٹھیک ٹھیک رکوع کرے، پس نہ جھکائے اپنا سر اور نہ اٹھائے۔ اور رکوع کے اذکار میں سے (آگے ترجمہ آگیا)

قومہ کا طریقہ اور اس کے اذکار

قومہ کا طریقہ یہ ہے کہ رکوع سے بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے، یہاں تک کہ پیٹھ کا ہر مُہرہ اس کی جگہ میں لوٹ جائے۔ یہی تعدیل ہے اس سے زیادہ قومہ میں ٹھہرنا تعدیل میں داخل نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو جب تک سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے سجدہ میں نہیں جاتے تھے۔ اور

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ رکوع سے سر اٹھاتے تو بالکل سیدھے کھڑے ہوجاتے۔ یہاں تک کہ پیٹھ کا ہر مہرہ اس کی جگہ میں لوٹ جاتا (مشکوۃ حدیث ۷۹۱و۷۹۲) اور جو حضرات رفع یدین کے قائل ہیں ان کے نزدیک ہاتھوں کا اٹھانا بھی قومہ کی ہیئت میں داخل ہے۔

اور قومہ کے اذکار یہ ہیں:

پہلا ذکر: امام اور منفرد رکوع سے کھڑے ہوتے وقت کہیں: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه (اللہ تعالیٰ سنتے ہیں اس کی جو ان کی تعریف کرتا ہے) اور مقتدی کہیں: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ (اے ہمارے پروردگار! اور آپ کے لئے تعریف ہے) اور منفرد تسمیع کے بعد تحمید بھی کرے، اور امام بھی چاہے تو تحمید کرسکتا ہے۔

دوسرا ذکر: تحمید اس طرح بھی کرسکتا ہے: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا، مُبَارَكًا فيه (اے اللہ! اے ہمارے رب! آپ کے لئے تعریف ہے، بے حد تعریف، پاکیزہ تعریف، جس میں برکت کی گئی)

تیسرا ذکر: اور اس طرح بھی تحمید کرسکتا ہے: اَللّٰهُم رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمَاوَاتِ، وَمِلْأَ الْأَرْضِ، وَمِلْأَ مَاشِئْتَ مِنْ شَيْئٍ بَعْدُ (یا اللہ! اے ہمارے پروردگار! آپ کے لئے تعریف ہے آسمانوں کو بھر کر، اور زمین کو بھر کر، اور ان کے علاوہ جو چیز آپ چاہیں وہ بھر کر)

چوتھا ذکر: اور چاہیں تو اس طرح تحمید کریں: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْأَ السَّمَاوَاتِ، وَمِلْأَ الْأَرْضِ، وَمِلْأَ مَاشِئْتَ مِنْ شَيْئٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، أَحَقُّ مَاقَالَ الْعَبْدُ ــ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ ــ: اَللّٰهُمَّ لَامَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَامُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَايَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ (یا اللہ! اے ہمارے پروردگار! آپ کے لئے تعریف ہے، آسمانوں کو بھر کر، اور زمین کو بھر کر، اور ان کے علاوہ جو چیز آپ چاہیں وہ بھر کر، اے تعریف اور بزرگی والی ذات! لائق تر وہ بات جو بندے نے کہی ـــــ اور ہم سب آپ کے بندے ہیں ـــــ یاالٰہی! کوئی روکنے والا نہیں اس چیز کو جو آپ دیں۔ اور کوئی دینے والا نہیں اس کو جو آپ نہ دیں۔ اور سود مند نہیں دولت مند کے لئے دولت آپ کے عذاب سے بچانے میں)

ترکیب: أحقُّ مبتداء ہے۔ اور اللّٰهم خبر اور مقولہ ہے، اور بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔

پانچواں ذکر: قومہ میں تسمیع وتحمید کے بعد یہ دعا بھی کرسکتے ہیں: اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِيْ بِالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَالْمَاءِ الْبَارِدِ، اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِيْ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ (اے اللہ! مجھے پاک کیجئے برف اُولوں اور ٹھنڈے پانی سے۔ اے اللہ! مجھے پاک کیجئے گناہوں اور غلطیوں سے جیسا صاف کیا جاتا ہے سفید کپڑا میل سے) (رواہ مسلم والنسائی ۱:۱۹۸)

ومن هيئات القومة : أن يستوى قائمًا، حتى يعودَ كلُّ فَقَارٍ مكانَه، وأن يرفع يديه، ومن أذكارها: " سمع الله لمن حمدَه" ومنها: " اللهم ربنا لك الحمد حمدًا كثيرًا طيبًا، مباركًا فيه"

وجاءت زيادة: "ملءَ السماوات وملءَ الأرض، وملءَ ما شئتَ من شيئٍ بعدُ" وزاد في رواية: "أهلَ الثناء والمجد، أحقُّ ما قال العبدُ ـــــ وكلُّنا لك عبد ـــــ : اللّٰهم لا مانع لما أعطيتَ، ولامعطِيَ لما منعتَ، ولاينفع ذا الجَدِّ منك الجدُّ" ومنها: "اللهم طَهِّرْني بالثلج والبرد والماء البارد، اللهم طهرني من الذنوب والخطايا كما ينقَّى الثوبُ الأبيض من الدنس"

ترجمہ: اور قومہ کی ہیئتوں میں سے یہ ہے کہ بالکل سیدھا کھڑا ہوجائے۔ یہاں تک کہ لوٹ جائے ہر مُہرہ اس کی جگہ میں اور یہ بات ہے کہ اٹھائے اپنے دونوں ہاتھوں کو۔ اور قومہ کے اذکار میں سے: (آگے ترجمہ آگیا)

☆ ☆ ☆

قنوت ـــــ نازلہ اور راتبہ

قنوت: متعدد معانی میں مستعمل ہے۔ یہاں بمعنی دعا اور تضرّع ہے۔ اور نازلہ: نُزُول سے ہے، جس کے معنی ہیں: دشمن کی طرف سے آنے والی سخت مصیبت۔ اور راتبہ بمعنی مقرر، دائمہ۔ رَتَبَ کے معنی ہیں: قائم وثابت ہونا۔ تنخواہ اور وظیفہ کو بھی راتب کہتے ہیں۔

قنوت: دو ہیں: ایک نازلہ، دوسرا راتبہ۔ جب مسلمانوں پر دشمنوں کی طرف سے کوئی سخت حادثہ آپڑے تو تمام ائمہ متفق ہیں کہ قنوتِ نازلہ پڑھنی چاہئے۔ اور قنوتِ راتبہ میں اختلاف ہے۔ احناف اور حنابلہ کے نزدیک وہ صرف وتر میں ہے اور مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک وہ فجر کی نماز میں بھی سنت یا مستحب ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

صبح کے قنوت کے سلسلہ میں روایات میں بھی اختلاف ہے۔ اور صحابہ وتابعین کی آراء بھی مختلف ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قبائل بنوسُلیم: رِعْل، ذَکوان اور عُصَیّہ کے لئے مسلسل ایک ماہ تک نماز میں بددعا کی، پھر جب سورۂ آل عمران کی آیت ۱۲۸ نازل ہوئی تو آپؐ نے بددعا بند کردی۔ اسی طرح مکہ مکرمہ کے کچھ شرپسند لوگوں کے لئے بھی کچھ عرصہ تک بددعا فرمائی، پھر بند کردی۔ بعض حضرات نے اس بند کرنے کو نسخ سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے کہ **قَنَتَ شَهْرًا يدعو عليهم، ثم تركه، فأما في الصبح فلم يزل يقنت حتى فارق الدنيا** (سنن بیہقی ۲: ۲۰۱) یعنی آپؐ نے ایک ماہ قنوت پڑھا۔ دشمنوں کے لئے بددعا کی، پھر اس کو بند کردیا، مگر فجر کی نماز میں آپؐ تاحیات برابر قنوت پڑھتے رہے۔ یہ روایت سند کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ اس کا ایک راوی ابوجعفر عیسیٰ بن ماہان رازی متکلم فیہ ہے۔

اسی طرح صحابہ وتابعین کی آراء بھی مختلف ہیں۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ روایت قابل ذکر ہے کہ ابو مالک اشجعی سعد بن طارق نے اپنے والد طارق بن اَشیم سے، جو صحابی ہیں، دریافت کیا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ،

حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے مدینہ میں تاحیات نماز پڑھی ہے۔ اور یہاں کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے تقریباً پانچ سال نماز پڑھی ہے، کیا یہ حضرات فجر کی نماز میں قنوت پڑھتے تھے؟ حضرت طارق نے جواب دیا: ''اے میرے پیارے لڑکے! نئی چیز ہے!'' یعنی اب جو فجر کی نماز میں مستقل طور پر قنوتِ راتبہ شروع کر دیا گیا ہے، یہ نئی چیز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ نہیں پڑھتے تھے۔

شاہ صاحب قدس سرہ کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے کہ دونوں امر سنت ہیں: پڑھنا بھی اور نہ پڑھنا بھی۔ کیونکہ شاہ صاحب کی رائے میں آپؐ نے کبھی پڑھا ہے اور کبھی چھوڑا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ جو نہیں پڑھتا وہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ البتہ دو صورتیں مستثنیٰ ہیں: ایک: قنوتِ نازلہ۔ وہ بوقتِ ضرورت پڑھنا چاہئے۔ دوسری: اگر کوئی دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے (امام مالک رحمہ اللہ کے قول پر) یا رکوع کے بعد (امام شافعی رحمہ اللہ کے قول پر) چند کلمات سراً پڑھے مثلاً اللهم اغفرنا وارحمنا تو کوئی حرج نہیں۔ اور قنوت نہ پڑھنے والا شاہ صاحب کو اس لئے زیادہ پسند ہے کہ احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ نے رِعل وذکوان کے لئے پہلے بددعا کی تھی، پھر بند کر دی تھی۔ اس سے اگرچہ دائماً قنوت نازلہ کا نسخ ثابت نہیں ہوتا، مگر اشارہ ضرور ملتا ہے کہ قنوت مستمر سنت نہیں ہے۔ ورنہ آپؐ بند نہ کرتے۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ قنوت طے شدہ حکم نہیں۔ اور حضرت طارق بن اشیم رضی اللہ عنہ نے جو قنوت پڑھنے کو نئی بات فرمایا ہے، وہ مواظبت کے ساتھ پڑھنے کے بارے میں فرمایا ہے۔ ورنہ قنوت نازلہ برابر مشروع ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاء جب بھی کوئی بات پیش آتی تھی تو قنوت نازلہ پڑھتے تھے۔ جس میں مسلمانوں کے لئے دعا اور کافروں کے لئے بددعا ہوتی تھی۔ کبھی رکوع سے پہلے پڑھتے تھے کبھی رکوع کے بعد، ان حضرات نے بایں معنی قنوت نہیں چھوڑا کہ وہ بوقتِ نازلہ بھی جائز نہیں۔

واختلف الأحاديثُ ومذاهبُ الصحابةِ والتابعين في قنوت الصبح، وعندي: أن القنوتَ وتركَه سنتان، ومن لم يقنُت —— إلا عند حادثةٍ عظيمةٍ، أو كلماتٍ يسيرةً إخفاءً قبل الركوع —— أحبُّ إليَّ، لأن الأحاديث شاهدةٌ على أن الدعاء على رِعْلٍ وذَكْوانَ كان أولاً ثم تُرِك؛ وهذا وإن لم يدلَّ على نسخ مطلق القنوت، لكنها تُوْمِئُ إلى أن القنوت ليس سنةً مستقرةً، أو نقول: ليس وظيفةً راتبةً، وهو قول الصحابي: ''أَيْ بُنَيَّ! محدَثٌ!'' يعني المواظبة عليه وكان النبيُّ صلى الله عليه وسلم وخلفاؤُه، إذا نابهم أمر، دَعَوْا للمسلمين، وعلى الكافرين بعد الركوع أو قبله، ولم يتركوه بمعنى عدم القول عند النائبة.

ترجمہ: اور مختلف ہوئی ہیں حدیثیں اور صحابہ وتابعین کے مذاہب صبح کے قنوت کے بارے میں۔ اور میرے نزدیک یہ بات ہے کہ قنوت پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں سنت ہیں۔ اور جو قنوت نہیں پڑھتا —— مگر کسی بڑے حادثہ کے

وقت، یا چند کلمات سر از رکوع سے پہلے ——— وہ مجھ کو زیادہ پسند ہے، اس لئے کہ حدیثیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ رعل وذکوان کے لئے پہلے بددعا کی تھی، پھر وہ چھوڑ دی گئی تھی۔ اور یہ بات اگرچہ مطلق قنوت کے نسخ پر دلالت نہیں کرتی، مگر یہ واقعہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ قنوت کوئی دائمی سنت نہیں ہے، یا ہم کہیں کہ قنوت مقررہ حکم نہیں ہے۔ اور وہ صحابی کا قول ہے: ''اے میرے پیارے لڑکے! نئی چیز ہے'' یعنی اس پر ہمیشگی کرنا۔ اور نبی ﷺ اور آپؐ کے خلفاء: جب ان کو کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو وہ مسلمانوں کے لئے دعا اور کافروں کے لئے بددعا کرتے تھے، رکوع کے بعد یا رکوع سے پہلے۔ اور نہیں چھوڑا ہے اس کو انھوں نے بایں معنی کہ وہ حادثہ کے وقت بھی قائل نہ ہوں۔

تصحیح: سنتان اصل میں سِیَّانِ (دونوں ایک جیسے) تھا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں اور مطبوعہ صدیقی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

سجدہ کا طریقہ اور اس کے اذکار

سجدہ کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے زمین پر دونوں گھٹنے رکھے، پھر دونوں ہاتھ رکھے[1]، پھر پیشانی اور ناک زمین پر جما کر رکھے، صرف برائے نام نہ رکھے اور کہنیاں اونچی رکھے، کلائیاں کتے کی طرح زمین پر نہ بچھائے اور ذرا لمبا ہو کر سجدہ کرے تا کہ پیٹ رانوں سے جدا ہو جائے اور دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے جدا کرے، یہاں تک کہ بغل کی سفیدی نظر

[1] یہ طریقہ: امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک مسنون ہے۔ اور ان کا مستدل حضرت وائل بن حُجر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو سنن اربعہ میں مروی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۸۹۸) اس پر یہ کلام ہے کہ اس کی روایت میں شریک بن عبداللہ نخعی متفرد ہیں۔ اور ان سے چوک بہت ہوتی تھی۔ اس لئے جس روایت میں وہ متفرد ہوں وہ قابل قبول نہیں ——— اور امام مالک اور امام احمد کی ایک روایت میں اس کا برعکس طریقہ مسنون ہے۔ اور ان کا مستدل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے اور چاہئے کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں سے پہلے رکھے (مشکوٰۃ حدیث ۸۹۹) اس پر یہ کلام کیا گیا ہے کہ نفس زکیہ سے اس کو دَرَاوَرْدی اور عبداللہ بن نافع صائغ روایت کرتے ہیں اور حدیث کا آخری حصہ صرف اول کی روایت میں ہے۔ عبداللہ کی روایت میں صرف پہلا جملہ ہے اور تقریب میں ہے کہ دراوردی دوسروں کی کتابوں سے حدیثیں بیان کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان سے غلطی ہو جاتی تھی۔ اور تقریب ہی میں ہے کہ عبداللہ کی کتاب صحیح تھی۔ پس آخری جملہ دراوردی کا وہم ہے اور وہ پہلے جملہ کے معارض بھی ہے کیونکہ اونٹ پہلے اگلے پیر ٹیکتا ہے۔ اور جانور کے اگلے پیر انسان کے ہاتھوں کے بمنزلہ ہیں۔ پس جس چیز سے منع کیا گیا ہے، وہی طریقہ سجدہ میں جانے کا بتلایا گیا ہے، یہ بات کیسے ممکن ہے؟ یاوَلْیَضَعْ میں عطف تفسیری ہے۔ پس یہ اونٹ کی طرح بیٹھنے کی وضاحت ہے اور یہی صورت ممنوع ہے۔ اور مستدرک حاکم (۲۲۶:۱) میں جو ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے وہ بھی دَرَاوَرْدی عن عبیداللہ العمری کی سند سے ہے۔ اور تقریب میں ہے: **حدیثہ عن عبید اللہ العمری منکر** یعنی دراوردی کی جو روایتیں عبیداللہ عمری سے ہیں وہ قطعاً ناقابل اعتبار ہیں۔ علاوہ ازیں مرقات شرح مشکوٰۃ میں صحیح ابن خزیمہ کے حوالہ سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ كنا نضع اليدين قبل الركبتين، فأُمرنا بوضع الركبتين قبل اليدين۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو فیصلہ کن ہے کہ آخری عمل پہلے گھٹنے رکھنا ہے۔ واللہ اعلم

آسکے، البتہ دائیں بائیں نمازی ہوں تو ان کا خیال رکھے اور ہاتھوں کو زیادہ نہ کھولے۔ اور دونوں پیر کھڑے کر کے، انگلیوں کے سرے موڑ کر قبلہ کی طرف متوجہ کرے۔ پھر سجدہ میں اطمینان سے ٹھہر کر ذکر کرے، مرغ کی طرح ٹھونگ مار کر اٹھ نہ جائے۔ سجدہ کرنے کا یہ طریقہ مختلف روایتوں میں آیا ہے۔ سب کو یہاں ذکر کرنے میں طول ہے۔

اور سجدہ کے اذکار یہ ہیں:

پہلا ذکر: کم از کم تین بار سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی کہے یعنی میرا عالی مرتبہ پروردگار (ہر عیب سے) پاک ہے! (مشکوٰۃ حدیث ۸۸۰)

دوسرا ذکر: سُبْحَانَكَ اللّٰهُم رَبَّنَا، وبحمدك، اَللّٰهُم اغفِرْلِیْ یہی رکوع کا بھی ذکر ہے، اور رکوع کے بیان میں گذر چکا ہے۔

تیسرا ذکر: اللّٰهم لك سجدتُ، وبك آمنتُ، ولك اسلمتُ، سجد وجهي للذي خلقه وصوره، وشقّ سمعَه وبصره، فتبارك الله أحسن الخالقين (اے اللہ! آپ کے لئے میں نے سجدہ کیا، اور آپ پر میں ایمان لایا۔ اور آپ کی میں نے تابعداری کی، میرے چہرے نے سجدہ کیا اس ذات کو جس نے اس کو پیدا کیا، اور اس کا نقشہ بنایا، اور اس میں کان اور آنکھیں پیدا کیں، سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام کاریگروں سے بڑھ کر کاریگر ہیں) (مشکوٰۃ حدیث ۸۱۳ باب مایقرأ بعد التكبير)

چوتھا ذکر: سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلاَئِكَةِ وَالرُّوْحِ یہ۔ رکوع کی بھی تسبیح ہے اور پہلے گذر چکی ہے۔

پانچواں ذکر: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِی كُلَّهُ، دِقَّهُ وَجِلَّهُ، وَأَوَّلَهُ وَآخِرَهُ، وَعَلاَنِيَتَهُ وَسِرَّهُ (اے اللہ! بخش دے میرے لئے میرے سارے گناہ، باریک بھی اور بڑے بھی، پہلے بھی اور پچھلے بھی، کھلے بھی اور چھپے بھی) (مشکوٰۃ حدیث ۸۹۲)

چھٹا ذکر: اَللّٰهُم إِنِّیْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ، لاَأُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ علی نفسك (یاالٰہی! بیشک میں آپ کی خوشنودی کی پناہ چاہتا ہوں آپ کی ناراضگی سے یعنی ایسے کاموں سے پناہ مانگتا ہوں جو آپ کی ناراضگی کا باعث ہیں۔ اور پناہ چاہتا ہوں میں آپ کی عافیت کی آپ کے عذاب سے۔ اور پناہ مانگتا ہوں میں آپ کی آپ سے یعنی آپ کی رحمت کی آپ کے قہر سے۔ نہیں گن سکتا ہوں میں آپ کی تعریف۔ آپ ویسے ہی ہیں جیسی آپ نے اپنی تعریف کی ہے) (مشکوٰۃ حدیث ۸۹۳)

ومن هيئات السجود: أن يضع ركبتيه قبل يديه، ولايبسط ذراعيه انبساط الكلب، ويجافِيْ يدَيه حتى يَبْدُوَ بياضُ إبطيه، ويستقبلُ بأطراف أصابع رجليه القلبةَ.

ومن أذكاره: سبحان ربى الأعلى —— ثلاثاً —— ومنها: "سبحانك اللّٰهم ربنا وبحمدك،

اللّٰهم اغفرلی" ومنها:" اللهم لك سجدتُ، وبك آمنتُ، ولك أسلمتُ سجد وجهي للذي خلقه، وصوَّره، وشقَّ سمعَه وبصره، فتبارك اللّٰه أحسن الخالقين" ومنها:" سبوح قدوس ربنا ورب الملائكة والروح" ومنها:" اللّٰهم اغفرلي ذنبي كلَّه، دقَّهُ وجِلَّهُ، وأوَّلَهُ وآخِرَهُ، وعلانِيَتَهُ وسِرَّه" ومنها:" اللهم إني أعوذ برضاك من سخطِك، وبمعافاتك من عقوبتك، وأعوذ بك منك، لاأُحْصِي ثناءً عليك، أنت كما أثنيتَ على نفسك"

ترجمہ: اور سجدوں کی ہیئتوں میں سے یہ ہے کہ اپنے دونوں گھٹنے اپنے دونوں ہاتھوں سے پہلے رکھے۔ اور اپنی دونوں کلائیاں نہ بچھائے کتے کے بچھانے کی طرح اور اپنے دونوں ہاتھوں کو علحدہ رکھے یہاں تک کہ ظاہر ہو اس کے دونوں بغلوں کی سفیدی۔ اور قبلہ کی طرف رکھے اپنے دونوں پیروں کی انگلیوں کے کناروں کو، اور سجدہ کے اذکار میں سے: (پہلے ترجمہ آگیا)

☆ ☆ ☆

فضائل سجود

حدیث ——— ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رات گذارتا تھا۔ پس آپؐ کے لئے وضو کا پانی اور دیگر ضروریات مہیا کرتا تھا۔ پس مجھ سے آپؐ نے فرمایا: ''مانگ'' تو میں نے عرض کیا کہ جنت میں آپؐ کی رفاقت مانگتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''یا اس کے علاوہ'' یعنی کچھ اور مانگ۔ میں نے عرض کیا: میرا مقصود تو یہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو میری مدد کر اپنی ذات پر سجدوں کی کثرت سے'' (مشکوۃ حدیث ۸۹۶)

تشریح: نماز کی روح بندگی اور فروتنی ہے۔ اور عبدیت اور تذلل کے سب سے بڑے مظہر رکوع وسجود ہیں۔ سر نیچا کرنا تواضع کی نشانی ہے اور زمین پر سر رکھنا تواضع اور تعظیم کی آخری شکل ہے، جو صرف خالق و مالک ہی کا حق ہے۔ اس لحاظ سے نماز کے ارکان میں سب سے زیادہ اہم سجدہ ہے۔ وہ مؤمن کی غیر معمولی پرواز ہے، بندہ سجدہ ہی میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے۔ اور اس وقت ملکیت، بہیمیت کی قید سے رہائی پالیتی ہے۔ اور جو شخص اپنے اندر رحمت الٰہی کے پردے کو جمالیتا ہے وہ خیر کا فیضان کرنے والے کی مدد کرتا ہے۔

وضاحت: جواب نبوی کا حاصل یہ ہے کہ میں تمہاری مقصد براری کی سعی کرونگا۔ البتہ تمہیں بھی چاہئے کہ نماز کی کثرت کر کے میری مدد کرو۔ اس کی حسّی مثال یہ ہے کہ کوئی وزیر اعظم سے کہے کہ مجھے فلاں عہدہ دلوادیں۔ وزیر اعظم دلوانے کا وعدہ کرے مگر مشورہ دے کہ تم فلاں ڈگری حاصل کرلو تا کہ میرے لئے تمہارے مقصد کی تکمیل میں سہولت ہو۔

فائدہ: حدیث میں سجدہ سے پوری نماز مراد لی گئی ہے۔ مگر کل کو جس جز سے تعبیر کیا ہے، اس سے اس جز کی خصوصی

اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہی سجدہ کی فضیلت ہے۔ باقی محض سجدہ ـــــ سجدۂ تلاوت کے علاوہ ـــــ کوئی عبادت نہیں۔ اور سجدۂ شکر مستحب ہے، مگر سجدۂ مناجات بدعت ہے۔

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن بُسر مازنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت قیامت کے دن سجدوں کی وجہ سے روشن پیشانی، اور وضوء کی وجہ سے روشن اعضا ہوگی'' (رواہ الترمذی فی آخر کتاب الصلوۃ ۱:۷۸)

تشریح: آخرت میں سجدوں کا اثر پیشانی کی چمک کی صورت میں، اور وضوء کا اثر چہرے، ہاتھوں اور پیروں کی چمک کی صورت میں اس لئے ظاہر ہوگا کہ عالم مثال کا مدار مشابہت پر ہے۔ روح اور اس کے پیکر کی مشابہت کا اس عالم میں لحاظ کیا جاتا ہے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ کے زمانہ میں ایک مؤذن نے ـــــ جو رمضان میں فجر کی اذان وقت سے پہلے دیدیا کرتا تھا ـــــ خواب دیکھا تھا کہ وہ لوگوں کے مونہوں اور شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہے۔ یہ خواب اسی مشابہت پر مبنی تھا، کیونکہ لوگ اذان ہوتے ہی سحری اور مقاربت سے رک جاتے تھے۔ اور آخرت کے معاملات عالم مثال کی مشابہت کے تابع ہیں۔ اس لئے قیامت کے دن سجدوں اور وضوء کے یہ آثار ظاہر ہوں گے۔

وإنما قال صلى الله عليه وسلم: " فأعِنّي على نفسك بكثرة السجود": لأن السجود غايةُ التعظيم، فهو معراج المؤمن، ووقتُ خُلوص ملكيته من أُسر البهيمية؛ ومن مكّن من نفسه للغاشية الإلٰهية فقد أعان مُفيض الخير.

قوله صلى الله عليه وسلم: " أمتي يومَ القيامة غُرٌّ من السجود، مُحَجَّلون من الوضوء"

أقول: عالَم المثال مبناه على مناسبة الأرواح بالأشباح، كما ظهر منعُ الصائمين عن الأكل والجماع بالخَتْم على الأفواه والفروج.

ترجمہ: اور فرمایا آپ ﷺ نے کہ: ''تو مدد کر میری اپنے نفس کے خلاف سجدوں کی زیادتی سے'' (یعنی خواہ تیرا جی چاہے نہ چاہے خوب نمازیں پڑھ) یہ ارشاد اسی لئے ہے کہ سجدے تعظیم کی انتہائی شکل ہیں۔ پس سجدہ مؤمن کی بلند پرواز ہے، اور بہیمیت کی قید سے ملکیت کے رہائی پانے کا وقت ہے۔ اور جس نے جمایا اپنے اندر رحمتِ الٰہی کے پردے کو، تو اس نے یقیناً خیر کا فیضان کرنے والے (یعنی نبی ﷺ) کی مدد کی۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''میری امت قیامت کے دن سجدوں کی وجہ سے روشن پیشانی، وضو کی وجہ سے روشن اعضاء ہوگی'' میں کہتا ہوں: عالم مثال کا مدار روحوں اور پیکروں کی مناسبت پر ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہوا روزے داروں کو کھانے اور صحبت کرنے سے روکنا مونہوں اور شرمگاہوں پر مہر کرنے کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

جلسہ اور قعدہ میں بیٹھنے کا طریقہ اوران کے اذکار

جلسہ میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ افتراش ہے یعنی بایاں پاؤں بچھا کراس پر بیٹھے، اور دایاں پاؤں کھڑا رکھے اور اپنی ہتھیلیاں گھٹنوں پر رکھے۔ اور یہ ذکر کرے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ، وَارْحَمْنِیْ، وَاھْدِنِیْ، وَعَافِنِیْ، وَارْزُقْنِیْ (اے اللہ! میری مغفرت فرما، مجھ پر مہربانی فرما، مجھے راہ راست دکھا، مجھے (بلیات دارین اور امراض ظاہرہ و باطنہ سے) عافیت عطا فرما اور مجھے روزی عطا فرما) یا کم از کم اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ضرور کہہ لے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اتنا کہنا فرض ہے۔ پس ان کے اختلاف کی رعایت کرے (مشکوۃ حدیث ۹۰۰ و ۹۰۱)

اور قعدہ میں ـــــ خواہ پہلا ہو یا آخری ـــــ بیٹھنے کا طریقہ بھی افتراش ہے۔ حضرت وائل، حضرت رفاعہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے جو روایات مروی ہیں ان میں بلا تفریق یہی طریقہ آیا ہے۔ بلکہ حضرت سمرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت میں جس کو حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے: تورّک کی ممانعت آئی ہے (اعلاء السنن ۸۲:۳) البتہ حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت میں آخری قعدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تورّک کرنا مروی ہے۔ اور تورّک یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھے، اور بایاں پاؤں اس کے نیچے سے دائیں طرف نکال دے اور سرین پر بیٹھے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ نے اس روایت کو لیا ہے۔ احناف کے نزدیک یہ عذر کی حالت پر محمول ہے۔

اور قعدہ میں دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے یعنی رانوں پر اس طرح رکھے کہ انگلیاں گھٹنوں تک پہنچ جائیں۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بائیں ہتھیلی اپنے گھٹنے کو لقمہ بنا کر کھلاتے تھے یعنی انگلیاں گھٹنے پر جھکا لیتے تھے۔ پس یہ بھی درست ہے۔

اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر ترپن کا عقد بنا کر رکھے۔ ترپن کا عقد اس طرح بنتا ہے کہ چھوٹی اور بیچ کی اور ان کے درمیان کی: تین انگلیاں بند کرلے، اور شہادت کی انگلی سیدھی رکھے، اور انگوٹھا اس کی جڑ میں لگائے، یہ ترپن کا عقد بن گیا۔ شروع ہی سے یہ عقد بنالے۔ اس کے علاوہ دو طریقے اور بھی مروی ہیں: ایک: چھوٹی اور اس کے پاس والی: دو انگلیاں بند کرلے، اور درمیانی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنالے، اور جب اشارہ کا وقت آئے تو انگشت شہادت سے اشارہ کرے۔ دوسرا: تمام انگلیوں کی مٹھی بنالے، اور بوقت اشارہ شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے۔ یہ تینوں صورتیں درست ہیں۔ اور شروع ہی سے یہ ہیئت بنالے یا جب اشارہ کا وقت آئے اس وقت بنالے دونوں باتیں درست ہیں۔ پھر اشارہ کے بعد یہ ہیئت آخر تک باقی رکھے۔ البتہ اشارہ ختم کردے۔ درمختار میں ہے ویضعها عند الإثبات۔ اور حضرت تھانوی قدس سرہ نے جو فتوی دیا تھا کہ آخر تک انگلی جھکا کر اشارہ باقی رکھے، اس فتوی سے آپ نے رجوع کرلیا ہے۔ اور وہ رجوع بھی امداد الفتاوی میں ہے۔

پھر جب تشہد پڑھتا ہوا لا إلٰــہ پر پہنچے تو نفی کے ساتھ شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے۔ اور حنفیہ کے نزدیک اس اشارہ کی وجہ یہ ہے کہ لا إلٰــہ سے مطلق نفی ہے، اور ایک انگلی کے اشارہ سے ایک اللہ کی الوہیت کا اثبات ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے دو انگلیوں سے اشارہ کیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ٹوکا۔ اور فرمایا أَحِّدْ أَحِّدْ: ایک انگلی سے اشارہ کر۔ اور جب إلا اللہ کہے تو اشارہ ختم کردے، کیونکہ اب ضرورت باقی نہیں رہی ——— امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اثبات کے ساتھ اشارہ ہے، تاکہ قول وفعل میں مطابقت ہو جائے۔ اور ایک معنوی حقیقت (توحید) نگاہوں کے سامنے پیکرِ محسوس بن کر آجائے۔

اور احناف کے نزدیک تشہد میں اشارہ مسنون ہے یا نہیں؟ اس میں شدید اختلاف تھا۔ فقہائے عراق جو کتب حدیث سے مزاولت رکھتے تھے اشارہ کے قائل تھے۔ اور فقہائے ماوراء النہر انکار کرتے تھے۔ مگر بعد میں معاملہ ٹھہر گیا۔ اب سب احناف اشارہ کے قائل ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

جو یہ کہتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں اشارہ نہیں ہے، وہ غلطی پر ہے۔ نہ کسی روایت سے اس کے قول کی تائید ہوتی ہے، اور نہ عقلاً یہ بات درست ہے، جیسا کہ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے ہدایہ کی شرح فتح القدیر (۲۷۲:۱) میں فرمایا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ کی مبسوط میں اشارہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ مگر موطا میں ہے۔ پس یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ظاہر روایت کی چھ کتابوں میں اشارہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ مگر یہ کہنا درست نہیں کہ حنفیہ کے ظاہر مذہب میں اشارہ نہیں۔ مگر بعض لوگ ان دونوں باتوں میں فرق نہیں کرتے اور وہی مرغ کی ایک ٹانگ گاتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب حنفی میں اشارہ نہیں۔ خدا ایسے جہل وتعصب سے بچائے (آمین)

اور تشہد مختلف طرح سے مروی ہے۔ ان میں معمولی الفاظ کا فرق ہے۔ سند کے اعتبار سے صحیح ترین وہ تشہد ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کو احناف نے لیا ہے۔ پھر حضرت ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مروی تشہد ہیں۔ اول کو امام شافعی رحمہ اللہ نے اور ثانی کو امام مالک رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک سب درست ہیں۔ جیسے قرآن کریم کی مختلف قراءتیں سب درست اور کافی شافی ہیں، اسی طرح تشہد کا معاملہ ہے۔

ومن هيئات ما بين السجدتين: أن يجلس على رجله اليسرى، وينصب اليمنى، ويضع راحتَيْه على ركبتيه؛ ومن أذكاره: "اللهم اغفرلي، وارحمني، واهدني، وعافني، وارزقني"

ومن هيئات القعدة: أن يجلس على رجله اليسرى، وينصب اليمنى، ورُوي في الأخيرة: قدَّم رجله اليسرى، ونصب الأخرى، وقعد على مقعدته؛ وأن يضع يديه على ركبتيه، وورد: يُلْقِمُ كفه اليسرى ركبتَه؛ وأن يَعْقِد ثلاثة وخمسين، وإشار بالسبابة، ورُوي: قَبَضَ ثنتين، وحَلَّقَ حلقةً.

والسر في رفع الأصبع: الإشارة إلى التوحيد، ليتعاضد القولُ والفعلُ، ويصير المعنى

متمثلاً متصوَّرًا.

ومن قال: إن مذهب أبي حنيفة رحمه الله تركُ الإشارة بالمسبحة، فقد أخطأ، ولايعضُده روايةٌ ولادرايةٌ، قاله ابنُ الهمام. نعم، لم يذكره محمد رحمه الله في الأصل، وذكره في الموطأ؛ ووجدتُ بعضَهم لايميز بين قولنا: ليست الإشارة في ظاهر المذهب، وقولنا: ظاهرُ المذهب أنها ليست؛ ومفاسدُ الجهل والتعصب أكثرُ من أن تُحصَى.

وجاء في التشهد صِيَغٌ: أصَحُّها تشهد ابن مسعود رضي الله عنه، ثم تشهد ابن عباس وعمر رضي الله عنهما: وهي كأحرف القرآن، كلُّها شافٍ كافٍ.

ترجمہ: اور دوسجدوں کے درمیان جلسہ کی ہیئتوں میں سے یہ ہے کہ اپنے بائیں پاؤں پر بیٹھے۔ اور دایاں کھڑا کرے۔ اور اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھے، اور جلسہ کے اذکار میں سے ہے: اللهم إلخ۔

اور قعدہ کی ہیئتوں میں سے ہے کہ بیٹھے وہ (دونوں قعدوں میں) اپنے بائیں پاؤں پر، اور کھڑا کرے دایاں۔ اور روایت کیا گیا ہے آخری قعدہ میں کہ اپنا بایاں پاؤں آگے بڑھادے، اور دوسرا کھڑا کرے، اور بیٹھے اپنی بیٹھنے کی جگہ پر۔ اور یہ ہے کہ رکھے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر (عام روایات میں یہی طریقہ آیا ہے) اور (ایک روایت میں) وارد ہوا ہے کہ لقمہ کھلائے اپنی بائیں ہتھیلی کا اپنے گھٹنے کو۔ اور یہ ہے کہ بنالے ترپن۔ اور اشارہ کرے شہادت کی انگلی سے۔ اور روایت کیا گیا ہے کہ بند کرلے دو انگلیاں اور حلقہ بنائے حلقہ بنانا۔

اور راز انگلی اٹھانے میں: اشارہ کرنا ہے توحید (اللہ کے ایک ہونے) کی طرف، تاکہ قول وفعل ایک دوسرے کے مددگار ہوجائیں۔ اور ہوجائیں معنی پیکر محسوس، تصور میں لائے ہوئے۔

اور جس نے کہا کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب انگشتِ شہادت سے اشارہ نہ کرنا ہے، تو یقیناً اس نے غلطی کی۔ نہیں مدد کرتی اس کی کوئی روایت اور نہ کوئی درایت۔ کہی ہے یہ بات ابن الہمام نے۔ ہاں! اشارہ کا تذکرہ نہیں کیا محمد رحمہ اللہ نے مبسوط میں اور اس کا تذکرہ کیا ہے موطا میں۔ اور پایا میں نے بعض احناف کو نہیں امتیاز کرتے وہ ہمارے اس قول کے درمیان کہ: ''ظاہر مذہب میں اشارہ نہیں ہے'' (یعنی کتب ستہ میں اشارہ کا تذکرہ نہیں ہے) اور ہمارے اس قول کے درمیان کہ: ''ظاہر مذہب یہ ہے کہ اشارہ نہیں ہے'' (یعنی احناف کا مفتی بہ مذہب یہ ہے کہ اشارہ جائز نہیں ہے) اور جہالت اور تعصب کے مفاسد اس سے زیادہ ہیں کہ شمار کئے جائیں۔

اور تشہد میں چند صیغے آئے ہیں: ان میں صحیح ترین ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا تشہد ہے۔ پھر ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا تشہد ہے۔ اور وہ قرآن کی قراءتوں کی طرح ہیں۔ سب کافی شافی ہیں۔

☆

قعدۂ اخیرہ میں درود اور دعائیں

درود شریف مختلف لفظوں سے مروی ہے۔ان میں صحیح ترین درود ابراہیمی ہے۔اور وہ دو طرح سے مروی ہے:

پہلا درود ابراہیمی: اَللّٰهُمَّ صَلِّ علىٰ مُحَمَّدٍ وَّعَلىٰ آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلىٰ إِبْرَاهِيْمَ وَعَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيْمَ، إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ. اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَّعَلىٰ آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلىٰ إِبْرَاهِيْمَ وَعَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيْمَ، إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (اے اللہ! بے پایاں رحمت نازل فرما حضرت محمد پر اوران کے خاندان پر، جس طرح بے پایاں رحمت نازل فرمائی آپ نے حضرت ابراہیم اوران کے خاندان پر۔ بیشک آپ ستودہ اور باعظمت ہیں۔اے اللہ! برکت فرما حضرت محمد پر اوران کے خاندان پر، جس طرح برکت فرمائی آپ نے حضرت ابراہیم پر اوران کے خاندان پر، بیشک آپ تعریف کئے ہوئے اور باعظمت ہیں)(مشکوۃ حدیث ۹۱۹)

دوسرا درود ابراہیمی: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَّأَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيْمَ، وبارك علىٰ مُحَمَّدٍ و أزواجه وذريته، كما باركت على آل إبراهيم، إنك حميد مجيد (اے اللہ! بے پایاں رحمت نازل فرما حضرت محمد پر، اوران کی بیویوں پر اوران کی اولاد پر، جس طرح بے پایاں رحمت نازل فرمائی آپ نے حضرت ابراہیم کے خاندان پر۔اور برکت فرما حضرت محمد پر اوران کی بیویوں پر اوران کی اولاد پر، جس طرح برکت فرمائی آپ نے حضرت ابراہیم کے خاندان پر۔ بیشک آپ ستودہ اور بزرگ ہیں)(مشکوۃ حدیث ۹۲۰)

اسی طرح قعدۂ اخیرہ میں دعائیں بھی متعدد مروی ہیں۔ان میں سے چند یہ ہیں:

پہلی دعا: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ (اے اللہ! میں جہنم کے عذاب سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔اور میں قبر کے عذاب سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔اور میں کانے دجال کے فتنہ سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔اور میں زندگی اور موت کے فتنہ سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں)

دوسری دعا: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا، وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ، فَاغْفِرْ لِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِيْ، إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (اے اللہ! میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا، اور آپ کے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔پس بخشش فرمایئے میری، خاص اپنے پاس سے بخشش۔اور مجھ پر مہربانی فرمایئے۔ بیشک آپ ہی بخشنے والے مہربان ہیں)

تیسری دعا: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّيْ، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، وَأَنْتَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اے اللہ! بخش دیجئے میرے لئے جو گناہ میں نے آگے

بھیجے اور جو میں نے پیچھے چھوڑے اور جو میں نے پوشیدہ طور پر کئے، اور جو میں نے کھلے طور پر کئے، اور ان گناہوں کو جن کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ہی آگے کرنے والے ہیں اور آپ ہی پیچھے کرنے والے ہیں۔ اور آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں) (مشکوۃ حدیث ۹۴۱، ۹۴۲، ۲۴۸۳)

واصحُّ صِيَغِ الصلاة: " اللهم صل على محمد وعلى آل محمد، كما صليتَ على إبراهيم وعلى آلِ إبراهيم، إنك حميد مجيد، اللّهم بارك على محمد وعلى آل محمد، كما باركت على إبراهيم وعلى آل إبراهيم، إنك حميد مجيد" و" اللّهم صلِّ على محمد وأزواجه وذريته، كما صليت على آل إبراهيم، وبارك على محمد وأزواجه وذريته، كما باركت على آل إبراهيم، إنك حميد مجيد"

وقد ورد في صِيَغِ الدعاء في التشهد: " اللّهم إني أعوذ بك من عذاب جهنم، وأعوذ بك من عذاب القبر، وأعوذ بك من فتنة المسيح الدجال، وأعوذ بك من فتنة المحيا والممات" وورد: " اللّهم إني ظلمت نفسي ظلمًا كثيرًا، ولايغفر الذنوب إلا أنت، فاغفرلي مغفرةً من عندك، وارحمني، إنك أنت الغفور الرحيم" وورد: " اللهم اغفرلي ما قدّمتُ، وما أخرت، وما أسررتُ، وما أعلنتُ وما أنت أعلم به مني، أنت المقدّمُ وأنت المؤخِّر، وأنت على كل شيئ قدير.

ترجمہ: سب آ گیا ہے۔ اس لئے ضرورت نہیں۔

☆ ☆ ☆

سلام کے بعد ذکر و دعا

سلام پر اگرچہ نماز پوری ہوجاتی ہے، مگر اس کے بعد بھی ذکر و دعا مروی ہے اور یہ قبولیت دعا کا خاص وقت ہے۔
حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! کونسی دعا زیادہ سُنی جاتی ہے؟ یعنی کس وقت کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: " آخری رات کے درمیان اور فرض نمازوں کے بعد"۔ لہٰذا سلام کے بعد بھی ذکر و دعا کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ کے چند اذکار درج ذیل ہیں:

پہلا ذکر: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوتے تھے تو تین بار استغفار کرتے تھے یعنی تین مرتبہ أَسْتَغْفِرُ اللّٰه کہتے تھے یعنی میں اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد کہتے

تھے: اَللّٰھُم أَنتَ السَّلَامُ، وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالإِكْرَامِ (اے اللہ! آپ ہی سالم ہیں یعنی ہر عیب ونقص سے پاک ہیں۔اورآپ ہی کی طرف سے سلامتی ہے۔آپ برکت والے ہیں۔اے جلال واکرام والی ذات!)

دوسرا ذکر: حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد کہا کرتے تھے: لَاإِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ، وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ لَامَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَامُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ یکتا ہے،اس کا کوئی شریک نہیں۔اسی کی فرمانروائی ہے،اوراس کے لئے ستائش ہے،اوروہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔اے اللہ! کوئی روکنے والانہیں اس کو جوآپ دیں۔اورکوئی دینے والانہیں اس کو جوآپ نہ دیں۔اورنہیں سودمند ہے سرمایہ دار کے لئے آپ سے سرمایہ داری یعنی بڑے سے بڑا سرمایہ دار بھی آپ کے کرم کا محتاج ہے)

تیسرا ذکر: حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سلام پھیرنے کے بعد نماز کے ختم پر بلند آواز سے کہا کرتے تھے: لَاإِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ، وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَلَانَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ، لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ، وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَاإِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ، مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ یکتا ہے،اس کا کوئی شریک نہیں۔اسی کی حکومت ہے اوراس کے لئے تعریف ہے۔اوروہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔نہیں ہے قدرت اور نہ طاقت مگر اللہ ہی سے۔اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ہم صرف اس کی عبادت کرتے ہیں۔اس کے لئے نعمتیں اوراس کے لئے احسان ہے۔اوراسی کے لئے بہترین تعریف ہے۔اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ہم پورے اخلاص کے ساتھ اسی کی بندگی کرتے ہیں،اگرچہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو)

چوتھا ذکر: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے بچوں کو یہ کلمات سکھایا کرتے تھے۔اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد ان کلمات کے ذریعہ پناہ مانگا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَرْذَلِ الْعُمُرِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ (اے اللہ! میں بزدلی سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔اور میں کنجوسی سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں،اورنکمی زندگی سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں،اور میں دنیا کے فتنہ سے اور قبر کے عذاب سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں)

پانچواں ذکر: حضرت کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آگے پیچھے پڑھے جانے والے چند کلمات ہیں۔ہر فرض نماز کے آخر میں ان کو پڑھنے والا نامراد نہیں ہوتا: ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۴ بار اللہ اکبر۔

چھٹا ذکر: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ ہر نماز کے بعد ۳۳

مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر اور سویں مرتبہ لا إله إلا الله، وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير کہے، اس کی سب خطائیں معاف کردی جائیں گی، اگرچہ وہ سمندر کے کف (جھاگ) کے برابر ہوں"

ساتواں ذکر: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہر فرض نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار تحمید اور ۳۴ بار تکبیر بتائی گئی۔ پھر ایک انصاری صحابی کو خواب آیا۔ خواب میں فرشتے نے اس سے کہا کہ ان تینوں کلمات کو پچیس پچیس بار کرلو، اور پچیس بار اس میں لا إلٰـه إلا الله بڑھالو، تاکہ سو کی گنتی پوری ہوجائے۔ اس انصاری نے صبح یہ خواب نبی ﷺ سے ذکر کیا، تو آپؐ نے فرمایا: "ایسا کرلو"

آٹھواں ذکر: اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ہر فرض کے بعد دس مرتبہ سبحان اللہ، دس مرتبہ الحمد للہ، اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہا جائے۔ تو پورے دن میں ڈیڑھ سو تسبیح ہونگی اور دس گنا ثواب کے قاعدہ سے پندرہ سو نیکیاں ہوجائیں گی۔

نواں ذکر: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو فجر کی نماز کے بعد سو مرتبہ سبحان اللہ اور سو مرتبہ لا إلٰه إلا الله کہے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے، اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں"

نوٹ: اس عنوان کے تحت بیان ہونے والی تمام روایات مشکوۃ شریف باب الذکر بعد الصلاۃ میں ہیں البتہ آخری روایت نسائی (۷۹:۳) میں ہے۔

فائدہ: یہ تمام اذکار وادعیہ: قرآن کی قراءتوں کی طرح ہیں۔ ان میں سے جس پر بھی عمل کرے گا اس پر جس ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور حاصل ہوگا۔

ومن أذكار ما بعدَ الصلاة: "أستغفر الله" ثلاثاً، و: "اللّٰهم أنت السلام، ومنك السلام، تبارکت يا ذا الجلال والإكرام. لا إلٰه إلا الله، وحدَه لاشريك له، له الملك، وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير، اللهم لامانع لما أعطيتَ، ولامعطى لما منعت، ولا ينفع ذا الجدِّ منك الجَدُّ، لا إلٰه إلا اللّٰه، ولانعبد إلا إياه، له النعمة وله الفضل، وله الثناء الحسن، لا إلٰه إلا الله، مخلصين له الدين، ولو كره الكافرون، اللهم إني أعوذ بك من الجُبْن، وأعوذ بك من البخل، وأعوذ بك من أرذل العمر، وأعوذ بك من فتنة الدنيا وعذاب القبر"

وثلاثٌ وثلاثون تسبيحةً، وثلاث وثلاثون تحميدةً، وأربع وثلاثون تكبيرةً، ورُوى من كلٍّ ثلاث وثلاثون، وتمام المائة: لا إلٰه إلا الله وحده لاشريك له إلخ ورُوى من كلٍّ خمس وعشرون، والرابعُ لا إلٰه إلا الله، ويُروى: يسبحون في دبر كل صلاة عشرًا، ويُحَمِّدون عشرًا، ويكبرون عشرًا، ورُوى من كلٍّ مائةٌ؛ والأدعيةُ كلُّها بمنزلة أحرف القرآن، من قرأمنها شيئًا فاز بالثواب الموعود.

ترجمہ: اور نماز کے بعد کے اذکار میں سے: (۱) تین بار استغفر الله اور اللهم أنت السلام إلخ (۲) لا إله إلخ (۳) لا إله إلخ اس کا شروع کا حصہ چھوڑ دیا ہے، کیونکہ نمبر۲ میں آگیا ہے (۴) اللهم إني أعوذ إلخ (۵) ۳۳ بار تسبیح ۳۳ بار تحمید ۳۴ بار تکبیر (۶) اور روایت کیا گیا ہر ایک سے ۳۳ بار اور سویں بار لا إله إلخ (۷) اور روایت کیا گیا ہر ایک سے ۲۵ بار اور چوتھا لا إله إلا الله ہے (۸) اور روایت کیا گیا: تسبیح پڑھیں لوگ ہر نماز کے بعد دس بار اور حمد کریں دس بار اور تکبیر کہیں دس بار (۹) اور روایت کیا گیا ہر ایک سے سو بار (یہ روایت مجھے نہیں ملی) اور ساری دعائیں قرآن کی قراءتوں کی بمنزلہ ہیں۔ جو پڑھے گا ان میں سے کسی کو بھی تو کامیاب ہوگا وہ وعدہ کئے ہوئے ثواب کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

سلام کے بعد اذکار کی اور گھر میں سنتیں ادا کرنے کی حکمت

بہتر یہ ہے کہ مذکورہ اذکار سنتوں سے پہلے کر لئے جائیں۔ کیونکہ بعض روایات میں اس کی صراحت ہے۔ جیسے عبدالرحمٰن بن غَنْم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص فجر اور مغرب کی نماز سے پھرنے اور پیر موڑنے سے پہلے کہے: لا إله إلا الله آخر تک'' اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ: ''آپ نماز کے بعد بلند آواز سے کہتے تھے: لا إله إلا الله آخر تک'' اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کا پورا ہونا تکبیر سے پہچانا کرتا تھا یعنی آپ سلام پھیرتے ہی زور سے تکبیر کہتے تھے۔ اور بعض روایات بظاہر اس پر دلالت کرتی ہیں، جن میں آیا ہے کہ ''ہر نماز کے پیچھے'' یہ اذکار کرے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سلام پھیرتے تھے تو بس اتنی دیر بیٹھتے تھے کہ کہیں: اللهم أنت السلام، ومنك السلام، تباركت يا ذا الجلال والأكرام۔ اس قول کی چند توجیہیں ہو سکتی ہیں:

پہلی توجیہ: صدیقہ کی مراد یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد آپ نماز کی ہیئت پر صرف اتنی دیر بیٹھتے تھے۔ پھر نشست بدل لیتے تھے۔ دائیں جانب یا بائیں جانب یا مقتدیوں کی جانب رُخ پھیر لیتے تھے، تاکہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یہ اذکار بھی نماز میں شامل ہیں۔

دوسری توجیہ: یا صدیقہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ گاہ بگاہ آپ دیگر اذکار چھوڑ دیتے تھے۔ صرف اللهم أنت السلام إلخ پڑھ کر اٹھ جاتے تھے۔ اور آپ ایسا اس لئے کرتے تھے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ اذکار فرض نہیں ہیں۔ اور کوئی یہ خیال نہ کرے کہ كَانَ تو مواظبت پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ كَانَ کا مقتضی یہ نہیں ہے۔ اس کا مفہوم کسی عمل کا بکثرت پایا جانا ہے یعنی صرف ایک بار یا دو بار نہ پایا جانا۔

اور سنتوں میں اصل یہ ہے کہ ان کو گھر میں ادا کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا۔ اور روایت میں ہے

کہ آپؐ بنوعبدالاشہل کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ آپؐ نے اس میں مغرب پڑھی۔ نماز کے بعد آپؐ نے لوگوں کو دیکھا کہ نوافل پڑھ رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ گھروں کی نماز ہے'' اور دوسری روایت میں ہے کہ: ''لازم کرو تم اس نماز کو گھروں میں'' (مشکوۃ حدیث ۱۱۸۲ باب السنن)

اوران دونوں باتوں کی حکمت یعنی سلام پھیرتے ہی اذکار کرنے کی اور گھر جاکر سنتیں ادا کرنے کی یہ ہے کہ فرض اور نفل کے درمیان ایسی چیز سے فصل ہو جائے جو دونوں کی جنس سے نہ ہو۔ اور یہ کہ یہ فصل معتد بہ ہو، جو سرسری نظر ہی میں محسوس کرلیا جائے۔ ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ ایک صاحب نے فرض نماز کے بعد متصلاً نوافل شروع کرنے چاہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کود کر کھڑے ہوئے، ان کا شانہ ہلایا اور فرمایا: ''اہل کتاب اسی لئے ہلاک ہوئے کہ ان کی نمازوں کے درمیان فصل نہیں رہا تھا'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اے عمر! اللہ تعالیٰ آپ کو صائب الرائے بنائیں!'' یعنی آپ نے صحیح تنبیہ کی۔ (مشکوۃ حدیث ۹۷۲)

والأولى: أن يأتي بهذه الأذكار قبل الرواتب، فإنه جاء في بعض الأذكار ما يدلُّ على ذلك نصًّا، كقوله: "من قال قبلَ أن ينصرفَ ويَثْنِيَ رجليه من صلاة المغرب والصبح: لا إله إلا الله" إلخ، وكقول الراوي: "كان إذا سلَّم من صلاته يقول بصوته الأعلى: لا إله إلا الله" إلخ قال ابن عباس: "كنتُ أعرفُ انقضاءَ صلاةِ رسول الله صلى الله عليه وسلم بالتكبير" وفي بعضها مايدل ظاهرًا، كقوله: "دبر كلِّ صلاةٍ"

وأما قولُ عائشة: "كان إذا سلَّم لم يقعُدْ إلا مقدارَ مايقول: اللهم أنت السلام، فيحتمل وجوهًا:

منها: أنه كان لايقعد بهيئة الصلاة إلا هذا القدر، ولكنه كان يتيامن، أو يتياسر، أو يُقبل على القوم بوجهه، فيأتي بالأذكار، لئلا يظنَّ الظانُّ: أن الأذكار من الصلاة.

ومنها: أنه كان حينًا بعد حين: يترك الأذكار، غيرَ هذه الكلمات، يعلِّمهم أنها ليست فريضةً.

وإنما مقتضى: "كان" وجودُ هذه الفعل كثيرًا، لا مرةً ولا مرتين، لا المواظبة.

والأصل في الرواتب: أن يأتي بها في بيته، والسر في ذلك كلِّه أن يقع الفصلُ بين الفرض والنوافل بما ليس من جنسِهما، وأن يكون فصلاً معتدًا به، يُدْرَكُ باديَ الرأي، وهو قول عمر رضي الله عنه لمن أراد أن يُشْفَعَ بعد المكتوبة: "اجلس فإنه لم يَهْلِكْ أهلُ الكتاب، إلا أنه لم يكن بين صلواتِهم فصلٌ" فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "أصاب اللهُ بك يا ابن الخطاب!" وقوله صلى الله عليه وسلم: "اجعلوها في بيوتكم" والله أعلم.

ترجمہ: اور بہتر یہ ہے کہ اذکار سنتوں سے پہلے کرے، پس بیشک بعض اذکار کے سلسلہ میں آیا ہے وہ جو اس پر

صراحۃً دلالت کرتا ہے۔ جیسے آپؐ کا ارشاد: ''جس نے کہا پھرنے سے پہلے، اور مغرب اور فجر کی نماز سے اپنے پیر موڑنے سے پہلے لا إلٰہ إلا اللّٰہ آخرتک اور جیسے راوی کا قول: ''نبی ﷺ جب اپنی نماز کا سلام پھیرتے تھے تو بلند آواز سے کہتے تھے: لا إلٰہ إلا اللّٰہ آخرتک ابن عباس نے فرمایا: ''میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کا پورا ہونا پہچانتا تھا تکبیر سے'' یعنی آپؐ سلام پھیرتے ہی زور سے تکبیر کہتے تھے۔ اور بعض روایات میں وہ الفاظ ہیں جو بظاہر اس پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے آپؐ کا ارشاد: ''ہر نماز کے پیچھے''

اور رہا عائشہ کا قول: ''آپؐ جب سلام پھیرتے تھے تو نہیں بیٹھتے تھے مگر اتنی دیر کہ کہیں آپ: اللھم أنت السلام، تو احتمال رکھتا ہے یہ قول کئی صورتوں کا ـــــ ان میں سے: یہ ہے کہ آپؐ نہیں بیٹھا کرتے تھے نماز کی ہیئت پر مگر اتنی دیر، بلکہ داہنی طرف رخ پھیر لیتے تھے یا بائیں طرف یا لوگوں کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے، پس یہ اذکار کرتے تھے، تاکہ کوئی گمان کرنے والا گمان نہ کرے کہ اذکار نماز سے ہیں۔ اور ان میں سے: یہ ہے کہ وہ تھا گاہ بگاہ: چھوڑتے تھے آپؐ ان کلمات کے علاوہ اذکار کو۔ سکھلاتے تھے آپؐ لوگوں کو کہ یہ اذکار فرض نہیں ہیں۔ اور کَـــــانَ کا تقاضا بس اس فعل کا بکثرت پایا جاتا ہے، نہ کہ ایک بار یا دو بار۔ مواظبت اس کا مقتضی نہیں ہے۔

اور سنن میں اصل: یہ ہے کہ ان کو اپنے گھر میں ادا کرے۔ اور راز ان سب میں یہ ہے کہ فرض اور نوافل کے درمیان ایسی چیز سے جدائی ہو جائے جو کہ وہ ان دونوں کی جنس سے نہیں ہے، اور یہ کہ فصل معتد بہ ہو، جو اول وہلہ ہی میں محسوس کر لیا جائے۔ اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اس شخص سے جس نے چاہا تھا کہ فرض سے دوگانۂ نفل ملائے: ''بیٹھ جا، پس بیشک نہیں ہلاک ہوئے اہل کتاب مگر بایں وجہ کہ نہیں تھا ان کی نمازوں کے درمیان فصل'' پس فرمایا نبی ﷺ نے: ''اے ابن خطاب! اللہ تعالیٰ آپ کو صائب الرائے بنائیں!'' آپ کا ارشاد ہے: ''ادا کرو تم ان کو تمہارے گھروں میں'' (یہ روایت پہلے آنی چاہئے تھی) واللہ اعلم۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۱۱

وہ امور جو نماز میں جائز نہیں اور سجدۂ سہو وتلاوت

نماز کی بنیاد تین چیزیں ہیں: (۱) اعضاء کا عاجزی کرنا (۲) دل کا حاضر ہونا (۳) زبان کا ذکر وتلاوت کے علاوہ باتوں سے رُکا رہنا۔ پس دو باتیں واضح ہیں:

پہلی بات: ہر وہ حالت جو خشوع وخضوع کے مباین ہے، اور ہر وہ بات جو ذکر خداوندی کے قبیل سے نہیں ہے: نماز

کے منافی ہے۔ جب تک اُن امور سے نماز میں احتراز نہ کیا جائے، اوران سے باز نہ رہا جائے: نماز تام نہیں ہوسکتی۔

دوسری بات: مگر مذکورہ امور متفاوت ہیں یعنی مبائن ومنافی امور سب ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ اور ہر کسی سے نماز باطل نہیں ہوتی (کیونکہ انسان بشری احوال سے بالکلیہ بری نہیں ہوسکتا، اور کبھی کسی ناگہانی ضرورت سے بھی کوئی کام کرنا پڑتا ہے، اس لئے کچھ گنجائش ضروری ہے)

فائدہ: اوران چیزوں میں جو نماز کو بالکلیہ باطل کرتی ہیں، اور جو نماز کو کسی درجہ میں ناقص کرتی ہیں امتیاز نص ہی سے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ بات تشریع (قانون سازی) سے تعلق رکھتی ہے، جس میں عقل وقیاس کا دخل نہیں۔ اور فقہاء نے اس سلسلہ میں بہت تفصیلات پیش کی ہیں، مگر وہ نصوص پر منطبق نہیں ہیں۔ نصوص سے اقرب وہ فقہی مسلک ہے جس میں زیادہ وسعت سے کام لیا گیا ہے۔ البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ وہ زیادہ عمل جس سے مجلس بدل جائے، اور وہ زیادہ کلام جسے بہت ہی زیادہ سمجھا جائے: نماز کو باطل کرتا ہے۔

اورامر ثانی: —— یعنی جن چیزوں سے نماز ناقص ہوتی ہے، بالکلیہ باطل نہیں ہوتی —— تو اس سلسلہ کی روایات درج ذیل ہیں:

پہلی روایت: حضرت معاویہ بن الحکم سُلمی رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام کے ابتدائی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز میں کسی نے چھینکا تو حضرت معاویہ نے یرحمك الله کہا۔ لوگوں نے ان کو گھورا۔ قصہ مختصر: نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو سمجھایا کہ: ”نماز میں باتوں کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ نماز تو بس تسبیح، تکبیر اور تلاوتِ قرآن ہے“ (مگر آپؐ نے نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ اس قدر کلام سے نماز فاسد نہیں ہوتی)

دوسری روایت: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کو سلام کیا۔ آپؐ نماز پڑھ رہے تھے۔ جواب نہیں دیا۔ نماز کے بعد جواب نہ دینے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ: ”نماز میں مشغولیت ہے“ (معلوم ہوا کہ جواب دینے کی تو گنجائش ہے، مگر مشغولیت مانع بنی)

تیسری روایت: حضرت مُعیقیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے دریافت کیا کہ نماز میں سجدہ کی جگہ کی مٹی برابر کرسکتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”اگر برابر کرنا ضروری ہوتو ایک مرتبہ کریں“ (اس سے معلوم ہوا کہ اتنے عمل سے نماز باطل نہیں ہوتی)

چوتھی روایت: نبی ﷺ نے نماز میں پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونے سے منع فرمایا۔ اور ایک ضعیف روایت میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ دوزخیوں کی راحت ہے یعنی دوزخی محشر میں جب کھڑے کھڑے تھک جائیں گے تو ستانے کے لئے اس طرح کھڑے ہوں گے۔ اور دنیا میں یہ مصیبت زدہ، حیران ومتحیر لوگوں کے کھڑے ہونے کا انداز ہے، اس لئے ممنوع ہے (تاہم اس طرح کھڑے ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی)

پانچویں روایت: نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اُچک لینا ہے۔ شیطان بندے کی نماز میں سے جھپٹا مار لیتا ہے یعنی اس سے نماز ناقص ہوتی ہے، اور یہ حرکت نماز کو کامل نہیں ہونے دیتی۔

چھٹی روایت: نماز میں جمائی آئے تو حکم یہ ہے کہ حتی الامکان اس کو روکے، نہ رُکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لے، ہاہا نہ کرے۔ پس بیشک شیطان اس کے منہ میں داخل ہوتا ہے یعنی اس سے مکھی وغیرہ منہ میں داخل ہوسکتی ہے۔ جس سے دل پراگندہ ہوجائے اور نماز سے توجہ ہٹ جائے (مگر نماز باطل نہ ہوگی)

ساتویں، آٹھویں اور نویں روایتیں: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو تو کنکریوں کو ہاتھ نہ لگائے، کیونکہ رحمتِ خداوندی اس کی طرف متوجہ ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ برابر بندے کی طرف متوجہ رہتے ہیں، جبکہ بندہ نماز میں ہوتا ہے، جب تک وہ اِدھر اُدھر نہیں جھانکتا۔ اور جب وہ اِدھر اُدھر جھانکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے روگردانی کرلیتے ہیں۔ اور ایک حدیث قدسی میں آیا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے نماز اپنے اور بندے کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم کی ہے یعنی حمد وثنا میرے لئے ہے اور ہدایت طلبی کی دعا بندے کے لئے ہے۔ آخر تک (مشکوٰۃ حدیث ۸۲۳ باب القراءۃ فی الصلاۃ) (یہ تیسری حدیث صرف اس لئے لائے ہیں کہ تینوں حدیثوں کی ایک ساتھ شرح کرنی ہے)

تشریح: ان تینوں روایتوں میں اس طرف اشارہ ہے کہ کرم خداوندی کا فیضان تو عام ہے، مگر فطری اور اکتسابی قابلیتوں کے تفاوت سے لوگوں میں تفاوت ہوتا ہے جیسے سورج کا فیضان تو عام ہے مگر آئینہ روشنی سے زیادہ مستفید ہوتا ہے، اور کالا توا محروم رہتا ہے۔ اسی طرح جب بندہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے لئے کرم خداوندی کا دروازہ وا کیا جاتا ہے۔ رحمت اور عنایاتِ خداوندی متوجہ ہوتی ہیں اور جب بندہ سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ پاک ہر ہر آیت کا جواب دیتے ہیں۔ اور جب بندہ روگردانی کرتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ کرم الٰہی سے محروم کردیا جاتا ہے، بلکہ اعراض کی وجہ سے وہ سزا کا بھی مستحق ہوتا ہے (مگر نماز اس اعراض اور بے توجہی سے بھی فاسد نہیں ہوتی)

دسویں روایت: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''نماز میں چھینکنا، اونگھنا اور جمائی لینا۔ اور حیض، قئی اور نکسیر شیطانی حرکتیں ہیں'' یعنی یہ (پہلی تین چیزیں) نماز کی حقیقت اور اس کے معنی کے منافی ہیں۔ کیونکہ اعضاء کا خضوع اور دل کی حضوری باقی نہیں رہتی (تاہم ان تینوں امور سے نماز باطل نہیں ہوتی) (اور حیض وغیرہ کا ذکر تبعاً آیا ہے)

اور رہا امر اول —— یعنی جن امور سے نماز باطل ہوجاتی ہے —— تو اس سلسلہ میں قاعدہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے نماز میں کچھ کام کئے ہیں بیانِ جواز کے لئے اور کچھ کاموں کو آپؐ نے برقرار رکھا ہے: یہ سب امور اور جو ان سے کم ہیں وہ نماز کو باطل نہیں کرتے۔ اور جائزہ لینے سے ایسے امور درج ذیل ہیں:

① —— معمولی بات —— جیسے کسی سے تین بار أَلْعَنُكَ بلعنة الله کہنا یعنی خدا کی تجھ پر پھٹکار! اور کسی سے یرحمُك الله کہنا۔ اور واثُكْلَ أُمِّيَاهُ کہنا یعنی مجھے میری ماں گم کرے! اور ماشأنكم تنظرون إليَّ کہنا یعنی کیا بات

ہے، میری طرف کیوں دیکھتے ہو! ــــ پہلے جملہ میں آنحضرت ﷺ نے نماز میں شیطان کو پھٹکارا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۰۱۲) اور باقی تینوں جملے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں آئے ہیں (مشکوٰۃ ۹۷۸)

(۲) ــــ تھوڑا پکڑنا ــــ جیسے بچی کو کندھے سے اتارنا اور کندھے پر بٹھانا۔ متفق علیہ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے اپنی نواسی اُمامہ کو کندھے پر بٹھا کر نماز پڑھائی۔ جب رکوع فرماتے تو نیچے اتار دیتے، اور جب سجدے سے اگلی رکعت کے لئے کھڑے ہوتے تو دوبارہ کندھے پر بٹھا لیتے ــــ اور جیسے نماز میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا پیر ٹھونکنا (مشکوٰۃ حدیث ۷۸۶ باب السترۃ) ــــ اور جیسے نفل نماز پڑھتے ہوئے دروازہ کھول دینا۔

(۳) ــــ تھوڑا چلنا ــــ جیسے منبر کی سیڑھیوں سے نیچے اترنا، نیچے سجدہ کرنا، پھر منبر پر چڑھنا (بخاری حدیث ۳۷۷ مشکوٰۃ حدیث ۱۱۱۳ باب الموقف) اور جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نماز میں امام کی جگہ سے پیچھے صف میں آجانا (بخاری حدیث ۶۸۴ کتاب الأذان) اور جیسے قبلہ کی جانب آپ ﷺ کا دروازہ کھولنے کے لئے چلنا۔

(۴) ــــ اللہ کے ڈر سے رونا ــــ آپ ﷺ جب تہجد پڑھتے تھے تو سینہ سے دیگ کی سنسناہٹ کی طرح آواز نکلتی تھی۔

(۵) ــــ ایسا اشارہ کرنا جو سمجھ لیا جائے ــــ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ قبا تشریف لے گئے۔ اور مسجد میں نماز پڑھنے لگے۔ لوگوں کو اطلاع ہوئی تو مسجد میں جمع ہونے لگے، جو آتا وہ سلام کرتا، تو آپؐ ہاتھ کے اشارہ سے سلام کا جوب دیتے تھے۔

(۶) ــــ نماز میں سانپ بچھو کو مارنا ــــ آپؐ نے حکم دیا ہے کہ نماز میں دو کالوں کو یعنی سانپ اور بچھو کو مار ڈالو۔

(۷) ــــ گردن گھمائے بغیر دائیں بائیں دیکھنا ــــ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نماز میں دائیں بائیں دیکھا کرتے تھے، اور پیٹھ کے پیچھے اپنی گردن نہیں موڑا کرتے تھے۔

(۸) ــــ بدن پر یا کپڑے پر ناپاکی ہو، اور وہ نمازی کے فعل سے نہ ہو، اور نہ نمازی کو اس کا علم ہو تو نماز فاسد نہیں ہوگی ــــ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ صحابہ کے ساتھ چپل پہنے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ اچانک نماز میں آپؐ نے چپل نکال دی۔ صحابہ نے بھی آپؐ کو دیکھ کر نکال دی۔ نماز کے بعد آپؐ نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے چپلیں کیوں نکال دیں۔ صحابہ نے آپؐ کے فعل کا حوالہ دیا۔ آپؐ نے فرمایا: مجھے جبرئیل نے اطلاع دی تھی کہ چپلوں میں نجاست ہے (رواہ ابوداؤد) اگر علم نہ ہونے کی صورت میں بھی طہارت شرط ہوتی تو نماز ازسرِنو پڑھنا ضروری تھا۔

نوٹ: اس عنوان کے تحت جن روایتوں کا حوالہ نہیں دیا گیا، وہ مشکوٰۃ شریف **باب مالایجوز من العمل فی الصلاۃ، وما یُباح منه** میں ہیں۔

فائدہ: (۱) حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے نزدیک کلام کثیر مُفسد نماز ہے، کلام قلیل مفسد نہیں۔ مگر روایات سے

مطلق کلام کا، خواہ قلیل ہو یا کثیر، مفسد نماز ہونا ثابت ہوتا ہے۔ وہ روایتیں تین ہیں:

پہلی روایت: حضرت معاویہ بن الحکم سُلَمی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ جس کو شاہ صاحب نے بھی پیش کیا ہے اس میں جو ارشادِ نبوی ہے: إن هذه الصلاةَ لايصلُح فيها شيئٌ من كلام الناس اس سے مطلقاً کلام کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اور شاہ صاحب نے جو استدلال کیا ہے کہ اگر مطلقاً کلام مفسد نماز ہوتا تو آپؐ ان کو نماز لوٹانے کا حکم دیتے۔ یہ استدلال تام نہیں۔ کیونکہ اعادہ نہ کروانا بھی ثابت نہیں۔ پس احتمال ہے کہ اعادہ کروایا ہو۔ اور عدمِ ذکر عدمِ شی کو مستلزم نہیں۔ اور اگر مان لیں کہ اعادہ نہیں کروایا تو یہ تشریع کے وقت کی ترخیص بھی ہوسکتی ہے یعنی چونکہ وہ ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں اس لئے ان کی غلطی سے درگذر کیا گیا اور ان کو صرف مسئلہ بتادیا۔

دوسری روایت: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے۔ شاہ صاحب نے بھی اس کو پیش کیا ہے۔ اور إن في الصلاة لَشُغلا سے یہ استدلال کیا ہے کہ نماز میں جواب دینا تو جائز تھا مگر نماز کی مشغولیت مانع بنی۔ یہ استدلال ابوداؤد اور نسائی کی روایت کی روشنی میں درست نہیں۔ ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: إن الله يُحدِثُ من أمره مايشاء، وإن مما أحدث أن لايتكلموا في الصلاة (مشکوۃ حدیث ۹۸۹) یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں اپنے دین میں نئے احکام بھیجتے ہیں۔ اور اللہ نے جو نئے احکام بھیجے ہیں ان میں سے یہ ہے کہ تم نماز میں بات نہ کرو۔ اس روایت کی روشنی میں متفق علیہ روایت کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں جو تلاوت، تسبیح و تکبیر وغیرہ کا شغل ہے، وہ آدمیوں کے کلام سے مانع ہے۔ اور نماز میں سلام کا جواب دینا یا کوئی دوسرا کلام کرنا حرام ہے (ابوداؤد حدیث ۹۲۴ نسائی ۳: ۱۹ باب الكلام في الصلاة)

تیسری روایت: ابن ماجہ کے علاوہ پوری جماعت نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ پہلے لوگ نماز میں بات چیت کرلیا کرتے تھے یہاں تک کہ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۸ نازل ہوئی یعنی ﴿ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ تو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور کلام سے روک دیا گیا (بخاری حدیث ۴۵۳۴ ابوداؤد حدیث ۹۴۹)

یہ تینوں روایات محکم ہیں۔ اور ذوالیدین کی روایت محتمل ہے۔ ممکن ہے وہ نسخ کلام سے پہلے کا واقعہ ہو۔ پس عمل انہی محکم روایات پر ہونا چاہئے۔

فائدہ: (۲) رہا عمل کا معاملہ تو اس سلسلہ میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے: جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ نماز میں عمل کی مطلقاً گنجائش نہیں اور عقلاً بھی یہ بات ممکن نہیں، پس کچھ عمل کی تو گنجائش ہوگی۔ البتہ عملِ کثیر سے نماز باطل ہوجائے گی۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے بھی فرمایا ہے۔ مگر عمل کثیر کا اندازہ شاہ صاحب نے منفی پہلو سے لگایا ہے کہ یہ اور یہ صورتیں عملِ کثیر نہیں ہیں۔ مگر یہ بات مفید مطلب نہیں۔ بلکہ مثبت پہلو سے اس کا کوئی اندازہ ٹھہرانا ضروری ہے یعنی عمل کثیر کی تحدید وتعیین ضروری ہے، تا کہ لوگ اس پر عمل پیرا ہوسکیں۔ مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ایسا کوئی اندازہ پیش نہیں کیا۔ اور فقہاء بھی کسی ایک بات پر متفق نہیں۔ اس لئے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ رائے مبتلی بہ پر چھوڑ دیا جائے۔ جس نے نماز میں

کوئی عمل کیا ہے، وہ خود غور کرے، اگر اس کے خیال میں زیادہ عمل ہے تو نماز از سر نو پڑھے، ورنہ پڑھتا رہے۔ مثلاً نماز میں بچھو سامنے آگیا اور اتفاقاً چپل وغیرہ کوئی چیز بھی قریب تھی۔ اس نے بچھو کو اس سے دبا دیا تو یہ عمل قلیل ہے۔ اور سانپ نظر آیا۔ وہ دوڑ کر لاٹھی لایا۔ اور بھاگ کر اس کو مار دیا تو ظاہر ہے کہ یہ عمل کثیر ہے۔ اور حدیث میں: سانپ بچھو کو نماز میں مار ڈالنے کا حکم ہے یعنی ان کو جانے نہ دیا جائے، تاکہ وہ ضرر نہ پہنچائیں۔ پس اس حدیث سے یہ مسئلہ تو اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ضرر کثیر سے بچنے کے لئے نماز توڑنا جائز ہے۔ مگر یہ بات ثابت کرنا کہ خواہ کتنا ہی عمل سانپ مارنے میں ہوا ہو، نماز باقی رہے گی: یہ بات منشأ حدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

فائدہ: (۳) نماز میں کلام اور عمل کی روایات کو پڑھتے وقت دو باتیں ضرور پیش نظر رکھنی چاہئیں:

پہلی بات: یہ کہ نماز کی موجودہ ہیئت شروع ہی سے اس طرح نہیں ہے۔ نماز کی ہیئت میں بہت سی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں۔ ابوداؤد شریف میں: نماز میں تین تبدیلیوں کا تذکرہ ہے۔ اور پہلے کلام کی اجازت پھر ممانعت کی حضرت زید بن ارقم کی روایت ابھی گذری ہے۔ اور اس سلسلہ میں بعض امور میں اختلاف بھی ہوا ہے مثلاً: رفع یدین نماز میں سب جگہ سے ختم کر دیا گیا ہے یا دو جگہ باقی ہے۔ غرض یہ سب روایات نماز کی ہیئت میں تبدیلی پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں۔

دوسری بات: جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے وہ ایک دم مسائل سے واقف نہیں ہو جاتے تھے۔ اس لئے بعض امور میں چشم پوشی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ پس اس سلسلہ کی ہر روایت کو حکم شرعی خیال کرنا درست نہیں ہے واللہ اعلم

﴿ مالایجوز فی الصلاة، وسجودُ السهو والتلاوة ﴾

واعلم: أن مبنى الصلاة على خشوع الأطراف، وحضورِ القلب، وكفِّ اللسان، إلا عن ذكر الله وقراءة القرآن: فكلُّ هيئةٍ بَايَنَتِ الخشوعَ، وكل كلمةٍ ليست بذكر الله، فإن ذلك ينافى الصلاةَ، لاتَتِمُّ الصلاةُ إلا بتركه، والكفِّ عنه؛ لكنَّ هذه الاشياءَ متفاوتةٌ، وما كلُّ نقصانٍ يُبطل الصلاةَ بالكلية، والتميزُ بين ما يُبطلها بالكليه وبين ما يَنْقُصُها فى الجملة: تشريعٌ، موكولٌ إلى نصِّ الشارع، وللفقهاء فى ذلك كلام كثير، وتطبيقُ الأحاديثِ الصحيحةِ عليه عسير، وأوفقُ المذهب بالحديث فى هذا الباب أوسعُها، ولاشك أن الفعل الكثير الذى يتبدل به المجلسُ، والقولَ الكثير الذى يُستكثر جدًا ناقضٌ.

فمن الثانى:

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "إن هذه الصلاةَ لايصلُح فيها شيئٌ من كلام الناس، إنما هى التسبيح، والتكبير، وقراءة القرآن"

[۲] وتعليلُه صلى الله عليه وسلم تركَ ردِّ السلام بقوله:" إن فى الصلاة لَشُغلا"

[۳] وقوله صلى الله عليه وسلم فى الرجل يُسَوِّى التراب حيث يسجد:" إن كنتَ فاعلاً فواحدةً"

[٤] ونهيُه صلى الله عليه وسلم عن الخَصْر، وهووضعُ اليد على الخاصرة، فإنه راحةُ أهل النار يعنى هيئةَ أهل البلاء المتحيرين المدهوشين.

[٥] وعن الالتفات، فإنه اختلاس، يَختلِسه الشيطانُ من صلاة العبد، يعنى: ينقص الصلاةَ، وينافى كمالَه.

[٦] وقوله صلى الله عليه وسلم:" إذا تثاء ب أحدكم فى الصلاة فليكظِم ما استطاع، فإن الشيطان يدخل فى فيه"

أقول: يريد أن التثاؤب مظِنَّة لدخول ذباب أو نحوه: مما يشوِّش خاطره، ويصدُّه عما هو بسبيله.

[۷-۹] وقوله صلى الله عليه وسلم:" إذا قام أحدكم إلى الصلاة فلا يمسح الحصى، فإن الرحمةَ تواجِهُه" وقوله صلى الله عليه وسلم:" لايزال اللّٰه تعالى مُقبلاً على العبد، وهو فى صلاته، مالم يلتفت، فإذا التفت أعرض عنه" وكذا ما ورد من إجابة الله للعبد فى الصلاة.

أقول: هذا إشارة إلى أن جُود الحقِ عامٌّ فائضٌ، وإنه إنما تتفاوتُ النفوسُ فيما بينها باستعدادها الجبليِّ أو الكسْبى، فإذا توجَّه إلى الله فُتح بابٌ من جُوده، وإذا أعرض حُرِمَه، بل استحق العقوبة بإعراضه.

[۱۰] قوله صلى الله عليه وسلم:" العُطاس، والنُعاس، والتثاؤبُ فى الصلاة، والحيضُ، والقيئُ، والرعافُ من الشيطان"

أقول: يريد أنها منافيةٌ لمعنى الصلاة، ومبناها.

وأما الأول: فإن النبى صلى الله عليه وسلم قد فعل أشياءَ فى الصلاة بيانًا للشرع، وقرّر على أشياء، فذلك وما دونه لايُبطل الصلاة، والحاصل من الاستقراء أن:

[۱] القولَ اليسير، مثلُ: ألعنك بلعنة الله— ثلاثا— ويرحمك الله، ووَا ثُكْلَ أُمِّيَاهْ، وماشأنكم تنظرون إلىّ.

[۲] والبطش اليسير، مثل: وضع صَبِيَّته من العاتق، ورفعها، وغَمْزِ الرِّجل، ومثل: فتح الباب.

[۳] والمشى اليسير، كالنزول من دَرَج المنبر إلى مكان، ليتأتَّى منه السجودُ فى أصل المنبر، والتأخُّرِ من موضع الإمام إلى الصف، والتقدُّم إلى الباب المقابل ليفتح.

[٤] والبكاءَ، خوفًا من الله.

[٥] والإشارةَ المُفهِمةَ.

[٦] وقتلَ الحية والعقرب.

[٧] واللَّحظَ يمينا وشمالاً من غير لَيِّ العنق ــــــ: لاتُفسد.

[٨] وأن تعلق القَذر بجسده، أو ثوبه، إذا لم يكن بفعله، أو كان لايعلمُه: لايُفسد، هذا، والله أعلم بحقيقة الحال.

ترجمہ: وہ امور جونماز میں ناجائز ہیں، اور سجود سہو وتلاوت: اور جان لیں کہ نماز کا مدار: اعضاء کے عاجزی کرنے پر، اور دل کی حضوری پر، اور زبان کے روکنے پر ہے، مگر اللہ کے ذکر اور قرآن کے پڑھنے سے۔ پس ہر وہ حالت جو خشوع سے مبائن ہے، اور ہر وہ بات جو ذکرِ خداوندی نہیں ہے: پس بیشک وہ نماز کے منافی ہے۔ نماز تام نہیں ہوتی مگر اس کو چھوڑنے سے، اور اس سے باز رہنے سے۔ لیکن یہ چیزیں متفاوت ہیں۔ اور ہر کی نماز کو بالکلیہ باطل نہیں کرتی۔ اور امتیاز کرنا اُن چیزوں کے درمیان جو نماز کو بالکلیہ باطل کردیتی ہیں، اور ان چیزوں کے درمیان جو نماز کو کسی درجہ میں ناقص کرتی ہیں: قانون سازی ہے۔ شارع کی صراحت کی طرف سپرد کی ہوئی ہے۔ اور فقہاء کا اس سلسلہ میں بہت کلام ہے۔ اور صحیح حدیثوں کا اس پر انطباق دشوار ہے۔ اور مذاہب فقہیہ میں سے حدیث سے زیادہ ہم آہنگ اس باب میں وہ مذہب ہے جس میں سب سے زیادہ گنجائش ہے (شاہ صاحب کی مراد امام احمد رحمہ اللہ کا مسلک ہے) اور اس میں شک نہیں کہ وہ فعلِ کثیر جس کی وجہ سے مجلس بدل جائے، اور وہ قولِ کثیر جو بہت ہی زیادہ سمجھا جائے: نماز کو توڑ دیتا ہے۔

پس ثانی (یعنی جو امور نماز کو کسی درجہ میں ناقص کرتے ہیں) سے: (۱) آنحضرت (ترجمہ آگیا) (۲) اور آنحضرت ﷺ کا وجہ بیان کرنا ہے سلام کا جواب نہ دینے کی اپنے ارشاد سے: ''بیشک نماز میں البتہ مشغولیت ہے'' (۳) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد اس شخص کے حق میں جو مٹی ٹھیک کرے جہاں اس کو سجدہ کرنا ہے کہ: ''اگر تو کرنے والا ہے تو ایک مرتبہ کر'' (۴) اور آپؐ کا خَصر سے منع کرنا ہے اور خَصر: پہلو پر ہاتھ رکھنا ہے۔ پس بیشک وہ دوزخیوں کی راحت ہے یعنی مصیبت زدہ حیران ومتحیر لوگوں کی ہیئت ہے (۵) اور جھانکنے سے (منع کرنا ہے) پس بیشک وہ ربودگی ہے۔ اُچک لیتا ہے اس کو شیطان بندے کی نماز سے یعنی یہ چیز نماز کو ناقص کرتی ہے۔ اور نماز کے کمال کے منافی ہے (٦) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد (ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں: آپؐ ارادہ فرماتے ہیں کہ جمائی لینا احتمالی جگہ ہے مکھی یا اس کے مانند کے داخل ہونے کے لئے: ان چیزوں میں سے جو اس کے دل کو پراگندہ کردیں، اور اس کو اس چیز سے روک دیں جس کے وہ درپے ہے۔

(۷ تا ۹) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد:...... اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد:...... اور اسی طرح وہ بات جو آئی ہے

یعنی اللہ تعالیٰ کا بندے کو نماز میں جواب دینا۔ میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے اس طرف کہ کرم خداوندی کا فیضان عام ہے۔ اور بیشک شان یہ ہے کہ نفوس میں باہم تفاوت ان کی فطری یا اکتسابی استعداد ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس جب بندہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے لئے کرم خداوندی کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ اور جب وہ روگردانی کرتا ہے، تو وہ اس سے محروم کردیا جاتا ہے۔ بلکہ سزا کا مستحق ہوتا ہے اس کے اعراض کرنے کی وجہ سے۔ (۱۰) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد:...... میں کہتا ہوں: آپؐ مراد لے رہے ہیں کہ یہ چیزیں نماز کی حقیقت اور اس کی بنیاد کی منافی ہیں۔

اور رہی **پہلی بات** —— یعنی جو امور نماز کو بالکلیہ باطل کرتے ہیں —— پس بیشک نبی ﷺ نے نماز میں کچھ کام کئے ہیں، احکام کی وضاحت کرنے کے لئے۔ اور کچھ چیزوں کو برقرار رکھا ہے، پس یہ اور وہ چیزیں جو اس سے کم ہیں: نماز کو باطل نہیں کرتیں۔ اور جائزہ لینے سے یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں: (۱) تھوڑی بات جیسے پھٹکارتا ہوں میں تجھ کو اللہ کی پھٹکار سے —تین مرتبہ— اور تجھ پر اللہ تعالیٰ مہربانی کریں۔ اور ہائے میری ماں کا بچے کو گم کرنا۔ اور تمہارا کیا معاملہ ہے کہ تم دیکھتے ہو میری طرف (۲) اور تھوڑا پکڑنا، جیسے آپؐ کا اپنی بچی کو کندھے سے اتارنا اور اس کو اٹھانا۔ اور پاؤں ٹھوکنا۔ اور جیسے دروازہ کھولنا (۳) اور تھوڑا چلنا۔ جیسے منبر کی سیڑھیوں سے اترنا ایسی جگہ کی طرف کہ حاصل ہوسکے وہاں سجدہ منبر کی جڑ میں۔ اور امام کی جگہ سے صف کی طرف پیچھے ہٹ آنا۔ اور سامنے کے دروازہ کی طرف پیش قدمی کرنا تاکہ آپؐ اُسے کھولیں۔ (۴) اور رونا خوفِ خداوندی سے (۵) اور سمجھانے والا اشارہ کرنا (۶) اور سانپ اور بچھو کو مارنا (۷) اور دائیں بائیں گوشۂ چشم سے دیکھنا، گردن موڑے بغیر —— یہ سب چیزیں نماز کو فاسد نہیں کرتیں (۸) اور یہ کہ ناپاکی کا لگنا نمازی کے جسم یا اس کے کپڑے سے۔ جبکہ نہ ہو وہ اس کے عمل سے، یا نہ جانتا ہو وہ اس کو، تو وہ نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ یہ وہ بات ہے جو میرے پاس ہے۔ اور حقیقت حال کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

فصل اول

سجدۂ سہو کی حکمت

سہو: کے معنی ہیں: غفلت۔ نمازی سے کبھی غفلت ہوجاتی ہے۔ اور نماز میں کوئی کام چھوٹ جاتا ہے یا بڑھ جاتا ہے۔ پس اگر نماز کا کوئی رکن چھوٹ جائے تو اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ نماز ازسرِنو پڑھنی ضروری ہے۔ اور سنت یا مستحب کے درجہ کی کوئی چیز چھوٹ جائے تو تلافی کی ضرورت نہیں۔ نماز ہوجاتی ہے، گو ناقص ہوتی ہے۔ البتہ اگر واجب کے درجہ کی کوئی چیز چھوٹ جائے یا اسی درجہ کی یا رکن کے درجہ کی کوئی چیز بڑھ جائے تو شریعت نے اس کی تلافی

کے لئے سجدۂ سہو مشروع کیا ہے۔اور سجدۂ سہو کی حکمت یہ ہے کہ اس سے تلافی مافات ہو جاتی ہے۔پس اس میں قضا کی بھی مشابہت ہے اور کفارہ کی بھی۔یعنی سجدۂ سہو فوت شدہ کا عوض بھی ہے اور اس سے کوتاہی کا گناہ بھی دُھل جاتا ہے۔

فائدہ: تبلیغ رسالت سے جن اقوال وافعال کا تعلق ہے، ان میں نبی ﷺ سے بھول نہیں ہوسکتی۔البتہ جن اقوال وافعال کا تعلق عبادت کی ادائیگی سے ہے ان میں بھول ہوسکتی ہے۔بخاری شریف کی روایت ہے: ایک مرتبہ آپؐ سے نماز میں بھول ہوگئی۔نماز کے بعد آپؐ نے فرمایا: إنما أنا بشر مثلکم، أنسیٰ کما تنسون فإذا نسیتُ فذکرونی یعنی میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔جس طرح تمہیں بھول لگتی ہے مجھے بھی لگتی ہے۔پس اگر مجھ سے نماز میں کوئی بھول ہو جائے تو بتلا دیا کرو اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اس سے بھی لوگ مسائل سیکھتے ہیں یعنی یہ بھی تشریع احکام کی ایک صورت ہے۔

بھول کی چار صورتیں اور ان کے احکام

پہلی صورت: اگر رکعتوں کی تعداد میں شک ہو جائے تو شک دور کرلے۔اور اس کی صورت یہ ہے کہ تحری کرے یعنی سوچے، اور جو غالب گمان قائم ہو اس پر عمل کرے۔اور ظن غالب قائم نہ ہو تو کم تعداد کا اعتبار کرے، کیونکہ وہ یقینی ہے۔ اور اس کے مطابق نماز پوری کرے۔اور آخر میں سجدۂ سہو کرے۔اس صورت کے بارے میں دو روایتیں ہیں:

حدیث ــــــ بخاری شریف (حدیث ۴۰۱) میں روایت ہے: إذا شک أحدکم فی صلاتہ فَلْیَتَحَرَّ الصوابَ، فَلْیُتِمَّ علیہ، ثم یسلِّم، ثم یسجد سجدتین یعنی جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو جائے تو چاہئے کہ وہ درست بات سوچے، پس چاہئے کہ اس کے مطابق نماز پوری کرے۔پھر سلام پھیرے۔پھر دو سجدے کرے (شاہ صاحب نے یہ روایت ذکر نہیں کی)

حدیث ــــــ مسلم شریف میں روایت ہے کہ جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو جائے۔پس اس کو پتہ نہ رہے کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں: تین یا چار؟ تو چاہئے کہ وہ شک دور کرلے۔اور اس تعداد پر مدار رکھے جس کا یقین ہے۔پھر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کرے۔پس اگر اس نے (نفس الامر میں) پانچ رکعتیں پڑھی ہیں، تو وہ شخص ان دو سجدوں سے اس (پانچویں) کو دوگانہ بنالے گا (یعنی یہ خیر میں زیادتی ہوگی) اور اگر (نفس الامر میں) پوری چار پڑھی ہیں تو یہ سجدے شیطان کی ناک رگڑیں گے ــــــ اور یہی حکم ہے رکوع وسجود میں شک ہونے کا۔یعنی شک ہوا کہ ایک سجدہ کیا یا دو؟ تو تحری کرے، اور ظن غالب قائم نہ ہو تو ایک سمجھے اور دوسرا سجدہ کرلے اور آخر میں سجدۂ سہو کرے، تاکہ شیطان ذلیل ہو۔

دوسری صورت: ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھادیں۔نماز کے بعد بتلایا گیا۔تو آپؐ

نے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کئے ـــــ یہی حکم رکن زیادہ کرنے کا ہے۔ مثلاً دو رکوع یا تین سجدے کرڈالے تو آخر میں سجدۂ سہو کرے۔

تیسری صورت: رباعی نماز میں آنحضرت ﷺ نے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا۔ آپؐ سے اس معاملہ میں گفتگو کی گئی تو آپؐ نے باقی نماز پڑھائی اور سجدۂ سہو کیا۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے عصر کی نماز میں تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا۔ آپؐ سے اس معاملہ میں گفتگو کی گئی، تو آپؐ نے باقی رکعت پڑھائی اور آخر میں سجدہ کیا ـــــ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی حکم ہر اس کام کو سہواً کرنے کا ہے جس کو عمداً کرنے سے نماز باطل ہوجاتی ہے یعنی نماز میں سہواً کلام وغیرہ کوئی عمل کرنا نماز کو باطل نہیں کرتا۔ کیونکہ اس تیسری صورت میں مذکور دونوں واقعوں میں کلام وغیرہ کے بعد آپؐ نے باقی نماز پوری کی ہے۔ پھر سجدۂ سہو کیا ہے (مگر یہ استدلال اس وقت تام ہوسکتا ہے جب یہ بات ثابت ہوجائے کہ یہ واقعات تحریم کلام کے بعد کے ہیں)

چوتھی صورت: ایک مرتبہ آپؐ نے بھول کر قعدۂ اولیٰ چھوڑ دیا، تو آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کیا ـــــ یہی حکم اس صورت کا ہے کہ قعدہ تو کیا مگر تشہد بھول گیا۔ کچھ اور پڑھ لیا۔ مثلاً سورۂ فاتحہ پڑھ کر اٹھ گیا تو آخر میں سجدۂ سہو کرے۔

اگر پہلا قعدہ بھول کر کھڑا ہونے لگے تو کیا حکم ہے؟

حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر امام پہلا قعدہ بھول کر کھڑا ہونے لگے تو اگر سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے یاد آجائے تو بیٹھ جائے۔ اور اگر سیدھا کھڑا ہوگیا پھر یاد آیا تو نہ بیٹھے، اور آخر میں سجدۂ سہو کرے''

تشریح: (۱) سیدھے کھڑے ہونے کے بعد بیٹھنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ قعدہ کا محل فوت ہوگیا۔ وہ اگلے رکن میں پہنچ گیا۔ اس لئے رجعتِ قہقری جائز نہیں۔ لیکن اگر بیٹھ گیا تو بعض کتابوں میں مثلاً مظاہر حق میں لکھا ہے کہ نماز باطل ہوجائے گی۔ یہ صحیح نہیں۔ مفتی بہ قول یہ ہے کہ اس نے برا کیا اور سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ نماز باطل نہیں ہوگی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔

(۲) اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جو کھڑا ہونے سے قریب ہوگیا، مگر ابھی سیدھا کھڑا نہیں ہوا۔ اور یاد آگیا تو بیٹھ جائے اور اس پر سجدۂ سہو نہیں، یہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے ہے۔ فقہاء کی رائے اس کے خلاف ہے۔ فقہ کی کتابوں میں یہ ہے کہ جو کھڑا ہونے کے قریب ہوگیا وہ گویا کھڑا ہوگیا۔ اب اس کو بیٹھنا نہیں چاہئے۔ اگر بیٹھ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

نوٹ: اس باب کی تمام روایات مشکوۃ شریف باب السہو میں ہیں۔

وَسَنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فيما إذا قصَّر الإنسان في صلاته: "أن يسجد سجدتين، تداركًا لما فرَّط، ففيه شِبْهُ القضاء، وشِبْهُ الكفارة.

والمواضع التي ظهر فيها النصُّ أربعةٌ:

الأول: قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا شك أحدكم في صلاته، ولم يدرِ: كم صلّى: ثلاثًا أو أربعًا؟ فليطرحِ الشك، وليَبْنِ على ما استيقن، ثم يسجد سجدتين قبلَ أن يسلِّم، فإن كان صلّى خمسًا شفَعَها بهاتين السجدتين، وإن كان صلّى تمامًا لأربع، كانتا ترغيمًا للشيطان" أي: زيادةٌ في الخير، وفي معناه: الشكُّ في الركوع والسجود.

الثاني: أنه صلى الله عليه وسلم صلّى الظهر خمسًا، فسجد سجدتين بعد ما سلّم، وفي معنى زيادة الركعة زيادةُ الركن.

الثالث: أنه صلى الله عليه وسلم سلّم في ركعتين، فقيل له في ذلك، فصلّى ما ترك، ثم سجد سجدتين، وايضًا: رُوِى أنه سلّم، وقد بقي عليه ركعة بمثله، وفي معناه: أن يفعلَ سهوًا ما يُبطل عَمْدُه.

الرابع: أنه صلى الله عليه وسلم قام في الركعتين، لم يجلس، حتى إذا قضى الصلاة سجد سجدتين قبل أن يسلِّم، وفي معناه: تركُ التشهد في القعود.

قوله: صلّى الله عليه وسلم: "إذا قام الإمام في الركعتين، فإن ذكر قبل أن يستوى قائمًا فليجلس، وإن استوى قائمًا، فلايجلسْ، ويسجد سجدتي السهو"

أقول: وذلك: أنه إذا قام فات موضعه، فإن رجع لا أَحْكُمُ ببطلان صلاته، وفي الحديث دليلٌ على أن من كان قريبَ الاستواء، ولَمَّا يَسْتَوِ، فإنه يجلس خلافًا لما عليه العامة.

ترجمہ: اور طریقہ جاری کیا رسول اللہ ﷺ نے اُس صورت میں جبکہ انسان اپنی نماز میں کوتاہی کرے کہ وہ دوسجدے کرے، اُس کوتاہی کی تلافی کے طور پر جو اس سے سرزد ہوئی۔ پس سجدۂ سہو میں قضا کی مشابہت ہے اور کفارہ کی مشابہت ہے۔

اور وہ جگہیں جن میں نص ظاہر ہوئی ہے چار ہیں:

اول: آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو، اور وہ نہ جانے کہ کتنی نماز پڑھی: تین رکعتیں یا چار؟ تو چاہئے کہ شک کو پھینک دے یعنی دور کردے اور چاہئے کہ بنا کرے اس پر جس کا اسے یقین ہے۔ پھر سلام پھیرنے سے پہلے دوسجدے کرے۔ پس اگر اس نے پانچ پڑھی ہیں تو جفت بنائے وہ اس (پانچویں) کو ان دو سجدوں کے ذریعہ۔ اور اگر اس نے پوری چار پڑھی ہیں تو یہ دوسجدے شیطان کو ذلیل کرنے کے طور پر ہوں گے'' یعنی

خیر میں زیادتی ہوں گے (یہ جفت بنانے کا مطلب بیان کیا ہے) اور اس کے معنی میں ہے رکوع وسجود میں شک کرنا۔
دوم: یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھیں تو سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کئے۔ اور رکعت زیادہ کرنے کے حکم میں رکن کو زائد کرنا ہے۔ سوم: یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا۔ پس آپؐ سے اُس بارے میں گفتگو کی گئی، تو آپؐ نے وہ رکعتیں پڑھیں جو چھوڑی تھیں، پھر دو سجدے کئے۔ اور نیز: روایت کیا گیا ہے کہ آپؐ نے سلام پھیر دیا۔ حالانکہ آپؐ کی ایک رکعت باقی تھی: اس کے (اوپر والی روایت کے) مانند۔ اور اس کے حکم میں یہ بات ہے کہ بھول سے کرے وہ کام جس کا عمداً کرنا نماز کو باطل کرتا ہے۔ چہارم: یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دو رکعتوں پر کھڑے ہوگئے۔ آپؐ بیٹھے نہیں۔ یہاں تک کہ جب نماز پوری کی تو سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کئے۔ اور اس کے حکم میں ہے قعدہ میں تشہد چھوڑنا۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد:...... میں کہتا ہوں: اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ کھڑا ہوگیا تو اس نے قعدہ کی جگہ فوت کر دی۔ پس اگر وہ لوٹا تو میں اس کی نماز کے بطلان کا حکم نہیں لگاتا۔ اور حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ جو کھڑے ہونے سے قریب ہوگیا، اور اب تک سیدھا کھڑا نہیں ہوا، تو وہ بیٹھ جائے، برخلاف اس قول کے جس پر عام لوگ (یعنی عام فقہاء) ہیں۔

☆ ☆ ☆

فصل دوم

سجودِ تلاوت کا بیان

سجدۂ تلاوت کی حکمت: آنحضرت ﷺ نے یہ طریقہ جاری کیا ہے کہ جب کوئی شخص ایسی آیت پڑھے جس میں سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یا سجدہ کرنے کا ثواب بیان کیا گیا ہے، یا سجدہ کرنے سے انکار کرنے والے کے لئے سزا بیان کی گئی ہے، تو پروردگار کے کلام کی تعظیم بجالاتے ہوئے اور خیر کے کام کی طرف سبقت کرتے ہوئے سجدہ کرے۔

فائدہ: سجدوں کی آیات میں پانچ طرح کے مضامین ہیں:

(۱) —— انسانوں کو ملائکہ کا حال سنایا گیا ہے کہ وہ اللہ کے اطاعت شعار بندے ہیں۔ بندگی سے تکبر نہیں کرتے۔ ہر وقت پاکی بیان کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں، پروردگار سے ڈرتے ہیں اور جو بھی حکم دیا جاتا ہے، بجالاتے ہیں (سورۃ الاعراف ۲۰۶ اور سورۃ النحل ۵۰)

(۲) —— آسمان وزمین کا ذرہ ذرہ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہے، مگر بہت سے انسان انکار کرتے ہیں، اس لئے ان پر عذاب ثابت ہوگیا (الرعد ۱۵ الحج ۱۸)

(۳)ـــــ انبیاء اور مؤمنین خدا کو سجدہ کرتے ہیں، روتے ہیں اور اللہ کی آیتیں سن کر ان کا خشوع بڑھ جاتا ہے (بنی اسرائیل ۱۰۹ امریم ۵۸ السجدہ ۱۵)

(۴)ـــــ کفار سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہیں، (الفرقان ۶۰ الانشقاق ۲۱)

(۵)ـــــ سجدہ صرف اللہ کو کرو اور سجدہ کر کے اللہ کی نزدیکی حاصل کرو۔ (النمل ۲۶ حم السجدہ ۳۸ النجم ۶۲ العلق ۱۹)

اور سورۂ صؔ میں داؤد علیہ السلام کی آزمائش کا ذکر ہے۔ جب وہ سجدہ میں گر پڑے اور رجوع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش بخش دی۔ اور سورۃ الحج آیت ۷۷ میں مؤمنین سے خطاب ہے کہ رکوع اور سجدہ کیا کرو، اپنے رب کی عبادت کیا کرو اور نیک کام کیا کرو، تاکہ فلاح پاؤ۔

غرض: سجدۂ تلاوت کی حکمت میں خاص طور پر امتثالِ امر اور نیک بندوں کی روش اپنانے کو ذکر کرنا چاہئے۔ عظمتِ کلام کا لحاظ تو ایک عام ادب ہے۔ آیاتِ سجدہ کے ساتھ خاص نہیں۔

سجدہ کی آیات نہیں ہیں: جن آیات میں آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں کے سجدہ کرنے کا اور ابلیس کے انکار کرنے کا تذکرہ ہے، ان میں سجدہ نہیں ہے۔ کیونکہ سجدۂ تلاوت اللہ کی بندگی ہے۔ اور فرشتوں کا سجدہ اظہارِ انقیاد کے لئے تھا۔ پس ان آیات میں سجدہ کرنا آیات کے موضوع کے خلاف ہے۔

سجدوں کی تعداد: روایات میں چودہ یا پندرہ سجدوں کا تذکرہ آیا ہے۔ اور دو باتوں میں اختلاف ہے: (۱) سورۂ صؔ میں سجدہ ہے یا نہیں؟ (۲) اور سورۃ الحج میں ایک سجدہ ہے یا دو؟ ـــــ نسائی شریف میں صحیح سند سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **سجدها داود توبةً، ونسجدها شكرًا** یعنی داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور پر سجدہ کیا تھا۔ اور ہم شکر گزاری کے طور پر سجدہ کرتے ہیں کہ اللہ نے حضرتِ داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی۔ اور بخاری میں بھی دو روایتیں ہیں، جن سے سورۂ ص میں سجدہ کرنا ثابت ہوتا ہے۔ البتہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ سجدہ نہایت مؤکد یعنی واجب نہیں ہے۔ اور جو حضرات سورۂ صؔ میں سجدہ کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس کوئی نص نہیں ہے، صرف قیاس ہے، جس کا جواب نسائی کی مذکورہ روایت میں موجود ہے۔

اور سورۃ الحج میں دو سجدوں کی تمام روایات ضعیف ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے پندرہ سجدے پڑھائے ان میں سے تین مفصلات میں ہیں۔ اور سورۃ الحج میں دو سجدے ہیں۔ یہ ابو داؤد (حدیث ۱۴۰۱) اور ابن ماجہ (حدیث ۱۰۵۷) کی روایت ہے۔ اس کی سند میں عبداللہ بن مُنَین ضعیف راوی ہے۔ دوسری روایت حضرت عقبہ بن عامرؓ کی ہے انھوں نے عرض کیا کہ سورۂ حج کو یہ برتری حاصل ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''ہاں، اور جو ان کو نہ کرے وہ ان کو نہ پڑھے'' یہ ترمذی (۱: ۷۵) کی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں البتہ ابو داؤد (حدیث ۱۴۰۲) میں اس کی صحیح سند ہے۔ مگر یہ روایت اس بات میں صریح

نہیں کہ یہ دونوں سجدے تلاوت کے ہیں۔ احتمال ہے کہ حضرت عقبہ کی مراد ایک سجدۂ تلاوت اور دوسرا سجدۂ صلاۃ ہو۔ آیت کا مضمون اس پر صاف دلالت کرتا ہے۔

سجدۂ تلاوت واجب ہے یا سنت؟ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سجودِ تلاوت سنت ہیں۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور شاہ صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہیں۔ ان کی دلیل خود آیاتِ سجدہ کے مضامین ہیں۔ وہ وجوب کے متقاضی ہیں۔ اور کسی صحیح صریح روایت سے آپ ﷺ کا سجدہ کو ترک کرنا ثابت نہیں۔ پس یہ مواظبتِ تامہ بھی وجوب کا قرینہ ہے۔

سجدۂ تلاوت سنت ہونے کی دو دلیلیں:

پہلی دلیل: متفق علیہ روایت ہے: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو سورۃ النجم سنائی تو آپؐ نے اس میں سجدہ نہیں کیا۔ یہ روایت صریح نہیں۔ امام مالک تو فرماتے ہیں کہ مفصلات کے سجدے منسوخ ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ابوداؤد (حدیث ۱۴۱۳) میں ایک ضعیف روایت بھی ہے۔ جس کی سند میں مطر الوراق اور حارث بن عبید اَیادی: دو ضعیف راوی ہیں۔ اور دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ ممکن ہے اس وقت آپؐ کی وضو نہ ہو۔ نیز علی الفور سجدہ واجب بھی نہیں۔

دوسری دلیل: بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں سورۃ النحل کی آیت سجدہ پڑھی تو نیچے اتر کر لوگوں کے ساتھ سجدہ کیا۔ اگلے جمعہ میں پھر خطبہ میں یہی آیت پڑھی تو لوگ سجدہ کرنے کے لئے تیاری کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا: ''یہ سجدے ہم پر لازم نہیں۔ ہم چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں'' شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کی اس بات پر کسی نے نکیر نہیں کی۔ سب نے یہ بات مان لی یعنی سجدوں کی سنیت پر اجماعِ صحابہ ہو گیا۔

مگر علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۷:۱۱۱) میں امام مالک رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی انفرادی رائے تھی۔ کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس مسئلہ میں تائید نہیں کی تھی اور نہ ان کے بعد کسی نے ان کی اس رائے پر عمل کیا (ورُوی عن مالك: أنه قال: إن ذلك مما لم يتبع عليه عمر، ولا عمل به أحد بعده) ایسی بعض آراء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اور بھی تھیں۔ جن کو امت نے نہیں لیا، جیسے حضر میں جنبی کے لئے عذر کے باوجود تیمم کا جائز نہ ہونا ــــــ اور سکوت ہمیشہ اجماع نہیں ہوتا۔ بلکہ جب رضا کے طور پر سکوت ہو تب اجماع سمجھا جاتا ہے۔ اور رضا کا اس واقعہ میں کوئی قرینہ نہیں۔ اور انفرادی آراء کا احترام مکارم اخلاق میں شمار ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کیا بے وضو سجدۂ تلاوت جائز ہے؟ پوری امت کا اتفاق ہے کہ سجدۂ تلاوت کے لئے وضو ضروری ہے، بے

وضو سجدہ کرنا درست نہیں۔' اور امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت کے لئے وضو ضروری نہیں۔ آپ نے اپنی صحیح میں اس کی دو دلیلیں بیان کی ہیں: ایک: یہ کہ حضرت ابن عمرؓ کبھی بے وضو بھی سجدۂ تلاوت کرلیا کرتے تھے۔ دوسری دلیل: ایک حدیث پیش کی ہے جس میں مشرکین کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ حالانکہ مشرکین ناپاک ہیں۔ اس طرح آپ نے اپنی بات ثابت کی ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ اس حدیث کی ایسی شرح کرتے ہیں، جس سے امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال بھی ختم ہوجائے۔ اور غرانیق والے واقعہ کی تردید بھی ہوجائے۔ وہ حدیث یہ ہے:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے ایک مخلوط مجمع میں آپ ﷺ نے سورۃ النجم پڑھی۔ اور سجدہ کیا تو لوگوں میں سے کوئی باقی نہ رہا جس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ آپؐ کے ساتھ مسلمانوں نے، مشرکوں نے، جنات نے اور انسانوں نے سجدہ کیا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکوں نے سجدہ کیوں کیا؟ زنادقہ نے اس کا جواب دینے کے لئے غرانیق کا قصہ گھڑا۔ اور مفسرین نے اس کو اپنی تفسیروں میں جگہ دیدی۔ علامہ عینی نے شرح بخاری (۷:۱۰۱) میں قاضی عیاض رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ کسی صحیح سند سے ثابت نہیں۔ علامہ نے اس قصہ کی اسانید پر بھی مفصل کلام کیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

میرے نزدیک مشرکوں کے سجدہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب آپؐ نے سورۃ النجم پڑھی، تو اس کی بلاغت وفصاحت اور زور بیان کی وجہ سے ایک سماں بندھ گیا۔ اور حق پورے طور پر واضح ہوگیا۔ اور وقتی طور پر کسی کے لئے بھی عاجزی اور تابعداری کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس لئے ہر شخص آپؐ کے ساتھ سجدہ میں گرگیا۔ صرف مکہ کا ایک سیٹھ امیہ بن خلف سجدہ میں شریک نہ ہوا۔ اس نے ذرا سی مٹی لی، پیشانی سے لگائی اور کہا: میرے لئے یہ بس ہے! یعنی ابر کرم برسا مگر وہ محروم رہا۔ کیونکہ اس کے دل پر زنگ سخت جم گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو جلد ہی دنیا میں سزا دی اور وہ میدانِ بدر میں مارا گیا۔ پھر جب لوگوں کو ہوش آیا تو انکار کرنے والوں نے انکار کردیا۔ اور جس کی قسمت نے یاوری کی وہ ایمان پر برقرار رہا۔

سجدۂ تلاوت کے اذکار: اصل ذکر تو وہی سبحان ربی الأعلی ہے۔ مگر روایات میں دو ذکر اور بھی آئے ہیں:

پہلا ذکر: آپؐ تہجد کی نماز میں سجدۂ تلاوت کرتے تو فرماتے: سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ، وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ، بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ (اس ذات کے لئے میرے چہرہ نے سجدہ کیا جس نے اس کو پیدا کیا۔ اور جس نے اس میں سماعت وبصارت کو جلوہ گر کیا، اپنی قدرت اور طاقت سے)

دوسرا ذکر: سورۂ صٓ کے سجدہ میں آپؐ نے یہ ذکر بھی کیا ہے: اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ أَجْرًا، وَضَعْ بِهَا عَنِّيْ وِزْرًا، وَاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا، وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ (اے اللہ! آپ میرے لئے اس سجدہ کی وجہ سے اپنے پاس ثواب لکھئے۔ اور آپ اس کی وجہ سے مجھ سے گناہوں کا بوجھ اتاریے۔ اور آپ اس کو اپنے

پاس میرے لئے ذخیرہ بنایئے۔ اور آپ اس کو میری طرف سے قبول فرمایئے، جس طرح آپ نے اس کو اپنے بندے داؤد کی طرف سے قبول فرمایا)

وَسَنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم لمن قرأ آيةً فيها أمرٌ بالسجود، أو بيانُ ثواب من سجد، وعقابُ من أبى عنه: أن يسجد تعظيمًا لكلام ربه، ومسارعةً إلى الخير؛ وليس منها مواضعُ سجودِ الملائكة لآدم عليه السلام، لأن الكلام فى السجود لله تعالىٰ.

والآياتُ التى ظهر فيها النصُّ: أربع عشرة، أو خمس عشرة. وبيّن عمر رضى الله عنه أنها مستحبةٌ، وليست بواجبة، على راس المنبر. فلم يُنكر السامعون، وسلّموا له، وتأويلُ حديث: " سجد النبى صلى الله عليه وسلم بالنجم، وسجد معه المسلمون، والمشركون، والجنُّ، والإنس " عندى: أن فى ذلك الوقت ظهر الحقُّ ظهورًا بينا، فلم يكن لأحدٍ إلا الخضوعُ والاستسلامُ، فلما رجعوا إلى طبيعتهم كفَرَ من كفر، وأسلم من أسلم، ولم يَقْبَلْ شيخٌ من قريش تلك الغاشيةَ الإلٰهيَّة، لقوة الختم على قلبه، إلا بأن رفع التراب إلى الجبهة، فَعُجِّلَ تعذيبُه: بأن قُتل ببدر.

ومن أذكار سجدة التلاوة: " سجد وجهى للذى خلقه، وشقَّ سمعه وبصره، بحوله وقوّته " ومنها: " اللهم اكتب لى بها عندك أجرًا، وضَعْ بها عنى وِزْرًا، واجعلها لى عندك ذُخراً، وتقبلها منى كما تقبلتها من عبدك داود "

ترجمہ: اور مسنون کیا رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے لئے جو پڑھے کوئی ایسی آیت جس میں سجدہ کرنے کا حکم ہے یا اس شخص کا ثواب بیان کیا گیا ہے جو سجدہ کرتا ہے اور اس شخص کی سزا بیان کی گئی ہے جو سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے کہ وہ سجدہ کرے، اپنے پروردگار کے کلام کی تعظیم بجالاتے ہوئے اور خیر کی طرف سبقت کرتے ہوئے۔ اور نہیں ہیں ان میں سے فرشتوں کے سجدہ کرنے کی جگہیں آدم علیہ السلام کے لئے۔ اس لئے کہ گفتگو اللہ تعالیٰ کے لئے سجدوں میں ہے۔

اور وہ آیتیں (یعنی وہ سجدے) جن میں نص ظاہر ہوئی ہے چودہ یا پندرہ ہیں۔ اور عمر رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر بیان کیا کہ سجدے مستحب ہیں، واجب نہیں ہیں۔ پس سامعین نے نکیر نہیں کی، اور انھوں نے عمر رضی اللہ عنہ کی بات مان لی۔ اور اس حدیث کا مطلب کہ نبی ﷺ نے سورۃ النجم میں سجدہ کیا۔ اور آپؐ کے ساتھ سجدہ کیا مسلمانوں نے، مشرکوں نے، جنات نے اور انسانوں نے: میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس وقت میں حق ظاہر ہوا خوب واضح طور پر ظاہر ہونا۔ پس نہیں تھا کسی کے لئے مگر عاجزی کرنا اور تابعداری کرنا۔ پس جب لوٹے وہ اپنی طبیعتوں کی طرف تو انکار

کردیا جس نے انکار کیا۔ اور مسلمان ہوگیا جو مسلمان ہوگیا۔ اور نہیں قبول کیا قریش کے ایک سیٹھ نے اس پردۂ الٰہی کو، مہر مضبوط لگ جانے کی وجہ سے اس کے دل پر، مگر بایں قدر کہ اس نے مٹی اٹھائی پیشانی کی طرف۔ پس جلد سزا دی گئی اس کو، بایں طور کہ وہ مارا گیا بدر میں۔ اور سجدہ کے اذکار میں سے ہے الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

باب ــــــ ۱۲

نوافل کا بیان

نوافل کی مشروعیت کی حکمت

تمام شریعتوں میں رحمتِ خداوندی نے ہمیشہ اس بات کا لحاظ کیا ہے کہ تمام ضروری باتیں بیان کردی جائیں۔ دین کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑا جائے۔ اسی طرح وہ باتیں بھی بیان کردی جائیں جن کے ذریعہ لوگ نمازوں سے پورا پورا فائدہ حاصل کرسکیں۔ تاکہ ہر شخص نماز سے اپنا حصہ لے سکے یعنی جو لوگ مشغول ہیں اور دنیوی امور کی طرف متوجہ ہیں، وہ فرائض کو مضبوط پکڑیں۔ اور ان کو پابندی سے ادا کریں۔ اور جو فارغ البال ہیں اور نفس کی اصلاح کی طرف اور آخرت کو سنوارنے کی طرف متوجہ ہیں، وہ کامل طور پر عبادات کو ادا کریں۔ اس لئے آئین سازی کرنے والی عنایت متوجہ ہوئی، اور اس نے فرض نمازوں کے ساتھ نوافل کو بھی مشروع کیا۔ اور ان کے لائق اسباب واوقات متعین کئے، ان کے اہتمام کرنے پر ابھارا، ان کی خوب ترغیب دی اور ان کے فوائد کی وضاحت کی۔ یہی رواتب یعنی مقررہ سنتیں ہیں۔ اور کچھ دیگر نوافل کی بالاجمال ترغیب دی یعنی ان کے لئے اوقات واسباب متعین نہیں کئے۔ ان کو ہر وقت پڑھا جاسکتا ہے البتہ جن اوقات میں نماز ممنوع ہے ان میں پڑھنے کی اجازت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نوافل بھی ــــــ خواہ وہ موقت ہوں یا غیر موقت ــــــ بعض بندوں کی ضرورت ہیں۔ اور ضرورتیں مہیا کرنا پروردگارِ عالم کی چارہ سازی ہے۔ اس لئے نوافل مشروع کئے گئے ہیں۔

﴿النوافل﴾

ولما كان من الرحمة المرعِيَّةِ في الشرائع: أن يُبَيِّنَ لهم مالا بد منه، وما يحصل به فائدةُ الطاعة كاملةً، ليأخذ كلُّ إنسان حظَّه، ويتمسكَ المشغولُ والمُقبِلُ على الارتفاقات بمالابد

منه، ويؤدي الفارغُ المقبلُ على تهذيبِ نفسه وإصلاح آخرته الكاملَ: توجهتِ العنايةُ التشريعية إلى بيانِ صلواتٍ يتنفَّلون بها، وتوقيتها بأسبابٍ وأوقاتٍ تليق بها، وأن يُحثَّ عليها، ويُرَغَّبَ فيها، ويُفْصَحَ عن فوائدها، وإلى ترغيبهم في الصلاة النافلة غير الموقَّتة إجمالاً، إلا عند مانع، كالأوقات المنهية.

ترجمہ: نوافل کا بیان: جبکہ تھی اس مہربانی سے جس کا شریعتوں میں لحاظ رکھا گیا ہے یہ بات کہ لوگوں کے لئے وہ باتیں بیان کی جائیں جن سے چارہ نہیں ہے۔ اور وہ باتیں (بھی بیان کی جائیں) جن سے نماز کا پورا پورا فائدہ حاصل ہوتا ہے، تاکہ ہر شخص اپنا حصہ لے۔ اور مضبوط پکڑیں مشغول اور تدابیر نافعہ (معاشی امور) کی طرف متوجہ لوگ ان چیزوں کو جن سے چارہ نہیں (یعنی فرائض وواجبات کو) اور ادا کریں فارغ اور اپنے نفس کی اصلاح کی طرف اور اپنی آخرت سنوارنے کی طرف متوجہ حضرات کامل کو (الکامل مفعول بہ ہے یؤدی کا یعنی کامل عبادت کو) تو عنایت تشریعی متوجہ ہوئی ایسی نمازوں کو بیان کرنے کی طرف جن کو لوگ بطور نفل (زائد) ادا کریں۔ اور (عنایت متوجہ ہوئی) ان (نوافل) کی تعیین کی طرف ایسے اسباب واوقات کے ساتھ جو ان نوافل کے لائق ہیں (مثلاً تحیۃ الوضو کا سبب وضو کو متعین کیا اور جب بھی وضو کرے یہ نماز ادا کرنا مشروع کیا) اور (عنایت متوجہ ہوئی) ان پر ابھارنے کی طرف (أن مصدریہ ہے) اور ان کی ترغیب دینے کی طرف اور ان کے فوائد کو ظاہر کرنے کی طرف اور لوگوں کو بالاجمال (یعنی اسباب متعین کئے بغیر) ترغیب دینے کی طرف ایسی نفل نمازوں کی جن کے اوقات متعین نہیں ہیں (یعنی وہ ہر وقت پڑھی جاسکتی ہیں) مگر کسی مانع کے وقت، جیسے وہ اوقات جن میں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔

☆ ☆ ☆

سنن مؤکدہ اور ان کی تعداد کی حکمت

سنن مؤکدہ: وہ نوافل ہیں جو فرض نمازوں کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔ ان میں سے جو فرض سے پہلے مقرر کئے گئے ہیں وہ جلا دینے کے لئے یعنی ذہن کو صاف کرنے کے لئے ہیں۔ اور جو بعد میں رکھے گئے ہیں، وہ فرض کی تکمیل کے لئے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیوی مشاغل دل سے اللہ کی یاد نکال دیتے ہیں۔ اور دنیا کی الجھنیں دل میں بھر دیتے ہیں۔ پس اگر آدمی یکدم فرض نماز شروع کرے گا تو یہ تصورات اذکار میں غور کرنے سے اور عبادت کا ثمرہ حاصل کرنے میں مانع بنیں گے۔ کیونکہ دنیا کے گورکھ دھندے انسان کو بہیمی حالت کی طرف جھکاتے ہیں۔ اور ملکیت کے لئے قسوت وحیرانی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لئے فرض نماز شروع کرنے سے پہلے کسی آلۂ صیقل کی ضرورت ہے، جس کو لوگ

استعمال کریں اور ذہن کو دنیا کے جھمیلوں سے ہٹائیں۔ اور دل کو عبادت کی طرف مائل کریں۔ تا کہ فرض نمازیں دل کی صفائی کے ساتھ اور توجہ کو اکٹھا کر کے شروع کی جائیں۔ یہ تو فرض سے پہلے والی سنتوں کی حکمت ہے۔

اور بعد والی سنتوں کی حکمت یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نماز کو کامل طور پر ادا نہیں کر پاتا۔ ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ جب آدمی نماز پڑھ کر لوٹتا ہے تو کسی کے لئے نماز کا دسواں حصہ لکھا جاتا (نو حصے ضائع ہو جاتے ہیں) اور کسی کے لئے نواں، آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، چوتھا، تہائی اور آدھا لکھا جاتا ہے (حدیث ۷۹۶) اس لئے فرائض کے بعد سنتیں مقرر کی گئیں، تا کہ ان سے فرض کی تکمیل ہو جائے۔

اور سنن مؤکدہ دس رکعتیں یا بارہ رکعتیں ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ ظہر سے پہلے دو سنتیں ہیں یا چار؟ دونوں باتیں صحیح روایات سے ثابت ہیں۔ پس چار پڑھے۔ یہی کامل سنت ہے۔ اور موقعہ نہ ہو تو دو ہی پڑھ لے۔ اور یہ تعداد فرائض پر تقسیم کر دی گئیں۔ دو فجر سے پہلے اور چار یا دو ظہر سے پہلے۔ اور دو ظہر کے بعد، دو مغرب کے بعد اور دو عشاء کے بعد رکھی گئی ہیں۔ اور اس تعداد میں حکمت یہ ہے کہ پہلے یہ بات تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں کہ اصل فرض گیارہ رکعتیں ہیں۔ بعد میں چھ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس لئے شریعت نے چاہا کہ اصل فرضوں کے بقدر سنتیں مقرر کی جائیں۔ مگر گیارہ مقرر کی جاتیں تو مجموعہ ۲۲ ہو کر نمازیں جفت ہو جاتیں جو مصلحت وتر کے خلاف تھا اس لئے ایک روایت میں نیچے کا عدد دس لیا گیا، اور دوسری میں اوپر کا عدد بارہ لیا گیا۔ تا کہ مجموعہ طاق رہے۔

فمنها: رواتب الفرائض : والأصل فيها: أن الأشغالَ الدنيوية لما كانت مُنْسِيةَ ذكرِ الله، صادَّةً عن تدبر الأذكار، وتحصيلِ ثمرة الطاعات، فإنها تورثُ إخلادَ إلى الهيئة البهيمية، وقسوةً ودهشًا للملكية، وجب أن يُشْرَعَ لهم مِصْقلةٌ يستعملونها قبل الفرائض، ليكون الدخولُ فيها على حين صفاءِ القلب وجمع الهمةِ.

وكثيرًا مّا لايصلى الإنسان بحيث يستوفى فائدةَ الصلاة، وهو المشارُ إليه فى قوله صلى الله عليه وسلم: "كم من مصلّ ليس له من صلاته إلا نصفُها، ثُلُثُها، ربعها" فوجب أن يُسَنَّ بعدَها صلاةٌ تكملةً للمقصود.

وآكدُها عشرُ ركعات، أو اثنتا عشرةَ ركعة، متوزِّعةً على الأوقات؛ وذلك: أنه أراد أن يزيد بعدد الركعات الأصلية، وهى إحدى عشرة، لكنها أشفاعٌ، فاختار أحَدَ العددين.

ترجمہ: پس ازآں جملہ: فرائض کے ساتھ مقرر کردہ سنن مؤکدہ ہیں: اور بنیادی بات اس کے بارے میں یہ ہے کہ دنیوی مشاغل جب تھے اللہ کی یاد کو بھلانے والے، اذکار میں غور کرنے اور عبادات کا ثمرہ حاصل کرنے سے روکنے

والے۔ پس بیشک وہ مشاغل جھکنا پیدا کرتے ہیں بہیمی حالت کی طرف، اور قساوت اور حیرانی (پیدا کرتے ہیں) ملکیت کے لئے، تو ضروری ہوا کہ لوگوں کے لئے کوئی مانجھنے کا آلہ مقرر کیا جائے، جس کو لوگ فرائض سے پہلے استعمال کریں۔ تا کہ فرائض میں داخل ہونا دل کی صفائی اور توجہ کو جمع کرنے کے وقت میں ہو۔

اور بار ہا انسان نماز نہیں پڑھتا اس طرح کہ نماز کا پورا پورا فائدہ حاصل کرے۔ اور وہی (ناقص نماز) مشارٌ الیہ ہے آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں: ''کتنے نمازی ہیں: نہیں ہے اس کے لئے اس کی نماز میں سے مگر اس کا آدھا، اس کا تہائی، اس کا چوتھائی'' (یہ روایت بالمعنی یعنی خلاصہ ہے) پس ضروری ہوا کہ مسنون کی جائے فرائض کے بعد کوئی نماز مقصود نماز کی تکمیل کے لئے۔

اور نوافل میں سب سے زیادہ مؤکد دس رکعتیں ہیں یا بارہ رکعتیں ہیں۔ جو اوقات پر تقسیم کی ہوئی ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ شارع نے چاہا کہ وہ بڑھائے اصل رکعتوں کی تعداد کے بقدر۔ اور وہ اصلی رکعتیں گیارہ ہیں۔ مگر وہ (مجموعہ) جفت ہیں۔ پس اختیار کیا دو عددوں میں سے ایک کو۔

☆ ☆ ☆

سُننِ مؤکدہ کی فضیلت: جنت کا گھر

حدیث ——— حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان بندہ ہر روز اللہ کیلئے بارہ رکعتیں نفل کے طور پر، فرض کے طور پر نہیں۔ پڑھے: اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لئے ایک گھر بناتے ہیں'' (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص پابندی سے سُننِ مؤکدہ ادا کرتا ہے وہ رحمتِ خداوندی کے بڑے حصہ کو اپنے اندر سمو لیتا ہے کیونکہ جنت میں گھر: جنت باسی کا ہوتا ہے۔ اور جنت میں وہ جائیگا جو کرمِ الٰہی کا مورد بن جائے گا۔

فجر کی سنتوں کی خاص فضیلت

حدیث ——— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ فجر کی دو سنتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں (مسلم)

تشریح: فجر کی سنتیں: دنیا اور دنیا کی ساری نعمتوں سے بہتر اس لئے ہیں کہ دنیا فانی ہے۔ اور اس کی نعمتیں رنج و محن سے مکدّر ہیں۔ اور آخرت کا ثواب سدا باقی رہنے والا ہے اور تکان و ماندگی سے مکدّر نہیں۔ پس وہی بہتر ہوا۔

فائدہ: اس ارشاد کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو صبح چار پیسوں کے نفع کی خاطر فرض جلدی سے ادا کر کے کام پر لگ جاتے ہیں۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ یہ سنتیں عام نوافل کی طرح نہیں ہیں۔ یہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے: سب سے قیمتی اور

کارآمد ہیں۔پس معمولی نفع کی خاطر ایسی قیمتی دولت ضائع نہیں کرنی چاہئے۔

فجر کی سنتوں کے بارے میں اسی قبیل کا ایک ارشاد ابوداؤد (حدیث ۱۲۵۸) میں مروی ہے کہ لاتَدَعُوْهما وإن طَرَدَتْكم الخيل یعنی چاہے گھوڑے تمہیں روندڈالیں: یہ دورکعتیں مت چھوڑو۔اس ارشاد کی مخاطب فوج ہے۔ جنگ کا میدان ہے۔دشمن حملہ کے لئے تُلا کھڑا ہے۔اندیشہ ہے کہ اگر ہم سنتیں ادا کر کے فرض پڑھیں گے تو دشمن حملہ کردے گا اوران کے گھوڑے ہمیں روندڈالیں گے۔ایسی صورت میں اگر سنتیں چھوڑ کر صرف فرض پڑھ لئے جائیں تو کیا حرج ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ چاہے دشمن کے گھوڑے تمہیں روندڈالیں: یہ دوسنتیں مت چھوڑو۔ان کو عام نوافل کی طرح مت سمجھو۔اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کسی نماز کا اتنا اہتمام نہیں کرتے تھے جتنا فجر کی سنتوں کا کرتے تھے (متفق علیہ عن عائشہؓ) چنانچہ امام اعظم کا ایک قول یہ ہے کہ فجر سے پہلے یہ دورکعتیں واجب ہیں۔

نمازِ اشراق کی فضیلت

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے فجر کی نماز باجماعت پڑھی، پھر بیٹھا ہوا اللہ کا ذکر کرتا رہا، یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔پھر اس نے دورکعتیں پڑھیں۔تو وہ اس کے لئے حج اور عمرہ کے ثواب کی مانند ہوں گی'' (مشکوۃ حدیث ۹۷۱ باب الذکر بعد الصلاۃ۔اس کی سند ضعیف ہے۔مگر ترغیب منذری میں اس کے شواہد ہیں)

تشریح: فجر کے بعد اشراق تک مسجد میں رکا رہنا بھی ایک طرح کا اعتکاف ہے۔اور یہ روزانہ کا اعتکاف ہے، جس کو ہر شخص بغیر کسی زحمت کے کرسکتا ہے۔اوراعتکاف کے فوائد قسم اول، مبحث ۵ باب ۱۱ کے آخر میں بیان کئے جاچکے ہیں (رحمۃ اللہ ۱:۵۸۷)

فائدہ: فجر کے بعد اشراق تک مسجد میں رہنا، فجر کے بعد کی سنتوں کے بمنزلہ ہے، جیسا کہ ابھی آرہا ہے،اس لئے اس کا تذکرہ یہاں سننِ مؤکدہ کے فضائل کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

فائدہ: مذکورہ حدیث میں ثواب کی مقدار کا بیان بھی ہوسکتا ہے،اورنسبت کا بیان بھی۔پہلی صورت میں یہ ثواب پابندی سے عمل کرنے کا ہے۔ایک دن کا نہیں ہے۔اورفضائل کی روایتوں میں عام طور پر دوام، ثابرا ور حافظ کی قید ملحوظ ہوتی ہے۔چاہے حدیث میں اس کا تذکرہ ہو یا نہ ہو۔البتہ اگر کسی حدیث میں صراحت ہو کہ یہ ثواب ایک بار عمل کا ہے تو وہ اور بات ہے۔

اوردوسری صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حج اور عمرہ: چھوٹی بڑی عبادتیں ہیں۔اسی طرح فجر کے فرضوں کی باجماعت ادائیگی اوراس کے بعد اعتکاف،اورآخر میں اشراق: یہ بھی دو چھوٹی بڑی عبادتیں ہیں۔اور جو حج کو

جاتا ہے، وہ عمرہ ضرور کر کے آتا ہے۔ پس فجر کی نماز کے لئے جانے والے کو بھی یہ چھوٹی عبادت کر کے گھر لوٹنا چاہئے۔

ظہر سے پہلے چار سنتوں کی فضیلت

حدیث ـــــ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں، جن کے درمیان سلام نہ پھیرا گیا ہو، ان کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۱۶۸)

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سورج ڈھلنے کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور فرمایا: ''یہ ایک ایسی گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ پس میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اس میں میرا کوئی نیک عمل چڑھے'' (مشکوۃ حدیث ۱۱۶۹)

حدیث ـــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: ''زوال کے بعد، ظہر سے پہلے چار رکعتیں، تہجد کی چار رکعتوں کے برابر شمار ہوں گی۔ اور نہیں ہے کوئی چیز مگر وہ اس گھڑی میں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۱۷۷)

تشریح: پہلے قسم اول کے مبحث ۶ باب ۸ میں یہ بات تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطلاقی شان زمان ومکان کی قید سے بالاتر ہے۔ مگر بندوں کی مصلحت سے اللہ تعالیٰ کی اطلاقی شان تقیید کو قبول کرتی ہے یعنی خاص زمان ومکان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی بیان کی جاچکی ہے کہ بعض اوقات میں روحانیت پھیلتی ہے (دیکھئے رحمۃ اللہ ۲: ۱۸۷ تا ۱۸۷) زوال کے بعد کی گھڑی میں بھی روحانیت پھیلتی ہے۔ اس لئے یہ بھی عبادت کا خاص وقت ہے۔ آسمان کے دروازے کھلنے کا مطلب: روحانیت کا پھیلنا اور عنایتِ الٰہی کا متوجہ ہونا ہے۔

جمعہ کے بعد مسجد میں چار سنتوں کی حکمت

متفق علیہ روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ جمعہ کے بعد مسجد میں سنتیں نہیں پڑھتے تھے۔ گھر میں جاکر دو سنتیں پڑھتے تھے (مشکوۃ حدیث ۱۱۶۱) اور مسلم شریف کی روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے جو جمعہ کے بعد (مسجد میں) سنتیں پڑھنا چاہے: وہ چار رکعتیں پڑھے'' (مشکوۃ ۱۱۶۶) اور مسلم ہی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ ارشاد نبوی منقول ہے کہ: ''جمعہ کی نماز کے ساتھ دوسری نماز نہ ملائی جائے تا آنکہ بات چیت کر لے یا مسجد سے نکل جائے'' (مشکوۃ حدیث ۱۱۸۶) ان روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جمعہ کے بعد جو شخص مسجد میں سنتیں پڑھنا چاہے: وہ چار رکعتیں پڑھے۔ اور گھر لوٹ کر چاہے تو دو بھی پڑھ سکتا ہے۔ اور مسجد میں چار پڑھنے کی حکمت یہ ہے کہ دو سنتیں پڑھے گا تو وہ جمعہ کے مانند ہو جائیں گی۔ اور ایک ہی جگہ میں، ایک ہی وقت میں، لوگوں کے بہت بڑے اجتماع میں یہ بات مناسب نہیں۔

عوام یہ گمان کر سکتے ہیں کہ شاید اس شخص نے امام کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کو معتبر نہیں سمجھا اور اس کا اعادہ کیا۔ یا اس قسم کا کوئی اور خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس نے جمعہ کی دو رکعتوں کو ناکافی سمجھا۔ کیونکہ جمعہ ظہر کا قائم مقام ہے، پس جمعہ کی رکعتیں بھی چار ہونی چاہئیں، اس لئے اس نے سلام پھیرتے ہی متصلاً دو اور پڑھ کر چار پوری کر لیں۔ اسی لئے تیسری حدیث میں آپؐ نے جمعہ کے ساتھ دوسری نماز ملانے کی ممانعت کی۔ اور جب تک بات نہ کر لے یا مسجد سے نکل نہ جائے دو رکعتیں پڑھنے کی ممانعت کی۔ اور چار سنتیں پڑھنے میں ایسا کوئی ایہام پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے مسجد میں جمعہ کے بعد متصلاً چار ہی سنتیں پڑھنی چاہئیں۔ پھر چاہے تو مسجد ہی میں دو بھی پڑھ سکتا ہے۔

عصر سے پہلے اور مغرب کے بعد سنن غیر مؤکدہ

حدیث شریف میں ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ اس شخص پر مہربانی فرمائیں جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۷۰) خود نبی ﷺ کا معمول بھی عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھنے کا تھا۔ جن کے درمیان آپ تشہد پڑھتے تھے (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۷۱) اور ایک روایت میں عصر سے پہلے آپؐ کا دو سنتیں پڑھنا بھی مروی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۷۲) اور مغرب کے بعد دو رکعتیں تو سنتِ مؤکدہ ہیں۔ جن کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ اور ان کے ساتھ دو اور پڑھی جائیں اور چار کر لی جائیں تو ایک مرسل روایت میں حضرت مکحول سے مروی ہے کہ وہ علیین میں اٹھائی جاتی ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۸۴) اور بشمول سنتِ مؤکدہ چھ پڑھی جائیں تو ایک نہایت ضعیف روایت میں آیا ہے کہ وہ بارہ سال کی عبادت کے برابر ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ درمیان میں کوئی بری بات نہ بولے (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۷۳) اور ایک اور ضعیف روایت میں بیس نفلیں پڑھنے کی یہ فضیلت آئی ہے کہ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنایا جاتا ہے۔ یہ روایت ابن ماجہ میں ہے اور اس کی سند میں یعقوب بن الولید مدنی ضعیف راوی ہیں۔ بہر حال یہ سب سنن غیر مؤکدہ ہیں۔

اور عشا کی نماز سے پہلے سنتوں کا تذکرہ کسی روایت میں نہیں آیا۔ مگر نماز بہترین کام ہے۔ پس عشاء سے پہلے بھی دو یا چار نفلیں پڑھنی چاہئیں۔

عصر اور فجر کے بعد سنتیں نہ رکھنے کی وجہ

فجر کے بعد دو وجہ سے سنتیں نہیں رکھی گئیں بلکہ مطلقاً نوافل سے منع کر دیا گیا: ایک وجہ: یہ ہے کہ فجر کے بعد اشراق تک مسجد میں جو اعتکاف کیا جاتا ہے، وہ سنتوں کے قائم مقام ہے۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ فجر کے بعد یا عصر کے بعد نوافل جائز رکھے جائیں گے تو یہ سلسلہ دراز ہو کر طلوع وغروب تک پہنچ جائے گا۔ اور مجوس و ہنود کے ساتھ مشابہت لازم آئے گی۔ یہ اقوام سورج کی طلوع وغروب کے وقت پرستش کرتی ہیں۔

فائدہ: مغرب سے پہلے موقعہ ہو تو نوافل جائز ہیں یعنی مکروہ وقت غروب پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور مغرب سے پہلے صحابہ کا نوافل پڑھنا بھی مروی ہے اور حدیث مرفوع میں آپؐ کی اجازت بھی مروی ہے۔ مگر چونکہ مغرب کا مستحب وقت مختصر ہے۔ اس لئے نبی ﷺ اور تمام اکابر صحابہ مغرب سے پہلے نفلیں نہیں پڑھتے تھے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "بنى له بيت في الجنة"

أقول هذا إشارة إلى أنه مَكّنَ من نفسه لحظٍّ عظيمٍ من الرحمة.

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "ركعتا الفجر خير من الدنيا ومافيها"

أقول: إنما كانتا خيرًا منهما، لأن الدنيا فانيةٌ، ونعيمُها لايخلو عن كَدَرِ النصَبِ والتعب، وثوابُهما باقٍ غيرُ كَدِرٍ.

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: "من صلى الفجر في جماعة، ثم قعد يذكر الله، حتى تطلع الشمس، ثم صلى ركعتين، كانت له كأجر حجةٍ وعمرة"

أقول: هذا هو الاعتكاف الذي سنَّه رسولُ الله صلى الله عليه وسلم كلَّ يوم، وقد مرَّ فوائد الاعتكاف.

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم في أربع قبل الظهر: "تُفتح لهن أبواب السماء" وقوله صلى الله عليه وسلم: "إنها ساعةٌ، تفتح فيها أبواب السماء، فأُحِبُّ أن يصعد لي فيها عمل صالح" وقوله صلى الله عليه وسلم: "مامن شيئ إلا يسبِّح في تلك الساعة"

أقول: قد ذكرنا من قبلُ: أن المتعالي عن الوقت له تجلياتٌ في الأوقات، وأن الروحانية تنتشر في بعض الأوقات، فراجِعْ هذا الفصل.

وإنما سُنَّ أربعٌ بعد الجمعة لمن صلاها في المسجد، وركعتان بعدها لمن صلاها في بيته، لئلا يحصلَ مثلُ الصلاة في وقتها ومكانها في اجتماع عظيم من الناس، فإن ذلك يفتح على العوام ظَنَّ الإعراض عن الجماعة، ونحو ذلك من الأوهام، وهو أمره صلى الله عليه وسلم: أن لايُوصل صلاةٌ بصلاة، حتى يتكلم، أو يخرُج.

ورُوِى أربع قبل العصر، وستٌّ بعد المغرب، ولم يُسنّ بعد الفجر، لأن السنة فيه الجلوسُ في موضع الصلاة إلى صلاة الإشراق، فحصل المقصود، ولأن الصلاة بعده تفتح باب المشابهة بالمجوس، ولابعد العصر للمشابهة المذكورة.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "بنایا جائے گا اس کے لئے جنت میں ایک گھر" میں کہتا ہوں: یہ اس

طرف اشارہ ہے کہ اس نے اپنے اندر رحمت الٰہی کے بڑے حصہ کو جمایا ہے۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''فجر کی دوسنتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں'' میں کہتا ہوں: دوسنتیں: دنیا و مافیہا سے بہتر اس لئے ہیں کہ دنیا فنا ہونے والی ہے۔ اور اس کی نعمتیں تکان و مشقت کی کدورتوں سے خالی نہیں۔ اور دوسنتوں کا ثواب باقی رہنے والا ہے۔ مکدر نہیں ہے۔

(۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:......... میں کہتا ہوں: یہی وہ اعتکاف ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے روزانہ مسنون کیا ہے۔ اور اعتکاف کے فوائد کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔

(۴) آنحضرت ﷺ کے تین ارشادات جن کا ترجمہ آ گیا۔ میں کہتا ہوں: ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ زمانہ سے بالاتر ہستی کے لئے بعض اوقات میں تجلیات ہیں۔ اور یہ (بات بھی بیان کر چکے ہیں) کہ بعض اوقات میں روحانیت پھیلتی ہے۔ پس آپ اس مضمون کی طرف رجوع کریں۔

اور جمعہ کے بعد اس شخص کے لئے جو مسجد میں سنتیں پڑھتا ہے چار رکعتیں۔ اور جمعہ کے بعد دو رکعتیں اس کے لئے جو ان کو اپنے گھر میں پڑھتا ہے، اس لئے مسنون کیا ہے تا کہ نہ حاصل ہو نماز (جمعہ) کے مانند، اس کے وقت میں، اور اس کی جگہ میں، لوگوں کے بڑے اجتماع میں۔ پس بیشک یہ چیز کھولتی ہے عوام کے لئے جماعت سے روگردانی کرنے کا گمان اور اس کے مانند دیگر خیالات۔ اور وہ آپ ﷺ کا حکم ہے کہ ایک نماز دوسری نماز کے ساتھ نہ ملائی جائے یہاں تک کہ بات کرے یا (مسجد سے) نکلے۔

اور روایت کی گئی ہیں عصر سے پہلے چار رکعتیں۔ اور مغرب کے بعد چھ رکعتیں۔ اور نہیں مسنون کیں فجر کے بعد، اس لئے کہ فجر میں مسنون نماز کی جگہ میں بیٹھنا ہے اشراق کی نماز تک، پس مقصد حاصل ہو گیا۔ اور اس لئے کہ فجر کے بعد نماز: مجوس کی مشابہت کا دروازہ کھولتی ہے۔ اور عصر کے بعد بھی مسنون نہیں کیں، مذکورہ مشابہت کی وجہ سے۔

☆ ☆ ☆

تہجد کی مشروعیت کی وجہ

ھجد (ن) ھُجُوْدًا اور تھَجُّدًا اضداد میں سے ہیں۔ رات میں سونا اور رات میں بیدار ہونا دونوں معنی ہیں۔ البتہ متھجد رات میں نماز کے لئے نیند سے بیدار ہونے والے کو کہتے ہیں۔ امام لغت ازہری کا قول ہے کہ کلام عرب میں ھاجد کا اطلاق رات میں سونے والے پر، اور متھجد کا رات میں نماز کے لئے بیدار ہونے والے پر ہوتا ہے۔

اور شارع کی نظر میں تہجد کی نماز کو تین وجوہ سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے:

پہلی وجہ: رات کے آخری حصہ میں پراگندہ کرنے والی مشغولیات سے دل صاف ہوتا ہے۔ جمعیت خاطر کی

دولت حاصل ہوتی ہے۔ ماحول پرسکون ہوتا ہے۔ آوازیں تھمی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور لوگ بستر خواب پر دراز ہوتے ہیں۔ ایسے وقت میں جو عبادت کی جاتی ہے اس میں دکھلانے سنانے کا احتمال بہت کم ہوتا ہے ——— اور عبادت کا بہترین وقت وہ ہے جس میں آدمی فارغ البال ہو اور دل اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے: ''اے لوگو! سلام کو رواج دو، غریبوں کو کھانا کھلاؤ، ناتوں کو جوڑو، اور رات میں نماز پڑھو، درانحالیکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ داخل ہوگے جنت میں سلامتی کے ساتھ'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۰۷ کتاب الزکوٰۃ، باب فضل الصدقہ) لوگ خوابیدہ ہوں یعنی میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوں ایسے وقت میں ایک بندے کا اٹھ کر نماز میں لگنا۔ اللہ کی خصوصی رحمت کا حقدار بناتا ہے۔ اور سورۃ المزمل آیت ۶ و ۷ میں ہے: ''البتہ رات کو اٹھنا سخت روندتا ہے'' یعنی رات کو اٹھنا کچھ آسان کام نہیں۔ بڑی بھاری ریاضت اور نفس کشی ہے جس سے نفس روندا جاتا ہے۔ اور خواہشات پامال کی جاتی ہیں: ''اور بات سیدھی نکلتی ہے'' یعنی اس وقت ذکر و دعا دل سے ادا ہوتی ہے۔ زبان و دل موافق ہوتے ہیں۔ جو بات زبان سے نکلتی ہے ذہن میں خوب جمتی ہے: ''بیشک آپ کے لئے دن میں لمبا شغل ہے'' پس رات میں فرصت کے یہ لمحات غنیمت سمجھنے چاہئیں۔

دوسری وجہ: رات کا آخری حصہ رحمت الٰہی کے نزول کا وقت ہے۔ اس وقت میں پروردگار عالم نیک بندوں سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ بندے سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری درمیانی حصے میں ہوتے ہیں۔ پس اگر تم سے ہوسکے کہ تم ان بندوں میں سے ہوجاؤ جو اس گھڑی میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں، تو ان میں سے ہوجاؤ'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۲۹) یہ مضمون پہلے مبحث ۶ باب ۸ میں بھی بیان ہو چکا ہے۔

تیسری وجہ: شب بیداری کا بہیمیت کے کمزور کرنے میں بڑا دخل ہے۔ سحر خیزی بہیمیت کے زہر کے لئے تریاق ہے۔ اس لئے جو لوگ کتے وغیرہ کو شکار کا طریقہ سکھاتے ہیں، وہ اس کو بھوکا اور بیدار رکھتے ہیں۔ اسی وقت وہ اس کی تعلیم میں کامیاب ہوتے ہیں ——— اور دارمی کی روایت میں ہے کہ: ''یہ رات کو بیدار ہونا بہت مشکل اور گراں ہے۔ پس جب کوئی شخص وتر پڑھے تو اس کے بعد دو نفلیں پڑھ لے۔ پھر اگر رات میں اٹھا (تو سبحان اللہ!) ورنہ یہ دو نفلیں تہجد کی جگہ لے لیں گی'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۸۶ باب الوتر)

مذکورہ بالا وجوہ سے شریعت نے تہجد کی نماز کا بہت زیادہ اہتمام کیا ہے۔ نبی ﷺ نے اس کے فضائل بیان کئے ہیں۔ اور اس کے آداب و اذکار منضبط کئے ہیں۔ جو آگے بیان کئے جارہے ہیں۔

ومنها: صلاة الليل:

اعلم: أنه لما كان آخرُ الليل وقتَ صفاءِ الخاطر عن الأشغال المشوِّشة، وجمعِ القلب، وهَدْءِ الصوت، ونومِ الناس، وأبعدَ من الرياء والسُّمعة؛ وأفضلُ أوقات الطاعة: ماكان فيه الفراغُ، وإقبالُ الخاطر، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم: " وصَلُّوا بالليل والناس نِيَامٌ" وقولُه

تعالى: ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَّأَقْوَمُ قِيلًا، إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا﴾

وأيضًا: فذلك الوقتُ وقتُ نزول الرحمة الإلٰهية، وأقربُ مايكون الربُّ إلى العبد فيه، وقد ذكرناه من قبلُ.

وأيضًا: فللسَّهر خاصية عجيبة في إضعاف البهيمية، وهو بمنزلة الترياق، ولذلك جرت عادةُ طوائف الناس: أنهم إذا أرادوا تسخيرَ السِّباع، وتعليمَها الصيد، لم يستطيعوه إلا من قِبَلِ السَّهَرِ والجوع، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "إن هذا السَّهَرَ جُهدٌ وثِقَلٌ" الحديث:

كانت العناية بصلاة التهجد أكثرَ، فبيَّن النبي صلى الله عليه وسلم فضائلَها، وضَبَطَ آدابَها وأذكارها.

ترجمہ: اورنوافل میں سے رات کی نماز ہے: جان لیں کہ جب رات کا آخر حصہ پراگندہ کرنے والی مشغولیات سے دل کی صفائی کا وقت، اور دل کی جمعیت، آواز کے سکون اور لوگوں کے سونے کا وقت تھا۔ اور وہ وقت دکھانے اور سنانے سے بہت زیادہ دور تھا۔ اور عبادت کے اوقات میں بہترین: وہ ہے جس میں فراغت ہو، اور دل متوجہ ہو۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''اور نماز پڑھو، درانحالیکہ لوگ سوئے ہوں'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بیشک رات کو اٹھنا: وہ بہت سخت ہے روندنے کے اعتبار سے۔ اور بہت سیدھا ہے بات کے اعتبار سے۔ بیشک آپ کے لئے دن میں لمبا پیرنا ہے'' —— اور نیز: پس وہ وقت رحمتِ الٰہی کے نزول کا وقت ہے۔ اور پروردگار اس وقت میں بہت زیادہ نزدیک ہوتے ہیں بندے سے۔ اور تحقیق ذکر کیا ہم نے اس کو قبل ازیں —— اور نیز: پس بیداری کے لئے عجیب خاصیت ہے بہیمیت کو کمزور کرنے میں۔ اور وہ بمنزلۂ تریاق ہے۔ اور اسی وجہ سے لوگوں میں یہ دستور جاری ہے کہ جب وہ درندوں کو سدھانا اوران کو شکار کا طریقہ سکھلانا چاہتے ہیں تو نہیں طاقت رکھتے وہ اس کی مگر جگانے اور بھوکا رکھنے کی جانب سے (یعنی یہی ایک طریقہ کارگر ہوتا ہے) اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''بیشک یہ بیداری مشقت اور گرانی ہے'' آخر تک —— تو تہجد کی نماز کی طرف توجہ زیادہ تھی۔ پس بیان کئے نبی ﷺ نے اس کے فضائل اور منضبط کئے اس کے آداب واذکار۔

(كانت العناية جزاء ہے لما كان آخر إلخ کی)

☆ ☆ ☆

نیند سے بیدار ہونے کا مسنون طریقہ

حدیث —— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شیطان تم میں سے ہر ایک کے سر کی گدی پر تین گرہیں لگاتا ہے، جب وہ سوتا ہے۔ وہ ہر گرہ پر منتر پڑھتا ہے کہ: ''رات دراز ہے سورہ!'' پس

جب وہ جاگتا ہے اور اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے، پھر وضو کرتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر نماز پڑھتا ہے تو تیسری گرہ کھل جاتی ہے۔ پس وہ چست خوش دل ہو جاتا ہے، ورنہ پلید کاہل رہتا ہے'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۲۱۹ باب التحریض علی قیام اللیل)

تشریح: اس حدیث میں بیدار ہونے کا طریقہ سکھلایا گیا ہے۔ جب آدمی سوتا ہے تو شیطان سونے والے کے لئے نیند کو لذیذ بناتا ہے۔ اور اس کے دل میں خیال پیدا کرتا ہے کہ ابھی رات کافی باقی ہے۔ کچھ اور سو رہو! شیطان کا یہ وسوسہ اتنا مضبوط اور پختہ ہوتا ہے کہ کسی کارگر تدبیر کے بغیر زائل نہیں ہوسکتا۔ اور وہ مؤثر تدبیر وہی ہے جس سے نیند دفع ہو جائے۔ اللہ کی طرف توجہ کا دروازہ وا ہو جائے۔ اس لئے جاگنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نیند ٹوٹتے ہی جبکہ آنکھیں خمار آلود ہوں اللہ کا ذکر کرے (جو آگے آرہا ہے) پھر مسواک کر کے وضو کرے، پھر دو ہلکی نفلیں پڑھے تو طبیعت کھل جائے گی۔ پھر جس قدر چاہے آداب واذکار کی رعایت کے ساتھ نماز دراز کرے۔

بعض حضرات نے اس گرہ لگانے کو مجاز پر محمول کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ تشبیہ ہے، جس طرح شیطان ذکر اور نماز سے روکتا ہے۔ نیند بھی مانع بنتی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ حقیقت پر محمول ہے۔ یعنی شیطان: جادوگر کی طرح حقیقۃً گرہیں لگاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے خود ان تین گرہوں کا تجربہ کیا ہے۔ اور ان کو لگانے کا اور ان کی تاثیر کا مشاہدہ کیا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مشاہدہ کے وقت میں یہ بھی جان رہا تھا کہ یہ شیطان لگا رہا ہے اور مجھے یہ حدیث بھی مستحضر تھی۔

[۵] قوله صلى الله عليه وسلم: " يعقِدُ الشيطانُ على قافيةِ رأسِ أحدِكم إذا هو نام ثلاثَ عُقَدٍ" الحديثَ.

أقول: الشيطان يُلَذِّذُ إليه النومَ، ويوسوس إليه أن الليل طويل، ووسوستُه تلك أكيدةٌ شديدةٌ، لاتَنْقَشِعُ إلا بتدبير بالغ. يندفع به النومُ، وينفتح به باب من التوجه إلى الله، فلذلك سُنَّ أن يذكر اللّٰهَ إذا هَبَّ، وهو يمسح النومَ عن وجهه، ثم يتوضأ ويتسوَّكُ، ثم يصلي ركعتين خفيفتين، ثم يُطوِّل بالآداب والأذكار ماشاء. وإني جرَّبْتُ تلك العُقدَ الثلاثَ، وشاهدتُ ضربَها وتأثيرَها، مع علمي حينئذ بأنه من الشيطان، وذكرى هذا الحديثَ.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: شیطان اس کے لئے نیند کو لذیذ بناتا ہے، اور اس کی طرف وسوسہ ڈالتا ہے کہ رات دراز ہے۔ اور اس کا وہ وسوسہ سخت مضبوط ہے۔ نہیں زائل ہوتا وہ مگر ایسی مؤثر تدبیر سے جس سے نیند دفع ہو جائے۔ اور جس سے اللہ کی طرف توجہ کا دروازہ کھل جائے۔ پس اسی وجہ سے مسنون کیا

گیا کہ اللہ کا ذکر کرے جب نیند سے کھڑا ہو، درانحالیکہ وہ پونچھ رہا ہو نیند کو اپنے چہرے سے۔ پھر وضو کرے اور مسواک کرے۔ پھر دو ہلکی رکعتیں پڑھے۔ پھر دراز کرے آداب واذکار کے ساتھ جتنا چاہے —— اور بیشک میں نے تجربہ کیا ہے ان تین گرہوں کا۔ اور میں نے مشاہدہ کیا ہے ان کو لگانے کا اور ان کی اثر اندازی کا۔ میرے جاننے کے ساتھ اس وقت میں کہ وہ شیطان کی طرف سے ہے، اور میرے اس حدیث کو یاد کرنے کے ساتھ۔

لغات: قافية: گدی...... اِنْقَشَعَ السحابُ: بادل کھل جانا انقشع الهم عن القلب: دل سے غم کا زائل ہونا...... هَبَّ(ن) الرجل من النوم: نیند سے بیدار ہونا۔

☆ ☆ ☆

تہجد کا وقت نزولِ رحمت کا وقت ہے

تہجد کے فضائل میں ایک روایت میں سمائے دنیا کی طرف اللہ تعالیٰ کے نزول فرمانے کا تذکرہ آیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت اور ان کا ایک فعل ہے جس کی حقیقت کا ہم ادراک نہیں کر سکتے۔ جس طرح اللہ کا ہاتھ، اللہ کا چہرہ اور اللہ کا عرش پر متمکن ہونا اور ان کی دیگر عام صفات وافعال کی حقیقت اور ان کی کیفیت ہم نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں اپنی نارسائی اور بے علمی کا اعتراف ہی علم ہے۔ لیکن اس حدیث کا یہ پیغام بالکل واضح ہے کہ رات کے آخری تہائی حصہ میں اللہ تعالیٰ اپنی خاص شانِ رحمت کے ساتھ بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور خود ان کو دعا، سوال اور استغفار کے لئے پکارتے ہیں۔ پس خوش نصیب ہیں وہ بندے جو اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ اور بستر سے کھڑے ہو کر کچھ کر لیتے ہیں۔

شاہ صاحب قدس سرہ اس مضمون کی تمہید میں فرماتے ہیں کہ کتاب کے شروع میں مبحث اول کے باب دوم میں یہ بات تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے کہ معنویات پیکر محسوس اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنے وجود حسّی سے پہلے زمین پر اترتے ہیں۔ درج ذیل حدیث اس کی واضح دلیل ہے:

حدیث —— حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نیند سے گھبرائے ہوئے یہ کہتے ہوئے بیدار ہوئے: ”سبحان اللہ! آج رات کس قدر خزانے اتارے گئے، اور کس قدر فتنے اتارے گئے! کوئی ہے جو جگائے حجروں والیوں کو —— آپؐ کی مراد ازواج مطہرات ہیں —— تاکہ وہ نماز پڑھیں؟ دنیا میں بہت سی کپڑے پہننے والیاں، آخرت میں ننگی ہوں گی“ (مشکوۃ حدیث ۱۲۲۲) یعنی بہت سی عورتیں جو دنیا میں قسماقسم کا لباس پہننے والیاں ہیں، مگر وہ روحانی کمالات سے عاری ہیں۔ ان کو آخرت میں ان کی بے کمالی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اس طرح کہ وہ ننگی ہوں گی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی!

اس روایت میں دو مضمون ہیں: (۱) خزانوں اور فتنوں کا اترنا (۲) فیشن والا لباس پہننے والیوں کو آخرت میں عریانی کی سزا ملے گی ـــــ یہ دونوں باتیں ابھی حسی طور پر وجود میں نہیں آئیں تھیں۔ جس وقت آپؐ نے یہ خواب دیکھا تھا نہ تو مسلمانوں کے پاس خزانے آئے تھے اور نہ دولت کے نشے میں چور ہو کر مرد فتنہ میں مبتلا ہوئے تھے، نہ ابھی عورتیں فیشن پرست ہوئی تھیں۔ مگر آپؐ نے اس کا پیکر محسوس خواب میں دیکھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ معنویات ـــــ مذکورہ باتیں ان کے وجود حسی سے پہلے معنویات ہیں ـــــ پیکر محسوس اختیار کرتی ہیں۔ اور ان کا نزول بھی ہوتا ہے۔

اب اس کی روشنی میں درج ذیل حدیث کو سمجھیں:

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر، جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے، نزول فرماتے ہیں۔ اور ارشاد فرماتے ہیں: کون ہے جو مجھ سے دعا کرے پس میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے گناہوں کی بخشش چاہے، پس میں اس کو بخش دوں؟ (مشکوۃ حدیث ۱۲۲۳)

علماء نے اس حدیث میں جس نزول وندا کا ذکر ہے اس کو کنایہ قرار دیا ہے کہ اس وقت میں بندوں کے نفوس رحمتِ الٰہی کو اتارنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت آوازیں تھمی ہوئی ہوتی ہیں۔ شوروشغب جو دل کی حضوری میں مانع ہوتا ہے: نہیں ہوتا۔ اور پراگندہ کرنے والی مشغولیات سے بھی دل صاف ہوتا ہے۔ اور اس وقت کا عمل دکھلانے کے جذبہ سے بھی خالی ہوتا ہے۔ اس لئے رحمت کے فیضان میں دیر نہیں لگتی۔

شاہ صاحب قدس سرہ کے نزدیک حدیث کا مضمون اتنا دور ہٹا دینا مناسب نہیں اگرچہ آپ کے نزدیک بھی یہ تاویل صحیح ہے، مگر ساتھ ہی آپ شئونِ الٰہی میں تجدد بھی مانتے ہیں۔ یعنی ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے، جس کو نزول سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اور مبحث خامس میں صفات کی بحث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آگے فرماتے ہیں: درج ذیل تین حدیثوں میں بھی یہی دو راز ہیں یعنی بندوں کے نفوس میں رحمتِ الٰہی کو اتارنے کی صلاحیت کا پیدا ہونا اور ساتھ ہی شئونِ الٰہی میں تجدد کا ہونا یعنی اُدھر سے بھی رحمتِ خداوندی اور اللہ کی تجلی کا اترنا مراد ہے۔

حدیث ـــــ یہ حدیث ابھی گذری ہے کہ ''اللہ تعالیٰ بندے سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری درمیانی حصے میں ہوتے ہیں''

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''رات میں ایک گھڑی ہے۔ نہیں موافق ہوتا اس سے کوئی مسلمان آدمی: مانگے وہ اللہ تعالیٰ سے اس میں دنیا وآخرت کے امور میں سے کوئی بھلائی، مگر اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز عنایت فرماتے ہیں۔ اور یہ بات ہر رات میں ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۲۲۴)

حدیث ـــــ حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آپ لوگ تہجد ضرور

پڑھا کریں۔ کیونکہ وہ گذشتہ صالحین کا طریقہ تھا۔ اور وہ تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ برائیوں کو مٹانے والا، اور گناہوں سے روکنے والا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۲۲۷)

اور نماز کفارہ کیسے بنتی ہے؟ اور وہ گناہوں سے کیسے روکتی ہے؟ اور ان کے علاوہ نماز کے دیگر فوائد مبحث ۵ باب ۹ کے آخر میں بیان کئے گئے ہیں۔

[٦] قوله صلى الله عليه وسلم: " رُبَّ كاسيةٍ في الدنيا"—— أى بأصناف اللباس——" عاريةٍ في الآخرة" أى جزاءً وفاقًا، لخلوِّ نفسِها عن الفضائل النفسانية. قوله صلى الله عليه وسلم: "ماذا أنزل" الحديث.

أقول: هذا دليلٌ واضحٌ على تمثل المعاني ونزولها إلى الأرض قبلَ وجودها الحسّي.

قوله صلى الله عليه وسلم:" ينزل ربُّنا تبارك وتعالى إلى السماء الدنيا" الحديث.

قالوا: هذا كناية عن تَهَيُّؤِ النفوس لاستنزال رحمة الله، من جهةِ هَذِهِ الأصوات الشاغلة عن الحضور، وصفاءِ القلب عن الأشغال المشوِّشة، والبُعد من الرياء.

وعندى: أنه مع ذلك كنايةٌ عن شيئ متجدِّد، يستحق أن يُعَبَّرَ عنه بالنزول، وقد أشرنا إلى شيئ من هذا.

ولهذين السِّرَّيْن قال النبى صلى الله عليه وسلم:" أقربُ مايكون الربُّ من العبد في جوف الليل الآخر" وقال:" إن في الليل لساعةً لايوافقها عبد مسلم يسأل الله فيها خيرًا إلا أعطاه" وقال:" عليكم بقيام الليل، فإنه دَأْبُ الصالحين قبلكم، وهو قربة لكم إلى ربكم، مَكْفَرَةٌ للسيآت، مَنْهَاةٌ عن الإثم" قد ذكرنا أسرار التكفير، والنهى عن الإثم، وغيرهما، فراجِعْ.

ترجمہ: (٦) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بہت سی دنیا میں لباس پہننے والیاں —— یعنی قسہا قسم کے لباس —— آخرت میں ننگی ہونگی یعنی بطور پورے بدلے کے۔ اس کے نفس کے عاری ہونے کی وجہ سے روحانی کمالات سے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''کس قدر اتارے گئے'' آخر تک (یہ دونوں ایک ہی حدیث ہیں۔ مگر چونکہ اس کے دو مضمونوں یا مثالوں سے استدلال کرنا ہے اس لئے اس طرح علحدہ علحدہ لائے ہیں) میں کہتا ہوں: یہ واضح دلیل ہے معانی کے پیکر محسوس اختیار کرنے کی۔ اور معانی کے اترنے کی زمین پر ان کے وجود حسّی سے پہلے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد: اترتے ہیں...... علماء نے کہا یہ کنایہ ہے نفوس کے تیار ہونے سے رحمت الٰہی کو اتارنے کے لئے۔ حضوری سے غافل کرنے والی آوازوں کے تھمنے کی، اور پراگندہ کرنے والی مشغولیات سے دل کے صاف

ہونے کی اور ریا سے دور ہونے کی جہت سے ——— میں کہتا ہوں: کہ وہ اس کے ساتھ کنایہ ہے ایک نئی چیز سے مستحق ہے کہ اس کو نزول سے تعبیر کیا جائے۔ اور ہم نے اس میں سے کچھ کی طرف اشارہ کیا ہے ——— اور انہی دو رازوں کی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا (تین حدیثیں جن کا ترجمہ اوپر آگیا) تحقیق ذکر کیے ہیں ہم نے گناہ مٹانے کے اور گناہ سے روکنے کے اور دونوں کے علاوہ کے راز۔ پس اس کو دیکھ لیں۔

☆ ☆ ☆

باوضو ذکر کرتے ہوئے سونے کی فضیلت

حدیث ——— حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''جو شخص بستر پر باوضو پہنچے اور اللہ کا ذکر کرے یہاں تک کہ اس کو نیند آجائے، تو نہیں کروٹ لے گا وہ رات کی کسی گھڑی میں، مانگے وہ اس گھڑی میں دنیا و آخرت کی بھلائیوں میں سے کوئی بھلائی مگر عطا فرمائیں گے اللہ تعالیٰ اس کو وہ بھلائی'' (مشکوۃ حدیث ۱۲۱۵ باب القصد فی العمل)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو پاکی کی حالت میں سویا اور فرشتوں کی مشابہت اختیار کی یعنی ذکر کرتا رہا۔ اور اللہ پاک کی طرف متوجہ رہا اور نیند آگئی تو وہ رات بھر اسی حالت میں رہے گا۔ اس کا نفس برابر اللہ کی طرف لوٹنے والا ہوگا اور اس کا شمار مقرب بندوں میں ہوگا۔

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم: " من أوى إلى فراشه طاهرًا، يذكر الله، حتى يدركه النعاس، لم ينقلب ساعةً من الليل، يسأل الله شيئًا من خير الدنيا والآخرة، إلا أعطاه"

أقول: معناه: من نام على حالة الإحسان، الجامع بين التشبه بالملكوت والتطلع إلى الجبروت، لم يزل طولَ ليلته على تلك الحالة، وكانت نفسُه راجعةً إلى الله، في عباده المقربين.

ترجمہ: آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جس نے ٹھکانہ پکڑا اپنے بستر پر پاک ہونے کی حالت میں، درانحالیکہ وہ اللہ کا ذکر کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ پایا اس کو اونگھ نے، تو نہیں کروٹ لے گا وہ رات کی کسی گھڑی میں، مانگے وہ اللہ سے دنیا و آخرت کی بھلائیوں میں سے کچھ، مگر دیں گے اللہ اس کو'' (مشکوۃ میں روایت کے الفاظ قدرے مختلف ہیں۔ اوپر ترجمہ اسی کا ہے)

میں کہتا ہوں: اس کا مطلب: جو سویا احسان (نیکوکاری) کی حالت میں، جو جامع ہے ملکوت کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے اور جبروت (اللہ تعالیٰ) کی طرف جھانکنے کے درمیان تو برابر رہے گا وہ اپنی پوری رات اُسی حالت پر۔ اور

ہوگی اس کی روح لوٹنے والی اللہ کی طرف۔ اس کے مقرب بندوں کے زمرہ میں۔

☆　☆　☆

تہجد کے لئے اٹھتے وقت مختلف اذکار

جو شخص تہجد کے لئے اٹھے وہ بیدار ہوتے ہی، وضو کرنے سے پہلے درج ذیل اذکار میں سے کوئی ذکر کرے:

پہلا ذکر: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات میں تہجد کے لئے اٹھتے تھے تو کہتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، أَنْتَ قَيِّمُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ، أَنْتَ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ، أَنْتَ مَلِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ، أَنْتَ الْحَقُّ، وَوَعْدُكَ الْحَقُّ، وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ، وَقَوْلُكَ حَقٌّ، والْجَنَّةُ حَقٌّ، والنَّارُ حَقٌّ، والنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ، وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ، وَالسَّاعَةُ حَقٌّ، اَللّٰهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ، وَبِكَ آمَنْتُ، وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ، وَإِلَيْكَ أَنَبْتُ، وَبِكَ خَاصَمْتُ، وَإِلَيْكَ حَاكَمْتُ، فَاغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّيْ، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ، وأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ.

ترجمہ: یا اللہ! آپ کے لئے تعریف ہے۔ آپ سنبھالنے والے ہیں آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان میں ہیں۔ اور آپ کے لئے تعریف ہے۔ آپ روشنی ہیں آسمانوں کی، زمین کی اور ان چیزوں کی جو ان میں ہیں۔ اور آپ کے لئے تعریف ہے۔ آپ بادشاہ ہیں آسمانوں کے، زمین کے اور ان چیزوں کے جو ان میں ہیں۔ اور آپ کے لئے تعریف ہے۔ آپ ہی حق (ثابت) ہیں۔ اور آپ کا وعدہ برحق ہے۔ اور آپ کی ملاقات برحق ہے۔ اور آپ کا ارشاد برحق ہے۔ اور جنت برحق ہے۔ اور دوزخ برحق ہے۔ اور تمام انبیاء برحق ہیں۔ اور محمد (ﷺ) برحق ہیں۔ اور قیامت برحق ہے۔ اے اللہ! آپ کا تابعدار ہوں میں۔ اور آپ پر ایمان لایا ہوں میں۔ اور آپ پر بھروسہ کیا ہے میں نے۔ اور آپ کی طرف رجوع کیا ہے میں نے۔ اور آپ کی مدد سے (دشمنوں سے) جھگڑا کرتا ہوں میں۔ اور آپ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرتا ہوں میں۔ پس بخش دیجئے میرے لئے جو گناہ میں نے پہلے کئے اور جو گناہ میں بعد میں کرونگا۔ اور وہ گناہ جو پوشیدہ کئے میں نے اور جو علانیہ کئے میں نے۔ اور وہ گناہ جن کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ہی آگے کرنے والے اور آپ ہی پیچھے کرنے والے ہیں۔ کوئی معبود نہیں مگر آپ اور آپ کے سوا کوئی معبود نہیں (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۲۱۱)

دوسرا ذکر: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ رات میں نیند سے اٹھتے تو دس مرتبہ اللہ

اکبر، دس مرتبہ الحمد للہ دس مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ، دس مرتبہ سبحان المَلِكِ القُدُّوس، دس مرتبہ أَستغفرُ اللہ دس مرتبہ لا إلٰہ إلا اللہ پھر دس مرتبہ اللھم إنی اعوذ بك من ضِیقِ الدنیا، وَضِیقِ یوم القیامۃ کہتے۔ (مشکوۃ حدیث ۱۲۱۶)

تیسرا ذکر: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ رات میں بیدار ہوتے تو کہتے: لا إلٰـہ إلا أنت، سبحانك اللّٰھم وبحمدك، استغفرك لذنبی، واسالك رحمتك، اللھم زدنی علما، ولا تزغ قلبی بعد إذ ھدیتنی، وھب لی من لدنك رحمۃ، إنك انت الوھاب (کوئی معبود نہیں مگر آپ۔ آپ کی ذات پاک ہے، اے اللہ! اور آپ اپنی خوبیوں کے ساتھ ہیں۔ بخشش چاہتا ہوں آپ سے اپنے گناہوں کی۔ اور مانگتا ہوں آپ سے آپ کی مہربانی۔ اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما اور میرا دل کج نہ فرما اس کے بعد کہ آپ نے مجھے راہِ راست دکھائی۔ اور بخشیے آپ مجھے خاص اپنے پاس سے مہربانی۔ بیشک آپ ہی سب سے زیادہ بخشنے والے ہیں (مشکوۃ حدیث ۱۲۱۴)

چوتھا ذکر: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے نیند سے بیدار ہوکر سورۃ آل عمران کا آخری پورا رکوع تلاوت فرمایا۔ پھر کھڑے ہوئے، مسواک کی اور وضوء فرمائی۔ پھر گیارہ رکعتیں پڑھیں (بخاری حدیث ۴۵۷۱ مشکوۃ حدیث ۱۱۹۵ باب صلاۃ اللیل) تیرہ رکعتیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ صحیح حدیث سے یہ تعداد بھی ثابت ہے۔ اور وتر کی نماز اس تعداد میں شامل ہے۔

پانچواں ذکر: سوکر اٹھنے کی مشہور دعا بخاری شریف میں مروی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَحْیَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا، وَإِلَیْہِ النُّشُوْرُ (تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا۔ اور اسی کی طرف زندہ ہوکر جانا ہے) (یہ ذکر شارح نے بڑھایا ہے)

ومن سنن التھجد: أن یذکر اللہ إذا قام من النوم، قبلَ أن یتوضأ؛ وقد ذُکر فیہ صِیَغٌ:

منھا: اللھم لك الحمدُ، أنت قَیِّمُ السماوات والأرض ومن فیھنّ، ولك الحمد أنت نور السماوات والأرض ومن فیھن، ولك الحمد، أنت مَلِكُ السماوات والأرض ومن فیھن، ولك الحمد أنتَ الحقُّ، ووعدُك الحق، ولقاؤ ك حق، وقولك حق، والجنۃ حق، والنار حق، والنبیون حق، ومحمد حق، والساعۃ حق، اللھم لك أسلمتُ، وبك آمنتُ، وعلیك توکلتُ، وإلیك أنبتُ، وبك خاصمتُ، وإلیك حاکمتُ، فاغفرلی ما قدّمتُ وما أخّرتُ، وما أسررتُ وما أعلنتُ، وما أنت أعلم بہ منی، أنت المقدّم، وأنت المؤخّر، لا إلٰہ إلا أنت، ولا إلٰہ غیرك.

ومنھا: أن کَبَّرَ اللّٰہَ عشرًا، وحَمِدَ اللّٰہ عشرًا، وقال: "سبحان اللّٰہ وبحمدہ" عشراً، وقال: سبحان الملك القدوس" عشراً، واستغفر اللّٰہ عشراً، وَھَلَّلَ اللّٰہ عشرًا، ثم قال: "اللھم إنی أعوذ بك من ضیق الدنیا، وضیق یوم القیامۃ" عشرًا.

ومنها: لا إله إلا أنت، سبحانك اللهم وبحمدك، أستغفرك لذنبي، وأسألك رحمتك، اللهم زدني علمًا، ولا تزغ قلبي بعد إذ هديتني، وهب لي من لدنك رحمة، إنك أنت الوهاب.
ومنها: تلاوة: ﴿إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ إلى آخر السورة.
ثم يتسوَّك، ويتوضأ، ويصلي إحدى عشرة ركعةً، أو ثلاث عشرة ركعة، منها الوتر.

ترجمہ: اور تہجد کی سنتوں میں سے ہے: کہ یاد کرے اللہ کو جب اٹھے وہ نیند سے، وضو کرنے سے پہلے۔ اور تحقیق بیان کئے گئے ہیں ذکر میں کئی صیغے: ان میں سے ہے: اللهم لك الحمد إلخ ۔ اور ان میں سے یہ ہے کہ اٹھنے والا اللہ کی بڑائی بیان کرے دس بار، اور اللہ کی تعریف کرے دس بار اور کہے: ''اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہیں اور اپنی خوبیوں کے ساتھ متصف ہیں'' دس بار، اور کہے: ''نہایت پاک بادشاہ ہر کمی سے مبرا ہیں'' دس بار، اور گناہوں کی بخشش چاہے اللہ سے دس بار، اور صرف اللہ کا معبود ہونا بیان کرے دس بار، پھر کہے: ''اے اللہ! بیشک میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں دنیا کی تنگی سے اور روزِ قیامت کی تنگی سے'' دس بار۔ اور ان میں سے ہے: لا إله إلا أنت إلخ ۔ اور ان میں سے إن في خلق آخر سورت تک پڑھنا ہے۔
پھر مسواک کرے، اور وضو کرے اور پڑھے گیارہ رکعتیں یا تیرہ رکعتیں۔ ان میں وتر شامل ہیں۔

☆ ☆ ☆

تہجد کے مستحبات

تہجد کے آداب میں سے درج ذیل چار باتیں ہیں:
پہلی بات: جو اذکار نبی ﷺ سے نماز کے مختلف ارکان: رکوع وسجود اور قومہ وجلسہ وغیرہ میں مروی ہیں ان کی پابندی کرے۔ یہ اذکار درحقیقت تہجد کے لئے بھی ہیں۔
دوسری بات: ہر دو رکعت پر سلام پھیرے۔ احناف کے یہاں بھی فتوی تہجد کی نماز میں صاحبین کے قول پر ہے۔ اور علامہ قاسم نے اس کا جو رد کیا ہے وہ محلِ نظر ہے۔
تیسری بات: تہجد سے فارغ ہو کر خوب گڑگڑا کر دعا کرے۔ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ ارشاد نبوی مروی ہے کہ: ''(تہجد کی) نماز دو دو، دو دو رکعتیں ہیں۔ ہر دو رکعتوں پر تشہد (یعنی قعدہ) ہے۔ اور فروتنی کرنا، گڑگڑانا اور مسکنت ظاہر کرنا ہے۔ پھر (نماز سے فارغ ہو کر) اپنے دونوں ہاتھ تیرے رب کی طرف اٹھا درانحالیکہ دونوں ہاتھوں

کی ہتھیلیاں اپنے منہ کی طرف کرنے والا ہو۔اور کہہ: اے میرے رب! اے میرے رب! اور جس نے یہ نہیں کیا یعنی خوب گڑگڑا کر دعا نہیں مانگی وہ ایسا اور ایسا ہے یعنی اس کی نماز ناتمام ہے (مشکوۃ حدیث ۸۰۵ باب صفة الصلاة)

اور آنحضرت ﷺ کی تہجد کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے اللھم اجعل فی قلبی نوراً، وفی بصری نوراً، وفی سمعی نوراً، وعن یمینی نوراً، وعن یساری نوراً، وفوقی نوراً، وتحتی نوراً، وأمامی نوراً، وخلفی نوراً، واجعل لی نوراً (اے اللہ! میرے دل میں روشنی کیجئے، اور میری آنکھوں میں روشنی، اور میرے کانوں میں روشنی، اور میری دائیں جانب روشنی، اور میری بائیں جانب روشنی، اور میرے اوپر روشنی، اور میرے نیچے روشنی، اور میرے آگے روشنی، اور میرے پیچھے روشنی، اور میرے لئے روشنی کیجئے) (یہ دعا گڑگڑا کر کرے)

چوتھی بات: نبی ﷺ نے تہجد کی مختلف رکعتیں پڑھی ہیں۔ کم از کم وتر کے ساتھ سات رکعتیں مروی ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ سترہ رکعتیں۔ پس جو تعداد بھی پڑھے وہ سنت ہے اور صحیح ترین روایت گیارہ رکعتوں کی اور اس کے بعد تیرہ رکعتوں کی ہے۔

ومن آداب صلاة الليل: أن يواظب على الأذكار التي سنَّها رسولُ الله صلى الله عليه وسلم في أركان الصلاة، وأن يسلِّم على ركعتين، ثم يرفع يديه يقول: "يارب! يارب!" يبتهلُ في الدعاء، وكان في دعائه صلى الله عليه وسلم: "اللهم اجعل في قلبي نورًا، وفي بصري نورًا، وفي سمعي نورًا، وعن يميني نورًا، وعن يساري نورًا، وفوقي نورًا، وتحتي نورًا، وأمامي نورًا، وخلفي نورًا، واجعل لي نورًا" وقد صلاها النبي صلى الله عليه وسلم على وجوهٍ، والكلُّ سنة.

ترجمہ: اور رات کی نماز کے مستحبات میں سے یہ ہے کہ مداومت کرے اُن اذکار پر جن کو رسول اللہ ﷺ نے جاری کیا ہے نماز کے ارکان میں۔ اور یہ ہے کہ ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرے، پھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے، کہے: "اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار!" گڑگڑائے دعا میں اور آنحضرت ﷺ کی دعا میں تھا: اللھم الخ اور تحقیق پڑھا ہے رات کی نماز کو نبی ﷺ نے کئی طرح سے۔ اور سبھی سنت ہے۔

☆ ☆ ☆

تہجد اور وتر ایک نماز ہیں یا دو؟ اور وتر واجب ہے یا سنت؟

تہجد اور وتر کی روایات میں بہت الجھاؤ ہے۔ اس لئے مجتہدین کرام کی آراء بھی مختلف ہیں: امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک وتر اور صلاۃ اللیل (تہجد) دو الگ الگ نمازیں ہیں۔ پھر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک:

وتر تین رکعتیں: دو قعدوں اور ایک سلام کے ساتھ ہیں۔اور واجب ہیں۔اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک: وتر تین رکعتیں: دو سلام سے مستحب ہیں۔ایک سلام سے مکروہ ہیں۔اور وتر سنت ہیں۔اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک: وتر صرف ایک رکعت ہے اور سنت ہے۔اور اس سے پہلے تہجد کا دوگانہ ضروری ہے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: تہجد اور وتر ایک ہی نماز ہیں فرق بس برائے نام ہے اور دونوں سنت ہیں، مگر وتر زیادہ مؤکد ہیں۔ان کے نزدیک ایک تا گیارہ سب وتر بھی ہیں اور صلاۃ اللیل بھی ہیں۔جس قدر چاہے پڑھ سکتا ہے۔البتہ قاضی ابوالطیب شافعی فرماتے ہیں کہ صرف ایک رکعت وتر پڑھنا مکروہ ہے۔اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: وتروں کی آخری رکعت علحدہ سلام سے پڑھے گا۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی رائے اس مسئلہ میں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے موافق ہے۔فرماتے ہیں:

بنیادی بات یہ ہے کہ صلاۃ اللیل ہی وتر ہے یعنی دونوں ایک ہی نماز ہیں۔اور وہی مفہوم ہے اس ارشاد نبوی کا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز کی کمک بھیجی ہے۔وہ وتر کی نماز ہے۔پس اسے پڑھو عشا اور فجر کے درمیان'' شاہ صاحب رحمہ اللہ اس روایت سے غالباً اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ عشا اور فجر کے درمیان جو بھی نماز پڑھی جائے گی وہ وتر ہے پس وہی صلاۃ اللیل بھی ہے (اگر استدلال اس طرح ہے تو عجیب ہے عشا اور فجر کے درمیان تو عشا کے بعد کی سنتیں بھی پڑھی جاتی ہیں اور رمضان میں تراویح بھی پڑھی جاتی ہے۔جو قیام رمضان ہے اور ایک مستقل نماز ہے۔

سوال: صلاۃ اللیل طاق کیوں ہے؟ جواب: طاق عدد: مبارک عدد ہے۔اس لئے رسول اللہ ﷺ نے صلاۃ اللیل کو طاق مشروع کیا ہے۔اور طاق کی فضیلت اس ارشاد نبوی سے ثابت ہے: ''بیشک اللہ یکتا ہیں۔طاق کو پسند کرتے ہیں۔پس اے حافظو! وتر پڑھو''

سوال: وتر سنت کیوں ہیں؟ جواب: چونکہ رات میں نماز کے لئے اٹھنا پُر مشقت کام ہے۔باتوفیق حضرات ہی اس کی طاقت رکھتے ہیں۔اس لئے نبی ﷺ نے اس کو عام قانون نہیں بنایا یعنی ہر شخص پر وتر کی نماز لازم نہیں کی۔

سوال: جب وتر ہی صلاۃ اللیل ہے تو سونے سے پہلے ان کو پڑھنے کی اجازت کیوں ہے، صلاۃ اللیل کا وقت تو آخر رات ہے؟ جواب: اس کی وجہ بھی وہی ہے جو اوپر گذری کہ رات میں اٹھ کر نماز پڑھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، اس لئے سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی اجازت دی۔اور آخر رات میں پڑھنے کی ترغیب دی۔ارشاد فرمایا: ''جسے اندیشہ ہو کہ وہ آخر رات میں نہیں اٹھ سکے گا تو وہ شروع رات میں وتر پڑھ لے۔اور جسے امید ہو کہ وہ آخر رات میں اٹھ جائے گا، تو وہ آخر رات میں وتر پڑھے۔پس بیشک رات کی نماز (فرشتوں کی) حاضری کا وقت ہے، اور وہ بہتر ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۶۰)

اور برحق بات یہ ہے کہ وتر سنت ہے۔البتہ دیگر سنتوں سے زیادہ مؤکد ہے۔اور یہ بات حضرت علی، حضرت ابن عمر اور حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہم نے بیان فرمائی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت: تو وہ ہے جو ابھی اوپر گذری (مشکوۃ حدیث ۱۲۶۶) انھوں نے صرف حفاظ کو وتر پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اگر وتر واجب ہوتے تو سب پر ضروری ہوتے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت: امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں بیان کی ہے کہ ایک شخص نے ابن عمرؓ سے وتر کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ واجب ہے؟ آپ نے جواب دیا: رسول اللہ ﷺ نے وتر پڑھے ہیں اور مسلمان وتر پڑھتے ہیں! وہ شخص بار بار اپنا سوال دُوہراتا رہا اور حضرت ابن عمرؓ یہی فرماتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وتر پڑھے ہیں اور مسلمان وتر پڑھتے ہیں (مشکوۃ حدیث ۱۲۸۰) اگر وتر واجب ہوتے تو ابن عمرؓ صاف جواب دیدیتے۔

حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت: امام مالک، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ ابو محمد نامی ایک عالم کہتے ہیں کہ وتر واجب ہے؟ آپ نے فرمایا: ابو محمد غلط کہتے ہیں۔ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: ”پانچ نمازیں: ان کو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کیا ہے۔ پس جو ان کو ادا کرے، ان میں سے ذرا بھی ضائع نہ کرے ان کے حق کو ہلکا سمجھتے ہوئے، تو اس کے لئے اللہ کے پاس عہد ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کریں۔ اور جو ان پانچ نمازوں کو ادا نہ کرے تو اس کے لئے اللہ کے پاس کوئی عہد و پیمان نہیں۔ اگر چاہیں گے تو اس کو سزا دیں گے اور چاہیں گے تو اس کو جنت میں داخل کریں گے“ (موطا ۱:۱۲۳)

فائدہ: (۱) واجب ایک فقہی اصطلاح ہے۔ اس کا درجہ فرض اور سنت مؤکدہ کے درمیان ہے۔ اس کا ثبوت دلیل قطعی الثبوت ظنی الدلالہ سے یا ظنی الثبوت قطعی الدلالہ سے اور دونوں ظنی ہوں تو قرائنِ منضمہ سے ہوتا ہے[1]۔ اور احکام کی یہ درجہ بندی اور ان کے لئے الفاظ کی تخصیص دورِ اول میں نہیں ہوئی تھی۔ یہ کام مجتہدین کے دور میں تکمیل پذیر ہوا ہے۔ پس

[1] دلیل قطعی الثبوت ظنی الدلالہ کی مثال: ﴿وعلى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ ہے۔ اس آیت سے صدقۂ فطر مراد لیا گیا ہے۔ مگر یہ دلالت قطعی نہیں ہے۔ کیونکہ روزے کا فدیہ بھی مراد ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلَى مَاهَدَاكُمْ﴾ سے عید کی نماز مراد لی گئی ہے کیونکہ اس میں تکبیرات زوائد ہوتی ہیں۔ مگر یہ دلالت بھی یقینی نہیں۔ مطلق بڑائی بیان کرنا بھی مراد ہوسکتا ہے۔

اور دلیل ظنی الثبوت قطعی الدلالہ کی مثال حدیث لا صلاۃ إلا بفاتحة الكتاب ہے۔ یہ روایت اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ مگر خبر واحد ہے۔ اس لئے ثبوت کے اعتبار سے ظنی ہے۔ اور فاتحہ کی ضرورت پر اس کی دلالت قطعی اور یقینی ہے۔ اور لا نفی کمال کا احتمال بے دلیل ہے۔ پس اس حدیث سے نماز میں فاتحہ کا وجوب ثابت ہوگا۔

اور دلیل ظنی الثبوت والدلالہ مع قرائن منضمہ کی مثال خود وتر کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں روایات کثیرہ کے علاوہ وجوب کے چار قرائن موجود ہیں۔ جن کی تفصیل کتاب میں ہے اور اس مسئلہ میں دونوں باتیں ظنی اس طرح ہیں کہ روایات اگرچہ انیس ہیں مگر ان میں سے کوئی اعلیٰ درجہ کی صحیح نہیں۔ ہر روایت کی سند میں تھوڑا بہت کلام ہے۔ مگر مجموعہ حسن لغیرہ ہو کر قابل استدلال ہو جاتا ہے۔ اور دلالت ظنی اس طرح ہے کہ وتر کا اطلاق تہجد پر بھی کیا گیا ہے۔ پس احتمال ہے کہ ان روایات میں وترِ حقیقی مراد نہ ہو، تہجد (وترِ مجازی) مراد ہو۔ اس لئے دیگر قرائن کو ساتھ میں ملانے کی ضرورت پیش آئی ۱۲

نصوص میں یہ اصطلاحی معنی مراد لینا درست نہیں۔ نصوص میں اُن الفاظ کے لغوی معنی مراد لیے جائیں گے۔

نیز یہ بات بھی معلوم رہنی چاہئے کہ دورِ اول میں صلاۃ اللیل اور وتر چونکہ ایک ساتھ رات کے آخر میں پڑھے جاتے تھے، اس لئے روایات میں دونوں کے مجموعہ پر صلاۃ اللیل کا بھی اطلاق کیا گیا ہے۔ اور صلاۃ الوتر کا بھی۔ اور کہیں حقیقت کا لحاظ کر کے دونوں نمازوں کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ وتر کتنے پڑھتے تھے؟ آپؓ نے جواب دیا: ''آپ ﷺ چار اور تین اور چھ اور تین اور آٹھ اور تین اور دس اور تین وتر پڑھتے تھے۔ اور سات سے کم اور تیرہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے (مشکوۃ حدیث ۱۲۶۴) اس روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اگرچہ مجموعہ پر وتر ہی کا اطلاق کیا ہے۔ مگر وترِ حقیقی اور صلاۃ اللیل کو الگ الگ بھی بیان کیا ہے۔ پس روایات پڑھتے وقت یہ غور کرنا ضروری ہے کہ کہاں اطلاق مجازی ہے اور کہاں حقیقی؟ اس کا لحاظ کئے بغیر شاید صحیح نتیجہ تک رسائی ممکن نہ ہو۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو صرف حفاظ کو وتر پڑھنے کا مشورہ دیا ہے تو اس سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ اور چونکہ حفاظ وتر بھی تہجد کے بعد پڑھیں گے اس لئے مجموعہ پر وتر کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اور آپؓ نے تمہید اس طرح اٹھائی ہے: **الوتر ليس بحَتْمٍ كصلاتكم المكتوبة ولكن سَنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم**: تہجد کی نماز اگرچہ فرائض کی طرح لازم نہیں، مگر رسول اللہ ﷺ کا معمول رہا ہے۔ اس لئے حفاظ کو اس کا اہتمام کرنا چاہئے تاکہ ان کا قرآن محفوظ رہے ـــــ اسی طرح حضرت ابن عمرؓ نے جو سعید بن یسار کو سواری پر وتر پڑھنے کے لئے کہا تھا (بخاری حدیث ۹۹۹) اس سے مراد بھی تہجد کی نماز ہے۔ کیونکہ طحاوی (۲۴۹:۱) میں ابن عمرؓ کا یہ عمل مروی ہے کہ آپ سواری پر نماز (تہجد) پڑھتے تھے اور وتر زمین پر اتر کر پڑھتے تھے: **ويزعم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يفعل كذلك**: اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ (اس روایت کی سند صحیح ہے)

اور حضرت ابن عمرؓ نے وتر پر واجب کا اطلاق کرنے سے جو احتراز کیا ہے، اس سے اصطلاحی واجب کی نفی نہیں نکلتی۔ کیونکہ آپؓ نے صاف وجوب کی نفی نہیں کی نہ سنت کا اطلاق کیا ہے۔ کیونکہ وتر کا معاملہ بیچ بیچ کا ہے۔ اور اس زمانہ میں اس درمیانی درجہ کے لئے اصطلاح مقرر نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح حضرت عبادہؓ نے جو ابو محمد کی بات کو غلط قرار دیا ہے تو وہ بھی واجب بمعنی فرض کی تکذیب کی ہے۔ آپؓ نے اپنی بات کی تائید میں جو حدیث سنائی ہے وہ اس کی واضح دلیل ہے ـــــ غرض کسی صاف صریح دلیل سے فقہی وجوب کی نفی نہیں ہوتی۔

فائدہ: (۲) وتر کے بارے میں پانچ باتوں پر غور کر کے فیصلہ کرنا چاہئے کہ اس کا درجہ کیا ہے؟

پہلی بات: انیس روایات ہیں جن میں وتر کی غایت درجہ تاکید آئی ہے۔ مثلاً: **الوتر حق فمن لم يُوتر فليس منا**: وتر برحق ہے۔ پس جو وتر نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں۔ آپؐ نے یہ بات مکرر تین بار ارشاد فرمائی (مشکوۃ حدیث

۱۲۷۸ابوداؤد نے اس کو صحیح سند سے روایت کیا ہے)

دوسری بات: آنحضرت ﷺ نے وتر مواظبتِ تامہ کے ساتھ ادا فرمائے ہیں۔ زندگی میں ایک بار بھی ترک نہیں فرمائے۔ اگر وتر واجب نہ ہوتے تو بیانِ جواز کے لئے، ایک ہی بار سہی، آپؐ وتر ترک فرماتے، تاکہ امت حقیقتِ حال سے واقف ہوتی۔

تیسری بات: وتر کا وقت مقرر ہے یعنی عشا کی نماز کے بعد سے طلوعِ فجر تک اس کا وقت ہے۔ اور یہ شان فرائض کی ہے۔ نوافل کے لئے اس طرح اوقات کی تعیین نہیں کی گئی۔

چوتھی بات: اگر کوئی شخص وتر پڑھنا بھول جائے یا سوتا رہ جائے تو یاد آنے پر یا بیدار ہونے پر اس کی قضا ضروری ہے (مشکوۃ حدیث ۱۲۷۹) اور یہ شان بھی فرائض کی ہے۔ نوافل کی اگرچہ وہ سنتِ مؤکدہ ہوں قضا نہیں ہے۔

پانچویں بات: وتر نہ پڑھنے کی کسی مجتہد نے اجازت نہیں دی۔ جو حضرات سنت کہتے ہیں، وہ بھی ترک وتر کے روادار نہیں امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو وتر نہیں پڑھتا اس کو سزا دی جائے گی اور وہ مردود الشہادۃ ہے'' امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص بالقصد وتر چھوڑتا ہے وہ برا آدمی ہے اور اس کی گواہی قبول نہیں کی جانی چاہئے''

مذکورہ پانچوں باتوں کے مجموعہ میں غور کیا جائے تو وتر کی مشابہت فرائض سے صاف نظر آئے گی۔ اور یہ بات سبھی ائمہ نے تسلیم کر لی ہے۔ ائمہ ثلاثہ بھی اگرچہ وتر کو سنت کہتے ہیں۔ مگر وہ اس کے ترک کے روادار نہیں، جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا۔ پس یہ اختلاف عنب وانگور کے اختلاف جیسا ہے یعنی محض لفظی اختلاف ہے۔ خواہ وتر کو واجب کہا جائے یا سنت: بہر حال اس کا پڑھنا بالاتفاق ضروری ہے۔

والأصل: أن صلاة الليل هي الوتر، وهو معنى قوله صلى الله عليه وسلم: " إن الله أمدَّكم بصلاة، هي الوتر، فصلوها ما بين العشاء إلى الفجر" وإنما شَرَعها النبي صلى الله عليه وسلم وِترًا، لأن الوتر عدد مبارك، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " إن الله وتر، يحب الوتر، فأوتروا ياأهلَ القرآن"

لكن لما رأى النبي صلى الله عليه وسلم أن القيام لصلاة الليل جُهْدٌ، لايطيقه إلا من وفِّق له، لم يُشَرِّعه تشريعًا عامًا، ورَخَّصَ في تقديم الوتر أولَ الليل، ورغَّب في تأخيره، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " من خاف أن لايقوم من آخر الليل، فليُوتر أولَه، ومن طمع أن يوتر آخره فليوتر آخِرَه، فإن صلاة الليل مشهودة، وذلك أفضل"

والحق: أن الوتر سنة، هو أوكدُ السنن، بيَّنه عليٌّ، وابن عمر، وعبادة بن الصامت رضي الله عنهم.

ترجمہ: اور بنیادی بات یہ ہے کہ صلاۃ اللیل ہی وتر ہے۔ اور وہی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے معنی ہیں کہ:

''بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس ایک نماز کی کمک بھیجی ہے۔ پس پڑھو تم اسے عشا اور فجر کے درمیان'' اور آپ ﷺ نے اس کو طاق ہی مقرر کیا، اس لئے کہ طاق مبارک عدد ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:
''بیشک اللہ تعالیٰ یگانہ ہیں۔ طاق کو پسند کرتے ہیں۔ پس وتر پڑھو اے قرآن والو! (یعنی حافظو)

لیکن جب نبی ﷺ نے دیکھا کہ تہجد کے لئے اٹھنا بھاری مشقت ہے، جس کی طاقت نہیں رکھتا مگر وہ جس کو اس کی توفیق دی گئی ہے، تو نہیں قانون بنایا آپؐ نے اس کو عام قانون۔ اور سہولت دی وتر کو مقدم کرنے کی شروع رات میں۔ اور ترغیب دی اس کی تاخیر کی۔ اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو ڈرتا ہے کہ نہیں کھڑا ہوگا آخر رات میں تو چاہئے کہ وہ شروع رات میں وتر پڑھ لے۔ اور جو امید کرتا ہے کہ آخر رات میں وتر پڑھے گا تو چاہئے کہ وہ آخر رات میں وتر پڑھے۔ پس بیشک رات کی نماز حاضری کا وقت ہے اور وہ افضل ہے''۔

اور برحق بات یہ ہے کہ وتر سنت ہے۔ وہ سنتوں میں سب سے زیادہ مؤکد ہے۔ بیان کی ہے یہ بات علی، ابن عمر اور عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہم نے۔

☆ ☆ ☆

تہجد کی گیارہ رکعتوں کی حکمت

حدیث ——— حضرت خارجہ بن حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس ایک نماز بطور کمک بھیجی ہے، جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ وہ وتر کی نماز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارے لئے مقرر کیا ہے عشا کی نماز اور طلوع فجر کے درمیان'' (مشکوۃ حدیث ۱۲۶۷)

تشریح: ''بطور کمک بھیجی ہے'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ وتر کی نماز محسنین کی ضرورت پیش نظر رکھ کر بھیجی گئی ہے۔ یہ نماز سب مسلمانوں پر لازم نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت نے احکام نازل کرنے میں تدریج ملحوظ رکھی ہے۔ ایک دم آخری حکم نازل نہیں کیا۔ مثبت ومنفی دونوں طرح کے احکام میں اس بات کا خیال رکھا ہے۔ مثلاً: لوگ شراب کے بری طرح عادی تھے۔ وہ ایک دم اس کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ تو رفتہ رفتہ حرمت نازل ہوئی۔ اسی طرح نمازیں لوگوں کی مقدرت کا خیال رکھ کر فرض کی گئی ہیں۔ اولاً صرف گیارہ رکعتیں فرض کی گئیں۔ کیونکہ لوگ اتنی ہی مقدار آسانی سے ادا کر سکتے تھے۔ پھر جب لوگوں کا ذوق وشوق بڑھ گیا تو چھ رکعتوں کا اضافہ کیا گیا۔ پھر نیکوکاروں کے لئے مزید گیارہ رکعتوں کی کمک بھیجی گئی، جو اصل فرض رکعتوں کے بقدر ہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کو اس کا ادراک تھا کہ محسنین (سالکین) زائد مقدار کے محتاج ہیں۔ سترہ رکعتوں سے ان کا کام بخوبی نہیں چل سکتا۔ غرض تہجد کی گیارہ رکعتیں اسی لئے تجویز کی گئی ہیں کہ یہ اصل فرض رکعتوں کی تعداد کے بقدر ہیں۔

اور فرض نمازوں کی رکعتوں میں پہلا اضافہ تو ہر کسی کے لئے تھا۔ مگر یہ گیارہ رکعتوں کی کمک صرف محسنین کے لئے ہے یعنی یہ نماز سنت ہے، ہر مسلمان پر لازم نہیں۔ اور اس کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ آپ نے ایک بار لوگوں کے سامنے یہ حدیث بیان کی کہ إن الله وتر، يحب الوتر، أوتروا ياأهلَ القرآن! تو ایک گنوار بولا: رسول اللہ ﷺ کیا فرمارہے ہیں؟ یعنی یہ اہل قرآن کو مخاطب بنا کر آپؐ نے کیا حکم دیا ہے؟ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: ليس لك، ولا لأصحابك: یہ نماز تیرے لئے اور تیرے جیسے گنواروں کے لئے نہیں ہے یہ تو محسنین کے لئے، حفاظ قرآن کے لئے اور ان لوگوں کے لئے ہے جو نیکوکاری میں دلچسپی رکھتے ہیں (ابن ماجہ حدیث ۱۱۷۰ ابوداؤد حدیث ۱۴۱۷)

فائدہ: (۱) ''بطور کمک بھیجی ہے'' میں غور کیا جائے تو اس طرف اشارہ ہے کہ وتر حقیقی واجب ہیں۔ کیونکہ مُمَدّ فيه اصل فرض نمازیں ہیں۔ اور مُمَدّ به وتر ہیں۔ اور مُمَدّ لهم مسلمان ہیں۔ اور کسی چیز میں اضافہ اصل کی جنس سے کیا جائے تو ہی امداد ہوتا ہے۔ فوج کی مدد کے لئے پیچھے سے فوجی روانہ کئے جائیں تو وہ فوجی کمک ہے۔ اگر عام لوگ روانہ کئے جائیں تو وہ فوجی کمک نہیں ہے۔ غرض وتر حقیقی کا عملاً فرضوں کی طرح ہونا اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ اور حضرت خارجہ کی حدیث میں وتر حقیقی مراد ہے۔ نماز تہجد مراد نہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی روایت: إن الله وتر إلخ میں جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی روایت کرتے ہیں: وتر سے مجازاً تہجد کی نماز مراد ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تہجد کی نماز گنواروں کے لئے نہیں ہے وہ تو بالفعل یا بالقوہ نیکوکاروں ہی کے لئے ہے۔

فائدہ: (۲) تہجد کی رکعتوں کی تعداد کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کا معمول بندھا ٹکا نہیں تھا۔ گیارہ سے کم وبیش رکعتیں بھی آپؐ نے پڑھی ہیں۔ پس گیارہ کی حکمت بیان کرنے سے بہتر کوئی ایسی عام حکمت بیان کرنا ہے جو تہجد کی تمام روایات کو اپنے جلو میں لے لے۔ اور وہ یہ ہے کہ معراج میں پچاس نمازیں یعنی پچاس رکعتیں فرض کی گئی تھیں۔ اصل نماز ایک ہی رکعت ہے۔ دو کا مجموعہ شُفعہ (جوڑی) ہے۔ پھر اللہ پاک نے کرم فرمایا اور تخفیف کر کے نمازیں پانچ کردیں۔ اور ثواب پچاس کا باقی رکھا۔ مگر یہ پانچ مسجد کی حاضری کے اعتبار سے ہیں۔ کیونکہ اصل دشواری اسی میں تھی اور رکعتوں کی تعداد میں کمی کر کے گیارہ فرض کیں۔ پھر پہلا اضافہ کر کے ان کو سترہ کردیا۔ پھر دوبارہ کمک بھیج کر بیس کی تعداد کردی۔ پس اب کل نمازیں (رکعتیں) بیس ادا کرنی ہیں۔ مگر مسجد کی حاضری پانچ ہی بار ہے، اس اعتبار سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

اور چونکہ یہ نسخ تخفیف کے لئے ہوا تھا، اس لئے اصل مقدار کا استحباب باقی ہے۔ اور محسنین کے سردار، جو ہمت وقوت میں بے مثال تھے، اصل تعداد پوری کرتے تھے۔ آپؐ کی شب وروز کی تمام نمازوں (فرائض، واجبات، سنن مؤکدہ، سنن غیر مؤکدہ، عام نوافل: اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد) کی رکعتوں کا مجموعہ دیکھا جائے، تو وہ پچاس سے کم ہرگز نہیں رہے گا۔ بڑھ جائے تو کوئی حرج نہیں۔

ان میں سے فرض، واجب اور سنن مؤکدہ تو آپ ہمیشہ پابندی سے معین وقت میں ادا فرماتے تھے۔ اور باقی تعداد

مختلف اوقات میں پوری فرماتے تھے یہی وجہ ہے کبھی اشراق، چاشت اوراوابین پڑھنے کی اور کبھی نہ پڑھنے کی۔ اور یہی وجہ ہے تہجد کی رکعتوں میں کمی بیشی کی۔

اور وتر کی تین رکعتیں اس لئے مقرر کی گئی ہیں کہ مغرب کی وجہ سے پچاس کی تعداد پوری نہیں ہوگی۔ ایک کم رہے گی یا ایک بڑھ جائے گی کیونکہ پچاس جُفت ہے۔ اس لئے رات میں وتر کا اضافہ کیا گیا تا کہ رات اور دن کے وتر مل کر جفت ہو جائیں، اور پچاس کا عدد تکمیل پذیر ہو۔ واللہ اعلم۔

> [۸] قوله صلى الله عليه وسلم :"إن الله أمدَّكم بصلاة، هي خير لكم من حُمْرِ النعم"
>
> أقول: هـذا إشـارة إلى أن الله تعالى لم يَفْرِض عليهم إلا مقدارًا يتأتّى منهم، ففرض عليهم أولاً إحدى عشرة ركعة، ثم أكملها بباقي الركعات في الحضر، ثم أمدَّها بالوتر للمحسنين، لعلمه صلى الله عليه وسلم أن المستعدين للإحسان يحتاجون إلى مقدار زائدٍ، فجعل الزيادة بقدر الأصل إحدى عشرة ركعة، وهو قول ابن مسعود رضي الله عنه للأعرابي:" ليس لك ولأصحابك!"

ترجمہ: (۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس کمک بھیجی ہے ایک نماز کے ذریعہ (یعنی یہی نماز کمک ہے۔ کمک ترکی لفظ ہے۔ اور اس فوج کو کہتے ہیں جو لڑائی میں مدد کے لئے بھیجی جاتی ہے) وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے (عربوں کے نزدیک سرخ اونٹ بہترین دولت تھے)

میں کہتا ہوں: یہ (لفظ أمدّكم) اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر نہیں فرض کی ہے مگر وہ مقدار جو ان سے حاصل ہو سکے (یعنی جو ان کی مقدرت میں ہو) چنانچہ فرض کی ان پر اولاً گیارہ رکعتیں۔ پھر مکمل کیا ان کو باقی رکعتوں سے حضر میں۔ پھر اضافہ کیا ان میں تہجد کی نماز کا سالکین کے لئے، آنحضرت ﷺ کے جاننے کی وجہ سے کہ نیکوکاری کے لئے تیار ہونے والے محتاج ہیں ایک زائد مقدار کے۔ پس زیادتی کو اصل کے بقدر گیارہ رکعتیں کیا۔ اور وہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے گنوار سے: "نہیں ہے (تہجد) تیرے لئے اور تیرے ساتھیوں کے لئے"

☆ ☆ ☆

وتر کے اذکار

پہلا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے اپنے نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو قنوت میں پڑھنے کے لئے یہ دعا تعلیم فرمائی ہے: اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا أَعْطَيْتَ، وَقِنِيْ

شَرَّ مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِيْ وَلاَيُقْضٰى عَلَيْكَ، إِنَّهُ لاَيَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ وَلاَيَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ (اے اللہ! مجھے ہدایت عطا فرما اُن بندوں میں شامل کر کے جن کو آپ نے ہدایت عطا فرمائی۔ اور مجھے عافیت (بلاؤں سے سلامتی) عطا فرما اُن بندوں میں شامل کر کے جن کو آپ نے عافیت عطا فرمائی۔ اور میرا کارساز بن جا اُن بندوں میں شامل کر کے جن کی آپ کارسازی فرماتے ہیں۔ اور مجھے برکت عطا فرما اُن چیزوں میں جو آپ نے عطا فرمائی۔ اور مجھے بچالے ان فیصلوں کے اثراتِ بد سے جو آپ نے کئے۔ پس بیشک آپ فیصلہ کرتے ہیں، اور آپ کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ بیشک شان یہ ہے کہ وہ شخص رسوا نہیں ہوتا جس کو آپ دوست بنالیں۔ اور وہ شخص عزت نہیں پاتا جس سے آپ دشمنی رکھیں۔ آپ برکت والے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور آپ کی شان بہت بلند ہے)

فائدہ: بعض روایات میں آخر میں اَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ بھی آیا ہے یعنی میں آپ سے گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں اور آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور بعض روایات میں اس کے بعد یہ درود بھی آیا ہے وَصَلَّى اللهُ عَلَى النَّبِيِّ یعنی اور بے پایاں رحمتیں نازل فرمائیں اللہ تعالیٰ نبیِ پاک پر۔

فائدہ: اکثر ائمہ نے وتر میں پڑھنے کے لئے اسی قنوت کو اختیار فرمایا ہے۔ اور حنفیہ میں جو قنوت رائج ہے یعنی اللهم إنا نستعينك إلخ اس کو ابن ابی شیبہ اور طحاوی وغیرہ نے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ پس بہتر یہ ہے کہ دونوں قنوت یاد کر لے اور کبھی یہ اور کبھی وہ پڑھے۔

فائدہ: حضرت حسن والا قنوت مشکوۃ حدیث ۱۲۷۳ میں ہے۔ البتہ ولا يعز من عاديت کا جملہ بیہقی وغیرہ میں ہے۔

دوسرا ذکر: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے آخر میں یہ دعا کیا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ، لاَأُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ (مشکوۃ حدیث ۱۲۷۶) یعنی اے اللہ! میں آپ کی ناراضی سے آپ کی رضامندی کی پناہ چاہتا ہوں۔ اور آپ کی سزا سے آپ کی عافیت بخشی کی پناہ چاہتا ہوں۔ اور آپ سے (یعنی آپ کی ناراضگی سے) آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ میں آپ کی ثنا کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ آپ ویسے ہی ہیں جیسی آپ نے اپنی ثنا کی ہے۔

فائدہ: ممکن ہے آپؐ یہ دعا قنوت کے طور پر پڑھتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آخری قعدہ میں سلام سے پہلے یا سلام کے بعد یہ دعا کرتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے وتر کے سجدوں میں یہ دعا کرتے ہوں۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں اس کی صراحت ہے۔

تیسرا ذکر: حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وتر کا سلام پھیرتے تھے تو کہتے تھے: سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ اور نسائی کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ یہ کلمہ تین دفعہ کہتے تھے اور تیسری دفعہ یہ

کلمہ بلند آواز سے کہتے تھے (مشکوۃ حدیث ۱۲۷۴ و ۱۲۷۵)

وتر میں مسنون قراءت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی پہلی رکعت میں سورۃ الاعلی، دوسری میں سورۃ الکافرون اور تیسری میں سورۃ الاخلاص اور معوذتین پڑھتے تھے (مشکوۃ حدیث ۱۲۶۹) اور نسائی نے حضرت عبدالرحمن بن اَبزیٰ سے اور امام احمد نے حضرت ابی بن کعب سے اور دارمی نے حضرت ابن عباس سے یہی روایت کی ہے۔ مگر ان حضرات نے تیسری رکعت میں معوذتین کا تذکرہ نہیں کیا (مشکوۃ حوالہ بالا) شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آپؐ یہ قراءت اس وقت فرماتے تھے جب وتر کی تینوں رکعتیں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔

فائدہ: ایسی کوئی صریح روایت میرے علم میں نہیں ہے، جس میں یہ بات آئی ہو کہ آنحضرت ﷺ نے وتر کی تیسری رکعت سلام پھیرنے کے بعد پڑھی ہے یا کبھی صرف ایک رکعت وتر پڑھی ہے۔ البتہ نسائی (۳: ۲۳۵ باب کیف الوتر بثلاث) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہے: کان لایسلِّم فی رکعتي الوتر: آنحضرت ﷺ وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرا کرتے تھے۔ بلکہ ان کے ساتھ تیسری ملا کر تینوں ایک سلام سے پڑھتے تھے۔

رہی روایت کان یوتر برکعة یا آپؐ کا ارشاد أوتر برکعة تو اس کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: ان روایات کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک رکعت علحدہ پڑھا کرتے تھے اور اسی کا آپ نے حکم دیا ہے۔ مگر احناف کے نزدیک ان روایات کا مطلب: یہ ہے کہ آپؐ ایک رکعت کو دوگانہ کے ساتھ ملا کر اس کو طاق بناتے تھے۔ اور آپؐ نے یہی حکم بھی دیا ہے کہ تہجد دو دو، دو دو رکعتیں پڑھتے رہو۔ پھر جب صبح کا اندیشہ ہو تو دو پر سلام نہ پھیرو بلکہ دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت ملا کر پڑھو تاکہ یہ تین رکعتیں طاق ہو جائیں۔ پھر وہ رات کی نماز میں شامل ہو کر سب کو طاق بنا دیں گی۔ غرض جب اس روایت کے دو مطلب ہیں تو یہ روایت صریح نہ رہی۔ اور پہلا مطلب کسی صریح روایت سے مؤید نہیں۔ اور دوسرا مطلب نسائی کی روایت سے مؤید ہے۔ علاوہ ازیں رُوات وتر کی تین رکعتوں کی قراءت تو بیان کرتے ہیں۔ مگر کوئی راوی صرف ایک روایت کی قراءت بیان نہیں کرتا۔ یہ بھی واضح قرینہ ہے کہ معمولِ نبوی وتر کی تینوں رکعتیں ایک ساتھ پڑھنے کا تھا۔ واللہ اعلم۔

ومن أذکار الوتر: کلماتٌ علّمها النبی صلی اللہ علیه وسلم الحسنَ بن علی رضی الله عنهما، فکان یقولها فی قنوت الوتر: "اللهم اهدنی فیمن هدیتَ، وعافنی فیمن عافیتَ، وتولنی فیمن تولیت، وبارك لی فیما أعطیت، وقنی شرما قضیت، فإنك تقضی ولایقضٰی علیك، إنه لایذل من والیت، ولایعز من عادیت، تبارکت ربنا وتعالیت"

ومنها : أن يقول في آخره: " اللهم إني أعوذ برضاك من سخطك، وأعوذ بمعافاتك من عقوبتك، وأعوذ بك منك، لا أحصي ثناءً عليك، أنت كما أثنيت على نفسك"

ومنها: أن يقول إذا سلّم:" سبحان الملك القدوس" ثلاث مرات، يرفع صوته في الثالثة.

وكان النبي صلى الله عليه وسلم إذا صلاها ثلاثاً، يقرأ في الأولى بسبح اسم ربك الأعلى، وفي الثانية بقل ياأيها الكافرون، وفي الثالثة بقل هو الله أحد والمعوّذتين.

ترجمہ: وتر کے اذکار میں سے چند کلمات ہیں جو نبی ﷺ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو سکھلائے ہیں۔ پس حضرت حسنؓ ان کلمات کو وتر کے قنوت میں پڑھا کرتے تھے۔ اللهم إلخ اور ان اذکار میں سے یہ ہے کہ وتر کے آخر میں کہے: اللهم إلخ اور ان اذکار میں سے یہ ہے کہ کہے جب سلام پھیرے۔ سبحان الملک القدوس تین مرتبہ۔ اونچی کرکے اپنی آواز تیسری بار میں۔

اور نبی ﷺ جب وتر کی نماز تین رکعتیں پڑھتے تھے تو پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ اور دوسری میں سورۃ الکافرون اور تیسری میں سورۃ الاخلاص اور معوذتین پڑھتے تھے۔

تراویح کی مشروعیت کی وجہ

نوافل میں تیسری نماز: تراویح کی نماز ہے۔ یہ سنت (نفل) ہے، فرض نہیں ہے اور اس کی مشروعیت کی وجہ یہ ہے کہ ماہِ رمضان سے مقصود: مسلمانوں کو فرشتوں کی لڑی میں پرونا اور ان کو فرشتہ صفت بنانا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ماہِ رمضان کی عبادتوں کے دو درجے مقرر کئے: ایک: عوام کے لئے۔ اس درجہ میں روزے اور دیگر فرائض ہیں۔ دوسرا: نیکوکاروں کے لئے یعنی اللہ کے مقرب بندوں کے لئے۔ اس درجہ میں روزوں کے ساتھ تراویح، زبان کی حفاظت مع اعتکاف اور آخری عشرہ میں عبادتوں میں جُت جانا ہے۔ کیونکہ نبی پاک ﷺ کو اس بات کا ادراک تھا کہ ساری امت مقاصدِ رمضان کی تحصیل کے لئے اعلیٰ درجہ کی ریاضتوں پر کاربند نہیں ہوسکتی۔ اور ہر شخص پر اس کی طاقت کے بقدر عبادتیں ضروری بھی ہیں۔ اس لئے آپؐ نے رمضان میں تراویح کی نماز کو بطور استحباب مشروع فرمایا۔ مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تراویح کی ترغیب دیتے تھے، تاکید (وجوب) کے ساتھ حکم دیئے بغیر۔ پس فرماتے تھے کہ جو شخص ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح وتہجد) پڑھے گا، اس کے سب پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے (مشکوۃ حدیث ۱۲۹۶ باب قیام شهر رمضان)

ومنها: قيام شهر رمضان:

والسر في مشروعيته: أن المقصود من رمضان أن يَلْحَقَ المسلمون بالملائكة، ويتشبَّهون بهم، فجعل النبيُّ صلى الله عليه وسلم ذلك على درجتين:

[۱] درجةُ العوام: وهي صوم رمضان، والاكتفاء على الفرائض.

[۲] ودرجةُ المحسنين: وهي صوم رمضان، وقيامُ لياليه، وتنزيهُ اللسان مع الاعتكاف، وشدُّ المِئْزَرِ في العشر الأواخر.

وقد علم النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن جميعَ الأمة لايستطيعون الأخذَ بالدرجة العليا، ولابد من أن يفعلَ كل واحد مجهودَه.

ترجمہ: اورنوافل میں سے: ماہِ رمضان کے نوافل یعنی تراویح ہے:

اور راز اس کی مشروعیت میں یہ ہے کہ رمضان سے مقصود یہ ہے کہ مسلمان فرشتوں کے ساتھ ملحق ہوجائیں اور ان کے مانند بن جائیں۔ پس نبی ﷺ نے اس کو دو درجوں میں کردیا: (۱) عوام کا درجہ: اور وہ رمضان کے روزے رکھنا اور فرائض پر اکتفا کرنا ہے (۲) اور سالکین کا درجہ: اور وہ رمضان کے روزے رکھنا، اور اس کی راتوں میں نوافل پڑھنا اور زبان کی حفاظت کرنا اعتکاف کے ساتھ اور تہبند مضبوط کسنا ہے عشرۂ اخیرہ میں —— اور نبی ﷺ جانتے تھے کہ ساری امت طاقت نہیں رکھتی درجۂ علیا پر عمل پیرا ہونے کی۔ اور ضروری تھا ہر شخص پر کہ اپنی طاقت کے بقدر عمل کرے۔

☆ ☆ ☆

دورِنبوی میں تراویح جماعت سے کیوں نہیں پڑھی گئی؟

نبی ﷺ کا معمول رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرنے کا تھا۔ آپؐ کے لئے مسجد میں بوریے کا حجرہ بنادیا جاتا تھا۔ آپؐ اسی میں رات میں نوافل ادا فرماتے تھے۔ اور لوگ اپنے گھروں میں اور مسجد میں نوافل میں مشغول رہتے تھے۔ ایک رات اچانک آپؐ حجرہ سے باہر تشریف لائے۔ اور مسجد میں موجود لوگوں سے فرمایا: آؤ، میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ صبح جب اس بات کا چرچا ہوا تو اگلی رات میں لوگ کافی تعداد میں جمع ہوگئے۔ یہ امید لے کر کہ شاید آج بھی آپؐ نوافل پڑھائیں۔ آپ حسبِ امید تشریف لائے۔ اور نماز پڑھائی۔ اب تو لوگوں کو غالب گمان ہوگیا کہ آپؐ اسی طرح ہر رات نوافل پڑھائیں گے۔ چنانچہ تیسری رات مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ مگر آپؐ تشریف نہ لائے۔ لوگوں نے خیال کیا کہ شاید آنکھ لگ گئی ہے۔ اس لئے کسی نے کھنکارا، کسی نے حجرے کی چٹائی پر کنکری ڈالی کہ آواز سے

آنکھ کھل جائے۔ تاہم آپ تشریف نہ لائے۔ لوگ مایوس ہو کر منتشر ہو گئے۔ صبح آپؐ نے فرمایا: ''میں رات برابر تمہارا طرزِ عمل دیکھتا رہا، یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ نماز تم پر فرض کی جائے۔ اور اگر یہ نماز تم پر فرض کی جائے گی تو تم اس کو نباہ نہ سکو گے'' (مشکوۃ حدیث ۱۲۹۵)

تشریح: احکام کی تشریع کی ایک صورت یہ ہے کہ نبی اور امت دونوں کسی حکم کو چاہیں تو وہ حکم لازم کر دیا جاتا ہے۔ اور کوئی ایک بھی پیچھے ہٹے وہ حکم لازم نہیں کیا جاتا۔ مثلاً روایات سے آنحضرت ﷺ کی شدید خواہش کا پتہ چلتا ہے کہ ہر نماز سے پہلے مسواک کو ضروری قرار دیا جائے۔ اور آپ نے اپنی اس خواہش کا لوگوں سے اظہار بھی فرمایا۔ مگر لوگوں نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ ان کی طرف سے کوئی پر جوش جواب نہ ملا تو مسواک لازم نہ ہوئی۔ اور حج کی مثال آگے آئے گی کہ آپؐ سے بار بار سوال کیا گیا کہ حج ہر سال فرض ہے؟ آپؐ نے تیسری مرتبہ سوال کے جواب میں فرمایا کہ نہیں اور یہ بھی فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا، اور وہ تمہاری استطاعت سے باہر تھا۔ اسی طرح باجماعت تراویح کے معاملہ میں بھی لوگوں کی طرف سے انتہائی جوش وخروش دیکھنے میں آیا۔ مگر نبیؐ امت کے ذہن میں ایک اندیشہ آیا۔ اور آپؐ نے قدم پیچھے ہٹالیا، تو یہ نماز بھی لازم نہ ہوئی۔ مگر دو دن آپ کا نماز پڑھانا، باجماعت تراویح کے استحسان پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے جب فرضیت کا اندیشہ نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے صحابہ وتابعین کو موفق کیا، اور انھوں نے باجماعت تراویح کا نظام چلایا۔ یہ شاہ صاحب کی بات کا خلاصہ ہے۔ اب یہی بات آپ کے الفاظ میں پڑھیں۔ فرماتے ہیں:

لوگوں پر وہی عبادتیں لازم کی جاتی ہیں جن پر ان کے نفوس مطمئن ہوں (اور تراویح کے معاملہ میں یہ بات صحابہ کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہو رہی تھی) مگر نبی ﷺ کو اندیشہ ہوا کہ اگر امت کا ہراول دستہ اس نماز کا عادی بن گیا۔ اور وہ اس عبادت میں کوتاہی کو اللہ کے دین میں کوتاہی تصور کرنے لگا، یا یہ عبادت دین کا شعار بن گئی تو قرآن میں اس کی فرضیت نازل ہوگی۔ اور آئندہ نسلوں کے لئے یہ حکم بھاری ہوگا —— اور یہ اندیشہ آپؐ کو اس وقت لاحق ہوا جب آپؐ نے محسوس کیا کہ حکمتِ خداوندی چاہتی ہے کہ مسلمان فرشتوں کی مشابہت اختیار کریں۔ اور آپؐ کو یہ بھی احساس ہوا کہ کچھ بعید نہیں کہ یہ نماز معمولی تشہیر سے، اور اس پر لوگوں کے قلوب کے مطمئن ہونے سے، اور اس کا غایت درجہ اہتمام کرنے سے لازم کر دی جائے (اس لئے آپؐ نے قدم پیچھے ہٹالیا)

مگر آپؐ کو جو احساس ہوا تھا وہ برحق احساس تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی فراست کو اس طرح سچا کر دکھایا کہ آپؐ کے بعد لوگوں کے دلوں میں یہ بات الہام فرمائی کہ وہ اس عبادت کا پورا پورا اہتمام کریں۔ چنانچہ صحابہ نے جماعت کا نظام بنا کر اس نماز کو امت میں رائج کیا (اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ عمرؓ کی قبر کو منور کریں جس طرح انھوں نے ہماری مسجدوں کو منور کیا'' یہ ارشاد دعائے خیر کے علاوہ تراویح کے اہتمام پر بھی دلالت کرتا ہے)

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم : " مازال بكم الذى رأيتُ من صنيعكم، حتى خشيتُ أن يُكتب عليكم، ولو كُتب عليكم ما قمتم به"

اعلم : أن العبادات لا تُوقَّتُ عليهم إلا بما اطْمَأَنَّتْ به نفوسُهم، فخشىَ النبىُّ صلى الله عليه وسلم أن يعتاد ذلك أوائلُ الأمة، فتطمئن به نفوسُهم، ويجدوا فى نفوسهم عند التقصير فيها التفريطَ فى جنب الله، أو يصيرَ من شعائر الدين فَيُفْرَض عليهم، ويَنزل القرآنُ، فيَثْقُل على أواخرهم.

وما خَشِيَ ذلك حتى تَفَرَّسَ أن الرحمةَ التشريعيةَ تُريد أن تُكلِّفهم بالتشبُّهِ بالملكوت، وأن ليس ببعيد أن ينزل القرآن لأدنى تشهير فيهم، واطمئنانهم به، وعَضِّهم عليه بالنواجذ، ولقد صدَّق الله فِرَاسَتَهُ، فنَفَثَ فى قلوب المؤمنين من بعده: أن يَعَضُّوا عليها بنواجذهم.

ترجمہ: (۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ”برابر رہا تمہارے ساتھ وہ جو دیکھا میں نے تمہارے طرز عمل (شوق وذوق) سے، یہاں تک کہ ڈرا میں کہ فرض کی جائے وہ تم پر۔ اور اگر فرض کی جائے گی وہ تم پر تو تم اس کو نباہ نہیں سکو گے“

جان لیں کہ عبادتیں نہیں متعین کی جاتیں لوگوں پر مگر وہی جن پر ان کے نفوس مطمئن ہوں۔ پس خوف ہوا نبی ﷺ کو کہ عادی بن جائیں امت کے اوائل اس نماز کے، پس مطمئن ہوجائیں اس پر ان کے نفوس۔ اور پائیں وہ اپنے دلوں میں اس عبادت میں کوتاہی کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے پہلو میں کوتاہی، یا ہوجائے وہ عبادت دین کے شعائر میں سے، پس فرض کردی جائے وہ ان پر، اور نازل ہو قرآن، پس بھاری ہوجائے وہ ان کے پچھلوں پر۔

اور نہیں خوف ہوا آپؐ کو اس کا، یہاں تک کہ بھانپ لیا آپؐ نے کہ رحمتِ تشریعیہ چاہتی ہے کہ وہ مکلف بنائے لوگوں کو فرشتوں کے ساتھ مشابہ ہونے کا۔ اور یہ (بات بھانپی) کہ بعید نہیں کہ قرآن نازل ہو، ان میں ذرا سی تشہیر سے، اور ان کے اس عبادت پر مطمئن ہونے سے۔ اور ان کے اس عبادت کو ڈاڑھوں سے کاٹنے کی وجہ سے۔ اور البتہ تحقیق سچا کر دکھایا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی فراست کو۔ پس پھونکا آپؐ کے بعد مؤمنین کے دلوں میں کہ وہ اس عبادت کو اپنی ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑیں۔

☆ ☆ ☆

تراویح مغفرت کا سبب کس طرح ہوتی ہے؟

حدیث ــــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص رمضان کے روزے ایمان واحتساب کے ساتھ رکھے گا، اس کے سب پچھلے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ اور جو شخص رمضان کی

راتوں میں ایمان واحتساب کے ساتھ نوافل پڑھے گا، اس کے سب پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔ اور جو شخص شب قدر میں ایمان واحتساب کے ساتھ نوافل پڑھے گا، اس کے سب پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے'' (متفق علیہ)

تشریح: جو شخص مذکورہ بالا رمضان کی عبادتوں کے دو درجوں میں سے درجۂ علیا پر عمل پیرا ہوتا ہے، وہ اپنے اندر رحمتِ الٰہی کے جھونکوں کو جمنے کا موقعہ دیتا ہے۔ اور جہاں یہ جھونکے جگہ پکڑتے ہیں، ملکیت ابھرتی ہے، اور بہیمیت کے نقوش یعنی برائیاں مٹ جاتی ہیں اور رحمتِ خداوندی گناہوں کی گندگی کو دھو دیتی ہے۔

فائدہ: اور ایمان واحتساب کا مطلب یہ ہے کہ عمل کی بنیاد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہو اور اللہ ورسول نے جس اجر وثواب کا وعدہ کیا ہے اس پر کامل یقین ہو، یہ بات ذہن میں مستحضر کرکے عمل کیا جائے تو عمل آسان بھی ہوجاتا ہے اور جاندار بھی۔

[۱۰] قوله صلى الله عليه وسلم: " من قام رمضان إيمانا واحتسابًا، غُفرله ما تقدَّم من ذنبه"

وذلك: لأنه بالأخذ بهذه الدرجةِ أمْكَنَ من نفسه لِنَفَحَاتِ ربه، المقتضيةِ لظهور الملكية، وتكفير السيئات.

ترجمہ: (۱۰) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... اور یہ بات اس لئے ہے کہ اس شخص نے اس (دوسرے) درجہ پر عمل کرکے اپنے اندر اپنے پروردگار کے جھونکوں کو جمنے کا موقعہ دیا ہے، جو ملکیت کے ظہور کو اور سیئات کے مٹانے کو چاہنے والے ہیں۔

نوٹ: بهذه مخطوط کراچی میں هذه ہے اور اسم اشارہ مشارٌ الیہ سے مل کر أخذ مصدر کا مفعول بہ ہے۔ مگر کسی نے اس کو بهذه سے بدلا ہے اور یہ زیادہ واضح ہے، اس لئے اسی کو باقی رکھا گیا ہے۔ أخذَه اور أخذَ به دونوں طرح درست ہے۔

☆ ☆ ☆

باجماعت بیس رکعت تراویح پڑھنے کی حکمتیں

شاہ صاحب قدس سرہ کے نزدیک تراویح کی اصل آنحضرت ﷺ کی تہجد کی گیارہ رکعتوں والی روایت ہے۔ اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک آنحضرت ﷺ نے اسی کو تہجد کے وقت میں دو دن جماعت سے پڑھایا تھا۔ اس لئے فرماتے ہیں:

صحابۂ کرام اور بعد کے لوگوں نے قیامِ رمضان میں تین چیزوں کا اضافہ کیا ہے:

اول: مسجد میں جماعت کے ساتھ تراویح ادا کرنے کا نظام بنایا۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ اس طرح مساجد میں

اجتماعی شکل میں ادائیگی میں عوام وخواص سب کے لئے سہولت ہے، کیونکہ لوگ انفرادی طور پر گھروں میں پابندی سے اس کو ادا نہیں کرسکتے۔

دوم: بجائے اخیر شب کے شروع رات میں پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ حالانکہ وہ حضرات اس بات کے قائل تھے کہ آخر شب کی نماز فرشتوں کی حاضری کا وقت ہے اور وہ افضل ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر تنبیہ کی ہے۔ بخاری شریف (حدیث ۲۰۱۰) میں آپ کا یہ قول مروی ہے: والتی ینامون عنها أفضل من التی یقومون، یرید آخر اللیل، وکان الناس یقومون أوّله: یعنی وہ نماز جس سے لوگ سوتے رہتے ہیں (یعنی تہجد) افضل ہے اس نماز سے جس کو لوگ ادا کررہے ہیں۔ راوی کہتے ہیں: ینامون عنها سے آپ کی مراد آخر شب کی نماز ہے۔ اور لوگ تراویح شروع رات میں ادا کرتے تھے (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۰۱) ——— اور اس کی حکمت بھی وہی آسانی ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا یعنی شروع رات میں پڑھنے میں آسانی ہے۔ آخر شب میں جمع ہونے میں دشواری ہے۔

سوم: تراویح کی گیارہ کے بجائے بیس رکعتیں مقرر کیں۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ صحابہ نے دیکھا کہ نبی ﷺ نے نیکوکاروں کے لئے پورے سال میں تہجد کی گیارہ رکعتیں متعین کی ہیں۔ پس صحابہ نے فیصلہ کیا کہ ماہِ رمضان میں جبکہ مسلمان ملائکہ کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں، رکعتوں کی اتنی تعداد کافی نہیں۔ کم از کم دوچند تو ہونی ہی چاہئے۔ اور گیارہ کا دوگنا بائیس تھا، جو جفت عدد تھا۔ پس یا تو دس کا اضافہ کیا جائے گا یا بارہ کا۔ اور چونکہ رمضان عبادتوں کا مہینہ تھا اس لئے بجائے دس کے صحابہ نے بارہ کا اضافہ کیا۔ پس مجموعہ ۲۳ ہوگیا۔ موطا میں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے گیارہ رکعتیں پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ جن سے لوگ فجر سے کچھ ہی دیر پہلے فارغ ہوتے تھے۔ پھر آپ نے رکعتوں کی تعداد بڑھا کر بیس کردی جو وتر کے ساتھ ۲۳ ہوجاتی ہے اور قراءت ہلکی کرنے کا حکم دیا۔

فائدہ: فیض الباری شرح صحیح البخاری (۲: ۴۲۰) وغیرہ میں ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تراویح کی بیس رکعتوں کے لئے آنحضرت ﷺ کی جانب سے کوئی عہد تھا؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جواب دیا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی طرف سے ایجاد کرنے والے نہیں تھے یعنی یقیناً ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت تھا۔

اور بیہقی، طبرانی، ابن ابی شیبہ، بغوی اور عبد بن حمید نے ایک ضعیف روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کی ہے کہ نبی ﷺ ماہِ رمضان میں بغیر جماعت کے بیس رکعتیں اور وتر پڑھتے تھے۔ پس مذکورہ حکمت کی مؤید یہ دلیل نقلی بھی ہوگئی۔

علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ ارشاد جو ابھی بیان ہوا ہے صاف اشارہ کرتا ہے کہ اولاً آپ نے جو گیارہ رکعت پڑھانے کا حکم دیا تھا، اور جس کو تہجد کے وقت تک جاری رکھا جاتا تھا: اس کا مدار تہجد کی روایت پر تھا۔ مگر بعد میں یہ

بات واضح ہوئی کہ رمضان میں بھی تہجد اپنی جگہ پر ہے۔ اور قیام رمضان (تراویح) اس کے علاوہ نماز ہے۔ چنانچہ آپ نے اُس قیاس کی بنا پر جو شاہ صاحب نے بیان کیا ہے یا اس روایت کی بنا پر جس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: رکعتوں کی تعداد بڑھادی۔ اور قراءت میں تخفیف کردی۔ تاکہ لوگ تراویح سے فارغ ہوکر سو جائیں۔ اور آخر شب میں اٹھ کر حسب معمول تہجد ادا کریں۔ پس یہ کہنا تو درست ہے کہ اولاً تراویح کی رکعتوں کی تعداد کا مدار تہجد کی روایت پر رکھا گیا تھا۔ مگر آخر میں یہ صورتِ حال بدل گئی تھی۔ اور رمضان میں شروع رات میں نوافل پڑھنے کا معمول تو دورِ نبوت سے چلا آرہا تھا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے دن جماعت سے تراویح کی نماز تہائی رات تک پڑھائی۔ یہ بات اسی وقت معقول ہے جبکہ شروع رات ہی سے نماز شروع کی گئی ہو پس وقت میں تبدیلی کی بات بھی غور طلب ہے۔

یہاں اگر کوئی یہ خیال کرے کہ جب بیس رکعتوں کی بنیاد حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے، اور تراویح کے وقت میں بھی کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی، اور باجماعت پڑھنے کی بھی اصل ہے، تو آخر حضرت عمرؓ نے بدعت حسنہ کس چیز کو فرمایا ہے؟ اس کا جواب سمجھنے کے لئے پہلے وہ روایت سامنے آنی ضروری ہے:

عبدالرحمٰن بن عبد جو قبیلۂ قارہ کے جلیل القدر تابعی ہیں، فرماتے ہیں کہ میں ایک شب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد نبوی میں گیا۔ وہاں یہ منظر سامنے آیا کہ لوگ متفرق جماعتیں بنے ہوئے تھے: کوئی اپنی نماز پڑھ رہا تھا، اور کسی کے پیچھے ایک گروہ نماز پڑھ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''میں اگر ان لوگوں کو ایک قاری پر جمع کردوں تو بہتر ہوگا'' پھر آپ نے پختہ ارادہ کیا۔ اور سب کو حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ پر جمع کردیا —— عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں پھر حضرت عمرؓ کے ساتھ ایک اور شب میں مسجد نبوی میں گیا۔ لوگ اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کررہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نِعْمَتِ البدعۃُ ھذہ، والتی تنامون عنھا أفضلُ من التی تقومون یعنی یہ نہایت عمدہ نئی بات ہے۔ اور جس نماز سے تم سوتے رہتے ہو وہ اس سے جس کو تم ادا کررہے ہو افضل ہے (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۱۳۰۱)

اس ارشاد کا پس منظر دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

ایک: یہ کہ جب تراویح کا باقاعدہ نظام بنایا گیا تو لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ یہ کیا بدعت شروع ہوئی! جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی پختہ بنائی تو بعض نے کہا کہ یہ تو کسری کا محل تعمیر ہوگیا!

دوسری: یہ کہ تہجد کی نماز کو آخر شب کے بجائے شروع رات میں کیوں کردیا؟ آخر شب افضل وقت ہے!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مذکورہ ارشاد میں دونوں باتوں کا جواب دیا:

پہلی بات کا جواب: یہ دیا کہ اگر یہ نئی چیز ہے تو نہایت شاندار نئی چیز ہے، کیونکہ اس کی اصل موجود ہے، اور وہ آپ ﷺ کا دو دن باجماعت نوافل پڑھانا ہے —— آپؓ نے لفظ بدعت اس کے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے،

اور بالفرض کلام کیا ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے بدعت: بدعتِ حسنہ بھی ہوتی ہے اور سیئہ بھی۔ اور بدعت اصطلاحی صرف بدعت سیئہ ہوتی ہے۔ وہ حسنہ نہیں ہوتی۔

اور دوسری بات کا جواب: آپ نے یہ دیا ہے کہ یہ تہجد کی نماز نہیں ہے۔ تہجد اپنی جگہ برقرار ہے۔ جس سے لوگ غفلت برتتے ہیں سحری کے لئے اٹھتے ہیں، پھر بھی نہیں پڑھتے، حالانکہ وہ تراویح سے افضل ہے۔

پس آپ کے اس ارشاد سے صاف معلوم ہوا کہ تراویح: تہجد کی تقدیم نہیں ہے۔ اور اس کی باجماعت ادائیگی بھی بدعت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی اصل موجود ہے۔ اور وہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہجد کی روایت تراویح کی اصل نہیں ہوسکتی۔ پس جن اکابر علماء نے دونوں روایتوں میں موازنہ کیا ہے اور حضرت عائشہؓ کی روایت کو اصح قرار دیا ہے۔ یہ موازنہ کرنا درست نہیں۔ موازنہ ایک باب کی دو روایتوں میں کیا جاتا ہے۔ دو الگ الگ بابوں کی روایات میں نہیں کیا جاتا۔

رہا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کا ضعف تو اس کی تلافی تعامل سے ہوجاتی ہے۔ بلکہ تعامل کی موجودگی میں روایت کی سرے سے ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً کلمہ اسلام: لا إلٰـه إلا الله — محمد رسول الله کسی روایت سے ثابت نہیں۔ اگرچہ اس کے دونوں اجزاء قرآن کریم میں الگ الگ آئے ہیں۔ مگر دونوں کا مجموعہ کلمہ اسلام ہے۔ یہ بات کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت نہیں۔ مگر چونکہ پوری امتِ مسلمہ کا اس پر تعامل ہے۔ اور اجماع دلیلِ اقوی ہے، اس لئے سند کی مطلق ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

وزادت الصحابةُ ومن بعدَهم في قيام رمضان ثلاثةَ أشياءَ:

[۱] الاجتماعَ له في مساجدهم؛ وذلك: لأنه يفيد التيسير على خاصتهم وعامتهم.

[۲] وأداؤَه في أول الليل، مع القول بأن صلاةَ آخر الليل مشهودة، وهي أفضلُ، كما نبه عمرُ رضي الله عنه؛ لهذا التيسير الذي أشرنا إليه.

[۳] وعددَ عشرين ركعة، وذلك: أنهم رأوا النبيَّ صلى الله عليه وسلم شرَّعَ للمحسنين إحدى عشرة ركعة في جميع السنة، فحكموا أنه لاينبغي أن يكون حظُّ المسلم في رمضان، عند قصده الاقتحامَ في لُجَّةِ التشبُّهِ بالملكوت، أقلَّ من ضِعْفها.

ترجمہ: اور زیادہ کیں صحابہ نے اور ان لوگوں نے جو ان کے بعد ہیں قیام رمضان میں تین چیزیں: (۱) قیام رمضان کے لئے لوگوں کے اپنی مسجدوں میں اکٹھا ہونے کو۔ اور یہ بات اس لئے ہے کہ وہ اکٹھا ہونا آسانی کا فائدہ دیتا ہے، ان کے خواص اور ان کے عوام کے لئے (۲) اور اس کو شروع رات میں ادا کرنے کو، اس بات کے ساتھ کہ آخر شب

کی نماز فرشتوں کی حاضری کا وقت ہے، اور وہ افضل ہے، جیسا کہ متنبہ کیا عمر رضی اللہ عنہ نے، اُسی آسانی کی وجہ سے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے (۳) اور بیس رکعتوں کی تعداد کو۔ اور یہ اس لئے کہ صحابہ نے دیکھا نبی ﷺ کو کہ آپؐ نے مقرر کی ہیں مقربین کے لئے گیارہ رکعتیں پورے سال میں۔ پس انھوں نے فیصلہ کیا کہ مناسب نہیں ہے کہ ہو مسلمان کا حصہ رمضان میں ــــــ اس کے گھسنے کا ارادہ کرنے کے وقت فرشتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کے سمندر میں ــــــ گیارہ کے دوچند سے کم۔

تصحیح: وعددَ عشرین رکعۃً اصل میں وعددُہ عشرون رکعۃ تھا۔ یہ تصحیف ہے۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

نماز چاشت کی حکمت

اشراق کے نوافل شاہ صاحب کے نزدیک مستقل نماز نہیں ہیں۔ وہ ہر دن کے اعتکاف کی نہایت ہیں۔ اور چاشت کے نوافل کی دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: دن چار پہروں میں تقسیم ہے۔ ہر پہر تین گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ اور تین گھنٹے وقت کی اچھی خاصی مقدار ہے۔ عرب وعجم کے نزدیک دن کے اجزاء میں سے جو مقدار کثرت کے لئے مستعمل ہے، ان میں تین گھنٹے کثرت کی ابتدائی مقدار ہیں یعنی جب لوگ ایک گھنٹہ یا دو گھنٹہ بولتے ہیں تو تھوڑا وقت مراد لیتے ہیں۔ اور جب تین گھنٹے بولتے ہیں تو کافی دیر مراد لیتے ہیں۔ مگر یہ زیادتی کا ابتدائی درجہ ہے۔ طویل وقفہ کے لئے کئی گھنٹے یا آدھا دن یا دن بھر کا محاورہ مستعمل ہے۔

بہرحال حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہوا کہ دن کے ان چار پہروں میں سے کوئی پہر نماز سے خالی نہ رہے۔ تاکہ ہر پہر پر نماز اللہ کی یاد تازہ کرے۔ جس سے بندہ غافل ہو گیا ہے۔ چنانچہ پہلے پہر میں فجر اور تیسرے اور چوتھے پہروں میں ظہر وعصر کی نمازیں فرض کی گئیں۔ اور دوسرا پہر چونکہ معاشی مشغولیت کا وقت تھا اس لئے چاشت کی نماز مستحب کی گئی۔

اور اسی وجہ سے کہ ایک معتد بہ وقفہ کے بعد تنبیہ الغافلین کی ضرورت ہے، نماز چاشت پڑھنا گذشتہ امتوں کے نیک لوگوں کا بھی طریقہ رہا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں اس نماز کو اَوّابین (اللہ کی طرف بہت زیادہ رجوع ہونے والے بندوں) کی نماز کہا گیا ہے۔ پس ہر نیک آدمی کو اس نماز کا اہتمام کرنا چاہئے۔

دوسری حکمت: دن کا ابتدائی حصہ رزق کی تلاش اور معاشی مشغولیت کا وقت ہے۔ اور یہ خرخشے غفلت کا سبب بنتے ہیں۔ اس لئے اس وقت میں ایک نماز مسنون کی گئی تاکہ وہ نفس کی غفلت کے زہر کے لئے تریاق کا کام دے۔ جیسے بازار میں جانا غفلت کا باعث ہو سکتا تھا، اس لئے یہ ذکر مسنون کیا: لا إلٰه إلا اللّٰه، وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد، يحيي ويميت، وهو حيٌّ لايموت، بيده الخير، وهو على كل شيئ قدير (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۳۱)

ومنها: الضحىٰ:

وسِرُّها: أن الحكمة الإلٰهية اقتضت أن لايخلوَ كلُّ ربعٍ من أرباع النهار من صلاةٍ، تُذَكِّرُ له ما ذَهَل عنه من ذكر الله، لأن الربع ثلاثُ ساعات، وهي أولُ كثرةٍ للمقدار المستعمَل عندهم في أجزاء النهار، عربِهم وعجمِهم، ولذلك كانت الضحىٰ سنةَ الصالحين قبل النبي صلى الله عليه وسلم.

وأيضاً: فأولِ النهار وقتُ ابتغاءِ الرزق، والسعي في المعيشة، فَسُنَّ في ذلك الوقت صلاةٌ لتكون ترياقاً لِسُمِّ الغفلة الطارئة فيه، بمنزلة ما سَنَّ النبيُّ صلى الله عليه وسلم لداخل السوق من ذكر: لا إلٰه إلا الله وحده لاشريك له إلخ.

ترجمہ: اورنوافل میں سے چاشت کی نماز ہے۔ اور چاشت کی نماز کا راز یہ ہے کہ حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ نہ خالی رہے دن کی چاروں چوتھائیوں میں سے کوئی چوتھائی ایسی نماز سے جو اس کو یاد دلائے اللہ کی وہ یاد جس سے وہ غافل ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ چوتھائی دن تین گھنٹے ہیں۔ اور تین گھنٹے پہلی کثرت ہیں اس مقدار کی جو لوگوں کے نزدیک مستعمل ہے دن کے اجزاء میں سے عربوں اور عجمیوں کے نزدیک۔ اور اسی وجہ سے چاشت کی نماز نیک لوگوں کا طریقہ تھا نبی ﷺ سے پہلے (بھی) اور نیز: پس دن کا ابتدائی حصہ روزی تلاش کرنے اور معاش کے لئے کوشش کرنے کا وقت ہے۔ پس مسنون کی گئی اس وقت میں ایک نماز تاکہ وہ اس غفلت کے زہر کا تریاق ہو جائے جو اس وقت میں طاری ہونے والی ہے۔ جیسے وہ ذکر جو مسنون کیا ہے نبی ﷺ نے بازار میں جانے والے کے لئے یعنی لا إلٰه إلا الله إلى آخره۔

نماز چاشت کی مقدار اور اس کی فضیلت

نماز چاشت کی تین مقداریں اور ان کے فضائل درج ذیل ہیں:

پہلی مقدار: دو رکعتیں ہیں۔ اور اس کی فضیلت میں یہ روایت آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کے جوڑ جوڑ پر ہر صبح میں صدقہ واجب ہے: پس ہر تسبیح صدقہ ہے اور ہر تحمید صدقہ ہے، اور ہر تہلیل صدقہ ہے۔ اور ہر تکبیر صدقہ ہے، اور بھلائی کا حکم دینا صدقہ ہے، اور برائی سے روکنا صدقہ ہے، اور کافی ہیں ان سب سے دو رکعتیں جو آدمی چاشت کے وقت پڑھے (رواہ مسلم) ــــــ اور انسان کے جوڑ جوڑ پر صدقہ اس لئے واجب ہے کہ صبح کو آدمی جب اس حالت میں اٹھتا ہے کہ اس کا ہر جوڑ صحیح سلامت ہے، تو اللہ کی اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اور وہ شکریہ نیکیوں کی ادائیگی کے ذریعہ ہی ادا ہو سکتا ہے اور نیکیوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اور نیکیوں میں نماز سب سے بڑی

عبادت ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کے سارے ہی اعضاء، اس کے تمام جوڑ اور تمام باطنی قوی شریک رہتے ہیں۔ پس چاشت کی دو رکعتیں پڑھنے سے ہر ہر جوڑ کا شکر یہ پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔

دوسری مقدار: چار رکعتیں ہیں۔ اور اس کی فضیلت میں یہ حدیث قدسی آئی ہے: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اے فرزند آدم! تو دن کے ابتدائی حصہ میں چار رکعتیں میرے لئے پڑھ لے، میں دن کے آخری لمحہ تک تیری کفایت کرونگا'' (رواہ الترمذی)

شاہ صاحب قدس سرہ اس حدیث کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ چار رکعتیں نفس کی اصلاح کے لئے کافی نصاب (مقدار) ہیں۔ اگر کوئی شام تک اصلاح نفس کے لئے کوئی دوسری عبادت نہ بھی کرے تو یہ عبادت اس کے لئے کافی ہے۔ اور عام طور پر علماء اس حدیث کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شام تک اس کے مسائل حل فرماتے ہیں۔

تیسری مقدار: چار سے زائد، جیسے آٹھ رکعتیں یا بارہ رکعتیں۔ حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت میں آپؐ کا فتح مکہ کے دن آٹھ رکعت بوقتِ چاشت پڑھنا مروی ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آپؐ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ جو چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں سونے کا محل بنائیں گے۔ (ترمذی ۱:۶۲)

نوٹ: اس حدیث میں جو ثواب بیان کیا گیا ہے وہ پابندی سے چاشت کی نماز پڑھنے کا ہے۔

اور چاشت کی نماز کا بالکل صحیح وقت: وہ ہے جب سورج بلند ہو جائے۔ اور اونٹنی کے بچوں کے پیر جلنے لگیں مسلم شریف، کتاب المسافرین میں یہی وقت بیان کیا گیا ہے۔

وللضحى ثلاث درجات:

أقلُّها: ركعتان، وفيها: أنها تجزئ عن الصدقاتِ الواجبة على كل سُلامَى ابن آدم؛ وذلك: أن إبقاءَ كلِّ مَفْصَلٍ على صحته المناسبة له نعمةٌ عظيمةٌ، تستوجب الحمدَ بأداء الحسناتِ للّهِ؛ والصلاةُ أعظم الحسنات، تتأتى بجميع الأعضاء الظاهرة، والقُوى الباطنة.

وثانيها: أربع ركعات، وفيها: عن الله تعالى: "يا ابنَ آدم! اركع لي أربع ركعات من أول النهار أكفك آخِرَه"

أقول: معناه: أنه نصابٌ صالح من تهذيب النفس، وإن لم يعمل عملاً مثلَه إلى آخر النهار.

وثالثها: مازاد عليها، كثماني ركعات، وثنتي عشرة.

وأكملُ أوقاته حين يَتَرَجَّلَ النهارُ، وتَرْمَضُ الفصالُ.

ترجمہ: اور چاشت کی نماز کے لئے تین درجے ہیں: اس کا کم از کم درجہ: دو رکعتیں ہیں۔ اور اس کے حق میں آیا

ہے کہ وہ کافی ہوجاتی ہیں ان صدقات سے جو انسان کے جوڑ جوڑ پر واجب ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر جوڑ کو اس کے لئے مناسب صحت پر باقی رکھنا ایک بڑی نعمت ہے، جو واجب جانتی ہے اللہ تعالیٰ کی حمد کو نیکیاں کر کے۔ اور نماز نیکیوں میں سب سے بڑی نیکی ہے۔ حاصل ہوتی ہے وہ تمام ظاہری اعضاء اور باطنی قُو ی سے۔

اور دوسرا درجہ: چار رکعتیں ہیں۔ اور اس کے بارے میں یہ حدیث قدسی آئی ہے: ''اے فرزند آدم! پڑھ تو میرے لئے چار رکعتیں دن کے شروع حصہ میں، کفایت کرونگا میں تیرے لئے دن کے آخری حصہ تک'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چار رکعتیں ایک مناسب نصاب ہیں نفس کو سنوارنے کے لئے اگرچہ نہ کرے وہ کوئی عمل اس کے مانند آخر دن تک۔

اور تیسرا درجہ: وہ ہے جو چار رکعت سے زائد ہے۔ جیسے آٹھ رکعتیں اور بارہ رکعتیں —— اور چاشت کا کامل تر وقت: جب آفتاب بلند ہوجائے، اور اونٹنی کے بچوں کے پیر جلنے لگیں۔

لغات: سُلَامی: چھوٹی ہڈیوں میں سے ہر جوڑ دار ہڈی، جیسے انگلیوں کی ہڈیاں۔ پھر توسعاً ہر جوڑ پر اطلاق ہونے لگا جمع سُلامیات... ترجّلَ الشمسُ: آفتاب کا بلند ہونا۔ مطبوعہ نسخہ میں حا کے ساتھ ہے جو تصحیف ہے، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے... رَمِضَ (س) رَمَضاً: سخت گرم ہونا۔ رمضان اسی سے ہے... فِصَال جمع ہے فَصِیل کی: اونٹنی کا بچہ۔

☆ ☆ ☆

نماز استخارہ کی حکمت

استخارہ: خیر سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ سے بہتری طلب کرنا —— بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اہم کام کرنا چاہتا ہے، مگر اسے کام کا انجام معلوم نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں سمجھداروں سے مشورہ کرنا بھی مسنون ہے۔ اور نماز استخارہ پڑھ کر اور استخارہ کی تعلیم فرمودہ دعا مانگ کر، اللہ تعالیٰ سے راہنمائی طلب کرنا بھی مسنون ہے —— رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی راہنمائی بندے کو کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ تو روایت میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اور تجربہ یہ ہے کہ یہ راہنمائی کبھی خواب کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ پھر خواب کبھی واضح ہوتا ہے اور کبھی تعبیر طلب ہوتا ہے۔ اور کبھی راہنمائی اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کام کے کرنے کا شدید داعیہ دل میں پیدا ہوتا ہے یا اس سے دل بالکل ہی ہٹ جاتا ہے۔ پس ان دونوں کیفیتوں کو منجانب اللہ اور دعا کا نتیجہ سمجھنا چاہئے —— اور اگر استخارہ کے بعد بھی تذبذب باقی رہے تو استخارہ کا عمل مسلسل جاری رکھے۔ اور جب تک کسی ایک طرف رجحان نہ ہوجائے کوئی عملی اقدام نہ کرے۔

اور استخارہ کرنے کے لئے کوئی مدت متعین نہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو ایک ماہ تک استخارہ کیا تھا تو ایک ماہ پر آپ کو شرح صدر ہوگیا تھا۔ اگر شرح صدر نہ ہوتا تو آپ آگے بھی استخارہ جاری رکھتے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے استخارہ کی دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی حکمت: زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب کوئی اہم کام کرنا ہوتا۔مثلاً سفر یا نکاح یا کوئی بڑا سودا کرنا ہوتا تو وہ تیروں کے ذریعہ فال نکالا کرتے تھے۔یہ تیر کعبہ شریف کے مجاور کے پاس رہتے تھے۔ان میں سے کسی تیر پر لکھا تھا: أمرني ربي اور کسی پر لکھا تھا: نهاني ربي اور کوئی تیر بےنشان تھا۔اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔مجاور تھیلا ہلا کر فال طلب کرنے والے سے کہتا کہ ہاتھ ڈال کر ایک تیر نکال۔اگر أمرني ربي والا تیر نکلتا تو وہ شخص کام کرتا۔اور نهاني ربي والا تیر نکلتا تو وہ کام سے رُک جاتا۔اور بےنشان تیر ہاتھ میں آتا تو دوبارہ فال نکالی جاتی۔سورۃ المائدہ آیت ۳ کے ذریعہ اس کی حرمت نازل ہوئی۔اور حرمت کی دو وجہیں ہیں: ایک: یہ کہ یہ ایک بے بنیاد عمل ہے،اور محض اتفاق ہے۔جب تھیلے میں ہاتھ ڈالا جائے گا تو کوئی نہ کوئی تیر ضرور ہاتھ آئے گا دوم: یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء (جھوٹا الزام) ہے۔اللہ پاک نے کہاں حکم دیا ہے؟ اور کب منع کیا ہے؟ اور افتراء حرام ہے۔

نبی ﷺ نے لوگوں کو فال کی جگہ استخارہ کی تعلیم دی۔اور اس میں حکمت یہ ہے کہ جب بندہ رب علیم سے رہنمائی کی التجا کرتا ہے۔اور وہ اپنے معاملہ کو اپنے مولیٰ کے حوالے کرتا ہے۔اور وہ ان کی مرضی معلوم کرنے کا شدید خواہش مند ہوتا ہے۔اور وہ اللہ کے دروازے پر جا پڑتا ہے اور اس کا دل ملتجی ہوتا ہے تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی رہنمائی اور مدد نہ فرمائیں۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان کا باب وا ہوتا ہے۔اور اس پر معاملہ کا راز کھولا جاتا ہے۔پس استخارہ محض اتفاق نہیں ہے بلکہ اس کی مضبوط بنیاد ہے۔

دوسری حکمت: استخارہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان فرشتہ صفت بن جاتا ہے۔استخارہ کرنے والا اپنی ذاتی رائے سے نکل جاتا ہے۔اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے۔اس کی بہیمیت ملکیت کی تابعداری کرنے لگتی ہے۔اور وہ اپنا رُخ پوری طرح اللہ کی طرف جھکا دیتا ہے تو اس میں فرشتوں کی سی خو بو پیدا ہو جاتی ہے۔ملائکہ الہام ربانی کا انتظار کرتے ہیں۔اور جب ان کو الہام ہوتا ہے تو وہ داعیۂ ربانی سے اس معاملہ میں اپنی والی پوری کوشش خرچ کرتے ہیں۔ان میں کوئی داعیۂ نفسانی نہیں ہوتا۔اسی طرح جو بندہ بکثرت استخارہ کرتا ہے، وہ رفتہ رفتہ فرشتوں کے مانند ہو جاتا ہے۔ملائکہ کے مانند بننے کا یہ ایک تیر بہدف مجرّب نسخہ ہے۔جو چاہے آزما کر دیکھے!

ومنها: صلاة الاستخارة

وكان أهل الجاهلية إذا عَنَتْ لهم حاجة: من سفر، أو نكاح، أو بيع، اسْتَقْسَموا بالأزلام، فنهى عنه النبي صلى الله عليه وسلم، لأنه غيرُ معتمد على أصلٍ، وإنما هو محضُ اتفاق، ولأنه افتراء على الله بقولهم: أمرني ربي، ونهاني ربي، فعوّضهم من ذلك الاستخارةَ، فإن الإنسان إذا استمطر العلمَ من ربه، وطلب منه كشفَ مرضاة الله في ذلك الأمر، ولَجَّ قلبُه بالوقوف

علی بابه، لم یتراخ من ذلك فیضانُ سِرٍّ إلٰهي.
وأیضًا: فمن أعظم فوائدها: أن یفنی الإنسانُ عن مراد نفسه، وتنقاد بهیمیتُه للملکیة، ویُسلم وجهه لله، فإذا فعل ذلك صار بمنزلة الملائکة، فی انتظارهم لإلهام الله، فإذا أُلهموا سعَوْا فی الأمر بداعیة إلٰهیة، لاداعیةٍ نفسانیةٍ. وعندی: أن إکثار الاستخارة فی الأمور تریاقٌ مجرَّب لتحصیل شِبْهِ الملائکة.

ترجمہ: اور نوافل میں سے نماز استخارہ ہے: اور اہل جاہلیت کو جب کوئی حاجت پیش آتی جیسے سفر، نکاح، یا بیع، تو وہ فال نکالا کرتے تھے قرعہ کے تیروں کے ذریعہ، پس روکا اس سے نبی ﷺ نے اس لئے کہ وہ فال کسی بنیاد پر ٹیک لگانے والا نہیں تھا۔ اور وہ محض اتفاق تھا۔ اور اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر افتراء تھا، ان کے کہنے کی وجہ سے کہ مجھے میرے رب نے حکم دیا اور مجھے میرے رب نے منع کیا۔ اور آپ نے اس کے بدلے میں دیا لوگوں کو استخارہ۔ پس بیشک انسان جب اپنے رب سے علم کی التجا کرتا ہے۔ اور اللہ سے اس معاملہ میں مرضیٔ الٰہی کی وضاحت کی درخواست کرتا ہے۔ اور اس کا دل اصرار کرتا ہے اس کے دروازہ پر ٹھہر کر تو نہیں پیچھے رہتا اس سے خداوندی بھید کا فیضان۔

اور نیز: پس استخارہ کے فوائد میں سے سب سے بڑا فائدہ: یہ ہے کہ انسان فنا ہو جائے اپنی ذاتی مراد سے۔ اور تابعداری کرے اس کی بہیمیت اس کی ملکیت کی، اور وہ اپنا رُخ اللہ کی طرف جھکا دے۔ پس جب اس نے یہ کیا تو وہ فرشتوں جیسا ہو گیا ان کے انتظار کرنے میں اللہ کے الہام کا۔ پس جب وہ الہام کئے جاتے ہیں تو وہ اس معاملہ میں سعی کرتے ہیں خداوندی تقاضے سے، نہ کہ نفسانی تقاضے سے۔ اور میرے نزدیک: یہ بات ہے کہ معاملات میں بکثرت استخارہ کرنا ایک مجرب تریاق ہے فرشتوں کی مشابہت حاصل کرنے کے لئے۔

لغات: عَنَّ الأمرُ: نازل ہونا، ظاہر ہونا، پیش آنا۔ اِستَقْسَم: حصہ طلب کرنا القِسْم: خیر کا حصہ معتمِد (اسم فاعل) اِعْتَمد علیه: ٹیک لگانا...... الاستخارة: مفعول ثانی ہے عوَّضَ کا...... اِسْتَمْطر فلانًا ومن فلان: عنایت وکرم کی التجا کرنا...... لَجَّ به: لازم رہنا۔

☆ ☆ ☆

استخارہ کا طریقہ اور اس کی دعا

استخارہ کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دو رکعت نفل پڑھے۔ پھر خوب دل لگا کر یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَاأَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَاأَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ

الْغُيُوْبِ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ، فَاقْدِرْهُ لِيْ، وَيَسِّرْهُ لِيْ، ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ، وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ، وَاصْرِفْنِيْ عَنْهُ، وَاقْدِرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِيْ بِهِ۔ اور جب هذا الأمر پر پہنچے، جس پر لکیر بنی ہے تو اگر عربی جانتا ہے تو اس جگہ اپنی حاجت کا تذکرہ کرے۔ مثلاً کوئی چیز بیچنی ہے تو هـذا الأمر کے بجائے هـذا البيع کہے۔ اور اگر عربی نہیں جانتا تو هذا الأمر کو پڑھتے وقت اس کام کا دھیان کرے جس کے لئے استخارہ کر رہا ہے۔ پھر کسی سے بولے بغیر پاک جگہ پر قبلہ کی طرف منہ کرکے باوضو سو جائے۔ جب سوکر اٹھے، تو جو بات مضبوطی سے دل میں جمے اس پر عمل کرے۔ ان شاء اللہ وہی بات بہتر ہوگی۔ اور کوئی خواب نظر آئے اور اس کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو کسی تعبیر جاننے والے سے دریافت کرے۔

دعا کا ترجمہ: اے اللہ! میں آپ سے خیر طلب کرتا ہوں آپ کی صفتِ علم کے وسیلہ سے۔ اور میں آپ سے قدرت طلب کرتا ہوں آپ کی صفتِ قدرت کے وسیلہ سے۔ اور آپ کے عظیم فضل کی بھیک مانگتا ہوں۔ پس بیشک آپ قادر ہیں اور میں قادر نہیں ہوں۔ اور آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا۔ اور آپ تمام چھپی چیزوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اے اللہ! اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ معاملہ میرے لئے بہتر ہے، میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت میں تو اس کو میرے لئے مقدر فرمائیں اور اس کو میرے لئے آسان فرمائیں پھر میرے لئے اس میں برکت پیدا فرمائیں اور اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ معاملہ میرے لئے برا ہے (یعنی اس کا نتیجہ خراب ہے) میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت میں، تو اس کو مجھ سے پھیر دیں، اور مجھے اس سے پھیر دیں۔ اور میرے لئے بھلائی مقدر فرمائیں جہاں بھی وہ ہو، پھر مجھے اس پر راضی کر دیں۔

> وضَبَطَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم آدابَها ودعاءَ ها فَشَرَّعَ ركعتين، وعَلَّم: "اللهم إني أستخيرك بعلمك، واستقدرك بقدرتك، وأسألك من فضلك العظيم، فإنك تقدر ولا أقدر، وتعلم ولا أعلم، وأنت علام الغيوب، اللّهم إن كنت تعلم أن هذا الأمر خير لي في ديني ومعاشي وعاقبة أمري ـــــ أوقال: في عاجل أمري، وآجله ـــــ فاقدره لي، ويسره لي ثم بارك لي فيه، وإن كنت تعلم أن هذا الأمر شرلي في ديني ومعاشي وعاقبة أمري ـــــ أوقال: في عاجل أمري وآجله ـــــ فاصرفه عني، واصرفني عنه، واقدر لي الخير حيث كان، ثم أرْضِني به" قال: ويسمي حاجتَه.

ترجمہ: اور منضبط کیے نبی ﷺ نے استخارہ کے آداب اور اس کی دعا۔ پس مشروع کیں آپؐ نے دو رکعتیں، اور سکھلایا: اللهم آخر تک (أو قال: شک راوی ہے اور دعا میں سے اس کو حذف کیا ہے) فرمایا آپؐ نے: اور نام لے

اپنی ضرورت کا۔

☆ ☆ ☆

نماز حاجت کا طریقہ اور اس کی حکمت

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کو کوئی حاجت پیش آئے اللہ تعالیٰ سے یا کسی انسان سے (یعنی وہ کسی اہم معاملہ میں براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہے یا کسی بندے سے کوئی چیز طلب کرنا چاہے مثلاً قرض لینا چاہے، اور خیال ہو کہ اللہ جانے دے گا یا نہیں!) تو خوب اچھی طرح وضو کرے، پھر دو رکعت نفل پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔ پھر یہ دعا پڑھے لَاۤ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، أَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ، وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ، وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ، لَاتَدَعْ لِيْ ذَنْبًا إِلَّا غَفَرْتَهُ، وَلَا هَمًّا إِلَّا فَرَّجْتَهُ، وَلَاحَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا إِلَّا قَضَيْتَهَا يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ (کوئی معبود نہیں مگر اللہ بردبار کریم۔ پاک ہے وہ اللہ جو عرشِ عظیم کا پروردگار ہے۔ اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے۔ مانگتا ہوں میں آپ سے آپ کی مہربانی واجب کرنے والی چیزیں۔ اور آپ کی بخشش کا پکا ذریعہ، اور ہر نیکی سے بلا مشقت کمائی۔ اور ہر گناہ سے سلامتی۔ نہ چھوڑیں آپ میرے کسی گناہ کو مگر بخش دیں آپ اس کو۔ اور نہ کسی فکر کو مگر دور کردیں آپ اس کو۔ اور نہ کسی ایسی حاجت کو جس سے آپ راضی ہیں مگر پورا فرمادیں آپ اس کو، اے سب مہربانوں سے بڑے مہربان) (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۲۷ یہ حدیث ضعیف ہے مگر استحباب کے درجہ کا عمل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے)

پھر اپنی ضرورت خوب گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ اور یہ عمل مسلسل جاری رکھے تا آنکہ مراد برآئے۔ یا مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ پر دل راضی ہوجائے۔ یہ سب سے بڑی دولت ہے۔ بندہ کی دعا ہر حال میں قبول ہوتی ہے۔ مگر بندہ جو مانگتا ہے اس کا دینا نہ دینا مصلحتِ خداوندی پر موقوف ہے۔ اگر مصلحت ہوتی ہے تو مانگی ہوئی چیز مل جاتی ہے۔ ورنہ دعا عبادت قرار دے کر نامۂ اعمال میں لکھ لی جاتی ہے۔ اور بندہ کے دل کو مطلوبہ چیز کے نہ ملنے پر راضی کردیا جاتا ہے۔

اور اگر حاجت کسی بندے سے متعلق ہو تو بھی مذکورہ ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے خوب عاجزی سے دعا کرے کہ الٰہی! اس بندے کے دل کو میری حاجت روائی کے لئے آمادہ کردے۔ کیونکہ تمام بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ وہ جدھر چاہتے ہیں پھیرتے ہیں۔ پھر دعا سے فارغ ہوکر اس بندے کے پاس جائے جس سے حاجت متعلق ہے اور اپنی حاجت طلب کرے۔ اگر مقصود حاصل ہوجائے تو اس بندہ کا بھی شکر ادا کرے اور اللہ تعالیٰ کا بھی شکر بجالائے۔ کیونکہ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر گزار بندہ نہیں ہے۔ اور اگر ناکامی ہو تو یہ

سمجھے کہ اللہ کی مرضی نہیں۔ وہ حاجت روائی کا کوئی اور انتظام فرمائیں گے۔

اور اللہ تعالیٰ سے حاجت مانگنے سے پہلے نمازِ حاجت پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۳ میں اللہ پاک نے حکم دیا ہے کہ مشکلات ومہمات میں ہمت وبرداشت اور نماز کے ذریعہ مدد حاصل کرو۔ اس تعلیم وہدایت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے حاجت طلب کرنے سے پہلے نمازِ حاجت پڑھنی چاہئے۔ پھر مقصد طلب کرنا چاہئے۔

اور اس میں گہری حکمت یہ ہے کہ کسی سے کچھ مانگنے سے پہلے تقرب حاصل کرنا پڑتا ہے۔ جان نہ پہچان، میں تیرا مہمان! کیا اچھی بات ہے؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگنے سے پہلے بھی وسیلہ ضروری ہے۔ سورۃ المائدہ آیت ۳۵ میں حکم دیا گیا ہے کہ: ''اللہ کا قرب ڈھونڈھو'' اور سب سے بڑا وسیلہ نیک اعمال ہیں اور ان سے بھی بڑھ کر اللہ کی حمد وثنا ہے۔ اسی لئے سورۃ الفاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وستائش ہے۔ پھر ہدایت طلبی کا مضمون ہے۔ پس جب بندہ نماز حاجت پڑھ کر —— جو اعلیٰ درجہ کا نیک عمل ہے —— اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کر کے دعا کرے گا تو ضرور کشاوگی کا دروازہ کھلے گا۔ اور بندے کی مراد پوری ہوگی۔

اور اگر حاجت کسی بندے سے متعلق ہے، تو اس بندے کے پاس جانے سے پہلے نماز حاجت پڑھنے میں دو حکمتیں ہیں۔ جو حضرت شاہ صاحب نے بیان فرمائی ہیں:

پہلی حکمت: اس صورت میں صلوٰۃ حاجت عقیدۂ توحید کی حفاظت کے لئے ہے۔ کیونکہ جب بندہ کسی سے کوئی حاجت طلب کرتا ہے تو اس میں یہ احتمال رہتا ہے کہ وہ غیر اللہ سے استعانت —— کسی درجہ میں بھی —— جائز سمجھتا ہے[1]۔ پس یہ حاجت طلبی اس کے عقیدۂ توحیدِ استعانت میں خلل انداز ہوگی۔ توحیدِ استعانت یہ ہے کہ اللہ کی ذاتِ پاک کے سوا کسی سے حقیقۃً مدد طلب نہ کرے۔ ﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ میں اسی توحیدِ استعانت کی تعلیم دی گئی ہے۔ جس کو بندہ بار بار ہر نماز کی ہر رکعت میں دوہراتا ہے۔ اس لئے شریعت نے ایک نماز مقرر کی اور اس کے بعد ایک دعا سکھلائی تا کہ عقیدہ میں فساد پیدا نہ ہو۔ کیونکہ جب حاجت مند نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا کہ وہ حاجت روائی کے لئے بندہ کے دل کو تیار کر دیں تو اس کا یہ عقیدہ اور یقین پختہ اور مستحکم ہوگا کہ کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ وہی کارساز اور کام بنانے والے

---

[1] امور عادیہ (روزمرہ کے کاموں) میں بندوں سے مدد لینا جائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''جو اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتے ہیں'' اور یہ استعانت مجازی ہے۔ حقیقی استعانت ذات پاک کے سوا کسی سے بھی جائز نہیں۔ اور حضرت استاذ الاستاذ مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی شیخ الہند قدس سرہ نے سورۂ فاتحہ کے حواشی میں جو تحریر فرمایا ہے کہ: ''ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطۂ رحمتِ الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانتِ ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے'' اس عبارت میں حضرت کی مراد استعانت سے توسل ہے۔ اور یہ مسئلہ یہاں غیر محل میں بیان ہو گیا ہے۔ جس سے کچھ لوگوں کو اشکال پیدا ہوا ہے۔ اس لئے وہاں یہ نوٹ لکھ دینا ضروری ہے کہ ''استعانت سے مراد توسل ہے اور یہ مسئلہ یہاں غیر محل میں بیان ہوا ہے''۔ اتنا نوٹ لکھ دیا جائے تو انصاف پسند ذہن مطمئن ہو جائیں گے ۱۲

ہیں۔ بندے محض واسطہ ہیں، بلکہ آلۂ کار ہیں۔ ان کے اختیار میں کچھ نہیں۔ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

دوسری حکمت: حاجت کا پیش آنا، اور اس کی وجہ سے کسی کے دروازے پر دستک دینا ایک دنیوی معاملہ ہے۔ شریعت چاہتی ہے کہ یہ دنیا کا معاملہ بھی نیکوکاری کا ذریعہ بن جائے۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی نماز اور دعا مشروع کی تاکہ بندہ کی نیکوکاری میں اضافہ ہو۔

ومنها: صلاة الحاجة:

والأصل فيها: أن الابتغاء من الناس، وطَلَبَ الحاجة منهم مَظِنَّةُ أن يرى إعانة مَّا من غير الله تعالى، فَيُخِلُّ بتوحيد الاستعانة، فَشَرَعَ لهم صلاةً ودعاءً، ليدفع عنهم هذا الشر، ويصير وقوعُ الحاجة مؤيِّدًا له فيما هو بسبيله من الإحسان، فَسَنَّ لهم أن يركعوا ركعتين، ثم يُثْنُوا على الله، ويصلُّوا على النبي صلى الله عليه وسلم، ثم يقولوا: " لا إلٰه إلا الله الحليم الكريم، سبحان الله رب العرش العظيم، والحمد لله رب العالمين، أسألك موجباتِ رحمتك، وعزائم مغفرتك، والغنيمةَ من كل بر، والسلامةَ من كل إثم، لاتدع لي ذنبا إلا غفرته، ولاهَمًّا إلا فَرَّجته، ولا حاجة هي لك رِضًا إلا قَضَيْتَها، يا أرحم الراحمين"

ترجمہ: اور نوافل میں سے نماز حاجت ہے۔ اور بنیادی بات اس میں یہ ہے کہ لوگوں سے چاہنا اور ان سے حاجت طلب کرنا اس بات کا احتمالی موقعہ ہے کہ جائز سمجھے وہ کسی درجہ کی استعانت کو غیر اللہ سے۔ پس خلل ڈالے وہ توحید استعانت میں۔ پس مقرر کی شارع نے لوگوں کے لئے ایک نماز اور ایک دعا، تاکہ وہ ہٹائے لوگوں سے اس خرابی کو (یہاں تک پہلی حکمت ہے) اور ہو جائے حاجت کا پیش آنا تائید کرنے والا اس کے لئے اس سلوک کی راہ میں جس کے وہ درپے ہے (یعنی مؤمن ہمیشہ نیک اعمال میں کوشاں رہتا ہے، پس یہ دنیوی معاملہ بھی اس کے لئے عبادت کا ذریعہ بن جائے۔ اس جملہ میں دوسری حکمت کا بیان ہے) پس مسنون کیا آپؐ نے لوگوں کے لئے کہ پڑھیں وہ دو رکعتیں، پھر اللہ تعالیٰ کی تعریف کریں اور نبی ﷺ پر درود بھیجیں، پھر کہیں: لا إلٰه إلا الله الحليم الكريم آخر تک۔

☆ ☆ ☆

نمازِ توبہ کی حکمت

حضرت علی رضی اللہ عنہ: خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، پھر وہ اٹھے، وضو کرے، پھر نماز پڑھے (کم از کم دو رکعتیں پڑھے اور زیادہ

سے زیادہ جتنی پڑھ سکے) پھر اللہ سے معافی طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما ہی دیتے ہیں۔ پھر آپؐ نے سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۵ تلاوت فرمائی (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۲۴)

سورہ آلِ عمران میں پہلے ان متقی بندوں کا ذکر ہے جن کے لئے جنت خاص طور پر تیار کی گئی ہے۔ پھر ارشاد پاک ہے: ''اور وہ بندے کہ جب ان سے کوئی گندہ کام ہو جاتا ہے یا وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو جلد ہی ان کو اللہ یاد آ جاتا ہے، پس وہ اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں ـــــ اور گناہوں کا بخشنے والا اللہ کے سوا ہے کون؟ ـــــ اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اَڑتے نہیں۔ انہی لوگوں کا بدلہ مغفرتِ خداوندی ہے اور ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ان میں سدا رہیں گے۔ اور کیا اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا!'' آیت کا ماحصل یہ ہے کہ ان گناہ گار بندوں کے لئے بھی مغفرت اور جنت کی بشارت ہے۔ بشرطیکہ وہ اللہ کو یاد کریں اور گناہوں سے توبہ کرلیں۔

اور اللہ کو یاد کرنے کا اعلیٰ فرد یہ ہے کہ کم از کم دو رکعت نماز پڑھے پھر توبہ کرے۔ نماز کا سب سے بڑا فائدہ یہی اللہ کی یاد ہے۔ جو بندے اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، خصوصاً گناہ ہو جانے کے بعد، تو یہ رجوع الی اللہ گناہ کو مٹا دیتا ہے اور بندے سے اس کی برائی کو ہٹا دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ معصیت کو عادت اور پیشہ نہ بنالے۔ ورنہ دل پر گناہ کا زنگ بیٹھ جائے گا۔ اور پھر توبہ کی توفیق شاید ہی ہو۔ پس خوش نصیب ہیں وہ گنہ گار بندے جو گناہ ہوتے ہی سچی پکی توبہ کر لیتے ہیں۔ اس حکمت کا حاصل یہ ہے کہ گناہ کے بعد توبہ سے پہلے دو نفل پڑھنا، رجوع الی اللہ کی علامت ہے۔ اور رجوع گناہوں کی گندگی کو صاف کر دیتا ہے۔

ومنها: صلاة التوبة:

والأصل فيها: أن الرجوع إلى الله، لاسيَّما عقيبَ الذنب، قبلَ أن يرتسِخ في قلبه رَيْنُ الذنب: مكفِّر مُزيلٌ عنه السوء.

ترجمہ: اور نوافل میں سے نماز توبہ ہے۔ اور بنیادی بات اس کے بارے میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ـــ خصوصاً گناہ کرنے کے بعد ـــ اس سے پہلے کہ اس کے دل میں گناہ کا میل جم جائے: اس سے برائی کو مٹانے والا ہٹانے والا ہے۔

☆ ☆ ☆

تحیۃ الوضو کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا: آپ جنت میں چل رہے ہیں اور آگے بلال رضی اللہ عنہ کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ فجر بعد آپؐ نے ان سے فرمایا: ''مجھ سے اپنا وہ عمل بیان کرو جو

اسلام میں تم نے کیا ہے اور جس پر تمہیں ثواب کی سب سے زیادہ امید ہے، کیونکہ میں نے جنت میں تمہارے چپلوں کی چاپ اپنے آگے سنی ہے!" حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "مجھے سب سے زیادہ ثواب کی امید اپنے اس عمل سے ہے کہ میں نے رات میں یا دن میں جب بھی وضو کی ہے تو حسب توفیق نماز ضرور پڑھی ہے" (مشکوۃ حدیث ۱۳۲۲)

تشریح: ہمیشہ باوضو رہنا اور ہر وضو کے بعد حسب توفیق نماز پڑھنا کوئی معمولی عمل نہیں۔ نیکوکاروں کے لئے ایک بہترین نصاب ہے۔ اور اس کی ہمت کوئی بڑا نصیبہ ور ہی کر سکتا ہے۔ اسی عمل کی برکت سے آنحضرت ﷺ کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنت میں نظر آئے ہیں۔

اسی واقعہ کو حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ اس طرح روایت کرتے ہیں کہ صبح آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کو بلایا اور پوچھا: "تم کونسے عمل کی وجہ سے جنت میں مجھ سے پہلے پہنچ گئے؟ میں جب بھی جنت میں گیا، تمہارے قدموں کی چاپ آگے سنائی دی!" حضرت بلالؓ نے اپنے دو عمل بیان کئے: ایک: یہ کہ وہ جب بھی اذان دیتے ہیں تو اس کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہیں۔ دوسرا: یہ کہ وہ ہمیشہ باوضو رہتے ہیں، اور ہر وضو کے بعد دو رکعتیں (تحیۃ الوضو) ضرور پڑھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "انہیں دو عملوں کی وجہ سے" (تم اس درجہ کو پہنچے ہو) (مشکوۃ حدیث ۱۳۲۶)

تشریح: خواب کے اس واقعہ میں بلال رضی اللہ عنہ کا آنحضرت ﷺ سے آگے ہونا نیکوکاری میں پیش قدمی کا پیکر محسوس ہے۔ خواب میں واقعات تمثیلی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ حقیقی نہیں ہوتے۔ جیسے کسی نے خواب دیکھا تھا کہ وہ رمضان میں لوگوں کے مونہوں اور شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہے، تو یہ ایک تمثیل تھی، قبل از وقت فجر کی اذان دینے کی۔ حقیقت نہیں تھی۔ اسی طرح حضرت بلال کا جنت میں آگے نظر آنا ان کے راہِ سلوک میں راسخ القدم ہونے کی تمثیل ہے۔ حقیقت مراد نہیں۔ پس کسی خلجان کا کوئی موقع نہیں!

سوال: خلجان کا موقع کیوں نہیں؟ ہمیشہ ہی یہ خلجان طلبہ کا دامن گیر رہا ہے کہ آخر ایک امتی اپنے نبی سے جنت میں آگے کیسے ہو گیا؟ اور نبی بھی کون؟ نبیوں کا سردار! اس سے آگے تو کوئی نبی بھی نہیں ہو سکتا، چہ جائے کہ ایک امتی!

جواب: سالار سالکین ﷺ سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنت میں کیسے پہنچ گئے؟ اس کا راز سمجھنے کے لئے پہلے تین باتیں سمجھ لیں:

پہلی بات: راہِ سلوک کے سالکین کے لئے سلوک کی راہ کے ہر کمال کے مقابلہ میں ایک تجلی ہوتی ہے۔ جس سے ان کے لئے اس راہ کی حالت واضح ہوتی ہے۔ اور اس تجلی کے ذریعہ اللہ پاک اس کامل کے دل پر اس کمال کی معرفت کا فیضان کرتے ہیں۔ پس وہ اپنے ذوق و وجدان کے ذریعہ اس کمال کو سمجھ لیتا ہے۔

دوسری بات: کبھی آدمی کسی خیال میں کھو جاتا ہے تو دوسرے تصورات ذہن سے ایسے اُوجھل ہو جاتے ہیں کہ وہ یکدم ان کی طرف التفات نہیں کر سکتا۔ شیخ چلی کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے گھی کا گھڑا پھوڑ لیا تھا۔ اسی

طرح اگر کوئی اس تصور میں مگن ہو کہ وہ بادشاہ ہے۔ تخت پر جلوہ افروز ہے۔ تاج شاہی پہنے ہوئے ہے۔ خدام پَرا باندھے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ حل وعقد کا مالک ہے، جنگی امور طے کر رہا ہے اور ملکی معاملات کے فیصلے کر رہا ہے تو اس حال میں اس کا اپنی ذات کی طرف التفات نہیں رہتا۔ اور وہ یہ تک بھول جاتا ہے کہ وہ ایک معمولی آدمی ہے۔ یہ مثال خود شاہ صاحب نے شرح تراجم ابواب بخاری، باب فضل الصلاۃ عند الطہور میں دی ہے۔ اور یہاں اس کی درج ذیل مثال دی ہے:

ایک شخص بلند پایہ شاعر بھی ہے اور باکمال حساب داں بھی، جب اس کے ذہن میں شاعری کا تصور سماتا ہے، اور وہ اپنے بلند پایہ شاعر ہونے پر ریجھتا ہے تو وہ اپنی حساب دانی کے کمال سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور جب ذہن پر حساب دانی کا تصور مسلط ہوتا ہے، اور وہ اس کی رعنائیوں میں کھو جاتا ہے تو وہ اپنی شاعری کے کمال سے غافل ہو جاتا ہے۔

تیسری بات: انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام عام مؤمنین کے ایمان کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں۔ کیونکہ منشأ خداوندی یہ ہے کہ وہ عام مؤمنین کے انوار کو بھی اپنے ذوق ووجدان سے اچھی طرح سمجھ لیں، تاکہ اس مرتبہ میں پے بہ پے پیش آنے والے احوال میں لوگوں کی راہنمائی کر سکیں۔ یعنی وہ اپنے ایمانی مقام سے نیچے اتر کر عام لوگوں کے ایمانی احوال سے بھی باخبر رہتے ہیں۔ اور اسی حکمت سے انبیاء بھی عام مؤمنین کی طرح زندگی گذارتے ہیں۔ مادّی چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں: کھاتے ہیں۔ پیتے ہیں اور ازواج سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاکہ عوامی زندگی میں پیش آنے والے امور سے واقف رہیں۔ اور لوگوں کی اس سلسلہ میں بصیرت کے ساتھ راہنمائی کر سکیں۔ ورنہ انبیاء ان مادّی چیزوں کے کچھ زیادہ محتاج نہیں ہیں۔ آپ ﷺ پندرہ دن کا مسلسل روزہ رکھتے تھے، اور کوئی کمزوری محسوس نہیں کرتے تھے۔ اور پچاس سال سے زیادہ عمر تک آپؐ نے ایک بیوی پر اکتفا کیا ہے، اور آپؐ کی عفت پر کوئی حرف نہیں آیا (اور زندگی کے آخری دس سالوں میں جو آپؐ نے متعدد نکاح کئے ہیں وہ ملکی، ملّی اور دینی مصلحتوں سے کئے ہیں)

اب اس راز کو سمجھ لیں: نبی ﷺ نے اپنے اس خواب میں خود کو عام مؤمنین کی سطح پر اتارا ہے۔ اس وقت آپؐ کا اپنی صفت نبوت اور افضل الخلائق ہونے کی طرف التفات نہیں رہا۔ اور آپؐ نے اس مرتبہ میں حضرت بلال کو اپنے سے آگے دیکھا یعنی ان کی ایمانی تجلی آگے دیکھی۔ اور اس سے یہ فیصلہ کیا کہ راہِ سلوک میں وہ راسخ القدم ہیں۔ اور اس مرتبہ میں تقدم میں کوئی اشکال نہیں۔

نوٹ: یہ حکمت دقیق ہے۔ اور اس مقام کی شرح میں شاہ صاحب کی تراجم ابوابِ بخاری کی شرح بھی پیش نظر رکھی گئی ہے۔

خلجان کا آسان جواب: یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے خادم تھے۔ اور دنیا میں بھی وہ کبھی آپؐ سے آگے چلتے تھے ترمذی (۱:۲۷ ابواب الاذان) میں روایت ہے فخرج بلال بین یدیه بالعنزۃ: بلال آپؐ کے آگے بلم لیکر نکلے۔ اسی صورتِ مخزونہ نے خواب میں پیکر محسوس اختیار کیا ہے۔ اور خواب کی چونکہ تعبیر ہوتی ہے۔ اس لئے آپؐ نے اُن کے تقدم کی تعبیر ایمان کی پختگی سے بیان فرمائی ہے۔ جس کا نتیجہ دخول جنت ہے۔ غرض خواب کو

حقیقت کا جامہ پہنا کر خلجان میں مبتلا ہونا بے دانشی کے سوا کچھ نہیں!

اس کی نظیر یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ایک مرید نے خواب دیکھا کہ وہ خواب میں کلمہ پڑھ رہا ہے۔ اور بجائے محمد رسول الله کے اشرف علی رسول اللہ منہ سے نکل رہا ہے۔ وہ ہر چند کلمہ صحیح پڑھنا چاہتا ہے، مگر بار بار منہ سے یہی نکلتا ہے۔ حضرت حکیم الامت نے اس خواب کی تعبیر اتباع سنت بیان فرمائی، جو بالکل صحیح تعبیر ہے۔ مگر کچھ لوگ اس خواب سے خلجان میں مبتلا ہیں۔ بلکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ بدباطنی کے سوا کیا ہے!

ومنها: صلاة الوضوء:

وفيها: قوله صلى الله عليه وسلم لبلالٍ رضى الله عنه: "إنى سمعتُ دَفَّ نعلَيْك بين يدىَّ فى الجنة"

أقول: وسِرُّها: أن المواظبةَ على الطهارة والصلاةَ عقيبَها نصابٌ صالح من الإحسان، لايتأتى إلا من ذى حَظٍّ عظيم.

وقوله صلى الله عليه وسلم: "بِمَ سَبَقْتَنِى إلى الجنة؟"

أقول: معناه: أن السَّبْق فى هذه الواقعة شَبَحُ التقدُّم فى الإحسان.

والسر فى تقدُّم بلال على إمام المُحْسِنِين: أن لِلْكُمَّلِ بازاءِ كلِّ كمالٍ من شعب الإحسان تدلِّيًا، هو مِكشافُ حالِه، ومنه يُفيض على قلبه معرفةَ ذلك الكمال ذوقا ووجدانًا.

نظيرُ ذلك من المألوف: أن زيدًا الشاعِرَ المحاسِبَ: ربما يحضر فى ذهنه كونُه شاعرًا، وأنه فى أىِّ منزلة من الشعر، فيذهَلُ عن الحساب؛ وربما يحضر فى ذهنه كونُه محاسبًا، فيستغرق فى بَهْجَتِهَا، ويذهَل عن الشعر.

والأنبياءُ عليهم السلام أعرفُ الناس بتدلِّى الإيمانِ العامىِّ، لأن الله تعالى أراد أن يتبيَّنوا حقيقتَه بالذوق، فَيَسُنُّوا للناس سُنَّتَهم فيما يَنُوْبُهم فى تلك المرتبة، وهذا سِرُّ ظهور الأنبياء عليهم السلامُ، من استيفاء اللذات الحسية وغيرها، فى صورة عامة المؤمنين.

فرأى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم تدلِّيَهُ الإيمانيَّ بتقدمةِ بلالٍ، فعرف رسوخَ قدمه فى الإحسان.

ترجمہ: اور نوافل میں سے وضو کی نماز ہے: اور اس نماز کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے بلال رضی اللہ عنہ سے: "بیشک سنی میں نے تمہارے چپلوں کی چاپ اپنے سامنے جنت میں" میں کہتا ہوں: اور اس کا راز یہ ہے کہ پاکی پر مواظبت اور اس کے بعد نماز احسان کا ایک معقول نصاب ہے۔ نہیں حاصل ہوتا ہے وہ مگر بڑے نصیبہ ور سے یعنی نصیبہ ور ہی اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''کس عمل کی وجہ سے آگے نکل گئے تم مجھ سے جنت کی طرف؟'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب: یہ ہے کہ اس واقعہ میں آگے ہونا سلوک میں آگے ہونے کا پیکر محسوس ہے۔ اور راز بلال کے آگے ہونے میں سالکین کے سالار پر: یہ ہے کہ کاملوں کے لئے سلوک کی شاخوں میں سے ہر کمال کے مقابلہ میں ایک تجلی ہے۔ وہ تجلی اس کمال کے حال کو کھولنے کا ذریعہ ہے۔ اور اس تجلی سے اللہ تعالیٰ فیضان فرماتے ہیں کامل کے دل پر اس کمال کی معرفت کا ذوق و وجدان کے طور پر۔ اور اس کی نظیر مانوس چیزوں سے: یہ ہے کہ زید جو شاعر بھی ہے اور حساب داں بھی: کبھی حاضر ہوتا ہے اس کے ذہن میں اس کا شاعر ہونا۔ اور یہ کہ وہ شاعری کے بہت اونچے مرتبہ میں ہے۔ پس غافل ہو جاتا ہے وہ حساب سے۔ اور کبھی حاضر ہوتا ہے اس کے ذہن میں اس کا حساب داں ہونا، پس ڈوب جاتا ہے وہ اس کی رعنائی میں، اور غافل ہو جاتا ہے شاعری سے۔

اور انبیاء علیہم السلام لوگوں میں سب سے زیادہ جانتے ہیں عمومی ایمان کی تجلی کو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ خوب واضح طور پر جان لیں انبیاء عمومی ایمان کی حقیقت کو ذوق سے پس متعین کریں وہ لوگوں کے لئے ان کی راہ ان باتوں میں جو لوگوں کو پے بہ پے پیش آتی ہیں اس مرتبہ میں۔ اور یہ راز ہے انبیاء علیہم السلام کے ظاہر ہونے کا مادی اور ان کے علاوہ لذتوں کو پورا پورا وصول کرنے کے سلسلہ میں عام مؤمنین کی صورت میں۔

پس دیکھا رسول اللہ ﷺ نے بلال کی ایمانی تجلی کو بلال کے آگے ہونے کے ذریعہ۔ پس جان لیا ان کے قدم کے جمے ہونے کو سلوک و احسان میں۔

فائدہ: تدلّی کے لغوی معنی ہیں: لٹکانا، اوپر سے نیچے اتارنا۔ سورۃ النجم آیت ۸ ہے: ﴿ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ﴾ پھر جبرئیل قریب ہوئے پس لٹک آئے (اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ لٹک آنا مقدم ہے، اور قریب ہونا مؤخر ہے) اور سورۃ الاعراف آیت ۲۲ میں ہے ﴿ فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ ﴾ یعنی شیطان دھوکا دیکر آدم و حوا کو جنت سے نیچے لے آیا۔

اور اصطلاح میں جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو انوار و تجلیات مراد ہوتی ہیں۔ کیونکہ عرف عام میں وہ بھی اوپر سے نیچے اترتی ہیں۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ اور جب بندے سے اس کا تعلق ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں: سالک کا سُکر کی حالت سے افاقہ میں آنا۔ سید شریف جرجانی رحمہ اللہ التعریفات میں لکھتے ہیں: **هو نزول المقرَّبين بوجود الصَّحو المُفيق بعد ارتقائهم إلى منتهى مناهجهم اھ**

☆　☆　☆

صلاۃ التسبیح کی حکمت

صلوٰۃ التسبیح: وہ نماز ہے جس میں چار رکعتوں میں تین سو مرتبہ یہ تسبیح پڑھی جاتی ہے: **سبحان الله، والحمد لله،**

ولا إلٰــه إلا اللّٰــه، والله أكبــر اس نماز سے دس قسم کے گناہ معاف ہوتے ہیں: اگلے پچھلے، نئے پرانے، بھول سے کئے ہوئے اور دانستہ کئے ہوئے، چھوٹے بڑے، ڈھکے چھپے اور علانیہ کئے ہوئے۔ اور اس کی فضیلت کا راز یہی تسبیحات ہیں۔ چونکہ یہ نماز ذکر کے ایک بہت بڑے حصہ پر مشتمل ہے اس لئے بمنزلہ تہجد کی نماز کے ہے۔ جو نیک بندے تہجد پر قابو یافتہ نہیں ہیں یعنی پابندی سے نہیں پڑھ سکتے، وہ جس رات تہجد چھوٹ جائے، دن میں یہ نماز پڑھ لیں تو ان شاء اللہ کافی ہو جائے گی۔

> ومنها: صلاة التسبيح:
>
> سِرُّها: أنها صــــلاةٌ ذاتَ حَظٍّ جسيم من الذكر، بمنزلة الصلاةِ التامّةِ الكاملة التي سَنَّها رسولُ الله صلى الله عليه وسلم باذكارها للمُحْسِنين، فتلك تكفي عنها لمن لم يُحطْ بها، ولذلك بَيَّن النبيُّ صلى الله عليه وسلم عشر خصالٍ في فضلها.

ترجمہ: اور نوافل میں سے ایک خاص تسبیح پر مشتمل نماز ہے: اس کا راز یہ ہے کہ صلوٰۃ التسبیح ذکر کے بہت بڑے حصہ والی نماز ہے، جیسے وہ کامل و تام نماز جس کو رسول اللہ ﷺ نے جاری کیا ہے، اس کے اذکار کے ساتھ نیکوکاروں کے لئے۔ پس یہ نماز کفایت کرتی ہے اس (تہجد کی) نماز سے، اس شخص کے لئے جس نے اُس نماز کا احاطہ نہیں کیا۔ اور اسی وجہ سے نبی ﷺ نے اس کی فضیلت میں دس باتیں بیان فرمائی ہیں۔

لغات: ذات حظ جسيم من الذكر اى فيها ذكر طويل، وهو التسبيحات، وإن قلّت الركعات قوله: بمنزلة الصلوة التامة اى باعتبار الركعات، وهى صلوة التهجد قوله: فتلك تكفي عنها اى صلوة التسبيح تكفي عن صلاة التهجد (سندی)...... أحاط به: گھیرنا، قابو پانا۔ یہ لفظ مطبوعہ نسخہ میں لم يُحْظَ تھا حَظٌّ (س) حظا کے معنی ہیں نصیب والا ہونا۔ پس مطلب دونوں کا ایک ہے۔ مگر مخطوطہ کراچی میں جو لفظ تھا وہ لیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ شاہ صاحب کے سامنے پڑھا گیا ہے۔ اور مخطوطہ پٹنہ بھی اس کے موافق ہے۔

☆ ☆ ☆

قدرت کی نشانیاں ظاہر ہونے پر نماز کی حکمت

قدرت کی نشانیاں: جیسے سورج یا چاند کا گہنانا، اور شدید ظلمت کا چھا جانا وغیرہ۔ ایسے حادثات کے وقت میں بھی نماز مسنون ہے ۱۰ھ میں جب سورج کو گہن لگا تھا تو آنحضرت ﷺ نے باجماعت نماز ادا فرمائی تھی۔ اور نسائی میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: ''سورج اور چاند نہ تو کسی کے مرنے پر گہناتے ہیں، نہ پیدا ہونے پر۔ بلکہ یہ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور اللہ جو چاہتے ہیں اپنی مخلوق میں تغیر کرتے ہیں فأيّهما انخسف فصلّوا: پس

ان میں سے جس کو بھی گہن پڑے، تم نماز پڑھو (مشکوۃ حدیث ۱۴۹۳) اور ابوداؤد میں نضر قیسی کی روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حیات میں ایک مرتبہ (دن میں) اندھیرا چھا گیا۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ دور نبوی میں کبھی ایسا واقعہ رونما ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ کی پناہ! دور نبوی میں ہوا سخت چلنے لگتی تھی، تو ہم جلد مسجد پہنچ جاتے تھے۔ اس اندیشہ سے کہ قیامت برپا نہ ہو جائے (جامع الاصول ۷: ۱۲۷)

اور قدرت کی نشانیاں ظاہر ہونے پر نماز پڑھنے میں تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: جب قدرتِ خداوندی کی کوئی بڑی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو دلوں کی دنیا بدل جاتی ہے۔ فرمانبرداری کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ لوگ اللہ کی پناہ کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اور علائق دنیا سے کسی درجہ میں بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ پس مؤمن کو یہ حالت غنیمت جانی چاہئے اور نماز و دعا میں لگ جانا چاہئے۔ اور دیگر اعمالِ خیر یہ: صدقہ وغیرہ بھی کرنے چاہئیں۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سورج گہن کے وقت غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے (مشکوۃ حدیث ۱۴۸۹)

دوسری حکمت: اللہ تعالیٰ پہلے قدرتی نشانیوں کا فیصلہ عالم مثال میں کرتے ہیں۔ چنانچہ عالم مثال کے احوال جاننے والے ایسے اوقات میں گھبراہٹ کو متاعِ جاں بنا لیتے ہیں۔ اسی لئے سورج کو گہن لگنے پر آنحضرت ﷺ گھبرا گئے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں: **خسفت الشمسُ فقام النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم فزِعا، یَخْشیٰ أن تکونَ الساعةُ**: سورج کو گہن لگا تو آپؐ نے گھبرا کر نماز شروع کر دی۔ آپؐ کو اندیشہ ہوا کہ قیامت برپا ہو جائے۔

اور ان اوقات میں زمین میں ایک خاص قسم کی روحانیت بھی پھیلتی ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت قبیصہ ہلالی رضی اللہ عنہما کی روایتوں میں نسائی شریف (۳: ۱۴۴) میں ہے کہ: ''جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز پر تجلی فرماتے ہیں تو وہ اللہ کے لئے فروتنی کرنے لگتی ہے'' پس نیک بندوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ ان اوقات میں نماز وغیرہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کریں۔

تیسری حکمت: کفار سورج اور چاند کی پرستش کرتے ہیں، پس جب کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جس سے پتہ چلے کہ یہ دونوں بندگی کے لائق نہیں ہیں تو مؤمن پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے۔ سورہ حٰم السجدۃ آیت ۳۷ ہے: ''اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن ہیں اور سورج اور چاند ہیں۔ پس تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو، اور نہ چاند کو، اور اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے، اگر تم کو خدا کی عبادت کرنا منظور ہے''

غرض گہن لگنے پر نماز پڑھنا دین اسلام کی ایک مخصوص بات ہے، اور وہ اللہ کا انکار کرنے والوں کے لئے ایک مسکت جواب بھی ہے کہ دیکھو! تم جن کو خدا مانتے ہو ان کی خدائی پر زوال آ گیا!

فائدہ: سورج گہن پر نماز باجماعت ادا کی جائے گی۔ اور چاند گہن پر یا دیگر نشانیاں پیش آنے پر لوگ تنہا نماز پڑھیں گے۔ ان میں آنحضرت ﷺ کا جماعت سے نماز پڑھنا ثابت نہیں۔

ومنها: صلاة الآيات: كالكسوف، والخسوف، والظلمة:

والأصل فيها: أن الآياتِ إذا ظهرت، انقادت لها النفوسُ، والتجأتْ إلى الله، وانفكّتْ عن الدنيا نوعَ انفكاك، فتلك الحالةُ غنيمةُ المؤمن، ينبغي أن يبتهل في الدعاء، والصلاة، وسائر أعمال البر.

وأيضًا: فإنها وقتُ قضاء الله الحوادثَ في عالم المثال، ولذلك يستشعرُ فيها العارفون الفزعَ، وفزِعَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم عندها لأجل ذلك، وهي أوقاتُ سَرَيَانِ الروحانية في الأرض، فالمناسب للمُحسن: أن يتقرب إلى الله في تلك الأوقات، وهو قوله صلى الله عليه وسلم في الكسوف في حديثِ نعمانَ بن بشير: "فإذا تجلَّى الله لشيئٍ من خلقه خَشَعَ له"

وأيضًا: فالكفار يسجدون للشمس والقمر، فكان من حق المؤمن: إذا رأى آيةَ عدم استحقاقهما العبادةَ: أن يتضرع إلى الله، ويسجدَ له، وهو قوله تعالى: ﴿لَاتَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ، وَلَالِلْقَمَرِ، وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ﴾ ليكون شعاراً للدين، وجوابًا مسكتا لمنكريه.

ترجمہ: اور منجملۂ نوافل قدرت کی نشانیوں کی نماز ہے: جیسے سورج گہن، چاند گہن، اور تاریکی۔

اور بنیادی بات اس نماز میں: یہ ہے کہ جب آیاتِ قدرت ظاہر ہوتی ہیں تو نفوس ان کے لئے فروتنی کرتے ہیں۔ اور نفوس اللہ کی طرف پناہ لیتے ہیں۔ اور وہ دنیا سے کسی درجہ میں بےتعلق ہوجاتے ہیں۔ پس یہ حالت مؤمن کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ مناسب ہے کہ وہ دعا و نماز میں گڑگڑائے اور دیگر نیک کام کرے۔

اور نیز: پس بیشک وہ نشانیاں عالم مثال میں اللہ تعالیٰ کے حوادث کا فیصلہ کرنے کا وقت ہے۔ اور اس وجہ سے عارفین حادثات کے وقت دل میں گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے حادثات پیش آنے پر رسول اللہ ﷺ گھبراتے ہیں۔ اور حوادث: زمین میں روحانیت کے سرایت کرنے کے اوقات ہیں۔ پس نیکوکار کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کرے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے سورج گہن کے بارے میں نعمان بن بشیر کی حدیث میں: ''پس جب اللہ تعالیٰ تجلی فرماتے ہیں اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز پر تو وہ اللہ کے سامنے عاجزی کرتی ہے''

اور نیز: پس کفار سورج اور چاند کو سجدہ کرتے ہیں۔ پس مؤمن پر لازم ہے کہ جب وہ دیکھے ان دونوں کے عبادت کا حقدار نہ ہونے کی نشانی کو تو وہ اللہ کے سامنے گڑگڑائے اور اس کو سجدہ کرے۔ اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''نہ سجدہ کرو تم سورج کو، اور نہ چاند کو، اور سجدہ کرو تم اس اللہ کو جس نے ان کو پیدا کیا ہے'' تاکہ وہ سجدہ کرنا دین کا شعار بن جائے۔ اور اللہ کا انکار کرنے والوں کے لئے مسکت جواب ہوجائے۔

نمازِ کسوف کا بیان

جب ۱۰ھ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے سورج کو گہن لگا تو آپؐ نے مدینہ میں اعلان کروایا: الصلاۃُ جامعۃٌ یعنی سب لوگ نماز کے لئے جامع مسجد پہنچیں۔ لوگ آنے شروع ہوگئے۔ جب معتدبہ مقدار آگئی تو آپؐ نے نماز شروع کردی۔ باقی لوگ آتے رہے اور جماعت میں شامل ہوتے رہے۔ اب روایات میں شدید اختلاف ہے۔ چھ طرح سے روایات مروی ہیں: ہر رکعت میں ایک سے پانچ رکوع تک کی اور یہ کہ آپؐ دو دو رکعتیں پڑھتے تھے، اور دریافت کرتے تھے کہ گہن کھلا یا نہیں؟ اور قراءت کے سلسلہ میں بھی جہری اور سرّی دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔ اس لئے ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ نے تو دو رکوع والی روایت لی۔ کیونکہ وہ باب کی صحیح ترین روایت ہے۔ اور احناف نے ہدایتِ نبوی پر عمل کیا۔ نسائی (۱۴۱:۳) میں حضرت نعمان اور حضرت قبیصہ رضی اللہ عنہما کی روایات ہیں کہ: ''جب آئندہ ایسا واقعہ پیش آئے تو تم نے جو قریب ترین فرض نماز پڑھی ہے یعنی فجر کی نماز کی طرح نماز پڑھو'' شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دونوں طرح پڑھنے کو روا رکھا ہے۔ اور قراءت کے معاملہ میں ابوحنیفہ، شافعی اور مالک رحمہم اللہ نے سراً پڑھنے کو اختیار کیا ہے۔ اور احمد، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ نے جہراً کو پسند کیا ہے۔ شاہ صاحب نے بھی اسی کو لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

نبی ﷺ سے ہر رکعت میں دو قیام اور دو رکوع ثابت ہوئے ہیں۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ رکوع بھی سجدہ کی طرح ابتہال (گڑگڑا کر دعا کرنا) ہے یعنی خضوع وخشوع کے مقصد میں دونوں مشترک ہیں۔ پس سجدہ کی طرح ان کی بھی تکرار مناسب ہے ——— اسی طرح آپؐ کا باجماعت نماز پڑھنا بھی ثابت ہے۔ کیونکہ سورج گہن کی نماز دن میں پڑھی جاتی ہے اور دن میں لوگوں کے جمع ہونے میں کوئی دشواری نہیں۔ اور تنہا پڑھنے سے جماعت کے ساتھ پڑھنا بہتر ہے۔ اور چاند گہن کی نماز رات میں پڑھی جاتی ہے۔ اور رات میں لوگوں کا جمع ہونا دشوار ہے۔ پس اس کو تنہا پڑھنا چاہئے۔

اور آپؐ نے اذان کے بجائے الصلاۃ جامعۃ کی بانگ لگوائی یعنی سب لوگ مسجد نبوی میں (جو جامع مسجد تھی) نماز کے لئے پہنچیں۔ کیونکہ اذان سے اول تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، ثانیاً لوگوں کو غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ اس لئے اعلان کا یہ نیا طریقہ اختیار کیا۔ یہیں سے احناف نے یہ مسئلہ طے کیا ہے کہ کسوف کی نماز ہر مسجد میں نہیں ہوگی۔ بلکہ جمعہ کی طرح امام المسلمین پڑھائے یا اس کا کوئی نائب پڑھائے۔

اور آپؐ نے قراءت جہری فرمائی۔ پس جو اس طریقہ پر صلاۃ الکسوف پڑھے تو فبہا اور جو معمول کے مطابق پڑھے یعنی ہر رکعت میں ایک رکوع کرے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ یہ آپؐ کے فعل کے بجائے قول پر عمل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ روایت ہے: ''اور جب تم یہ دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اور تکبیر کہو، اور نماز پڑھو اور خیرات کرو'' (مشکوۃ حدیث ۱۴۸۳)، اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''پس جب تم ان میں سے کوئی

نشانی دیکھوتو اللہ کے ذکر کی طرف اوران سے دعاؤ استغفار کی طرف گھبرا کر چل دو'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۴۸۴)

فائدہ: ان روایات کے بجائے حضرت نعمان اور حضرت قبیصہ رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا روایات کا حوالہ دینا مناسب تھا۔ معلوم نہیں شاہ صاحب نے کس مصلحت سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

وقد صحَّ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنہ قام قیامین، ورکع رکوعین، حملاً لھما علی السجدۃ فی موضع الابتھال، فإنہ خضوع مثلھا، فینبغی تکرارُھا، وأنہ صلاھا جماعۃً، وأمر أن یُنادی بھا: أن الصلاۃ جامعۃ، وجھر بالقراء ۃ، فمن اتَّبع فقد أحسن، ومن صلّی صلا تہ معتدًا بھا فی الشرع، فقد عمل بقولہ علیہ السلام:" فإذا رأیتم ذلک فادعوا اللہ، وکبروا، وصلوا، وتصدقوا"

ترجمہ: اور تحقیق ثابت ہوا ہے نبی ﷺ سے کہ آپؐ نے دو قیام فرمائے اور دو رکوع کئے (اس کا طریقہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے جو مشکوٰۃ شریف باب صلاۃ الکسوف میں ہے) محمول کرتے ہوئے دو رکوع کو سجدہ پر گڑگڑانے کی جگہ میں (یعنی رکوع سے بھی ابتہال کا مقصد پورا ہوتا ہے) پس بیشک وہ رکوع سجدہ کی طرح عاجزی کرنا ہے۔ پس مناسب ہے اس کی تکرار۔ اور یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ آپؐ نے اس کو باجماعت ادا کیا ہے۔ اور حکم دیا کہ اس کی بانگ دی جائے کہ نماز کے لئے جامع مسجد میں آجاؤ۔ اور آپؐ نے جہری قراءت کی۔ پس جس نے اس کی پیروی کی تو یقیناً اس نے بہتر کیا۔ اور جس نے پڑھی اپنی نماز اس طریقہ پر جس کا اعتبار کیا گیا ہے شریعت میں تو تحقیق عمل کیا اس نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر: ''پس جب دیکھو تم اس کو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اور تکبیر کہو اور نماز پڑھو اور خیرات کرو''

☆ ☆ ☆

بارش طلبی کی نماز کی حکمت

استسقاء کے لغوی معنی ہیں: پانی مانگنا اور سیرابی طلب کرنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: جب کسی علاقہ میں سوکھا پڑے تو اللہ سے بارش طلب کرنا۔ بارش انسانوں ہی کی نہیں بلکہ حیوانات ونباتات کی بھی بنیادی ضرورت ہے۔ سب کی زندگی کا پانی پر انحصار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بابرکت زمانہ میں بھی سوکھا پڑا ہے۔ اور آپؐ نے اپنی امت کے لئے مختلف انداز سے بارش طلب کی ہے۔ کبھی جمعہ کے خطبہ میں دعا فرمائی تو نماز ختم ہونے سے پہلے بدلی امنڈ آئی، اور ہفتہ بھر خوب برسی۔ کبھی آپؐ لوگوں کے ساتھ شہر سے باہر احجار الزیت نامی مقام پر تشریف لے گئے۔ اور نماز کے بغیر بارش کی دعا فرمائی۔ اور ایک مرتبہ عیدگاہ میں تشریف لے جا کر نماز پڑھ کر بارش طلب کی۔ اس لئے اختلاف ہوا ہے کہ استسقاء کے لئے نماز سنت ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ استسقاء کے لئے نماز سنت نہیں۔ یعنی اور طرح سے

بھی بارش طلب کرنا درست ہے۔ اور یہ بات بالکل درست ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ نماز پڑھ کر ہی بارش طلب نہیں کی۔ اور طریقوں سے بھی بارش طلب کی ہے۔ رہی صلاۃ استسقاء کی مشروعیت یا استحباب تو اس کے امام اعظم منکر نہیں ہیں۔ اور جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نماز استسقاء نہیں ہے یعنی جائز نہیں ہے۔ یہ ان کے قول کی صحیح تعبیر نہیں ہے۔ اور جو حضرات صلاۃ استسقاء کو سنت کہتے ہیں، وہ بھی دیگر طریقوں سے بارش طلبی کے منکر نہیں ہیں۔ پس یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے۔

بہرحال ایک مرتبہ نبی ﷺ لوگوں کے ساتھ عیدگاہ تشریف لے گئے: پرانے کپڑوں میں، خاکساری کی حالت میں اور عاجزی سے دعا کرتے ہوئے۔ وہاں آپؐ نے لوگوں کے ساتھ دو رکعت نفل ادا فرمائی۔ جن میں جہری قراءت فرمائی۔ پھر مختصر سا خطبہ دیا۔ اور جب دعا کا وقت آیا تو منہ قبلہ کی طرف کر لیا۔ اور دعا میں دونوں ہاتھ اتنے اونچے اٹھائے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ اور چادر مبارک کو پلٹ دیا۔ ابھی فارغ ہو کر واپس لوٹنے نہیں پائے تھے کہ بادل اٹھا اور خوب گرجا برسا۔ اور آپؐ کے مسجد لوٹنے سے پہلے نالے بہنے لگے۔ اور لوگ بھاگ بھاگ کر سائبانوں کی پناہ لینے لگے تو آپؐ کو ہنسی آ گئی۔ اور فرمایا: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے، اور میں اس کا بندہ اور رسول ہوں!'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۵۰۸)

نماز استسقاء کی حکمت: یہ ہے کہ اعمالِ خیر یہ کر کے اور گناہوں سے توبہ کر کے، پوری توجہ سے ایک چیز طلب کرنے کے لئے مسلمانوں کا ایک جگہ میں اکٹھا ہونا قبولیتِ دعا میں بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر نماز پڑھ کر دعا کی جائے تو سونے پہ سہاگا! کیونکہ نماز میں بندہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے۔

اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے میں حکمت یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو اٹھانا تضرعِ تام اور ابتہالِ عظیم کا پیکر محسوس ہے جو نفس کو عاجزی کرنے کے لئے چوکنا کرتا ہے جیسے سائل ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتا ہے تو اس کے لہجہ میں بھی بیچارگی آ جاتی ہے۔

اور امام کا چادر پلٹنا لوگوں کے احوال کے پلٹنے کا پیکر محسوس ہے۔ جیسے فریادی لُٹا پِٹا تباہ حال بادشاہ کے دربار میں پہنچتا ہے تاکہ اس کا حال زار دیکھ کر بادشاہ کو رحم آ جائے۔ اسی طرح بارش نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے احوال کا دیگرگوں ہونا چادر پلٹنے کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔

یا یہ کہا جائے کہ یہ چادر پلٹنا بھی دعا ہی کا ایک جزء ہے۔ اس فعل سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ الٰہی! جس طرح میں نے اس چادر کو الٹ دیا ہے، اُسی طرح آپ بھی بارش نازل فرما کر صورتِ حال کو پلٹ دیں۔ یا یوں کہا جائے کہ خدایا! ہم اپنے احوال پلٹ رہے ہیں۔ گناہوں سے توبہ کر رہے ہیں۔ آپ بھی اپنی سنت بدل دیں اور بارش عنایت فرمائیں۔

بارش طلبی کے لئے دعائیں: آپ ﷺ نے مختلف موقعوں پر اس طرح بارش طلب فرمائی ہے:

پہلی دعا: اَللّٰهُمَّ اسْقِ عِبَادَكَ وبَهِيْمَتَكَ، وَانْشُرْ رَحْمَتَكَ، وَأَحْيِ بَلَدَكَ الْمَيِّتَ: الٰہی! اپنے بندوں کو اور اپنے چوپایوں کو پانی پلا اور اپنی رحمت پھیلا اور اپنی ویران زمین کو آباد فرما۔

دوسری دعا: اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا غَیْثًا مُغِیْثًا مَرِیْئًا مُرِیْعًا نَافِعًا غَیْرَ ضَارٍّ، عَاجِلاً غَیْرَ آجِلٍ: الٰہی! پلا ہمیں: مینہ، فریادرسی کرنے والا، اچھے انجام والا، ارزانی کرنے والا، نفع پہنچانے والا، ضرر نہ پہنچانے والا، جلدی آنے والا، دیر نہ لگانے والا۔

فائدہ: منجملۂ نوافل: دونوں عیدوں کی نمازیں ہے (شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک وتر کی طرح یہ نماز بھی سنت ہے) ان نمازوں کا تذکرہ آگے مستقل عنوان سے آئے گا۔

ومنها: صلاة الاستسقاء:

وقد استسقى النبيُّ صلى الله عليه وسلم لأمته مراتٍ، على أنحاءٍ كثيرة، لكن الوجهَ الذى سنَّه لأمته: أن خرج بالناس إلى المصلّى، مُتَبَذِّلاً، متواضعا، متضرّعا، فصلّى ركعتين، جهر فيهما بالقراءة، ثم خطب، واستقبل فيها القبلة يدعو، ويرفع يديه، وحوَّل رداءه.

وذلك: لأن لاجتماع المسلمين فى مكان واحدٍ، راغبين فى شيئ واحد، بأقصى هِمَمِهِمْ، واستغفارِهم، وفعلهم الخيراتِ: أثرًا عظيمًا فى استجابة الدعاء؛ والصلاةُ أقرب أحوال العبد من الله، ورفعُ اليدين حكاية عن التضرع التام والابتهال العظيم، تُنَبِّهُ النفسَ على التخشع، وتحويلُ ردائه حكاية عن تقلب أحوالهم، كما يفعل المستغيث بحضرة الملوك.

وكان من دعائه عليه السلام إذا استسقى: "اللهم اسق عبادك وبهيمتك، وانشُرْ رحمتك، وأَحْيِ بلدَك الميت" ومنه أيضاً: "اللهم اسْقِنا غَيْثًا مُغيثًا مَرِيئًا مُرِيعا، نافعًا غير ضارّ، عاجلا غير آجل"

ومنها: صلاة العيدين: وسيأتيك بيانهما.

ترجمہ: اور منجملۂ نوافل: نماز استسقاء ہے: اور نبی ﷺ نے اپنی امت کے لئے مختلف انداز سے کئی بار بارش طلب کی ہے۔ لیکن وہ طریقہ جس کو آپؐ نے اپنی امت کے لئے مسنون کیا ہے: یہ ہے کہ آپ تشریف لے گئے لوگوں کے ساتھ عیدگاہ میں، پرانے کپڑے پہنے ہوئے۔ خاکساری کی حالت میں۔ عاجزی سے دعا کرتے ہوئے۔ پس آپؐ نے لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائیں، جن میں قراءت جہری فرمائی۔ پھر خطبہ دیا۔ اور خطبہ میں منہ قبلہ کی طرف کیا جبکہ آپ دعا مانگنے لگے۔ اور آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ اور اپنی چادر کو پلٹا —— اور وہ بات اس لئے ہے کہ مسلمانوں کے اکٹھا ہونے کے لئے، ایک جگہ میں، درانحالیکہ وہ ایک چیز میں رغبت کرنے والے ہوں، اپنی انتہائی توجہات کے ساتھ، اور اپنی مغفرت طلبی کے ساتھ اور خیراتیں کرنے کے ساتھ۔ بہت بڑا اثر رکھتا ہے دعا کی قبولیت میں۔ اور نماز بندے کے احوال میں سے قریب ترین حالت ہے اللہ سے —— اور دونوں ہاتھوں کا اٹھانا تضرع تام اور ابتہال عظیم کی حکایت ہے، چوکنا کرتی ہے یہ حکایت نفس کو عاجزی کرنے پر —— اور آپؐ کا چادر پلٹنا لوگوں کے احوال پلٹنے کی حکایت ہے، جیسا کہ فریادی بادشاہوں کے دربار

میں کرتا ہے۔اور نبی ﷺ کی دعا سے تھا جب آپؐ نے بارش طلب کی الی آخرہ۔

اور منجملۂ نوافل: دو عیدوں کی نماز ہے۔اور عنقریب آئے گا تیرے پاس ان دونوں کی تفصیل۔

☆ ☆ ☆

سجدۂ شکر کی حکمت

سجدۂ شکر: نوافل کے مشابہ ایک عبادت ہے۔جب کوئی خوش کن معاملہ پیش آئے یا کوئی آفت ٹلے یا ان باتوں کی اطلاع ملے تو سجدۂ تلاوت کی طرح سجدۂ شکر بجالانا مسنون ہے۔متعدد مواقع پر آنحضرت ﷺ نے خوشی کی خبر پر سجدۂ شکر کیا ہے۔اور یہ آپؐ کا معمول تھا۔الکوکب الدری میں ہے کہ احناف کا بھی مفتی بہ قول یہی ہے کہ سجدۂ شکر مستحب ہے۔اور امام اعظم سے جو مروی ہے کہ لَمْ یَرَہٗ: آپ نے اس کو نہیں دیکھا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شکر تام نہیں۔شکر تام: کم از کم دو نفل پڑھنا ہے۔فتح مکہ کے موقع پر جو آپؐ نے آٹھ نفل پڑھے تھے۔ان کو فتح کا شکریہ بھی قرار دیا گیا ہے[1] ـــــ اور سجدۂ شکر کی دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: تشکر وامتنان درحقیقت ایک قلبی جذبہ ہے۔اس کے لئے کوئی پیکر محسوس ضروری ہے۔تاکہ وہ باطنی کیفیت اس ظاہری عمل سے مضبوط ہوجائے۔

دوسری حکمت: نعمتوں پر آدمی کبھی نازاں ہوتا ہے، اتنا کہ اترانے لگتا ہے۔یہ ایک بری کیفیت ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ مُنعِم (نعمتیں عطا کرنے والے) کے سامنے عاجزی کی جائے، تاکہ وہ خراب کیفیت دل میں پیدا نہ ہو۔

مسنون نمازیں مقرّب بندوں کے لئے ہیں

نماز کے اذکار اور مستحب ہیئات کا بیان جہاں سے شروع ہوا ہے، وہاں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ نماز سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے فرائض کے علاوہ سنن ونوافل کی ایک مقدار بھی مسنون کی گئی ہے تاکہ ان کے ذریعہ نماز سے کامل فائدہ حاصل کیا جاسکے۔وہ سب مسنون نمازیں یہی ہیں جو نوافل کے عنوان کے تحت بیان کی گئی ہیں: شریعت نے یہ نمازیں نیکوکاری اور سلوک میں کمربستہ حضرات کے لئے اور امت کے سابقین کے لئے مشروع کی ہیں۔یہ نمازیں: عوام وخواص پر جو نمازیں واجب ولازم ہیں ان کے علاوہ ہیں: ﴿ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴾ اور حرص کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ اس چیز کی حرص کریں۔واللہ الموافق!

---

[1] اور سجدۂ مناجات جائز نہیں۔کسی صحیح روایت سے اس کا ثبوت نہیں۔اور اس سلسلہ میں جو روایت بیان کی جاتی ہیں۔کبیری میں لکھا ہے کہ وہ موضوع ہے اور صحیح روایات میں جو سجدہ میں آنحضرت ﷺ کا دعا کرنا مروی ہے، اس سے مراد تہجد وغیرہ نفل نمازوں کے سجدوں میں دعا کرنا ہے ۱۲

طلوع وغروب اور استواء کے وقت نماز ممنوع ہونے کی وجہ

نماز سے بہتر کوئی کام نہیں۔ پس جو زیادہ سے زیادہ نماز سے حصہ لے سکے، اس کو لینا چاہئے۔ البتہ پانچ اوقات میں نماز ممنوع ہے۔ پھران میں سے تین اوقات میں نماز کی سخت ممانعت ہے۔ اور وہ یہ ہیں:

۱ ـــــ جب سورج طلوع ہونا شروع ہو یعنی اس کا اوپر کا کنارہ نمودار ہو۔ پھر جب تک سورج بلند نہ ہو جائے یعنی اس میں روشنی نہ بھر جائے اور اس کی کرنیں نہ پڑنے لگیں، ہر نماز مکروہ تحریمی ہے۔

۲ ـــــ جب سورج سر پہ آجائے یعنی ٹھیک دوپہر کو جب لمبی چیزوں کا سایہ گھٹنا بند ہو جائے۔ پھر جب تک سورج ڈھل نہ جائے یعنی سایہ مشرق کی طرف بڑھنے نہ لگے، ہر نماز مکروہ تحریمی ہے۔

۳ ـــــ جب سورج ڈوبنے کے لئے تیار ہو جائے یعنی اس کی روشنی ختم ہو جائے، اور وہ لال تھالی بن جائے، تو جب تک غروب نہ ہو جائے یعنی اس کا اوپر کا کنارہ چھپ نہ جائے، ہر نماز مکروہ تحریمی ہے۔

اور ان تین اوقات میں نماز کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ مجوس کی نماز کے اوقات ہیں۔ مجوس ایک ایسی قوم ہے جس نے اللہ کے نازل کردہ دین میں تحریف کر ڈالی ہے۔ اور وہ اللہ کو چھوڑ کر سورج کی پرستش میں لگ گئی ہے۔ اور شیطان ان پر اس درجہ غالب آ گیا ہے کہ انھوں نے محرف دین ہی کو اصل دین باور کر لیا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ان اوقات میں نماز ممنوع ہونے کی یہی وجہ بیان کی گئی ہے۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے: ''پس بیشک سورج نکلتا ہے، جب نکلتا ہے شیطان کے دو سینگوں کے درمیان، اور اس وقت اس کو کفار سجدہ کرتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۰۴۲)

اور جب ان اوقات میں کفار سورج کی پرستش کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ ملتِ اسلام اور ملتِ کفر کے درمیان وقت کے لحاظ سے بھی نماز میں، جو سب سے بڑی عبادت ہے، امتیاز کیا جائے۔ چنانچہ ان اوقات میں نماز ممنوع ہوئی۔

فجر اور عصر کے بعد نوافل ممنوع ہونے کی وجہ

دوسرے دو وقت جن میں صرف نوافل ممنوع ہیں: یہ ہیں: (۱) فجر کی نماز کے بعد طلوع تک (۲) عصر کی نماز کے بعد غروب تک۔ ایک متفق علیہ روایت میں ہے کہ: ''کوئی (نفل) نماز نہیں فجر کے بعد تا آنکہ سورج اونچا ہو جائے۔ اور نہ عصر کے بعد تا آنکہ سورج ڈوب جائے'' (مشکوۃ حدیث ۱۰۴۱)

یہ دو وقت درحقیقت نماز کے مکروہ اوقات نہیں ہیں۔ ان اوقات میں ایک عارضی مصلحت سے نفل نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے۔ اور وہ مصلحت یہ ہے کہ جو شخص ان دو وقتوں میں نوافل میں لگ جائے گا، ہو سکتا ہے کہ وہ مکروہ وقت میں بھی نماز پڑھتا رہے۔ اور چونکہ یہ اندیشہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں تھا۔ آپ غفلت میں اچانک مکروہ وقت میں داخل

ہونے سے محفوظ تھے۔اس لئے آپؐ نے ایک مرتبہ عصر کے بعد ظہر کی دوسنتیں پڑھی ہیں۔اور جب عصر کے بعد پڑھی ہیں تو گویا فجر کے بعد بھی پڑھی ہیں معلوم ہوا کہ ان دووقتوں میں فی نفسہ نماز مکروہ نہیں ہے۔

جمعہ کے دن بوقتِ استواء اور مسجد حرام میں پانچوں اوقات میں نماز مکروہ نہ ہونے کی وجہ

ایک نہایت ضعیف روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نصف النہار کے وقت نماز کی ممانعت فرمائی تا آنکہ سورج ڈھل جائے مگر جمعہ کے دن کو مستثنیٰ فرمایا (مشکوۃ حدیث ۱۰۴۶) یعنی جمعہ کے دن استواء کے وقت بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔

اسی طرح مسجد حرام میں پانچوں اوقات میں نماز کی اجازت آئی ہے۔خصوصیت سے فجر اور عصر کے بعد جواز کی روایت تو ضعیف ہے، جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''فجر کے بعد کوئی نماز نہیں تا آنکہ سورج نکل آئے۔اور نہ عصر کے بعد تا آنکہ سورج چھپ جائے۔مگر مکہ مستثنیٰ ہے، مگر مکہ مستثنیٰ ہے، مگر مکہ مستثنیٰ ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۰۵۱) اور اس سلسلہ میں جو عام روایت ہے وہ صحیح تو ہے مگر صریح نہیں۔اس سے جواز مستنبط کیا گیا ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اے عبد مناف کی اولاد! نہ روکو تم کسی کو جو اس گھر کا طواف کرے، اور نماز پڑھے، رات دن کی جس گھڑی میں چاہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۰۵۴) اس ارشاد پاک کے عموم سے یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ مسجد حرام میں رات اور دن کی ہر گھڑی میں ہر نماز جائز ہے[1]

بہر حال: جواز کا راز یہ ہے کہ جمعہ کا دن شعائر اسلام کے ظہور کا وقت ہے۔اور مسجد حرام شعائر اسلام کے ظہور کی جگہ ہے۔پس ان دونوں باتوں نے مانع سے مقاومت (مقابلہ) کی اور قوی تر سبب نے قوی سبب کا اثر باطل کردیا یعنی نہلے پہ دہلہ ہو گیا اور ممانعت مرتفع ہوگئی۔

ومما يناسبها: سجودُ الشكر عند مجيئ أمرٍ يسرُّه، أو اندفاع نِقمة، أو عند علمه بأحد الأمرين: لأن الشكر فعل القلب، ولابد له من شَبَحٍ في الظاهر، ليعتضِد به، ولأن لِلنِّعَم بطرًا، فَيُعالَج بالتذلل للمُنعم.

[1] یہ روایت صریح اس لئے نہیں کہ اس میں اصالۃً مسجد حرام کے متولی کے فرائض منصبی کا بیان ہے۔اوقات خمسہ میں نماز کے جواز کا بیان نہیں ہے۔ نیز: اوقات خمسہ میں مطلقاً نماز کی ممانعت کی روایات اعلی درجہ کی صحیح اور صریح ہیں۔اس لئے احناف نے ان ضعیف اور غیر صریح روایت کو مخصص نہیں بنایا ۱۲

فهذه هي الصلوات التي سَنَّها رسولُ الله صلى الله عليه وسلم لمستعدِّى الإحسان، والسُّبَّقِ من امته، زيادةً على الواجب المحتوم، على خاصتهم وعامتهم.

ثم الصلاة خير موضوع، فمن استطاع أن يستكثر منها فليفعل، غير أنه نهى عن خمسةِ أوقاتٍ: ثلاثة منها أو كد نهيًا عن الباقين؛ وهي الساعات الثلاث: إذا طلعت الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل، وحين تتضَيَّفُ للغروب حتى تغرب؛ لأنها أوقات صلاة المجوس، وهم قوم حَرَّفوا الدين، جعلوا يعبدون الشمس من دون الله، واستَحْوَذَ عليهم الشيطان، وهذا معنى قوله صلى الله عليه وسلم: "فإنها تطلع حين تطلع بين قَرْنَي الشيطان، وحينئذ يسجد لها الكفار" فوجب أن يُمَيِّزَ ملةُ الإسلام وملةُ الكفر في أعظم الطاعات من جهة الوقت أيضًا.

وأما الآخران: فقوله صلى الله عليه وسلم: " لاصلاة بعد الصبح حتى تَبْزَغ الشمس، ولا بعد العصر حتى تغرب"

أقول: إنما نهى عنهما: لأن الصلاة فيهما تفتح بابَ الصلاة في الساعات الثلاث، ولذلك صلى فيهما النبيُّ صلى الله عليه وسلم تارةً، لأنه مأمونٌ أن يهجم عليه المكروه.

وروى استثناءُ نصف النهار يوم الجمعة، واستُنبط جوازُها في الأوقات الثلاث في المسجد الحرام، من حديث:" يا بني عبدِ مَنَافٍ! من وَلِيَ منكم من أمر الناس شيئًا فلا يمنعَنَّ أحدًا طاف بهذا البيت، وصلَّى أيَّ ساعةٍ شاء من ليل أو نهار" وعلى هذا: فالسر في ذلك: أنهما وقتُ ظهور شعائر الدين، ومكانُه، فعَارَضا المانعَ من الصلاة.

ترجمہ: اوران چیزوں میں سے جونوافل سے مشابہت رکھتی ہیں: سجدۂ شکر ہے، کسی ایسے امر کے آنے کے وقت جوان کوخوش کرے، یا کسی نقمت (آفت) کے ہٹنے کے بعد یاان دوچیزوں میں سے کسی ایک کو جاننے کے وقت: اس لئے کہ جذبۂ شکر دل کا فعل ہے، اورضروری ہے اس کے لئے ظاہر میں کوئی پیکر محسوس ہونا، تاکہ جذبۂ شکراس پیکر سے مضبوط ہو ——— اوراس لئے کہ نعمتوں کے لئے اتراتا ہے۔ پس علاج کیا جائے وہ انعام کرنے والے کے سامنے عاجزی کرنے کے ذریعہ۔

پس یہ وہ نمازیں ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے مسنون کیا ہے سلوک کے لئے کمر بستہ لوگوں کے لئے اوراپنی امت کے اعلی درجہ کے لوگوں کے لئے۔ جو کہ زائد ہیں عوام وخواص پرواجب ولازم نمازوں سے۔

پھر نماز بہترین کام ہے۔ پس جوشخص استطاعت رکھتا ہے کہ زیادہ کرے اس سے تو چاہئے کہ کرے۔ البتہ یہ بات

ہے کہ نبی ﷺ نے پانچ اوقات سے روکا ہے۔ان میں سے تین زیادہ مؤکد ہیں ممانعت کے اعتبار سے باقی دو سے۔ اور وہ تین گھڑیاں: جب سورج چمکتا ہوا نکلے، تا آنکہ بلند ہوجائے۔اور جب ٹھہر جائے ٹھہرنے والی دوپہر تا آنکہ وہ ڈھل جائے۔اور جب سورج ڈوبنے کی طرف مائل ہوجائے تا آنکہ ڈوب جائے ـــــ اس لئے کہ یہ تین اوقات مجوس کی نماز کے اوقات ہیں۔اور مجوس ایسی قوم ہے جنھوں نے دین میں تحریف کردی ہے۔پوجنے لگے ہیں وہ سورج کو اللہ کو چھوڑ کر، اور غالب آگیا ہے ان پر شیطان۔اور یہ معنی ہیں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے:''پس بیشک سورج نکلتا ہے شیطان کے دوسینگوں کے درمیان، اور اس وقت سجدہ کرتے ہیں اس کو کفار'' پس ضروری ہے کہ ملتِ اسلام اور ملتِ کفر ممتاز کی جائیں سب سے بڑی عبادت میں، وقت کے لحاظ سے بھی۔

اور رہے دوسرے دو وقت: پس آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:''کوئی نماز نہیں فجر کے بعد، یہاں تک کہ سورج چمکے، اور نہ عصر کے بعد یہاں تک کہ سورج چھپے'' میں کہتا ہوں: ان دو وقتوں میں صرف اس وجہ سے روکا ہے کہ ان دونوں وقتوں میں نماز پڑھنا تین گھڑیوں میں نماز کا دروازہ کھولتا ہے۔اور اسی وجہ سے ان دونوں وقتوں میں نبی ﷺ نے کبھی نماز پڑھی ہے۔کیونکہ آپ محفوظ تھے اس بات سے کہ غفلت کی حالت میں اچانک آجائے آپ پر مکروہ وقت۔

اور روایت کیا گیا ہے جمعہ کے دن نصف النہار کا استثناء۔اور مستنبط کیا گیا ہے نماز کا جواز اوقات ثلاثہ میں مسجد حرام میں اس حدیث سے کہ:''اے عبد مناف کی اولاد! جو شخص ذمہ دار بنے تم میں سے لوگوں کے معاملات میں سے کسی چیز کا تو ہرگز نہ روکے وہ کسی کو جو اس گھر کا طواف کرے اور نماز پڑھے جس گھڑی میں بھی وہ چاہے رات اور دن سے'' (یہ روایت ان الفاظ سے سنن بیہقی ۲: ۴۶۱ میں ہے) اور اس تقدیر پر (یعنی اگر یہ روایتیں اور یہ مسائل درست ہیں) تو راز اس میں یہ ہے کہ یہ دونوں (یعنی جمعہ اور حرم مکی) دین کے شعائر کے ظہور کا وقت اور اس کی جگہ ہیں۔پس مقابلہ کیا دونوں نے نماز سے روکنے والی چیز کا۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۱۳

عبادت میں میانہ روی کا بیان

گذشتہ باب میں نوافل کا بیان تھا۔اب یہ بیان کرتے ہیں کہ نوافل میں اعتدال ضروری ہے یعنی شریعت نے جو نفل نمازیں تجویز کی ہیں اور ان کی جو مقداریں مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔نبی ﷺ نے تاکید کے ساتھ اپنی امت کو نوافلِ اعمال میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔اور صراحۃً اور اشارۃً حد سے تجاوز کرنے کے

مفاسد سے آگاہ فرمایا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

پہلی خرابی:—— بے اعتدالی سے طبیعت میں ملال پیدا ہوتا ہے —— طاعات کے لئے مہلک مرض نفس کا ملال ہے۔ جب نفس میں فتور پیدا ہوتا ہے تو اس کو صفتِ خشوع کا دھیان نہیں رہتا۔ نیاز مندی کے اظہار سے اس کا ذہن ہٹ جاتا ہے۔ اور عبادت کی مشقت بے فائدہ ہوجاتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: ''ہر چیز کے لئے چستی ہے۔ اور ہر چستی کے لئے سستی ہے'' (ترمذی ۶۸:۲) دوسری حدیث میں ہے: ''جب تک نشاط رہے نماز پڑھو۔ اور جب سستی چڑھے تو بیٹھ جاؤ'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۴۴) یعنی تہجد پڑھنا موقوف کردو —— غرض چستی ہی سے عمل میں جان پڑتی ہے۔ چنانچہ جب کسی نیک کام کا رواج ختم ہوجائے، اور اس کی طرف سے لاپروائی برتی جانے لگے، تو اس صورتِ حال میں اس نیک کام کے کرنے میں بے حد اجر وثواب ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''جو میری سنت کو مضبوط پکڑتا ہے، جب میری امت میں بگاڑ پھیل جاتا ہے، تو اس کو شہید کا ثواب ملتا ہے'' (مجمع الزوائد ۱۷۲:۱) کیونکہ اس صورتِ حال میں اس نیک عمل کو کرنے کی ہمت وہی کرتا ہے جو اس کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے۔ اور جو ہمتِ مردانہ رکھتا ہے —— بہرحال چستی کے بقدر ہی عبادت مفید ہے۔ اور نشاط اعتدال کی حد تک باقی رہتا ہے۔ بے اعتدالی باعثِ کلفت ہوتی ہے۔ اس لئے شارع علیہ السلام نے نوافل کی مقداریں متعین کی ہیں۔ جیسے بیمار کے لئے دوا کا کورس ہوتا ہے۔ جس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

دوسری خرابی:—— بے حد عبادت سے ارتفاقات ضائع ہوتے ہیں اور دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے —— نوافل سے مقصود صفتِ احسان (نیکوکاری کی حالت) پیدا کرنا ہے۔ مگر اس طرح کہ ضروری ارتفاقات (معاشی معاملات) درہم برہم نہ ہوجائیں اور دوسروں کی حق تلفی نہ ہو۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ رات بھر عبادت کرتے تھے۔ نہ سوتے تھے، نہ بیوی سے کچھ تعلق رکھتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے —— جو مواخات کی رو سے ان کے بھائی تھے —— ان کو سمجھایا کہ: ''تم پر تمہارے پروردگار کا بھی حق ہے۔ اور تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ اور تمہاری بیوی کا بھی حق ہے'' جب یہ فہمائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آئی تو آپؐ نے فرمایا: ''سلمان نے سچ کہا'' (جامع الاصول ۲۲۰:۱) اور جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے عہد باندھا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھیں گے، رات بھر عبادت کریں گے، اور بیوی سے بے تعلق ہوجائیں گے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سخت تنبیہ کی، اور اپنا اُسوہ پیش کیا کہ: ''میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ رات میں بندگی بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور ازواج سے تعلق بھی رکھتا ہوں۔ پس جو میرے طریقہ سے روگردانی کرتا ہے وہ میرا نہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۴۵)

تیسری خرابی:—— ہر وقت عبادت میں لگے رہنے والے کو عبادت کی لذت محسوس نہیں ہوتی —— عبادتوں سے مقصود نفس کی درستگی اور اس کی کجی کی اصلاح ہے، تمام عبادتوں کا احاطہ مقصود نہیں۔ عام لوگوں کے حق میں یہ

بات محال جیسی ہے۔اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ: ''استقامت اختیار کرو، تمام طاعات کا تم ہرگز احاطہ نہیں کر سکتے۔اور نوافل اعمال میں سے اتنے اپناؤ جو تمہارے بس میں ہوں[1]''—— اور استقامت: عبادت کی اتنی مقدار سے حاصل ہوتی ہے جو نفس کو ملکوتی لذت سے آشنا کرے۔اور بہیمیت کے خسائس ونقائص سے رنجیدہ کرے۔اور جب بہیمیت: ملکیت کی تابعداری کرتی ہے تو کیا کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو نفس سمجھ لے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح بھوک پیاس لگتی ہے تو آدمی کو اس کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے پھر جب کھا پی کر شکم سیر اور سیراب ہوتا ہے تو اس کا لطف محسوس کرتا ہے۔اگر بھوک پیاس نہ ہو تو آدمی شکم سیری اور سیرابی کی لذت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔اسی طرح جب بندہ عمل کرتا ہے تو ملکیت کو انشراح حاصل ہوتا ہے اور نفس خوشی محسوس کرتا ہے۔اور جب وظیفہ سے فارغ ہو جاتا ہے اور امورِ دنیا میں مشغول ہوتا ہے اور بہیمیت کے رذائل سے سابقہ پڑتا ہے تو نفس رنجیدہ ہوتا ہے۔اور اس طرح آدمی عبادت کی اس مخالف کیفیت سے بھی آشنا ہوتا ہے۔اسی طرح یکے بعد دیگرے متضاد احوال پیش آنے سے نفس اس سے بھی واقف ہوتا ہے کہ جب بہیمیت: ملکیت کی تابعداری کرتی ہے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔پس نفس عبادت کے لطف سے آشنا ہوتا ہے۔اور اس میں عبادت کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے، کیونکہ قدرِ نعمت بعد زوالِ نعمت معلوم ہوتی ہے۔

غرض اگر ہر وقت آدمی عبادت میں مشغول رہے گا تو نفس عبادت کا عادی ہو جائے گا۔اور وہ ہر وقت عبادت کی حلاوت سے سرشار رہے گا، تو اس کو اس دوسری کیفیت کا ادراک نہیں ہوگا۔نہ وہ عبادت کے ثمرہ سے آشنا ہوگا۔اس لئے وقفہ وقفہ سے عبادت کرنا زیادہ مفید ہے۔

چوتھی خرابی:—— عبادت میں غلو دین میں تعمق کا راستہ کھولتا ہے —— شریعت سازی میں جو باتیں پیش نظر رکھی گئی ہیں، ان میں ایک اہم بات یہ ہے کہ دین میں تعمق کی راہ بند کر دی جائے۔تعمق کے لغوی معنی ہیں: گہرائی میں اترنا۔تہ میں پہنچنا۔اور اصطلاحی معنی ہیں: احکام شرعیہ کو ان کی حدود سے متجاوز کرنا اور دین میں نئی باتیں پیدا کرنا۔جب کسی زمانہ کے لوگ دین میں کسی امر کا اضافہ کرتے ہیں۔اور اس کا غایت درجہ اہتمام کرتے ہیں تو آئندہ نسل اس کو فرض تصور کرنے لگتی ہے۔اور اس کے بعد والی نسل کا تصور یقین سے بدل جاتا ہے۔اور ایک احتمالی درجہ کی چیز پر لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں۔پس وہ دین کا جز بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دین کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔نصاریٰ میں رہبانیت (ترکِ دنیا) اسی راہ سے در آئی تھی۔اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔

پانچویں خرابی:—— آدمی کے تصورات آدمی کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں —— پہلے مبحث ۵ باب ۱۴ میں یہ مضمون تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ التزاماتِ عبد پر بھی گرفت ہوتی ہے۔پس جو شخص گمان کرتا ہے —— چاہے

---

[1] یہ دو حدیثوں کا مضمون ہے۔پہلی حدیث مشکوٰۃ شریف کتاب الطہارہ میں ہے۔حدیث نمبر ۲۹۲ ہے۔اور دوسری: خذوا من العمل الخ مشکوٰۃ شریف باب القصد فی العمل میں ہے اور حدیث نمبر ۱۲۴۳ ہے ۱۲

زبان سے اس کے خلاف کہے ـــــــ کہ اللہ تعالیٰ ان عبادات شاقہ کے بغیر راضی نہیں ہوتے۔ نہ ان کے بغیر نفس کی اصلاح ممکن ہے۔ اور وہ اُن ریاضتوں میں کوتاہی کو دین میں کوتاہی تصور کرتا ہے، تو اس کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے۔ یعنی ان التزامات پر عمل نہ کرنے کی صورت میں بھی مواخذہ ہوگا۔ اور اس کے اپنے تصورات خود اس کے لئے وبالِ جان بن جائیں گے۔ اور اس کی دیگر عبادتیں بھی قبول نہ ہونگی۔ کیونکہ اس کے گمان میں اس کے نفس میں برائی ہے یعنی وہ اپنے خیال میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔

اور اس کی دلیل یہ روایت ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو مدینہ شریف میں کوئی نئی بات پیدا کرے یا کسی نئی بات پیدا کرنے والے کو ٹھکانہ دے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی، اور تمام لوگوں کی پھٹکار ہے۔ اور اس کی نہ کوئی فرض عبادت قبول کی جاتی ہے، نہ نفل'' (بخاری حدیث ۱۸۷۰) اسی طرح کی اور بہت روایات ہیں جن میں یہ مضمون آیا ہے کہ جو غلام اپنے آقا کے پاس سے بھاگ جاتا ہے یا جو کاہن کے پاس جاتا ہے اور اس کی باتوں کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کی چالیس روز تک نماز قبول نہیں کی جاتی۔ غرض کچھ گناہ ایسے سخت ہیں کہ ان کے مرتکب کی دیگر عبادتیں بھی قبول نہیں کی جاتیں۔ مذکورہ گناہ یعنی خود اپنے سر لی ہوئی عبادت کو ترک کرنا بھی ایسا ہی سنگین گناہ بن جاتا ہے۔

بہر حال دینی کاموں میں اور نفل عبادتوں میں حد سے تجاوز کرنا، اور اعتدال اور میانہ روی کی راہ سے ہٹ جانا مضر ہی مضر ہے۔ ایسا شخص کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: ''دین آسان ہے۔ اور ہرگز دین پر غالب آنے کی کوشش نہیں کرتا کوئی شخص مگر دین اس پر غالب آجاتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۴۶) یعنی وہ آخر کار تھک ہار کر رہ جاتا ہے۔ اور دین اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔

غرض: مذکورہ بالا خرابیوں کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو عبادات میں میانہ روی اختیار کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ اور یہ حکم دیا ہے کہ وہ عبادتوں میں اتنے آگے نہ بڑھ جائیں کہ طبیعتوں میں ملال وفتور پیدا ہو جائے۔ ایجادات کی وجہ سے دین میں اشتباہ پیدا ہو جائے۔ اور معاشی امور درہم برہم ہو جائیں۔ بہت سی روایات میں یہ باتیں صراحۃً یا اشارۃً بیان کی گئی ہیں۔

﴿ الاقتصاد في العمل ﴾

اعلم: أن أدْوَأَ الداءِ في الطاعات ملالُ النفس، فإنها إذا ملَّت لم تَتَنَبَّهْ لصفة الخشوع، وكانت تلك المشاقُّ خاليةً عن معنى العبادة، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم: " إن لكل شيئ شِرَّةً، وإن لكل شِرَّةٍ فترةً" ـــــ ولهذا السر كان أجر الحسنة عند اندراس الرسم بها، وظهورِ التهاون فيها، مضاعفًا أضعافًا كثيرةً، لأنها، والحالة هذه، لاتنبَجِسُ إلا من تَنَبُّهٍ

شديد، وعزمٍ مؤكدٍ ـــــ ولهذا جعل الشارع للطاعات قدرًا، كمقدار الدواءِ في حق المريض، لايُزاد ولايُنقص.

وأيضًا: فالمقصود: هو تحصيلُ صفة الإحسان على وجهٍ لايُفضي إلى إهمالِ الارتفاقات اللازمة، ولا إلى غَمْطِ حق من الحقوق، وهو قول سلمان رضي الله عنه: إن لعينيك عليك حقًا، وإن لزوجك عليك حقًا، فصدَّقه النبيُّ صلى الله عليه وسلم، وقولُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم:" أنا أصوم وأُفطر، وأقوم وأرقُد، وأتزوَّج النساء، فمن رغِب عن سنتي فليس مني"

وأيضًا: فالمقصود من الطاعات: هو استقامةُ النفس، ودفعُ اعْوجَاجِها، لاالإحصاء، فإنه كالمتعذَّر في حق الجمهور، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" اسْتَقِيْمُوْا، ولن تُحْصُوْا، وأْتُوا من الأعمال بما تُطيقون" والاستقامة تحصل بمقدار معين، يُنَبِّهُ النفسَ لِالْتِذَاذِها بلذّاتِ الملكية، وتألُّمِها من خسائس البهيمية، ولِتَفَطُّنِها بكيفيةِ انْقِيَادِ البهيمية للمكلية؛ فلو أنه أكثَرَ منها اعتاذتها النفسُ، واسْتَحْلَتْها، فلم تَتَنَبَّهْ لثمرتها.

وأيضًا: فمن المقاصد الجليلة في التشريع: أن يُسَدَّ بابُ التعمق في الدين، لئلا يَعَضُّوا عليها بنواجذهم، فيأتي من بعدهم قوم، فيظنوا أنها من الطاعات السماوية المفروضةِ عليهم، ثم تأتي طبقة أخرى، فيصير الظن عندهم يقينا، والمحتملُ مُطْمَئَنًّا به، فيظل الدين محرَّفًا، وهو قوله تعالى:﴿ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا، مَاكَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾

وأيضًا: فمن ظَنَّ من نفسه ـــ وإن أقر بخلاف ذلك من لسانه ـــ أن الله لايرضى إلا بتلك الطاعات الشاقةِ، وأنه لو قصَّر في حقها فقد وقع بينه وبين تهذيب نفسه حجابٌ عظيم، وأنه فَرَطَ في جنب الله، فإنه يُؤاخَذ بماظن، ويُطالَب بالخروج عن التفريط في جنب الله حسب اعتقاده، فإذا قصَّر انقلبت علومُه عليه ضارَّةً مُظْلِمَةً، فلم تُقبل طاعاتُه لِهَنَةٍ في نفسه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إن الدين يسر، ولن يشادَّ الدينَ أحدٌ إلاغَلَبه"

فلهذه المعاني عَزَمَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم على أمته: أن يقتصدوا في العمل، وأن لايُجاوِزوا إلى حدٍّ يُفضي إلى ملالٍ، أو اشتباهٍ في الدين، أو إهمال الارتفاقات؛ وبيَّن تلك المعانيَ تصريحًا أو تلويحًا.

ترجمہ: عمل میں میانہ روی کا بیان: جان لیں کہ عبادت میں سب سے زیادہ خطرناک بیماری: نفس کی ملامت ہے۔ پس بیشک جب نفس طول ہو جاتا ہے تو وہ چوکنا نہیں ہوتا صفتِ خشوع کے لئے۔ اور ہوتی ہیں وہ مشقتیں عبادت

کے معنی سے خالی۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''بیشک ہر کام کے لئے چستی ہے، اور ہر چستی کے لئے سستی ہے'' — اور اسی راز کی وجہ سے نیکی کا ثواب ہے، اس پر عمل کرنے کی صورت میں، اس کا رواج مٹ جانے کے وقت، اور اس میں لاپرواہی ظاہر ہونے کے وقت: بہت زیادہ، دونے پر دونا۔ اس لئے کہ نیکی، جبکہ صورتِ حال ایسی ہو نہیں جاری ہوتی ہے مگر شدید چوکنا ہونے سے، اور پختہ عزم سے — اور اسی لئے مقرر کی شارع نے عبادتوں کے لئے ایک مقدار، جیسے بیمار کے حق میں دواء کی مقدار: نہ زیادہ کی جاتی ہے اور نہ کم کی جاتی ہے۔

اور نیز: پس مقصود: وہ صفتِ احسان کی تحصیل ہے، اس طرح کہ نہ پہنچائے ارتفاقاتِ لازمہ کو رائگاں کرنے تک، اور نہ حقوق میں سے کسی حق میں کمی کرنے تک۔ اور وہ سلمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''بیشک تیری دونوں آنکھوں کا تجھ پر حق ہے۔ اور بیشک تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے'' پس تصدیق کی ان کی نبی ﷺ نے۔ اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''بیشک میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار کرتا ہوں۔ اور رات میں نماز کے لئے اٹھتا ہوں اور سوتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ پس جو میرے طریقہ سے اعراض کرتا ہے وہ میرا نہیں''

اور نیز: پس عبادات سے مقصود: وہ نفس کی درستگی اور اس کی کجی کی اصلاح ہے۔ تمام طاعات کا احصاء مقصود نہیں۔ پس بیشک احاطہ مانند متعذر کے ہے اکثر لوگوں کے حق میں۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''سیدھے رہو، اور ہرگز احاطہ نہیں کر سکتے تم'' اور ''کرو تم اعمال میں سے جن کی طاقت رکھتے ہو'' اور استقامت حاصل ہوتی ہے ایک ایسی مقدار سے جو چوکنا کرے نفس کو، اس کے لذت پانے کے لئے ملکیت کی لذتوں سے، اور اس کے رنجیدہ ہونے کے لئے بہیمیت کی رذالتوں سے۔ اور اس کے چوکنا ہونے کے لئے ملکیت کے لئے بہیمیت کی تابعداری کرنے کی کیفیت سے۔ پس اگر وہ بہت زیادہ عبادتیں کرے گا تو نفس ان کا عادی ہو جائے گا۔ اور ان کو شیریں سمجھے گا۔ پس نہیں چوکنا ہوگا وہ ان کے ثمرہ کے لئے۔

اور نیز: پس قانون سازی میں ملحوظ مقاصد جلیلہ میں سے یہ ہے کہ دین میں تعمق کا دروازہ بند کیا جائے۔ تاکہ نہ کاٹیں لوگ (اپنی ایجاد کردہ) عبادتوں کو اپنی ڈاڑھوں سے (یعنی ان کا غایت درجہ اہتمام نہ کریں) پس آئے ان کے بعد ایک قوم پس گمان کرے وہ کہ (وہ خود ساختہ) عبادتیں ساوی عبادتوں میں سے ہیں جو لوگوں پر فرض کی گئی ہیں۔ پھر آئے ایک دوسرا طبقہ، پس ہو جائے گمان ان کے نزدیک یقین۔ اور ہو جائے احتمالی چیز اس کے متعلق اطمینان کی ہوئی، پس ہو جائے دین محرف۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا'' (الحدید آیت ۲۷)

اور نیز: پس جو شخص اپنے دل میں گمان کرتا ہے — اگرچہ اپنی زبان سے اس کے خلاف اقرار کرے — کہ اللہ تعالیٰ نہیں راضی ہوں گے مگر ان عباداتِ شاقہ سے اور یہ کہ اگر وہ کوتاہی کرے گا اُن عباداتِ شاقہ کے حق میں تو یقیناً

پڑ جائے گا اس کے درمیان اور اس کے نفس کی اصلاح کے درمیان ایک بڑا پردہ۔ اور یہ کہ اس نے کوتاہی کی اللہ کے پہلو میں۔ پس بیشک وہ پکڑا جائے گا اس گمان کے مطابق جو اس نے قائم کیا ہے۔ اور مطالبہ کیا جائے گا وہ نکلنے کا کوتاہی کرنے سے اللہ کے پہلو میں اس کے اعتقاد کے موافق۔ پس جب کوتاہی کرے گا وہ تو پلٹ جائیں گے اس کے علوم (تصورات) اس پر نقصان رساں اور تاریک کرنے والے ہوکر۔ پس نہیں قبول کی جائیں گی اس کی عبادتیں اس کے نفس میں برائی کی وجہ سے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''بیشک دین آسان ہے۔ اور ہرگز دین پر غالب آنے کی کوشش نہیں کرے گا کوئی شخص مگر دین اس پر غالب آجائے گا''

پس ان معانی (خرابیوں) کی وجہ سے مؤکد کیا نبی ﷺ نے اپنی امت پر کہ میانہ روی اختیار کریں وہ عمل میں۔ اور یہ کہ تجاوز نہ کریں وہ ایسی حد کی طرف جو پہنچادے دل تنگی تک۔ یا دین میں اشتباہ تک۔ یا تدابیر نافعہ کو رائگاں کرنے تک۔ اور بیان کیا ان معانی (خرابیوں) کو صراحۃً یا اشارۃً۔

لغات: الشِرَّۃ: تیزی، چستی۔ شِرَّۃُ الشباب: جوانی کی چستی...... غَمَطَ (ض) غَمْطًا: الحقَّ: حق کا انکار کرنا...... خَسَائِسُ الأمور: حقیر باتیں، معمولی گھٹیا چیز مفرد خسیسۃ...... فطن (ن، ک، س) لہ وبہ وإلیہ: سمجھنا...... اِسْتَحْلَی الشیئَ: میٹھا پانا...... ھَنَۃٌ مؤنث ھَنٌ کا بری چیز...... شَادَّہ فی الأمر: غالب ہونے کی کوشش کرنا، مقابلہ کرنا۔

☆ ☆ ☆

عمل پر مداومت اللہ کو پسند کیوں ہے؟

حدیث —— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اعمال میں سب سے پسند اللہ تعالیٰ کو زیادہ پابندی سے کیا ہوا عمل ہے، اگر چہ وہ تھوڑا ہو'' (مشکوۃ ۱۲۴۲)

تشریح: مداومت والا عمل دو وجہ سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے:

پہلی وجہ: مداومت: رغبت کی علامت ہے۔ جس کام کی رغبت ہوتی ہے اس کو آدمی ہمیشہ کرتا ہے۔ اور رغبت سے کی ہوئی عبادتیں اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں، چاہے تھوڑی ہوں۔ اور رغبت سے اعتدال کے ساتھ ہی عبادتیں کی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ بے اعتدالی اور غلو کا لازمی نتیجہ سیری اور بے رغبتی ہے۔

دوسری وجہ: نفس عبادت کا اثر اس وقت قبول کرتا ہے، اور عبادت کا فائدہ اس وقت جذب کرتا ہے، جب اس کو عرصہ تک مسلسل کیا جائے۔ اور دل اس پر مطمئن ہوجائے۔ اور کوئی ایسا وقت ہاتھ آجائے جب دل فارغ ہو۔ ایسا فارغ جیسا خواب میں فارغ ہوتا ہے جبکہ ملأ اعلیٰ کی طرف سے علوم کا فیضان ہوتا ہے۔ اور اس کا کوئی اندازہ مقرر نہیں ہے کہ یہ باتیں کتنے عرصہ میں حاصل ہوں گی؟ پس ان کی تحصیل کا ایک ہی راستہ ہے کہ عمل مسلسل کیا جائے۔ ان شاء اللہ کبھی نہ

کبھی وہ دن ضرور آئے گا کہ مقصد برآئے۔ لقمان حکیم رحمہ اللہ نے نصائح میں اپنے صاحبزادے کو یہی بات سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں: ''اپنے نفس کو بکثرت استغفار کا عادی بناؤ، کیونکہ بعض اوقات ایسے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کسی سائل کو رد نہیں کرتے'' یعنی اس وقت میں تمہاری توبہ بھی قبول ہو جائے گی۔

فائدہ: حضرت لقمان حکیم رحمہ اللہ نبی نہیں تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک ولی تھے۔ شاہ صاحب نے تفہیمات (۱۹:۲) تفہیم ۱۴ میں ان کو سلف صالح لکھا ہے اور تفہیم ۲۴۱ میں سورۃ الحج کی آیت ۵۲ میں حضرت ابن عباسؓ کی قراءت **ولا محدث** نقل کی ہے، پھر ابن عباسؓ ہی سے اس کی تفسیر میں جن غیر انبیاء کا تذکرہ کیا ہے، ان میں لقمان حکیم بھی ہیں۔ پس یہاں آپ کے نام نامی کے ساتھ علیہ السلام بے خبری میں لکھ دیا ہے۔ جیسے آپ نے اپنے خطبۂ جمعہ میں سبطین کے ناموں کے ساتھ ''امام'' استعمال کیا ہے۔ جبکہ یہ شیعوں کا عقیدہ ہے۔ اور حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنے ترجمہ قرآن میں سورۃ التحریم کی آخری آیت میں حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے نام کے بعد بین القوسین (علیہا السلام) لکھا ہے۔ حالانکہ کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔ جبکہ حضرت آسیہ پر (رضی اللہ عنہا) لکھا ہے۔ بے خبری میں ایسا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی صاحب کی مہربانی ہو۔ انھوں نے بین القوسین بڑھایا ہو۔ واللہ اعلم۔

اعمال میں حد سے بڑھنا ملالت کا باعث ہے

حدیث ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اتنے اعمال اپناؤ جن پر (ہمیشہ) عمل کرنے کی طاقت ہو، پس بیشک اللہ تعالیٰ تنگ نہیں ہوتے یہاں تک کہ تم تنگ ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۴۳)

تشریح: طاقت سے بڑھ کر عمل کا التزام بے طاقتی پیدا کرتا ہے۔ اور جب آدمی تھک جاتا ہے اور عمل چھوڑ بیٹھتا ہے تو اس کا اجر وثواب بھی بند ہو جاتا ہے۔ اور حسب طاقت عمل اپناتا ہے تو وہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ اور وہ اگرچہ تھوڑا ہو، اس کا ثواب برابر ملتا رہتا ہے۔ اور قطرہ قطرہ دریا شود۔ انجام کار وہ ثواب بہت ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے تنگ آنے کی تعبیر مقابلۃً اور مجازاً ہے اور یہ عرب کا عام محاورہ ہے۔ جیسے سورۃ النساء آیت ۱۴۲ میں ہے: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ، وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ یعنی منافقین اللہ سے چالبازی کرتے ہیں، درانحالیکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی چال کی سزا دینے والے ہیں۔ اس آیت میں جس طرح خداع کی سزا کو مقابلۃً خداع سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح عابد کے ملول ہونے پر ثواب موقوف کرنے کو حدیث میں مشاکلۃً ملول ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

اونگھتے ہوئے عبادت کرنا بے فائدہ ہے

حدیث ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو اونگھ

آنے لگے اور وہ نماز پڑھ رہا ہو، تو چاہئے کہ سو جائے، یہاں تک کہ نیند پوری ہو جائے۔ کیونکہ جب کوئی اونگھتے ہوئے نماز پڑھتا ہے تو نہیں جانتا کہ شاید وہ مغفرت طلب کرے پس اپنے لئے بددعا کرنے لگے" (مشکوۃ حدیث ۱۲۴۵)

تشریح: جو اونگھتے ہوئے نماز پڑھتا ہے جب وہ شدید سستی کی وجہ سے عبادت اور غیر عبادت میں امتیاز نہیں کر پاتا تو وہ عبادت کی حقیقت سے کیا خاک واقف ہوگا؟! پس ایسی عبادت بالکل بے فائدہ ہے۔ نشاط اور چستی کے ساتھ عبادت مفید ہے۔

میانہ روی سے عبادت کرنے کے خاص اوقات

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بیشک دین آسان ہے (یعنی اس پر عمل کرنا آسان ہے، مگر لوگ اس کو مشکل بنا دیتے ہیں) اور ہرگز دین پر غالب آنے کی کوئی شخص کوشش نہیں کرے گا مگر دین اس پر غلبہ پالے گا (یعنی جو عبادتوں میں غلو کرے گا اور چاہے گا کہ میں سبھی عبادتیں کر ڈالوں تو دین اس کو ہرا دے گا یعنی وہ ساری عبادتوں کا احاطہ نہیں کر سکے گا اور تھک ہار کر بیٹھ جائے گا) پس میانہ روی اختیار کرو (یعنی درستی کا راستہ اپناؤ۔ اور درستی کا راستہ درمیانی چیز لینا ہے، جس کی مراعات اور جس پر مواظبت ممکن ہے) اور قریب ہو (یعنی کامل درجہ عبادت نہ کر سکو تو جو اس سے قریب ہو اس کو اپناؤ۔ اور شاہ صاحب نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حسب استطاعت عمل کر کے اللہ سے قریب ہو۔ یہ خیال نہ کرو کہ تم اللہ سے دور رہ گئے۔ اللہ کی نزدیکی سخت دشوار عبادتوں کے ذریعہ ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسا گمان نہ کرو۔ اعتدال کے ساتھ عبادت کرنے سے بھی اللہ کی نزدیکی حاصل ہو سکتی ہے) اور خوش خبری سن لو (یعنی ثواب کے امیدوار بن جاؤ اور عبادتوں میں چست ہو جاؤ) اور مدد چاہو صبح کے وقت سے اور شام کے وقت سے اور کچھ آخر رات سے (یہ تین اوقات نزول رحمت کے اور پراگندگی سے دل کی تختی کی صفائی کے اوقات ہیں۔ ان اوقات میں عبادتیں بہت سودمند ہیں۔ تفصیل مبحث ۶ باب ۸ میں گذر چکی ہے) (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۱۲۴۶)

اوراد و وظائف کی قضاء میں حکمت

حدیث ــــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو اپنے ورد سے سو گیا یا اس کا کچھ حصہ رہ گیا۔ پس اس نے اس کو فجر کی نماز اور ظہر کی نماز کے درمیان میں پڑھا تو اس کے لئے لکھا جائے گا: گویا اس نے رات میں پڑھا" (مشکوۃ حدیث ۱۲۴۷)

تشریح: اوراد و وظائف اگرچہ نوافل اعمال ہوں، تاہم ان کی قضا ضروری ہے۔ اور ان کی قضاء میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: جب ایک مرتبہ وظیفہ چھوٹ جاتا ہے اوراس کا متبادل نہیں کیا جاتا تو نفس بے لگام ہو جاتا ہے اور وہ ترک کا عادی بن جاتا ہے۔ اور آئندہ اس پر اس ورد کی پابندی دشوار ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کا متبادل ضرور کرلیا جائے تاکہ نفس اس کا پابند رہے۔

دوسری حکمت: ورد اگرچہ اللہ پاک نے لازم نہیں کیا، بندے نے خود سر لیا ہے، مگر وہ بھی التزام عبد کی وجہ سے از قبیل واجب ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کے فوت ہونے کی شکل میں متبادل کرنا ضروری ہے تاکہ وہ ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے۔ ورنہ اس کے دل میں تشویش رہے گی کہ اس سے دین کے معاملہ میں کوتاہی ہوگئی۔ اور اس کے التزام کی وجہ سے ترک پر اس کی پکڑ ہوگی۔ خواہ وہ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " أحبُّ الأعمال إلى الله أَدْوَمُها، وإن قلَّ"

أقول: وذلك: لأن إدامتَها والمواظبةَ عليها آيةُ كونِه راغبا فيها. وأيضًا: فالنفس لاتقبل أثر الطاعة، ولاتَتَشَرَّبُ فائدتَها إلا بعد مدة، ومواظبةٍ، واطمئنانٍ بها، ووجدانِ أوقاتٍ تُصادف من النفس فراغاً، بمنزلة الفراغ الذى يكون سببا لانطباع العلوم من الملأ الأعلى فى رؤياه، وذلك غيرُ معلوم القدر، فلا سبيل إلى تحصيل ذلك إلا الإدامةُ والإكثارُ، وهو قولُ لقمان عليه السلام: " وعَوِّدْ نفسَك كثرةَ الاستغفار، فإن لله ساعةً لايَرُدُّ فيها سائلاً"

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " خذوا من الأعمال ما تطيقون، فإن الله لايمَلُّ حتى تَملُّوا" أى: لايترك الإثابةَ إلا عند ملالهم، فأطلق الملالَ مشاكلةً.

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن احدكم إذا صَلَّى وهو ناعسٌ، لايدرى لعله يستغفر فَيَسُبُّ نفسَه" أقول: يريدُ أنه لايميز بين الطاعة وغيرها من شدَّة الملال، فكيف يتنبَّهُ بحقيقة الطاعة؟!

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " فَسَدِّدُوا" يعني خذوا طريقةَ السداد، وهي التوسط الذى يمكن مراعاتُه، والمواظبةُ عليه." وقاربوا" يعني: لاتظنوا أنكم بُعداء، لاتصلون إلا بالأعمال الشاقة: "وأَبْشِرُوْا" يعنى: حَصِّلُوا الرجاء والنشاط." واستعينوا بالغَدوة والرَّوحة، وشيئ من الدُّلجة" هذه الأوقاتُ أوقاتُ نزول الرحمة، وصفاءِ لَوْحِ القلب من أحاديث النفس، وقد ذكرنا من ذلك فصلاً.

[۵] قوله صلى الله عليه وسلم: " من نام عن جزبه، أو عن شيئ منه، فقرأه فيما بين صلاة الفجر وصلاة الظهر، كُتب له كأنما قرأه من الليل"

أقول: السبب الأصلي في القضاء شيئان: أحدهما: أن لاتسترسلَ النفس بترك الطاعة، فيعتاده، ويَعْسر عليه التزامُها من بعدُ، والثاني: أن يخرج عن العُهدة، ولايُضمر أنه فرّط في جنب الله، فيُؤا خذ عليه، من حيث يعلم أو لايعلم.

ترجمہ:(۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:...... میں کہتا ہوں: وہ بات (یعنی محبوبیت) اس لئے ہے کہ اعمال کو ہمیشہ کرنا اوران کی پابندی کرنا آدمی کے اعمال میں رغبت کرنے والا ہونے کی نشانی ہے۔اور نیز: پس نفس عبادت کا اثر قبول نہیں کرتا اوراس کا فائدہ نہیں پیتا مگر بعد ایک مدت کے، اور مواظبت کے، اوراس پر مطمئن ہونے کے، اور ایسے اوقات پانے کے کہ پائیں وہ اوقات نفس کی فراغت کو، ویسی فراغت جیسی ہوتی ہے آدمی کے خواب میں ملأاعلی کے علوم کے چھپنے کا سبب۔اور وہ بات معلوم المقدار نہیں۔پس اس کی تحصیل کی کوئی راہ نہیں مگر ہمیشہ کرنا اور بکثرت کرنا۔اور وہ لقمان علیہ السلام کا قول ہے:''عادی بنا تو اپنے نفس کو کثرتِ استغفار کا۔پس بیشک اللہ تعالیٰ کے لئے ایک گھڑی ہے جس میں وہ کسی بھی سائل کو نہیں پھیرتے''

(۲) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: یعنی نہیں چھوڑتے وہ ثواب دینا مگر لوگوں کے ملول ہونے کے وقت۔پس بولا لفظ ملال ہم شکل ہونے کی وجہ سے۔

(۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: میں کہتا ہوں: آپؐ مراد لے رہے ہیں اس بات کو کہ نہیں امتیاز کرتا ہے وہ عبادت اور غیر عبادت کے درمیان شدت ملالت کی وجہ سے۔پس کیسے چوکنا ہوگا وہ عبادت کی حقیقت سے؟!

(۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:''پس میانہ روی اختیار کرو'' یعنی درستی کا راستہ لو۔اور وہ درمیانی چیز لینا ہے جس کی رعایت اور جس کی پابندی ممکن ہے''اور نزدیک ہو'' یعنی نہ گمان کرو کہ تم دور ہو۔اللہ تک نہیں پہنچ سکتے مگر سخت دشوار عبادتوں کے ذریعہ''اور خوش ہوجاؤ'' یعنی امید اور چستی حاصل کرو''اور مدد چاہو صبح کے وقت سے، اور شام کے وقت سے، اور کچھ اخیر رات سے'' یہ اوقات نزول رحمت اور پراگندہ بالی سے دل کی تختی کی صفائی کے اوقات ہیں۔اور تحقیق ذکر کی ہے ہم نے اس سلسلہ میں ایک (پوری) فصل۔

(۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: میں کہتا ہوں: قضاء کا اصل سبب دو چیزیں ہیں: ایک: یہ کہ نفس بہتا نہ چلا جائے عبادت چھوڑنے میں، پس وہ اس کا عادی بن جائے۔اوراس کے بعد اس پراس ورد کی پابندی دشوار ہوجائے۔ اور دوسری: یہ کہ وہ ذمہ داری سے نکلے، اور وہ اپنے دل میں نہ چھپائے کہ اس نے اللہ کے پہلو میں کوتاہی کی۔پس وہ اس پر پکڑا جائے۔ایسے طور سے کہ وہ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

☆ ☆ ☆

باب ——— ۱۴

معذوروں کی نماز کا بیان

معذور: یعنی صاحبِ عذر: وہ شخص ہے جس کو کوئی شرعی عذر لاحق ہو، جیسے مسافر اور بیمار وغیرہ۔ شریعت میں اصحابِ اعذار کے لئے سہولتیں کی گئی ہیں۔ تا کہ وہ آسانی سے دین پر عمل پیرا ہوسکیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ اس سلسلہ میں بطور تمہید تین باتیں بیان فرماتے ہیں:

پہلی بات: ——— قانون مکمل وہ ہے جس میں سہولتیں بھی ہوں ——— تشریع (آئینِ شریعت) کی تکمیل اس پر موقوف ہے کہ اس میں معذوروں کے لئے سہولتیں ہوں۔ تا کہ مکلّف بندے حسب استطاعت عبادتیں ادا کرسکیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ معذور بندے ایسے بھی ہیں جن کے لئے عام شرعی قوانین پر عمل دشوار ہوتا ہے۔ جیسے نماز میں قیام ضروری ہے۔ اب جو بندہ صاحبِ فراش ہے، وہ کھڑے ہوکر نماز کیسے پڑھے گا؟! ایسے معذروں کے لئے شریعت سازی کے وقت سہولتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ تا کہ ایسے بندے عبادت سے محروم نہ رہیں۔ حسب مقدرت بندگی کرسکیں۔

دوسری بات: ——— ترخیص: شارع کی طرف مفوض ہے ——— ترخیص یعنی ممانعت کے بعد اجازت دینے کا اختیار شارع کو ہے یعنی سہولت کہاں دی جائے۔ کس کو دی جائے۔ کن امور میں دی جائے۔ اور کتنی دی جائے؟ یہ باتیں شارع کو سپرد کی گئی ہیں۔ اور یہی مناسب بھی ہے۔ خود معذوروں کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا۔ کیونکہ ایک طرف اطاعت و بندگی اللہ تعالیٰ کا حق ہے، جس کی ادائیگی ضروری ہے۔ دوسری طرف بندوں کے اعذار ہیں ان کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ اور دونوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر درمیانی راہ شارع ہی تجویز کرسکتا ہے۔ بندوں کے بس کی یہ بات نہیں ہے۔ اگر ان کو اختیار دیا جائے گا تو وہ افراط وتفریط میں مبتلا ہوجائیں گے: اگر اللہ کی جانب کی رعایت کریں گے تو اپنے حق میں دشواری پیدا کرلیں گے۔ اور اپنے عذر کا لحاظ کریں گے تو اللہ کے معاملہ میں کوتاہی کریں گے ——— چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اعذار اور سہولتوں کے بیان کا پورا پورا اہتمام فرمایا ہے۔

تیسری بات: ——— سہولت اصل عبادت میں نہیں، بلکہ حدود وضوابط میں دی جاتی ہے ——— رخصتوں کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ سب سے پہلے حکمتِ بر کے لحاظ سے عبادت کی اصل اور روح کو دیکھا جائے۔ اور اس میں کوئی سہولت نہ دی جائے۔ البتہ عبادت کی بسہولت ادائیگی کے لئے جو قواعد وضوابط مقرر ہیں، ان میں حسب ضرورت سہولت دی جائے۔ مثلاً نماز کی روح اخبات اور اظہار نیازمندی ہے۔ اس کا پورا اہتمام ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر نماز کی روح ہی فوت ہوگئی تو پھر کیا حاصل رہا؟! البتہ مقصد اخبات کو حاصل کرنے کے لئے جو قیام رکوع وغیرہ ارکان تجویز کئے

گئے ہیں جن کی تشریع کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے لئے عبادت کرنا آسان ہو۔ان میں شارع تصرف کرے: حسب ضرورت اس کو ساقط کرے یا ان میں تبدیلی کرے۔

﴿ صلاةُ المعذورين ﴾

ولما كان من تمام التشريع: أن يُبين لهم الرُّخَصُ عند الأعذار، ليأتي المكلفون من الطاعة بمايستطيعون، ويكون قدر ذلك مفوَّضا إلى الشارع، لِيُراعي فيه التوسط، لا إليهم فيُفرِطُوا أو يُفرِّطُوا: اعتنى رسول الله صلى الله عليه وسلم بضبط الرخص والأعذار.

ومن اصول الرُّخَص: أن يُنْظَرَ إلى اصل الطاعة، حسبما تأمر به حكمةُ البر، فَيُعَضُّ عليها بالنواجذ على كل حالٍ، ويُنظر إلى حدودٍ وضوابطَ شَرَّعها الشارعُ، ليتيسر لهم الأخذ بالبر، فيتصرف فيها إسقاطا وإبدالاً، حسبما تؤدي إليه الضرورة.

ترجمہ: معذوروں کی نماز: اور جب قانون سازی کی تمامیت میں سے یہ بات تھی کہ لوگوں کے لئے اعذار کی صورت میں سہولتیں بیان کی جائیں۔تاکہ بجالائیں مکلف بندے عبادت میں سے جس قدر طاقت رکھتے ہیں۔اور (یہ بات تھی کہ) اس کا اندازہ سونپا ہوا ہو شارع کی طرف، تاکہ شارع اس میں اعتدال کا لحاظ رکھے۔(یہ معاملہ) لوگوں کی طرف سپرد کیا ہوا نہ ہو، پس حد سے بڑھ جائیں وہ یا کوتاہی کریں (پس) اہتمام کیا رسول اللہ ﷺ نے رخصتوں اور عذروں کو منضبط کرنے کا —— اور رخصتوں کے اصولوں میں سے یہ بات ہے کہ عبادت کی اصل کی طرف دیکھا جائے، اس طور پر جس کا حکم دیتی ہے نیکی کی حکمت۔پس کاٹا جائے اصلِ طاعت کو ڈاڑھوں سے ہر حال میں (یعنی عذر کی حالت میں بھی روح عبادت کا غایت درجہ اہتمام کیا جائے۔علیہا کی ضمیر اصل الطاعۃ کی طرف لوٹتی ہے۔مضاف نے مضاف الیہ سے تانیث کا استفادہ کیا ہے) اور دیکھا جائے ان حدود وضوابط کی طرف جن کو شارع نے مقرر کیا ہے تاکہ لوگوں کے لئے نیکی کو اپنانا آسان ہو۔پس تصرف کرے شارع ان حدود وضوابط میں ساقط کرنے اور تبدیلی کرنے کے طور پر، اس کے موافق جس تک ضرورت پہنچائے (یعنی ضرورت کے تقاضے کے مطابق)

☆ ☆ ☆

مسافر کے لئے سہولتیں

سفر میں جو پریشانی لاحق ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔کہا جاتا ہے: السفر سَقَرٌ: سفر تکلیف میں نمونۂ دوزخ ہے۔خواہ کتنا ہی آرام دہ سفر ہو، مگر سفر بہرحال سفر ہے۔اس لئے شارع نے مسافر کو چند سہولتیں دی ہیں: ۱-: رباعی نماز

میں قصر کرنا ۲-: رمضان میں افطار کرنا یعنی روزے نہ رکھنا (اس کا بیان ابواب الصوم میں آئے گا) ۳-: عصرین اور عشائین ایک ساتھ پڑھنا ۴-: سنن مؤکدہ نہ پڑھنا ۵-: نوافل سواری پر ادا کرنا وغیرہ۔

پہلی سہولت: نماز قصر کرنا

یہ بات پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ نمازوں کی اصل رکعتیں گیارہ ہیں۔ اس تعداد کو سفر میں باقی رکھا گیا ہے۔ اور جو زائد رکعتیں اطمینان وقیام کی حالت میں بڑھائی گئی تھیں، ان کو سفر میں ساقط کردیا گیا ہے۔

سوال: سورۃ النساء آیت ۱۰۱ میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ یعنی جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز کو کم کردو، اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تم کو پریشان کریں گے۔ اس آیت کے اشارہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسافر کی نماز قصر یعنی کم کی ہوئی ہے۔ اور بخاری ومسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول روایت کیا ہے کہ: ’’نماز دو فرض کی گئی تھی۔ پھر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے ہجرت فرمائی تو چار رکعتیں فرض کی گئیں۔ اور سفر کی نماز مقدم فریضہ پر چھوڑ دی گئی‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۴۸) اور ابن ماجہ نے ایک نہایت ضعیف روایت حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے سفر کی نماز دو رکعتیں مقرر فرمائی ہے۔ اور وہ دو رکعتیں پوری نماز ہیں، قصر نہیں ہیں[1]۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مسافر کی نماز پوری ہے، قصر (کم کی ہوئی) نہیں ہے —— علاوہ ازیں اگر یہ نمازیں پوری ہیں تو آیت کریمہ میں قصر کرنے کے لئے خوفِ فتنہ کی شرط کیوں ہے؟ اصلی حکم پر عمل کرنے میں تقیید کا کیا مطلب؟!

جواب: آیتِ کریمہ سے اگر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسافر کی نماز قصر ہے تو روایات سے اس کے عزیمت یعنی اصلی حکم ہونے کا شائبہ یعنی احتمال پیدا ہوتا ہے[2]۔ چنانچہ گیارہ کی تعداد میں ضرورت کا لحاظ کرکے مزید کمی نہیں کی گئی، نہ کوئی قید لگا کر اس پر عمل کرنے میں تنگی پیدا کی گئی ہے۔ اور آیت کریمہ میں جو خوفِ فتنہ کی قید ہے، وہ بیانِ فائدہ کے لئے ہے۔ قیدِ احترازی نہیں ہے کہ مفہوم مخالف نکالا جائے۔ اور یہ بات درج ذیل حدیث سے ثابت ہے:

حضرت یعلی بن اُمیہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آیت کریمہ میں تو قصر کرنے کے لئے

---

[1] ابن ماجہ حدیث ۱۱۹۴ باب الوتر۔ اس حدیث کی سند میں جابر بن یزید جُعفی ہے جو متّہم بالکذب ہے ۱۲

[2] یعنی یہ بات تسلیم ہے کہ قرآن کریم سے مسافر کی نماز کا قصر ہونا مفہوم ہوتا ہے۔ مگر حدیث بھی تو ہے پس اس کا کم از کم اتنا اعتبار تو ہونا ہی چاہئے کہ سفر کی نماز میں کمی کرنے کے بعد عزیمت کی شان پیدا ہوگئی ہے مگر یہ جواب ذرا دقیق ہوگیا ہے۔ آسان جواب: یہ ہے کہ مسافر کی نماز میں دو اعتبار ہیں: ایک: اضافہ کے بعد مسافر کے حق میں اصل رکعتوں کا اعتبار کرنا۔ مسافر کی نماز میں بایں اعتبار قصر ہے اور اسی کا قرآن میں تذکرہ ہے۔ کیونکہ امتنان (احسان کرنے) کے لائق یہی بات ہے۔ دوسرا: مسافر کے حق میں اضافہ نہ ہونے کا اعتبار۔ حدیثوں میں اس کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ حدیثوں میں حقیقی صورتِ حال کی وضاحت ہے ۱۲

خوفِ فتنہ کی قید ہے۔ اور اب تو امن وامان ہو گیا ہے، پھر قصر کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: مجھے بھی اس بات پر حیرت ہوئی تھی، جس پر تمہیں حیرت ہورہی ہے۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا: ''(قصر) ایک خیرات ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے تم کو دی ہے۔ پس ان کی خیرات قبول کرو'' (رواہ مسلم مشکوٰۃ حدیث ۱۳۳۵)

اور بامروّت اور شرفاء، جب خیرات دیتے ہیں تو تنگی نہیں کرتے یعنی کوئی شرط لگا کر پریشانی کھڑی نہیں کرتے۔ پس خوفِ فتنہ کی قید بھی تنگی پیدا کرنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس میں یہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ دیکھو! کفار تو تمہارے آزار کے درپے ہیں، اور تم بندگی پر کمر بستہ ہو، اس لئے تمہیں سہولت دی جاتی ہے۔ اور قصر (نماز کم پڑھنے) کی اجازت دی جاتی ہے۔

اور جس طرح کریم (فیاض) خیرات دینے میں تنگی نہیں کرتا، اس کی خیرات کو رد کرنا بھی مروّت کے خلاف ہے۔ چنانچہ:

۱ــــ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مواظبت کے ساتھ قصر پڑھتے تھے، اگرچہ آپؐ نے کسی درجہ میں اتمام کی بھی اجازت دی ہے۔ پس قصر سنتِ مؤکدہ ہے، واجب نہیں۔

۲ــــ جب کوئی شخص ایک مرتبہ مسافر ہو گیا، تو اب جب تک وہ شرعاً مسافر ہے قصر کرنا جائز ہے۔ جب بالکلیہ اس سے مسافر کا اطلاق ختم ہو جائے گا تب نماز پوری پڑھے گا۔ اور دورانِ سفر یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس کو سفر میں کوئی زحمت ہے یا نہیں؟ نہ یہ بات دیکھی جائے گی کہ وہ اتمام پر قادر ہے یا نہیں؟ یہ باتیں تو صرف شروع میں دیکھی جاتی ہیں۔ جب اس پر مسافر کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جب ایک مرتبہ وہ مسافر ہو گیا تو وہ شرعاً معذور ہو گیا۔ اب ہر آن اور ہر حال میں مشقت کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ کریم ذات کا صدقہ ہے۔ اس سے جہاں تک استفادہ کیا جا سکے کرنا چاہئے۔

سوال: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جوازِ اتمام کی روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہی عمل کئے ہیں: نماز قصر بھی پڑھی ہے اور پوری بھی پڑھی ہے[1]۔ اور ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت اوپر گذری ہے کہ مسافر کی نماز پوری ہے، قصر نہیں ہے: ان دونوں باتوں میں بھی تعارض ہے؟

جواب: ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اور وہ اس طرح کہ اصل واجب تو دو ہی رکعتیں ہیں۔ مگر پھر بھی اگر کوئی نماز پوری پڑھ لے تو وہ بدرجۂ اولیٰ درست ہو جائے گی۔ جیسے بیمار اور غلام پر جمعہ واجب نہیں۔ لیکن اگر وہ جمعہ پڑھ لیں تو ظہر ساقط ہو جاتی ہے یا جیسے کسی کے پاس پچیس اونٹ ہیں۔ اور ان میں بنتِ مخاض واجب ہے۔ اب اگر وہ سارے ہی اونٹ صدقہ کر دے، تو ضمناً بنتِ مخاض بھی ادا ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر مسافر ظہر کی چار رکعتیں پڑھتا

---

[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت مشکوٰۃ میں حدیث نمبر ۱۳۴۱ ہے۔ اور نہایت ضعیف ہے۔ اس کا ایک راوی طلحہ بن عمرو متروک ہے۔ اور اس کی جو دوسری سند سنن دار قطنی میں ہے، اور جس کو دار قطنی نے صحیح کہا ہے۔ اس میں ایک راوی سعید بن محمد مستور ہے ۱۲

ہے، تو ضمناً اصل واجب (دو رکعتیں) بدرجۂ اَولیٰ ادا ہو جائے گا۔

نوٹ: شرح میں متن کی ترتیب بدل گئی ہے۔ کتاب سے ملاتے ہوئے اس کا خیال رکھا جائے۔

فائدہ: (۱) جواب میں جو دو باتیں ذکر کی گئی ہیں: دونوں غور طلب ہیں:

پہلی مثال میں تو مریض اور غلام پر جمعہ اس لئے واجب نہیں کہ وہ حاضری سے معذور ہیں۔ جیسے فقیر پر حج اس لئے فرض نہیں کہ وہ زاد و راحلہ کا مالک نہیں۔ لیکن جب مریض اور غلام جمعہ میں آ گئے تو جمعہ ان پر فرض ہو گیا۔ جس کو انھوں نے ادا کیا تو ظہر ساقط ہو گئی۔ جیسے فقیر کسی طرح حج کے دنوں میں کعبہ تک پہنچ جائے تو اس پر حج فرض ہو جائے گا۔ اور وہ حج کر لے گا تو حج فرض ادا ہو جائے گا۔ اور مسافر پر تو پچھلی دو رکعتیں واجب ہی نہیں۔ پھر یہ قیاس کیسے درست ہے؟

اور دوسری مثال میں قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ نماز اور زکات دو الگ الگ عبادتیں ہیں۔ اور دونوں کے مقاصد جدا جدا ہیں۔ نماز کا مقصد اخبات، نیاز مندی اور بندگی کا اظہار ہے۔ اور زکوۃ کا مقصد غرباء کی غم خواری ہے۔ پس ایک کا دوسرے کے ساتھ موازنہ درست نہیں۔ جیسے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے مسح راس کو اعضائے مغسولہ پر قیاس کر کے مسح میں تثلیث کا سنت ہونا ثابت کیا ہے۔ وہاں یہی کہا جاتا ہے کہ غسل اور مسح دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور دونوں کے مقاصد بھی جدا جدا ہیں۔ غسل میں مبالغہ اور مسح میں تخفیف پیش نظر ہے۔ پس ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں۔ قیاس کرنا ہے تو مسح راس کو مسح خف پر قیاس کیا جائے کہ دونوں ایک قبیل کی چیزیں ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی اگر قیاس کرنا ہے تو فجر کی نماز پر قیاس کیا جائے۔ اگر کوئی فجر کی نماز: دو کے بجائے چار پڑھے تو جائز ہے یا نہیں؟ اور چار کے ضمن میں دو بدرجۂ اَولیٰ ادا ہونگی یا نہیں؟

فائدہ: (۲) مسافر کے لئے اتمام جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف دو باتوں پر مبنی ہے۔ مذکورہ قیاسات پر یہ مسئلہ مبنی نہیں ہے:

پہلی بات: نصوص سے اتمام کا جواز ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ ایک خیال یہ ہے کہ کسی صحیح صریح نص سے بغیر تاویل کے اتمام کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ پس قصر واجب ہے۔ یہ حنفیہ کا خیال ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے مواظبت تامہ کے ساتھ قصر فرمایا ہے، جیسا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور وجوب کے دیگر قرائن بھی موجود ہیں، جیسے خیرات کی حدیث جو ابھی گذری ——— دوسرا خیال یہ ہے کہ نصوص سے اتمام کا جواز نکلتا ہے یہ نصوص بھی اوپر گذر چکی ہیں۔ یہ ائمہ ثلاثہ کی رائے ہے۔ اور بحث طویل ہے فالقصر أولیٰ!

دوسری بات: آیت کریمہ میں جو ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا﴾ یعنی تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم نماز کم پڑھو ——— اس آیت کا مفاد کیا ہے؟ ایک رائے یہ ہے کہ یہ آیت قصر کی اجازت دیتی ہے۔ قصر کو واجب نہیں کرتی۔ کیونکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں یعنی قصر کرنا جائز ہے اور اتمام کرنا بھی درست ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک مصلحت کے پیش نظر ہے، ورنہ قصر واجب ہے۔ جیسے صفاومروہ کے درمیان سعی احناف کے نزدیک واجب ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فرض ہے۔ مگر سورۃ البقرہ آیت ۱۵۸ میں تعبیر یہ آئی ہے: ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ، فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ یعنی صفا اور مروہ منجملہ یادگارِ دینِ خداوندی ہیں۔ پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان سعی کرے ——— بخاری شریف میں روایت ہے: اس تعبیر کے بارے میں حضرت عروۃ رحمہ اللہ نے اپنی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ اس تعبیر سے تو سعی کا جواز ثابت ہوتا ہے، جبکہ سعی واجب ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جواز کی یہ تعبیر نہیں ہے۔ جواز کی تعبیر ہے: فلاجناح علیه أن لایطوف بهما یعنی اگر صفاومروہ کی سعی نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں۔ پھر انھوں نے قرآنی تعبیر کا راز سمجھایا کہ اسلام سے پہلے ان پہاڑیوں پر اساف ونائلہ کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انصار کے بعض قبائل ان کو خدا نہیں مانتے تھے۔ وہ جب زمانہ جاہلیت میں حج یا عمرہ کے لئے آتے تھے تو ان مورتیوں کی وجہ سے صفاومروہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔ پھر جب اسلام کا زمانہ آیا۔ اور وہاں سے مورتیاں ہٹادی گئیں، تو بھی انصار کے ان قبائل کو سعی کرنے میں تذبذب ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ان کو بتایا گیا کہ صفاومروہ کی سعی کچھ ان مورتیوں کی وجہ سے نہیں کی جاتی بلکہ یہ تو دین اسلام کے شعائر ہیں۔ ان کی سعی کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔

اسی طرح جو شخص ہمیشہ نماز پوری پڑھتا ہے، جب وہ سفر میں قصر کرے گا تو اس کے دل پر بوجھ پڑے گا۔ اس کو خیال آئے گا کہ وہ نماز ناقص ادا کر رہا ہے اس لئے آیت کریمہ میں اس کی تسلی کی گئی ہے کہ قصر پڑھنے میں کوئی گناہ نہیں۔ پورے اطمینان سے قصر کرو۔ اور اس کی نظیر وہ تعبیر بھی ہے جو سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۶ میں آئی ہے: ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ یعنی متمتع اور قارن اگر ہدی نہ پائیں تو دس روزے رکھیں۔ تین روزے حج کا احرام باندھ کر رکھیں اور سات روزے وطن لوٹ کر رکھیں۔ یہاں یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ جو تین روزے حج کا احرام باندھ کر رکھے گئے ہیں، وہ تو اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اور جو سات وطن لوٹ کر رکھے جاتے ہیں وہ ان تین کے برابر نہیں ہوسکتے۔ پس کیوں نہ سارے روزے حج کا احرام باندھ کر رکھ لئے جائیں؟ اس لئے فرمایا کہ یہ دسوں روزے کامل ہیں۔ ان میں کوئی ناقص نہیں، پس بے فکر ہوکر سات روزے وطن لوٹ کر رکھو۔ حج کا احرام باندھ کر سارے روزے رکھو گے تو احرام لمبا ہوجائے گا اور پریشانی ہوگی۔

فمن الأعذار: السفر: وفيه من الحرج مالايحتاج إلى بيان، فشرع رسول الله صلى الله عليه وسلم رُخَصًا:

منها: القصر: فأبقى أصل أعداد الركعات، وهي إحدى عشرة ركعة، وأسقط مازِيْدَ بشرط الطُّمَأْنينة والحضر.

ولما كان هذا العدد فيه شائبة العزيمة: لم يكن من حقِّه: أن يقدَّر بقدر الضرورة، ويضيَّق في

ترخيصه كلَّ التضيقِ، فلذلك بين رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: أن شرطَ الخوف في الآية لبيان الفائدة، ولا مفهوم له، فقال" صدقةٌ تصدَّق الله بها عليكم، فاقبَلوا صدقتَه" والصدقةُ لايُضَيَّقُ فيها أهل المروءات.

ولذلك أيضًا: واظب رسول الله صلى الله عليه وسلم على القصر، وإن جوَّزَ الإتمامَ في الجملة، فهو سنة مؤكدة.

ولا اختلافَ بين مارُوى من جواز الإتمام، وأن الركعتين في السفر تمامٌ، غيرُ قصرٍ: لأنه يمكن أن يكون الواجبُ الأصلي هو ركعتين، ومع ذلك يكون الإتمامُ مُجزِئًا بالأَوْلى، كالمريض والعبد يُصليان الجمعةَ، فيسقط عنهما الظهر، أو كالذى وجب عليه بنتُ مَخاضٍ، فتصدَّق بالكل.

ولذلك كان من حقّه: أنه إذا صحَّ على المكلف إطلاقُ اسم المسافر، جاز له القصر إلى أن يزول عنه هذا الاسم بالكلية، لايُنظر في ذلك إلى وجود الحرج، ولا إلى عدم القدرة على الإتمام، لأنه وظيفةٌ من هذا شأنُه ابتداءً.

وهو قول ابن عمر رضي الله عنه: سَنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم صلاةَ السفر ركعتين، وهما تمامٌ، غيرُ قصر.

ترجمہ: پس اعذار میں سے سفر ہے: اور اس میں جو حرج ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ پس مشروع کیں اس کے لئے رسول اللہ ﷺ نے چند سہولتیں:

منجملہ ازاں: قصر ہے۔ پس باقی رکھی آپؐ نے رکعتوں کی اصل تعداد۔ اور وہ گیارہ رکعتیں ہیں۔ اور ساقط کیا آپؐ نے ان کو جو زیادہ کی گئی تھیں اطمینان اور قیام کی شرط کے ساتھ ——— اور جب اس عدد (گیارہ) میں عزیمت کا شائبہ تھا تو اس کے حق میں سے نہیں ہے کہ اندازہ کیا جائے وہ ضرورت کی مقدار کے ساتھ (یعنی بوقت ضرورت بھی اس مقدار میں کمی کرنا مناسب نہیں، کیونکہ یہ اصل عدد ہے) اور (نہ اس کے حق میں سے یہ بات ہے کہ) تنگی کی جائے اس مقدار میں سہولت دینے میں بہت زیادہ تنگی کرنا (یعنی چونکہ یہ مقدار اصلی ہے اس لئے اس پر عمل کرنے میں کوئی قید لگا کر تنگی پیدا کرنا بھی مناسب نہیں) پس اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا کہ آیت میں خوف کی شرط بیانِ فائدہ کے لئے ہے۔ اور اس کا کوئی مفہوم نہیں۔ پس آپؐ نے فرمایا: ''ایک خیرات: کی اللہ تعالیٰ نے وہ تم پر، پس قبول کرو تم ان کی خیرات'' اور خیرات: نہیں تنگی کرتے اس میں بامروت لوگ ——— اور نیز اس وجہ سے (یعنی ایک تو اصلی مقدار ہونے کی وجہ سے، دوسرے خیرات ہونے کی وجہ سے) پابندی کی ہے رسول اللہ ﷺ نے قصر کی۔ اگرچہ کسی درجہ میں

اتمام کی بھی اجازت دی ہے۔ پس قصر سنتِ مؤکدہ ہے۔

اور کوئی اختلاف نہیں اس بات کے درمیان جو روایت کی گئی ہے یعنی اتمام کا جواز، اور (اس بات کے درمیان) کہ دو رکعتیں سفر میں پوری نماز ہیں۔ قصر نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ممکن ہے کہ واجب اصلی دو رکعتیں ہوں، اور اس کے ساتھ اتمام بدرجۂ اَولی کافی ہونے والا ہو۔ جیسے مریض اور غلام: پڑھتے ہیں دونوں جمعہ، پس ساقط ہو جاتی ہے ان سے ظہر۔ یا جیسے وہ شخص جس پر بنتِ مخاض واجب ہوئی، پس صدقہ کر دیا اس نے سارے اونٹوں کا۔

اور اسی وجہ سے (یعنی قصر کے صدقہ ہونے کی وجہ سے) اس کے حق میں سے تھا (یعنی اس کے لئے سزاوار تھا) کہ جب مکلّف پر لفظ ''مسافر'' کا اطلاق ثابت ہو گیا تو جائز ہے اس کے لئے قصر، یہاں تک کہ ہٹ جائے اس سے یہ لفظ کلّی طور پر۔ نہیں دیکھا جائے گا اس سلسلہ میں تنگی کے پائے جانے کی طرف، اور نہ اتمام پر قادر نہ ہونے کی طرف۔ اس لئے کہ یہ (باتیں دیکھنا) اس شخص کا مخصوص حکم ہے جس کی شروع میں یہ حالت ہے (یعنی ابتداءً جب کسی کو مسافر قرار دیا جاتا ہے تو اس وقت یہ باتیں دیکھی جاتی ہیں۔ بعد میں ان کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ بس اس کا مسافر ہونا ہی جوازِ قصر کے لئے کافی ہے)

اور وہ ابن عمرؓ کا قول ہے: ''رائج کیا رسول اللہ ﷺ نے سفر کی نماز کو دو رکعتیں۔ درانحالیکہ وہ پوری ہیں، کم نہیں ہیں'' (اس روایت کا تعلق اوپر سے ہے، جہاں معترض نے جوازِ اتمام اور دوسری بات کے درمیان تعارض دکھلایا ہے)

☆ ☆ ☆

مسافتِ قصر کا بیان

مسافتِ قصر منصوص نہیں ہے۔ اور صحابہ وتابعین کی رائیں بھی مختلف ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تین شبانہ روز کی مسافت میں قصر کرتے تھے۔ مگر اس کی مراحل، برید اور امیال وغیرہ سے کوئی تقدیر مروی نہیں۔ اور اس کے بغیر اس کو معمول بہ بنانا مشکل ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے سفر کے جو اندازے قائم کئے ہیں، اور جن پر ان کا عمل بھی تھا: وہ چار برید ہیں۔ ایک برید بارہ میل کا ہوتا ہے۔ پس چار برید کے اڑتالیس میل ہوئے۔ اسی پر اب ائمہ اربعہ کے متبعین عمل پیرا ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی بحث کے آخر میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ احناف کے یہاں بھی فتوی اسی قول پر ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی بات: ——— مسافتِ قصر منصوص نہ ہونے کی وجہ ——— سفر، اقامت، زنا اور سرقہ (چوری) وغیرہ چیزوں کے احکام شریعت نے ان کے الفاظ پر دائر کئے ہیں۔ جن الفاظ کو اہل عرف ان کے مواقع میں استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ ان کے معانی جانتے ہیں۔ اور اس کا ایک نمونہ (مثال) ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور وہ لفظ ''سفر'' ہے۔ تمام اہل لسان جانتے ہیں کہ مکہ شریف سے مدینہ شریف جانا، اور مدینہ شریف سے خیبر جانا یقیناً سفر ہے۔ اور صحابہ کے

ارشادات اوران کے عمل سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مکہ شریف سے جدہ یا طائف یا عُسفان یا کسی ایسی جگہ جانا جو چار برید کی دوری پر ہو: مسافتِ سفر ہے۔ اسی طرح لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ گھر سے نکلنا کئی طرح پر ہوتا ہے: ایک: باغات اور کھیتوں کی طرف آمد ورفت یا شکار وغیرہ کے لئے قریبی جنگل میں جانا، جہاں سے ہمہ روز واپسی ہو جاتی ہے۔ دوسرا: مقصد اور سفر کی تعیین کئے بغیر بس یونہی آوارہ گردی کرنا۔ تیسرا: کسی خاص جگہ پہنچنے کا قصد کر کے گھر سے نکلنا، اور وہ جگہ اتنی دور ہو کہ عرف میں وہاں جانے کو ضرب فی الارض کہہ سکیں، اور جہاں پورا دن چل کر بلکہ رات کا ابتدائی حصہ چل کر پہنچے، اور ہمہ روز وہاں سے واپسی ناممکن ہو۔ اور لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ تینوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ اور وہ ایک پر دوسرے کا اطلاق نہیں کرتے۔ غرض قرآن کریم میں قصر کا حکم ضرب فی الارض (زمین میں سفر کرنا) پر اور احادیث میں سفر واقامت کے الفاظ پر دائر کیا گیا ہے۔ اور ان کی تعریفات وتحدیدات بیان نہیں کی گئیں۔ اب یہ کام مجتہدین امت کا ہے کہ اس کی تمام تفصیلات طے کریں۔

دوسری بات: —— مسافتِ قصر کی تحدید وتعیین کا طریقہ —— سفر کی جامع مانع تعریف جاننے کے لئے اجتہاد اور غور وفکر کرنا ضروری ہے۔ اور اجتہاد کا طریقہ یہ ہے کہ سفر کی حدِ تمام (جامع مانع تعریف) بنائی جائے۔ اور وہ ذاتیات سے حاصل ہوتی ہے —— اس کی تفصیل یہ ہے کہ کلیات پانچ ہیں: جنس، نوع، فصل، خاصہ اور عرض عام۔ اول تین ذاتی کلیاں ہیں، اور آخری دو عرضی۔ اور تعریف میں اگر کلی عرضی شامل کر لی جائے تو اس کو رسم کہتے ہیں۔ وہ حدّ نہیں ہوتی۔ حدّ: ذاتی کلیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ پھر حد بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اعم کلی کو یعنی جنس کو موضوع بنایا جائے۔ اور اخص کلی کو یعنی فصل کو محمول بنایا جائے۔ اور فصلیں ایک سے زائد بھی ہو سکتی ہیں۔ پس سب کو محمول بنایا جائے تو حد حاصل ہو جائے گی۔ پھر اگر موضوع جنس قریب ہو تو وہ حد تمام ہے جیسے انسان کی حد تمام ہے حیوانِ ناطق۔ اور اگر موضوع جنس بعید ہو، تو وہ حد ناقص ہے۔ جیسے انسان کی حد ناقص ہے جسم ناطق۔ غرض اعلی درجہ کی حد: حد تام ہے۔ کیونکہ بات پوری طرح اسی سے سمجھ میں آتی ہے۔ حد ناقص تو ناقص ہے۔ پس سفر کی حقیقت جاننے کے لئے اس کی جامع مانع تعریف یعنی حد تام بنانی ضروری ہے —— اور کسی چیز کی ذاتیات کو جاننے کا طریقہ سَبر وتقسیم ہے۔ سَبر کے لغوی معنی ہیں: جانچنا، امتحان کرنا۔ اور تقسیم کے معنی ہیں: بانٹنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: کسی چیز کے ممکنہ اوصاف کو یعنی جو جو اوصاف اس میں ہو سکتے ہیں، ان کو حرف تردید أو کے ذریعہ جمع کرنا۔ پھر جن اوصاف میں کلی ذاتی ہونے کی صلاحیت نہیں ہے، ان کو ساقط کرنا۔ تا آنکہ وہ اوصاف باقی رہ جائیں جو کلی ذاتی بننے کے قابل ہیں۔ پھر ان میں سے عام کو موضوع اور خاص کو محمول بنالیا جائے تو حد تام حاصل ہو جائے گی۔

اب اس طریقہ پر ہم غور کریں تو سفر کی تین ذاتی کلیاں حاصل ہوں گی: اول: گھر سے نکلنا کلی ذاتی ہے، کیونکہ جو گھر میں اقامت پذیر ہے اس کو مسافر نہیں کہا جاتا دوم: کسی معین جگہ جانا بھی کلی ذاتی ہے، کیونکہ بے مقصد گھومنا آوارہ گردی

ہے، سفر نہیں ہے۔ سوم: وہ جگہ جہاں جانے کا قصد ہے دور ہو، جہاں سے اس روز بلکہ رات کے ابتدائی حصہ میں بھی واپسی ممکن نہ ہو، ورنہ وہ کھیتوں میں اور باغات میں آمد ورفت کی طرح ہو جائے گا ——— اب پھر غور کریں: پہلی کلی اعم ہے، کیونکہ گھر سے نکلنے کے بہت سے مقاصد ہوسکتے ہیں۔ اور باقی دو کلیاں اخص ہیں۔ پس سفر کی حد تمام اس طرح بنے گی: **السفر: هو الخروج من الوطن إلى موضع معين بعيد بحيث لايمكن له الرجوع منه إلى محل إقامته في يومه ذلك ولافي أوائل ليلته** یعنی سفر: وطن سے کسی ایسی معین جگہ کی طرف جانے کا نام ہے جو اتنی دور ہو کہ ہمہ روز بلکہ بعد والی رات کے شروع حصہ میں بھی گھر واپسی ممکن نہ ہو ——— اور تیسری کلی ذاتی (یعنی مقصد کے مخصوص بُعد) کے لئے کم از کم ایک پورے دن کی مسافت لازم ہے۔ یہی بات موطا (۱: ۱۴۷) میں حضرت سالم رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: **كان ابن عمر يقصر الصلاة في مسيره اليومَ التامَّ** یعنی حضرت ابن عمرؓ جب ایک پورے دن کا سفر کرتے تھے تو نماز قصر پڑھتے تھے۔ مگر موطا کے شارح علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ تیز چال سے ایک دن میں تقریباً چار برید چلا جاسکتا ہے۔ پس چار برید یقینی ہیں۔ اور اس سے کم میں شک ہے۔ اس لئے مسافتِ قصر چار برید یعنی اڑتالیس میل شرعی ہیں، جن کے تقریباً ۸۹ کلومیٹر بنتے ہیں۔

فائدہ: مسافتِ قصر کا مسئلہ کبھی عراقی اور حجازی مکاتب فکر میں معرکۃ الآراء مسئلہ رہا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ نے کتاب الحُجج (**كتاب الحجة على أهل المدينة**) میں اس کا تذکرہ کیا ہے[۱]۔ اور اُس روایت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے جس میں بغیر محرم کے عورت کو تین رات دن کا سفر کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ مگر یہ استنباط واضح نہیں ہے۔ کیونکہ روایات میں ایک رات دن کے سفر کی، بلکہ مطلق سفر کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ درحقیقت اس مسئلہ کا مدار خوفِ فتنہ پر ہے۔ غالباً اسی لئے بعد کے احناف نے استدلال بدل دیا۔ اور اُس روایت سے استدلال کیا جس میں مسافر کو تین رات دن تک موزوں پر مسح کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر یہ استدلال بھی صحیح نہیں۔ جیسے فتح مکہ کے موقعہ پر مکہ مکرمہ میں آنحضرت ﷺ کا انیس دن تک قیام فرمانا اور نماز قصر پڑھنا، مدت اقامت کی تعیین کے لئے کافی نہیں، اگرچہ حضرت ابن عباسؓ نے انیس دن سے زائد قیام کی نیت کو مدت اقامت قرار دیا ہے، مگر ائمہ میں سے کسی نے اس کو نہیں لیا۔ کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ اگر آپ بیس دن ٹھہرتے تو اتمام فرماتے۔ اسی طرح یہاں بھی کوئی دلیل نہیں

---

[۱] اس کتاب میں ''اہل مدینہ'' سے مراد صرف امام مالک رحمہ اللہ نہیں ہیں۔ جیسا کہ گمان پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ پورا حجازی مکتب فکر مراد ہے۔ جس کو کسی زمانہ میں مدنی مکتب فکر بھی کہتے تھے۔ اور چونکہ اس مکتب فکر کے سرخیل امام مالک رحمہ اللہ ہیں اس لئے کتاب میں بار باران کا ذکر آتا ہے۔ اوران کے مختارات اوران کی روایات سے اہل حجاز پر حجت قائم کی ہے۔ اُس وقت اس مکتب فکر کے جو دیگر اکابر تھے وہ اب گوشہ گمنامی میں چلے گئے ہیں۔ اور بعد کے اکابر جیسے امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔ غرض یہ خیال درست نہیں ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے یہ کتاب اپنے استاذ امام مالک کے خلاف لکھی ہے۔ بلکہ یہ ایک مکتب فکر کی طرف سے دوسرے مکتب فکر کے مسائل پر بحث ہے ۱۲

ہے کہ آپؐ نے مسح کی مدت: اقل مدتِ قصر کو قرار دیا ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ اور ایسے مسائل کی تاریخ یہ ہے کہ ان میں سے بعض میں تو بعد میں اختلاف اور سخت ہوگیا ہے۔ جیسے سری نماز میں مقتدی کے فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ۔ احناف کے یہاں اس مسئلہ میں پانچ روایات ہیں: وجوب، استحباب، اباحت، کراہیتِ تنزیہی اور کراہیتِ تحریمی۔ مگر بعد میں آخری روایت فتوی کے لئے متعین ہوگئی۔ یا جیسے جہری نماز میں مقتدی پر فاتحہ کی فرضیت کا مسئلہ۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے اس مسئلہ میں کوئی روایت ثابت نہیں۔ مگر بعد میں شوافع نے فرضیت کا فیصلہ کردیا۔ تو اختلاف اور سخت ہوگیا —— اور بعض مسائل میں زمانہ گذرنے کے ساتھ اختلاف ہلکا پڑ گیا۔ بلکہ رفتہ رفتہ اختلاف مضمحل ہوگیا۔ مسافتِ قصر کا مسئلہ ایسا ہی مسئلہ ہے۔ اب اس مسئلہ میں کچھ اختلاف نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ تو شروع ہی سے چار برید کے قائل تھے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ سے سات تقدیریں مروی ہیں۔ مگر بعد کے حضرات نے ان کو چار برید (اڑتالیس میل) پر جمع کردیا ہے (شرح مہذب ۴: ۳۲۳) بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے مراعاتِ خلاف کے لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ شیرازی رحمہ اللہ (متوفی ۴۷۶ھ) نے مہذب میں یہ بات بیان کی ہے۔ مگر یہ سب ابحاث بعد میں ختم ہوگئیں اور چار برید فتوی کے لئے متعین ہوگئے۔

اور احناف کی صورتِ حال یہ ہے کہ ان کا اصل مذہب: بغیر تقدیر کے تین رات دن کی مسافت: مدتِ قصر قرار دی گئی تھی۔ مگر تقدیر کے بغیر عوام کے لئے عمل میں دشواری تھی۔ اس لئے بعد کے حضرات نے اندازے قائم کئے۔ سیدھا اندازہ تین مراحل کا تھا۔ مرحلہ: اونٹ کی چال سے ایک دن کی مسافتِ سفر کو کہتے ہیں جو چوبیس میل ہوتی ہے۔ مگر احناف نے مرحلوں کے بجائے فرسخوں سے اندازہ کیا۔ فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ فرسخوں سے تین رات دن کی مسافت کے تین اندازے کئے گئے اکیس فرسخ یعنی ۶۳ میل، اٹھارہ فرسخ یعنی ۵۴ میل اور پندرہ فرسخ یعنی ۴۵ میل۔ پہلی تقدیر پر کسی نے فتوی نہیں دیا۔ باقی دو تقدیروں کو مفتی بہ قرار دیا گیا۔ پھر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے فتاوی رشیدیہ میں اڑتالیس میل یعنی چار برید پر فتوی دیا۔ کیونکہ یہ پندرہ فرسخ سے زائد تھا۔ اور اس کا مستند موجود تھا۔ اس لئے اب یہی قول مفتی بہ ہے۔

اور میل کے لغوی معنی ہیں: مدالبصر یعنی جہاں تک نگاہ جاتی ہے وہ ایک میل ہے۔ اور اصطلاح میں میل چار ہزار ہاتھ کا اور ہاتھ چوبیس انگشت کا، اور انگشت چھ جو کی ہوتی ہے۔ یہی میل ہاشمی اور میل شرعی ہے۔ کسی زمانہ میں میل اموی اس سے بڑا رائج ہوا تھا۔ اور قریب زمانہ میں میل انگریزی اس سے چھوٹا رائج ہوا ان کا اعتبار نہیں۔ پس کلومیٹر میں اندازہ کرتے وقت اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ پس ایک عام حساب جو ۷۷ کلومیٹر کا چل رہا ہے، غالباً وہ صحیح حساب نہیں۔ مجمع لغۃ الفقہاء میں تقریباً ۸۹ کلومیٹر حساب کیا گیا ہے۔

آخر میں امام محمد رحمہ اللہ کی ایک قیمتی نصیحت درج کی جاتی ہے کہ جہاں شک ہو کہ آدمی مسافر ہوا یا نہیں وہاں پوری نماز پڑھنا بہتر ہے۔ حدیث میں ہے: دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَى مَالَا يُرِيبُكَ: کھٹک والی بات چھوڑ دو، اور بے کھٹک بات اختیار کرو واللہ الموفق۔

سفر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کب پورا ہوتا ہے

جب کوئی شخص ایسی جگہ جانے کا ارادہ کر کے شہر پناہ سے یا گاؤں کے باہر لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ (یعنی فنا) سے یا گاؤں کے گھروں سے نکلے جو چار برید کے فاصلہ پر ہو تو اس پر مسافر کا اطلاق درست ہو جاتا ہے۔ اور وہ مسافر بن جاتا ہے۔

اور جب کسی شہر یا گاؤں میں قابل لحاظ کافی مدت ٹھہرنے کی نیت کر لے تو لفظ مسافر اس سے ہٹ جاتا ہے اور وہ مقیم بن جاتا ہے (یہ مدت ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چار دن ہے۔ اور احناف کے نزدیک پندرہ دن ہے۔ یہ مدت بھی منصوص نہیں اور صحابہ و تابعین کے اقوال بھی مختلف ہیں۔ احناف نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول لیا ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ نے حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کا قول اختیار کیا ہے)

واعلم: أن السفر، والإقامة، والزنا، والسرقة، وسائرَ ما أدار الشارع عليه الحكم: أمورٌ يستعملها أهل العرف في مظانّها، ويعرفون معانِيَها، ولايُنَالُ حدُّه الجامعُ المانعُ إلا بضرب من الاجتهاد والتأمل، ومن المهمّ معرفةُ طريق الاجتهاد، فنحن نعلم نموذجا منها في السفر.

فنقول: هو معلوم بالقسمة والمثال:

يعلم جميعُ أهل اللسان: أن الخروج من مكة إلى المدينة، ومن المدينة إلى خيبر سفرٌ لامحالة، وقد ظهر من فعل الصحابة وكلامِهم: أن الخروج من مكة إلى جدّة، وإلى الطائف، وإلى عُسفان، وسائرِ مايكونُ المقصدُ فيه على أربعة بُرُدٍ: سفر. ويعلمون أيضًا أن الخروج من الوطن على أقسام: ترددٌ إلى المزارع والبساتين، وهيمانٌ بدون تعيينِ مقصد وسفر، ويعلمون أن اسم أحدِ هذه لايُطلق على الآخر.

وسبيلُ الاجتهاد: أن يُستقرأ الأمثلةُ التي يُطلق عليها الاسم عرفا وشرعا، وأن يُسْبَر الأوصافُ التي بها يفارِقُ أحدُها قسيمَه، فيُجعل أعمُّها في موضع الجنس، وأخصُّها في موضع الفصل. فعلمنا أن الانتقالَ من الوطن جزءٌ نفسيٌّ، إذ من كان ثاويًا في محلِّ إقامته لايقال له: مسافر، وأن الانتقال إلى موضع معين جزء نفسي، وإلا كان هيمانًا، لاسفرًا، وأن كونَ ذلك الموضِع بحيث لايمكن له الرجوع منه إلى محل إقامته في يومه وأوائلِ ليلته: جزء

نفسي، وإلا كان مثل التردد إلى البساتين والمزارع. ومن لازِمه: أن يكون مسيرةَ يوم تامّ، وبه قال سالِمٌ، ولكن مسيرةُ أربعة بُرُد متيقن، ومادونه مشكوك.

وصحةُ هذا الاسم: يكون بالخروج من سور البلد، أو حِلّةِ القرية، أو بيوتها، بقصدِ موضع هو على أربعة بُرُدٍ؛ وزوالُ هذا الاسم إنما يكون بنية الإقامة مدة صالحة يعتد بها في بلدة أو قرية.

ترجمہ: اور جان لیں کہ سفر، اقامت، زنا، سَرِقہ اور دیگر وہ الفاظ جن پر شارع نے حکم کو دائر کیا ہے: ایسے امور ہیں جن کو اہل عرف ان کی احتمالی جگہوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ ان الفاظ کے معانی کو جانتے ہیں (یہاں تک پہلی بات ہے) اور اس کی جامع مانع تعریف حاصل نہیں کی جاسکتی مگر ایک قسم کے اجتہاد اور غور وفکر سے۔ اور اہم امور میں سے اجتہاد کا طریقہ جاننا ہے (یہ دوسری بات شروع کردی) پس ہم جانتے ہیں اُن امور کا ایک نمونہ لفظ سفر میں (یہ پہلی بات آگئی) پس ہم کہتے ہیں: سفر معلوم ہے بانٹنے اور مثال کے ذریعہ (سَبر وتقسیم کی تفصیل رحمۃ اللہ ۲: ۵۳۴ میں گذر چکی ہے۔ اور مثال کا تعلق پہلی بات سے ہے کہ ہم لفظ سفر کے معنی اس کی مثالوں کے ذریعہ جان سکتے ہیں۔ آگے وہی مثالیں ہیں:)

تمام اہل لسان جانتے ہیں کہ مکہ سے مدینہ کی طرف نکلنا، اور مدینہ سے خیبر کی طرف نکلنا یقیناً سفر ہے۔ اور تحقیق ظاہر ہوا صحابہ کے عمل سے اور ان کے کلام سے کہ مکہ سے جدہ کی طرف، اور طائف کی طرف، اور عُسفان کی طرف، اور دیگران جگہوں کی طرف نکلنا جس میں چار برید کا ارادہ ہو: سفر ہے۔ اور لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وطن سے نکلنا کئی طرح کا ہوتا ہے: کھیتوں اور باغات کی طرف آمد ورفت، اور مقصد اور سفر کی تعیین کے بغیر آوارہ گردی۔ اور لوگ جانتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا لفظ دوسرے پر نہیں بولا جاتا (یہ سارا مضمون پہلی بات سے متعلق ہے)

اور اجتہاد کا طریقہ یہ ہے کہ ان مثالوں کا جائزہ لیا جائے جن پر لفظ عرفاً اور شرعاً بولا جاتا ہے۔ اور یہ کہ جانچے جائیں وہ اوصاف جن کے ذریعہ جدا ہوتی ہے ان میں سے ایک اپنی قسیم سے (یعنی ہر وصف کو دوسرے سے الگ کرلیا جائے) پس بنایا جائے ان کے زیادہ عام کو جنس کی جگہ میں اور ان کے زیادہ خاص کو فصل کی جگہ میں۔ پس ہم نے جانا کہ وطن سے منتقل ہونا (یعنی نکلنا) جزء ذاتی ہے۔ کیونکہ جو شخص اپنی اقامت کی جگہ میں ٹھہرنے والا ہے اس کو مسافر نہیں کہا جاتا۔ اور (جانا ہم نے) کہ کسی معین جگہ کی طرف منتقل ہونا جزء ذاتی ہے۔ ورنہ وہ (نکلنا) آوارہ گردی کہلائے گا، سفر نہیں کہلائے گا۔ اور (جانا ہم نے) کہ اس جگہ کا ہونا بایں طور کہ نہ ممکن ہو اس کے لئے وہاں سے لوٹنا اس کی اقامت کی جگہ کی طرف اس کے اسی دن میں اور اس کی رات کے شروع حصہ میں: جزء ذاتی ہے، ورنہ ہوگا باغات اور کھیتوں کی طرف آمد ورفت کی طرح۔ اور اس تیسرے جزء ذاتی کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک پورے دن کا سفر ہو۔ اور اسی کے قائل ہیں سالم رحمہ اللہ مگر چار برید کی مسافت یقینی ہے، اور جو اس سے کم ہے اس میں شک ہے۔

اور اس لفظ (مسافر) کی درستگی ہوتی ہے نکلنے سے شہر پناہ سے یا گاؤں کے باہر لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ سے یا

گاؤں کے گھروں سے، ایسی جگہ کے قصد سے جو چار برید پر ہے۔ اور اس لفظ کا ٹھنا ہوتا ہے صرف ٹھہرنے کی نیت کرنے سے کافی مدت جس کا اعتبار کیا جائے کسی شہر میں یا کسی گاؤں میں۔

☆ ☆ ☆

دوسری سہولت: جمع بین الصلاتین

شریعت نے مسافر کو دوسری سہولت یہ دی ہے کہ وہ ظہر وعصر کو اور مغرب وعشاء کو جمع کرکے ایک ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ جمع تقدیم بھی جائز ہے اور جمع تاخیر بھی۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ پہلے اوقات الصلاۃ میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ نمازوں کے اصل اوقات تین ہیں: فجر، ظہر اور مغرب۔ اور عصر: ظہر میں سے اور عشاء: مغرب میں سے مشتق کی گئی ہیں تاکہ ظہر اور مغرب میں اور مغرب اور فجر میں لمبا فاصلہ نہ ہوجائے۔ اور تاکہ کاروباری مشغولیت میں اللہ کی یاد دل سے نکل نہ جائے۔ اور غفلت کی حالت میں سونا نہ ہو۔ پس ظہر وعصر اور مغرب وعشاء درحقیقت ایک ہی چیز کے دو پیس (Piece) ہیں۔ اس لئے بوقتِ ضرورت ان کو ایک ساتھ پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس پر مواظبت کے ساتھ عمل نہیں فرمایا جیسا کہ قصر مواظبت کے ساتھ کیا ہے۔ پس بے ضرورت جمع کرنا جائز نہیں۔

فائدہ: یہ مسئلہ بھی عراقی اور حجازی مکاتب فکر میں مختلف فیہ ہے۔ سورۃ النساء آیت ۱۰۳ میں صراحت ہے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا﴾ یعنی یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے، اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔ اور ترمذی میں کتاب الصلاۃ کے پہلے باب میں روایت ہے: إن للصلاۃ أولاً وآخرًا: یعنی ہر نماز کا اول وآخر ہے۔ پس دو نمازوں کو جمع کرنے کا جواز اس وقت پیدا ہوگا جبکہ صحیح اور صریح نص سے یہ بات ثابت ہو کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی جمع حقیقی کیا ہے۔ عراقی فقہاء کے نزدیک ایسی کوئی نص موجود نہیں، اور جو نصوص اس سلسلہ میں بیان کی جاتی ہیں ان میں کلام ہے۔ اور حجازی فقہاء کے نزدیک ایسی نصوص موجود ہیں اور بحث طویل ہے۔ اس لئے اس سے اعراض مناسب ہے۔

البتہ جمع صوری یعنی ایک نماز اس کے آخر وقت میں اور دوسری نماز اس کے شروع وقت میں پڑھنا بالاتفاق درست ہے۔ اور آنحضرت ﷺ جو سفر میں دو نمازوں کو جمع فرمایا کرتے تھے وہ اسی طرح جمع کرتے تھے۔ اور یہ سوال کہ ایسا تو عصر اور مغرب میں اور عشا اور فجر میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ ظہرین اور مغربین کے درمیان ہی کیوں جمع فرماتے تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عصر کا آخر وقت مکروہ ہے۔ اس لئے عصر ومغرب میں جمع صوری کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ عشا اور فجر میں ایسا کیا جاسکتا ہے۔ مگر آنحضور ﷺ ایسا اس لئے نہیں کرتے تھے کہ سفر پوری رات جاری نہیں رہتا تھا۔ نیز: ایک قول میں عشاء کا وقت نصف رات پر ختم ہوجاتا ہے اور جمہور کے نزدیک اگرچہ وقت ختم نہیں ہوتا، مگر اتنی تاخیر مکروہ ہے۔

اسی طرح سخت مجبوری کی حالت میں جمع تاخیر کرنے میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ اس صورت میں عراقی فقہاء کے نزدیک ایک نماز قضا ہوگی۔ اور سخت مجبوری کی حالت میں نماز قضا کرنے کی اجازت ہے۔ غزوۂ خندق میں ایک دن آپؐ کی ایک نماز، اور ایک دن تین نمازیں قضا ہوئی ہیں۔ البتہ جمع تقدیم: عراقی فقہاء کے نزدیک کسی حال میں درست نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں ایک نماز: قبل از وقت پڑھنا لازم آئے گا۔ پس یہ سوال بھی ختم ہوگیا کہ سخت مجبوری میں آدمی کیا کرے؟ جواب یہ ہے کہ نماز قضا کر کے جمع تاخیر کرے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دونوں نمازیں قضا کر کے بعد میں پڑھے۔ غرض اختلافی صورت درحقیقت یہی جمع تقدیم والی ہے۔ اور احتیاط پر عمل بہرحال اولی ہے۔ اور حاجی کا عرفہ میں جمع تقدیم کرنا اور مزدلفہ میں جمع تاخیر کرنا بالاجماع ثابت اور جائز ہے۔ کیونکہ اجماع دلیل قطعی ہے۔ اس سے آیت پاک میں تخصیص جائز ہے۔

تیسری سہولت: سنتیں نہ پڑھنا

شریعت نے مسافر کو تیسری سہولت یہ دی ہے کہ وہ سفر میں سنن مؤکدہ بھی چھوڑ سکتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک سفر میں ظہر کی دو رکعتیں پڑھائیں اور فوراً سوار ہوگئے۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ابھی نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا: یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟! بتایا گیا کہ سنتیں پڑھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: مجھے سنتیں پڑھنی ہوتیں تو میں فرض پورے نہ پڑھتا! میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کیا ہے۔ آپؐ سفر میں صرف دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور میں نے ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی اسفار کئے ہیں۔ وہ بھی یہی کرتے تھے (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۳۳۸) البتہ فجر کی سنتیں اور وتر کی نماز آپؐ اور خلفائے راشدین سفر میں بھی ادا فرماتے تھے۔

فائدہ: مگر ترمذی کی روایت میں خود ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ظہر کے بعد دو سنتیں پڑھنا مروی ہے۔ اور وہ اس کو آنحضور ﷺ کا معمول بتاتے تھے (مشکوۃ حدیث ۱۳۴۳) اور ایک مرتبہ آپ نے اپنے صاحبزادے عبید اللہ کو سفر میں نفلیں پڑھتے دیکھا ہے، تو ٹوکا نہیں (مشکوۃ حدیث ۱۳۵۳) اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ عمومی احوال میں تو سفر میں سنتیں نہیں پڑھتے تھے، مگر کبھی موقعہ ہوتا تھا تو پڑھتے بھی تھے۔ اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ حالتِ فرار میں سنتیں نہ پڑھے اور حالت قرار میں پڑھے۔

چوتھی سہولت: سواری پر نوافل پڑھنا

شریعت نے مسافر کو چوتھی سہولت یہ دی ہے کہ وہ سواری پر نوافل ادا کر سکتا ہے۔ جب نماز شروع کرے اس وقت سواری کو قبلہ رخ کر لے تو بہتر ہے۔ پھر جدھر بھی سواری چلتی رہے، نماز پڑھتا رہے۔ اور رکوع و سجود اشارے سے کرے۔ رکوع کے لئے ذرا کم اور سجدہ کے لئے ذرا زیادہ اشارہ کرے۔ اور یہ سہولت صرف نوافل میں ہے۔ اور فجر کی

سنتیں بھی نفل ہیں۔ اور وتر بھی شاہ صاحب کے نزدیک نفل ہیں، اس لئے ان کو بھی سواری پر ادا کر سکتا ہے۔ البتہ فرض نمازیں زمین پر اتر کر پڑھنا ضروری ہے۔

فائدہ: نوافل صرف اونٹ پر پڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کو چلانا نہیں پڑتا۔ وہ اونٹوں کی قطار میں چلتا رہتا ہے۔ گھوڑے پر نماز پڑھنا درست نہیں۔ کیونکہ اس کو چلانا پڑتا ہے جو عمل کثیر ہے۔ اور کار، بس وغیرہ وہ سواریاں جن میں قیام اور استقبالِ قبلہ پر قدرت نہیں: بحکم دابہ ہیں۔ اور ریل اور ہوائی جہاز میں چونکہ قیام اور استقبالِ قبلہ پر قدرت ہے اس لئے وہ بحکم ارض ہیں۔

ومنها: الجمعُ بين الظهر والعصر، والمغرب والعشاء: والأصل فيه: ما أشرنا أن الأوقات الأصلية ثلاثة: الفجر، والظهر، والمغرب؛ وإنما اشْتُقَّ العصر من الظهر، والعشاءُ من المغرب، لئلا تكون المدّةُ الطويلة فاصلةً بين الذكرين، ولئلايكون النوم على صفة الغفلة، فَشَرَعَ لهم جمع التقديم والتأخير، لكنه لم يُواظب عليه، ولم يَعْزِم عليه مثلَ ما فعل في القصر.

ومنها: تركُ السنن: فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأبوبكر، وعمر، وعثمان رضى الله عنهم لايسبحون إلا سنة الفجر والوتر.

ومنها: الصلاةُ على الراحلة، حيث توجهت به، يؤمى إيماءً ا، وذلك في النوافل، وسنة الفجر، والوتر، لاالفرائض.

ترجمہ: اور رخصتوں میں سے: ظہر و عصر اور مغرب و عشا کے درمیان جمع کرنا ہے: اور بنیادی بات اس سلسلہ میں وہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اصلی اوقات تین ہیں: فجر، ظہر اور مغرب۔ اور عصر: ظہر ہی سے، اور عشا: مغرب ہی سے مشتق کی گئی ہے۔ تاکہ لمبی مدت دو ذکروں کے درمیان فاصل نہ ہو، اور اس لئے کہ غفلت کی حالت پر سونا نہ ہو۔ پس آپؐ نے مقرر کیا لوگوں کے لئے آگے کر کے جمع کرنا اور پیچھے کر کے جمع کرنا۔ مگر آپؐ نے اس پر مواظبت نہیں فرمائی۔ اور نہ اس پر مضبوطی سے عمل کیا ہے، جیسا کہ آپؐ نے قصر میں کیا ہے۔

اور ان میں سے: سنتیں چھوڑنا ہے۔ پس رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اور ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم نوافل نہیں پڑھا کرتے تھے، سوائے سنتِ فجر اور وتر کے۔

اور ان میں سے: سواری پر نماز پڑھنا ہے۔ جدھر بھی سواری رخ کرے سوار کو لیکر اشارہ کرے اچھی طرح اشارہ کرنا۔ اور یہ رخصت: نوافل، سنت فجر اور وتر میں ہے۔ فرائض میں نہیں۔

☆　☆　☆

نماز خوف کا بیان

(خوف میں نماز کی صورتیں اوران کی حکمتیں)

دوسرا عذر: دشمن یا کسی درندہ وغیرہ کا خوف ہے۔ اس عذر کی حالت میں شریعت نے معمول سے ہٹ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ سورۃ النساء میں قصر کی رخصت کے بعد متصلاً صلوٰۃ خوف کا تذکرہ ہے۔ اور نبی ﷺ نے چوبیس مرتبہ یہ نماز مختلف طرح سے پڑھی ہے (شامی ۱:۶۲۷) امام ابوداؤد اور ابن المنذر نے آٹھ، ابن حبان نے اپنی صحیح میں نو، ابن حزم نے ایک مستقل رسالہ میں چودہ اور ابوالفضل عراقی نے سترہ صورتیں بیان کی ہیں (معارف السنن) شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مشکوٰۃ شریف، باب الخوف میں جو چند روایات ہیں، ان کو اوران کی مصلحتوں کو بیان کیا ہے:

پہلی صورت: مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے صلاۃ خوف پڑھائی۔ دشمن سامنے قبلہ کی طرف تھا۔ آپؐ نے لوگوں کی دو صفیں بنائیں۔ سب لوگ تکبیر تحریمہ سے رکوع تک آپؐ کے ساتھ شریک رہے۔ جب آپؐ نے سجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ صرف پہلی صف نے سجدہ کیا۔ اور آخری صف دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہی۔ پھر جب آپ اور پہلی صف سجدہ سے فارغ ہو کر کھڑے ہوگئے تو دوسری صف نے سجدہ کیا۔ سجدوں سے فارغ ہو کر جب دوسری صف کھڑی ہوئی تو وہ آگے پہلی صف کی جگہ میں چلی گئی۔ اور پہلی صف پیچھے ہٹ آئی۔ پھر دوسری رکعت میں رکوع تک سب آپؐ کے ساتھ شریک رہے۔ پھر جب آپؐ نے دوسری رکعت کا سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ پہلی صف نے سجدہ کیا۔ اور دوسری صف دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہی۔ پھر جب آپ اور پہلی صف سجدہ سے فارغ ہوئے تو دوسری صف نے سجدہ کیا۔ پھر سب نے آپؐ کے ساتھ سلام پھیرا ــــــ اس طرح نماز اس وقت پڑھی جائے گی جب دشمن سامنے قبلہ کی جانب میں ہو، جیسا کہ روایت میں اس کی صراحت ہے۔

دوسری صورت: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بطن نخل میں (جو مدینہ کے قریب ہی ہے) ظہر کی نماز پڑھائی۔ لوگوں کی دو جماعتیں بنائیں۔ ایک طائفہ کو دو رکعتیں پڑھا کر آپؐ نے سلام پھیر دیا۔ پھر دوسرے طائفہ کو دو رکعتیں پڑھائیں اور سلام پھیرا ــــــ اس طرح صلاۃ الخوف اس وقت پڑھی جائے گی جب دشمن سامنے کی جانب میں نہ ہو۔ دائیں، بائیں یا پیچھے ہو۔ اور ہر طائفہ کو ایک ایک رکعت پڑھانے میں تشویش کا اندیشہ ہو کہ لوگ اپنی نماز خراب کرلیں گے، صحیح طریقہ پر ادا نہیں کرسکیں گے، تو اس طرح کرلیا جائے۔

فائدہ: یہ روایت مشکوٰۃ شریف میں امام بغوی رحمہ اللہ کی شرح السنۃ کے حوالے سے درج کی گئی ہے۔ اور شرح السنۃ (۲:۵۹۴) میں بغیر سند کے مذکور ہے۔ البتہ نسائی (۳:۱۷۸) دارقطنی (۲:۶۱) اور سنن بیہقی (۳:۲۵۹) میں اسانید کے

ساتھ مروی ہے۔ اور اس میں تین اضطراب ہیں: (۱) یونس وقتادہ عن الحسن عن جابر روایت کرتے ہیں اور اشعث بن عبد الملک حُمرانی اور ابوحرہ رقاشی عن الحسن عن ابی بکرۃ روایت کرتے ہیں (۲) یونس کی روایت میں دو رکعت پر سلام پھیرنے کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور باقی حضرات دو سلاموں کا تذکرہ کرتے ہیں (۳) اشعث سے سعید بن عامر کی روایت میں یہ واقعہ رباعی نماز کا ہے اور اشعث ہی سے عمر بن خلیفہ بکراوی کی روایت میں یہ قصہ مغرب کی نماز کا ہے (یہ سب روایات سنن بیہقی میں مذکور ہیں) پس اضطراب کی وجہ سے یہ روایت قابل استدلال نہیں۔ گمان ایسا ہے کہ یہ قصہ حضر کا ہے اور ظہر کی نماز کا ہے اور دو رکعت پر سلام کا تذکرہ راوی کا وہم ہے۔ صحیح روایت یونس کی ہے واللہ اعلم۔

تیسری صورت: حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ ذات الرقاع کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے اس طرح صلاۃ الخوف پڑھائی کہ ایک طائفہ آپؐ کے پیچھے کھڑا ہوا۔ اور دوسرا طائفہ دشمن کے مقابل کھڑا رہا۔ پہلے طائفہ کو ایک رکعت پڑھا کر آپ کھڑے رہے۔ اور لوگوں نے اپنی نماز پوری کی۔ پھر وہ دشمن کے سامنے چلے گئے۔ اور دوسرا طائفہ آپؐ کے پیچھے آ گیا۔ آپؐ نے ان کو اپنی نماز کی باقی رکعت پڑھائی۔ پھر آپ بیٹھے رہے۔ اور لوگوں نے اپنی نماز پوری کی، تو آپؐ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا ــــــ اس طرح صلاۃ الخوف اس صورت میں پڑھی جائے گی جب دشمن سامنے قبلہ کی جانب میں نہ ہو، اور دونوں گروہوں کو ایک ایک رکعت پڑھانے میں کسی تشویش کا بھی اندیشہ نہ ہو۔

فائدہ: یہ متفق علیہ روایت ہے۔ اور ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک یہی صورت بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں نماز میں چلنا نہیں پڑتا۔ مگر اس میں پہلا گروہ امام سے پہلے نماز سے فارغ ہو جاتا ہے جو امامت کے موضوع کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے: إنما جُعل الإمام لیؤتم به: امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

چوتھی صورت: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نجد کے علاقہ میں ہمارا دشمن سے مقابلہ ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے صلاۃ الخوف اس طرح پڑھائی: لوگوں کی دو جماعتیں کی گئیں۔ ایک جماعت آپؐ کے پیچھے کھڑی ہوئی۔ اور دوسری دشمن کے مقابلہ میں چلی گئی۔ پھر آپؐ نے پہلے طائفہ کے ساتھ نماز شروع کی۔ جب آپؐ پہلی رکعت سے فارغ ہوئے تو یہ جماعت دشمن کی طرف چلی گئی۔ اور وہ طائفہ آیا جو ابھی تک نماز میں شریک نہیں ہوا۔ آپؐ نے اس کو دوسری رکعت پڑھائی۔ اور سلام پھیر دیا۔ پھر ہر طائفہ نے اپنی اپنی نماز پوری کی۔ (پہلے طائفہ نے لاحق کی طرح اور دوسرے نے مسبوق کی طرح)

فائدہ: یہ روایت بھی متفق علیہ ہے۔ احناف کے نزدیک یہی صورت بہتر ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کے بیان سے اقرب ہے۔ اور قرآن میں افضل صورت ہی کو لیا جاتا ہے۔ نیز ابوداؤد میں حضرت ابن مسعودؓ سے بھی یہی طریقہ مروی ہے۔

پانچویں صورت: اگر خوف شدید ہو، اور احادیث میں مروی طریقوں پر صلاۃ الخوف پڑھنے کا موقع نہ ہو، تو پھر لوگ تنہا تنہا جس طرح بھی بن پڑے: کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے نماز پڑھیں خواہ قبلہ کی طرف منہ ہو یا نہ

ہو، اور گو رکوع وسجود اشارے ہی سے ممکن ہوں۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۹ میں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی صلاۃ الخوف ہی کی ایک صورت ہے۔

فائدہ: نماز کے درمیان بہت چلنا پڑے یا لڑنا پڑے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ پس جب گھمسان کا رن پڑے اور قتال جاری ہو تو نماز کو مؤخر کرے۔ غزوۂ خندق میں ایسی ہی صورت میں آپؐ نے اور صحابہ نے نمازیں قضا کی ہیں۔

خلاصہ: یہ ہے کہ خوف کی حالت میں نماز پڑھنے کی جو صورتیں ہیں سب پر عمل کرنا درست ہے۔ اور جیسا موقعہ ہو اور جس میں سہولت ہو، وہ صورت اختیار کرلی چاہئے۔

ومن الأعذار: الخوف: وقد صلّىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاةَ الخوف على أنحاء كثيرة:

منها: أن رتّب القومَ صفَّين، فصلّى بهم، فلما سَجَدَ، سَجَدَ معه صفٌّ سجدتَيْه، وحَرَسَ صفٌّ، فلما قاموا سجد من حَرَسَ، ولحقوه، وسجد معه في الثانية من حَرَسَ أولاً، وحرس الآخرون، فلما جلس، سجدمن حرس، وتشهّد بالصفين وسلَّم؛ والحالةُ التي تقتضي هذا النوعَ: أن يكون العدو في جهة القبلة.

ومنها: أن صلّى مرتين: كلَّ مرة بفرقة؛ والحالةُ التي تقتضي هذا النوعَ: أن يكون العدو في غيرها، وأن يكون توزيعُ الركعتين عليهم مشوِّشًا لهم، ولايُحيطوا بأجمعهم بكيفية الصلاة.

ومنها: أن وقفت فرقةٌ في وجهه، وصلّى بفرقة ركعة، فلما قام للثانية، فارَقَتْه، وأتمت، وذهبت وِجَاهَ العدو، وجاء الواقفون، فاقتدوا به، فصلى بهم الثانية، فلما جلس للتشهد قاموا، فأتموا ثانيتَهم، ولحقوه، وسلم بهم؛ والحالةُ المقتضيةُ لهذا النوع: أن يكون العدو في غير القبلة، ولايكون توزيعُ الركعتين عليهم مشوِّشًا لهم.

ومنها: أنه صلّى بطائفة منهم، وأقبلت طائفة على العدوّ، فركع بهم ركعةً، ثم انصرفوا بمكان الطائفة التي لم تصل، وجاء أولئك، فركع بهم ركعةً، ثم أتم هؤلاء وهؤلاء.

ومنها: أن يصلي كل واحد كيفما أمكن: راكبًا أو ماشيًا، لقبلة أو غيرها، رواه ابن عمر رضى الله عنهما؛ والحالةُ المقتضية لهذا النوع: أن يشتد الخوف، أويلتحم القتال.

وبالجملة: فكل نحوٍ رُوى عن النبى صلى الله عليه وسلم فهو جائز، ويفعل الإنسان ماهو أخف عليه، وأوفق بالمصلحة حالتئذ.

ترجمہ: اور اعذار میں سے خوف ہے: اور رسول اللہ ﷺ نے صلاۃ الخوف بہت طرح سے پڑھی ہے:

ان میں سے: یہ ہے کہ لوگوں کی دو صفیں بنائیں۔ پس ان کے ساتھ نماز شروع کی۔ پس جب آپؐ نے سجدہ کیا، تو آپؐ کے ساتھ دو سجدے کئے ایک صف نے، اور چوکیداری کرتی رہی دوسری صف۔ پھر جب آپؐ کھڑے ہوئے تو ان لوگوں نے سجدہ کیا جو چوکیداری کر رہے تھے۔ اور مل گئے وہ آپؐ کے ساتھ۔ اور سجدہ کیا آپؐ کے ساتھ دوسری رکعت میں ان لوگوں نے جنھوں نے پہلے چوکیداری کی تھی۔ اور چوکیداری کی دوسری نے۔ پس جب آپؐ قعدہ میں بیٹھے تو ان لوگوں نے سجدہ کیا جنھوں نے پہلے پاسبانی کی تھی۔ اور قعدہ کیا آپؐ نے دونوں صفوں کے ساتھ اور سلام پھیرا ——— اور وہ حالت جو اس نوعیت کی مقتضی ہے یہ ہے کہ دشمن قبلہ کی جانب میں ہو۔

اور ان میں سے: یہ ہے کہ آپؐ نے دو مرتبہ نماز پڑھی، ہر مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ ——— اور وہ حالت جو اس نوعیت کی مقتضی ہے یہ ہے کہ دشمن قبلہ کی جانب کے علاوہ میں ہو، اور یہ کہ دو رکعتوں کو لوگوں پر تقسیم کرنا ان کے لئے باعثِ تشویش ہو، اور وہ سارے ایک ساتھ احاطہ نہ کر سکتے ہوں نماز کی ترکیب کا۔

اور ان میں سے: یہ ہے کہ کھڑی ہوئی ایک جماعت دشمن کے مقابلہ میں۔ اور آپؐ نے ایک جماعت کو ایک رکعت پڑھائی۔ پس جب آپؐ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ جماعت آپؐ سے علحدہ ہوگئی۔ اور اس نے نماز پوری کرلی۔ اور دشمن کے مقابلہ میں چلی گئی۔ اور آئے کھڑے ہونے والے، پس اقتداء کی انھوں نے آپؐ کی۔ پس آپؐ نے ان کو دوسری رکعت پڑھائی۔ پس جب آپؐ قعدہ میں بیٹھے تو وہ کھڑے ہوئے۔ پس انھوں نے اپنی دوسری رکعت پوری کی۔ اور وہ آپؐ کے ساتھ مل گئے۔ اور آپؐ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا ——— اور وہ حالت جو اس نوعیت کی مقتضی ہے یہ ہے کہ دشمن قبلہ کے علاوہ جانب میں ہو۔ اور دو رکعتوں کو لوگوں پر تقسیم کرنا ان کو پراگندہ کرنے والا نہ ہو۔

اور ان میں سے: یہ ہے کہ آپؐ نے ان میں سے ایک جماعت کو نماز پڑھائی۔ اور دوسری جماعت دشمن کی طرف متوجہ رہی۔ پس پڑھائی آپؐ نے ان کو ایک رکعت۔ پھر پلٹ گئے وہ اس جماعت کی جگہ میں جس نے نماز نہیں پڑھی ہے۔ اور آئے وہ لوگ۔ پس آپؐ نے ان کو دوسری رکعت پڑھائی۔ پھر نماز پوری کی ان لوگوں نے اور اُن لوگوں نے۔

اور ان میں سے: یہ ہے کہ پڑھے ہر ایک جس طرح بھی ممکن ہو، خواہ سوار ہو کر یا چلتے ہوئے (ماشیاً سے قائماً مراد ہے، چلنے لڑائی کے لئے چلنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے) قبلہ کی طرف منہ ہو یا غیر قبلہ کی طرف۔ روایت کیا ہے اس کو ابن عمرؓ نے ——— اور وہ حالت جو اس نوعیت کو چاہنے والی ہے یہ ہے کہ خوف سخت ہو یا گھمسان کا رن پڑے۔

اور حاصل کلام: پس ہر وہ صورت جو نبی ﷺ سے روایت کی گئی ہے: وہ جائز ہے۔ اور ہر شخص کرے وہ جو اس پر آسان ہو اور اس وقت کی حالت سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔

☆ ☆ ☆

بیمار کی نماز کا بیان

بیمار کو قیام اور رکوع وسجود میں سہولت دینے کی حکمت

تیسرا شرعی عذر بیماری ہے۔ فرض اور واجب نمازوں میں قیام اور ہر نماز میں رکوع وسجود فرض ہیں۔ مگر شریعت نے بیمار کو یہ سہولت دی ہے کہ اگر وہ کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے۔ اور بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتا تو لیٹ کر پڑھے۔ خواہ کروٹ پر لیٹ کر پڑھے یا چت لیٹ کر۔ دونوں طرح درست ہے۔ اور رکوع وسجود نہیں کرسکتا تو اشارہ کرے۔ کیونکہ تکلیف یعنی حکم کا مکلف بنانا حسب استطاعت ہی ہوتا ہے۔ برداشت سے زیادہ حکم دینا شانِ رحیمی کے خلاف ہے۔ اس لئے بیمار کو یہ سہولتیں دی گئی ہیں۔ حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ رخصت ثابت ہے۔ حضرت عمران کو بواسیر کا عارضہ تھا۔ جب دورہ پڑتا تھا تو آپ بہت لاغر ہوجاتے تھے۔ آپ نے مسئلہ دریافت کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کھڑے ہوکر نماز پڑھو، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھو۔ اور اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کروٹ پر لیٹ کر پڑھو'' (مشکوۃ حدیث ۱۲۴۸) اور لیٹ کر نماز پڑھنے کی صورت میں رکوع وسجود اشارے ہی سے ادا ہوسکتے ہیں۔ پس اشارہ کا جواز بھی اس حدیث سے ثابت ہوا۔

قیام پر قدرت کے باوجود نفل نماز بیٹھ کر پڑھنے کی حکمت

قیام پر قدرت کے باوجود نفل نماز (اور سنن مؤکدہ بھی نوافل ہیں) بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔ البتہ ثواب آدھا ملے گا۔ حضرت عبداللہ بن عَمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے کسی نے یہ حدیث بیان کی کہ: **صلاۃُ الرجل قاعدًا نصفُ الصلاۃ** یعنی اگر قیام پر قادر شخص بیٹھ کر نفل نماز پڑھے تو ثواب آدھا ملے گا۔ پھر میں ایک دن آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ آپؐ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں نے سر پہ ہاتھ دَھر لیا (کہ الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟!) آپؐ نے پوچھا: ''کیا بات ہے؟'' میں نے واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں! (یعنی تمہیں حدیث صحیح پہنچی ہے) مگر میرا معاملہ آپ لوگوں سے مختلف ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۱۲۵۲) یعنی رسول اللہ ﷺ کو بیٹھ کر نوافل پڑھنے میں بھی پورا ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ آپؐ کے عمل میں تشریع کا پہلو بھی ہے۔ موطا (ص ۱۰۰) میں روایت ہے کہ: ''میں نماز میں بھلایا جاتا ہوں تاکہ میرے عمل سے احکام کی تعیین ہو''

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نوافل میں قیام فرض نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نوافل: فرائض کی طرح محدود نہیں ہیں۔ طبرانی کی روایت میں ہے کہ: ''نماز بہترین کام ہے، پس جو جس قدر زیادہ پڑھ سکتا ہو، پڑھے'' (مجمع الزوائد ۲: ۲۴۹)

اور نماز کی حقیقت: بندگی یعنی اخبات اور نیاز مندی کا اظہار ہے۔ اور یہ مقصد ہر طرح حاصل ہوسکتا ہے: خواہ کھڑے ہوکر نماز پڑھے یا بیٹھ کر۔ البتہ کھڑے ہوکر نماز پڑھنے میں نیاز مندی کا اظہار کامل طور پر ہوتا ہے۔ اور عربی کی مثل ہے: ما لایُدرك كلُّه، لایترك كلُّه اور اردو کی کہاوت ہے: بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سہی یعنی جو چیز ساری ہاتھ سے جارہی ہو اس کا کچھ حصہ ہاتھ آجائے تو بھی غنیمت ہے۔ اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کھڑے ہوکر نوافل پڑھنے کا موڈ نہیں ہوتا، مگر دل نماز پڑھنے کو چاہتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر بندگی کے ناقص اظہار پر اکتفا کرلیا جائے تو بالکل نماز نہ پڑھنے سے بہتر ہے، اس لئے رحمت الٰہی نے بیٹھ کر نفل نماز پڑھنے کی اجازت دیدی۔ البتہ یہ بات بھی واضح کردی کہ ثواب کم ہوجائے گا۔ کیونکہ بندگی کا ناقص اظہار: کامل اظہار کے برابر نہیں ہوسکتا۔ ثری ثریا کی برابری کب کرسکتا ہے!

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے اس مسئلہ کا جو متدل ذکر کیا ہے میں نے اس کو بدل دیا ہے۔ کیونکہ وہ روایت اس مسئلہ سے متعلق نہیں۔ شاہ صاحب نے روایت کا آخری حصہ چھوڑ دیا ہے، اس لئے وہ روایت بظاہر اس مسئلہ سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ پوری روایت اس طرح ہے: حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص بیٹھ کر نماز پڑھے تو کیسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جو کھڑے ہوکر پڑھے تو وہ افضل ہے۔ اور جو بیٹھ کر پڑھے تو اس کے لئے کھڑے ہوکر پڑھنے والے کے ثواب کا آدھا ہے۔ اور جو لیٹ کر پڑھے تو اس کے لئے بیٹھ کر پڑھنے والے کے ثواب کا آدھا ہے'' (بخاری حدیث ۱۱۱۵) اس روایت میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ نفل نماز کا مسئلہ دریافت کیا گیا تھا۔ پھر نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا تو جائز ہے، مگر لیٹ کر پڑھنا جائز نہیں۔

درحقیقت حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی دونوں روایتیں فرض نماز ہی سے متعلق ہیں۔ پہلی حدیث کا تعلق نماز کے جواز وعدم جواز سے ہے اور اس دوسری حدیث کا تعلق اجر وثواب سے ہے۔ یعنی جوازِ نماز میں مکلف کے گمان کا اعتبار ہے۔ اور اجر وثواب میں نفس الامری استطاعت کا اعتبار ہے۔ پس جو شخص گمان کرتا ہے کہ وہ کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر نماز ادا نہیں کرسکتا، وہ اگر بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھے گا تو نماز درست ہوجائے گی۔ لیکن اگر وہ نفس الامر میں کھڑے ہونے کی یا بیٹھنے کی استطاعت رکھتا ہے تو بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے سے ثواب کم ہوجائے گا۔ اکابر کے واقعات میں مروی ہے کہ ان کو بازو سے پکڑ کر نماز کے لئے کھڑا کیا جاتا تھا۔ اور وہ نماز کھڑے ہوکر ادا کرتے تھے۔ یہ اہتمام اسی کامل اجر وثواب کے لئے تھا۔ اور نصف سے بالکل آدھا مراد نہیں، بلکہ ''بہت کم'' مراد ہے۔ عربی میں نصف کا لفظ اس معنی میں بھی مستعمل ہے۔

طالب ومطلوب کی اور کیچ اور بارش میں نماز کی حکمت

طالب: وہ شخص ہے جو دشمن کا پیچھا کر رہا ہے۔ اور مطلوب: وہ شخص ہے جس کو پکڑنے کے لئے دشمن پیچھے چلا آرہا ہے۔ اور دونوں کو اندیشہ ہے کہ اگر سواری سے اتر کر نماز پڑھیں گے تو دشمن ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یا وہ پکڑا جائے گا اور

مارا جائے گا، ایسی صورت میں کیا ان کے لئے سواری پر اشارہ سے نماز پڑھنا جائز ہے؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جواز کی روایات آئی ہیں۔

بخاری شریف کتاب الخوف میں طالب ومطلوب کی نماز کا باب ہے۔ مگر اس سلسلہ میں کوئی مرفوع صریح روایت نہیں ہے۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے جس مرفوع حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس میں بہت تکلف ہے۔ البتہ صحابہ سے طالب ہونے کی حالت میں سواری پر نماز پڑھنا مروی ہے۔ پس مطلوب کے لئے بدرجۂ اَولی جائز ہوگا۔

اسی طرح بارش اور کیچ میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کا سواری پر اشارہ سے نماز پڑھنا ترمذی شریف (۱:۵۵) میں مروی ہے، گو روایت ضعیف ہے، مگر اس کے مقابل کوئی روایت نہیں۔ پس یہ بھی مجبوری کی حالت ہے۔ اور سواری پر نماز پڑھنا درست ہے۔ اور اگر سواری پر نہ ہو زمین پر ہو، اور کوئی سجدہ کی جگہ نہ ہو تو اشارہ سے سجدہ کرے اور نماز پڑھے۔

طلبِ سہولت کی درخواستیں اور ان کی قبولیت کا معیار

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جب بھی کسی نے شریعت کے ضوابط وحدود کے سلسلہ میں، کسی سخت مجبوری کی وجہ سے کوئی سہولت طلب کی ہے، اور آپؐ نے اس درخواست میں انکار یا ناقدری کا شائبہ نہیں پایا تو اس کو مان لیا ہے۔ انکار کے شائبہ کی مثال وہ روایت ہے جو ابوداؤد، کتاب الخراج باب ۲۰ میں ہے کہ جب وفد ثقیف خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا تو اس نے اسلام قبول کرنے کے لئے یہ شرط رکھی کہ وہ نماز نہیں پڑھیں گے۔ آپؐ نے اس درخواست کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ **لاخیر فی دینٍ لارکوع فیہ** یعنی جس دین میں رکوع (عاجزی) نہیں اس میں کوئی خیر نہیں یعنی جب مسلمان ہو کر نماز نہیں پڑھو گے تو مسلمان ہونے سے کیا فائدہ؟! اور ناقدری کے شائبہ کی مثال وہ روایت ہے جو مشکوۃ شریف باب الجماعۃ میں مسلم شریف سے مروی ہے کہ ایک نابینا صحابی نے عرض کیا کہ مجھے مسجد میں لے جانے والا کوئی نہیں۔ مجھے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپؐ نے اجازت دیدی۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر چلے تو آپؐ نے دریافت کیا: تم اذان سنتے ہو؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ آپؐ نے فرمایا: **فأجِب** یعنی اذان شروع ہوتے ہی آواز پر چلدو، ختم ہونے تک مسجد میں پہنچ جاؤ گے (مشکوۃ حدیث ۱۰۵۴ و ۱۰۷۸)

ایک جامع ارشاد جو رخصتوں کی بنیاد ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے چھوڑو جب تک میں تمھیں چھوڑوں (یعنی سوالات نہ کرو) اس لئے کہ تم سے پہلے والے اسی لئے ہلاک ہوئے کہ وہ اپنے انبیاء سے سوالات کرتے تھے اور ان کی مخالفت کرتے تھے۔ پس جب میں تم کو کسی چیز سے روکوں تو اس سے بچو۔ اور جب میں تم کو کسی چیز

کا حکم دوں تو اس میں سے بقدر استطاعت بجالاؤ'' (بخاری حدیث ۷۲۸۸ کتاب الاعتصام)

تشریح: یہ ایک جامع ارشاد ہے۔ اور شرعی رخصتوں کی بنیاد ہے۔ جن اوامر کی تعمیل میں اور نواہی سے اجتناب میں لوگوں کو سخت مجبوری پیش آتی ہے، شریعت ان میں سہولت دیتی ہے۔ فقہاء نے اسی قسم کی نصوص سے یہ ضابطہ بنایا ہے: الضروراتُ تُبیح المحظورات یعنی مجبوریاں: ممنوعات کو مباح کرتی ہیں۔

ومن الأعذار: المرض: وفيه قوله صلى الله عليه وسلم: " صل قائما، فإن لم تستطع فقاعدًا، فإن لم تستطع فعلى جنب" وقال صلى الله عليه وسلم فى النافلة: " من صلّى قائمًا فهو أفضل، ومن صلّى قاعدًا فله نصف أجر القائم"

أقول: لما كان من حق الصلاة أن يكثر منها، وأصلُ الصلاة يتأتّى قائما وقاعداً كما بينا، وإنما وجب القيامُ عند التشريع، وما لايُدرك كله لايترك كله، اقتضت الرحمة: أن يسوّغ لهم الصلاةُ النافلة قاعدًا، وبَيَّنَ لهم ما بين الدرجتين.

وقد وردت صلاةُ الطالب، وصلاةُ المطر والوحل، ولم يترخص أحد من الصحابة فى الضوابط والحدود، من ضرورة لايجد منها بدًّا، من غير شائبة الإنكار والتهاون، إلا وسلّمه النبى صلى الله عليه وسلم؛ وقوله صلى الله عليه وسلم: " فإذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم" كلمة جامعة، والله أعلم.

ترجمہ: اور اعذار میں سے بیماری ہے: اور اس میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:...... اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا:...... میں کہتا ہوں: جب نماز کے حق میں سے یہ بات تھی کہ اس سے زیادہ کیا جائے (یعنی نماز زیادہ سے زیادہ پڑھی جائے) اور نماز کی اصل حاصل ہوتی ہے کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر (یعنی نیاز مندی کا اظہار ہر طرح ہوسکتا ہے) جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اور واجب ہوا ہے کھڑا ہونا صرف قانون سازی کے ذریعہ (یعنی جب فرائض کی تشکیل کی گئی اور ان کے ارکان وشرائط طے کئے گئے تو کامل درجہ کی نیازمندی کے اظہار کے لئے قیام کو بھی فرض کیا گیا۔ ورنہ مطلق اخبات کا اظہار اس پر موقوف نہیں) اور جو چیز ساری حاصل نہ ہوسکتی ہو اس کے سارے کو چھوڑا بھی نہ جائے (بلکہ جتنا حصہ ہاتھ آجائے اس کو غنیمت تصور کیا جائے) تو اللہ کی مہربانی نے چاہا کہ لوگوں کے لئے نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا جائز قرار دیا جائے۔ اور نبی ﷺ نے فرق بیان کیا جو دو درجوں کے درمیان ہے۔

اور تحقیق آئی ہے طالب کی نماز اور بارش اور کیچڑ کی نماز۔ اور نہیں اجازت مانگی صحابہ میں سے کسی نے ضوابط وحدود میں، کسی ایسی ضرورت سے جس سے وہ کوئی چارہ نہیں پاتا، انکار اور بے قدری کے شائبہ کے بغیر، مگر مان لیا ہے اس کو

نبی ﷺ نے۔اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پس جب میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو بجالاؤ اس سے جتنا تمہارے بس میں ہو'' یہ ایک جامع ارشاد ہے۔باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

باب ــــــ ۱۵

جماعت کا بیان

باجماعت نماز کے پانچ فوائد

چند مصالح کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے بحکم الٰہی جماعت سے نماز ادا کرنے کا نظام بنایا۔اور متنوع ثواب بیان کرکے اس کی ترغیب دی۔اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں کوتاہی کرنے والوں کو سخت تنبیہ کی۔جماعت کے وہ فوائد درج ذیل ہیں:

پہلا فائدہ:ــــــ جماعت کے ساتھ نماز حجاب دنیا کو زائل کرتی ہے ـــــ مبحث چہارم کے باب ششم میں بیان کیا گیا ہے کہ تین حجابات: حجابِ نفس، حجابِ دنیا اور حجابِ جہالت: نیک بختی حاصل کرنے میں مانع بنتے ہیں۔پھر باب ہفتم میں ان حجابات کے ازالے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔حجابِ دنیا کے ازالہ کا ایک طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ کچھ عبادتوں کو رواج عام دیا جائے یعنی سب لوگوں کے لئے وہ عبادتیں ضروری قرار دی جائیں۔جیسے پانچ فرض نمازیں، رمضان کے روزے وغیرہ۔ان عبادتوں کی پابندی لوگوں پر لازم کی جائے۔خواہ لوگ رضامند ہوں یا نہ ہوں۔اور ان عبادتوں کے ترک پر ملامت کی جائے۔اور اگر کوئی ان طاعات کو فوت کردے تو بطور سزا اس کی مرغوبات سے اس کو محروم کردیا جائے (رحمۃ اللہ ۱:۵۷۲) اسی کو یہاں باجماعت نماز کا پہلا فائدہ بیان کیا ہے۔فرماتے ہیں:

رسم یعنی دنیا کی آفات سے حفاظت میں اس سے زیادہ کوئی چیز نافع نہیں کہ عبادت میں سے کسی عبادت کو رواج عام دیا جائے، جو ہر کہ ومہ کے سامنے ادا کی جائے۔اور سب شہری اور دیہاتی ادا کریں۔کوئی اس سے مستثنیٰ نہ ہو۔اور لوگ اس عبادت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔(کیونکہ فخر ومباہات انسان کا فطری جذبہ ہے۔اس کو ظہور کا کوئی مناسب موقع ملنا چاہئے۔ورنہ وہ غلط جگہ پر ظاہر ہوگا) اور اس عبادت کو اتنا عام کیا جائے کہ وہ ضروری معاشی امور کا درجہ حاصل کرلے۔جس طرح کھانا پینا اور سونا جاگنا زندگی کے ایسے لوازم ہیں کہ ان کے بغیر چارہ نہیں۔نہ لوگ ان سے بے اعتنائی برت سکتے ہیں۔اسی طرح اس عبادت کو لوگوں کی عادت ثانیہ بنادینا چاہئے۔تاکہ وہ دوسری

عبادتوں کا شوق پیدا کرے۔اور دنیا کے ہر معاملہ میں اور زندگی کے ہر موڑ پر دین کی طرف دعوت دے۔اور وہی دنیا: جس کے ضرر کا ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا تھا: لوگوں کو دین کی طرف بلانے والی بن جائے —— ایسی عبادت نماز ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ عظیم الشان اور قوی البرہان عبادت ہے۔ اس لئے اس کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا، تاکہ اس کی اشاعت عام ہو۔اس کے لئے لوگ جمع ہوں اور سب مل کر اس کو ادا کریں تاکہ غفلت کا پردہ چاک ہو۔

دوسرا فائدہ:—— باجماعت نماز ادا کرنے میں عوام کی مصلحت مضمر ہے —— جس طرح طلبہ تین طرح کے ہوتے ہیں: ۱- شوقین۔ انکو پڑھنے کے لئے کہنا نہیں پڑتا، بلکہ حد سے زیادہ پڑھنے سے روکنا پڑتا ہے ۲- بے شوق۔ ان کو بار بار علم کا شوق دلانا پڑتا ہے، تب وہ کچھ کرتے ہیں ۳- بدشوق۔ ان کے لئے تشویق کافی نہیں۔ ان کو مطالعہ اور تکرار کے لئے ایک ساتھ بٹھانا پڑتا ہے، اور ان کی نگرانی کرنی پڑتی ہے —— مگر ان تینوں قسموں کو الگ الگ کرنا مشکل ہے۔اس لئے مدارس میں سب طلبہ کو ایک ساتھ پڑھنے کے لئے بٹھایا جاتا ہے —— اسی طرح ملت میں بھی تین طرح کے لوگ ہیں: ۱- علماء۔ یہ تو مقتدی ہیں ۲- راہِ سلوک کے خواہش منداور نیکوکاری کے آرزومند۔ ان کو وعظ ونصیحت کے ذریعہ عبادتوں کا شوق دلانا کافی ہے۔ ۳- نیت اور جذبے کے کمزور لوگ۔ ان کو اگر لوگوں کے روبرو عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا جائے گا تو وہ سستی میں مبتلا ہو جائیں گے —— پس ملت کے حق میں اس سے زیادہ مفید، اور مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ کوئی بات نہیں کہ سب کو ایک ساتھ مل کر عبادت کرنے کا حکم دیا جائے۔ تاکہ نمازی اور بے نمازی کا پتہ چل جائے۔اور عبادت کا شوق رکھنے والے اور بدشوق جدا ہو جائیں۔اور جماعت میں جو علماء ہیں: ان کی پیروی کی جائے، اور لوگوں میں جو بے علم ہیں ان کو تعلیم دی جائے۔اور عبادت لوگوں میں سونے کی مثال بن جائے۔ جب اس کا کھرا کھوٹا جاننا ہوتا ہے تو وہ مختلف سناروں کو دکھایا جاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کونسا سونا کھرا ہے اور کونسا کھوٹا؟ کونسا اچھا ہے اور کونسا برا؟ اسی طرح جب سب مل کر ایک دوسرے کے سامنے عبادت کریں گے تو جو غلطی کرے گا، اس کو ٹوکا جائے گا۔اور جو معروف طریقہ پر عبادت کرے گا اس کو بنظر استحسان دیکھا جائے گا۔

تیسرا فائدہ:—— جماعت کی نماز پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں —— پہلے مضمون کو قریب الفہم بنانے کے لئے ایک مثال عرض ہے: ایک طالب علم اپنی ضرورت لیکر مہتمم صاحب کے پاس جاتا ہے۔اور عاجزی سے عرض گذارتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طلبہ کا ایک بڑا وفد اپنی ضرورت لے کر جاتا ہے اور نیازمندی سے عرض کرتا ہے۔ پہلی صورت میں درخواست ایک آدمی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔اور وہ درخواست قبول بھی ہو سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی ہے۔اور دوسری صورت میں وہ ایک عمومی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔اور جب بہت سے چہرے ایک ساتھ نیازمندانہ عرض کرتے ہیں تو مہتمم کا جذبۂ ترحم جوش مارتا ہے اور وہ ان کی درخواست قبول کر لیتا ہے اسی طرح بلا تشبیہ مسلمانوں کا ایک ساتھ جمع ہونا، اس حال میں کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف راغب ہوں، اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں، اللہ تعالیٰ سے خائف

ہوں، سب اللہ تعالیٰ کی طرف اپنا رُخ جھکانے والے ہوں: عجیب تاثیر رکھتا ہے۔ اس حال میں نزولِ برکات اور فیضانِ رحمت میں دیر نہیں لگتی۔ جیسا کہ یہ مضمون نماز استسقاء کے بیان میں گذر چکا ہے اور حج کے بیان میں آئے گا۔

چوتھا فائدہ: —— باجماعت نماز ادا کرنے سے دین کا بول بالا ہوتا ہے —— امتِ مسلمہ کو منصۂ شہود پر اس لئے جلوہ گر کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ اسلام کا بول بالا ہو یعنی زمین میں کوئی دین اسلام سے اعلیٰ نہ رہے۔ اسلام تمام ادیان پر غالب آجائے۔ جیسا کہ سورۃ الصف آیت ۹ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا، تاکہ وہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دے، گو مشرکین کیسے ہی ناخوش ہوں'' اور غلبۂ اسلام کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اعمالِ اسلام کا عام مظاہرہ ہو۔ اور یہ بات اسی وقت متصور ہے جبکہ مسلمانوں کے عوام وخواص، شہری اور دیہاتی، چھوٹے اور بڑے ایک ساتھ اکٹھا ہوں۔ اور مل کر وہ عبادت بجالائیں جو اللہ کے دین کا سب سے بڑا شعار ہے۔ اور جو اللہ کی بندگی کا مشہور ترین طریقہ ہے۔

پانچواں فائدہ: —— باجماعت نماز کے ذریعہ گاڑی کا ہر سوار منزل پر پہنچ جاتا ہے —— باجماعت نماز کا ایک عجیب فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر مقتدی نماز میں کچھ بھی نہ پڑھے۔ صرف نیت کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر آخر تک ارکان میں امام کے ساتھ شریک رہے، تو بھی اس کی نماز ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اقوال میں سے نماز میں صرف قراءت فرض ہے۔ اور وہ امام کے ذمہ ہے۔ باقی تکبیرات، تسبیحات اور ادعیہ وغیرہ یا تو مستحب ہیں یا سنت یا واجب، جن کے ترک سے بھی نماز ہو جاتی ہے (یہ فائدہ شارح نے بڑھایا ہے)

﴿ الجماعة ﴾

اعلم: أنه لاشيئَ أنفعُ من غائلة الرسوم من أن يُجعل شيئٌ من الطاعات رسمًا فاشيًا، يؤدَّى على رء وس الخاملِ والنبيهِ، ويستوى فيه الحاضِرُ والبادِ، ويجرى فيه التفاخر والتباهى، حتى تدخل فى الارتفاقات الضرورية، التى لايمكن لهم أن يتركوها، ولا أن يُهملوها، لتصير مؤيِّدَةً لعبادة الله، والْسِنَةً تدعو إلى الحق، ويكون الذى يُخاف منه الضررُ: هو الذى يَجْلِبُهم إلى الحق، ولاشيئَ من الطاعات أتمُّ شأنًا، ولا أعظمُ برهانا: من الصلاة، فوجب إشاعتُها فيما بينهم، والاجتماعُ لها، وموافقةُ الناس فيها.

وأيضًا: فالملّة تجمع: ناسًا علماءَ يُقتدى بهم، وناسًا يحتاجون فى تحصيل إحسانهم إلى دعوة حثيثةٍ، وناسًا ضعفاءَ النيّةِ، لو لم يكلّفوا أن يؤدّوا على أعين الناس تهاونوا فيها، فلا أنفع ولا أوفق بالمصلحة فى حق هؤلاء جميعًا: أن يُكَلَّفوا أن يُطيعوا الله على أعين الناس، ليتميز فاعلُها من

تاركها، وراغبُها من الزاهد فيها، ويُقتدى بعالمها، ويُعلّم جاهلُها، وتكونُ طاعةُ الله فيهم كسبيكة تُعرض على طوائف الناس، يُنكر منها المنكرُ، ويُعرف منها المعروفُ، ويُرى غشُّها وخالصُها.

وأيضًا: فلاجتماع المسلمين ـــــ راغبين في الله، راجين راهبين منه، مُسْلِمين وجوهَهم إليه ـــــ خاصيةٌ عجيبةٌ في نزول البركات وتَدلِّي الرحمة، كما بينا في الاستسقاء والحج.

وأيضًا: فمرادُ الله من نصب هذه الأمة: أن تكون كلمة الله هي العلياء، وأن لايكون في الأرض دينٌ أعلى من الإسلام، ولايتصورُ ذلك إلا بأن تكون سُنَّتُهم أن يجتمع خاصتُهم وعامتهم، وحاضرهم وباديهم، وصغيرهم وكبيرهم، لما هو أعظم شعائره، وأشهر طاعاته.

فلهذه المعاني انصرفت العناية التشريعية إلى شرع الجمعة والجماعات، والترغيبِ فيها، وتغليظ النهي عن تركها.

ترجمہ: جماعت کا بیان: جان لیں کہ نہیں ہے کوئی چیز زیادہ مفید رسوم کی خرابی میں اس سے کہ بنائی جائے عبادتوں میں سے کسی چیز کو عام ریت۔ جو ادا کی جائے گمنام اور مشہور کے سامنے۔ اور جس میں برابر ہوں شہری اور دیہاتی۔ اور چلے اس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور باہم بڑائی جتانا۔ تا آنکہ داخل ہو جائے وہ عبادت ان ضروری معاشی تدبیروں میں، جو کہ ممکن نہیں لوگوں کے لئے کہ وہ ان معاشی تدبیروں کو چھوڑیں۔ اور نہ یہ کہ وہ ان کو رائگاں کریں۔ تاکہ بن جائے وہ عبادت تقویت پہنچانے والی اللہ کی بندگی کو۔ اور بن جائے وہ زبانیں جو بلائے دینِ حق کی طرف۔ اور ہو جائے وہ چیز جس کے ضرر سے ڈرا جاتا ہے: وہی وہ جو ان کو کھینچے دینِ حق کی طرف۔ اور نہیں ہے عبادت میں سے کوئی چیز زیادہ تام شان کے اعتبار سے اور زیادہ بڑی دلیل کے اعتبار سے: نماز سے۔ پس ضروری ہوا اس کا پھیلانا لوگوں کے درمیان۔ اور اس کے لئے لوگوں کا اکٹھا ہونا۔ اور اس میں لوگوں کا ایک دوسرے کی موافقت کرنا۔

اور نیز: پس ملت جمع کرتی ہے: علماء کو جن کی پیروی کی جاتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو جو محتاج ہیں اپنے احسان (نیکوکاری) میں اُکسانے والی دعوت کے۔ اور ایسے لوگوں کو جو کمزور نیت والے ہیں: اگر نہ حکم دیئے جائیں وہ کہ ادا کریں وہ لوگوں کے سامنے تو سستی کریں گے وہ اس عبادت میں۔ پس نہیں ہے کوئی چیز زیادہ مفید، اور نہ مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ اُن سب لوگوں کے حق میں: اس بات سے کہ مکلّف کئے جائیں وہ کہ عبادت کریں وہ اللہ کی لوگوں کی نگاہوں کے سامنے۔ تاکہ جدا ہو جائے اس کا کرنے والا، اس کے چھوڑنے والے سے۔ اور اس میں رغبت کرنے والا، اس میں بے رغبتی کرنے والے سے۔ اور پیروی کی جائے اس عبادت کو جاننے والے کی۔ اور تعلیم دیا جائے اس عبادت کا نہ جاننے والا۔ اور ہو جائے اللہ کی اطاعت لوگوں میں اس سونے چاندی کے ٹکڑے کی طرح جو مختلف لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے: اس میں سے انجانے کا انکار کیا جائے۔ اور اس میں سے جانے ہوئے کو پہچانا جائے۔ اور اس

کا کھوٹ والا اور اس کا خالص دیکھا جائے۔

اور نیز: پس مسلمانوں کے اکٹھا ہونے کے لئے ——— درانحالیکہ وہ رغبت کرنے والے ہوں اللہ میں، اور امید رکھنے والے اور ڈرنے والے ہوں اس سے، سپرد کرنے والے ہوں اپنے چہروں کو اس کی طرف ——— عجیب خاصیت ہے برکات کے نزول میں اور رحمت کے اترنے میں۔ جیسا کہ ہم نے استسقاء اور حج میں بیان کیا ہے۔

اور نیز: پس اللہ تعالیٰ کا مقصد اس امت کو کھڑا کرنے سے: یہ ہے کہ اللہ ہی کا بول بالا ہو۔ اور یہ کہ نہ ہو زمین میں کوئی دین اسلام سے اعلی۔ اور نہیں متصور ہے یہ بات مگر بایں طور کہ ہو مسلمانوں کا طریقہ کہ اکٹھا ہوں ان کے خواص اور عوام، اور ان کے شہری اور دیہاتی، اور ان کے چھوٹے اور بڑے: اس بات کے لئے جو کہ وہ اللہ کے دین کے شعائر میں سے سب سے بڑا شعار ہے۔ اور اس کی عبادتوں میں سے سب سے زیادہ مشہور عبادت ہے۔

پس انہی باتوں کی وجہ سے عنایتِ تشریعیہ متوجہ ہوئی جمعہ اور جماعتوں کو مقرر کرنے کی طرف، اور ان کی ترغیب دینے کی طرف، اور ان کے چھوڑنے کی سخت ممانعت کرنے کی طرف۔

لغات: الغائلة: شر، آفت، برائی، مصیبت جمع غوائل ...... الخامل: گمنام ...... النبیه: سمجھدار، شہرت والا ...... تَباهَی القومُ: تفاخروا ...... حثیثة: برانگیختہ کرنے والی، ابھارنے والی ...... السبیکة من الذهب أو الفضة: کتلة من الذهب أو الفضة ...... تَدَلّٰی: نزل عن عُلْو ...... عنایتِ تشریعیہ: اللہ کی وہ صفتِ رحمت جو نزول شرائع کا باعث بنی۔

تصحیح: مؤیدة اصل میں مؤیدًا تھا اور ضعفاء النیة اصل میں ضعفاء البنية تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆　☆　☆

فضیلتِ جماعت کی وجہ

نماز کو جو اسلام کی سب سے بڑی عبادت ہے، عام طور پر رائج کرنے کے دو طریقے ہیں: محلہ کی حد تک رائج کرنا اور پورے شہر میں رائج کرنا۔ محلہ میں رواج دینا ہر نماز کے وقت میں آسان ہے۔ اور پورے شہر میں رائج کرنا وقفہ وقفہ ہی سے ممکن ہے، ہر نماز میں سارے شہر کو مجتمع نہیں کیا جاسکتا۔ پہلا طریقہ ہر نماز کو باجماعت ادا کرنا ہے۔ اسی کا بیان اس باب میں ہے۔ اور دوسرا طریقہ: ہفتہ میں ایک بار شہر کا مجتمع ہو کر ایک ساتھ نماز ادا کرنا ہے۔ یہ جمعہ کی نماز ہے جس کا بیان آئندہ باب میں آرہا ہے۔

اور جماعت کی نماز کی فضیلت میں دو حدیثیں آئی ہیں: (۱) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: ''باجماعت نماز تنہا آدمی کی نماز سے ستائیس گنا بڑھ جاتی ہے'' (۲) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''پچیس گنا'' ہے۔ اور دونوں روایتیں متفق علیہ ہیں۔ اور تفضیل کی وجہ خود رسول اللہ ﷺ نے صراحۃً یا اشارۃً بیان

فرمائی ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنے والے کو علاوہ نماز کے چند دیگر فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔جس کی وجہ سے نماز کا اجر بڑھ جاتا ہے۔اور وہ فوائد یہ ہیں:(۱) جب آدمی وضو کرتا ہے تو عمدہ وضو کرتا ہے، کیونکہ اس کو لوگوں کے بیچ میں جانا ہے،اس لئے وہ طہارت،لباس،زینت وغیرہ کا خیال رکھتا ہے۔تنہا نماز ادا کرنے والا ان سب باتوں کا اہتمام نہیں کرتا (۲) پھر مسجد کی طرف نماز ہی کے ارادے سے چلتا ہے تو اس کا یہ چلنا بھی نماز قرار پاتا ہے۔اور ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے۔اور اس کی ایک خطا مٹائی جاتی ہے (۳) نماز کے بعد اجتماعی دعا ہوتی ہے۔اور ہر نمازی سب کے لئے دعا کرتا ہے (۴) اور جو مسجد میں جلدی پہنچ جاتا ہے اس کو نماز کے انتظار کا ثواب ملتا ہے۔ایک صحیح حدیث میں نماز کے لئے انتظار کرنے کو سرحد کا پہرہ دینا قرار دیا گیا ہے (۵) اور اگر وہ مسجد میں پہنچ کر اعتکاف کی نیت کر لیتا ہے،تو اس کو اعتکاف کا ثواب بھی ملتا ہے۔اس کے علاوہ دیگر فوائد بھی ہیں جو جماعت سے نماز پڑھنے والے کو حاصل ہوتے ہیں۔ یہ تمام ثواب تنہا نماز پڑھنے والے کو نصیب نہیں ہوتے۔اس لئے اس کا اجر بڑھ جاتا ہے۔

اور پچیس اور ستائیس کا عدد بس اٹکل پچو نہیں ہے۔دین حق میں،جس میں نہ سامنے سے باطل آسکتا ہے، نہ پیچھے سے۔کسی طرح سے بھی اٹکل کی گنجائش نہیں۔ بلکہ اس میں ایک بلیغ نکتہ ہے جو آنحضرت ﷺ پر منکشف ہوا ہے۔ جس کو ہم نے مبحث ششم کے باب نہم (رحمۃ اللہ الواسعہ ۲:۲۰۵) میں بیان کیا ہے،پس اس کو دیکھ لیں۔

فائدہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو مذکورہ بالا مرجّحات (وجوہِ فضیلت) بیان کئے گئے ہیں۔ وہ درحقیقت صراحت ہیں۔مگر عام طور پر ان کو اسبابِ فضیلت کا بیان نہیں سمجھا گیا۔اس لئے شاہ صاحب نے ارشاد کا لفظ بھی استعمال کیا ہے یعنی شاید یہ مضمون اشارہ میں بیان کیا گیا ہے۔اس لئے سب حضرات اس کا ادراک نہیں کر سکے۔

والإشاعة: إشاعتان: إشاعةٌ في الحيِّ، وإشاعة في المدينة: والإشاعة في الحيِّ تتيسر في وقت كل صلاة، والإشاعة في المدينة لاتتيسر إلا غِبَّ طائفةٍ من الزمان، كالأسبوع.

أما الأولى: فهي الجماعة، وفيها قولُه صلى الله عليه وسلم:" صلاةُ الجماعةِ تفضُلُ صلاةَ الفذِّ بسبع وعشرين درجةً" وفي رواية:" بخمس وعشرين درجة" وقد صَرَّح النبيُّ صلى الله عليه وسلم، أو لَوَّحَ: أن من المرجِّحات: أنه إذا توضأ فأحسن وضوءه، ثم توجَّه إلى المسجد، لايُنْهِضُه إلا الصلاةُ، كان مشيه في حكم الصلاة، وخطواتُه مكفرات لذنوبه، وأن دعوةَ المسلمين تُحيط بهم من ورائهم، وأن في انتظار الصلوات معنى الرِّباط والاعتكاف إلى غير ذلك.

ثم مانَوَّهَ بأحد العددين المذكورين إلا لنكتة بليغة، تمثَّلت عنده صلى الله عليه وسلم، وقد ذكرناها من قبلُ، فراجع، وليس في الحق الذي لايأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه جُزَافٌ بوجهٍ من الوجوه.

ترجمہ: اور اشاعت (پھیلانا، رواج دینا) دو اشاعتیں ہیں: محلہ میں اشاعت، اور شہر میں اشاعت۔ اور محلہ میں اشاعت آسان ہے ہر نماز کے وقت میں۔ اور شہر میں اشاعت آسان نہیں مگر زمانہ کے ایک حصہ کے بعد، جیسے ہفتہ ——— رہی پہلی اشاعت: تو وہ جماعت ہے۔ اور اس میں...... اور تحقیق صراحت کی ہے نبی ﷺ نے یا اشارہ کیا ہے کہ ترجیح دینے والی چیزوں میں سے یہ ہے کہ جب اس نے وضو کیا، پس بہترین کیا اس نے اپنا وضوء۔ پھر وہ مسجد کی طرف متوجہ ہوا، نہیں کھڑا کیا اس کو مگر نماز نے تو ہوگا اس کا چلنا نماز کے حکم میں۔ اور اس کے اقدام مٹانے والے ہوں گے اس کے گناہوں کو۔ اور یہ کہ (یہ شاہ صاحب نے مرجحات میں دیگر روایات کی بنیاد پر اضافہ کیا ہے) مسلمانوں کی دعائیں ان کو گھیرتی ہیں ان کے پیچھے سے، اور یہ کہ نمازوں کے انتظار میں رباط (سرحد کا پہرہ دینے) اور اعتکاف وغیرہ کے معنی ہیں۔

پھر نہیں شان بلند کی مذکورہ دو عددوں میں سے ایک کی (یعنی صرف اسی عدد کا تذکرہ نہیں کیا) مگر ایک بلیغ (فصیح، برمحل) نکتہ کی وجہ سے، جو متصور ہوا ہے آنحضرت ﷺ کے لئے۔ اور تحقیق ذکر کیا ہے ہم نے اس کو قبل ازیں، پس اس کو دیکھ لیں۔ اور نہیں ہے اس دین حق میں، جس میں نہ سامنے سے باطل آتا ہے اور نہ پیچھے سے: کوئی اٹکل شکلوں میں سے کسی شکل میں۔

☆ ☆ ☆

مل کر نماز نہ پڑھنے والوں پر شیطان کا قبضہ

حدیث ——— حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی بستی میں یا بادیہ (وہ جنگل جہاں عارضی طور پر قیام کیا گیا ہو) میں تین آدمی ہوں، اور وہ باجماعت نماز نہ پڑھیں، تو ان پر یقیناً شیطان قابو پالے گا۔ لہٰذا تم جماعت کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کرلو، کیونکہ بھیڑیا اسی بھیڑ کو لقمہ بناتا ہے جو گلہ سے دور ہوجاتی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۰۶۷)

تشریح: اس حدیث میں جماعت سے نماز پڑھنے کا یہ فائدہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے نماز پابندی سے ادا ہوتی ہے۔ جو شخص جماعت کا اہتمام نہیں کرتا، شیطان آسانی سے اس کو شکار کرلیتا ہے۔ جیسے ریوڑ سے دور افتادہ بکری کو بھیڑیا دبوچ لیتا ہے ——— علاوہ ازیں اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ترکِ جماعت تہاون کا دروازہ کھولتا ہے یعنی اس کی نظر میں جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم ہیچ ہوتا ہے۔ اور جب احکام شرعیہ کو حقیر سمجھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تو پھر اس کی دینداری کا خدا حافظ!

جماعت سے پیچھے رہنے والوں کے لئے سخت وعید

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! البتہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے قصد کیا تھا کہ میں سوختہ جمع کرنے کا حکم دوں۔ پس وہ جمع

کیا جائے۔ پھر میں نماز کا حکم دوں، پس اس کے لئے اذان کہی جائے۔ پھر میں ایک آدمی کو حکم دوں جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ پھر میں ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے۔ پس میں ان کو ان کے گھروں میں جلا دوں (مگر پھر آپؐ کو عورتوں اور بچوں کا خیال آیا تو آپؐ نے اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہیں پہنایا) (مشکوٰۃ حدیث ۱۰۵۳)

تشریح: اللہ اکبر! کتنی سخت وعید ہے۔ اور ابن ماجہ کی روایت میں تو انتہائی درجہ جلال اور غصہ کا اظہار ہے۔ ارشاد فرمایا: ''لوگوں کو جماعت ترک کرنے سے باز آ جانا چاہئے۔ ورنہ میں اُن کے گھروں میں آگ لگوا دوں گا!'' (حدیث ۷۹۵) اس قسم کی احادیث سے امام احمد وغیرہ نے جماعت کو فرض قرار دیا ہے۔ اور علامہ ابن الہمام نے واجب کہا ہے یعنی جس طرح نماز پڑھنا فرض ہے اُسی طرح اس کو جماعت سے پڑھنا بھی ایک مستقل فرض یا واجب ہے۔ مگر جمہور کی رائے وہ ہے جو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے:

جماعت سنتِ مؤکدہ ہے یعنی فرض یا واجب نہیں ہے۔ مگر چونکہ وہ شعائرِ اسلام میں سے ہے اس لئے اس کے ترک کرنے والے کو سخت سرزنش کی جا سکتی ہے اور مذکورہ حدیث میں تہدید ہے۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ کچھ لوگ جماعت سے پیچھے رہتے ہیں۔ اور دیر سے آتے ہیں اور اس کا سبب کوئی معذوری نہیں: بلکہ عزیمت اور جذبہ کی کمی ہے، اس لئے آپؐ نے ان پر سخت نکیر کی۔ اور دل دہلانے والا ارشاد فرمایا۔

وفيها:

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " ما من ثلاثة، في قرية أو بَدْوٍ، لاتقام فيهم الصلاةُ، إلا قد اسْتَحْوَذَ عليهم الشيطان"

أقول: هو إشارة إلى أن تركها يفتح بابَ التهاون.

[۲] وقوله صلى الله عليه وسلم: " والذي نفسي بيده! لقد هَمَمْتُ أن آمُرَ بحطب فَيُحتطب" الحديث.

أقول: الجماعة سنة مؤكدة، تُقام اللائمةُ على تركها، لأنها من شعائر الدين، لكنه صلى الله عليه وسلم رأى من بعض من هنالك تأخُّرا واستبطاءً، وعَرف أن سببَه ضُعف النية في الإسلام، فشدَّد النكير عليهم، وأخاف قلوبهم.

ترجمہ: اور جماعت کے سلسلہ میں: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:...... میں کہتا ہوں: یہ ارشاد اس طرف اشارہ ہے کہ ترکِ جماعت ہیچ سمجھنے کا دروازہ کھولتا ہے (۲) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:...... میں کہتا ہوں: جماعت سنتِ مؤکدہ ہے۔ ملامت برپا کی جائے ترک جماعت پر (یعنی اس کو سخت سرزنش کی جائے) اس لئے کہ

جماعت دین کی امتیازی باتوں میں سے ہے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے دیکھا بعض اُن لوگوں سے جو وہاں ہیں (یعنی اپنے دور کے بعض لوگوں سے اور بعض مضاف ہے مَن کی طرف) پیچھے رہنے کو اور دیر سے آنے کو، اور جانا کہ اس کا سبب اعمالِ اسلام میں جذبے کی کمزوری ہے تو سخت نکیر کی ان پر اور ڈرایا ان کے دلوں کو۔

☆ ☆ ☆

ترکِ جماعت کے چار اعذار

کمزور اور بیمار اور حاجت مند کے لئے جماعت میں حاضر ہونے میں پریشانی ہے، اس لئے حکمت کا تقاضا ہوا کہ اعذار کی صورت میں ترکِ جماعت کی اجازت دی جائے، تاکہ افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کی راہ ہموار ہوجائے، جس میں نہ شریعت کی حق تلفی ہو، نہ بندوں کی۔ وہ اعذار یہ ہیں:

پہلا عذر: سخت سرد اور برساتی رات ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب سردی اور بارش والی رات ہوتی تو اپنے مؤذن کو حکم دیتے کہ وہ اعلان کرے کہ لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۰۵۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک بارش والے جمعہ کے دن میں مؤذن کو ہدایت دی تھی کہ شہادتین کے بعد **حی علی الصلاۃ** نہ کہے بلکہ اس کی جگہ **ألا صلوا فی الرحال** کہے (جامع الاصول حدیث ۳۹۵۵)

اور اس میں راز یہ ہے کہ جب اچانک رات میں سخت سردی یا بارش شروع ہوجاتی ہے تو لوگوں کے پاس بچاؤ کا سامان نہیں ہوتا۔ اس لئے ایسی حالت میں ان کے لئے جماعت میں حاضر ہونا پریشانی کا باعث ہے۔ اس لئے ان کو سہولت دی گئی۔

دوسرا عذر: کوئی ایسی صورت پیش آئے کہ جماعت میں شرکت مشکل ہو، جیسے:

۱ ــــ روزہ دار کے سامنے شام کا کھانا آگیا۔ بھوک کڑاکے کی لگ رہی ہے۔ دل کھانے کی طرف بے حد مائل ہے تو پہلے بھوک کا بھوت مار لے۔ کیونکہ اس حالت میں اگر جماعت میں شریک ہوگا تو دھیان کھانے کی طرف لگا رہے گا۔ اور پہلے کھائے گا تو کھاتے وقت دھیان نماز کی طرف لگا رہے گا۔ اور نماز کو کھانا بنانے سے بہتر ہے کہ کھانے کو نماز بنالے۔

۲ ــــ کوئی ایسا کھانا اچانک سامنے آگیا جو نماز سے فارغ ہونے تک برباد ہوجائے گا، تو پہلے کھانے سے نمٹ لے تاکہ مال کا نقصان نہ ہو، مگر اس کی صورت نادر ہے۔

۳ ــــ چھوٹے یا بڑے استنجاء کا تقاضا ہو تو حدیث میں حکم ہے کہ پہلے قضائے حاجت کرلے۔ کیونکہ اس حالت میں نماز پڑھنے سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ دھیان دوسری طرف لگا رہے گا۔ اور پریشانی خدی! ہر وقت پیشاب نکل جانے کا اور استنجاء خطا ہونے کا دھڑکا لگا رہے گا۔

دو متعارض حدیثیں: مسلم شریف میں روایت ہے کہ: ''کوئی نماز نہیں کسی کھانے کے سامنے آجانے پر، اور نہ اس حال میں کہ دو نہایت گندی چیزیں (پیشاب اور پاخانہ) مزاحمت کر رہی ہوں'' اور ابو داؤد کتاب الاطعمہ میں روایت (نمبر ۳۷۵۸) ہے کہ: ''نماز مؤخر نہ کرو کسی کھانے کی وجہ سے، نہ کسی اور وجہ سے'' ان دونوں روایتوں میں تعارض ہے، اس کا کیا حل ہے؟

جواب: اس کا حل یہ ہے کہ پہلی حدیث صحیح ہے اور دوسری نہایت ضعیف۔ اس کا ایک راوی محمد بن میمون زعفرانی نہایت ضعیف ہے۔ امام بخاری اور امام نسائی نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے۔ اور تعارض کے لئے شرط یہ ہے کہ دونوں حدیثیں ایک درجہ کی ہوں۔ مگر شاہ صاحب تطبیق کی صورت بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔ تطبیق ممکن ہے۔ اور تطبیق کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: یہ ہے کہ پہلی حدیث میں نماز کی ممانعت تعمق کا دروازہ بند کرنے کے لئے ہے اور دوسری حدیث میں تاخیر کی ممانعت اس شخص کے لئے ہے جو تعمق کے شر سے محفوظ ہو۔ جیسے احادیث میں جلدی افطار کرنے کی تاکید آئی ہے، مگر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روزہ کھولنے میں تھوڑی دیر کرتے تھے۔ کیونکہ افطار میں جلدی کرنے کا حکم تعمق کا دروازہ بند کرنے کے لئے ہے اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اس اندیشہ سے مامون تھے۔ اس لئے آپ تھوڑی تاخیر کرتے تھے۔

دوسری صورت: تاخیر کا جواز اس صورت میں ہے کہ نفس کھانے کی طرف مائل ہو یا کھانا بگڑ جانے کا اندیشہ ہو، اور تاخیر نہ کرنے کا حکم اس وقت ہے جبکہ یہ دونوں باتیں نہ ہوں۔ اور یہ تطبیق علت کی حالت کے پیش نظر ہے کہ تاخیر کیوں کر رہا ہے: خواہ مخواہ یا کوئی معقول وجہ ہے؟ اگر معقول وجہ ہے تو جائز ہے، ورنہ ناجائز۔

تیسرا عذر: فتنہ کا اندیشہ ہے مسلم شریف میں روایت ہے کہ: ''جس عورت نے خوشبو کی دھونی لے رکھی ہو، وہ ہمارے ساتھ عشا کی نماز پڑھنے نہ آئے'' اور آپ نے عورتوں کو عام ہدایت دے رکھی تھی کہ: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو خوشبو نہ لگائے'' (مشکوۃ حدیث ۱۰۶۰ و ۱۰۶۱)

دو باتوں میں تعارض: متفق علیہ روایت ہے کہ: ''جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد میں آنے کی اجازت چاہے تو وہ اس کو منع نہ کرے'' (مشکوۃ ۱۰۵۹) اور جمہور صحابہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عورتوں کو مسجد سے روکا جائے۔ ان دونوں باتوں میں تعارض ہے۔ پس اس کا کیا حل ہے؟

جواب: ان دو باتوں میں بھی کوئی تعارض نہیں۔ ممنوع: غیر شرعی غیرت کی بنا پر روکنا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''دو غیرتیں ہیں: ایک اللہ کو پسند ہے اور دوسری ناپسند۔ وہ غیرت جس کی بنیاد کوئی شک کی بات ہو، وہ اللہ کو پسند ہے۔ اور وہ غیرت جو بے بنیاد ہو وہ اللہ کو ناپسند ہے'' (مجمع الزوائد ۱۰: ۱۵۱) اور صحابہ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ خوفِ فتنہ کی وجہ سے کیا ہے۔ متفق علیہ روایت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: لو أدرك النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم ما

احدث النساءُ، لمنعهن المسجد كما مُنعت نساءُ بنی إسرائیل (بخاری کتاب الاذان حدیث ۸۶۹) یعنی اگر نبی ﷺ کے سامنے یہ صورتِ حال آتی جواب عورتوں نے نئی پیدا کی ہے تو آپؐ ان کو ضرور مسجد میں آنے سے روک دیتے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا۔

چوتھا عذر: خوف ہے جیسے کرفیو لگ رہا ہے یا بیمار ہے۔ اوران دونوں کا معاملہ ظاہر ہے۔ یعنی ان کے لئے نہ کسی دلیل کی حاجت ہے نہ وجہ بیان کرنے کی۔ دونوں باتیں ظاہر ہیں۔

ایک حدیث کا مطلب: ایک نابینا صحابی نے گھر نماز پڑھنے کی اجازت طلب کی، اور یہ عذر پیش کیا کہ ان کو مسجد تک لے جانے والا کوئی نہیں آپؐ نے پہلے اجازت دیدی۔ پھر دریافت فرمایا کہ تمہارے گھر تک اذان کی آواز پہنچتی ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''پس لبیک کہو'' اور دوسری روایت میں ہے: فَـحَيَّـهَـلا: پس فوراً آجاؤ یعنی آپؐ نے دی ہوئی اجازت واپس لے لی۔ آپؐ نے ان سے سوال یہ بات جاننے کے لئے کیا تھا کہ آیا وہ واقعی معذور ہیں یا نہیں؟ ان کے جواب سے معلوم ہوا کہ عذر معقول نہیں، کیونکہ نابینا آواز کے سہارے آواز کی جگہ تک بے تکلف پہنچ سکتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ وہ عزیمت کے درجہ میں یعنی معقول عذر کے بغیر اجازت مانگ رہے ہیں، اس لئے آپؐ نے ان کو اجازت نہ دی بلکہ دی ہوئی اجازت واپس لے لی۔

ثم لما كان في شهود الجماعة حرجٌ للضعيف والسقيم وذی الحاجة: اقتضت الحكمة أن يُرَخَّصَ في تركها عند ذلك، ليتحقق العدلُ بين الإفراط والتفريط.

فمن أنواع الحرج: ليلةٌ ذات برد ومطر، ويستحب عند ذلك قولُ المؤذن: ألا صلوا في الرحال.

ومنها: حاجةٌ، يعسر التربُّص بها، كالْعَشَاء إذا حضر، فإنه ربما تَتَشَوَّفُ النفسُ إليه، وربما يُضَيَّعُ الطعامُ، وكَمُدافعة الأخبثين، فإنه بمعزل عن فائدة الصلاة، مع مابه من اشتغال النفس.

ولا اختلاف بين حديث: " لاصلاةَ بحضرة طعام" وحديثِ: " لاتؤخروا الصلاة لطعام، ولاغيره" إذ يمكن تنزيل كل واحد على صورة أو معنى، إذ المرادُ:

[الف] نفيُ وجوبِ الحضور سَدًّا لباب التعمق، وعدمُ التاخير هو الوظيفةُ لمن أَمِنَ شَرَّ التعمق، وذلك كتنزيل فطر الصائم وعدمه على الحالين.

[ب] أو التأخيرُ إذا كان تشوُّفٌ إلى الطعام، أو خوفُ ضياع، وعدمُه إذا لم يكن، وذلك مأخوذ من حال العلة.

ومنها: ما إذا كان خوفُ فتنة، كامرأة أصابت بخوراً.

ولا اختلاف بين قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا استأذنت امرأةُ أحدكم إلى المسجد

فلايمنعها" وبين ماحكم به جمهورُ الصحابة: من منعهنَّ، إذا المنهيُّ الغيرةُ التي تنبعثُ من الأنَفَة، دونَ خوف الفتنة، والجائز ما فيه خوف الفتنة، وذلك قوله صلى الله عليه وسلم: "الغيرة غيرتان" الحديث، وحديثُ عائشة:" إن النساء أَحْدَثْنَ" الحديث.

ومنها: الخوف، والمرض، والأمر فيهما ظاهر.

ومعنى قوله صلى الله عليه وسلم للأعمٰى:" أتسمع النداءَ بالصلاة؟" قال: نعم، قال: "فَأَجِبْ": إن سؤاله كان في العزيمة، فلم يُرَخِّصْ له.

ترجمہ: پھر جب جماعت میں حاضر ہونے میں کمزور، بیمار اور حاجت مند کے لئے تنگی تھی تو حکمت نے چاہا کہ اجازت دی جائے اعذار کی صورت میں ترکِ جماعت کی، تاکہ متحقق ہو افراط وتفریط کے درمیان اعتدال ـــــ پس حرج کی انواع میں سے: ٹھنڈی اور برساتی رات ہے۔ اور مستحب ہے اس وقت میں مؤذن کا کہنا: "سنو! نماز پڑھو ڈیروں میں" ـــــ اور ان میں سے: ایسی ضرورت ہے کہ دشوار ہو جماعت کا انتظار کرنا اس ضرورت کے ساتھ۔ جیسے شام کا کھانا جب سامنے آجائے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ کبھی نفس جھانکتا ہے اس کی طرف۔ اور کبھی کھانا ضائع کردیا جاتا ہے۔ اور جیسے دونہایت گندی چیزوں کا مزاحمت کرنا۔ پس بیشک وہ نماز کے فائدے سے جدا ہے، اس چیز کے ساتھ جو اس کو ہے نفس کی مشغولیت سے ـــــ اور کچھ اختلاف نہیں اس حدیث کے درمیان کہ: کوئی نماز نہیں کسی کھانے کے سامنے آجانے پر" اور اس حدیث کے درمیان کہ: "تم نماز کو مؤخر نہ کرو کسی کھانے کی وجہ سے، اور نہ کسی اور وجہ سے" کیونکہ ممکن ہے ہر ایک کو اتارنا ایک صورت پر یا ایک معنی پر (یعنی دونوں حدیثوں میں صورۃً فرق کرلیا جائے یا معنی فرق کرلیا جائے۔ پہلی تطبیق میں صورۃً فرق کیا گیا ہے۔ اور دوسری میں معنیً) کیونکہ مراد: (الف) جماعت میں حاضر ہونے کے وجوب کی نفی کرنا ہے تعمق کے دروازے کو بند کرنے کے لئے۔ اور تاخیر نہ کرنا: وہ اس شخص کا حکم ہے جو تعمق کی برائی سے مطمئن ہے۔ اور وہ بات جیسے اتارنا: روزہ دار کے روزہ کھولنے کو اور نہ کھولنے کو دو حالتوں پر (ب) یا (مراد) تاخیر ہے جبکہ کھانے کی طرف میلان ہو یا کھانا برباد ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور تاخیر نہ کرنا جب ہے کہ وہ بات نہ ہو۔ اور یہ تطبیق لی گئی ہے علت کی حالت سے۔

اور ان میں سے: وہ ہے جبکہ فتنہ کا اندیشہ ہو، جیسے وہ عورت جس نے خوشبو کی دھونی لے رکھی ہے ـــــ اور کچھ اختلاف نہیں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان کہ: "جب اجازت مانگے تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی تو وہ اس کو منع نہ کرے" اور اس بات کے درمیان جس کا جمہور صحابہ نے فیصلہ کیا ہے یعنی عورتوں کو روکنا۔ کیونکہ ممنوع: وہ غیرت ہے جو خودداری سے برانگیختہ ہونے والی ہے، نہ کہ فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے۔ اور جائز وہ (روکنا) ہے جس میں فتنہ کا اندیشہ ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "غیرتیں دو طرح کی ہیں" آخر حدیث تک، اور عائشہ کی حدیث ہے: "بیشک عورتوں نے نئی پیدا کی ہے" آخر حدیث تک ـــــ اور ان میں سے: خوف اور بیماری ہے۔ اور

ان دونوں میں معاملہ ظاہر ہے۔

اور نابینا سے آنحضرت ﷺ کے پوچھنے کا کہ: ''کیا تم نماز کی بانگ سنتے ہو؟'' کہا انھوں نے: جی ہاں! فرمایا آپ نے: ''تو لبیک کہو'' (یہ بات دریافت کرنے کا) مطلب یہ ہے کہ اس کی درخواست عزیمت کے بارے میں تھی۔ پس آپؐ نے اس کو اجازت نہ دی۔

☆ ☆ ☆

باجماعت نماز کے سلسلہ میں چار باتوں کی وضاحت

باجماعت نماز ادا کرنے کے سلسلہ میں چار باتوں کی وضاحت ضروری ہے اول: امامت کا زیادہ حقدار کون ہے؟ دوم: جماعت کے لئے اکٹھا ہونے کا طریقہ متعین کیا جائے سوم: امام کو تاکید کرنا کہ جب نماز پڑھائے تو قراءت ہلکی کرے۔ اور اس سلسلہ میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا لمبی قراءت کرنے کا قصہ مشہور ہے، جو نماز کے اذکار وہیئات کے باب میں گذر چکا ہے چہارم: مقتدیوں کو تاکید کرنا کہ وہ امام کی پوری طرح پیروی کریں —— چنانچہ نبی ﷺ نے یہ سب باتیں نہایت تاکید سے بیان فرمائی ہیں۔ (باب کے آخر تک یہی بیان ہے۔ مگر ترتیب ملحوظ نہیں)

امامت کا زیادہ حقدار کون اور کیوں؟

حدیث —— حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کی امامت کرے ان میں سے سب سے زیادہ قرآن کریم پڑھا ہوا۔ پس اگر قرآن پڑھنے میں سب برابر ہوں تو ان میں سے زیادہ حدیثوں کو جاننے والا امامت کرے۔ پس اگر وہ احادیث جاننے میں یکساں ہوں، تو وہ شخص جس نے ان میں پہلے ہجرت کی ہے امامت کرے، پس اگر وہ سب ہجرت کرنے میں یکساں ہوں، تو جوان میں عمر میں بڑا ہے وہ امامت کرائے۔ اور ہرگز امامت نہ کرے کوئی دوسرے کی اس کی امارت میں۔ اور نہ بیٹھے اس کے گھر میں اس کی مخصوص نشست گاہ پر مگر اس کی اجازت سے'' اور ایک روایت میں **فی أھلہ** ہے یعنی دوسرے کے گھر میں (مشکوۃ حدیث ۱۱۱۷ باب الامامۃ)

تشریح: کتاب اللہ زیادہ پڑھے ہوئے کی تقدیم دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: ضروری علوم تین ہیں جن کا تذکرہ **أبواب الاعتصام** میں گذرا ہے ان میں کتاب اللہ کا پہلا مقام ہے۔ کیونکہ وہ علوم شرعیہ کی جڑ بنیاد ہے۔ اس لئے اس کے عالم کو برتری دی گئی ہے۔

دوسری وجہ: قرآن کریم شعائر دینیہ میں سے ہے، پس اس کے عالم کی تقدیم اور اس کا مرتبہ بلند کرنا ضروری ہے، تاکہ وہ علوم قرآنی کی تحصیل میں منافست (ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا) کی دعوت دے۔

اور یہ خیال صحیح نہیں: کہ قرآن کریم جاننے والے کی تقدیم صرف اس وجہ سے ہے کہ نماز میں قراءت کی حاجت ہے۔ کیونکہ یہ بات تو قدر مایجوز قرآن جاننے سے بھی حاصل ہوجاتی ہے، اس کا سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ اصل وجہ وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی کہ یہ چیز تحصیل علوم قرآنی میں منافست پر ابھارنے والی ہے۔ اور کمالات منافست ہی کے ذریعہ ہاتھ آتے ہیں۔

اور یہ سوال کہ تقدیم کی وجہ منافست کا جذبہ پیدا کرنا ہے تو پھر نماز کی تخصیص کیوں؟ یہ تقدیم تو ہر معاملہ میں ہونی چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نماز میں قراءت کی بھی تو حاجت ہے۔ پس غور کرلیں۔

مذکورہ سوال کے دوجواب اور بھی ہیں:

پہلا جواب: امامت چونکہ ایک مقام ومرتبہ ہے، اس لئے اس میں تقدیم ہی منافست کا جذبہ پیدا کرسکتی ہے۔ جیسے کسی بڑے منصب کے لئے کوئی ڈگری شرط کی جائے، یا ڈگری والے کو مقدم رکھا جائے تو ہی اس ڈگری کی تحصیل کا جذبہ پیدا ہوگا۔

دوسرا جواب: حدیث میں حصر نہیں ہے کہ بڑے عالم کو صرف امامت میں مقدم کیا جائے۔ بلکہ اس میں اشارہ ہے کہ علماء اور قراء کو ہر اہم دینی معاملہ میں مقدم رکھنا چاہئے۔ بخاری شریف میں ہے: **كان القُرَّاءُ أصحابَ مجالسِ عمر، ومشاورته، كُهُولاً كانوا أو شُبَّانًا** یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہم نشیں اور مشیر قرّاء حضرات تھے، خواہ وہ ادھیڑ ہوں یا جوان (حدیث ۴۶۴۲ تفسیر سورۃ الاعراف)

پھر کتاب اللہ کے بعد سنت کی معرفت کا درجہ ہے۔ علوم ثلاثہ میں اس کا دوسرا مقام ہے۔ اور سنت کے ذریعہ ملت کا بقا ہے۔ صرف قرآن سے ملت کی پوری طرح تشکیل نہیں ہوسکتی۔ مثلاً نماز کے اہتمام کرنے کا قرآن کریم میں بار بار حکم دیا گیا ہے۔ مگر نماز کی ہیئت کذائی حدیثوں ہی کے ذریعہ منظم ہوتی ہے۔ اور سنت: امت کے لئے میراث نبوی ہے۔ یہی وہ ترکہ ہے جو نبی اُمت نے امت کے لئے چھوڑا ہے۔ پس اس کو دوسرا مقام ملنا ہی چاہئے۔

پھر اس کے بعد ہجرت کا درجہ ہے۔ جو لوگ گھر سامان چھوڑ کر آنحضرت ﷺ کے پاس چلے آتے تھے تاکہ دین کی مدد کریں ان کا جذبہ قابل قدر اور لائق ہمت افزائی تھا۔ چنانچہ آپؐ نے ہجرت کی اہمیت بیان کی، اس کی ترغیب دی اور اس کی شان بلند کی۔ امامت میں ہجرت کا اعتبار ترغیب اور شان بلند کرنے ہی کے لئے ہے۔

پھر عمر میں زیادتی کا لحاظ کیا ہے: کیونکہ تمام ملتوں کا عام دستور: بڑوں کی تعظیم کرنا ہے۔ بڑی عمر والے کا تجربہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور وہ بردباری میں بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی شخص امامت کے لئے موزون ہے۔

اور کسی حاکم کی عملداری میں بغیر اجازت نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھنے سے اس لئے منع کیا کہ یہ بات حاکم پر شاق گذرے گی، اور اس کی سیادت میں عیب لگائے گی کہ حاکم میں امامت کی اہلیت کم ہے۔ اور کسی کے گھر میں اس کی مخصوص نشست گاہ پر بغیر اجازت کے بیٹھنے کی ممانعت بھی اس وجہ سے ہے کہ یہ بات گھر والے پر شاق گذرے گی۔

اس لئے حاکم پر اور گھر والے پر شفقت ومہربانی کرتے ہوئے اس کو قانون بنادیا۔

ثـم وقـعـت الـحـاجةُ إلى بيان الأحق بالإمامة، وكيفيةِ الاجتماع، ووصيةِ الإمام أن يخفِّف بـالـقـوم، والـمـامومين أن يحافظوا على اتباعه، وقصةُ معاذ رضى الله عنه فى الإطالة مشهورةٌ، فبيَّن هذه المعانيَ بأوكدِ وجهٍ، وهو:

[١] قـولـه صلى الله عليه وسلم: " يَؤُمُّ القومَ أقرؤُهم لكتاب الله، فإن كانوا فى القراءة سواءً فـأعـلَـمُهـم بـالـسنَّة، فـإن كـانـوا فى السنَّةِ سواءً فأقدمُهم هجرةً، فإن كانوا فى الهجرة سواءً فأقدمهم سِنًّا، ولايَؤُمَّنَّ الرجلُ الرجلَ فى سلطانه"

[أقول:] وسـبـبُ تـقـديـم الأقرأ: أنـه صلى الله عليه وسلم حدَّ للعلم حدًّا معلومًا، كما بينا، وكان أول ما هنالك معرفة كتاب اللّٰه، لأنه أصل العلم. وأيضًا: فإنه من شعائر اللّٰه، فوجب أن يُقدَّم صاحبُه، وينوَّه بشأنه، ليكون ذلك داعيًا إلى التنافس فيه.

ولـيـس كـمـا يُظَنُّ: أن السبب احتياجُ المصلى إلى القراءة فقط، ولكن الأصلَ حملُهم على الـمـنـافـسـة فيهـا، وإنما تُدركُ الفضائلُ بالمنافسة. وسببُ خصوص الصلاة باعتبار المنافسة: احتياجها إلى القراءة، فَلْيُتدبر.

ثـم مـن بعدها: معرفةُ السنَّةِ، لأنها تِلْوُ الكتاب، وبها قيام الملة، وهى ميراثُ النبى صلى الله عليه وسلم فى قومه.

ثم بعدَه اعتبرت الهجرةُ إلى النبى صلى الله عليه وسلم، لأن النبى صلى الله عليه وسلم عَظَّم أمر الهجرة، ورغَّب فيها، ونَوَّهَ بشأنها، وهذا من تمام الترغيب والتنويه.

ثم زيادة السِّنّ: إذا السنَّةُ الفاشية فى الملل جميعِها توقير الكبير، ولأنه أكثرُ تجربةً،وأعظم حلمًا.

وإنـمـا نهـى عـن التـقـدُّم عـلى ذى سلطان فى سلطانه، لأنه يشق عليه، ويَقْدَح فى سلطانه، فَشَرَّعَ ذلك إبقاءً عليه.

ترجمہ: پھر حاجت پیش آئی بیان کرنے کی: امامت کے زیادہ حقدار کو اور اکٹھا ہونے کی کیفیت کو اور امام کو اس بات کی تاکید کرنے کی کہ وہ لوگوں کے ساتھ ہلکی قراءت کرے اور مقتدیوں کو (تاکید کرنے کی) کہ وہ امام کی پیروی کی نگہداشت کریں۔ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا واقعہ قراءت لمبی کرنے کا مشہور ہے۔ پس بیان کیں آپؐ نے یہ باتیں نہایت مؤکد طور پر، اور وہ:

(۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: میں کہتا ہوں: اور ''کتاب اللہ زیادہ پڑھے ہوئے'' کی تقدیم کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے علم کے لئے حد مقرر کی ہے۔ معلوم حد، جیسا کہ بیان کیا ہم نے، اور اس کا جو وہاں ہے پہلا مرتبہ تھا کتاب اللہ کا جاننا، اس لئے کہ وہ علم کی بنیاد ہے۔ اور نیز: پس بیشک وہ اللہ کے دین کی امتیازی چیزوں میں سے ہے۔ پس ضروری ہے کہ مقدم کیا جائے اس کا جاننے والا، اور بلند کی جائے اس کی شان، تا کہ اس میں تقدیم ریس کرنے کی طرف بلانے والی ہو۔

اور نہیں ہے جیسا گمان کیا گیا کہ وجہ فقط نمازی کی قراءت کی طرف احتیاج ہے، بلکہ اصل وجہ لوگوں کو قراءت میں منافست پر آمادہ کرنا ہے۔ اور کمالات منافست ہی سے حاصل کئے جاتے ہیں ـــــ اور نماز کی تخصیص کا سبب منافست کے اعتبار سے: نماز کا قراءت کی طرف محتاج ہونا ہے۔ پس چاہئے کہ غور کیا جائے۔

پھر اس کے بعد: سنت کو جاننا ہے۔ اس لئے کہ سنت کتاب اللہ کے پیچھے آنے والی ہے، اور اس کے ذریعہ ملت کا بقاء ہے اور وہ نبی ﷺ کی میراث ہے اپنی امت میں ـــــ پھر اس کے بعد: نبی ﷺ کی طرف ہجرت کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ نبی ﷺ نے ہجرت کے معاملہ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اور اس کی ترغیب دی ہے۔ اور اس کی شان بلند کی ہے۔ اور یہ (امامت میں ہجرت کا اعتبار) ترغیب اور شان بلند کرنے کی تمامیت سے ہے ـــــ پھر عمر کی زیادتی ہے۔ اس لئے کہ ساری ملتوں کا عام دستور: بڑے کی تعظیم کرنا ہے۔ اور اس لئے کہ عمر میں بڑا تجربہ میں زیادہ ہوتا ہے اور بربادی میں بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

اور منع کیا حاکم پر آگے بڑھنے سے اس کی سیادت میں صرف اس لئے کہ وہ آگے بڑھنا شاق گذرے گا اور وہ اس کی سیادت میں عیب لگائے گا۔ پس قانون بنایا آپ نے یہ اس حاکم پر مہربانی کرتے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

جماعت کی نماز میں ہلکی قراءت کرنے کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی لوگوں کو امام بن کر نماز پڑھائے تو چاہئے کہ نماز ہلکی پڑھائے۔ کیونکہ مقتدیوں میں بیمار بھی ہوتے ہیں، اور کمزور بھی اور بوڑھے بھی۔ اور جب تم میں سے کوئی اپنے لئے تنہا نماز پڑھے تو جتنی چاہے لمبی کرے'' (مشکوۃ حدیث ۱۱۳۱)

تشریح: باجماعت نماز بھی اذان ہی کی طرح دین کی ایک عمومی دعوت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی درخواست کی جاتی ہے۔ پھر اس کا جواب قرآن کریم میں سے سب لوگوں کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ اور دعوت کا پورا فائدہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس میں آسانی کا خیال رکھا جائے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جو دین کی دعوت دینے کا

طریقہ بتلایا گیا تھا، اس میں تدریج آسانی کرنے ہی کے مقصد سے تھی۔ اور نماز میں قراءت لمبی کر کے لوگوں کو بھگانا دعوت کے موضوع کے خلاف ہے، اور جس بات کا عام لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے اس میں تو تخفیف کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ حدیث میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا فجر کی نماز لمبی پڑھانا اور ایک شخص کا شکایت کرنا مروی ہے، اس دن آپؐ نے سخت غضبناک ہو کر وعظ فرمایا تھا۔ اور ارشاد فرمایا تھا کہ: ''تم میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو لوگوں کو بھگانے والے ہیں، جو کوئی تم میں سے لوگوں کا امام بنے چاہئے کہ وہ نماز مختصر پڑھائے۔ کیونکہ لوگوں میں ضعیف، بوڑھے اور حاجت والے ہوتے ہیں (مشکوۃ ۱۱۳۲) اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قصہ تو مشہور ہے کہ عشا کی نماز لمبی پڑھانے کی وجہ سے آپؐ نے ان کو ڈانٹا تھا۔ اور فرمایا تھا: أَفَتَّانٌ أنتَ یا معاذ! معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالو گے! پھر آپؐ نے عشا کی نماز کے لئے سورتیں متعین کیں کہ یہ یہ صورتیں پڑھو۔

امام کی پیروی ضروری ہے

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، پس تم اس سے آگے پیچھے نہ ہوو۔ پس جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو۔ اور جب وہ کہے: سَمِعَ اللّٰہُ لمن حمدہ تو تم کہو: ربنا لك الحمدُ۔ اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو'' (بخاری حدیث ۷۲۲ کتاب الاذان) اور ایک روایت میں ہے: ''اور جب امام کہے: ﴿وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ تو تم کہو آمین'' (مشکوۃ حدیث ۱۱۳۸)

تشریح: جس طرح اذان کی ابتداء حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کے خواب، اور تائید نبوی سے ہوئی ہے، اسی طرح امام کی پیروی کا طریقہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اجتہاد، اور تصویب نبوی سے جاری ہوا ہے۔ ابوداؤد شریف (حدیث ۵۶ باب کیف الاذان) اور مسند احمد (۲۴۶:۵) میں نماز میں تین تبدیلیوں کی روایت ہے۔ پہلے طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی جماعت میں دیر سے آتا تو کسی سے دریافت کرتا کہ کتنی رکعتیں ہوگئیں؟ اسے بتایا جاتا تو وہ فوت شدہ رکعتیں پڑھ کر امام کی نماز میں شریک ہوتا۔ نتیجۂ: کوئی کھڑا ہوتا، کوئی رکوع میں، کوئی سجدہ میں اور کوئی امام کے ساتھ۔ ایک مرتبہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ دیر سے آئے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ نامناسب صورت ہے۔ وہ آتے ہی امام کی نماز میں شریک ہوگئے۔ اور باقی نماز بعد میں پوری کی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: إن معاذًا قد سَنَّ لكم سنةً، فكذلك فافعلوا: معاذؓ نے تمہارے لئے ایک طریقہ چلایا ہے، پس اسی طرح تم لوگ بھی کرو ——— اور حضرت معاذؓ کے اجتہاد کی بنیاد یہ تھی کہ اس طرح کرنے سے یعنی آتے ہی امام کے ساتھ شامل ہو جانے سے سب کی نماز ایک ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بغیر: سب لوگ ایک جگہ میں تو جمع ہیں، مگر ایک نماز میں جمع نہیں۔

اور امام کی پیروی کا مطلب یہ ہے کہ جو امام کرے وہی مقتدی کرے۔ اور جو امام پڑھے وہی مقتدی پڑھے۔ مگر جب امام تسمیع کہے یعنی اعلان کرے کہ اللہ کی تعریف کرو تو مقتدی تحمید کریں، کیونکہ تعمیل حکم ہی پیروی ہے۔ اور جب امام ہدایت طلبی کی دعا کرے اور فاتحہ پوری کرے تو مقتدی آمین کہیں یہی تعمیل ہے۔ اور جب امام قراءت کرے تو مقتدی خاموش ہو کر اس کو کان لگا کر سنیں، یہی تعمیل ہے۔

اور جب امام معذوری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی کیا کریں؟ اس میں اختلاف ہے:

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ایسے معذور امام کی اقتدا میں قیام پر قادر مقتدیوں کا نماز پڑھنا درست نہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اگر امام شروع سے معذور ہے تو مقتدی بیٹھ کر اقتدا کریں۔ اور اگر امام کو درمیانِ نماز میں عذر پیش آیا ہو، اور وہ بیٹھ گیا ہو تو مقتدی کھڑے کھڑے اقتدا کریں۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک ایسے معذور امام کی اقتدا درست ہے اور جو مقتدی قیام پر قادر ہیں وہ کھڑے ہو کر اقتدا کریں

اس معاملہ میں دو روایتیں ہیں: ایک وہ ہے جو اوپر گذری یہ سن ۵ ہجری کا واقعہ ہے، جبکہ آپ کو چوٹ آئی تھی۔ ایک دن بیماری کے زمانہ میں آپ کمرے میں بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے کہ چند صحابہ عیادت کے لئے پہنچ گئے۔ انھوں نے موقع غنیمت جان کر کھڑے کھڑے آپ کی اقتداء کی۔ آپ نے اشارہ سے ان کو بٹھا دیا اور نماز کے بعد مسئلہ بتایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے پس جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بھی اس کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھو۔

اور دوسرا واقعہ: آپ کے مرض موت کا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھانی شروع کی۔ اس کے بعد آپ نے بیماری میں تخفیف محسوس کی تو دو آدمیوں کے سہارے تشریف لائے۔ آپ کو امام کی جانب میں بٹھا دیا گیا۔ اور آپ نے درمیان سے نماز پڑھانی شروع کی۔ مقتدیوں نے کھڑے کھڑے اقتدا کی۔

امام مالک رحمہ اللہ ان دونوں حدیثوں کو آپ کی خصوصیت قرار دیتے ہیں۔ مگر تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ پہلے واقعہ میں امام کا عذر اصلی تھا یعنی وہ شروع ہی سے معذور تھا اور دوسرے واقعہ میں عذر طاری تھا یعنی معذور امام درمیان میں آیا تھا۔ اس لئے لوگوں نے کھڑے کھڑے اقتداء کی تھی۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ روایتیں ناسخ منسوخ ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کا ارشاد کہ: ''جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو'' یہ ارشاد منسوخ ہے۔ اور ناسخ: آخر حیات میں آپ کی امامت کا واقعہ ہے۔ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی ہے۔ اور لوگوں نے کھڑے کھڑے اقتدا کی ہے۔ اور سابق حکم کے منسوخ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امام کا بیٹھا ہوا ہونا اور مقتدیوں کا کھڑا رہنا عجمیوں کے اس طریقہ کے مشابہ ہے جو ان کے دربار کا تھا کہ بادشاہ بیٹھتا تھا اور لوگ کھڑے رہتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے بادشاہوں کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ ایک حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ عصا ٹیکے

باہر تشریف لائے۔ لوگ کھڑے ہوگئے تو آپؐ نے فرمایا: لاتقوموا كما يقوم الأعاجم، يعظّم بعضُها بعضًا: عجمیوں کی طرح کھڑے نہ ہوو، وہ کھڑے رہ کر ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔ یہی تعظیم بڑھتی بڑھتی شخصیت پرستی تک پہنچ جاتی تھی۔ اس لئے اس کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اور اسی کے پیش نظر حکم دیا تھا کہ مقتدی بیٹھ کر اقتدا کریں۔ مگر بعد میں جب اصولِ اسلام ثابت و برقرار ہوگئے۔ اور بہت سی باتوں کے ذریعہ عجمیوں سے امتیاز ہوگیا تو ایک دوسرے پہلو کو ترجیح دی گئی۔ اور وہ یہ ہے کہ نماز میں قیام فرض ہے البتہ معذور اس سے مستثنیٰ ہے۔ اور صورتِ زیرِ بحث میں امام تو معذور ہے، مگر مقتدیوں کو کوئی عذر نہیں۔ پس ان پر قیام فرض ہے۔ اور کھڑے ہو کر اقتدا ضروری ہے۔

اس کی نظیر: زیارتِ قبور کا مسئلہ ہے۔ شروع میں قبرستان جانے سے اس لئے روکا گیا تھا کہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور فسادِ عقیدہ کا اندیشہ تھا۔ مگر بعد میں جب عقائدِ اسلامیہ قلوب میں راسخ ہوگئے تو ایک دوسرے پہلو کو ترجیح دی گئی۔ اور وہ اموات کے لئے ایصالِ ثواب اور احیاء کے لئے تذکیر بالموت کا پہلو ہے۔ چنانچہ اس قیاس کی رعایت کرکے بعد میں زیارتِ قبور کی اجازت، بلکہ ترغیب دی گئی۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا صلّى أحدُكم للناس فليخفف، فإن فيهم السقيمَ، والضعيفَ، والكبيرَ، وإذا صَلّى أحدكم لنفسه فليطوِّلْ ماشاء"

أقول: الدعوة إلى الحق لاتتم فائدتُها إلا بالتيسير؛ والتنفيرُ يخالف الموضوع، والشيئُ الذى يُكلَّف به جمهورُ الناس: من حقّه التخفيفُ، كما صَرَّح النبى صلى الله عليه وسلم، حيث قال: " إن منكم مُنفِّرِيْنَ"

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: "إنما جُعل الإمامُ ليؤتم به، فلا تختلفوا عليه، فإذا ركع فاركعوا، وإذا قال: سمع الله لمن حمده، فقولوا: اللهم ربنا لك الحمد، وإذا سجد فاسجدوا، وإذا صلّى جالسًا فصلوا جلوسًا أجمعون" وفى رواية: " وإذا قال: ﴿وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ فقولوا: آمين"

أقول: بَدْأُ الجماعةِ: ما اجتهده معاذٌ رضى الله عنه برأيه، فقرَّره النبى صلى الله عليه وسلم، واستصوبه؛ وإنما اجتهد: لأنه به تصير صلاتُهم واحدةً، ودون ذلك: إنما هو اتفاق فى المكان، دون الصلاة.

وقوله صلى الله عليه وسلم: " إذا صلّى جالسًا فصلوا جلوسًا" منسوخ بدليل إمامة النبى صلى الله عليه وسلم فى آخر عمره جالسًا، والناسُ قيام؛ والسرُّ فى هذا النسخ: أن جلوس الإمام وقيامَ القوم يُشْبِهُ فعلَ الأعاجم فى إفراط تعظيم ملوكهم، كما صُرِّح به فى بعض روايات الحديث، فلما استقرَّتِ الأصولُ الإسلامية، وظهرت المخالفة مع الأعاجم فى كثير من الشرائع، رُجِّحَ

قياسٌ آخر، وهو: أن القيام ركن الصلاة، فلا يُترك من غير عذر، ولا عذر للمقتدى.

ترجمہ:(۲) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد:.......... میں کہتا ہوں: دین حق کی طرف دعوت: اس کا فائدہ تام نہیں ہوتا مگر آسانی کرنے کے ذریعہ، اور بھگانا موضوع دعوت کے خلاف ہے۔ اور وہ چیز جس کا عام لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے: اس کے حق میں سے (یعنی اس کے لئے سزاوار) تخفیف ہے۔ جیسا کہ صراحت کی ہے نبی ﷺ نے، چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ''بیشک تم میں سے بعض لوگ بھگانے والے ہیں!''

(۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:.......... میں کہتا ہوں: جماعت کا آغاز وہ ہے جس کا اجتہاد کیا ہے معاذؓ نے اپنی رائے سے۔ پس برقرار رکھا اس کو نبی ﷺ نے اور تصویب کی آپؐ نے اس کی۔ اور معاذؓ نے اسی لئے اجتہاد کیا: اس لئے کہ شان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہوجاتی ہے لوگوں کی نماز ایک۔ اور اس کے بغیر: بس وہ جگہ میں اتفاق ہے۔ نہ کہ نماز میں ـــــ اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جب وہ نماز پڑھے بیٹھ کر تو تم بھی نماز پڑھو بیٹھ کر'' منسوخ ہے، نبی ﷺ کی بیٹھ کر امامت کی دلیل سے اپنی حیات کے آخر میں، درانحالیکہ لوگ کھڑے تھے ـــــ اور راز اس نسخ میں یہ ہے کہ امام کا بیٹھنا اور لوگوں کا کھڑا ہونا عجمیوں کے عمل کے مشابہ ہے، ان کے حد سے زیادہ تعظیم کرنے میں اپنے بادشاہوں کی۔ جیسا کہ اس کی صراحت کی گئی ہے حدیث کی بعض روایات میں۔ پس جب اصولِ اسلامیہ ثابت ہوگئے اور عجمیوں کے ساتھ مخالفت ظاہر ہوئی بہت سے احکام شرعیہ میں تو ایک دوسرے قیاس کو ترجیح دی گئی۔ اور وہ یہ ہے کہ قیام نماز کا رکن ہے۔ پس نہیں چھوڑا جائے گا بغیر عذر کے۔ اور مقتدیوں کو کوئی عذر نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

امام کے قریب دانشمند رہیں اور لوگ مسجد میں شور نہ کریں

حدیث ـــــ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چاہئے کہ مجھ سے قریب رہیں جو دانش منداور سمجھدار ہیں۔ پھر وہ لوگ رہیں جو اس وصف میں ان سے قریب ہیں ـــــ یہ بات تین مرتبہ فرمائی ـــــ اور بچو تم بازاروں جیسے شور سے (مشکوۃ حدیث ۱۰۸۹)

تشریح: دورِ نبوی میں بیشتر احکام عمل نبوی سے اخذ کئے جاتے تھے۔ اس لئے اس وقت اس ارشاد کا یہ مقصد بھی تھا کہ سمجھدار صحابہ آپؐ کی نماز دیکھیں اور اس کو محفوظ کریں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس مقصد کی صراحت کی ہے (ابن ماجہ حدیث ۹۷۷) اور حضرت معاذ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب آپؐ کسی منزل میں اترتے تھے تب بھی مہاجرین آپؐ سے قریب اترتے تھے (مسند احمد ۵: ۲۳۲) پس دورِ نبوت میں تو اس ہدایت نبوی کا

اصل مقصد تعلیم اوراخذ شریعت تھا۔مگراس میں دوسری حکمتیں بھی ہیں:

پہلی حکمت:—— یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں بڑوں کی عظمت قائم ہو—— اسلامی تہذیب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں چھوٹے بڑے کا فرق رکھا گیا ہے۔چھوٹے بڑوں کی تعظیم کرتے ہیں اور بڑے چھوٹوں پر شفقت!اسی قدر(Valua)کوفروغ دینے کے لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ چھوٹے بڑوں کی قدردانی کریں اوران کو آگے آنے کا موقع دیں—— یہ حکمت اس صورت میں ہے جبکہ چھوٹے مامور ہوں کہ وہ بڑوں کو آگے بڑھائیں۔

دوسری حکمت:—— لوگوں میں بزرگوں اور بڑوں کی عادتیں اختیار کرنے کی ریس پیدا ہو—— یعنی ہر شخص سمجھ دار بننے کی کوشش کرے اوراس کا طریقہ یہ ہے کہ بڑوں کے نقشِ قدم پر چلے اوران کی اچھی عادتیں اپنائے۔جس طرح بڑے امام کے قریب نماز پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں،چھوٹے بھی یہی کوشش کریں—— یہ حکمت اس صورت میں ہے جبکہ خُردخودآگے بڑھنے کے مامور ہوں۔

تیسری حکمت:—— کم درجہ کے لوگوں کو آگے بڑھانا عقلمندوں پر شاق نہ گذرے—— کہتروں کو مہتروں سے آگے بڑھانے میں مہتروں کی دل شکنی کا اندیشہ ہے۔اس لئے احادیث میں حکم دیا گیا ہے کہ خواہ کسی قوم کا بڑا ہو،اس کی قدر پہچاننی چاہئے،اوراس کے ساتھ اس کے شایانِ شان برتاؤ کرنا چاہئے تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔پس یہ حکم بڑوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اوران کی دل شکنی سے بچنے کے لئے دیا گیا ہے—— یہ حکمت مذکورہ دونوں صورتوں کو عام ہے

اور مسجد میں شور کی ممانعت میں بھی تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: لوگوں کو مہذب اور شائستہ بنانا مقصود ہے۔سلیقہ مندی کی بات یہی ہے کہ اجتماعات اور پاک مقامات میں شوروشغب نہ کیا جائے۔

دوسری حکمت: مسجد کا ماحول پرسکون رکھنا مقصود ہے تاکہ جولوگ نوافل میں یا تلاوت میں مشغول ہیں وہ قرآن کریم میں غوروفکر کرسکیں۔

تیسری حکمت: نمازیوں کو اللہ کے دربار میں اس طرح حاضر ہونا چاہئے جس طرح لوگ بادشاہوں کے دربار میں عرض ومعروض کرنے کے لئے جاتے ہیں۔وہاں کوئی چوں نہیں کرتا!

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: "لِيَلِيَنِي منكم أولو الأحلام والنُّهى، ثم الذين يلونهم— ثلاثًا— وإياكم وهَيْشَاتِ الأسواق"

أقول: ذلك ليتقرر عندهم توقير الكبير، أو ليتنافسوا في عادة أهل السُّؤْدَدِ، ولئلا يشق على أولي الأحلام تقديمُ من دونهم عليهم.

ونهى عن الهيشات تأدُّبًا، وليتمكنوا من تدبر القرآن، وليتشبهوا بقوم نَاجَوا المَلِك.

ترجمہ: (۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:......... میں کہتا ہوں: وہ حکم اس لئے ہے تا کہ ثابت ہو لوگوں کے نزدیک بڑے کی توقیر یا اس لئے ہے کہ ریس کریں لوگ بزرگی (سیادت) والوں کی عادت میں (او حرف تردید دو حکمتوں کے درمیان ہے) اور تا کہ نہ شاق گذرے عقلمندوں پر ان لوگوں کو آگے بڑھانا جوان سے کہتر ہیں اُن (عقل مندوں) پر ـــــ اور شور وشغب سے منع کیا سلیقہ مند بنانے کے لئے اور تا کہ قادر ہوں وہ قرآن میں غور کرنے پر اور تا کہ مشابہت اختیار کریں وہ ان لوگوں کی جو بادشاہ سے مناجات (عرض معروض) کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ملائکہ کی صفوں میں خلل نہ ہونے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم صفیں نہیں بناتے جس طرح ملائکہ اپنے رب کے پاس (بندگی کے لئے) صفیں بناتے ہیں؟'' صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! اور ملائکہ اپنے رب کے پاس کس طرح صفیں بناتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''پہلے اگلی صفوں کو پورا کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے مل کر کھڑے رہتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۰۹۰)

تشریح: جس طرح بادشاہ کے دربار میں حاضرین کی نشست گاہیں حسب مراتب طے ہوتی ہیں۔ مثلاً وزیر اعظم کے لئے ممتاز مقام ہوتا ہے، پھر دوسرے وزراء کے لئے، پھر فوجی افسران کے لئے۔ پھر عمائدین شہر کے لئے جگہیں متعین ہوتی ہیں۔ اور یہ ترتیب ان کے مراتب کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اور وہ عقل سے قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح ملائکہ جب بندگی کے لئے بارگاہِ عالی میں حاضر ہوتے ہیں تو وہاں ہر فرشتہ کا ایک معین درجہ ہے۔ اور یہ درجات ان کی استعدادوں کے اعتبار سے طے شدہ ہیں، اور عقلی ترتیب کے مقتضیٰ کے مطابق ہیں۔ سورۃ الصافات آیات (۱۶۴-۱۶۶) میں فرشتوں کی زبان سے فرمایا ہے: ''اور ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے، اور ہم صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ہم ہی پاکی بیان کرنے والے ہیں'' ـــــ اور بادشاہ کے دربار میں تو اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ کوئی درباری کسی وجہ سے غیر حاضر ہو جائے۔ اور اس کی جگہ خالی رہ جائے۔ مگر فرشتوں میں یہ بات ناممکن ہے۔ اس وجہ سے ملائکہ کی صفوں میں کوئی خلل نہیں ہوتا۔

شیطان کا صف کے شگافوں میں گھسنا

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی صفوں کو ملا کر رکھو'' یعنی ایک دوسرے سے خوب لگ کر کھڑے رہو'' اور صفوں کے درمیان نزدیکی کرو'' یعنی دو صفوں کے درمیان اتنا فاصلہ

نہ رکھو کہ درمیان میں ایک صف اور بن سکے'' اور گردنیں ایک دوسرے کے مقابل رکھو'' یعنی برابر جگہ میں کھڑے رہو، کوئی اونچی جگہ اور کوئی نیچی جگہ کھڑا نہ رہے، تاکہ گردنیں برابر رہیں: ''پس قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میں شیطان کو داخل ہوتا ہوا دیکھتا ہوں صف کے شگافوں میں گویا وہ چھوٹی سیاہ بھیڑ ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۰۹۳)

تشریح: اس بات کا تجربہ کیا گیا ہے کہ ذکر کی مجلس میں ایک دوسرے سے مل کر بیٹھنا جمعیت خاطر کا سبب ہے، اس سے دل جمعی کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ ذکر میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ اور قلبی وساوس بند ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اس طرح مل مل کر نہیں بیٹھا جاتا تو ان باتوں میں کمی آجاتی ہے۔ ٹھیک یہی صورت حال صف میں مل مل کر کھڑے ہونے کی اور درمیان درمیان میں فاصلہ رکھ کر کھڑے ہونے کی ہے۔ ان شگافوں میں شیطان گھستا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو چھوٹی کالی بھیڑ کی شکل میں گھستے دیکھا ہے۔ اور اسی صورت میں آپؐ نے اس لئے دیکھا ہے کہ عام طور پر گھروں میں جو تنگ جگہیں ہوتی ہیں ان میں غفلت کے وقت میں یہ بھیڑیں گھستی ہیں۔ اور ظاہر کی سیاہی باطن کی خرابی کی ترجمانی کرتی ہے۔ چنانچہ شیطان آپ ﷺ کو اس صورت میں گھستا ہوا نظر آیا۔

[۵] قوله صلى الله عليه وسلم: "ألاتصفُّون كما تصفُّ الملائكةُ عند ربها"

أقول: لكل مَلَكٍ مقامٌ معلوم، وإنما وُجِدوا على مقتضى الترتيب العقليِّ في الاستعدادات، فلا يمكن أن يكون هنالك فُرْجَة.

[۶] قوله صلى الله عليه وسلم: "إني لأرى الشيطان يدخل من خلل الصف، كأنها الحَذَف"

أقول: قد جَرَّبنا أن التراصَّ في حِلَق الذكر سببُ جمع الخاطر، ووجدان الحلاوة في الذكر، وسدِّ الخطرات، وتركَه ينقصُ من هذه المعاني؛ والشيطانُ يدخل كلما انتقص شيئ من هذه المعاني، فرأى ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم متمثلا بهذه الصورة؛ وإنما رأى في هذه الصورة: لأن دخول الحَذَفِ أقربُ ما يُرىٰ في العادة من هجوم شيئ في المضايق، مع السواد المُشعر بقبح السريرة، فتمثل الشيطان بتلك الصورة.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ...... میں کہتا ہوں: ہر فرشتہ کے لئے ایک معین درجہ ہے۔ اور پائے گئے ہیں وہ استعدادوں میں عقلی ترتیب کے مقتضی کے مطابق ہی، پس نہیں ممکن ہے کہ ہو وہاں کوئی شگاف۔

(۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ...... میں کہتا ہوں: تحقیق تجربہ کیا ہے ہم نے کہ ذکر کے حلقوں میں ایک دوسرے سے مل جانا دل جمعی کا، ذکر میں لذت کا اور قلبی وساوس کو روکنے کا سبب ہے۔ اور اس کو ترک کرنا ان باتوں میں سے گھٹاتا ہے۔ اور شیطان گھستا ہے جب بھی گھٹتی ہے ان باتوں میں سے کوئی بات (بلکہ جب شیطان گھستا ہے تو ان باتوں میں یعنی

جمعیتِ خاطر، ذکر میں لذت اور وساوس قلبی کے بند ہونے میں کمی آ جاتی ہے) پس رسول اللہ ﷺ نے شیطان کو اس صورت میں متمثل ہونے والا دیکھا۔ اور اسی صورت میں اس لئے دیکھا کہ چھوٹی کالی بھیڑ کا گھسنا قریب ترین وہ بات ہے جو دیکھی جاتی ہے عادت میں یعنی کسی چیز کا غفلت کی حالت میں اچانک آنا تنگ جگہوں میں (یعنی عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جہاں ذرا غفلت ہوئی کہ بکری کا بچہ اِدھر اُدھر تنگ جگہ میں گھس جاتا ہے) سیاہی کے ساتھ جو آگہی دینے والی ہے باطن کی برائی کی (یعنی سیاہ رنگ میں شیطان کا خبثِ باطن متمثل ہوا تھا) پس متشکل ہوا شیطان اس صورت میں۔

لغات: فَرْجَةٌ و فُرْجَةٌ : کشادگی، درز...... الحَذَف: غنم سُوْدٌ جُرْدٌ صِغار، لیس لھا آذان ولا أذناب (المعجم الوسیط) یعنی چھوٹی، بغیر بال کی۔ سیاہ بھیڑیں، جن کے نہ کان ہوں، نہ دُم۔

☆ ☆ ☆

صفوں کی درستی اور امام کی پیروی میں کوتاہی پر سخت وعید

حدیث ــــــ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہماری صفوں کو اس قدر سیدھا کیا کرتے تھے کہ ہم میں سے کوئی سوت برابر بھی آگے پیچھے نہیں رہتا تھا۔ ایک مدت تک کوشش کرنے کے بعد آپؐ کو اطمینان ہو گیا کہ لوگ صف سیدھی کرنے کا طریقہ سمجھ گئے ہیں تو آپؐ نے اہتمام چھوڑ دیا۔ لوگ خود ہی صفیں سیدھی کرنے لگے۔ لیکن ایک دن آپ نے اس معاملہ میں ایک آدمی کی کوتاہی دیکھی۔ اس کا سینہ صف سے کچھ آگے نکلا ہوا تھا، تو آپؐ نے پُر جلال انداز میں فرمایا: ''اللہ کے بندو! اپنی صفیں سیدھی کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کے درمیان اختلاف ڈالدیں گے'' یعنی صفیں سیدھی کرنے میں کوتاہی کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کی سزا میں تمہارے رخ ایک دوسرے سے پھیر دیں گے۔ تمہاری وحدت اور اجتماعیت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ اور تم میں آپسی پھوٹ پڑ جائے گی (مشکوٰۃ حدیث ۱۰۵۸)

حدیث ــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہ شخص ڈرتا نہیں جو امام سے پہلے سجدہ سے سر اٹھا لیتا ہے: اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے کے سر سے پلٹ دیں؟!''
(متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۱۱۴۱)

تشریح: یہ دونوں حدیثیں وعید کی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو صفیں سیدھی کرنے کا اور امام کی پیروی کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور بہت تاکیدی حکم دیا تھا۔ پھر بھی بعض لوگوں کی طرف سے کوتاہی اور لاپروائی دیکھنے میں آئی، تو آپؐ نے ان کو سخت دھمکایا اور ڈرایا کہ اگر وہ مخالفت پر اصرار کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ ان پر لعنت فرمائیں گے۔ کیونکہ تجلیات ربانی کو پھینک دینا اور انوار الٰہی سے روگردانی کرنا موجبِ لعنت ہے۔ اور لعنت جب کسی پر مسلط ہوتی ہے تو

مسخ تک نوبت پہنچ جاتی ہے، یا پھر آپسی اختلافات رونما ہوتے ہیں۔

اور حدیث میں گدھے کی تخصیص میں یہ نکتہ ہے کہ گدھا ایک ایسا جانور ہے، جس کی حماقت اور حقارت کی عام طور پر مثال دی جاتی ہے۔ اور اس حکم کی مخالفت کرنے والا بھی گدھا ہے۔ اس پر بہیمیت وحماقت سوار ہوگئی ہے۔ پس وہ اسی سزا کا مستحق ہے کہ اس کا سر گدھے کے سر سے چینج کردیا جائے۔

اور حدیث میں چہروں میں مخالفت کی تخصیص میں یہ نکتہ ہے کہ عربی میں چہرہ بول کر پوری ذات مراد لی جاتی ہے۔ پھر انھوں نے کوتاہی اور بے ادبی بھی اللہ کے لئے چہرہ منقاد کرنے میں کی ہے، پس اس کی سزا بھی اسی عضو کو دی گئی جس کے ذریعہ انھوں نے بے ادبی کی ہے۔ جیسے سورۃ التوبہ آیت ۳۵ میں ہے کہ لوگوں کا جمع کیا ہوا خزانہ قیامت کے دن جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں، کروٹوں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا۔ ان تین اعضاء کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ دولت مند سے جب اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے یا کوئی حاجت منداس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتا ہے۔ اصرار کیا جائے تو اعراض کرکے پہلو بدل لیتا ہے۔ اور زیادہ کہا جائے تو پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے، اس لئے انہی تین اعضاء پر داغ دیئے جائیں گے تاکہ وہ مزہ چکھیں! ——— یا یہ کہ لوگوں نے صورۃً تقدم وتأخر کیا تو ان کو معنوی تقدم وتأخر یعنی باہمی نزاع کی سزا دی گئی۔

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم: "لَتُسَوُّنَّ صفوفكم، أو ليخالفن الله بين وجوهكم" وقوله صلى الله عليه وسلم: "أما يخشى الذي يرفع رأسه قبل الإمام: أن يحوِّل الله رأسَه رأسَ حمار"

أقول: كان النبي صلى الله عليه وسلم أمرهم بالتسوية والاتباع فَفَرَّطُوا، وسَجَّل عليهم فلم يَنْزَجِرُوْا، فغلَّظ التهديدوأخافهم إن أصروا على المخالفة: أن يلعنهم الحق؛ إذ منا بذةُ التَّدَلِّيَاتِ الإلٰهيةِ جالبةٌ للَّعْنِ، واللعنُ إذا أحاط بأحدٍ يورث المسخَ، أو وقوعَ الخلاف بينهم.

والنكتة في خصوص الحمار: أنه بهيمة يُضرب به المثلُ في الحمق والإهانة فكذلك هذا العاصي غلب عليه البهيمية والحُمُقُ،

وفي خصوص مخالفةِ الوجوه: أنهم أساء وا الأدب في إسلام الوجه لله، فَجُوْزُوْا في العضو الذي أساء وا به، كما في كَيِّ الوجوه، أو اختلفوا صورةً بالتقدُّم والتأخر، فَجُوْزُوا بالاختلاف معنىً والمناقشة.

ترجمہ: (۷) آنحضرت ﷺ کے دو ارشادات: .... میں کہتا ہوں: نبی ﷺ نے لوگوں کو صفیں سیدھی کرنے کا اور امام کی پیروی کرنے کا حکم دیا تھا، پس لوگوں نے کوتاہی کی۔ اور لوگوں کے سامنے اس حکم کی تشہیر کی پھر

بھی وہ باز نہ آئے۔ تو آپؐ نے ان کو سخت دھمکایا۔ اور ان کو ڈرایا، اگر وہ حکم کی مخالفت پر اصرار کریں: اس بات سے کہ ان پر اللہ لعنت برسائیں۔ کیونکہ تجلیاتِ ربانیہ کو پھینک دینا لعنت کو کھینچنے والا ہے۔ اور لعنت جب کسی کو گھیر لیتی ہے تو مسخ کا یا آپسی اختلاف کا وارث بناتی ہے ـــــــ اور گدھے کی تخصیص میں نکتہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا جانور ہے جس کے ذریعہ مثال بیان کی جاتی ہے حماقت اور اہانت میں۔ پس اسی طرح یہ گہنہ گار ہے: اس پر غالب آ گئی ہے بہیمیت اور حماقت ـــــــ اور چہروں کی مخالفت کی تخصیص میں نکتہ یہ ہے کہ انھوں نے بے ادبی کی چہرہ منقاد کرنے میں اللہ تعالیٰ کے لئے تو وہ سزا دیئے گئے اس عضو میں جس کے ذریعہ انھوں نے بے ادبی کی تھی، جیسا کہ چہروں کے داغنے میں۔ یا مخالفت کی انھوں نے صورتوں کے ذریعہ آگے پیچھے ہو کر تو سزا دیئے گئے وہ معنوی اختلاف کے ذریعہ اور وہ معنوی اختلاف باہمی نزاع ہے۔

لغات: سَجَّل علیه بکذا: شَهَّرَه (المعجم الوسیط)..... اِنْزَجَر: رک جانا، باز آنا۔ آخری کلمہ والمناقشة میں عطف تفسیری ہے یعنی مناقشہ اور اختلاف ایک چیز ہیں۔

☆ ☆ ☆

رکوع پانے سے رکعت ملنے کی، اور سجدہ پانے سے رکعت نہ ملنے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نماز میں آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو سجدہ میں شریک ہو جاؤ۔ اور اس کو کچھ شمار نہ کرو یعنی اس کو رکعت ملنا نہ سمجھو۔ اور جس نے رکوع پالیا تو یقیناً اس نے نماز یعنی رکعت بھی پالی'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۴۳)

تشریح: رکوع پانے والا رکعت پانے والا دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: رکوع کی قیام سے قریب ترین مشابہت ہے۔ کیونکہ رکوع نصف قیام ہے۔ رکوع کی حالت میں آدھا جسم کھڑا ہوتا ہے۔ پس جس نے رکوع پالیا اس نے گویا قیام کو بھی پالیا۔ پس تمام ارکان اس کے ہاتھ آ گئے۔ اس لئے رکعت پالی۔ رہا رکن قراءت تو وہ امام کے ذمہ ہے۔ قائلین فاتحہ نے بھی یہاں یہ بات خواہی نخواہی مان لی ہے کہ مقتدی کی طرف سے فاتحہ امام نے پڑھ لیا ہے۔

دوسری وجہ: نماز میں سجدہ اصلِ اصول ہے۔ وہی نماز سے اصل مقصود ہے۔ کیونکہ وہی غایتِ تواضع ہے جو نماز سے مقصود ہے۔ اور قیام و رکوع تو سجدہ کی تمہید اور پیش خیمہ ہیں۔ پس جب اصل ہاتھ آ گیا تو رکعت پالی، اور اصل فوت ہو گیا تو رکعت فوت ہو گئی۔ اور تمہیدی چیزوں کے فوت ہونے کی پروانہیں کی۔

تنہا نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ جماعت سے نماز پڑھنے کی حکمت

حدیث ــــــ حضرت یزید بن الاسود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے حج کے موقعہ پر منیٰ کی مسجد خیف میں یہ واقعہ پیش آیا کہ جب آپؐ فجر کی نماز پڑھا کر فارغ ہوئے تو دیکھا کہ پیچھے دو آدمی علحدہ بیٹھے ہیں۔ آپؐ نے ان کو طلب فرمایا۔ وہ ڈرے سہمے آئے۔ آپؐ نے پوچھا: ''تم دونوں نماز میں کیوں شامل نہیں ہوئے؟'' انھوں نے عرض کیا کہ ہم اپنے ڈیروں میں نماز پڑھ کر آئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''پھر بھی ایسا نہ کرو۔ جب تم دونوں اپنے ڈیروں میں نماز پڑھ لو، پھر ایسی مسجد میں آؤ جہاں جماعت ہورہی ہے، تو لوگوں کے ساتھ بھی نماز پڑھ لو۔ پس وہ یعنی مسجد میں پڑھی ہوئی نماز تمہارے لئے نفل ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۵۲)

تشریح: یہ دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم اس لئے ہے کہ تارکِ نماز: گھر میں نماز پڑھنے کا بہانہ نہ بنائے، اور اس سے باز پرس ناممکن نہ ہوجائے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا نماز میں شریک ہونا اور کچھ کا علحدہ بیٹھا رہنا کیا اچھی بات ہے! یہ تو مسلمانوں کی وحدت اور اجتماعیت کو پارہ پارہ کرنا ہے، گو سرسری نظر ہی میں سہی، اس لئے اس سے احتراز ضروری ہے۔

فائدہ: جہاں پہلی وجہ ہو، وہاں پانچوں نمازوں میں شریک ہوجانا چاہئے، تاکہ امیر کے عتاب سے بچ جائے۔ رہی یہ بات کہ عصر اور فجر کے بعد نوافل مکروہ ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ: إذا ابْتُلِي ببليَّتَيْنِ فلْيَختَرْ اهونَهما: یعنی جب دو مصیبتیں درپیش ہوں تو ہلکی کو اختیار کرنا چاہئے۔ اور یہاں ہلکی: کراہیت کا ارتکاب کرنا ہے۔ اور مغرب میں چاہے تو امام کے ساتھ سلام پھیر دے۔ دو نفل ہوجائیں گی اور ایک رائگاں جائے گی اور چاہے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت اور پڑھ لے۔ چار نفل ہوجائیں گی۔

اور جہاں امیر کی سرزنش کا موقع نہ ہو، وہاں صرف ظہر اور عشا میں نفل کی نیت سے شریک ہونا چاہئے۔ باقی تین نمازوں میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔ دار قطنی (۴۱۶:۱) میں روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے عصر کی جماعت میں شرکت نہیں کی پس یہی حکم فجر کا اور مغرب کا ہے۔

[٨] قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا جئتم إلى الصلاة، ونحن سجود، فاسجُدوا، ولاتعدُّوه شيئًا، ومن أدرك الركعة فقد أدرك الصلاة"

أقول: ذلك: لأن الركوع أقربُ شِبْهًا بالقيام، فمن أدرك الركوع فكأنه أدركه، وأيضًا: فالسجدة أصلُ أصولِ الصلاة، والقيامُ والركوعُ تمهيدٌ له وتوطئةٌ.

[٩] قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا صليتُما في رحا لكما، ثم أتيتُما مسجدَ جماعة، فصلِّيا معهم، فإنها لكمانافلة"

أقول: ذلك لئلا يعتذر تارك الصلاة بأنه صلى في بيته، فيمتنع الإنكار عليه، ولئلا تفترق كلمة المسلمين، ولو بادي الرأي.

ترجمہ: (۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: وہ بات اس لئے ہے کہ رکوع کی قیام سے قریب ترین مشابہت ہے۔ پس جس نے رکوع پالیا تو گویا اس نے قیام بھی پالیا۔ اور نیز: پس سجدہ نماز کی اصلِ اصول ہے۔ اور قیام اور رکوع اس کی تمہید اور تیاری ہیں۔

(۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: وہ بات اس لئے ہے کہ تاکہ نہ بہانہ بنائے تارکِ نماز کہ اس نے گھر میں نماز پڑھ لی ہے۔ پس ناممکن ہو جائے اس سے باز پرس کرنا۔ اور اس لئے تاکہ مسلمانوں کا کلمہ متفرق نہ ہو، گو سرسری نظر ہی میں سہی۔

☆ ☆ ☆

باب ــــــ ۱۶

جمعہ کا بیان

اجتماعی عبادت کے لئے دن کی تعیین کا مسئلہ

محلہ میں نماز کی اشاعت کے لئے پنج وقتہ نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا جو نظام بنایا گیا، اس کا بیان گذشتہ باب میں آچکا ہے۔ اور شہر میں نماز کی اشاعت کے لئے یعنی اجتماعی عبادت کے لئے چونکہ روزانہ لوگوں کا جمع ہونا مشکل امر تھا، اس لئے اس کے لئے کسی مدت کی تعیین ضروری ہے۔ یہ مدت نہ بہت مختصر ہونی چاہئے، نہ بہت لمبی۔ کیونکہ مدت اگر مختصر ہوگی تو لوگوں کو پریشانی ہوگی۔ اور مدت لمبی ہوگی تو مقصد فوت ہو جائے گا یعنی نماز کی شہر میں اشاعت خواطر خواہ نہیں ہوگی۔ پس کوئی بین بین مدت ہونی چاہئے۔ اور وہ ہفتہ کی مدت ہے۔ عرب وعجم میں اور اکثر مذاہب میں یہ مدت مستعمل ہے۔ اور وہ اس مقصد کے لئے کارآمد بھی ہے۔ اس لئے اجتماعی عبادت کے لئے ہفتہ واری اجتماع طے کیا گیا ہے۔

رہا دن کی تعیین کا مسئلہ: یعنی ہفتہ کے سات دنوں میں سے کونسا دن اس اجتماعی عبادت کے لئے مقرر کیا جائے؟ تو اس میں اختلاف ہوا ہے: یہود نے بار کا دن پسند کیا ہے اور عیسائیوں نے اتوار کا۔ اور اس انتخاب کی وجوہ ان لوگوں کے ذہنوں میں تھیں: یہود کا خیال تھا کہ جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ تخلیقِ کائنات کے عمل سے فارغ ہوئے ہیں۔ اور بار کا دن بے بار رہا ہے۔ اس لئے اس دن کاروبار بند رکھنا چاہئے اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہونا چاہئے۔ اور عیسائیوں کا نقطۂ نظر یہ

تھا کہ اتوار کے دن تخلیق کا عمل شروع ہوا ہے۔ اس لئے شکر وامتنان کی بجا آوری کے لئے وہی دن موزوں ہے[1]
مگر اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ایک عظیم علم سے سرفراز فرمایا یعنی انھوں نے یہ بات بوجھ لی کہ سب سے بہتر دن: جمعہ کا دن ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ نے اولاً صحابہ پر کھولی۔ ان کو جمعہ کی فضیلت الہام فرمائی۔ چنانچہ ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں صحابہ نے سب سے پہلے اجتہاد سے جمعہ قائم فرمایا۔ ابوداؤد شریف (حدیث ۱۰۶۹ باب الجمعۃ فی القریٰ) میں روایت ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جب بھی جمعہ کی اذان سنتے تھے تو حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے لئے دعائے خیر کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے بتایا کہ حضرت اسعد ہی نے سب سے پہلے مسلمانوں کو جمع کر کے فلاں مقام میں جمعہ قائم کیا ہے۔ جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد کل چالیس تھی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ ایک بلند پایہ صحابی ہیں۔ مدینہ میں اسلام کی اشاعت میں ان کی مساعی جمیلہ کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی وفات ہجرت کے بعد جلدی ہوگئی ہے اس لئے تاریخ اسلامی میں گمنام ہیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ مسلمانوں کو مدینہ سے باہر ایک باغ میں جمع کیا۔ تاکہ پتہ چلے کہ مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے؟ اور وہ کس حال میں ہیں؟ جب سب حضرات جمع ہوئے تو مسلمانوں کی تعداد توقع سے زیادہ تھی۔ سب ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوئے۔ حضرت اسعدؓ نے ایک بکرا ذبح کر کے سب کی دعوت کی۔ اتفاق سے یہ جمعہ کا دن تھا۔ کھانا کھا کر سب نے جماعت سے دوگانۂ شکر ادا کیا۔ اور مشورہ ہوا کہ آئندہ بھی ہفتہ میں ایک بار جمع ہونا چاہئے، تاکہ ایک دوسرے کے احوال کا پتہ چلے۔ پھر یہ بات زیر غور آئی کہ کس دن جمع ہونا چاہئے؟ سب نے جمعہ کے دن کی رائے دی۔ اور وجہ یہ بیان کی ہم اہل کتاب سے پیچھے کیوں رہیں۔ دین کے کاموں میں ہمیں ان سے ایک دن آگے رہنا چاہئے۔ اس طرح جمعہ کے دن کا انتخاب عمل میں آیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ثانیاً یہ علم آنحضرت ﷺ پر کھولا۔ مصنف ابن ابی شیبہ ۲: ۱۵۰ فضل الجمعۃ) میں روایت ہے: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جبریل میرے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں سفید آئینہ جیسی کوئی چیز تھی۔ اس میں ایک سیاہ نقطہ تھا۔ میں نے پوچھا: جبریل! یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ جمعہ ہے۔ میں نے پوچھا: جمعہ کیا ہے؟ فرمایا: تمہارے لئے اس میں خیر ہے۔ میں نے پوچھا: اس میں کیا خیر ہے؟ فرمایا: وہ آپؐ کے لئے اور آپؐ کی امت کے لئے روز عید ہے۔ اور یہود ونصاریٰ تمہارے پیچھے ہیں یعنی ان کی عبادت کے دن بعد میں آرہے ہیں۔ میں نے پوچھا: اس دن میں کیا خصوصیت ہے؟ فرمایا: اس میں ایک ساعتِ مَرجوّہ ہے (پھر اس کی تفصیل ہے جو آگے آرہی ہے) میں نے پوچھا: اس میں یہ سیاہ نقطہ کیا ہے؟ فرمایا: یہی وہ ساعتِ مرجوہ ہے، جو جمعہ کے دن میں ہوتی ہے۔ اور یہ سید الایام ہے۔ قیامت کے دن ہم اس کو ''یوم المزید'' کہیں گے (پھر مشک کے ٹیلوں والی جنت میں جمعہ کے دن دربار خداوندی کا تذکرہ ہے۔ اور حضرت

[1] وجوہ ترجیح کا بیان بطور مثال ہے۔ ورنہ معلوم نہیں تشریع کے وقت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے صحابہ کے ذہنوں میں کیا کیا وجوہ ترجیح ہونگی ۱۲

جبرئیل نے یہ بھی بیان فرمایا کہ اس دن میں اللہ تعالیٰ جنتیوں کو کس طرح مزید نعمتوں سے نوازیں گے)

اس مشاہدہ میں آپ کو جو علم عطا فرمایا گیا ہے، اس کا حاصل تین باتیں ہیں:

پہلی بات: عبادت کے لئے بہترین وقت وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ بندوں سے قریب ہوتے ہیں۔ اور جس وقت میں بندوں کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ کیونکہ جب وہ عنایات کے انعطاف کا وقت ہے اور اس میں دعائیں قبول کی جاتی ہیں تو عبادتیں بھی قبول کی جائیں گی۔ ایسے وقت میں کی ہوئی عبادت قلوب کی تھاہ میں اثر کرتی ہے۔ اور تھوڑی عبادت بھی بہت نفع دیتی ہے۔

دوسری بات: بندوں سے اللہ کی نزدیکی کے لئے ایک وقت مقرر ہے، جو ہر ہفتہ آتا ہے۔ اسی وقت میں اللہ تعالیٰ مشک کے ٹیلوں والی جنت میں دربار کریں گے، تجلی فرمائیں گے اور جنتیوں کو نعمتوں سے نوازیں گے۔

تیسری بات: اللہ کی نزدیکی کا یہ وقت ہفتہ کے کسی بھی دن میں ہوسکتا ہے۔ مگر اس کی زیادہ احتمالی جگہ جمعہ کا دن ہے۔ کیونکہ اس دن میں بہت سے اہم واقعات زمانہ ماضی میں پیش آچکے ہیں۔ اور ایک خصوصیت (ساعتِ مرجوّہ) تو ہر جمعہ میں پائی جاتی ہے۔ اور ایک اہم واقعہ آئندہ اس دن میں پیش آنے والا ہے۔ اور اہم کام اہم دن میں کئے جاتے ہیں۔ اور کسی دن میں اہم کام کرنے کی وجہ سے بھی اس دن کو اہمیت حاصل ہوجاتی ہے —— گذشتہ زمانہ میں جمعہ کے دن میں درج ذیل واقعات پیش آچکے ہیں:

پہلا واقعہ: جمعہ کے دن حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے ہیں۔ آپ ابوالبشر ہیں۔ پس آپ کی تخلیق پوری انسانیت پر احسانِ عظیم ہے۔

دوسرا واقعہ: جمعہ کے دن حضرت آدم علیہ السلام جنت میں داخل کئے گئے ہیں۔ یہ وہی جمعہ بھی ہوسکتا ہے جس میں آپ کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ اور کوئی اور جمعہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور انسانوں کے مورثِ اعلیٰ کا جنت کی نعمت سے سرفراز کیا جانا ساری اولاد پر احسانِ عظیم ہے۔

تیسرا واقعہ: جمعہ کے دن حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا گیا ہے اور زمین پر اتارا گیا ہے۔ اور آپ کو خلافتِ ارضی کا تاج پہنایا گیا ہے۔ پس یہ اولادِ آدم کے لئے بھی بڑا اعزاز ہے۔ جنت سے اخراج گو بظاہر نامناسب بات معلوم ہوتی ہے، مگر وہ اپنے عواقب کے اعتبار سے ایک عظیم نعمت ہے۔

چوتھا واقعہ: جمعہ کے دن آدم علیہ السلام کی وفات ہوئی ہے۔ اور وفات کی یادگار میں لوگ برسی مناتے ہی ہیں۔

ساعتِ مرجوّہ: اور ہر جمعہ میں ساعتِ مرجوّہ ہے، جو دعا کی قبولیت کی گھڑی ہے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ کوئی مسلمان بندہ اس گھڑی میں اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی کوئی بھلائی مانگ لے اور وہ اس کے مقدر میں بھی ہو، تو وہ ضرور اس کو دی جاتی ہے۔ اور اگر مقدر میں نہ ہو تو وہ دعا ذخیرہ کرلی جاتی ہے۔ اور مطلوبہ چیز سے اللہ تعالیٰ بہتر چیز عطا فرماتے

ہیں۔اور اگر اس نے کسی شر سے پناہ چاہی ہے،اور وہ شر مقدر نہیں ہوتا،تو اس سے اس شر کو ہٹادیا جاتا ہے۔ اور اگر مقدر ہوتا ہے تو کوئی اور بڑی آفت ٹال دی جاتی ہے۔ساعتِ مرجوہ کی یہ وضاحت جبرئیل علیہ السلام نے مذکورہ روایت میں کی ہے۔

آئندہ پیش آنے والا واقعہ: اور آئندہ جو واقعات جمعہ کے دن میں پیش آنے والے ہیں ان میں ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ جمعہ کے دن قیامت برپا ہوگی۔ اسی دن صور پھونکا جائے گا،اور اسی دن کائنات پر بے ہوشی طاری ہوگی۔اور قیامت کے بعد ہی نیک لوگ جنت میں جائیں گے۔پس نیکوں کے حق میں قیامت کا دن انعام کا دن ہے——— اور موطا کی روایت میں ہے کہ جمعہ کے دن ہر جانور کان لگائے رہتا ہے یعنی صبح صادق سے طلوع آفتاب تک وحشت زدہ، خوف کھایا ہوا ہوتا ہے، جیسے خوفناک آواز سے آدمی خوف زدہ ہوجاتا ہے۔

سوال: حیوانات کو اس بات کا پتہ کیسے چلتا ہے کہ جمعہ کو قیامت بپا ہونے والی ہے؟ اور وہ گھبراتے کیوں ہیں، ان کے لئے تو کوئی جزاوسزا نہیں؟

جواب: حیوانات پر یہ علم ملأ سافل سے مترشح ہوتا ہے۔اور ملائکہ پر یہ علم ملأ اعلی سے مترشح ہوتا ہے (اور جنات اور انسانوں پر یہ علم اس لئے مترشح نہیں ہوتا کہ ان کی قوتِ عاقلہ مضبوط ہے۔ضعیف قوتِ عاقلہ رکھنے والی مخلوقات پر تکوینی علوم اور غیبی امور زیادہ منکشف ہوتے ہیں)

اور حیوانات کی گھبراہٹ ایسی ہوتی ہے جیسی فرشتوں کی گھبراہٹ، جبکہ ان پر پہلی مرتبہ فیصلۂ خداوندی نازل ہوتا ہے۔حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی بات کا فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے اپنے پَر پھڑ پھڑاتے ہیں۔اس طرح وہ حکم الٰہی کے سامنے انقیاد کا اظہار کرتے ہیں۔اور اللہ کا فیصلہ اس طرح اترتا ہے جیسے کسی چکنے پتھر پر لوہے کی زنجیر کھینچی جائے۔پھر جب فرشتوں کے دل سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو ماتحت فرشتے بالائی فرشتوں سے پوچھتے ہیں: ''تمہارے پروردگار نے کیا حکم دیا؟'' آخر تک (بخاری حدیث ۴۷۰۱)

اور سورۃ الضحیٰ کی آخری آیت میں اللہ پاک نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا ہے:﴿ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ یعنی آپؐ اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہئے۔چنانچہ ایک متفق علیہ روایت میں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپؐ نے اللہ کی اس عظیم الشان نعمت کا تذکرہ فرمایا ہے کہ: ''ہم پیچھے آنے والے ہیں (یعنی دنیا میں) اور پہلے ہونے والے ہیں قیامت کے دن (یعنی جنت میں داخل ہونے میں یا حساب کے لئے پیش ہونے میں) البتہ یہ بات ہے کہ اہل کتاب ہم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں۔اور ہم ان کے بعد کتاب دیئے گئے ہیں (یعنی صرف اس ایک بات میں وہ ہم سے برتر ہیں) پھر یہ ان کا وہ دن ہے جو ان پر فرض کیا گیا ہے (یعنی ایک غیر متعین دن۔جو ہمارے حق میں جمعہ کا دن ہے۔اور اہل کتاب کے حق میں ہار اور اتوار کے دن ہیں) پس انھوں نے اختلاف کیا اس دن میں (یعنی اپنے انبیاء سے) اور راہ دکھائی ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس دن کے لئے (یعنی جمعہ کے دن کے لئے۔جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے)

حاصل کلام: یہ ہے کہ جمعہ کے دن کا انتخاب ایک ایسی فضیلت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خاص کیا ہے۔ کسی بھی دوسری امت کو یہ دولت نصیب نہیں ہوئی فلہ الحمد و الشکر!

سوال: تو کیا ہم یہ بات سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ملتِ موسوی میں بار کا دن، اور ملت عیسوی میں اتوار کا دن بوگس (غیر حقیقی) تھا؟

جواب: توبہ! یہ بات کیونکر ممکن ہے۔ وہ بھی تو ملل حقہ تھیں۔ یہود و نصاری کے ہاتھ سے بھی وہ بات نہیں گئی جس کا آئین میں ہونا مناسب تھا، بلکہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ: ''تمام سماوی ادیان قانون سازی کے ضابطوں کو چوکتے نہیں ہیں'' اور یہ الگ بات ہے کہ کوئی ملت کسی زائد فضیلت کے ساتھ ممتاز کی جائے۔

وضاحت: اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہفتہ میں اجتماعی عبادت کے لئے کسی دن کی تعیین کا مسئلہ اجتہادی تھا۔ اور اجتہاد امتوں کو کرنا تھا۔ انبیاء کو صرف تائید کرنی تھی۔ اور اجتہادی امور میں نفس الامر کے اعتبار سے تو حق ایک ہوتا ہے، مگر عمل کے اعتبار سے حق متعدد ہوتے ہیں۔ جیسے ائمہ اربعہ کے اختلافی مسائل میں نفس الامر کے اعتبار سے تو حق ایک ہے، اور جو مجتہد اس کو پالیتا ہے اس کو دوہرا اجر ملتا ہے۔ مگر عمل کے اعتبار سے ہر رائے برحق ہے، چنانچہ جو صواب کو چوک جاتا ہے وہ بھی اجر کا مستحق ہوتا ہے —— اور نبی کی موجودگی میں امت کو اجتہاد مفوّض ہونے کی مثال بدر کے قیدیوں کا مسئلہ ہے۔ جو صحابہ کو سپرد کیا گیا تھا —— اسی طرح اجتماعی عبادت کے لئے کسی دن کی تعیین کا مسئلہ امتوں کے حوالے کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہود نے اجتہاد سے بار کا انتخاب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اشارہ کیا کہ بار نہیں کوئی اور دن منتخب کرو، کیونکہ آپ کو اللہ کی پسند کی بھنک پڑ گئی تھی۔ مگر یہود نے اپنی بات پر اصرار کیا تو بار ہی ان کے لئے طے کر دیا گیا۔ اور عمل کے اعتبار سے وہی دن ان کے لئے برحق ثابت ہوا۔ سورۃ النحل آیت ۱۲۴ میں ہے: ﴿إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ یعنی بار کا دن صرف انہی لوگوں پر لازم کیا گیا تھا جنھوں نے اس میں اختلاف کیا تھا یعنی اپنے پیغمبر کے اشارے کی خلاف ورزی کی تھی۔ اسی طرح عیسائیوں نے اتوار کا انتخاب کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو بھی اشارہ دیا کہ آگے بڑھو، مگر انھوں نے پیچھے رہنا پسند کیا تو ان کو پیچھے کر دیا گیا اور عمل کے اعتبار سے اتوار ہی ان کے حق میں برحق قرار پایا۔ پھر جب اس امت کا نمبر آیا تو اس نے خود ہی جمعہ کا انتخاب کیا۔ اور نبیٔ امت نے اس کی تائید کی، تو یہی دن اس امت کے حق میں برحق قرار پایا۔ جو نفس الامر میں بھی اللہ کو پسند ہے۔ اور یہ سب توفیق خداوندی سے ہوا فلہ المِنّة!

﴿الجمعة﴾

الأصل فيها: أنه لما كانت إشاعةُ الصلاة في البلد —— بأن يَجتمع لها أهلُها —— متعذِّرَةً كلَّ يوم: وجب أن يعيَّن لها حدٌّ، لايَسْرُع دورانُه جدًا، فيتعسَّر عليهم، ولايَبْطُؤُ جدًا، فيفوتهم

المقصود، وكان الأسبوع مستعملا فى العرب، والعجم، وأكثرِ الملل، وكان صالحًا لهذا الحدّ، فوجب أن يُجعل ميقاتُها ذلك.

ثم اختلف أهل الملل فى اليوم الذى يوقَّت به: فاختار اليهودُ السبتَ، والنصارى الأحدَ لمرجِّحاتٍ ظهرت لهم، وخَصَّ اللّٰه تعالى هذه الأمة بعلم عظيمٍ، نَفَثَه أولاً فى صدور أصحابه صلى الله عليه وسلم، حتى أقاموا الجمعة فى المدينة قبلَ مقدمه صلى الله عليه وسلم، وكَشَفَه عليه ثانيًا، بأن أتاه جبريل بمرآة، فيها نقطةٌ سوداء، فَعَرَّفَه ما أُريد بهذا المثال، فَعَرَفَ.

وحاصل هذا العلم:

[١] أن أحق الأوقات بأداء الطاعات، هو الوقت الذى يتقرب فيه اللّٰهُ إلى عباده، ويُستجاب فيه أدعيتُهم، لأنه أدنى أن تُقبل طاعتُهم، وتُؤثِّر فى صميم النفس، وتَنْفعَ نفعَ عددٍ كثير من الطاعات.

[٢] وأن لله وقتًا دائرًا بدورانِ الأسبوع، يتقرب فيه إلى عباده، وهو الذى يتجلّى فيه لعباده فى جَنَّةِ الكثيب.

[٣] وأن أقربَ مَظِنَّةٍ لهذا الوقت: هو يوم الجمعة، فإنه وقع فيه أمور عظام، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " خيرُ يوم طلعت عليه الشمسُ يومُ الجمعة، فيه خُلق آدم، وفيه أُدخل الجنة، وفيه أُخرج منها، ولاتقوم الساعة إلا فى يوم الجمعة"

والبهائمُ تكون فيه مُسِيْخَةً يعنى فَزِعَةً مرعوبةً، كالذى هَالَهُ صوتٌ شديد. وذلك: لما يترشح على نفوسهم من الملأ السافل،ويترشح عليهم من الملأ الأعلى، حين تَفْزَع أولاً لنزول القضاء، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" كسِلسِلةٍ على صفوانٍ، حتى إذا فُزِّعَ عن قلوبهم" الحديث.

وقد حدَّث النبيُّ صلى الله عليه وسلم بهذه النعمة، كما أمره ربُّه، فقال:" نحن الآخرون السابقون يوم القيامة" يعنى فى دخول الجنة، أو العرض للحساب" بَيْدَ أنهم أُوتوا الكتاب من قبلنا، وأُوتيناه من بعدهم" يعنى غير هذه الخصلة، فإن اليهود والنصارى تقدموا فيها" ثم هذا يومُهم الذى فُرض عليهم" يعنى الفردَ المنتشر، الصادق بالجمعة فى حقنا، وبالسبت والأحد فى حقهم" فاختلفوا فيه، فهدانا الله له" أى لهذا اليوم كما هو عند الله.

وبالجملة: فتلك فضيلة خصَّ الله بها هذه الأمةَ، واليهودُ والنصارى لم يَفُتْهم أصلُ ما ينبغى فى التشريع؛ وكذلك الشرائع السماوية لاتُخْطِئُ قوانينَ التشريع، وإن امتاز بعضُها بفضيلة زائدةٍ.

ترجمہ: جمعہ کا بیان: جمعہ میں اصل: یہ ہے کہ جب شہر میں نماز کی اشاعت ـــــ بایں طور کہ اکٹھا ہوں نماز کے لئے بستی کے لوگ ـــــ محال جیسی تھی ہر دن میں تو ضروری ہوا کہ متعین کی جائے اشاعت کے لئے کوئی حد۔ بہت جلدی نہ ہو اس کا گھومنا، پس دشوار ہو جائے جمع ہونا لوگوں کے لئے۔ اور نہ دیر کرے وہ گھومنا، پس فوت ہو جائے مقصود۔ اور ہفتہ مستعمل تھا عرب وعجم میں اور اکثر مذاہب میں۔ اور وہ اس حد کے لئے مناسب تھا۔ تو ضروری ہوا کہ گردانی جائے اشاعت کی مقدار یہ یعنی ہفتہ۔

پھر اختلاف کیا اہل ملل نے اس دن میں جس کے ذریعہ تعیین کی جائے۔ پس پسند کیا یہود نے بار کو، اور نصاریٰ نے اتوار کو۔ ان ترجیحات کی بنا پر جو ان کے لئے ظاہر ہوئیں۔ اور خاص کیا اللہ نے اس امت کو ایک بڑے علم کے ساتھ۔ پھونکا اس علم کو اولاً آنحضرت ﷺ کے صحابہ کے سینوں میں، یہاں تک کہ قائم کیا انھوں نے جمعہ مدینہ منورہ میں آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے۔ اور کھولا اس علم کو ثانیاً آپؐ پر، بایں طور کہ آئے آپؐ کے پاس جبرئیل ایک آئینہ لے کر، جس میں سیاہ نقطہ تھا۔ پس واقف کیا انھوں نے اس بات سے جو مراد لی گئی تھی اس مثال سے، پس آپ نے بات جان لی۔

اور اس علم کا حاصل: (۱) یہ ہے کہ اوقات میں سب سے زیادہ حقدار عبادات کی ادائیگی کے لئے: وہ وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے نزدیک ہوتے ہیں۔ اور جس میں بندوں کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ وقت زیادہ قریب ہے اس بات سے کہ قبول کی جائے بندوں کی عبادت۔ اور اثر کرے وہ عبادت ان کے دل کی گہرائی میں۔ اور فائدہ پہنچائے وہ عبادات میں سے بہت زیادہ تعداد کا نفع ـــــ (۲) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ایک وقت ہے گھومنے والا ہے وہ ہفتہ کے گھومنے کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ اس میں بندوں سے نزدیک ہوتے ہیں۔ اور وہی وہ وقت ہے جس میں تجلی فرمائیں گے اللہ تعالیٰ اپنی بندوں کے لئے ٹیلوں کے باغ میں ـــــ (۳) اور یہ کہ قریب ترین جگہ اس وقت کے لئے جمعہ کا دن ہے۔ پس بیشک اس دن میں پیش آئے ہیں بڑے معاملات۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ”بہترین دن جس میں سورج طلوع کرتا ہے: جمعہ کا دن ہے۔ اس میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اور اس میں جنت میں داخل کئے گئے، اور اس میں جنت سے نکالے گئے، اور نہیں برپا ہوگی قیامت مگر جمعہ کے دن میں“

اور چوپائے اس دن میں کان لگانے والے ہوتے ہیں یعنی گھبرائے ہوئے، دہشت زدہ، اس شخص کی طرح جس کو گھبرادے کوئی سخت آواز۔ اور وہ بات اس علم کی وجہ سے ہے جو ملأ سافل کی طرف سے چوپایوں کے دلوں پر مترشح ہوتا ہے۔ اور ملأ سافل پر ملأ اعلیٰ کی طرف سے مترشح ہوتا ہے، جبکہ گھبرا جاتے ہیں وہ اولاً فیصلہ کے نزول کے وقت۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ”جیسے زنجیر کسی چکنے پتھر پر، یہاں تک کہ جب گھبراہٹ دور ہوتی ہے ان کے دلوں سے“ آخر تک۔

اور تحقیق بیان فرمائی نبی ﷺ نے یہ نعمت، جیسا کہ آپؐ کو آپؐ کے رب نے حکم دیا ہے۔ پس فرمایا: ”ہم پچھلے ہیں، پہلے ہیں قیامت کے دن“ (یعنی جنت میں داخل ہونے میں یا حساب کے لئے پیشی میں یعنی ہمارا حساب سب

سے پہلے شروع ہوگا) علاوہ اس کے کہ وہ ہم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں۔ اور ہم ان کے بعد کتاب دیئے گئے ہیں (یعنی اس بات کے علاوہ۔ پس بیشک یہود ونصاری آگے بڑھ گئے ہیں اس بات میں) پھر یہ ان کا دن ہے جو کہ مقرر کیا گیا ہے ان پر (یعنی غیر متعین دن جو صادق آنے والا ہے جمعہ کے ذریعہ ہمارے حق میں۔ اور باراور اتوار کے ذریعہ ان کے حق میں) پس اختلاف کیا انھوں نے اس دن میں۔ پس راہ دکھائی ہم کو اللہ نے اس دن کے لئے (یعنی اس جمعہ کے دن کے لئے، جیسا کہ وہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے)

اور حاصل کلام: پس یہ ایک فضیلت ہے۔ خاص کیا ہے اس کے ساتھ اللہ نے اس امت کو۔ اور یہود ونصاری نہیں فوت ہوئی ان سے وہ اصل چیز جو قانون سازی میں مناسب ہے۔ اور اسی طرح شریعتیں: نہیں چوکتی ہیں قانون سازی کے ضابطوں کو۔ اگرچہ ان کے بعض ممتاز ہوتے ہیں کسی زائد فضیلت کے ساتھ۔

ترکیب: یجتمع لها أهلها میں پہلی ضمیر مؤنث إشاعة کی طرف راجع ہے اور دوسری البلد کی طرف بتاویل قریہ..... لما یترشح علی نفوسهم میں ضمیر هم راجع ہے البهائم کی طرف۔ بہتر واحد مؤنث غائب کی ضمیر تھی۔

☆ ☆ ☆

قبولیت کی گھڑی اور اس کی دو احتمالی جگہیں

جمعہ کے دن میں جو رحمت وقبولیت کی ایک خاص گھڑی ہے، جو آنحضرت ﷺ کو سیاہ نقطہ کی شکل میں دکھائی گئی تھی۔ اس کی عظمت شان بیان کرتے ہوئے آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے: ''بیشک جمعہ کے دن میں یقیناً ایک ایسی گھڑی ہے کہ اگر کسی مسلمان بندے کو اس میں اللہ تعالیٰ سے کوئی خیر کی چیز مانگنے کی توفیق ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز عطا فرماتے ہیں'' ——— پھر روایات میں اس ساعتِ اجابت کی تعیین میں اختلاف ہے۔ فتح الباری (۲: ۴۱۵) میں تفصیل ہے۔ ان میں سے مشہور روایتیں دو ہیں:

پہلی روایت: مسلم شریف میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ساعت: جس وقت امام خطبہ کے لئے ممبر پر آجائے: اس وقت سے لے کر نماز کے ختم ہونے تک کا وقت ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۵۸) اور یہ گھڑی بابرکت اور قبولیت کا وقت اس لئے ہے کہ زوال کے وقت آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۱۶۹ باب السنن) اور اس وقت ایماندار بندے رغبت کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پس اس وقت میں آسمان اور زمین کی برکتیں اکٹھا ہوجاتی ہیں۔ آسمان کی برکت: رحمت کا باب وا ہونا۔ اور زمین کی برکت: بندوں کی رغبتیں اور توجہات۔

دوسری روایت: موطا میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ساعت عصر کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۵۹) اور یہ گھڑی بابرکت اور قبولیت کا وقت اس لئے ہے کہ یہ اللہ کے فیصلوں کے

نازل ہونے کا وقت ہے۔اور بعض آسمانی کتابوں میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے دن عصر کے بعد ہوئی ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک: ان روایات کا اور ان کے علاوہ دیگر روایات کا مقصد حتمی تعیین نہیں ہے۔ بلکہ یہ قریب ترین احتمالی مواقع کا بیان ہے۔اور اس کی نظیر: شب قدر کا معاملہ ہے۔اس کی تعیین میں بھی جو مختلف روایات آئی ہیں ان کا مقصد بھی احتمالی جگہوں کا بیان ہے۔بعض روایات میں ہے کہ یہ دونوں چیزیں (ساعتِ مرجوہ اور شب قدر) بھلا دی گئی ہیں۔اور اسی میں امت کی بھلائی ہے۔

ونَوَّهَ صلى الله عليه وسلم بهذه الساعة، وعظَّم شأنَها، فقال: "لايوافقها مسلم يسأل الله فيها خيرًا إلا أعطاه إياه" ثم اختلفت الرواية في تعيينها:

فقيل: هي ما بين أن يجلس الإمام إلى أن تُقضى الصلاةُ، لأنها ساعةٌ تُفتح فيها أبوابُ السماء، ويكون المؤمنون فيها راغبين إلى الله، فقد اجتمع فيها بركاتُ السماء والأرض.

وقيل: بعد العصر إلى غيبوبة الشمس، لأنهاوقتُ نزول القضاء، وفي بعض الكتب الإلٰهية: أن فيها خُلق آدم؛ وعندي: أن الكل بيانُ أقربِ مظنةٍ، وليس بتعيين.

ترجمہ: اور آنحضرت ﷺ نے شان بلند کی اس گھڑی کی، اور بڑا کیا اس کی مزیّت کو، پس فرمایا: "نہیں مطابق ہوتا ہے اس گھڑی سے کوئی مسلمان درانحالیکہ وہ مانگ رہا ہو اللہ تعالیٰ سے اس گھڑی میں کوئی بھلائی، مگر دیتے ہیں اللہ اس کو وہ چیز" پھر روایتیں مختلف ہیں اس گھڑی کی تعیین میں —— پس کہا گیا کہ وہ گھڑی: وہ وقت ہے جو امام کے بیٹھنے کے درمیان ہے یہاں تک کہ نماز پوری کی جائے۔اس لئے کہ وہ ایک ایسی گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔اور مؤمنین اس میں اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہوتے ہیں۔پس جمع ہوئیں اس گھڑی میں آسمان اور زمین کی برکتیں —— اور کہا گیا: عصر کے بعد سے سورج چھپنے تک ہے۔اس لئے کہ وہ فیصلہ کے نزول کا وقت ہے۔اور بعض آسمانی کتابوں میں ہے کہ اس گھڑی میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے ہیں —— اور میرے نزدیک یہ ہے کہ سب قریب ترین احتمالی مواقع کا بیان ہے۔اور تعیین نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

جمعہ کے تعلق سے پانچ باتوں کی وضاحت

نماز جمعہ چونکہ ایک اجتماعی عبادت ہے، اور اس میں لوگوں کا بڑا اجتماع ہوتا ہے، اس لئے پانچ باتیں بیان کرنی ضروری ہیں:

۱ ـــــ جمعہ کا وجوب اور اس کی تاکید اور ترک جمعہ کے اعذار۔

۲ ـــــ تنظیف (صفائی) کا استحباب یعنی لوگ جمعہ کے لئے آنے سے پہلے مسواک کریں، نہائیں، دھوئیں، خوشبو لگائیں اور اچھا لباس پہن کر آئیں۔

۳ ـــــ جامع مسجد میں لوگ سویرے آئیں، امام سے قریب بیٹھیں، دورانِ خطبہ خاموش رہیں اور لغو کاموں سے بچیں۔ نیز پیدل آئیں۔ سوار ہوکر نہ آئیں۔

۴ ـــــ خطبہ شروع ہونے سے پہلے سنتیں اور نفلیں پڑھیں۔ اور کوئی خطبہ کے دوران آئے تو وہ بھی شاہ صاحب کے نزدیک دو سنتیں پڑھے اور مختصر پڑھے۔

۵ ـــــ جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے۔ نہ لوگوں کی گردنیں پھلانگے، نہ دو آدمیوں کے درمیان گھسے، نہ کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ بیٹھے۔

یہ سب باتیں روایات میں بیان کی گئی ہیں۔ شاہ صاحب ان کی حکمتیں بھی بیان کریں گے۔

پہلی بات: نماز جمعہ کا وجوب اور ترکِ جمعہ کے اعذار

حدیث ـــــ حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو برسرِ منبر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''یا تو جمعہ چھوڑنے والے اپنی حرکت سے باز آجائیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کردیں گے، پھر وہ غافلوں میں سے ہوجائیں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۷۰)

تشریح: اس حدیث سے جمعہ کی تاکید کے علاوہ یہ بات بھی مفہوم ہوتی ہے کہ ترکِ جمعہ دین کی **بے قدری کا** دروازہ کھولتا ہے۔ اور اس راہ سے شیطان انسان پر غالب آجاتا ہے۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''جمعہ ہر مسلمان پر واجب ہے، مگر عورت، بچہ اور غلام مستثنیٰ ہیں'' (بیہقی ۱۷۲:۳) اور ایک روایت میں مریض کا بھی ذکر ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۷۷)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ اس شخص پر واجب ہے جو اذان سنتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۷۵ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں دو راوی مجہول ہیں)

تشریح: ان دو روایتوں میں ترک جمعہ کے اعذار کا بیان ہے۔ تاکہ افراط وتفریط کے درمیان اعتدال قائم ہو۔ افراط یہ ہے کہ خواہ کیسی ہی مجبوری ہو، جمعہ میں آنا ضروری ہے اور تفریط یہ ہے کہ بے عذر بھی تخلف جائز ہے۔ اور اعتدال کی راہ یہ ہے کہ جمعہ فرض ہے، مگر معذور مستثنیٰ ہیں۔ اور ترک جمعہ کے اعذار بطور مثال یہ ہیں:

۱ ـــــ جس کے جمعہ میں آنے سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہو، جیسے عورتیں۔ ان کو وجوب سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ علاوہ

ازیں: عورتوں کے گھریلو مشاغل: بچوں کی نگہداشت وغیرہ معقول اعذار ہیں، جن کی وجہ سے عورتوں پر جماعتوں میں اور جمعہ میں حاضری لازم نہیں کی گئی۔

۲ــــ جو حاضری سے لاچار ہو، جیسے غلام اور قیدی۔

۳ــــ جو مکلّف نہیں ہیں، جیسے بچے اور پاگل۔

۴ــــ جو بیمار یا معذور ہیں اور خود سے جمعہ میں نہیں آسکتے۔

فائدہ: (۱) جو لوگ محلِّ اقامتِ جمعہ میں رہتے ہیں، ان پر جمعہ فرض ہے، چاہے وہ اذان سنتے ہوں یا نہ سنتے ہوں۔ اور جو باہر رہتے ہیں، ان پر جمعہ فرض نہیں، چاہے وہ اذان سنتے ہوں۔ اور یہ حدیث کہ: ''جمعہ اس شخص پر واجب ہے جو اذان سنتا ہے'' اس میں وجوب شرعی مراد نہیں۔ بلکہ احسان ونیکوکاری کے باب کا وجوب مراد ہے۔ ایسی ہی ایک دوسری ضعیف حدیث بھی ہے کہ الجمعة على من آواه الليل إلى أهله یعنی جمعہ اس شخص پر لازم ہے جو جمعہ پڑھ کر رات تک گھر پہنچ سکتا ہو (مشکوۃ حدیث ۱۳۷۶) یہ دونوں روایتیں محلِّ اقامتِ جمعہ سے باہر کے باشندوں کے لئے ہیں۔ اور ان پر جمعہ واجب نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دورِ نبوی میں قُبا اور عوالی کے سب لوگ جمعہ میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ باری باری سے آتے تھے۔ حالانکہ وہ مدینہ سے متصل آبادیاں تھیں۔

فائدہ: (۲) جو لوگ جامع مسجد سے دور، شہر ہی میں رہتے ہیں، ان پر جمعہ فرض ہے۔ اگر ان کے لئے جامع مسجد تک آنے میں دشواری ہو تو وہ اپنے علاقہ میں جمعہ قائم کریں۔ اگرچہ اصل یہی ہے کہ ایک شہر اور ایک بستی میں جمعہ ایک ہی جگہ ہونا چاہئے۔ عہدِ نبوی اور دورِ صحابہ وتابعین کا عمل یہی ہے۔ لیکن اگر شہر بہت بڑا ہے یا کوئی مسجد ایسی نہیں جس میں سارے نمازی سما سکیں تو حسبِ ضرورت دیگر مساجد میں بھی جمعہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ مگر بے ضرورت متعدد جگہ جمعہ قائم کرنا شریعت کے مقصد ومنشأ کو فوت کرنا ہے۔ پس اس سے احتراز ضروری ہے۔

ثم مسَّت الحاجة:

[۱] إلى بيان وجوبها، والتأكيدِ فيه، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: "لَيَنْتَهِيَنَّ أقوامٌ عن وَدْعِهِم الجُمُعاتِ، أو لَيختِمَنَّ اللهُ على قلوبهم، ثم لَيكونُنَّ من الغافلين"

أقول: هذا إشارة إلى أن تركها يفتح بابَ التهاون، وبه يستحوذُ الشيطان.

وقال صلى الله عليه وسلم: " تجب الجمعة على كل مسلم، إلا امرأةٍ، أو صبيٍّ، أو مملوكٍ"

وقال صلى الله عليه وسلم: " الجمعة على من سمع النداء"

أقول: هذا رعاية للعدل بين الإفراط والتفريط، وتخفيفٌ لذوى الأعذار، والذين يَشُقُّ عليهم الوصولُ إليها، أو يكون فى حضورهم فتنة.

ترجمہ: پھر حاجت پیش آئی: (۱) جمعہ کے وجوب اور وجوب میں تاکید کے بیان کی۔ پس فرمایا نبی ﷺ نے: ''البتہ ضرور باز آجائیں لوگ اپنے جمعوں کو چھوڑنے سے، یا ضرور مہر لگادیں گے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر۔ پھر وہ غافلوں میں سے ہوجائیں گے'' (یعنی اپنی اصلاح کی توفیق سے محروم کردیئے جائیں گے) ــــــ میں کہتا ہوں: یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جمعہ کا چھوڑنا دین کی بے قدری کا دروازہ کھولنا ہے۔ اور ترکِ جمعہ سے شیطان غالب آجاتا ہے۔

اور فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ: ''جمعہ ہر مسلمان پر واجب ہے، مگر عورت یا بچہ یا غلام'' اور آپؐ نے فرمایا: ''جمعہ اس پر ہے جو اذان سنے'' ــــــ میں کہتا ہوں: یہ اعتدال کی رعایت ہے، افراط وتفریط کے درمیان۔ اور عذر والوں کے لئے تخفیف ہے اور ان لوگوں کے لئے جن پر جمعہ تک پہنچنا دشوار ہے۔ یا ان کے جمعہ میں آنے سے فتنہ ہوتا ہے۔

☆　　☆　　☆

دوسری بات: تنظیف کا استحباب اور اس کی تین حکمتیں

جمعہ کے دن تنظیف کا اہتمام یعنی مسواک کرنا، غسل کرنا، خوشبو لگانا اور اچھا لباس پہننا مستحب ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''اگر میری امت کے لئے دشواری نہ ہوتی تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا'' ہر نماز سے پہلے مسواک لازم کرنے میں تو حرج ہے، مگر ہفتہ میں ایک بار حکم دینے میں کوئی حرج نہیں، چنانچہ آپؐ نے ایک جمعہ میں ارشاد فرمایا: ''مسلمانو! جمعہ کا یہ دن عید (خوشی) کا دن ہے: پس نہاؤ، اور جس کے پاس خوشبو ہو اس پر کچھ مضائقہ نہیں کہ اس میں سے لگائے اور مسواک تو تم لوگ ضرور کرو'' (مشکوۃ حدیث ۱۳۹۸) دوسری روایت میں ہے کہ: ''اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر گنجائش ہو تو کام کاج کے کپڑوں کے علاوہ خاص جمعہ کے لئے کپڑوں کا ایک جوڑا بنالو'' (مشکوۃ حدیث ۱۳۸۹) اور ابوداؤد میں ہے کہ: ''جس نے جمعہ کے دن غسل کیا۔ اور جو اچھے کپڑے میسر تھے وہ پہنے۔ اور خوشبو اگر اس کے پاس تھی تو وہ بھی لگائی، پھر جمعہ کے لئے آیا'' الی آخرہ (مشکوۃ حدیث ۱۳۸۷)

اور جمعہ کے دن تنظیف کے حکم میں تین حکمتیں ہیں: ایک نماز کے تعلق سے، دوسری: انسانی زندگی کے تعلق سے تیسری: اجتماع میں شرکت کے تعلق سے:

پہلی حکمت: ــــــ نماز کے تعلق سے ــــــ یہ ہے کہ نیک بختی حاصل کرنا چار باتوں پر موقوف ہے۔ ان میں سب سے پہلی بات نظافت وطہارت ہے۔ اور مذکورہ امور کے اہتمام سے صفتِ طہارت سے آگہی دوچند ہوجاتی ہے۔ کیونکہ طہارت کا ثمرہ سرور وانبساط ہے۔ اور وضوء سے زیادہ انبساط غسل سے حاصل ہوتا ہے۔ اور خوشبو لگانے سے اور اچھا لباس زیب تن کرنے سے یہ کیفیت کئی گناہ بڑھ جاتی ہے۔ اور جس قدر طہارت ونظافت کا اہتمام ہوگا اسی قدر نماز کامل ہوگی (تحصیلِ سعادت کا مدار جن صفاتِ اربعہ پر ہے ان کا بیان مبحث چہارم کے باب چہارم میں گذر چکا ہے)

دوسری حکمت: ــــ انسانی زندگی کے تعلق سے ــــ یہ ہے کہ لوگوں کے لئے کوئی ایسا دن ہونا ضروری ہے جس میں وہ نہائیں دھوئیں اور خوشبو لگائیں۔ یہ بات انسانی زندگی کی خوبیوں میں سے ہے۔ حیوانات سے یہی بات انسان کو ممتاز کرتی ہے۔ مسند احمد (۳۴۲:۲) میں فرمایا گیا ہے: ''ہر مسلمان پر اللہ کا حق ہے کہ ہفتہ میں نہائے: اپنا سر اور اپنا چہرہ دھوئے'' کیونکہ روزانہ یہ کام دشوار ہیں۔

اوران کاموں کے لئے جمعہ کا دن متعین کرنے میں دو مصلحتیں ہیں:

پہلی مصلحت: یہ ہے کہ وقت کی تعیین کام پر ابھارتی ہے۔ مثلاً: طالب علموں کے لئے پڑھنے کا کوئی وقت متعین نہ ہوتو وہ گپ شپ میں لگے رہیں گے۔ اور وقت متعین ہوتو گھنٹہ بجتے ہی درسگاہ میں حاضر ہو جائیں گے۔ اسی طرح یہ کہہ دینا کہ ہفتہ میں ایک دن نہالیا کرو: کافی نہیں۔ وقت کی تعیین ضروری ہے۔

دوسری مصلحت: یہ ہے کہ ان امور کے اہتمام سے نماز جمعہ شاندار ہوگی۔ پس جمعہ کی تعیین ہم خرما ہم ثواب کا مصداق ہے۔

تیسری حکمت: ــــ اجتماع میں شرکت کے تعلق سے ــــ یہ ہے کہ جب کسی بڑے اجتماع میں شریک ہونا ہو تو ضروری ہے کہ صاف ستھرا ہو کر جائے، تاکہ لوگ نفرت نہ کریں، بلکہ پاس بلائیں۔ جمعہ کے دن مذکورہ امور کا امر بھی اسی مقصد سے دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ دور نبوی میں لوگ اپنے کام خود کرتے تھے۔ نوکر چاکر نہیں تھے۔ اون کا لباس پہنتے تھے۔ سوتی کپڑے عام نہیں ہوئے تھے۔ مسجد کی چھت نیچی تھی۔ اور حجاز کا خطہ گرم تھا۔ جب جمعہ کی اذان ہوتی تھی تو لوگ کھیتوں اور باغوں سے کام چھوڑ کر سیدھے جمعہ پڑھنے آتے تھے۔ گرمی کے ایک دن میں لوگ جمعہ کے لئے جمع ہوئے۔ پسینہ نکلا اور اونی کپڑوں میں سے ایسی بو اٹھی جیسی بھیڑوں کے جسم سے اٹھتی ہے۔ آنحضرت ﷺ جمعہ پڑھانے نکلے تو دیکھا کہ مسجد کا ماحول بُرا بن رہا ہے۔ اور لوگ ایک دوسرے کی بو سے پریشان ہیں تو آپ نے حکم دیا کہ اس طرح کام پر سے جمعہ پڑھنے نہ آیا کرو۔ پہلے نہاؤ، اچھے کپڑے پہنو اور جو خوشبو میسر ہو، وہ استعمال کرو، پھر جمعہ کے لئے آؤ، تاکہ مسجد میں خوشبو پھیلے، اور ماحول خوشگوار بنے

(یہ دونوں روایتیں متفق علیہ ہیں جامع الاصول حدیث ۵۳۵۹ و ۵۳۶۰)

[۲] وإلى استحباب التنظيف بالغسل، والسواك، والتطيُّبِ، ولُبس الثياب، لأنها من مكمِّلاتِ الصلاة، فيتضاعف التنبُّهُ لخلَّة النظافة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " لولا أن أشُقَّ على أمتى لأمرتُهم بالسواك" ولأنه لابد لهم من يوم يغتسلون فيه، ويتطيبون، لأن ذلك من محاسن ارتفاقات بنى آدم، ولمَّا لم يتيسر كلَّ يومٍ أُمر بذلك يومَ الجمعة، لأن التوقيت يَحُضُّ عليه، ويُكْمِلِ الصلاة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" حقٌّ على كل مسلم أن يغتسل فى كل سبعة أيام يومًا، يغسل فيه رأسه وجسدَه" ولأنهم كانوا عَمَلَةَ أنفسهم، وكان لهم إذا اجتمعوا ريحٌ كريح الضأن، فأُمروا

بالغسل ليكون رافعًا لسبب التنفُّر، وأدعىٰ للاجتماع، بيَّنه ابن عباس، وعائشة رضي الله عنهما.

ترجمہ: (۲) اور (حاجت پیش آئی) تنظیف کے استحباب کے بیان کی: نہانے کے ذریعہ، اور مسواک کے ذریعہ اور خوشبو لگانے کے ذریعہ اور لباس پہننے کے ذریعہ: اس لئے کہ یہ باتیں نماز کے مکملات میں سے ہیں، پس دوچند ہوگی آگہی نظافت کی صفت کے لئے (یہ پہلی حکمت ہے) اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر میری امت پر دشواری نہ ہوتی تو میں ان کو مسواک کا حکم دیتا'' (یہ دلائل کی ابتدا کر کے آگے کی بات قاری کے فہم پر چھوڑ دی ہے) اور اس لئے کہ شان یہ ہے کہ ضروری ہے لوگوں کے لئے کوئی ایسا دن جس میں وہ نہائیں اور خوشبو لگائیں۔ اس لئے کہ یہ انسانوں کی معاشی تدبیروں کی خوبیوں میں سے ہے (یہ دوسری حکمت ہے) اور جب آسان نہیں ہے روزانہ نہانا تو حکم دیا گیا جمعہ کے دن نہانے کا، اس لئے کہ تعیین ابھارتی ہے نہانے پر (یہ پہلی مصلحت ہے) اور کامل کرتی ہے نماز کو (یہ دوسری مصلحت ہے) اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہر مسلمان پر حق لازم ہے کہ نہائے وہ ہر ہفتہ میں ایک دن: دھوئے وہ اس میں اپنا سر اور اپنا جسم'' (اس حدیث کا تعلق دوسری حکمت سے ہے۔ دن کی تعیین کی دونوں مصلحتوں سے تعلق نہیں ہے) اور اس لئے کہ لوگ اپنے کام خود کرنے والے تھے۔ اور جب وہ اکٹھا ہوتے تھے تو ان کے لئے بھیڑ کی بو کی طرح بو ہوتی تھی۔ پس وہ نہانے کا حکم دیئے گئے تاکہ وہ تنفر کے سبب کو اٹھانے والا ہو۔ اور وہ زیادہ بلانے والا ہو اکٹھا ہونے کے لئے (یعنی لوگ شوق سے اپنے پاس بلائیں) بیان کیا اس کو ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہما نے۔

تصحیح: التنفُّر مطبوعہ میں التنفیر تھا۔ مگر مطبوعہ صدیقی میں اور مخطوط کراچی میں التنفُّر ہے۔ تنفر فارسی کلمہ ہے جس کے معنی ہیں نفرت کرنا۔ عربی میں تنفُّر کے معنی ہیں کوچ کرنا۔ اس لئے غالباً مصر والوں نے یہ تبدیلی کی ہے۔ مگر تنفیر کے معنی بھی یہاں موزون نہیں۔ اس لئے ہم نے اسی لفظ کو باقی رکھا ہے جو مصنف کا استعمال کیا ہوا ہے اس کی جگہ موزون لفظ کَرَاهِيَة ہے۔

☆ ☆ ☆

تیسری بات: جمعہ کے لئے پیدل جانے اور اہتمام سے خطبہ سننے کی حکمت

جمعہ کی نماز کے لئے حتی الامکان جلدی جانا چاہئے۔ اور کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو پیدل جانا چاہئے۔ سواری پر نہیں جانا چاہئے۔ اور مسجد میں امام کے قریب رہنا چاہئے۔ اور جب خطبہ شروع ہو تو لایعنی کام نہیں کرنا چاہئے۔ اور خاموش رہ کر غور سے خطبہ سننا چاہئے۔ حضرت اَوس بن اَوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو جمعہ کے دن: نہایا دھویا اور خوب سویرے گیا اور چل کر گیا، سوار ہو کر نہیں گیا۔ اور امام سے قریب رہا اور غور سے خطبہ سنا اور کوئی لغو کام نہیں

کیا تو اس کو ہر قدم پر ایک سال کے عمل کا ثواب ملے گا: اس کے روزوں کا اور تراویح کا'' (مشکوۃ حدیث ۱۳۸۸)

پیدل جانے میں تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: پیدل جانے سے اللہ کے لئے عاجزی اور خاکساری ٹپکتی ہے۔ اور سوار ہو کر جانے میں شان کا اظہار ہوتا ہے۔ پہلی صورت عبادت کے شایان شان ہے دوسری صورت مناسب نہیں۔

دوسری حکمت: جمعہ میں مالدار اور غریب سب آتے ہیں۔ پس جس کے پاس سواری نہیں ہوگی، وہ جمعہ میں آنے سے شرمائے گا۔ اس لئے اس کا سدّباب ضروری ہے۔

تیسری حکمت: سب سوار ہو کر آئیں گے تو سواریاں باندھنے کا اور گاڑیاں کھڑی کرنے کا مسئلہ پیدا ہوگا اس لئے لوگوں کو، کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو پیدل آنا چاہئے۔ (یہ حکمت شارح نے بڑھائی ہے)

اور باقی امور میں حکمت یہ ہے کہ اس طرح خطبہ سننے سے خطبہ میں غور کرنے کا اور نصیحت پذیری کا خوب موقع ملے گا۔ باتیں کرتا رہے گا یا بیکار کاموں میں لگا رہے گا تو خطبہ سننے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

چوتھی بات: خطبہ سے پہلے سنتوں کی حکمت

خطبہ شروع ہونے سے پہلے سنتیں اور دیگر نوافل پڑھنے چاہئیں۔ بیکار نہیں رہنا چاہئے۔ اور اس کی حکمت سنن مؤکدہ کے بیان میں گذر چکی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دل سے غفلت دور کرنے کے لئے فرض نماز سے پہلے آلۂ صیقل کی ضرورت ہے۔ جس سے دل کی صفائی کرے اور توجہ سمیٹ کر فرض ادا کرے۔

مسئلہ: اگر کوئی دورانِ خطبہ آئے تو اس کو بھی دو سنتیں پڑھنی چاہئیں۔ البتہ مختصر پڑھے تاکہ حتی الامکان سنتِ مؤکدہ کی بھی رعایت ہو جائے (کہ چار کے بجائے دو پڑھی) اور خطبہ کے ادب کا بھی پاس رہے (کہ لمبی نہیں مختصر پڑھی) اور احناف کی جو رائے ہے کہ جب امام منبر پر آ گیا تو اب نفل نماز جائز نہیں۔ اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں صحیح حدیث موجود ہے، جس پر عمل کرنا واجب ہے۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مشکوۃ میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: **إذا جاء أحدُكم يومَ الجمعة والإمام يخطب، فليركع ركعتين، وليَتَجَوَّزْ فيهما** یعنی جو جمعہ کے دن آئے درانحالیکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو چاہئے کہ وہ دو رکعتیں پڑھے اور چاہئے کہ دونوں کو مختصر پڑھے'' (رواہ مسلم مشکوۃ حدیث ۱۴۱۱) مگر اس حدیث میں جملہ: **والإمام يخطب** میں اضطراب ہے۔ حدیث کے صحیح الفاظ یہ ہیں: **إذا جاء أحدُكم يوم الجمعة، وقد خرج الإمام، فليصلِّ ركعتين**۔ اور امام کے منبر پر آ جانے کے بعد، خطبہ شروع کرنے سے پہلے نماز جائز ہے۔ اور احناف جو امام کے خروج کے بعد صلاۃ وکلام سے

منع کرتے ہیں وہ محض احتیاط کی بات ہے۔نماز اور کلام کی ممانعت درحقیقت دورانِ خطبہ ہے۔اور یہ دوسری روایت بھی مسلم شریف میں ہے، جو عَمرو بن دینار سے مروی ہے۔اور عَمرو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے مضبوط راوی ہیں۔اور والإمام یخطب: ابوسفیان طلحہ کے الفاظ ہیں۔مگر انھوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صرف چار حدیثیں سنی ہیں، اور وہ چاروں بخاری میں ہیں۔یہ روایت ان میں نہیں ہے۔اور ابن عیینہ اور شعبہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ باقی روایتیں ابوسفیان: صحیفۂ جابر سے روایت کرتے ہیں (جو حضرت جابرؓ کے کسی گمنام شاگرد کا مرتب کیا ہوا صحیفہ ہے) (تہذیب ابن حجر ومزّی رحمہما اللہ) اور بخاری (حدیث ۱۱۶۶) میں عَمرو بن دینار کی روایت کے الفاظ: والإمام یخطب أو قد خرج شک راوی کے ساتھ ہیں۔پس جو متفق علیہ الفاظ ہیں یعنی وقد خرج الإمام وہی محفوظ ہیں۔

علاوہ ازیں: نصف درجن واقعات مروی ہیں کہ دورانِ خطبہ لوگ آئے ہیں، اور آپؐ نے کسی سے نماز نہیں پڑھوائی۔اور خلافتِ فاروقی کا یہ واقعہ تو مشہور ہے کہ خطبہ کے دوران حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ آئے تھے۔اور نہ انھوں نے تحیۃ المسجد پڑھی تھی، نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پڑھوائی تھی۔نیز دیگر بہت سی روایات سے یہ روایت متعارض بھی ہے تفصیل فتح الملھم (۲: ۴۱۵) میں ہے۔اس لئے مجتہدین کرام نے اپنی صوابدید سے ترجیح سے کام لیا ہے۔کسی نے جواز کی یہ روایت لی ہے۔کسی نے ممانعت کی عام روایات لی ہیں۔پس احناف کا قول بھی بے دلیل نہیں۔رہا حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو مسلم شریف میں صراحت ہے کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تھے تو آپ منبر پر بیٹھے ہوئے تھے، ابھی خطبہ شروع نہیں کیا تھا۔اور سنن دار قطنی میں روایت ہے کہ ان کے نماز ختم کرنے تک آپ ﷺ خطبہ سے رُکے رہے تھے واللہ اعلم

پانچویں بات: گردنیں پھاندنے کی ممانعت کی وجہ

مسجد میں پہنچ کر آگے بڑھنے کے لئے لوگوں کی گردنیں نہ پھاندے، نہ دو شخصوں کے درمیان گھسے، نہ کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ بیٹھے۔احادیث میں ان سب باتوں کی ممانعت آئی ہے۔فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھاندتا ہے، وہ قیامت کے دن جہنم کا پُل بنایا جائے گا'' یعنی اس پر چل کر لوگ جہنم میں جائیں گے (مشکوۃ حدیث ۱۳۹۲) اور فرمایا: ''ہرگز نہ اٹھائے کوئی تم میں سے اپنے بھائی کو جمعہ کے دن۔پھر پیچھے سے اس کی جگہ میں جا پہنچے اور اس میں بیٹھ جائے، بلکہ کہے: جگہ کردو'' (مشکوۃ حدیث ۱۳۸۶) اور حضرت سلمان کی ایک طویل روایت میں جو آگے آرہی ہے دو شخصوں کے درمیان گھسنے کی بھی ممانعت آئی ہے (مشکوۃ حدیث ۱۳۸۱)

اوران سب باتوں کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ حرکتیں جہلاء بکثرت کرتے ہیں، جس سے آپس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔بلکہ نوبت جھگڑے ٹنٹے تک پہنچتی ہے اور سینوں میں کینہ کا بیج پڑتا ہے۔پس ہر مجمع میں ان باتوں سے احتراز ضروری ہے۔

[۳] وإلى الأمر بالإنصات، والدنوّ من الإمام، وتركِ اللغو، والتبكير، ليكون أدنى إلى استماع الموعظة، والتدبر فيها؛ وبالمشي وترك الركوب، لأنه أقرب إلى التواضع والتذلل لربه، ولأن الجمعة تجمعُ المُمْلِقَ والمُثْرِيَ، فلعل من لايجد المركوب يستحيي، فاسْتُحِبَّ سدُّ هذا الباب.

[٤] وإلى استحباب الصلاة قبل الخطبة، لما بيَّنَّا في سنن الرواتب، فإذا جاء والإمام يخطب فليركع ركعتين، ولْيَتَجَوَّزْ فيهما، رعاية لسنة الراتبة وأدب الخطبة جميعاً بقدر الإمكان؛ ولا تَغْتَرَّ في هذه المسألة بما يَلْهَجُ به أهلُ بلدك، فإن الحديث صحيحٌ واجبٌ اتباعه.

[٥] وإلى النهي عن التخطي، والتفريق بين اثنين، وإقامةِ أحدٍ لِيُخَالف إلى مقعده، لأنها مما يفعله الجهال كثيرًا، ويحصل بها فساد ذات البين، وهي بَذْرُ الحِقْد.

ترجمہ: (۳) اور (حاجت پیش آئی) خاموش رہنے اور امام سے نزدیک ہونے، اور لغو کام چھوڑنے اور سویرے جانے کا حکم دینے کی۔ تاکہ ہوئے وہ قریب تر نصیحت کے سننے سے اور اس میں غور کرنے سے۔ اور چلنے کا اور سوار نہ ہونے کا حکم دینے کی۔ اس لئے کہ وہ قریب تر ہے اپنے پروردگار کے لئے عاجزی اور خاکساری کرنے سے اور اس لئے کہ جمعہ جمع کرتا ہے غریبوں اور مالداروں کو۔ پس ہوسکتا ہے جو سواری نہیں پاتا وہ شرمائے۔ پس پسند کیا گیا اس دروازے کو بند کرنا۔

(۴) اور (حاجت پیش آئی) خطبہ سے پہلے نماز کے استحباب کو بیان کرنے کی۔ اس حکمت کے پیش نظر جو ہم نے سنن مؤکدہ کی حکمت میں بیان کی ہے ـــــ پس جب کوئی آئے درانحالیکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو چاہئے کہ وہ دو رکعتیں پڑھے۔ اور چاہئے کہ مختصر پڑھے ان دونوں کو۔ سنتِ مؤکدہ اور خطبہ کے ادب کی: دونوں باتوں کی حتی الامکان رعایت کرتے ہوئے ـــــ اور نہ دھوکہ کھا تو اس مسئلہ میں اس بات سے جو تیرے دیار کے لوگ کہتے ہیں۔ پس بیشک حدیث صحیح ہے۔ اس کی پیروی واجب ہے۔

(۵) اور (حاجت پیش آئی) ممانعت کرنے کی گردنیں پھاندنے کی۔ اور دو شخصوں کے درمیان جدائی کرنے کی اور کسی کو اٹھانے کی تاکہ اس کے بعد اس کی جگہ میں بیٹھے۔ اس لئے کہ یہ کام ان امور میں سے ہیں جن کو ناخواندہ لوگ بکثرت کرتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے آپسی معاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور وہ کینہ کا بیج ہے۔

☆ ☆ ☆

نماز جمعہ کا ثواب اور اس کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے

دن غسل کرے۔ اور جہاں تک ہو سکے پاکی صفائی کا اہتمام کرے۔ اور جو تیل خوشبو میسر ہو وہ لگائے۔ پھر وہ نماز کے لئے جائے اور دو آدمیوں کے درمیان جدائی نہ کرے۔ پھر جو نماز اس کے لئے مقدر ہے وہ پڑھے۔ پھر جب امام خطبہ دے تو توجہ اور خاموشی سے سنے تو اس جمعہ اور گذشتہ جمعہ کے درمیان کی اس کی خطائیں معاف کر دی جائیں گی'' (رواہ البخاری مشکوٰۃ حدیث ۱۳۸۱)

تشریح: اس حدیث میں چھ اعمال کا ذکر ہے: (۱) حتی الامکان پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام کرنا (۲) تیل خوشبو لگانا (۳) مسجد میں پہنچ کر کسی کو اذیت نہ دینا (۴) حسب توفیق نوافل پڑھنا (۵) ادب وتوجہ کے ساتھ خطبہ سننا (۶) اور نماز جمعہ ادا کرنا ـــــ یہ اعمالِ صالحہ کی اچھی خاصی مقدار ہے۔ جو ان کو بجالاتا ہے وہ انوار کے سمندر میں غوطہ لگانے کے قابل ہو جاتا ہے یعنی اس کے دل کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ وہ مؤمنین کی اجتماعی دعا اور ان کی صحبت کی برکت سے مستفید ہوتا ہے۔ اور پند وموعظت کی برکات سے مالا مال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی فوائد اس کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اعمال ہفتہ بھر کے گناہوں کی بخشش کا سبب بن جاتے ہیں۔

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور یکے بعد دیگرے آنے والوں کے نام لکھتے ہیں: دوپہر میں اول وقت آنے والے کی مثال: اس شخص جیسی ہے جو اونٹ کی قربانی کرے۔ پھر اس کے بعد آنے والے کی مثال: اس شخص جیسی ہے جو گائے کی قربانی کرے۔ پھر مینڈھے کی، پھر مرغی کی، پھر انڈے کی۔ پھر جب امام آجاتا ہے تو وہ رجسٹر لپیٹ لیتے ہیں۔ اور خطبہ سننے میں شریک ہو جاتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۳۸۴)

تشریح: مذکورہ گھڑیاں مختصر وقفات ہیں۔ جو زوال سے شروع ہوتے ہیں۔ اور خطبہ شروع ہونے پر منتہی ہوتے ہیں (ایک رائے یہ ہے کہ یہ درجات جمعہ کے دن صبح صادق سے شروع ہوتے ہیں۔ ان حضرات نے لفظ بَکَّرَ وابتکر سے استدلال کیا ہے۔ مگر صحیح رائے وہی ہے جو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں مُھَجِّر (دوپہر میں چلنے والا) آیا ہے۔ اور بَکَّرَ وابتکر کا ثواب دوسرا ہے۔ اور وہ ایک سال کے روزوں اور تراویح کا اجر ہے جو پہلے آچکا ہے)

ثم بَيَّن رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ثوابَ من أدى الجمعة كاملةً موفَّرة بآدابها: أنه يُغفر له ما بينه وبين الجمعة الأخرى، وذلك: لأنه مقدارٌ صالح للحلول في لُجَّةِ النور ودعوةِ المؤمنين وبركاتِ صحبتهم، وبركة الموعظة والذكر، وغير ذلك.

وبَيَّنَ درجاتِ التبكير ومايترتب عليها من الأجر، بما ضرب من مثل البدنة، والبقرة، والكبش، والدجاجة؛ وتلك الساعاتُ أزمنةٌ خفيفة من وقت وجوب الجمعة إلى قيام الخطبة.

ترجمہ: پھر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اس شخص کا ثواب بیان کیا جس نے جمعہ ادا کیا کامل طور پر، درانحالیکہ اس کے

آداب کی پوری طرح حفاظت کی تو بخشے جائیں گے اس کے لئے وہ گناہ جو اس کے اِس جمعہ کے درمیان اور دوسرے جمعہ کے درمیان ہیں۔ اور یہ بات اس لئے ہے کہ وہ اعمال کی ایک کافی مقدار ہے نور کے سمندر میں اترنے کے لئے اور مؤمنین کی دعا اور ان کی صحبت کی برکات اور چند ذکر اور اس کے علاوہ کے لئے ——— اور بیان فرمائے آپؐ نے سویرے جانے کے درجات اور وہ ثواب جو ان درجات پر مرتب ہوتا ہے، اونٹ، گائے، مینڈھا اور مرغی کی مثالوں کے ذریعہ جو آپؐ نے بیان فرمائیں۔ اور وہ گھڑیاں مختصر وقفات ہیں، وجوب جمعہ کے وقت سے خطبہ شروع ہونے تک۔

☆ ☆ ☆

دوگانۂ جمعہ، جہری قراءت اور خطبہ کی حکمتیں

سوال: جب نمازِ جمعہ نمازِ ظہر کے قائم مقام ہے تو اس میں دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اصل کی طرح چار رکعتیں کیوں نہیں؟ اور جمعہ دن کی نماز ہے اور دن کی نمازیں سرّی ہوتی ہیں، پھر جمعہ میں قراءت جہری کیوں ہے؟ اور کسی نماز کے ساتھ خطبہ ضروری نہیں، پھر جمعہ کے لئے خطبہ شرط کیوں ہے؟

جواب: قاعدہ یہ ہے کہ جس نماز میں قریب وبعید کے لوگ شریک ہوں، اس میں دو ہی رکعتیں رکھی جاتی ہیں۔ چنانچہ جمعہ اور عیدین میں دوگانہ ہی مشروع کیا گیا ہے۔ اور اس میں دو مصلحتیں ہیں: ایک: یہ کہ وہ نماز لوگوں پر بھاری نہ ہوجائے۔ اور دوسری: یہ کہ مجمع میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کمزور، بیمار اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں۔ پس ان کی رعایت ضروری ہے۔

اور قراءت جہراً اس لئے کی جاتی ہے کہ قرآن کی شان بلند ہو۔ اور لوگوں کو قرآن میں غور کرنے کا موقع ملے۔ اور جہر کا وہ مانع موجود نہیں جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے کہ دن میں شور ہوتا ہے اور طبیعتوں میں انبساط نہیں ہوتا۔ اور ایسے وقت میں قرآن سنانا بے فائدہ ہے۔ اور جمعہ اور عیدین کے وقت کاروبار بند ہوجاتے ہیں۔ اس لئے شور تھم جاتا ہے۔ اور لوگ نہا دھو کر اور خوشبو لگا کر آتے ہیں۔ اور شوق وذوق کے ساتھ آتے ہیں اس لئے طبیعتوں میں سرور وانبساط کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اور ایسے وقت میں قرآن سنانا مفید ہوتا ہے۔ اس لئے قراءت جہراً کی جاتی ہے۔

اور خطبہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع روز روز نہیں آتے۔ اس لئے موقعہ غنیمت سمجھ کر تقریر ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ ناخواندہ لوگ مسائل سے واقف ہوں اور واقف کاروں کی یاد تازہ ہو۔

دو خطبوں کی اور خطبہ کے مضامین کی حکمت

سوال: جب خطبہ ہفتہ واری تقریر ہے تو وہ مسلسل کیوں نہیں ہے؟ اس کو دو حصوں میں کیوں بانٹا گیا ہے یعنی دو خطبے کیوں

ہیں؟ اور جب خطبہ مسائل کی تعلیم کے لئے اور پند ونصیحت کے لئے ہے تو شروع میں حمد وثنا، درود وسلام اور توحید ورسالت کی گواہی کیوں ضروری ہے؟ (امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ مضامین واجب ہیں۔ ان کے بغیر خطبہ درست نہیں)

جواب: دو خطبوں میں دو حکمتیں ہیں: **پہلی حکمت**: یہ ہے کہ اس سے تقریر کا مقصد پوری طرح حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ مسلسل بات کرنے میں کبھی کچھ ضروری باتیں رہ جاتی ہیں۔ جب مقرر وقفہ کرے گا تو اس وقفہ میں ضروری باتیں یاد آجائیں گی۔ جن کو وہ دوسرے خطبہ میں بیان کردے گا۔ اور **دوسری حکمت**: یہ ہے کہ مسلسل بولنے سے بولنے والا بھی تھکتا ہے اور سننے والے بھی اکتاتے ہیں۔ اور ذرا وقفہ کر کے دوبارہ خطبہ شروع کیا جائے گا تو خطیب بھی نشاط کے ساتھ گفتگو کرے گا اور سامعین بھی دلچسپی سے سنیں گے۔

اور خطبہ چونکہ شعائر میں سے ہے۔ اس لئے دین کی بنیادی باتیں اس میں شامل کی گئی ہیں۔ دین کی بنیادی باتیں ہیں: اللہ کا ذکر، اللہ کے رسول کا ذکر، اللہ کی کتاب کا ذکر اور توحید ورسالت کی گواہی۔ اذان میں بھی نماز کی دعوت کے ساتھ یہ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ اور شہادتین کی اہمیت اُس حدیث سے بھی واضح ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ”ہر وہ تقریر جس میں تشہد نہ ہو وہ ہتھ کٹی ہے“ (مشکوۃ حدیث ۳۱۵۰ کتاب النکاح باب اعلان النکاح إلخ) غرض اس وجہ سے خطبۂ جمعہ میں نصیحت کے مضامین کے ساتھ یہ ضروری مضامین بھی ملائے گئے ہیں۔ پھر کلمۂ فصل یعنی **أما بعد** کہہ کر اصل تقریر شروع کی جاتی ہے۔

فائدہ: جمعہ کا خطبہ محض ایک دینی تقریر اور بیان نہیں ہے، بلکہ وہ ایک شعار بھی ہے جیسا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا۔ اور شعار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ورنہ وہ شعار باقی نہیں رہے گا۔ جیسے قرآن واذان: جہاں ہدایت کی کتاب اور نماز کی دعوت ہیں، اسلام کے شعائر بھی ہیں پس جس طرح ان کی زبان نہیں بدلی جاسکتی۔ خطبہ بھی غیر عربی میں دینا درست نہیں یہ بات تعاملِ امت کے خلاف ہے ـــــ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جو پڑوسی ممالک فتح کئے تھے، وہاں عربی نہیں بولی جاتی تھی۔ فارسی، رومی اور قبطی وغیرہ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اور اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ جمعہ کے خطبہ میں لوگوں سے ان کی زبان میں خطاب کیا جائے۔ مگر صحابہ نے ایسا نہیں کیا ـــــ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح سرکاری زبان کے لئے نمود وظہور کے مواقع ضروری ہیں۔ جن میں وہی سرکاری زبان استعمال کی جائے، خواہ لوگوں کو اس کے سمجھنے میں کتنی ہی دشواری کیوں نہ ہو، اسی طرح اسلام کی سرکاری زبان عربی ہے۔ اسی میں دین نازل ہوا ہے اور اسی میں دین محفوظ ہے۔ اور اسلام کا بقاء عربی زبان کے بقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ پس اس کے نمود وظہور کے لئے بھی کچھ مواقع ضروری ہیں۔ جن میں وہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگ اس سے واقف ہوں اور اس کو سیکھیں، تاکہ اپنے مذہب کے اصل مصادر سے استفادہ کرسکیں۔ جمعہ کا خطبہ ایسا ہی عربی زبان کے نمود وظہور کا ایک موقع ہے اس کو کھونا نہیں چاہئے۔

واعلم: أن كل صلاة تجمع الأقاصيَ والأدانيَ فإنها شفعٌ واحدٌ، لئلا تثقل عليهم، وأن فيهم الضعيفَ، والسقيمَ، وذا الحاجة؛ ويجهر فيها بالقراء ة ليكون أمكن لتدبرهم في القرآن، وأنْوَهَ بكتاب الله؛ ويكون فيها خطبةٌ، لِيُعلِّمَ الجاهلَ، ويُذَكِّرَ الناسي.

وسَنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم في الجمعة خطبتين، يجلس بينهما، ليتوفر المقصد، مع استراحة الخطيب، وتطريةِ نشاطه ونشاطهم؛

وسنة الخطبة: أن يحمدَ الله، ويصلّي على نبيه، ويتشهد، ويأتي بكلمة الفصل، وهي:" أما بعد" ويُذَكِّرُ، ويامر بالتقوى، ويحذِّر عذابَ الله في الدنيا والآخرة، ويقرأ شيئًا من القرآن، ويدعو للمسلمين.

وسبب ذلك: أنه ضَمَّ مع التذكير التنويهَ بذكر الله، ونبيه، وبكتاب الله، لأن الخطبة من شعائر الدين، فلا ينبغي أن يخلو منها، كالأذان، وفي الحديث:" كل خطبة ليس فيها تشهد فهي كاليد الجَذْماء"

ترجمہ: اور جان لیں کہ ہر وہ نماز جو دور کے اور قریب کے لوگوں کو اکٹھا کرتی ہے۔ پس بیشک وہ ایک دوگانہ ہے۔ تاکہ وہ نماز لوگوں پر بھاری نہ ہو۔ اور اس لئے کہ لوگوں میں کمزور اور بیمار اور حاجت مند ہیں۔ اور زور سے کرے اس میں قراءت، تاکہ وہ جہر زیادہ ممکن بنائے لوگوں کے لئے قرآن میں غور وفکر کرنے کو۔ اور شان بلند کرنے والا ہو کتاب اللہ کی۔ اور ہو اس نماز میں خطبہ تاکہ سکھلایا جائے ناخواندہ۔ اور یاد دلایا جائے بھولنے والا۔

اور مسنون کئے رسول اللہ ﷺ نے جمعہ میں دو خطبے، دونوں کے درمیان میں خطیب بیٹھے تاکہ مقصد پوری طرح حاصل ہو خطیب کے آرام کے ساتھ اور خطیب کے اور لوگوں کے نشاط کو تازہ کرنے کے ساتھ —— اور خطبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی ستائش کرے اور اللہ کے نبی پر درود بھیجے اور توحید ورسالت کی گواہی دے۔ اور کلمۂ فصل لائے۔ اور وہ أما بعدُ ہے اور نصیحت کرے۔ اور پرہیز گاری کا حکم دے۔ اور دنیا وآخرت میں اللہ کے عذاب سے ڈرائے، اور قرآن میں سے کچھ پڑھے اور مسلمانوں کے لئے دعا کرے —— اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ نے ملایا نصیحت کے ساتھ اللہ اور اس کے نبی اور اس کی کتاب کے ذکر بلند کرنے کو۔ اس لئے کہ خطبہ شعائر دین میں سے ہے۔ پس مناسب نہیں کہ وہ خالی ہو مذکورہ باتوں سے۔ جیسے اذان۔ اور حدیث میں ہے کہ:" ہر خطبہ جس میں تشہد نہ ہو، پس وہ کٹے ہوئے ہاتھ کی طرح ہے"

☆

جمعہ کے لئے تمدن اور جماعت کے اشتراط کی وجہ

امت نے نبی ﷺ سے الفاظ کے ذریعہ نہیں، بلکہ معنوی طور پر یعنی دلالۃً یہ بات اخذ کی ہے کہ جمعہ کے لئے جماعت اور گونہ تمدن (مل کر رہنا) شرط ہے۔ نبی ﷺ، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ: آبادیوں میں نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے، صحرانشینوں کو اس کا مکلف نہیں بناتے تھے۔ بلکہ ان کے عہد میں صحرانشینوں میں جمعہ قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ پس اس تعامل سے امت نے قرناً بعد قرنٍ اور عصراً بعد عصرٍ یہ سمجھا کہ جمعہ کے لئے جماعت اور تمدن شرط ہے۔

تشریح: اور ان دونوں چیزوں کے اشتراط کی وجہ یہ ہے کہ جمعہ کی غرض آبادی میں نماز کی اشاعت ہے۔ پس ضروری ہے کہ تمدن اور جماعت کا لحاظ کیا جائے۔

صحتِ جمعہ کے لئے کیسی بستی اور کتنی جماعت ضروری ہے؟ رہی یہ بات کہ جمعہ کی صحت کے لئے کس درجہ کا تمدن اور کتنی بڑی جماعت ضروری ہے؟ تو اس میں اختلاف ہے: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک: شہر، قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے: جس میں گلی کوچے اور بازار ہوں۔ اور کم از کم چار آدمیوں کی شرکت نماز میں ضروری ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک: ایسی بستی ضروری ہے جس کے مکانات متصل ہوں۔ اور اس میں ایسا بازار ہو جس سے بستی کی ضروریات پوری ہوجاتی ہوں۔ اور جماعت میں کم از کم بارہ آدمی ضروری ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: جس بستی میں چالیس آزاد، عاقل، بالغ مرد بستے ہوں اس میں جمعہ ہوسکتا ہے۔ اور جماعت میں بھی یہی تعداد شرط ہے۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک: صحیح ترین بات یہ ہے کہ جمعہ کی صحت کے لئے:

ا ـــــ اتنی آبادی کافی ہے جس کو قریہ (بستی) کہا جاسکے۔ اور بستی کی دو حدیں ہیں: ادنی اور اعلی۔ اعلی حد کی تو کوئی نہایت نہیں۔ قرآن کریم میں بڑے بڑے شہروں پر قریہ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ البتہ ادنی حد کی تعیین تین حدیثوں سے کی جاسکتی ہے یہ احادیث اگرچہ فی نفسہ سب ضعیف ہیں مگر باہم مل کر قوی ہوجاتی ہیں۔ وہ حدیثیں درج ذیل ہیں:

پہلی حدیث: طبرانی نے معجم اَوسط میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ: ''پانچ شخصوں پر جمعہ نہیں: عورت، مسافر، غلام، بچہ اور صحرانشیں'' (کنز العمال حدیث ۲۱۰۹۶) صحرانشیں کا تذکرہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ مستقل آبادی کے باشندوں پر جمعہ واجب ہے (یہ مفہوم مخالف سے استدلال ہے)

دوسری حدیث: طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ: ''جمعہ پچاس آدمیوں پر ہے۔ اور پچاس سے کم پر جمعہ نہیں'' (کنز العمال حدیث ۲۱۰۹۷) اس روایت سے معلوم ہوا کہ پچاس کی تعداد سے بستی کا وجود ہوجاتا ہے۔

تیسری حدیث: بیہقی نے اُمّ عبداللہ دوسیہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ: "جمعہ ہر بستی پر واجب ہے"[1]

۲ ـــــ اور جماعت میں کم از کم اتنے آدمی ضروری ہیں جن کو جماعت کہا جاسکے، کوئی تعداد شرط نہیں۔ سورۃ الجمعہ آیت گیارہ کی تفسیر میں جو واقعہ مروی ہے، وہ اس کی دلیل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک جمعہ میں آپ خطبہ دے رہے تھے کہ مدینہ میں ایک تجارتی قافلہ آیا۔ اس نے نقارہ بجایا اور اعلان کیا تو سارا مجمع منتشر ہوگیا۔ صرف بارہ آدمی رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس دن آپ نے انہی بارہ آدمیوں کے ساتھ جمعہ ادا فرمایا ہوگا۔ پس چالیس کی تعداد کیسے شرط کی جاسکتی ہے۔ اور مُغنی ابن قدامہ وغیرہ میں جو لکھا ہے کہ جانے والے لوٹ آئے ہوں گے: وہ محض ایک احتمال ہے۔ بظاہر وہ واپس نہیں لوٹے تھے، باقی اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں[2]

بہر حال: جب اس درجہ کی آبادی اور جماعت حاصل ہوجائے تو جمعہ فرض ہوجاتا ہے۔ اب جو پیچھے رہے گا وہ گنہگار ہوگا ـــــ اور جمعہ قائم کرنے کا حق امام (حاکم) کا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ چار کام امام کے سپرد ہیں: ان میں سے ایک کام: جمعہ قائم کرنا بھی ہے، مگر امام کا وجود شرط نہیں۔ اس کی اجازت کافی ہے[3]

وقد تلَقَّتِ الأمةُ تلقيا معنويا، من غير تلقى لفظي: أنه يَشترط في الجمعة الجماعةُ، ونوعٌ من التمدُّن؛ وكان النبيُّ صلى الله عليه وسلم، وخلفاؤُه رضى الله عنهم، والأئمةُ المجتهدون رحمهم الله تعالىٰ: يُجَمِّعون في البلدان، ولا يؤاخِذون أهلَ البَدْوِ، بل ولايُقام في عهدهم في البدو، ففهموا من ذلك قرنًا بعد قرنٍ وعصرًا بعد عصر: أنه يَشترط لها الجماعةُ والتمدُّن.

أقول: وذلك: لأنه لما كان حقيقةُ الجمعة إشاعةَ الدين في البلد: وجب أن يُنظر إلى تمدنٍ وجماعة.

والأصح عندي: أنه يكفى:

[۱] أقلُّ مايقال فيه: قرية، لما رُوى من طُرُقٍ شتّى، يقوّى بعضُها بعضًا: "خمسة لاجمعةَ

[1] مگر یہ حدیث شاہ صاحب رحمہ اللہ نے پوری نہیں لکھی۔ اس کے آخر میں یہ جملہ بھی ہے کہ: "اگرچہ اس میں نہ ہوں مگر چار آدمی" (کنز العمال حدیث ۲۱۰۹۹) اس اضافہ کے ساتھ حدیث مفید مدعیٰ نہیں ہے۔ بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جو جمعہ کی صحت کے لئے چار آدمیوں کی جماعت شرط کی ہے: یہ حدیث اس کی دلیل ہے۔ اور یہ حدیث درحقیقت اس صورت کے لئے ہے جب گاؤں میں حاکم موجود ہو۔ حدیث کے بعض طرق میں اس کی صراحت ہے ۱۲

[2] مگر مراسیل ابوداؤد میں روایت ہے کہ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے: جب جمعہ کا خطبہ بھی عیدین کے خطبوں کی طرح نماز کے بعد دیا جاتا تھا۔ تفصیل ابن کثیر میں ہے ۱۲

[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول سرسری تلاش میں مجھے نہیں ملا۔ البتہ نصب الرایہ (۳۲۶:۳) میں یہ قول: حضرت حسن بصری، حضرت عبداللہ بن مُحَیرِز اور حضرت عطاء خُراسانی سے مروی ہے ۱۲

عليهم" وعدَّ منهم أهلَ البادية. قال صلى الله عليه وسلم:" الجمعة على الخمسين رجلاً"
أقول: الخمسون يَتقرَّى بهم قرية، وقال صلى الله عليه وسلم:" الجمعة واجبة على كل قرية"
[۲] وأقلُ ما يقال فيه: جماعةٌ، لحديث الانفضاض، والظاهر انهم لم يرجعوا، والله أعلم.
فإذا حصل ذلك وجبت الجمعةُ، ومن تخلَّف فهو الآثم، ولايشترط أربعون، وأن الأمراء أحقُّ بإقامة الصلاة، وهو قولُ على كَرَّمَ اللهُ وجهَه:" أربع إلى الإمام" إلخ، وليس وجود الإمام شرطًا. والله أعلم بالصواب.

ترجمہ: اور تحقیق حاصل کیا امت نے معنوی طور پر حاصل کرنا، الفاظ حاصل کئے بغیر کہ جمعہ میں جماعت اور کچھ تمدن شرط ہے۔ اور نبی ﷺ، اور ان کے خلفاء رضی اللہ عنہم اور ائمۂ مجتہدین رحمہم اللہ جمعہ پڑھا کرتے تھے آبادیوں میں۔ اور نہیں مکلف کرتے تھے وہ بادیہ نشینوں کو، بلکہ نہیں قائم کیا گیا جمعہ ان کے زمانہ میں جنگل باسیوں میں۔ پس امت اس سے قرناً بعد قرنٍ اور عصراً بعد عصر یہ بات سمجھی کہ شرط کی گئی ہے جمعہ کے لئے جماعت اور تمدن۔

میں کہتا ہوں: اور وہ بات (یعنی جمعہ کے لئے جماعت اور آبادی کا اشتراط) اس لئے ہے کہ جب جمعہ کی غرض بستی میں دین کی اشاعت ہے تو ضروری ہے کہ دیکھا جائے تمدن اور جماعت کی طرف۔

اور میرے نزدیک اصح بات یہ ہے کہ کافی ہے:

(۱) کم از کم اتنی آبادی جس کو قریہ کہا جاسکے۔ اُن احادیث کی وجہ سے جو مختلف اسانید سے مروی ہیں۔ جن کی بعض، بعض کو قوی کرتی ہیں: ''جمعہ پانچ شخصوں پر واجب نہیں'' اور شمار کیا ان میں بادیہ نشینوں کو۔ فرمایا آپؐ نے: ''جمعہ پچاس آدمیوں پر ہے'' میں کہتا ہوں: پچاس آدمی: بن جاتا ہے ان سے قریہ۔ اور فرمایا آپؐ نے کہ: ''جمعہ واجب ہے ہر بستی پر''

(۲) اور (کافی ہے) کم از کم وہ مقدار جس کو جماعت کہا جائے۔ منتشر ہو جانے والے لوگوں کے واقعہ کی وجہ سے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ وہ واپس نہیں لوٹے تھے۔ باقی اللہ پاک زیادہ جانتے ہیں۔

پس جب حاصل ہو یہ مقدار تو جمعہ واجب ہو جاتا ہے۔ اور جو پیچھے رہا تو وہ گنہگار ہے۔ اور شرط نہیں چالیس آدمی اور ظاہر یہ ہے کہ حکام زیادہ حقدار ہیں جمعہ قائم کرنے کے۔ اور وہ علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے: ''چار باتیں امام کے سپرد ہیں'' آخر تک۔ اور امام کا وجود شرط نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فائدہ: قریہ کا مادّہ: ق، ر، ی ہے۔ یہ مادّہ جمع واجتماع پر دلالت کرتا ہے۔ اور قریہ کو اسی لئے قریہ کہتے ہیں کہ لوگ اس میں اکٹھا بستے ہیں ——— اور تمدن کے مادّے م، د، ن میں شائستگی اور سلیقہ مندی کے معنی ہیں۔ بادیہ نشینوں میں شائستگی اور سلیقہ مندی نہیں ہوتی۔ آبادیوں میں بسنے والوں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ پھر دیہاتوں اور شہروں کی سلیقہ مندی اور شائستگی میں فرق ہے۔

رہی یہ بات کہ جمعہ کے لئے کس درجہ کا تمدن شرط ہے؟ اس سلسلہ میں ضعیف احادیث کی روشنی میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی بات اوپر آگئی ہے۔ مگر اس سلسلہ میں قرآن کا اشارہ اور دورِ نبوی کا معمول بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ: ''جب جمعہ کے روز نماز کے لئے پکارا جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو، اور خرید وفروخت موقوف کردو'' اس میں جہاں یہ اشارہ ہے کہ جمعہ کے لئے جماعت شرط ہے، یہ بھی اشارہ ہے کہ نماز جمعہ کے مخاطب شہر اور قصبات کے لوگ ہیں، جن کی معیشت کا مدار بیع وشراء پر ہے۔ دیہات کے لوگ جن کی معیشت کا مدار کاشتکاری وغیرہ ذرائع معاش پر ہوتا ہے: جمعہ کے مخاطب نہیں۔ اور آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قُبا اور عوالی کے لوگ باری باری جمعہ کے لئے مسجد نبوی میں حاضر ہوتے تھے۔ اگر دیہات والوں پر بھی جمعہ فرض ہوتا تو باقی لوگ اپنے مقام میں جمعہ ضرور قائم کرتے۔ غرض مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے ان باتوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۱۷

عیدین

عید الفطر اور عید الاضحیٰ

مشروعیت کی حکمت: دنیا کی تمام اقوام میں قدیم زمانہ سے تہواروں کا رواج چلا آرہا ہے۔ لوگ تہوار میں آراستہ پیراستہ ہوکر نکلتے ہیں اور خوشی مناتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی جاری عادت ہے کہ اس سے لوگ جدا نہیں ہوسکتے۔ ایران میں مجوسیوں کے دو تہوار: نوروز (۲۱ تا ۲۵ مارچ) اور مہر جان (۲۲ ستمبر تا ۲۲ اکتوبر) قومی تہوار تھے، جو عربوں میں بھی رائج تھے۔ جب آنحضرت ﷺ ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ لوگ سال میں دو مرتبہ خوشیاں مناتے ہیں۔ آپؐ نے دریافت کیا: ''یہ دن کیا ہیں؟'' لوگوں نے عرض کیا: ہم ان دنوں میں زمانۂ جاہلیت سے کھیلتے آئے ہیں یعنی یہ ہمارے قدیمی تہوار ہیں۔ آپ ﷺ نے بحکم الٰہی امتِ مسلمہ کی خوشی کے لئے دوسرے دو دن تجویز فرمائے، اور ارشاد فرمایا کہ یہ تمہارے لئے اُن سے بہتر ہیں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ (مشکوٰۃ حدیث ۱۴۳۹)

اور اس تبدیلی میں حکمت یہ ہے کہ ہر تہوار کے پیچھے چند اسباب کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً: کسی مذہب کے شعائر کی تشہیر کرنا یا کسی مذہب کے پیشواؤں کی ہمنوائی کرنا یا کسی چیز کی یادگار منانا وغیرہ۔ پس آنحضرت ﷺ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر کوئی اسلامی تہوار مقرر نہ کیا گیا تو لوگ فطری جذبہ سے کسی نہ کسی تہوار کو اپنائیں گے۔ اور اس سے جاہلیت کے

شعائر کی تشہیر ہوگی یا جاہلیت کے بڑوں کا طریقہ رائج ہوگا۔ اس لئے شریعت نے علاج بالمثل کیا۔ اور مسلمانوں کی خوشی کے اظہار کے لئے ایسے دو دن مقرر کئے جن سے ملتِ ابراہیمی کے شعائر کی تشہیر ہوتی ہے۔ اور ان کو صرف تہوار نہیں بلکہ عبادت کے ایام بنادیا۔ اس طرح کہ خوشی کے ان دنوں میں زیبائش کے ساتھ دوگانۂ عید ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور دیگر مختلف قسم کی عبادتیں اس میں شامل کیں۔ تاکہ مسلمانوں کا اجتماع محض تفریحی اجتماع ہوکر نہ رہ جائے، بلکہ اس کے ذریعہ اللہ کا بول بالا ہو اور دینِ اسلام کو فروغ ملے۔

﴿ العيدان ﴾

الأصل فيهما: أن كل قوم لهم يومٌ يتجمَّلون فيه، ويخرجون من بلادهم بزينتهم، وتلك عادةٌ لا ينفك عنها أحد من طوائف العرب والعجم؛ وقدم النبيُّ صلى الله عليه وسلم المدينة، ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال:" ما هذان اليومان؟" قالوا: كنا نلعب فيهما في الجاهلية، فقال:" قد أبدلكم الله بهما خيرًا منهما: يومَ الأضحى ويومَ الفطر" قيل: هما النيروز والمهرجان.

وإنما بدَّل: لأنه ما من عيد في الناس إلا وسبب وجوده تنويهٌ بشعائر دينٍ، أو موافقةُ أئمةِ مذهبٍ، أو شيئٌ مما يُضاهي ذلك، فخشي النبيُّ صلى الله عليه وسلم —— إن تركهم وعادتَهم —— أن يكون هنالك تنويهٌ بشعائر الجاهلية، أو ترويج لسنَّةِ أسلافها، فأبدلهما بيومين فيهما تنويهٌ بشعائر الملة الحنيفية.

وضَمَّ مع التجمُّل فيهما ذكرَ الله، وأبوابا من الطاعة، لئلا يكون اجتماعُ المسلمين بمَحْضِ اللعِب، ولئلا يخلو اجتماع منهم من إعلاء كلمة الله.

ترجمہ: عیدین کا بیان: دونوں میں بنیادی بات: یہ ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک دن ہے، جس میں وہ آراستہ ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے شہروں سے اپنی زیبائش کے ساتھ نکلتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی عادت ہے جس سے عرب وعجم کے گروہوں میں سے کوئی گروہ جدا نہیں ہوتا۔ اور تشریف لائے نبی ﷺ مدینہ میں درانحالیکہ ان کے لئے دو دن تھے جن میں وہ کھیلتے تھے، پس آپؐ نے پوچھا: ''یہ دو دن کیا ہیں؟'' لوگوں نے کہا: ''ہم ان دونوں میں زمانۂ جاہلیت سے کھیلا کرتے ہیں'' پس آپؐ نے فرمایا: ''تحقیق بدل کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان دو کے بدلے میں ان سے بہتر دو دن یعنی قربانی کی عید اور روزے چھوڑنے کی عید'' کہا گیا کہ وہ دو دن: نوروز اور مہرجان تھے۔

اور بدل دیا: صرف اس وجہ سے کہ نہیں ہے لوگوں کی کوئی عید، مگر اور اس کے پائے جانے کا سبب: کسی دین کے شعائر کا شہرہ کرنا، یا کسی مذہب کے پیشواؤں کی ہمنوائی، یا کوئی اور بات ہوتی ہے جو ان کے مشابہ ہے۔ پس نبی ﷺ

کو اندیشہ ہو ـــــ اگر چھوڑ دیں گے آپ ان کو اور ان کی عادت کو ـــــ کہ ہو وہاں جاہلیت کے شعائر کو شہرہ دینا۔ یا جاہلیت کے بڑوں کے طریقہ کو رائج کرنا۔ پس بدل دیا اُن دو دنوں کو، دوسرے ایسے دو دنوں سے، جن میں ملت ابراہیمی کے شعائر کو شہرہ دینا ہے۔

اور ملایا آپ نے زیبائش کے ساتھ ان دو دنوں میں اللہ کے ذکر کو اور مختلف قسم کی عبادتوں کو، تا کہ نہ ہو مسلمانوں کا اکٹھا ہونا محض کھیلنے کے لئے اور تا کہ نہ خالی ہو مسلمانوں کا اجتماع اللہ کے بول کو بالا کرنے سے۔

☆ ☆ ☆

دنوں کی تعیین میں حکمت

عید الفطر: یکم شوال کو رکھی گئی ہے۔ فطر کے معنی ہیں: روزہ کھولنا۔ اور فطر دو ہیں: فطرِ معتاد اور فطر غیر معتاد۔ فطر معتاد: ہر دن مغرب کے وقت روزہ کھولنا ہے۔ اور فطر غیر معتاد: ماہ رمضان کے روزے بند کرنا ہے۔ صدقۃ الفطر اور یوم الفطر اور عید الفطر میں فطر کے یہی غیر معتاد معنی مراد ہیں۔

اور عید کے لئے یکم شوال کی تعیین دو وجہ سے کی گئی ہے: ایک: اس دن میں رمضان کے روزے چھوڑے جاتے ہیں۔ دوسری: اس دن صدقۂ فطر ادا کیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں خوشی کی ہیں۔ اس دن میں طبعی خوشی بھی حاصل ہوتی ہے اور عقلی بھی۔ طبعی خوشی تو اس بات سے حاصل ہوتی ہے کہ ایک بھاری کام (روزے رکھنا) نمٹ گیا۔ یہ خوشی تو سب کو حاصل ہوتی ہے۔ اور غریبوں کو اس سے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ ان کو مالی تعاون مل گیا۔ اور عقلی خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انعام اور فضل وکرم فرمایا۔ اور ان کو اس عبادت کے بجالانے کی توفیق دی جو ان پر فرض کی گئی تھی یعنی انھوں نے بتوفیقِ خداوندی روزے رکھے۔ اس خوشی میں وہ زمزمۂ تکبیر بلند کرتے ہیں اور دوگانۂ شکر ادا کرتے ہیں سورۃ البقرہ آیت ۱۸۵ میں ہے: ''اور تا کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرو اس پر کہ اُس نے تم کو راہ دکھائی'' یعنی اس بات کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمہیں روزے رکھنے کی توفیق دی ـــــ اور عقلی خوشی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے اہل وعیال کو سال بھر تک سلامت رکھا اور ان کو نعمتِ حیات سے بہرہ ور کیا۔ اس خوشی میں وہ اپنا اور اپنے عیال کا صدقہ ادا کرتے ہیں ـــــ غرض اس دن میں مسلمانوں کے لئے چند در چند خوشیاں جمع ہوگئی ہیں، اس وجہ سے اس دن کو عید کا دن مقرر کیا ہے۔

اور عید الاضحیٰ: ابراہیم واسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی یادگار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خواب میں حکم دیا تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کریں۔ انھوں نے دس ذی الحجہ کو اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ اور اپنا خواب سچا کر دکھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے سے خوش ہوکر، عوض میں ایک عظیم قربانی بھیج دی تھی۔ جو اسماعیل علیہ السلام کی جگہ میں ذبح کی گئی

تھی۔اس لئے بطور یادگار: ملتِ اسلامیہ کے لئے دوسری عید اس دن میں تجویز کی گئی ہے۔اور اس میں دو مصلحتیں ہیں:

پہلی مصلحت: اس عید سے ملتِ حنفی کے دونوں پیشواؤں (ابراہیم واسماعیل علیہما السلام) کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اوران کی زندگی سے سبق ملتا ہے کہ اللہ کی اطاعت میں جان ومال خرچ کرنے سے کبھی دریغ نہیں کرنا چاہئے۔نیز ان کی زندگیوں سے صبر واستقامت کا سبق بھی ملتا ہے۔

دوسری مصلحت: اس دن حُجاج حج کی تکمیل کرتے ہیں: حُجاج ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں ٹھہرتے ہیں۔اور دس کو منیٰ میں آتے ہیں۔اور رمی اور قربانی کرکے احرام کھولتے ہیں۔پس جو لوگ وہاں نہیں پہنچ سکے، وہ ان کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔جمع ہوکر دوگانۂ عید ادا کرتے ہیں۔پھر قربانی کرتے ہیں۔اس طرح انھوں نے بھی گویا احرام کھولدیا۔اور اس طرح سے تقریب حج کی تشہیر ہوتی ہے۔اور حج کرنے والوں کی شان بلند ہوتی ہے۔اور لوگوں میں شوق وولولہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی آئندہ سال حج کے لئے تیار ہوجائیں۔اور اسی مشابہت کی وجہ سے ایام منیٰ (گیارہ تا تیرہ ذی الحجہ) میں تکبیر تشریق مسنون کی گئی ہے۔اور قربانی کرنے کے بعد بال ناخن کاٹنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔

سوال: حاجیوں کے لئے تو عید کی نماز نہیں ہے، مشابہت اختیار کرنے والوں کے لئے عید کی نماز کیوں ہے؟

جواب: حاجیوں کے لئے دس ذی الحجہ میں اور بھی بہت سی عبادتیں ہیں۔اور مشابہت اختیار کرنے والوں کے لئے کوئی عبادت نہیں،اس لئے عید کی نماز اور خطبہ رکھا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کا کوئی اجتماع ذکر اللہ سے اور شعائر دین کی تشہیر سے خالی نہ رہے۔

أحدهما: يومُ فطرِ صيامِهم، وأداءِ نوعٍ من زكاتهم، فاجتمع الفرح الطبيعي: من قِبَلِ تفرغهم عمايشق عليهم، وأخذِ الفقيرِ الصدقاتِ، والعقلي: من قِبَلِ الابتهاج مما أنعم الله عليهم، من توفيق أداء ما افترض عليهم، وأَسْبَلَ عليهم من إبقاء رءوس الأهل والولد إلى سَنَةٍ أخرى.

والثاني: يومُ ذبح إبراهيمَ ولدَه إسماعيل عليهما السلام، وإنعامِ الله عليهما: بأن فداه بذبح عظيم، إذ فيه تَذَكُّر حالِ أئمة الملة الحنيفية، والاعتبار بهم في بذل المُهَجِ والأموال في طاعة الله، وقوةِ الصبر، وفيه تَشَبُّهٌ بالحاجّ، وتنويهٌ بهم، وشوق لماهم فيه، ولذلك سُنَّ التكبير، وهو قوله تعالى: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدَاكُمْ﴾ يعني شكرًا لما وفَّقكم للصيام، ولذلك سُنَّ الأضحيةُ والجهر بالتكبير أيامَ منى. واستُحب تركُ الحلق لمن قَصَدَ التضحيةَ، وسُنَّ الصلاةُ والخطبةُ: لئلا يكون شيئٌ من اجتماعهم بغير ذكر الله، وتنويهِ شعائر الدين.

ترجمہ: دو عیدوں میں سے ایک: مسلمانوں کے روزے چھوڑنے (بند کرنے) کا دن ہے۔اور ان کے زکات

کی ایک خاص قسم (صدقۂ فطر) کے ادا کرنے کا دن ہے۔ پس جمع ہوئی طبعی خوشی: ان کے فارغ ہونے کی جانب سے اس کام سے جوان پر دشوار ہے، اور غریبوں کے صدقات لینے کی جانب سے۔ اور عقلی خوشی: خوش ہونے کی جانب سے اس بات سے جوان پر اللہ نے انعام کی یعنی اس عبادت کی ادائیگی کی توفیق دینا جوان پر فرض کی گئی ہے۔ اوران پر دوسرے سال تک اہل وعیال کے سروں کو یعنی ذوات کو باقی رکھنے کی نعمت برسائی۔

اور دوسری عید: حضرت ابراہیم کا اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہما السلام کو ذبح کرنے کا دن ہے۔ اور اللہ کے دونوں پر انعام فرمانے کا دن ہے۔ بایں طور کہ ان کے عوض میں دیدیا ایک بڑا ذبیحہ۔ کیونکہ اس (دن کی تعیین) میں ملتِ ابراہیمی کے پیشواؤں کی حالت یاد کرنا ہے۔ اوران سے سبق لینا ہے اللہ کی فرمانبرداری میں جان ومال کے خرچ کرنے سے اور قوتِ صبر سے —— اوراس میں حجاج کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ہے، اور حجاج کا ذکر بلند کرنا ہے اور شوق پیدا کرنا ہے اُس حالت کا جس میں وہ حجاج ہیں —— اوراسی وجہ سے تکبیر مسنون کی گئی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرواس پر کہ اس نے تم کو راہ دکھائی'' یعنی شکریہ کے طور پر اس بات کی کہ اس نے تم کو توفیق دی، روزے رکھنے کی (اس کا تعلق پہلی عید سے ہے) —— اوراس وجہ سے قربانی کرنا اور منی کے دنوں میں (فرض نمازوں کے بعد) زور سے تکبیر کہنا مسنون کیا گیا۔ اور مستحب قرار دیا گیا بال نہ مونڈنا اس کے لئے جو قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے —— اور مسنون کی گئی نماز اور خطبہ تاکہ نہ ہو مسلمانوں کا کوئی اجتماع ذکر اللہ کے بغیر اور دین کے شعائر کی تشہیر کے بغیر۔ (الحاجّ: اسم جمع بمعنی حجّاج ہے)

☆ ☆ ☆

عیدین کے اجتماع کا ایک مقصد شوکت کی نمائش بھی ہے

عیدین کی مذکورہ حکمتوں کے ساتھ ایک مقصد اور بھی ملایا گیا ہے۔ اور وہ بھی ایک شرعی مقصد ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر ملت کے لئے ایک ایسا فنکشن ضروری ہے، جس میں اُس ملت کے لوگ اکٹھا ہوں، تاکہ ان کی شوکت کا اظہار ہو۔ اور ان کی کثرت کا پتہ چلے۔ عیدین کے اجتماعات کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ اوراسی وجہ سے مستحب قرار دیا گیا کہ سب لوگ عیدین کے لئے نکلیں۔ یہاں تک کہ بچے، عام عورتیں، پردہ نشین خواتین، کنواری لڑکیاں اور حائضہ عورتیں بھی نکلیں۔ البتہ حائضہ عورتیں نماز میں شرکت نہ کریں۔ بلکہ نماز کی جگہ سے علحدہ بیٹھیں۔ اور خطبہ میں جو پند وموعظت کی جائے اس سے استفادہ کریں اور اجتماعی دعا میں شریک رہیں۔ اور نبی ﷺ جو عیدین میں آتے جاتے راستہ بدلا کرتے تھے، اس کا بھی یہی مقصد تھا کہ دونوں راستوں کے لوگ مسلمانوں کی شان وشوکت دیکھیں۔ اور عید کی اصل چونکہ آرائش وزیبائش ہے، اس لئے اچھا لباس پہننا، ڈھپ ڈھپاہٹ کرنا اور اشعار پڑھنا، اور آتے جاتے راستہ بدلنا اور شہر میں عید

پڑھنے کے بجائے عیدگاہ جا کر عید پڑھنا مستحب قرار دیا گیا۔

فائدہ: یہ جو عید کا ذیلی مقصد بیان کیا گیا ہے۔اور فرمایا ہے کہ یہ بھی ایک شرعی مقصد ہے۔اس کی شاہ صاحب نے کوئی دلیل بیان نہیں کی۔میرے ناقص علم میں بھی اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔پس اس حکمت پر آگے جو تفریعات کی ہیں، وہ سب محل نظر ہیں۔مثلاً: عیدین میں سب کا نکلنا یعنی بچوں اور سب عورتوں کا بھی نکلنا، ائمہ میں سے کسی کی رائے نہیں ہے۔نہ اس پر مسلمانوں کا عمل ہے۔اور آنحضرت ﷺ نے جو حائضہ عورتوں کو بھی عیدگاہ میں آنے کا حکم دیا تھا اس کی غرض حدیث میں مصرح ہے: یَشْهَدْنَ دعوةَ المسلمین یعنی مسلمانوں کو جو پند وموعظت کی جائے گی اس میں شرکت کریں۔آنحضرت ﷺ عیدین کے خطبوں میں خصوصی احکام بیان فرمایا کرتے تھے، ان سے واقف ہونے کے لئے سب عورتوں کو شریک کیا جاتا تھا۔چنانچہ بچوں کو شریک کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اور راستہ بدلنے کی تو اور بھی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔اور صحراء میں عیدین ادا کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ مساجد میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ بستی کے سارے مسلمان ایک ساتھ عید ادا کرسکیں۔بہر حال اہل علم غور کرلیں کہ یہ حکمت اور یہ مقصد کہاں تک درست ہے!

> وضَمَّ معه مقصدًا آخر من مقاصد الشريعة: وهو: أن كل ملة لابد لها من عَرْضَةٍ، يجتمع فيها أهلها، لتظهر شوكتُهم، وتُعلَم كثرتُهم، ولذلك استُحب خروج الجميع، حتى الصبيان، والنساء، وذوات الخدور، والْحُيَّضِ ويعتزلن المصلّٰى، ويشهدْنَ دعوةَ المسلمين؛ ولذلك كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يخالف في الطريق ذهابًا وإيابًا، ليطلع أهلُ كلتا الطريقين على شوكة المسلمين؛ ولما كان أصل العيد الزينةُ استُحبَّ حسنُ اللباس، والتقليس، ومخالفة الطريق، والخروج إلى المصلّٰى.

ترجمہ: اور ملایا گیا ہے اس کے ساتھ (یعنی مذکورہ حکمت کے ساتھ) ایک اور مقصد شریعت کے مقاصد میں سے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر ملت کے لئے ضروری ہے کوئی نمائش، جس میں اس ملت کے لوگ اکٹھا ہوں، تاکہ ان کی شوکت ظاہر ہو، اور ان کی کثرت جانی جائے۔اور اسی وجہ سے مستحب قرار دیا گیا ہے سب کا نکلنا، یہاں تک کہ بچے، اور عورتیں، اور پردے والیاں اور حائضہ عورتیں۔اور جدا رہیں وہ نماز کی جگہ سے۔اور شرکت کریں وہ مسلمانوں کی موعظت میں۔اور اسی وجہ سے نبی ﷺ آتے جاتے راستہ بدلا کرتے تھے، تاکہ مطلع ہوں دونوں ہی راستوں والے مسلمانوں کی شوکت سے —— اور جب تھی عید کی اصل زیبائش تو مستحب قرار دیا گیا اچھا لباس، اور دُف بجانا اور اشعار پڑھنا (اس کے استحباب کی کوئی دلیل نہیں حدیث سے صرف گنجائش یا جواز نکلتا ہے) اور راستہ بدلنا اور عیدگاہ کی طرف نکلنا۔

لغات: عَرْضَة: نمائش، اظہار مَعْرِض: نمائش گاہ۔یہ لفظ عین کے پیش کے ساتھ نہیں ہے عُرضة کے معنی ہیں:

نشانہ، ہدف (سورۃ البقرہ آیت ۲۲۴)..... قَلَّسَ :دُف بجانا اور گانا۔ قَلَّسَ القوم: گا بجا کر اور کھیل کود سے بادشاہوں کا استقبال کرنا۔

☆ ☆ ☆

نمازِ عیدین کے مسائل اور ان کی حکمتیں

عیدین میں نماز سے آغاز کرے یعنی پہلے نماز پڑھی جائے پھر خطبہ دیا جائے۔ کیونکہ اصل یہی ہے۔ اجتماع کا اصل مقصد نماز ہے۔ پس پہلے وہ ادا کی جائے۔ اور جمعہ میں بھی پہلے خطبہ بعد میں تھا۔ مگر چونکہ وہ ہفتہ واری اجتماع ہے، اس لئے بعض لوگ سستی کرتے ہیں اور دیر سے آتے ہیں۔ اور ان کی پوری نماز یا کوئی رکعت چھوٹ جاتی ہے۔ اس لئے بعد میں خطبہ مقدم کر دیا گیا۔ اور عیدین کی نوبت سال میں دو ہی مرتبہ آتی ہے، اور لوگ پہلے سے تیاری کر کے آجاتے ہیں، اس لئے اصل کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔

اور عیدین: اذان واقامت کے بغیر ادا کی جائیں، کیونکہ جنگل میں اذان دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا! اور اقامت اذان ثانی ہے۔ پس جب اذانِ اول نہیں تو ثانی بھی نہیں ـــــ اور عیدین میں قراءت جہری کرے، کیونکہ دن میں جہر سے مانع جو امور ہیں، وہ عیدین میں موجود نہیں ہیں۔ تفصیل پہلے گذر چکی ہے ـــــ اور ہلکی نماز پڑھانی ہو تو امام سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ یا ان کے بقدر پڑھے۔ اور کامل پڑھانی ہو تو سورۃ ق اور سورۃ القمر یا ان کے بقدر پڑھے۔ اور وجہ: تخفیف وتکمیل کا قصد ہے۔

اور عیدین میں زائد تکبیریں کتنی ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک بارہ ہیں: سات پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور پانچ دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے۔ اور احناف کے نزدیک چھ ہیں: تین پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں قراءت کے بعد۔ اور دونوں کے پاس روایات ہیں جو متکلم فیہ ہیں، مگر قابل استدلال ہیں۔ پس دونوں طرح عمل کرنا درست ہے۔ اور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حرمین کا عمل ارجح ہے۔ وہاں بارہ تکبیریں کہی جاتی ہے (مگر یہ بات اس وقت درست ہے جبکہ حرمین کے ائمہ آزاد ہوں۔ نہ حکومت کے پابند ہوں نہ کسی مسلک کے۔ اور اب یہ بات ناممکن سی ہے) ـــــ پھر نماز سے فارغ ہو کر خطبے دے، جن میں لوگوں کو اللہ سے ڈرنے کا حکم دے اور پند ونصیحت اور تذکیر موعظت کرے۔

اور عید الفطر کے مخصوص مسائل دو ہیں:

پہلا مسئلہ: عید کی نماز کے لئے جانے سے پہلے چند کھجوریں کھائے اور طاق عدد کا خیال رکھے۔ اور کھجوریں میسر نہ ہوں تو کوئی بھی میٹھی چیز یا جو چیز بھی میسر ہو: ضرور کھائے تاکہ افطار متحقق ہو جائے یعنی عملی طور پر یہ بات ثابت ہو جائے

کہ آج روزہ نہیں ہے۔ کیونکہ روزوں کا مہینہ ختم ہو چکا۔

دوسرا مسئلہ: نماز کے لئے جانے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرے، تاکہ غریب لوگ کمانے سے بے نیاز ہو جائیں، اور بے فکر ہو کر نماز میں شرکت کریں۔

اور عیدالاضحیٰ کے مخصوص مسائل بھی دو ہیں:

پہلا مسئلہ: نماز سے پہلے کوئی چیز نہ کھائے، بلکہ نماز کے بعد اپنی قربانی کا گوشت کھائے۔ کیونکہ اگر بھوکا ہوگا تو قربانی کا گوشت خوب رغبت سے کھائے گا۔ اور قربانی کا گوشت بابرکت ہے، پھر دوسری چیز کیوں کھائے؟ اور اس سے قربانی کا اہتمام بھی ظاہر ہوتا ہے (البتہ چائے پی سکتا ہے اور پان کھا سکتا ہے، کیونکہ اس سے پیٹ نہیں بھرتا)

دوسرا مسئلہ: قربانی نماز کے بعد ہی درست ہے۔ نماز سے پہلے کی ہوئی قربانی معتبر نہیں۔ کیونکہ قربانی حاجیوں کی مشابہت کی وجہ سے عبادت بنی ہے۔ اور حجاج: قربانی وقوفِ عرفہ کے بعد ہی کرتے ہیں۔ اور یہاں عید کا اہتمام وقوفِ عرفہ کے مثل ہے، پس قربانی اس کے بعد ہی درست ہے۔ چنانچہ جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی، وہاں صبح صادق کے بعد قربانی درست ہے۔

وسنةُ صلاة العيدين: أن يُبدأ بالصلاة من غير أذان ولا إقامة، يُجهر فيها بالقراءة، يَقرأ عند إرادة التخفيف بسبح اسم ربك الأعلى، وهل أتاك، وعند الإتمام ق، واقتربت الساعة؛ يكبر في الأولى سبعًا قبل القراءة، والثانيةِ خمسًا قبل القراءة؛ وعملُ الكوفيين: أن يكبِّرَ أربعًا كتكبير الجنائز، في الأولى قبل القراءة، وفي الثانية بعدها، وهما سنتان، وعملُ الحرمين أرجح، ثم يخطب: يأمر بتقوى الله، ويَعِظُ، ويُذَكِّرُ.

وفي الفطر خاصةً: أن لايغدُوَ حتى يأكل تمرات، ويأكلهن وترًا، وحتى يؤدي زكاةَ الفطر، إغناءً للفقير في مثل هذا اليوم، ليشهدوا الصلاةَ فارغي القلب، وليتحقق مخالفةُ عادةِ الصوم، عند إرادة التنويه بانقضاء شهر الصيام.

وفي الأضحى خاصةً: أن لايأكل حتى يرجع، فيأكل من أضحيته، اعتناءً بالأضحية، ورغبةً فيها، وتبركًا بها، ولا يضحِّيْ إلا بعد الصلاة، لأن الذبح لايكون قُربةً إلا بتشبه الحاج، وذلك بالاجتماع للصلاة.

ترجمہ: اور عیدین کی نماز کا طریقہ: یہ ہے کہ نماز سے آغاز کیا جائے، اذان و اقامت کے بغیر۔ زور سے پڑھی جائے نماز میں قراءت۔ تخفیف کے ارادے کے وقت پڑھے سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ۔ اور تکمیل کے ارادہ کے وقت

پڑھے سورۂ ق اور سورۃ القمر۔ سات تکبیریں کہے پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے (امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک پہلی رکعت میں تکبیراتِ زوائد چھ ہیں) اور دوسری میں پانچ قراءت سے پہلے۔ اور کوفہ والوں کا عمل یہ ہے کہ چار تکبیریں کہے جنازوں کی تکبیروں کی طرح: پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے، اور دوسری میں قراءت کے بعد (پہلی رکعت کی تین زائد تکبیریں تکبیر تحریمہ کے ساتھ مل کر چار ہیں اور دوسری رکعت کی تکبیریں رکوع کی تکبیر کے ساتھ مل کر چار ہیں) اور دونوں سنت ہیں۔ اور حرمین کا عمل راجح ہے۔ پھر خطبہ دے۔ حکم دے اللہ سے ڈرنے کا اور نصیحت کرے اور تذکیر کرے۔

اور عید الفطر میں خاص طور پر یہ ہے کہ (۱) صبح کو نہ جائے یہاں تک کہ چند کھجوریں کھائے اور ان کو طاق کھائے (۲) اور یہاں تک کہ صدقۃ الفطر ادا کرے۔ غریب کو بے نیاز کرنے کے طور پر اس دن جیسے میں (یعنی خوشی کے دن میں) تا کہ شریک ہوں وہ نماز میں درانحالیکہ وہ فارغ القلب ہوں (یہ دوسرے مسئلہ کی حکمت ہے) اور تا کہ پائی جائے روزے کی عادت کی مخالفت (یعنی روزہ نہ ہونا متحقق ہو) روزوں کے مہینے کے ختم ہونے کی تشہیر کرنے کا ارادہ کرنے کے وقت (یعنی عید الفطر کا مقصد ہی اس بات کی تشہیر کرنا ہے کہ رمضان ختم ہوگیا۔ اور یہ بات اس دن میں کچھ کھانے ہی سے متحقق ہوگی)

اور عید الاضحیٰ میں خاص طور پر: یہ بات ہے کہ: (۱) نہ کھائے یہاں تک کہ لوٹے، پس کھائے اپنی قربانی سے۔ اہتمام کرتے ہوئے قربانی کا۔ اور اس میں رغبت کرتے ہوئے۔ اور اس سے برکت حاصل کرتے ہوئے (۲) اور نہ قربانی کرے مگر نماز کے بعد۔ اس لئے کہ ذبح عبادت نہیں ہے مگر حجاج کی مشابہت کی وجہ سے۔ اور وہ مشابہت نماز کے لئے جمع ہونے کے ذریعہ ہے۔

☆ ☆ ☆

قربانی کے جانور

(احوال اور حکمتیں)

وہ جانور جن کی قربانی جائز یا ناجائز ہے؟: قربانی صرف اونٹ، گائے بھینس اور بھیڑ بکری کی درست ہے۔ کیونکہ یہ پالتو مویشی ہیں اور سرمایہ ہیں۔ ان کی قربانی کرنے کا دل پر اثر پڑتا ہے۔ جنگلی جانور: ہرن وغیرہ کی قربانی تو مالِ مفت دلِ بے رحم والا معاملہ ہے۔ اور کوئی ہرن پال لے تو یہ خاص معاملہ ہے۔ احکام عام حالات پر مرتب ہوتے ہیں۔ اور گھوڑے، گدھے اور خچر کی قربانی اس لئے درست نہیں کہ وہ ماکول اللحم نہیں۔

قربانی کے جانور کی عمریں: قربانی کا جانور جوان ہونا ضروری ہے۔ بچے کی قربانی درست نہیں۔ اور جانور اس وقت جوان ہوتا ہے جب اس کے دودھ کے دانت ٹوٹتے ہیں۔ عربی میں اس کو ثَنِیّ (وہ جانور جس کے سامنے کے

دانت گر گئے ہوں) اور مُسِنّ (بڑی عمر کا یعنی جوان جانور) کہتے ہیں۔ اونٹ پانچ سال میں، گائے بھینس دو سال میں اور بھیڑ بکری ایک سال میں جوان ہوتے ہیں۔ پس اس سے کم عمر کے جانور کی قربانی درست نہیں۔

چھ ماہہ بھیڑ کی قربانی جائز ہے: اور بھیڑ دُنبہ: خواہ چکتی دار ہو یا بے چکتی، اگر وہ چھ ماہ کا ہو چکا ہے، اور فربہ ایسا ہو کہ سال بھر کی بھیڑوں میں چھوڑ دیا جائے، تو دور سے چھوٹا نہ معلوم ہو تو اس کی قربانی بھی بوقتِ ضرورت درست ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بعض علاقوں میں نشو ونما اچھی ہوتی ہے۔: ہاں لڑکے اور لڑکیاں بلوغ کی عمر (لڑکے میں بارہ سال اور لڑکی میں نو سال) کے بعد جلدی جوان ہو جاتے ہیں، اسی طرح بعض جانور جلدی پروان چڑھتے ہیں۔ بھیڑ ایسا ہی جانور ہے۔ بکرا اور بھیڑ پال کر دیکھیں، فرق کا اندازہ ہو جائے گا۔ اور جس طرح اَمرد (بے ریش لڑکے) کے پیچھے نماز پڑھنا، اگر چہ وہ بالغ ہو، بے ضرورت پسندیدہ نہیں۔ اسی طرح چھ ماہہ بھیڑ کی قربانی بھی بے ضرورت نہیں کرنی چاہئے۔ غرض بھیڑ میں جوانی کی مدت چھ ماہ ہے۔ اس عمر کے بعد جب وہ سال بھر کی بھیڑوں جیسا معلوم ہونے لگے تو بوقتِ ضرورت اس کی قربانی درست ہے۔ مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: لَاتَذْبَحوا إلا مُسِنَّةً، إلا أن يَعْسُرَ عليكم، فَتَذْبَحُوْا جَذَعَةً من الضَّأْنِ۔ ترجمہ: نہ قربانی کرو مگر مُسِنَّہ (پورے جوان جانور) کی۔ مگر یہ کہ نہ پاؤ تم مسنہ تو قربانی کرو چھ ماہہ دنبہ یا بھیڑ کی یعنی مستحب یہ ہے کہ اگر پورا جوان جانور نہ ملے یا اس کی گنجائش نہ ہو تو چھ ماہہ بھیڑ دنبے کی قربانی کرے۔

نابالغ اولاد کی طرف سے قربانی باپ پر واجب نہیں: اور قربانی صدقۂ فطر کی طرح نہیں ہے۔ صدقۂ فطر تو نابالغ اولاد کا بھی باپ پر علحدہ واجب ہے۔ مگر قربانی کا یہ حکم نہیں۔ باپ مالدار ہو تو اسی پر قربانی واجب ہے، وہی اولاد کی طرف سے بھی قربانی ہے۔ اولاد کی الگ سے قربانی کرنا باپ پر واجب نہیں۔ البتہ بیوی اور بالغ بچوں میں سے جو صاحب نصاب ہوں ان پر علحدہ قربانی کرنا واجب ہے۔ ابوداؤد (حدیث ۲۷۸۸) اور نسائی اور ابن ماجہ میں جو روایت ہے: إنَّ علی كلِّ أهلِ بيت في كل عامٍ أُضْحِيَّةً: بیشک ہر فیملی پر ہر سال میں قربانی واجب ہے: اس کا یہی مطلب ہے۔

بڑے جانور میں سات حصے ہو سکتے ہیں: اور بڑے جانور میں یعنی اونٹ اور گائے بھینس میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ خاص اس مسئلہ میں تو کوئی روایت نہیں مگر ہدی کے سلسلہ میں روایت ہے کہ حدیبیہ میں جب صحابہ نے احرام کھولا تو بڑے جانور کی قربانی سات سات آدمیوں نے شریک ہو کر کی تھی۔ علماء نے قربانی کو ہدی پر قیاس کیا ہے۔ پس قربانی میں بھی سات آدمیوں کی شرکت درست ہے۔ اور وجہ ظاہر ہے: چھوٹا جانور چھوٹا ہے اور بڑا بڑا۔ قیمت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرے کی شرکت جائز رکھی گئی ہے، ورنہ اصل عدم شرکت ہے۔

عمدہ جانور کی قربانی مستحب ہے اور عیب دار کی جائز نہیں: قربانی کے جانور کو فربہ کرنا اور عمدہ جانور کی قربانی کرنا مستحب ہے اور عیب دار جانور کی قربانی درست نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قربانی من وجہ مالی عبادت ہے۔ سورۃ

الحج آیت ۳۷ میں ہے: ''اللہ کے پاس نہ اُن (ہدیوں) کا گوشت پہنچتا ہے، اور نہ ان کا خون۔ بلکہ ان کے پاس تمہارا تقوی پہنچتا ہے'' یعنی قربانی میں اصل مقصود تقوی ہے، جو دل کی ایک کیفیت ہے، مال نہیں ہے۔ مگر اس کا تقوم (وجود) قربانی کے جانور کے ذریعہ ہوتا ہے، پس قربانی ضروری ہے۔ پھر جانور قربان کرنے کے بعد اس کا گوشت یہیں دنیا میں رہ جاتا ہے۔ اس کو اللہ کی میزبانی کے طور پر خود قربانی کرنے والا اور دوسرے بندے استعمال کرتے ہیں۔ اور کچھ حصہ اس کا رائگاں جاتا ہے۔ خون، ہڈیاں وغیرہ پھینک دی جاتی ہیں۔ اور جب جانور کی قربانی ضروری ٹھہری تو جانور مال ہے۔ پس قربانی بھی مالی عبادت ہے اور مالی عبادت کے بارے میں اللہ پاک نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ سورۂ آل عمران آیت ۹۲ میں فرمایا ہے: ''تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو'' اور مریل اور عیب دار جانور پیارا کب ہوتا ہے۔ عمدہ فربہ جانور پیارا ہوتا ہے۔ ایسا جانور قربان کرنے سے قربانی کرنے والے کی سچی رغبت ظاہر ہوتی ہے۔ اور دوسری بات سورۃ البقرہ آیت ۲۶۷ میں ارشاد فرمائی ہے: ''اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیز اپنی کمائی سے، اور اس سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہے۔ اور ردّی (بیکار) چیز کو خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو'' اس حکم خداوندی کے بموجب عیب دار جانور کی قربانی درست نہیں۔

عیب دار جانور: وہ عیب دار جانور جن کی قربانی جائز نہیں درج ذیل ہیں:

۱ــــــ جو جانور اتنا لنگڑا ہو کہ فقط تین پاؤں سے چلتا ہو۔ چوتھا پاؤں رکھا ہی نہ جاتا ہو یا چوتھا پاؤں رکھتا تو ہے مگر اس سے چل نہیں سکتا تو اس کی قربانی درست نہیں۔ واضح لنگڑا یہی ہے اور جو چلتے وقت پاؤں ٹیک کر چلتا ہے۔ اور چلنے میں اس سے سہارا لیتا ہے، لیکن لنگڑا کر چلتا ہے تو اس کی قربانی درست ہے۔ وہ واضح لنگڑا نہیں ہے۔

۲ــــــ وہ جانور جو اندھا ہے یا کانا ہے۔ ایک آنکھ کی تہائی یا اس سے زیادہ روشنی چلی گئی ہے تو اس کی قربانی بھی درست نہیں۔

۳ــــــ ایسا بیمار جانور جو گھاس نہ کھاتا ہو اس کی قربانی بھی درست نہیں۔

۴ــــــ اتنا دُبلا مریل جانور جس کی ہڈیوں میں گودا بالکل نہ رہا ہو، اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ پیروں پر کھڑا نہ ہوسکتا ہو، اس کی قربانی بھی درست نہیں۔ اور اگر دُبلا تو ہے مگر اتنا دُبلا نہیں تو اس کی قربانی درست ہے۔ مگر تازے جانور کی قربانی زیادہ بہتر ہے۔

۵ــــــ جس جانور کا سینگ بالکل جڑ سے ٹوٹ گیا ہو اس کی قربانی بھی درست نہیں۔ البتہ پیدائش ہی سے سینگ نہ ہوں یا سینگ کا خول اتر گیا ہو یا گری (اصل سینگ) کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہو تو اس کی قربانی درست ہے۔

۶ــــــ جس جانور کے پیدائش ہی سے کان نہ ہوں یا تہائی سے زیادہ کان کاٹ ڈالے گئے ہوں تو اس کی قربانی بھی درست نہیں۔ اور اگر کان چھوٹے ہیں تو اس کی قربانی درست ہے۔ یہی حکم دُم کٹے جانور کا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم قربانی کے جانور کی آنکھ اور کان خوب دیکھ بھال لیں۔ اور اگلی طرف سے جس کا کان کٹا ہوا ہو یا پچھلی طرف سے کٹا ہوا ہو یا جس کے کان دراز چیرے ہوئے ہوں یا جس کے کانوں میں گول سوراخ کئے گئے ہوں ان کی قربانی نہ کریں (مشکوۃ حدیث ۱۴۶۳) مگر مطلق کٹنا مراد نہیں۔ بلکہ تہائی سے زیادہ کان ضائع ہو گیا ہو تو اس کی قربانی درست نہیں۔ اس سے کم ضائع ہوا ہو تو قربانی درست ہے۔ اور دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سینگ ٹوٹے کی اور کان کٹے کی قربانی کرنے سے منع کیا (مشکوۃ حدیث ۱۴۶۴) اس حدیث کی شرح میں حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مراد آدھا یا زیادہ کان کٹا ہوا ہے۔

سینگ دار خصی مینڈھے کی قربانی: جس کی آنکھیں، سینہ، پیٹ اور پاؤں سیاہ ہوں اور باقی بدن سفید ہو مسنون ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک مرتبہ ایسے ہی مینڈھے کی قربانی کی ہے (مگر یہ سب باتیں اتفاقاً ہی کسی مینڈھے میں جمع ہوتی ہیں، پس اس کو مستحب قرار دینا اَولیٰ ہے۔ مسنون قرار دینا مناسب نہیں) اور استحباب کی وجہ یہ ہے کہ یہ باتیں چھوٹے جانور کی بھرپور جوانی کی علامت ہیں۔

ذبح کی دعا: اور جب قربانی کا جانور قبلہ رُخ لٹادے تو یہ دعا پڑھے إِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ. إِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، لَاشَرِیْكَ لَهُ، وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ، وَلَكَ پھر بِسْمِ اللهِ أَللّٰهُ أَكْبَرُ کہہ کر ذبح کرے اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ وَخَلِیْلِكَ إِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِمَا الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ۔

والأضحيةُ: مُسِنَّةٌ من مَعْزٍ، أو جذع من ضَأْنٍ، على كل أهل بيتٍ، وقاسوها على الهدى، فأقاموا البقرةَ عن سبعة والجزور عن سبعة مقامَها.

ولما كانت الأضحية من باب بذل المال لله تعالى، وهو قوله تعالى: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللهَ لُحُوْمُهَا وَلَادِمَاؤُهَا، وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ كان تسمينُها، واختيارُ الجيِّد منها مستحبًا، لدلالته على صحة رغبته في الله، فلذلك يُتَّقَى من الضحايا أربعًا: العرجاءُ البيِّنُ ظَلَعها، والعوراء البين عَوَرها، والمريضة البين مَرَضُها، والعجفاء التي لاتُنْقِيْ، ويُنْهٰى عن أعضَبِ القرن والأذن، وسُنَّ استشراف العين والأذن، وأن لايُضَحّٰى بمقابلةٍ، ولامدابرة، ولاشرقاء، ولاخرقاء، وسُنَّ الفحل الأقرن الذي ينظر في سوادٍ، ويبرك في سواد، ويَطَأُ في سواد، لأن ذلك تمام شباب المعز.

ومن أذكار التضحية: " إني وجهت وجهي للذي فطر السماوات والأرض إلخ اللهم منك، ولك، بسم الله والله أكبر.

ترجمہ: اور قربانی بکری میں سے جوان جانور ہے یا بھیڑ میں سے چھ ماہہ ہے، ہر گھر والوں پر۔ اور علماء نے قیاس کیا ہے قربانی کو ہدی پر۔ پس رکھا ہے انھوں نے گائے بھینس کو سات کی طرف سے اور اونٹ کو سات کی طرف سے قربانی کی جگہ میں ـــــ اور جب تھی قربانی اللہ تعالیٰ کے لئے مال خرچ کرنے کے قبیل سے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اللہ کے پاس نہ اُن کا گوشت پہنچتا ہے، اور نہ ان کا خون، بلکہ اس کے پاس تمہارا تقوی پہنچتا ہے'' تو قربانی کے جانور کو فربہ کرنا اور جانوروں میں سے عمدہ کو اختیار کرنا مستحب ہوا، اس کے دلالت کرنے کی وجہ سے قربانی کرنے والے کی رغبت کے سچا ہونے پر۔ پس اسی وجہ سے چار قسم کے جانوروں کی قربانی سے بچا جاتا ہے: وہ لنگڑا جس کا لنگڑا پن واضح ہو۔ اور وہ کانا جس کا کانا پن واضح ہو۔ اور ایسا بیمار جس کی بیماری واضح ہو۔ اور ایسا لاغر جس کی نلیوں میں گھی نہ رہا ہو۔ اور رد کیا گیا ہے سینگ ٹوٹے اور کان کٹے سے۔ اور مسنون کیا گیا ہے آنکھ اور کان کو گھور کر دیکھ لینا۔ اور یہ کہ نہ قربانی کی جائے سامنے کی طرف سے کان کٹے کی اور نہ پیچھے کی طرف سے کان کٹے کی۔ اور نہ دراز کان چیرے ہوئے کی اور نہ کان میں گول سوراخ کئے ہوئے کی۔ اور مسنون کیا گیا ہے: سینگ دار مینڈھا جو سیاہی میں دیکھتا ہو اور سیاہی میں بیٹھتا ہو اور سیاہی میں روندتا ہو۔ اس لئے کہ یہ بکرے کی جوانی کی تمامیت ہے ـــــ اور قربانی کے اذکار میں سے ہے: إني وجهت إلخ

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۱۸

جنائز کا بیان

مرضِ موت، موت اور موت کے بعد کی اصولی باتیں

بیمار کی بیمار پرسی کرنا، بیماری میں بابرکت اور مفید جھاڑ پھونک کرنا۔ لبِ مرگ کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کرنا۔ مرنے کے بعد کفن دفن کرنا۔ میت کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ میت پر آنسو بہانا۔ پسماندگان کو تسلی دینا اور قبرستان جانا: یہ ایسے امور ہیں جو عربوں میں رائج تھے۔ اور اُن پر یا ان کی نظائر پر عجم کے لوگ بھی متفق تھے۔ اور یہ ایسی عادتیں ہیں جن سے سلیم فطرت والے جدا نہیں ہوتے۔ اور نہ جدا ہونا مناسب ہے کہ یہ سب باتیں ہر طرح سے مفید ہیں۔ اس لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپؐ نے اُن عادات کا جائزہ لیا اور ان کی اصلاح فرمائی۔ اور ان میں جو بگاڑ تھا اس کو درست کیا۔

اور اصلاح میں تین باتیں ملحوظ رکھیں اول: مریض کی دنیوی اور اُخروی مصلحت دوم: پسماندگان کی دنیوی اور

اُخروی مصلحت سوم: ملت کی مصلحت۔

مریض کی دنیوی مصلحتیں: دو ہیں:

پہلی مصلحت: یہ ہے کہ مریض کو تسلی دی جائے، اور اس کے ساتھ نرمی برتی جائے۔ تا کہ اس کو تسکین ہو، اور اس کی بے چینی کم ہو۔

دوسری مصلحت: یہ ہے کہ جو کام مریض خود نہیں کرسکتا اس میں اس کی مدد کی جائے۔

ان دو مصلحتوں کے پیش نظر عیادت کا طریقہ لازم کیا۔ خاندان والوں پر اور اہل بستی پر لازم ہے کہ وہ بیمار کی بیمار پرسی کریں۔ صحیح روایات میں مسلمان کے مسلمان پر جو پانچ یا چھ یا سات حقوق بیان کئے گئے ہیں، ان میں ایک بیمار پرسی کرنا بھی ہے (مشکوۃ حدیث ۱۵۲۴-۱۵۲۶)

مریض کی اُخروی مصلحتیں: بھی دو ہیں:

پہلی مصلحت: یہ ہے کہ مریض کو صبر کی تلقین کی جائے اور ہمت سے کام لینے پر ابھارا جائے۔ تا کہ بیماری کی کلفتیں: دواء کے اس کڑوے گھونٹ کی طرح ہوجائیں، جو بدمزہ ہوتا ہے مگر نفع کی امید سے آدمی پیتا ہے۔ بے صبری کا مظاہرہ کرنا اور ہائے ہلاّ مچانا: دنیا میں ڈوباتا ہے، اور اللہ سے دور کرتا ہے۔ اور جو صبر سے کام لیتا ہے، وہ جوں جوں کمزور ہوتا ہے، اس کے گناہ جھڑتے ہیں۔ آگے حدیث اول میں اس کا بیان ہے —— اس مصلحت کے پیش نظر ضروری ہوا کہ مریض کو صبر کے فوائد اور سختیوں کے ثواب سے آگاہ کیا جائے تا کہ اس کا ثواب ضائع نہ ہو۔

دوسری مصلحت: یہ ہے کہ مریض چونکہ لبِ مرگ آچکا ہے، اس لئے اس کو اللہ کو یاد کرنے کے لئے کہا جائے۔ اور اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دی جائے، تا کہ جب اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرے تو وہ ایمان کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی نکلے۔ اور اس کا ثمرہ آخرت میں پائے۔

میت کے ساتھ حسن سلوک: کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: یہ ہے کہ میت کی جائز وصیتیں اور نیک خواہشات پوری کی جائیں۔ کیونکہ ہر سلیم المزاج کی فطرت ہے کہ جس طرح اس کو اہل وعیال اور مال ومنال سے محبت ہوتی ہے، اسی طرح اس کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد لوگ اس کا ذکر خیر کریں۔ اور اس کی کوئی برائی لوگوں کے سامنے نہ آنے پائے۔ چنانچہ دنیا کے تمام صائب الرائے لوگ بے شمار دولت خرچ کر کے کوئی ایسی بلند عمارت بناتے ہیں جو ان کی یادگار رہے۔ اور لوگ خطرناک مواقع میں بے دھڑک کود پڑتے ہیں تا کہ ان کی بہادری کا ڈنکا بجے۔ اور لوگ وصیتیں کر جاتے ہیں کہ ان کا شاندار مزار بنایا

جائے تاکہ لوگ کہیں کہ فلاں کیسا نصیبہ ور تھا! یہاں تک کہ حکیم شیراز نے کہا ہے: ''نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت!'' یعنی جو اچھا نام کما گیا، وہ مرنے کے بعد بھی زندہ ہے۔

پس جب یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اور لوگ ایسی باتوں کے آرزومند رہتے ہیں تو ضروری ہے کہ میت کے گمان کو سچا کر دکھایا جائے۔ اور اس کی وصیتوں کو پورا کیا جائے۔ تاکہ اس کو خوشی ہو۔ یہ بھی میت کے ساتھ ایک طرح کا حسن سلوک ہے۔ اور اس کی برائیوں کا تذکرہ نہ کیا جائے البتہ خوبیاں بیان کی جائیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۷۸) خوبیاں بیان کرنا بھی میت کے ساتھ حسن سلوک ہے۔

دوسری صورت: یہ ہے کہ میت کو دعا اور صدقہ کے ذریعہ فائدہ پہنچایا جائے۔ کیونکہ جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی روح کے احساسات اور ادراکات باقی رہتے ہیں یعنی حس مشترک وغیرہ ادراک کرنے والی صلاحیتوں کا عمل جاری رہتا ہے۔ نیز زندگی کے خیالات ومزعومات بھی برقرار رہتے ہیں۔ مزید حسبِ اعمال: عالَم بالا سے علوم مترشح ہوتے ہیں۔ جو جزا و سزا کا باعث بنتے ہیں۔ اور میت کو رنج وکلفت یا سرور وفرحت حاصل ہوتی ہے (تفصیل مبحث دوم باب سوم میں گذر چکی ہے، دیکھیں رحمۃ اللہ ۱: ۳۹۳)

پس جب دنیا میں اللہ کے نیک بندے میت کے لئے گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں، تو ان کی توجہاتِ سامیہ بارگاہِ عالی تک پہنچتی ہیں۔ یا پسماندگان مشقت اٹھا کر کوئی بڑی خیرات کرتے ہیں تو یہ دعا وصدقہ اللہ تعالیٰ کے انتظام کے مطابق میت کے لئے نافع بن جاتے ہیں۔ اور یہ دعا وصدقہ اللہ تعالیٰ کے اس فیضان سے ملتے ہیں جو بارگاہِ عالی سے میت پر نازل ہوتا ہے۔ اور اس کو میت کی خوش حالی کے لئے تیار کرتے ہیں۔

فائدہ: دعا وصدقہ کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ ان کا نفع پہنچنا متفق علیہ ہے۔ عبادات بدنیہ کے نفع پہنچنے کی بھی یہی صورت ہوتی ہے۔

میت کے پسماندگان کی دنیوی مصلحتیں:

میت کے اہل وعیال کو چونکہ شدید صدمہ پہنچا ہے، اس لئے ان کے لئے دنیا میں تین باتیں مفید ہیں:

پہلی بات: پسماندگان کو تسلی اور دلاسا دیا جائے، تاکہ ان کا صدمہ کچھ کم ہو۔ اس مقصد سے تعزیت مسنون ہوئی ہے۔

دوسری بات: میت کی تجہیز وتکفین میں پسماندگان کا ہاتھ بٹایا جائے یعنی غسل دینے میں، میت کو اٹھانے میں اور دفن کرنے میں شرکت کی جائے۔

تیسری بات: میت کے گھر والوں کے لئے یک شبانہ روز کا اتنا کھانا تیار کیا جائے، جس کو وہ شکم سیر ہو کر کھائیں۔

اور پسماندگان کی اُخروی مصلحت: یہ ہے کہ ان کو مصیبت پر صبر کرنے کی تلقین کی جائے اور ان کو ثواب عظیم کی

خوش خبری سنائی جائے۔ تاکہ ان کی بے چینی کی راہ مسدود ہو، اور اللہ کی طرف توجہ کا دروازہ کھلے اور اہل میت کو بین کرنے سے، کپڑے پھاڑنے سے، سینہ کوبی اور سر پھوڑنے جیسی حرکتوں سے روکا جاسکے، جن سے حزن وملال تازہ ہوتا ہے اور غم واندوہ بڑھ جاتا ہے۔ وارثان کا حال اس وقت میں بیمار کے حال جیسا ہوتا ہے، جس کا علاج ضروری ہے، مرض میں اضافہ مناسب نہیں۔

اور ملت کی مصلحت: یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں نے جو خرافات شروع کی تھیں، اور جو شرک تک مُفضی تھیں، ان کا سدّباب کیا جائے۔

﴿الجنائز﴾

اعلم: أن عيادةَ المريض، وتمسُّكه بالرُّقى المباركة، والرِّفْق بالمحتَضَر، وتكفينَ الميت، ودفنَه، والإحسانَ إليه، والبكاءَ عليه، وتعزيةَ أهلِه، وزيارةَ القبور: أمورٌ تتداولُها طوائفُ العرب، وتتواردُ عليها أو على نظائرها أصنافُ العجم؛ وتلك عاداتٌ لاينفك عنها أهل الأمزجة السليمة، ولاينبغي لهم أن ينفكوا، فلما بُعث النبيُّ صلى الله عليه وسلم نظر فيما عندهم من العادات، فأصلَحها، وصحَّح السقيم منها.

والمصلحةُ المرعية: إما راجعةٌ إلى نفس المبتلى، من حيث الدنيا أو من حيث الآخرة، أو إلى أهله من أحدى الحيثيتين، أو إلى الملة:

والمريضُ يحتاج:

[۱] في حياته الدنيا إلى تنفيسِ كربته بالتسلية والرفق، وإلى أن يتعرض الناسُ لمعاونته فيما يعجز عنه، ولايتحقَّق إلا أن تكون العِيادةُ سنةً لازمةً في إخوانه، وأهل مدينته.

[۲] وفي آخرته يحتاج إلى الصبر، وأن يتمثَّل الشدائدُ عنده بمنزلة الدواء الْمُرِّ، يعاف طعمَها، ويرجو نفعَها، لئلا يكون سببًا لغوصه في الحياة الدنيا، واحتجابه والتنحِّيْ من ربه، بل مؤيِّدةً في حط ذنوبه، مع تحلل أجزاءِ نسمته، ولايتحقق إلا بأن يُنَبَّهَ على فوائد الصبر، ومنافع الآلام.

والمحتضر في آخر يوم من أيام الدنيا، وأول يوم من أيام الآخرة، فوجب أن يُحثَّ على الذكر، والتوجه إلى الله، لتُفارق نفسُه، وهي في غاشيةٍ من الإيمان، فيجد ثمرتَها في معاده.

والإنسانُ: عند سلامة مزاجه كما جُبِلَ على حب المال والأهل، كذلك جُبل على حب أن يَذْكُرَهُ الناسُ بخيرٍ، في حياته وبعد مماته، وأن لاتظهر سوأتُه لهم، حتى إن أَسَدَّ الناس رأيا

من كل طائفة، يُحب أن يبذل أموالاً خطيرة في بناءٍ شامخ يبقى به ذكرُه، ويهجم على المهالكِ لِيُقال له من بعده: إنه جرئ! ويُوصى أن يُجعل قبره شامخًا ليقول الناس: هو ذو حظ عظيم في حياته وبعد مماته، وحتى قال حكماؤ هم: إن مَنْ كان ذكرُه حيًا في الناس فليس بميت! ولما كان ذلك أمرًا يُخلقون عليه ويموتون معه، كان تصديقُ ظنهم وإيفاءُ وعدهم نوعًا من الإحسان إليهم بعد موتهم.

وأيضًا: إن الروح إذا فارقت الجسدَ بقيت حساسةً مدرِكةً بالحس المشترك وغيره، وبقيت على علومها وظنونها، التي كانت معها في الحياة الدنيا، ويترشح عليها من فوقها علومٌ يُعذَّب بها أو يُنَعَّم، وهِمَمُ الصالحين من عباد الله ترتقى إلى حظيرة القدس، فإذا أَلَحُّوا في الدعاء لميت، أو عَانَوْا صدقةً عظيمةً لأجله، وقع ذلك بتدبير الله نافعًا للميت، وصادف الفيضَ النازلَ عليه من هذه الحظيرة، فَأَعَدَّ لرفاهية حاله.

وأهل الميت: قد أصابهم حزنٌ شديد، فمصلحتُهم:

[۱] من حيث الدنيا: أن يُعزَّوْا، ليُخفَّفَ ذلك عنهم بعضَ مايجدونه، وأن يُعاونوا على دفن ميتهم، وأن يُهَيِّئُوا لهم ما يُشْبِعُهم في يوم وليلتهم.

[۲] ومن حيث الآخرة: أن يُرَغَّبُوْا في الأجر الجزيل، ليكون سدًّا لغوصهم في القَلَق، وفتحًا لباب التوجه إلى الله، وأن يُنْهوا عن النياحة، وشَقِّ الجيوب، وسائرِ ما يُذَكِّرُهُ الأسفَ والموجِدَةَ، ويتضاعفُ به الحزنُ والقلقُ، لأنه حينئذ بمنزلة المريض، يحتاج أن يُداوىٰ مرضُه، لاينبغى أن يُمَدَّ فيه.

وكان أهل الجاهلية: ابتدعوا أمورًا تُفضى إلى الشرك بالله، فمصلحة الملة أن يُسَدَّ ذلك الباب.

ترجمہ: جنائز کا بیان: جان لیں کہ عیادت، اور بابرکت منتروں سے چمٹنا اور لبِ مرگ کے ساتھ نرمی کرنا، اور میت کو کفنانا اور اس کو دفنانا۔ اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ اور اس پر آنسو بہانا۔ اور اس کے گھر والوں کو تسلی دینا۔ اور قبروں کی زیارت کرنا: ایسے امور ہیں جن کو ہاتھ در ہاتھ لیتی ہیں عربوں کی جماعتیں۔ اور ان پر یا ان کی نظیروں پر غیر عربوں کی قسمیں متفق ہیں۔ اور وہ ایسی عادتیں ہیں جن سے درست مزاج والے جدا نہیں ہوتے۔ اور ان کے لئے مناسب بھی نہیں کہ جدا ہوں، پس جب مبعوث فرمائے گئے نبی ﷺ تو آپؐ نے اُن عادات پر نظر ڈالی جو ان میں رائج تھیں۔ پس ان کو سنوارا۔ اور ان کے خراب کو صحیح کیا۔

اور وہ مصلحت جس کا لحاظ رکھا گیا ہے: یا تو لوٹنے والی ہے مصیبت زدہ (یعنی بیمار) کی ذات کی طرف: دنیا کے اعتبار

سے یا آخرت کے اعتبار سے۔ یا (لوٹنے والی ہے) اس کے گھر والوں کی طرف، انہی دو اعتباروں میں سے کسی ایک اعتبار سے۔ یا (لوٹنے والی ہے) ملت کی (مصلحت کی) طرف۔

اور بیمار محتاج ہے: (۱) اپنی دنیا کی زندگی میں (الف) اس کی بے چینی کو دور کرنے کی طرف تسلی دینے اور نرمی کرنے کے ذریعہ (ب) اور اس بات کی طرف کہ لوگ تعرض کریں اس کی مدد سے، اُن باتوں میں جن کے کرنے سے وہ عاجز ہے ـــــ اور نہیں متحقق ہوتی ہیں (یہ دونوں باتیں) مگر یہ کہ ہو بیمار پرسی ایک لازمی طریقہ اس کے برادران میں اور اس کے شہر کے لوگوں میں۔

(۲) اور اپنی آخرت میں وہ صبر کا محتاج ہے۔ اور اس بات کا محتاج ہے کہ متصور ہوں بیمار کی سختیاں اس کے نزدیک کڑوی دواء کی طرح۔ جس کے ذائقہ کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ اور جس کے نفع کی وہ امید رکھتا ہے، تاکہ سختیاں دنیا کی زندگی میں ڈوبنے کا، اور اس کے اپنے رب سے چھپنے کا اور دور ہونے کا سبب نہ ہوں۔ بلکہ تائید کرنے والی ہوں اس کے گناہوں کے جھڑنے میں، اس کے نسمہ کے اجزاء کے تحلیل ہونے کے ساتھ (یعنی ضعف کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ) اور نہیں متحقق ہوتی یہ بات مگر اس طور پر کہ آگاہ کیا جائے وہ صبر کے فوائد سے اور تکالیف کے منافع سے۔

(دوسری مصلحت:) اور قریب المرگ دنیا کے دنوں میں سے آخری دن میں، اور آخرت کے دنوں میں سے پہلے دن میں ہے۔ پس ضروری ہے کہ ذکر اللہ پر اور اللہ کی طرف متوجہ ہونے پر ابھارا جائے۔ تاکہ اس کی روح جدا ہو درانحالیکہ وہ ایمان کے ایک بڑے پردہ میں ہو، تاکہ پائے وہ اس ایمانی پردے کا ثمرہ اپنی آخرت میں۔

(میت کے ساتھ حسن سلوک کی پہلی صورت:) اور انسان اس کے مزاج کی درستگی کی صورت میں: جس طرح پیدا کیا گیا ہے اہل و مال کی محبت پر، اسی طرح پیدا کیا گیا ہے اس بات کی محبت پر کہ لوگ اس کو یاد کریں بھلائی کے ساتھ اس کی زندگی میں اور اس کی موت کے بعد۔ اور یہ کہ نہ ظاہر ہو اس کی کوئی برائی ان پر، یہاں تک کہ ہر گروہ میں سے: لوگوں میں سب سے زیادہ درست رائے والا پسند کرتا ہے کہ وہ بے شمار دولت خرچ کرے کسی ایسی بڑی عمارت کے بنانے میں، جس کے ذریعہ اس کا ذکر باقی رہے۔ اور کود پڑتا ہے خطروں میں تاکہ اس کے حق میں کہا جائے اس کے بعد کہ وہ بہادر تھا۔ اور وصیت کرتا ہے وہ کہ اس کی قبر اونچی بنائی جائے تاکہ لوگ کہیں: ''وہ بڑا نصیبہ ور تھا اپنی زندگی میں اور اپنی موت کے بعد'' (مگر ایسی وصیت جائز نہیں، نہ اس کو پورا کرنا جائز ہے) اور یہاں تک کہ ان کے دانشمندوں نے کہا ہے: ''بیشک جس شخص کا لوگوں میں تذکرہ باقی ہے وہ مرا نہیں!'' اور جب تھی یہ بات ایک ایسی بات جس پر لوگ پیدا کئے جاتے ہیں، اور اس کے ساتھ مرتے ہیں (یعنی موت تک یہ جذبات باقی رہتے ہیں) تو ان کے گمان کو سچا کرنا، اور ان کے وعدہ کو وفا کرنا ایک طرح کا حسن سلوک تھا ان کے ساتھ ان کے مرنے کے بعد۔

(حسن سلوک کی دوسری صورت:) اور نیز: روح جب جسم سے جدا ہوتی ہے، تو وہ باقی رہتی ہے احساس کرنے والی

اور ادراک کرنے والی حس مشترک اور اس کے علاوہ قُویٰ کے ذریعہ۔ اور باقی رہتی ہے وہ اپنے علوم اور اپنے ظنوں پر جن کے ساتھ تھی وہ دنیا کی زندگی میں (یعنی اس کے دنیوی خیالات ختم نہیں ہوتے، بلکہ اسی طرح باقی رہتے ہیں) اور ٹپکتے ہیں اس پر اس کے اوپر سے ایسے علوم جن کے ذریعہ وہ تکلیف دیا جاتا ہے یا راحت پہنچایا جاتا ہے (یعنی اس کے اعمال کی ملکیت سے مناسبت یا منافرت کا علم مترشح ہوتا ہے۔ اور اس کی کوئی ناجائز وصیت پوری کی جاتی ہے تو وصیت پوری کرنے والا وارث بھی گنہ گار ہوتا ہے۔ اور میت کو بھی اس کی سزا ملتی ہے جیسے پسماندگان کے ماتم کرنے سے میت کو عذاب ہوتا ہے) اور اللہ کے بندوں میں سے نیک بندوں کی توجہات (یعنی تضرع کے ساتھ کی ہوئی ان کی دعائیں) حظیرۃ القدس (بارگاہِ عالی) کی طرف چڑھتی ہیں (یعنی پہنچتی ہیں) پس جب اصرار کرتے ہیں وہ کسی میت کے لئے دعا کرنے میں۔ یا مشقت اٹھاتے ہیں ورثاء کوئی بڑی خیرات کرنے کی میت کی خاطر، تو واقع ہوتی ہے یہ چیز (یعنی دعاو صدقہ) اللہ کے انتظام کی وجہ سے میت کو نفع پہنچانے والی۔ اور ملتی ہے وہ چیز (یعنی دعاوصدقہ) اس فیض سے جو اترنے والا ہے اس پر بارگاہ خداوندی سے (یعنی دونوں چیزیں اس فیض کو اترنے کی دعوت دیتی ہیں) پس تیار کرتا ہے وہ فیض اس کی خوش حالی کو (یعنی وہ فیض اترتا ہے۔ اور میت کو نہال کر دیتا ہے)

اور میت کے گھر والے: تحقیق پہنچا ہے ان کو سخت غم: پس ان کی مصلحت: دنیا کے اعتبار سے یہ ہے کہ (۱) وہ تسلی دیئے جائیں۔ تا کہ ہلکا کرے وہ تسلی دینا ان سے کچھ اس غم کو جس کو وہ پاتے ہیں (۲) اور یہ کہ مدد کئے جائیں وہ ان کے مردے کی تدفین میں (۳) اور یہ کہ تیار کیا جائے ان کے لئے وہ کھانا جو ان کو شکم سیر کرے ان کے اس دن اور اس کی رات میں —— اور آخرت کے اعتبار سے: یہ ہے کہ وہ ترغیب دیئے جائیں بڑے ثواب کی۔ تا کہ اس سے ان کے بے چینی میں گھسنے کا دروازہ بند ہو، اور اللہ کی طرف توجہ کا دروازہ کھلے۔ اور یہ کہ روکے جائیں وہ ماتم کرنے سے اور گریبان پھاڑنے سے اور دیگر ان باتوں سے جو یاد دلاتی ہیں اس کو حزن و ملال، اور دو چند ہوتی ہے اس کی وجہ سے بے چینی اور غم، اس لئے کہ وہ پسماندگان اس وقت میں بیمار جیسے ہیں۔ محتاج ہیں اس بات کے کہ ان کی بیماری کا علاج کیا جائے۔ نہیں مناسب ہے کہ اس میں زیادتی کی جائے۔

(ملت کی مصلحت) اور زمانۂ جاہلیت کے لوگوں نے ایجاد کی تھیں کچھ ایسی باتیں جو پہنچاتی تھیں اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے تک، پس ملت کی مصلحت یہ ہے کہ اس کا دروازہ بند کیا جائے۔

ملحوظہ: حِسّ مشترک: حواسِ باطنہ میں سے ایک حاسہ ہے۔ جس کا کام حواس ظاہرہ کی فراہم کردہ معلومات کا ادراک کرنا ہے۔ اور غیر مادی چیزوں کا ادراک وہم کرتا ہے اور قوت متصرفہ کا کام الگ ہے، حواس اور ان کے دائرہ کی تفصیل میری کتاب معین الفلسفہ میں ہے۔ ضرورت مند حضرات اس کی مراجعت کریں۔

  ☆

جنائز سے متعلق احادیث کی شرح

جنائز کے سلسلہ میں اصولی باتوں سے فارغ ہوکر اب جنائز سے متعلق احادیث کی شرح کرتے ہیں۔ مضامین مرتب ہیں۔ پہلے بیماری اور آفات وبلیات کا ثواب بیان کیا ہے (حدیث ۱-۴) پھر عیادت کا بیان ہے (حدیث ۵و۶) پھر بابرکت جھاڑوں (منتروں) کا بیان ہے (نمبر ۷) پھر عین موت کے وقت کے اور موت سے ذرا پہلے کے احوال ہیں (۸-۱۳) پھر موت کے بعد معاً پیش آنے والے احوال ہیں (۱۴و۱۵) پھر تجہیز وتکفین اور تدفین کی روایات ہیں (۱۶-۲۶) پھر قبر کے احوال اور موت کے بعد کے حالات ہیں (۲۷-۳۶) پھر زیارت قبور کا بیان ہے (۳۷و۳۸)

بیماری اور بلیّات کا ثواب

(۱) —— بیماری سے گناہ معاف ہوتے ہیں —— حدیث: میں ہے کہ: ''مسلمان کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے، خواہ بیماری ہو یا کچھ اور، تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کو جھاڑ دیتے ہیں۔ جیسے خزاں رسیدہ درخت اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۵۳۸)

تشریح: پہلے یہ بات آچکی ہے کہ چند چیزیں گناہوں کو مٹاتی ہیں: ایک: نفس کے حجاب کا ٹوٹنا دوم: بیماری کی وجہ سے یا ریاضت کی وجہ سے بہیمیت کا کمزور پڑنا۔ بہیمیت ہی برائیوں کا سرچشمہ ہے، پس جب وہ کمزور پڑتی ہے تو برائیوں کا ازالہ ہوتا ہے سوم: دنیا سے کچھ دل کا اکھڑنا، اور آخرت کی طرف مائل ہونا۔ بیماری سے یہ تینوں فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس لئے اس سے گناہ جھڑتے ہیں۔

(۲) —— مؤمن آفات میں زیادہ مبتلا ہوتا ہے —— حدیث: میں ہے کہ: ''مؤمن کا حال تروتازہ کھیتی جیسا ہے، جسے ہوائیں کبھی جھکاتی ہیں اور کبھی اٹھاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ اور منافق کا حال: مضبوط جمے ہوئے درختِ صنوبر جیسا ہے، جس پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی۔ تا آنکہ جب وقت آتا ہے تو یکدم زمین پر آگرتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۵۴۱)

تشریح: اللہ تعالیٰ نے نفس میں دو متضاد صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں یعنی قوتِ بہیمی اور قوت ملکی۔ ان دونوں میں ہمیشہ کشمکش رہتی ہے۔ ایک ابھرتی ہے تو دوسری دبتی ہے۔ جب ملکیت نمودار ہوتی ہے تو آدمی فرشتہ صفت بن جاتا ہے۔ اور بہیمیت کا غلبہ ہوتا ہے تو آدمی دوپیر کا جانور بن جاتا ہے۔ اور کسی لحاظ کے قابل نہیں رہتا —— اور بہیمیت کی تیزی سے پیچھا چھڑا کر ملکیت کی مملکت میں داخل ہونے کے لئے بھی سخت حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔ دونوں قوتوں میں کشتی جمتی ہے: کبھی یہ اس کو چت کرتی ہے، اور کبھی وہ اس پر غالب آتی ہے۔ یہ دنیوی زندگی میں مجازات کے مواقع ہیں۔ اور دنیا

میں مجازات کی عقلی دلیل پہلے بیان کی جا چکی ہے[1]

وضاحت: مؤمن امراض وبلیات میں زیادہ مبتلا اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہے۔ اس لئے اس کو احوال پیش آتے ہیں، جن سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور بہیمیت بھی کمزور پڑتی ہے اور ملکیت کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے لوگ آپ نے ضرور دیکھے ہوں گے جو بری زندگی گذار رہے تھے۔ پھر وہ کسی سخت آزمائش میں مبتلا ہوئے، اور موت کے منہ میں پہنچ کر واپس آئے تو ایک نیک انسان بن گئے۔ اور نیکی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ غرض بیماری گذشتہ گناہوں کا کفارہ بنتی ہے، اور آئندہ کے لئے عبرت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اور منافق اکثر توانا تندرست رہتا ہے۔ پھر جب وقت آتا ہے تو موت اس کو دبوچ لیتی ہے، اور اس کو سنبھلنے کا موقعہ نہیں ملتا۔

(۳) —— کبھی عمل کے بغیر بھی ثواب جاری رہتا ہے —— حدیث: میں ہے کہ: ''جب بندہ بیمار پڑتا ہے یا سفر کرتا ہے، تو اس کے لئے ویسی عبادتیں لکھی جاتی ہیں جو وہ حالتِ صحت اور زمانۂ اقامت میں کرتا رہا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۵۴۴)

تشریح: بیماری وغیرہ میں زمانۂ تندرستی کے اعمال کا ثواب لکھے جانے کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کسی نیک کام کے کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا ہے۔ پھر ارادہ بدل جانے کی وجہ سے نہیں، بلکہ کسی بیرونی عارض کی وجہ سے وہ کام نہیں کر پاتا، تو اس نے اگرچہ بظاہر وہ کام نہیں کیا، مگر دل سے کرلیا۔ اور اصل مدار دل پر ہے۔ اچھائی برائی کا محل وہی ہے۔ ظاہری اعمال تو کیفیات قلبیہ کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس لئے بصورتِ استطاعت تو اعمال کو مضبوط پکڑا جاتا ہے، مگر مجبوری میں ان کو یونہی رہنے دیا جاتا ہے یعنی ثواب کا مدار ان کے وجود پر نہیں ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بندے کے نامۂ اعمال میں اس کے معمولات ہی کی طرح اجر وثواب لکھتے ہیں۔ اس کی نظیر ملازمت کا معاملہ ہے۔ مدتِ ملازمت پوری ہونے کے بعد وظیفۂ تقاعد بغیر عمل کے ملتا ہے۔ یہ باب کرم سے ہے۔

(۴) —— کسی ناگہانی حادثہ سے موت ہوجائے تو شہادت کا درجہ ملتا ہے —— حکمی شہداء: یعنی جن کو آخرت میں شہادت کا درجہ ملتا ہے: بہت ہیں۔ ایک حدیث میں حقیقی شہید کے ساتھ پانچ کا اور دوسری حدیث میں سات کا تذکرہ ہے۔ اور مختلف روایات میں تقریباً ساٹھ کا تذکرہ آیا ہے۔ یہ سب روایات أوجز المسالك في شرح الموطا لمالك میں جمع کی گئی ہیں۔ یہ سب ناگہانی حوادث میں فوت ہونے والے لوگ ہیں۔ اور ان کو شہادت کا مرتبہ اس لئے ملتا ہے کہ ناگہانی سخت مصیبت جو بندے کے فعل سے نہ ہو: گناہ مٹانے میں اور بندہ کو قابل رحم بنانے میں شہادت حقیقی کا کام کرتی ہے۔ آپ کو تجربہ ہوگا کہ جو شخص کسی حادثہ میں مرتا ہے: لوگ اس پر مہربان ہوتے ہیں۔ کثیر تعداد میں جنازہ میں

---

[1] مبحث ۵ باب ۱۳ میں اُن امور کا بیان گذرا ہے جو کفارۂ سیئات بنتی ہیں (رحمۃ اللہ: ۵۷۷) اور مبحث ۴ باب ۷ میں حجاب نفس کے ٹوٹنے کا بیان ہے (رحمۃ اللہ: ۵۷۰) اور دنیا میں مجازات کی دلیل عقلی مبحث ۲ باب اول میں بیان ہوئی ہے (رحمۃ اللہ: ۳۵۸)

شرکت کرتے ہیں اوراس پرآنسو بہاتے ہیں۔اور جوخودکشی کر کے مرتا ہے: لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ جنازہ میں بھی بہت کم لوگ شریک ہوتے ہیں۔اور وہ بھی کسی مجبوری میں! اور حدیث میں ہے کہ مؤمنین زمین میں اللہ کے گواہ ہیں۔پس گواہوں کے بیان سے عدالت کے فیصلہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔احادیث میں اسی کی اطلاع دی گئی ہے۔

إذا علمتَ هذا حان أن نشرع في شرح الأحاديث الواردة في الباب:

[١] قوله صلى الله عليه وسلم: " ما من مسلمٍ يُصيبُه أذىً من مرض، فما سواه، إلا حَطَّ الله تعالى به سيئاتِه، كما تَحُطُّ الشجرةُ ورقَها"

أقول: قد ذكرنا المعاني الموجِبةَ لتكفير الخطايا، منها كسرُ حجاب النفس، وتَحَلُّلُ النسمةِ البهيميةِ الحاملةِ للملكات السيئة، وأن صاحِبَها يُعْرِض عن الاطمئنان بالحياة الدنيا نوعَ إعراضٍ.

[٢] قوله صلى الله عليه وسلم: " مَثَلُ المؤمن كمثل الخامة، ومَثَلُ المنافق كمثل الأَرْزَةِ" الحديث.

أقول: السر في ذلك: أن لنفس الإنسان قوتين: قوةٌ بهيميةٌ، وقوة ملكية، وأن من خاصيته: أنه قد تكْمَنُ بهيميتُه، وتبرز ملكيتُه، فيصير في أعداد الملائكة، وقد تكمن ملكيتُه، وتبرز بهيميتُه، فيصير كأنه من البهائم، لايُعبأ به؛ وله عند الخروج من سَورة البهيمية إلى سلطنة الملكية أحوالٌ، تتعالجان فيها، تَنال هذه منها، وتلك من هذه؛ وتلك مواطنُ المجازاة في الدنيا، وقد ذكرنا لِمِّيَّةَ المجازاة من قبل، فراجعْ.

[٣] قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا مرض العبد، أو سافر، كُتب له بمثل ما كان يعمل صحيحًا مقيمًا"

أقول: الإنسان إذا كان جامعَ الهمة على الفعل، ولم يمنع عنه إلا مانعٌ خارجي، فقد أتى بوظيفة القلب، وإنما التقوى في القلب، وإنما الأعمال شروحٌ ومؤكِّدَاتٌ، يُعَضُّ عليها عند الاستطاعة، ويُمْهَلُ عند العجز.

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " الشهداء خمسة، أو سبعة" الحديث.

أقول: المصيبةُ الشديدة التي ليست بصنعة العبد، تعملُ عملَ الشهادة في تكفير الذنوب، وكونهِ مرحومًا.

ترجمہ: جب آپ یہ جان چکے تو وقت آ گیا کہ ہم ان احادیث کی شرح شروع کریں جو جنائز کے سلسلہ میں آئی ہیں:

(١) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:...... میں کہتا ہوں: تحقیق ذکر کی ہم نے وہ باتیں جو گناہوں کے کفارہ کا سبب بنتی

ہیں۔ان میں سے: حجاب نفس کا ٹوٹنا ہے۔اور اس بہیمی نسمہ کا تحلیل ہونا ہے جو برے ملکات کو اٹھانے والا ہے۔اور یہ بات ہے کہ خطا کار دنیا کی زندگی پر مگن ہونے سے کچھ روگردانی کرے۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ...... میں کہتا ہوں: راز اس میں (یعنی مؤمن کو جھنجھوڑنے میں) یہ ہے کہ نفس انسانی کے لئے دو قوتیں ہیں: بہیمی قوت اور ملکی قوت۔اور یہ کہ انسان کی خصوصیات میں سے یہ بات ہے کہ کبھی چھپ جاتی ہے اس کی بہیمیت اور نمودار ہوتی ہے اس کی ملکیت، پس ہوجاتا ہے وہ فرشتوں کی گنتی میں۔اور کبھی چھپ جاتی ہے اس کی ملکیت، اور نمودار ہوتی ہے اس کی بہیمیت، پس ہوجاتا ہے وہ گویا چوپایوں میں سے ہے۔نہیں پروا کی جاتی اس کی۔اور انسان کے لئے نکلنے کے وقت بہیمیت کی تیزی سے ملکیت کی طرف حالات ہیں۔کشتی کرتی ہیں دونوں قوتیں اُن احوال میں۔حاصل کرتی ہے یہ اس سے اور وہ اس سے۔اور یہ دنیا میں مجازات کی جگہیں (شکلیں) ہیں۔اور تحقیق ذکر کی ہم نے مجازات کی دلیل عقلی قبل ازیں۔پس اس کی طرف رجوع کریں۔

(۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ..... میں کہتا ہوں: انسان جب کسی کام کے کرنے پر پوری توجہ جمع کرنے والا ہوتا ہے۔اور اس سے نہیں روکتا مگر کوئی خارجی مانع تو یقیناً وہ دل کے وظیفہ کو بجالایا۔یعنی اس نے دل سے وہ عمل کرلیا اور تقوی درحقیقت دل میں ہے۔اور اعمال تو تشریحات وتاکیدات ہیں (تشریحات: یعنی اعمال سے دل کی کیفیات کی وضاحت ہوتی ہے۔اور ان کا پتہ چلتا ہے۔اور تاکیدات: یعنی اعمال ظاہری: باطنی کیفیت کو قوی کرتے ہیں۔دل میں انوار پیدا کرتے ہیں) ان کو مضبوط پکڑا جاتا ہے بوقتِ استطاعت، اور ان کو مہلت دی جاتی ہے یعنی ان کا عمل مؤخر کیا جاتا ہے بے بسی کی صورت میں۔

(۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: شہداء پانچ ہیں یا سات ہیں۔آخر تک۔میں کہتا ہوں: وہ سخت مصیبت جو بندے کے عمل سے نہیں ہوتی: شہادت کا کام کرتی ہے گناہوں کو مٹانے میں اور اس کو قابلِ رحم بنانے میں۔

☆ ☆ ☆

عیادت کا بیان

① ــــــ عیادت کرنا بڑا ثواب کا کام ہے ــــــ حدیث: میں ہے کہ: ”جب ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی بیمار پرسی کے لئے جاتا ہے، تو وہ واپس آنے تک برابر جنت کے چنیدہ میووں میں رہتا ہے“ (مشکوۃ حدیث ۱۵۲۷)

تشریح: بیمار پرسی کرنا، مریض کو تسلی دینا اور ہمدردی ظاہر کرنا اونچے درجہ کا نیک عمل اور مقبول ترین عبادت ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی میں جذبۂ الفت اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب حاجت مندوں کی معاونت کی جائے۔اور جو کام عمرانی زندگی کو سنوارتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔اور عیادت رشتۂ الفت قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اس لئے اس میں بڑا اجر وثواب رکھا گیا ہے۔

(۲) —— بیمار کی بیمار پرسی اللہ تعالیٰ کی بیمار پرسی ہے —— مسلم شریف کی روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (بیمار پرسی میں کوتاہی کرنے والے بندے سے) فرمائیں گے: "اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تھا مگر تو نے مجھے نہ پوچھا!" بندہ عرض کرے گا: اے میرے ربّ! میں آپ کو کیسے پوچھتا، اور آپ تو جہانوں کے پالنہار ہیں! یعنی بیماری سے پاک ہیں! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "کیا تو نہیں جانتا تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تھا، پس تو نے اس سے نہ پوچھا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر اس کی بیمار پرسی کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا؟!" —— (اور غریبوں کو کھانا دینے میں کوتاہی کرنے والے بندے سے فرمائیں گے:) "اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے مجھے کھانا نہ دیا!" بندہ عرض کرے گا: اے میرے ربّ! میں آپ کو کیسے کھانا دیتا، اور آپ تو جہانوں کے پالنہار ہیں! یعنی کھانے کے محتاج نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "کیا تو نہیں جانتا تھا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، پس تو نے اس کو کھانا نہ کھلایا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو تو اس کھانے (کے ثواب) کو میرے پاس پاتا؟!" —— (اور پانی پلانے میں بخیلی کرنے والے بندہ سے فرمائیں گے:) اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا، پس تو نے مجھے پانی نہ پلایا!" بندہ عرض کرے گا: اے میرے ربّ! میں آپ کو کیسے پانی پلاتا، اور آپ تو رب العالمین ہیں یعنی پانی کے محتاج نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "کیا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا، پس تو نے اُسے پانی نہ پلایا؟! کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو تو اس پانی کو یہاں میرے پاس پاتا؟!" (مشکوٰۃ حدیث ۱۵۲۸)

فائدہ: عیادت نہ کرنے والے سے فرمایا: "تو مجھے اس کے پاس پاتا" اور نہ کھلانے پلانے والے سے فرمایا کہ: "تو اس کھانے پانی (کے ثواب) کو میرے پاس پاتا" اس تعبیر کے فرق سے معلوم ہوا کہ غریبوں کو کھلانے پلانے سے عیادت افضل ہے (مظاہر حق)

تشریح: اس حدیث میں سمجھنے کی خاص بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندوں کے احوال (بیمار ہونے، بھوکا ہونے اور پیاسا ہونے) کو اپنی طرف کیوں منسوب کریں گے؟ اس مضمون کو سمجھنے کے لئے پہلے چار باتیں جان لیں:

پہلی بات: سورۃ القدر آیت ۴ ہے: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ مِنْ کُلِّ اَمْرٍ﴾ یعنی اترتے ہیں فرشتے اور روح شب قدر میں باذن الٰہی ہر امر خیر لے کر" —— اس آیت کی تفسیر میں بیہقی رحمہ اللہ کے حوالہ سے سیوطی رحمہ اللہ نے درمنثور (۶: ۳۷۲) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"بخدا! میں نے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رمضان میں تراویح کا نظام قائم کرنے پر ابھارا ہے۔ لوگوں نے پوچھا: یہ کیسے اے امیر المؤمنین؟ فرمایا: میں نے ان کو بتلایا کہ ساتویں آسمان میں ایک بارگاہ ہے۔ جس کو حظیرۃ القدس

(مقدس بارگاہ) کہا جاتا ہے۔ اس بارگاہ میں فرشتے ہیں جن کو''روح'' کہا جاتا ہے۔ اور ایک لفظ میں ''روحانیوں'' آیا ہے۔ جب شب قدر آتی ہے تو یہ فرشتے اپنے پروردگار سے دنیا میں اترنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اجازت مل جاتی ہے۔ پس وہ جس مسجد کے پاس سے گذرتے ہیں، جس میں نماز پڑھی جارہی ہے یا راستہ میں جس سے بھی سامنا ہوتا ہے تو اس کو دعائیں دیتے ہیں۔ پس ان کو ان فرشتوں کی برکت پہنچتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لہٰذا ہم لوگوں کو نماز پر ابھاریں تاکہ ان کو فرشتوں کی برکت پہنچے۔ چنانچہ انھوں نے لوگوں کو تراویح شروع کرنے کا حکم دیا''

اور جو مشہور حدیث ہے کہ شب قدر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے کُبکُبۃ (جلوس، جھرمٹ) میں اترتے ہیں۔ وہ جھرمٹ انہیں روحانیوں کا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان کو''روح اعظم'' سے تعبیر کیا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یہ انسانوں کی مجموعی روح ہے۔ اور ملکوت میں موجود ہے۔ اور ملکوت کی ہر چیز کو ملائکہ کہہ دیا جاتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کلی کی تین قسمیں ہیں: کلی منطقی، کلی طبعی اور کلی عقلی۔ کلی منطقی: کلی کے مفہوم کو کہتے ہیں۔ یعنی کلی وہ مفہوم ہے جو کثیرین پر صادق آئے، اور مفہوم کا وجود صرف ذہن میں ہوتا ہے۔ پس یہ کلی نہ خارج میں موجود ہے۔ نہ نفس الامر میں۔ صرف ذہن میں موجود ہے۔ اور کلی طبعی: کلی کے معروض کو کہتے ہیں یعنی خارج میں کلی کے جو افراد پائے جاتے ہیں وہی کلی طبعی ہیں اور کلی عقلی: کلی کی ماہیت کا نام ہے۔ جیسے انسان کی ماہیت ہے حیوان ناطق یہی کلی عقلی ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ کلی عقلی خارج میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ محقق رائے یہ ہے کہ خارج میں اس کا مستقل وجود نہیں۔ البتہ وہ اپنے افراد کے ضمن میں پائی جاتی ہے۔ اور فلسفۂ تصوف میں یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ وہ نفس الامر میں —— اور شاہ صاحب کی اصطلاح میں عالم مثال میں —— مستقل طور پر پائی جاتی ہے۔ صوفیا کے نزدیک نوع کی ماہیت کا یہی وجود روح اعظم اور انسانِ اکبر کہلاتا ہے۔

دوسری بات: اللہ تعالیٰ کی زیارت خواب میں اس دنیا میں بھی ہوتی ہے، میدان حشر میں بھی ہوگی اور آخرت میں بھی۔ اور تمام زیارتوں کا معاملہ یکساں ہے یعنی دیکھنے والے کو جس صورت سے مناسبت ہوتی ہے، اس صورت میں اللہ پاک کی زیارت ہوتی ہے۔ اور دیکھنے والے کو اللہ پاک کی تجلی میں اپنے احوال کا عکس نظر آتا ہے۔ کامل مؤمن کو خواب میں اللہ پاک کی زیارت نہایت اچھے حال میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی پاک ﷺ نے خواب میں اپنے پروردگار کو نہایت عمدہ صورت میں دیکھا ہے۔ ان خوابوں کی تعبیر نہیں ہوتی۔ یہ مبشرات ہیں۔ خواب دیکھنے والے کو اپنے حال کی عمدگی پر سجدۂ شکر بجالانا چاہئے۔

اور اگر کوئی اللہ تعالیٰ کو خواب میں نامناسب حالت میں دیکھے، تو وہ اس کے برے احوال کا عکس ہے۔ اور ایسا خواب تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔ مثلاً: کوئی خواب میں دیکھے کہ اللہ پاک اس سے ناراض ہیں۔ تو اس کی تعبیر والدین کی ناراضگی ہے۔ اور کوئی خواب میں دیکھے کہ وہ اللہ پاک جل شانہ کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ ناشکرا

ہے۔ اللہ کی نعمتوں پر راضی نہیں۔ اور کوئی خواب میں دیکھے کہ اللہ پاک اس کو اس کی چوکھٹ میں طمانچہ مار رہے ہیں۔ تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس نے چوکھٹ (بیوی) کے ساتھ برتاؤ میں کسی دینی معاملہ میں کوتاہی کی ہے۔

تیسری بات: جو کام نظام عالم کو اور عمرانی زندگی کو سنوارنے والے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ جیسے لوگوں میں باہمی الفت ومحبت اور وہ کمالات جو انسان کے ساتھ مختص ہیں اللہ کو پسند ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، علوم ربانی کی تحصیل میں سعی کرنا۔ اور لوگوں کے لئے جو باتیں مفید ہیں ان کو رائج کرنے کی محنت کرنا وغیرہ۔ اور جو کام نظام عالم کو درہم برہم کرنے والے ہیں وہ اللہ کو ناپسند ہیں۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۵ میں ایک فسادی اخنس بن شریق کے تعلق سے فرمایا ہے کہ جب وہ آنحضرت ﷺ کے پاس سے پیٹھ پھیرتا ہے تو زمین میں دوڑ دھوپ کرتا ہے کہ شہر میں فساد پھیلائے، اور کھیت اور مویشی کو تلف کرے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے۔

چوتھی بات: اللہ تعالیٰ کی شان کلی رنگ لئے ہوئے ہے یعنی وہ ہر ہر معاملہ میں علحدہ علحدہ فیصلہ نہیں کرتے۔ بلکہ ایک عام فیصلہ فرماتے ہیں اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عالَم کو انواع کی شکل میں پیدا کیا ہے اور ہر نوع کے لئے جو فیصلہ فرمایا ہے: وہی فیصلہ تمام افراد میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور نوع کی تمام خصوصیات صورتِ نوعیہ کے تابع ہوتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کہ یہ مادّہ —— مثال کے طور پر —— کھجور کا درخت ہو، تو اس میں یہ سب کچھ آگیا ہے کہ اس کا پھل ایسا ہو۔ اور اس کے پتے ایسے ہوں۔ یہ بات مبحث اول باب ہفتم میں تفصیل سے گذر چکی ہے۔

اب شاہ صاحب قدس سرہ کی بات شروع کی جاتی ہے: فرماتے ہیں:

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن بندوں سے جنھوں نے عبادت وغیرہ احکام الٰہی میں کوتاہی کی ہے: جو خطاب فرمائیں گے: وہ اللہ کی ایک تجلی ہے۔ اور یہ تجلی انسان کے افراد پر نہیں ہوگی، بلکہ اُس روح اعظم پر ہوگی جس کا تذکرہ ﴿تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ میں آیا ہے۔ اور اس تجلی کا معاملہ بالکل ایسا ہوگا، جیسا دنیا میں جب کوئی شخص خواب میں اللہ پاک کو دیکھتا ہے: تو ہوتا ہے۔ یعنی اس روح اعظم کے احوال کا پرتو اس تجلی میں نظر آئے گا۔ کیونکہ دنیا میں جب کوئی بندہ خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے، تو اس کو اپنا حال اس تجلی میں نظر آتا ہے یعنی وہ اپنے پروردگار کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا ہے یا اللہ تعالیٰ نے اس بندے کو جو احکام دیئے ہیں ان کے بارے میں اس کا کیا اعتقاد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس خواب دیکھنے والے سے خوش ہیں یا ناخوش؟ یہ سب باتیں خواب میں متمثل ہوتی ہیں۔ اور ان کا عکس پروردگار کی اس تجلی میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ مؤمنِ کامل کو خواب میں اللہ تعالیٰ بہترین صورت میں نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے اپنے رب کو بہترین صورت میں خواب میں دیکھا ہے۔ یہ خوبصورتی اس مؤمنِ کامل کے بہترین حال کا جلوہ ہے۔ اور اگر کوئی اللہ پاک کو نامناسب حالت میں دیکھتا ہے تو وہ بھی اس کی بُری حالت کا انعکاس ہے۔ مثلاً: کوئی دیکھے کہ اللہ پاک اس کو اس کے گھر کی چوکھٹ میں طمانچہ مار رہے ہیں، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس نے اس چوکھٹ یعنی بیوی کے

معاملہ میں اللہ کے احکام میں کوتاہی کی ہے۔اسی طرح قیامت کے دن: بندے پر اللہ تعالیٰ کا جو حق ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی کرے، کسی کو بندگی میں شریک نہ ٹھہرائے اور بندے کو اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں، اور بندے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، اور بندے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نظم کیا ہے، یا اللہ تعالیٰ نے انسان کے افراد کو جو تھام رکھا ہے، یا اللہ تعالیٰ افرادِ انسانی کے وجود کا مبدأ (علت العلل) ہیں، یا انسان کے افراد کا اپنے پروردگار کے بارے میں آخری درجہ کا اعتقاد کیا ہونا چاہئے، جبکہ ان کا مزاج درست ہو۔اور ان کے نفوس میں استقامت ہو یعنی وہ عاقل بالغ ہوں، پاگل نہ ہوں باشعور ہوں بےشعور نہ ہوں: باشعور ہوں: یہ سب باتیں آخرت میں افرادِ انسانی کی صورتِ نوعیہ کی دین کے مطابق مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوں گی۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ:

''میدانِ قیامت میں اعلان ہوگا کہ جو جس کو پوجتا تھا: وہ اُس کی پیروی کرے۔چنانچہ چاند کے پجاری چاند کی پیروی کریں گے، سورج کے پجاری سورج کی اور طاغوتی طاقتوں کے پجاری: ان طاغوتی طاقتوں کے پیچھے ہولیں گے (اور وہ اپنے چیلوں کو جہنم میں پہنچائیں گے) اور یہ امت باقی رہ جائے گی۔جس میں اس کے منافقین بھی ہوں گے۔ان کے سامنے اللہ پاک پہلے غیر معروف صورت میں آئیں گے۔اور فرمائیں گے: میں تمہارا پروردگار ہوں (یعنی میرے پیچھے آجاؤ) لوگ کہیں گے: پناہ بخدا! ہم تو یہیں رہیں گے تا آنکہ ہمارے پروردگار آجائیں۔جب ہمارے پروردگار آئیں گے تو ہم ان کو پہچان لیں گے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ ان کو جانی پہچانی صورت میں نظر آئیں گے۔اور فرمائیں گے: میں تمہارا پروردگار ہوں۔لوگ کہیں گے: ہاں آپ ہمارے پروردگار ہیں۔پس وہ اللہ تعالیٰ کی پیروی کریں گے'' (اور اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں لے جائیں گے) (رواہ مسلم، مسند احمد ۲: ۵۳۴)

بہر حال: قیامت کے دن یہ تجلی روح اعظم ہی پر ہوگی۔کیونکہ روح اعظم انسانوں کی مجموعی روح ہے۔وہ ان کی کثرت کا سنگم ہے یعنی تمام انسان اُس ایک اکائی میں سمٹ جاتے ہیں۔اور وہ دنیا و آخرت میں انسانوں کی ترقی کی آخری حد ہے یعنی افرادِ انسانی ترقی کر کے اس سے آگے نہیں جاسکتے۔خواہ وہ کتنی بھی اڑان بھریں: انسان ہی رہیں گے۔اس سرحد سے آگے نہیں جاسکتے۔اور اس تجلی سے میری مراد: اللہ تعالیٰ کی شانِ کلی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا تمام افراد انسانی کے ساتھ جو اصولی اور یکساں معاملہ ہے، روح اعظم پر وہ تجلی نمودار ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے جو انسانوں کو سنبھال رکھا ہے اور انسانوں کو جو احکامات دیئے ہیں: یہی باتیں آخرت میں لوگوں کو نظر آئیں گی: دل کی آنکھوں سے تو یہ باتیں ہر وقت قطعی طور پر نظر آئیں گی۔اور کبھی جب اللہ تعالیٰ کسی مناسب صورت میں جلوہ فرمائیں گے تو لوگوں کو یہ باتیں اللہ کی تجلی کی صورت میں سر کی آنکھوں سے بھی نظر آئیں گی۔

حاصل کلام: یہ ہے کہ مذکورہ وجہ سے یعنی چونکہ اللہ کی تجلی میں بندے کے اچھے بُرے احوال منعکس ہوتے ہیں، اس لئے وہ تجلی ذریعۂ انکشاف ہوجاتی ہے، ان احکام کے لئے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے افراد پر لازم کئے ہیں۔اور

اس حق کے لئے جو اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ہے۔ اور وہ تجلی انسان کی صورتِ نوعیہ کی دین کے مطابق ذریعہ انکشاف ہوجاتی ہے۔ اور انسانوں پر اللہ کا حق اور انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکامات —— بطور مثال —— یہ ہیں: (۱) لوگوں کا باہم الفت ومحبت سے رہنا (۲) اس کمال انسانی کی تحصیل میں لگے رہنا جو نوع انسان کے ساتھ خاص ہے یعنی اللہ کی بندگی کرتے رہنا (۳) اور لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کو جو نظام پسند ہے اس میں حصہ داری اور اس نظام کو برپا کرنے کی محنت کرنا —— پس ضروری ہوا کہ اچھے یا برے قومی اور اجتماعی احوال کو اللہ پاک اپنی ذات کی طرف منسوب کریں۔ اسی علاقہ کی وجہ سے کہ وہ کام اللہ کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہیں۔

اور بلاتمثیل اس کی نظیر یہ ہے کہ جس طرح حکومت کا ایک مطلوبہ نظام اور فلاحی پروگرام ہوتا ہے۔ جو اس میں حصہ دار بنتا ہے۔ بادشاہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ نے میرا تعاون کیا۔ اور میرے کاز کو تقویت پہنچائی۔ اور جو اس نظام میں رخنہ انداز ہوتا ہے۔ اور اس پروگرام کو فیل کرتا ہے۔ بادشاہ اس کی سرزنش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے تو نے میرا کام بگاڑ دیا اور میرے ملک کو ویران کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی عیادت نہ کرنے والے سے اور غریبوں کا تعاون نہ کرنے والوں سے مذکورہ بات فرمائیں گے۔

فائدہ: اگر روح اعظم کے توسط والی بات کسی کے پلے نہ پڑے، تو مضمون کا سمجھنا اس پر موقوف نہیں۔ دنیا میں جس طرح خواب میں ہر شخص اللہ پاک کی تجلی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ٹھیک وہی نوعیت آخرت کی بھی ہے۔ اور اللہ کی شان: لایشغله شانٌ عن شان ہے۔ یعنی ایک کام: دوسرے کام سے اللہ کو نہیں روکتا۔ پس دنیا کے خوابوں کی طرح آخرت میں سب کوتاہی کرنے والوں کے ساتھ ایک ساتھ یہ معاملہ پیش آئے گا۔ واللہ اعلم

---

[۵] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن المسلم إذا عاد أخاه المسلم، لم يزل في خُرْفَةِ الجنة حتى يرجع"

أقول: تألُّفُ أهلِ المدينة فيما بينهم لايمكن إلا بمعاونة ذوى الحاجاتِ، والله تعالىٰ يحب ما فيه صلاحُ مدينتهم، والعيادةُ سبب صالحٌ لإقامة التألُّف.

[٦] قولُ الله تعالى يومَ القيامة: " يا ابنَ آدم! مرِضتُ فلم تعُدْنى" إلخ.

أقول: هذا التجلى : مَثَلُه بالنسبة إلى الروح الأعظم المذكورِ فى قوله تعالى: ﴿ اَلْمَلَائِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ مَثَلَ الصورة الظاهرة فى رؤيا الإنسان، بالنسبة إلى ذلك الإنسان؛ فكما أن اعتقاد الإنسان فى ربه، أو حكمِه، ورضاه فى حق هذا الشخص، يتمثل فى رؤياه بربه تعالىٰ، ولذلك كان من حق المؤمن الكامل أن يراه فى أحسن صورة ، كما رآه النبىُّ صلى الله عليه وسلم، وكان تعبيرُ من يراه يَلْطمه فى دَهليز بابه: أنه فَرَّطَ فى جنب الله فى ذلك الدهليز، فكذلك يتمثَّل حقُّ الله وحكمُه ورضاه وتدبيره، أو قيومِيَّتُه لأفراد الإنسان، أو كونُه مبدأَ تحقُّقِهم، أو

مبلغُ اعتقادِ أفراد الإنسان في ربهم، عند صحة مزاجهم، واستقامةِ نفوسهم، حَسَبَمَا تعطيه الصورةُ في أفراد الإنسان في المعاد: بصور كثيرة، كما بينه النبيُّ صلى الله عليه وسلم.

وهذا التجلي إنما هو للروح الأعظم الذي هو جامعُ أفرادِ الإنسان، وملتقى كثرتهم، ومبلغُ رُقِيِّهم في الدنيا والآخرة، أعني بذلك: أن هنالك لله تعالى شأنًا كليا بحسب قيوميته له، وحكمه فيه، وهو الذي يراه الناس في المعاد عِيانًا دائما بقلوبهم، وأحيانا إذا تمثل بصورةٍ مناسبة بأبصارهم.

وبالجملة: فلذلك كان هذا التجلي مِكْشَافا لحكم الله، وحقِّه في أفراد الإنسان، من حيث تُعطيها الصورةُ النوعيه، مثلُ تألُّفِهم فيما بينهم، وتحصيلِهم للكمال الإنساني المختص بالنوع، وإقامةِ المصلحة المرضية فيهم، فوجب أن يُنسب ما للقوم إلى نفسه لهذه العلاقة.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ...... میں کہتا ہوں: شہر والوں کا باہم جڑنا ممکن نہیں مگر حاجت مندوں کی معاونت کے ذریعہ۔ اور اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں ان کاموں کو جن میں اُن کے شہر (سوسائٹی) کا فائدہ ہے۔ اور بیمار پرسی ایک عمدہ ذریعہ ہے باہمی میل جول کو قائم کرنے کا۔

(۶) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا فرمانا: ''اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا مگر تو نے مجھ کو پوچھا نہیں؟'' آخر تک۔

میں کہتا ہوں: یہ تجلی (جو قیامت کے دن کوتاہی کرنے والے بندے پر ہوگی) اس کا حال اُس روح اعظم کی بہ نسبت جس کا تذکرہ ﴿ اَلْـمَلَائِكَةُ وَالرُّوْحُ ﴾ میں ہے: اس صورت کی حالت کی طرح ہے جو ظاہر ہونے والی ہے انسان کے خواب میں، اُسی انسان کی بہ نسبت۔ پس جس طرح یہ بات ہے کہ انسان کا اعتقاد اس کے رب کے بارے میں یا اس کے حکم کے بارے میں، اور اللہ کی خوشنودی اس شخص کے حق میں متمثل ہوتی ہے اس کے اپنے پروردگار کو اپنے خواب میں دیکھنے میں۔ اور اسی وجہ سے مؤمن کامل کے حق میں سے ہے کہ وہ اللہ کو دیکھے بہتر سے بہتر صورت میں۔ جیسا کہ بہترین صورت میں اللہ پاک کو نبی ﷺ نے دیکھا ہے ـــــ اور تھی تعبیر اس شخص کی جس نے دیکھا اللہ کو درانحالیکہ اللہ تعالیٰ اس کو تھپڑ لگا رہے ہیں اس کے دروازے کی چوکھٹ میں: کہ اس نے کوتاہی کی ہے اللہ کے دین میں اس چوکھٹ میں ـــــ پس اسی طرح متمثل ہوتا ہے اللہ کا حق اور اس کا حکم اور اس کی خوشنودی اور اس کا انتظام یا اس کا سنبھالنا انسان کے افراد کو، یا اس کا ہونا انسان کے افراد کے پائے جانے کا مبدأ (سبب، علت) یا (اس کا ہونا) اپنے رب کے متعلق انسان کے افراد کے اعتقاد کی نہایت: ان کے مزاج کے درست ہونے کے وقت، اور ان کے نفوس کے سیدھا ہونے کے وقت: اس چیز کے موافق جو صورتِ نوعیہ دیتی ہے آخرت میں انسان کے افراد کو (یہ سب چیزیں متمثل ہوتی ہیں) بہت سی صورتوں میں، جیسا کہ نبی ﷺ نے اس کو بیان کیا ہے (مختلف روایات میں)

اور یہ تجلی صرف اس روح اعظم کے لئے ہے جو کہ وہ انسان کے افراد کو جمع کرنے والی ہے۔ اور ان کی کثرت کا سنگم ہے۔

اور دنیا و آخرت میں ان کی ترقی کی نہایت ہے۔ اس تجلی سے مری مراد یہ ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ کے لئے ایک کلی شان ہے۔ اس کے روح کو سنبھالنے اور روح میں اس کے حکم کے اعتبار سے۔ اور وہی تجلی: وہ ہے جس کو آخرت میں لوگ ہمیشہ قطعی طور پر دیکھیں گے اپنے دلوں سے۔ اور کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جب وہ کسی مناسب صورت میں متمثل ہوگی۔

اور حاصل کلام: پس اسی وجہ سے یہ تجلی ذریعۂ انکشاف ہے: اللہ کے حکم کے لئے۔ اور انسان کے افراد میں اللہ کے حق کے لئے، اس طرح جو افراد کو صورت نوعیہ دیتی ہے، جیسے: ان کا میل جول ان کے آپس میں۔ اور ان کا اس کمالِ انسانی کو حاصل کرنا جو نوع انسان کے ساتھ مختص ہے یعنی عبادت کرنا، اور لوگوں میں اللہ کی پسندیدہ مصلحت کو قائم کرنا۔ پس ضروری ہوا کہ اللہ پاک منسوب کریں اس بات کو جو قوم کے لئے ہے اپنی ذات کی طرف اس تعلق کی وجہ سے۔

لغات: خُرْفَة: پکے ہوئے چنیدہ میوے۔ اور پکے ہوئے میووں میں ہونے کا مطلب: جنت کی نعمتوں میں ہونا ہے...... **تألُّف** (مصدر) اکٹھا ہونا۔ مراد باہم میل جول...... **القیوم**: **القائم الحافظ لکل شیئ**: نگہبانی کرنے والا اور سنبھالنے والا...... **دَهْلِيز**: فارسی کلمہ ہے: چوکھٹ، عربی میں اس کے لئے **عَتَبَةُ الباب** ہے...... **مَبْدَأ**: اصل، علت۔ یہ فلسفہ کی اصلاح ہے...... **عِيَانًا** کے معنی یہاں یقینی طور پر کے ہیں۔

ترکیب: **ورضاه** کا عطف **اعتقاد** پر ہے...... **فی رؤياه بربه تعالیٰ** تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ مگر بظاہر **لِرَبِّه** ہونا چاہئے ترجمہ اسی کا کیا گیا ہے...... **بصور كثيرة** متعلق ہے **يتمثل** سے...... **بابصارهم** متعلق ہے **يراه** سے...... **فكما أن** اور **فكذلك** ایک دوسرے سے متصل ہیں۔

تصحیح: **أو مبلغ اعتقاد** اصل میں واو کے ساتھ تھا...... **مكشافاً لحكم الله** اصل میں **مكشافا بحكم الله** تھا۔ یہ دونوں تصحیحیں مخطوطہ کراچی سے کی ہیں۔

☆ ☆ ☆

مریض پر دَم کرنے کی دعائیں: اور اس کی حکمت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ایسی کامل اور تام جھاڑیں اور دعائیں بتلائی ہیں جو اللہ کے ذکر پر مشتمل ہیں، اور جن میں اللہ تعالیٰ سے استعانت کی گئی ہے۔ ان کے دو مقصد ہیں:

پہلا مقصد: اِن جھاڑوں کی تعلیم سے یہ ہے کہ مریضوں کو رحمتِ الٰہی کی چادر ڈھانپ لے، اور وہ الاؤں بلاؤں کو دفع کردیں یعنی جس طرح جسمانی علاج مسنون ہے یہ روحانی علاج بھی ضروری ہے۔ تاکہ دونوں علاج شفا میں ایک دوسرے کے مددگار ہوجائیں۔

دوسرا مقصد: زمانۂ جاہلیت میں ایسی جھاڑوں اور منتروں کا رواج تھا، جن میں شیطانی طاقتوں سے استعانت کی

جاتی تھی۔ پس لوگوں کو اس سے روکنا ضروری تھا۔ اس لئے علاج بالمثل کے طور پر ان ناجائز منتروں کی جگہ بہترین اور مفید دعائیں سکھلائیں تاکہ لوگ ان مشرکانہ طریقوں سے بچ جائیں۔

مریض پر دَم کرنے کی چند بابرکت نبوی دعائیں درج ذیل ہیں: یہ دو قسم کے افسوں ہیں: ایک: دوسرے پر دم کرنے کے، دوسرے: خود اپنے اوپر دم کرنے کے:

① —— دوسرے پر دَم کرنے کی دعائیں —— (۱) اپنا داہنا ہاتھ مریض کے جسم پر پھیرے، اور یہ دعا پڑھے: اَذْهِبِ الْبَأْسَ، رَبَّ النَّاسِ، وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ، لَا شِفَآءَ إِلَّا شِفَآءُكَ، شِفَآءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا (دور فرما تکلیف کو، اے انسانوں کے پروردگار! اور شفا عطا فرما، آپ ہی شفا دینے والے ہیں۔ بس آپ ہی کی شفا شفا ہے۔ ایسی کامل شفا عطا فرما جو بالکل بیماری نہ چھوڑے) پھر تین مرتبہ مریض پر دَم کرے (مشکوۃ ۱۵۳۰)

(۲) ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے۔ آپ علیل تھے۔ جبرئیل نے محسوس کیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں! تو جبرئیل نے آپ کو اس دعا سے جھاڑا: بِسْمِ اللهِ اَرْقِيْكَ، مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ (اور ترمذی کی روایت میں مِنْ عَيْنِ حَاسِدَةٍ ہے) اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ، بِسْمِ اللهِ اَرْقِيْكَ (میں اللہ کے نام سے آپ کو جھاڑتا ہوں، ہر اُس چیز سے جو آپ کو تکلیف دے رہی ہے: ہر شخص کی برائی سے اور ہر جلنے والے کی آنکھ سے (اور ترمذی کی روایت میں ہے ہر حسد کرنے والی آنکھ سے) اللہ تعالیٰ آپ کو شفا بخشیں۔ اللہ کے نام سے میں آپ کو جھاڑتا ہوں) پھر دم کرے (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۱۵۳۴)

(۳) ایک جھاڑ یہ ہے: جس سے ابراہیم علیہ السلام اپنے صاحبزادوں کو، اور رسول اللہ ﷺ اپنے نواسوں کو جھاڑا کرتے تھے: اُعِيْذُكَ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ، مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ (پناہ میں دیتا ہوں میں تجھ کو اللہ تعالیٰ کے تام کلمات کے ذریعہ۔ ہر شیطان اور ہر زہریلے جانور کی برائی سے۔ اور ہر نظر لگانے والی آنکھ سے) اگر ایک لڑکا یا مرد ہو تو اسی طرح پڑھے۔ اور دو ہوں تو اُعِيْذُكُمَا کہے اور زیادہ ہوں تو اُعِيْذُكُمْ کہے اور ایک لڑکی ہو تو اُعِيْذُكِ (کاف کے زیر کے ساتھ) کہے۔ اور دو لڑکیاں ہوں تو بھی وہی اُعِيْذُكُمَا کہے اور چند ہوں تو اُعِيْذُكُنَّ کہے اور لڑکے لڑکیاں ہوں تو مذکر کے صیغے استعمال کرے، پھر سب پر دم کرے۔ (مشکوۃ حدیث ۱۵۳۵)

(۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی مسلمان کسی مسلمان کی عیادت کرے۔ اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھے اَسْاَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ، رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَّشْفِيَكَ (میں عظیم المرتبت اللہ سے سوال کرتا ہوں، جو عرش بزرگ کے پروردگار ہیں کہ وہ تجھے شفا دیں) تو ضرور اسے شفا ہو جائے گی، اگر موت کا وقت نہیں آیا (مشکوۃ حدیث ۱۵۵۳)

② —— اپنے اوپر دَم کرنے کی دعائیں —— (۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب نبی ﷺ بیمار ہوتے تو اپنے اوپر معوِّذات کے ذریعہ دم کرتے۔ اور اپنے جسم پر اپنا ہاتھ پھیرتے، جہاں تک اپنے

بدن مبارک پر پہنچ سکتا (مشکوۃ حدیث ۱۵۳۲) اس حدیث میں معوذات سے مراد بظاہر سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دعائیں مراد ہوں جن میں اللہ سے پناہ طلب کی جاتی ہے، اور جو آپ بیماروں پر پڑھ کر اکثر دم کیا کرتے تھے (معارف الحدیث ۳: ۴۵۱)

(۲) حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے درد کی شکایت کی، جو ان کے جسم کے کسی حصہ میں تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: "تم اس جگہ پر اپنا ہاتھ رکھو جہاں تکلیف ہے۔ اور تین دفعہ کہو بِسْمِ اللّٰہ اور سات مرتبہ کہو اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ: مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ (میں پناہ لیتا ہوں اللہ کی عظمت اور اس کی قدرت کی: اس تکلیف کے شر سے جو میں پا رہا ہوں، اور جس سے میں ڈر رہا ہوں) حضرت عثمان کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ نے میری وہ تکلیف دور فرمادی (مشکوۃ حدیث ۱۵۳۳)

(۳) نبی ﷺ بخار کے لئے اور سب دردوں کے لئے صحابہ کو یہ دعا سکھلاتے تھے: بِسْمِ اللّٰهِ الْكَبِيْرِ، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ: مِنْ شَرِّ كُلِّ عِرْقٍ نَعَّارٍ، وَمِنْ شَرِّ حَرِّ النَّارِ (بڑے اللہ کے نام سے، عظیم المرتبت اللہ کی پناہ چاہتا ہوں: ہر جوش مارنے والی رگ کی برائی سے اور آگ کی گرمی کی برائی سے) (مشکوۃ حدیث ۱۵۵۴)

(۴) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ: "تم میں سے جو کوئی بیمار ہو کچھ بھی، یا اس کا بھائی بیمار ہو تو چاہئے کہ کہے: رَبُّنَا اللّٰهُ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ، تَقَدَّسَ اسْمُكَ، اَمْرُكَ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ، كَمَا رَحْمَتُكَ فِي السَّمَاءِ فَاجْعَلْ رَحْمَتَكَ فِي الْاَرْضِ، اغْفِرْ لَنَا حُوْبَنَا وَخَطَايَانَا، اَنْتَ رَبُّ الطَّيِّبِيْنَ، اَنْزِلْ رَحْمَةً مِّنْ رَحْمَتِكَ وَشِفَاءً مِّنْ شِفَائِكَ عَلَى هَذَا الْوَجَعِ (ہمارا پروردگار وہ اللہ ہے جو آسمان میں ہے۔ پاک ہے آپ کا نام۔ آپ کا حکم آسمانوں اور زمین میں مانا ہوا ہے۔ جس طرح آپ کی رحمت آسمان میں ہے پس کریں آپ اپنی رحمت زمین میں بخش دیجئے ہمارے لئے ہمارے بڑے اور چھوٹے گناہ۔ آپ پاکیزہ لوگوں کے پروردگار ہیں۔ نازل فرما اپنی رحمت میں سے بڑی رحمت یا کچھ رحمت اور اپنی شفا میں سے بڑی شفا یا کچھ شفا اس درد (تکلیف) پر پس وہ اچھا ہو جائے گا (مشکوۃ حدیث ۱۵۵۵)

[۷] وأمر النبيُّ صلى الله عليه وسلم برُقًى تامةٍ كاملةٍ، فيها ذكر الله، والاستعانةُ به، يريد أن تُغَشِّيَهُمْ غاشيةٌ من رحمة الله، فتدفع بلاياهم، وأن يَكْبَحَهم عما كانوا يفعلون في الجاهلية، من الاستعانة بطواغيتهم، ويُعَوِّضَهم عن ذلك بأحسن عوض: منها:

[الف] قولُ الراقي، وهو يمسَحه بيمينه: " أَذْهِبِ البأسَ، رَبَّ الناس، واشْفِ، أنت الشافي، لاشفاءَ إلا شفاؤك، شفاءً لايُغادر سَقَمًا.

[ب] وقولُه: " بسم الله أَرْقِيك، من كل شيئ يُؤْذيك، من شر كل نفس، أو عينِ حاسد، اَللّٰهُ

يشفيك، باسم الله أرقيكَ"

[ج] وقولُه:" أُعيذُكَ بكلمات الله التامَّةِ، من كل شيطان وهامَّة، ومن كل عين لامة"

[د] وقولُه سبع مرات:" أسأل اللهَ العظيمَ، ربَّ العرش العظيم، أن يشفيك"

ومنها:

[الف] النفث بالمعوِّذات، والمسحُ

[ب] وأن يضع يدَه على الذى يألَم من جسده، ويقول:" باسم الله" ثلاثًا، وسبعَ مراتٍ:" أعوذ بعزة الله وقدرته من شر ما أجد وأُحَاذِرُ"

[ج] وقولُه:" باسم الله الكبير، أعوذ بالله العظيم، من شر كل عِرْقٍ نَعَّارٍ، ومن شر حَرِّ النار"

[د] وقولُه:" رَبُّنَا الله الذى فى السماء، تقدَّس اسمُك، أَمْرُك فى السماء والأرض، كما رحمتُك فى السماء فاجعل رحمتَك فى الأرض، اغفِرْلنا حُوْبَنَا وخطايانا، أنت ربُّ الطيبين، أنزل رحمةً من رحمتك، وشفاءً من شفائك على هذا الوجع"

ترجمہ:(۷)اور نبی ﷺ نے حکم دیا کامل تام افسونوں کا، جن میں اللہ کا ذکر ہے اور اللہ سے مدد طلب کرنا ہے۔ چاہتے ہیں آپؐ کہ ڈھانپ لے لوگوں کو اللہ کی رحمت کا بڑا پردہ۔ پس ہٹادے وہ رحمت لوگوں کی آفتوں کو اور یہ کہ لگام دے (روکے) ان کو ان منتروں سے جن کو وہ استعمال کیا کرتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں، یعنی ان کی سرکش طاقتوں سے مدد طلب کرنا۔ اور بدل دیا لوگوں کے لئے ان جاہلی طریقوں کو بہترین عوض سے ان میں سے: (الف) جھاڑنے والے کا قول ہے۔ درانحالیکہ وہ مریض پر اپنا دایاں ہاتھ پھیر رہا ہو (آگے ترجمہ کرنا تکرار ہے)

☆ ☆ ☆

موت کی تمنا کیوں ممنوع ہے؟

حدیث —— میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ہرگز کسی دُکھ اور تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے (اگر دل غم سے بھر جائے اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے) موت کی دعا کرنی ہی پڑے، تو یوں دعا کرے:'' خدایا! جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے: زندہ رکھ۔ اور جب میرے لئے موت بہتر ہو، تو مجھے دنیا سے اٹھالے'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۰۰)

تشریح: موت کی آرزو اور دعا کرنا دو وجہ سے ممنوع ہے:

پہلی وجہ: موت کی دعا کرنا اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی، دلیری اور بے باکی ہے، کیونکہ موت کی دعا: اللہ تعالیٰ سے یہ مطالبہ کرنا ہے کہ وہ اپنی بخشی ہوئی عظیم نعمتِ حیات چھین لیں۔ اس گستاخ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں! اور زندگی

نعمت اس لئے ہے کہ جب تک زندگی ہے نیکی کا موقع ہے۔ اور دینی ترقی کا امکان ہے۔ مرتے ہی نیکوکاری کی بیشتر راہیں بند ہوجائیں گی۔ اور طبعی ترقی کے علاوہ ہر ترقی رُک جائے گی۔ اور طبعی ترقی سے مراد مادّی ترقی ہے۔ جیسے بچہ بڑھتا رہتا ہے اور جوان ہوجاتا ہے۔ یہ طبعی ترقی ہے۔ یہ ترقی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن آدمی کا قد ساٹھ ہاتھ کا ہوجائے گا۔

دوسری وجہ: موت کی تمنا بے دانشی اور لاپروائی سے کسی کام میں گھس پڑنا ہے۔ اور بے قراری، بے صبری اور حالات سے زچ ہوجانا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں بدترین اخلاق میں شمار ہوتی ہیں۔ آدمی کو دانشمند ہونا چاہئے اور عواقب پر نظر رکھنی چاہئے۔ نیز ہمت وحوصلہ سے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے۔ کیا موت کی تمنا اور دعا کرنے والا جانتا ہے کہ آگے اس کے لئے دسترخوان بچھا ہوا ہے؟ ممکن ہے کوڑا تیار ہو! پس بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے پناہ لینے کی مثال صادق آئے گی۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " لايتمنين أحدكم الموت" الحديث.
أقول: من أدب الإنسان في جنب ربه: أن لايجترىءَ على طلب سلب نعمة، والحياةُ نعمةٌ كبيرةٌ، لأنها وسيلةٌ إلى كسب الإحسان، فإنه إذا مات انقطع أكثرُ عمله، ولايترقى إلا ترقيا طبيعيا. وأيضًا: فذلك تَهَوُّرٌ وتَضَجُّرٌ، وهما من أقبح الأخلاق.

ترجمہ: (۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ...... میں کہتا ہوں: اپنے پروردگار کے پہلو میں ادب انسانی میں سے یہ بات ہے کہ نہ دلیری کرے وہ کسی نعمت کو چھین لینے کا مطالبہ کرنے پر۔ اور زندگی ایک بڑی نعمت ہے۔ اس لئے کہ وہ ذریعہ ہے نیکوکاری کو کمانے کا۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ جب انسان مرگیا تو اس کے بیشتر اعمال بند ہوگئے (صدقۂ جاریہ وغیرہ بعض اعمال ہی جاری رہتے ہیں) اور وہ ترقی نہیں کرتا مگر مادی ترقی۔ اور نیز: وہ (موت کی دعا) لاپروائی سے کسی کام میں گھس پڑنا ہے۔ اور (حالات سے) زِچ ہوجانا ہے۔ اور یہ دونوں بدترین اخلاق میں سے ہیں۔

☆ ☆ ☆

شوقِ لقاء سے عقلی شوق مراد ہے

حدیث ــــــ حضرت عُبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا پسند کرتے ہیں۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا ناپسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا ناپسند کرتے ہیں'' ــــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''موت ہم سب کو ناپسند ہے!'' (یعنی موت کے پُل سے گذرے بغیر اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور موت سب کو ناگوار ہے، پس گویا کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے

ملنا پسند نہیں کرتا) ——— آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا نہیں ہے (یعنی سب کو موت ناپسند نہیں ہے) جب مؤمن کی موت کا وقت آتا ہے، تو اس کو اللہ کی خوشنودی، اور اللہ کے نزدیک اعزاز واکرام کی خوش خبری دی جاتی ہے، تو اس وقت مؤمن کے لئے آئندہ زندگی سے پیاری کوئی چیز نہیں ہوتی، پس وہ اللہ سے ملنے کو پسند کرتا ہے (اور مرنے کے لئے بے تاب ہوجاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور کافر کی موت کا جب وقت آتا ہے، تو اس کو اللہ کے عذاب کی اور آخرت میں سزا کی خوش خبری دی جاتی ہے، تو اس وقت کافر کے لئے آئندہ زندگی سے زیادہ ناپسند کوئی چیز نہیں ہوتی، پس وہ اللہ سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنے کو ناپسند کرتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۰۱)

تشریح: حدیث کے آخر میں جو سوال وجواب ہیں اُن سے کسی کو یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ اللہ سے ملنے کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا تعلق زندگی کے آخری لحات ہی سے ہے۔ حالانکہ اللہ سے ملنے کا شوق تو مؤمن کی زندگی کی متاع ہے۔ سورۃ الکہف میں ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ﴾ اور سورۃ العنکبوت میں ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللّٰهِ﴾ اور سورۃ الاحزاب میں ہے: ﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ﴾ ان آیات میں اشارہ ہے کہ مؤمن زندگی بھر اس متاع گرانمایہ سے بہرہ ور رہتا ہے۔ پھر آپؐ نے زندگی کے آخری لحات کی تخصیص کیوں فرمائی؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اللہ کی ملاقات: کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن ایمان بالغیب سے ایمان بالعَین کی طرف منتقل ہو۔ یعنی مؤمن ایمانی حالت میں ترقی کرے، اور عینی اور مشاہداتی ایمان کے مرحلہ میں داخل ہوجائے۔ اور یہ مرحلہ موت کے بعد ہی آتا ہے۔ زندگی بھر آدمی ایمان بالغیب کے مرحلہ میں رہتا ہے۔ سورۃ الحجر کی آخری آیت ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ یعنی آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں، یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے اس آیت میں ''موت'' کو ''یقین'' سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ مرنے کے بعد ہی مؤمن کو ایمانیات میں یقین حاصل ہوتا ہے۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ موت سے بہیمیت کا دبیز پردہ چاک ہوجاتا ہے، اور ملکیت کا نور چمکتا ہے، تو مؤمن پر حظیرۃ القدس سے ان باتوں کا یقین مترشح ہوتا ہے جن کی انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اطلاعات دی ہیں۔ اور وہ باتیں اب غیب (بن دیکھی) نہیں رہتیں۔ بلکہ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی حقیقت بن جاتی ہیں۔

اور مؤمن بندہ جو زندگی بھر نیکوکاری میں کوشاں رہتا ہے: بہیمیت کو روکتا ہے، اور ملکیت کو قوی کرتا ہے، وہ اس حالت یقین کا ایسا مشتاق ہوتا ہے، جیسا عناصر اربعہ اپنے حیز اور مرکز کے مشتاق ہوتے ہیں، اور ہر ذی حواس اس چیز کا مشتاق ہوتا ہے، جس میں اس کے حاسہ کو مزہ آتا ہے یعنی آنکھ خوشنما مناظر کو پسند کرتی ہے، کان وجد آفریں نغمے سننے کے خواہش مند رہتے ہیں اور زبان چٹخارے بھرنا چاہتی ہے، وقس علی ہذا۔ رہا جسمانی نظام کے اعتبار سے موت اور اس کے اسباب (بیماری اور سکرات کی تکلیف) سے رنجیدہ ہونا، تو وہ الگ بات ہے۔ اس سے شوق لقاء پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

اور بدکار بندہ جو زندگی بھر بہیمیت کو گاڑھا کرنے میں لگا رہتا ہے، وہ دنیا کی زندگی کا مشتاق ہوتا ہے۔ اس کی رعنائیوں پر فریفتہ رہتا ہے۔ اور اس کا یہ اشتیاق بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا عناصر اربعہ میں اپنے مراکز کا اشتیاق ہوتا ہے، اور حواس میں ان کے لذائذ کی خواہش پائی جاتی ہے۔ آخرت کی زندگی یک لخت اسے نہیں بھاتی۔ پس اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر یہ دونوں باتیں یعنی موت اور اس کی تکالیف سے طبعی طور پر گھبرانا۔ اور آخرت کو بنانے کی محنت میں عقلی استحسان سے لگا رہنا، یہ دونوں امر گڈ مڈ ہو گئے، بلکہ موت کی ناگواری غالب نظر آئی تو انھوں نے سوال کیا۔ اور نبی ﷺ نے جواب میں ایک ایسی حالت کا تذکرہ فرمایا، جس میں اللہ سے ملنے کا اشتیاق غالب آجاتا ہے۔ اور وہ فرشتوں کے ظاہر ہونے کی اور خوش خبری سنانے کی حالت ہے۔

وضاحت: شاہ صاحب قدس سرہ کی بات کا حاصل یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں: ''اللہ سے ملنا پسند کرنے'' میں شوقِ لقاءِ عقلی مراد ہے۔ جو مؤمن میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ سنبھل کر زندگی گذارتا ہے۔ ایسے تمام کاموں سے بچتا ہے جو اللہ کو ناراض کرنے والے ہیں۔ یہی آخرت کی زندگی کا استحسانِ عقلی ہے۔ رہی موت کی طبعی ناگواری تو وہ ایک فطری بات ہے۔ اور عام حالات میں فطری امور غالب نظر آتے ہیں۔ مگر جب موت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، اور فرشتے نمودار ہوتے ہیں۔ اور وہ اچھے انجام کی خوش خبری سناتے ہیں، تو وہ فطری خوف مغلوب ہو جاتا ہے، اور شوق غالب آجاتا ہے۔ حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موت کے وقت: وہ فطری ناگواری ختم ہو جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ جانکنی کے وقت مسلسل یہ دعا فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ أَعِنِّیْ علی سکراتِ الموت و غمراتها: الٰہی! سکرات میں اور موت کی سختیوں میں میری مدد فرما! اسی طرح صحت کی حالت میں جو موت کی کراہیت غالب نظر آتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مؤمن میں اللہ سے ملنے کا شوق نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ محتاط زندگی کیوں گزارتا؟

اور محسوسات میں اس کی نظیریں بہت ہیں: ایک طالب علم جو امتحان سے ہفتوں مہینوں پہلے آموختہ یاد کرنا شروع کرتا ہے، تو وہ امتحان کے خوف ہی سے ایسا کرتا ہے۔ اور آدمی جو کسی خطرناک مرض سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے اور آپریشن کراتا ہے، تو وہ اس وقت میں آپریشن کی تکالیف سے بے خوف نہیں ہو جاتا۔ بلکہ شفا کی آرزو غالب آجاتی ہے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جو اشکال پیش آیا ہے، ایسا ہی اشکال ایک اور حدیث میں پیش آتا ہے۔ متفق علیہ روایت ہے: لایؤمن احدُکم حتی اکونَ أحبَّ إلیه من والده، وولده، والناس أجمعین ہے یعنی جب تک رسول اللہ ﷺ کی محبت ہر محبت سے زیادہ نہ ہو، آدمی مؤمن نہیں ہوتا۔ جبکہ اپنی ذات کی، آل اولاد کی، عزیز و اقارب کی اور دنیا کے مال و منال کی محبت آدمی پر چھائی رہتی ہے۔ مگر یہ طبعی محبت ہے۔ عقلی طور پر مؤمن کامل میں اللہ و رسول کی اور دین کی محبت پہاڑ جیسی موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ موقع آنے پر وہ کسی بھی چیز کو قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔

اس حدیث میں بھی طالب علم یہی سوال کرتے ہیں کہ بظاہر تو ماں باپ کی اور اولاد کی محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ تو اساتذہ ایک ایسی حالت کا تذکرہ کرتے ہیں، جس میں دین کی محبت غالب آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ایسی بات نہیں ہے: جب دین پر آنچ آتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حرف آتا ہے، تو مؤمن کیا کرتا ہے؟ اس وقت میں اس کو جان کی پرواہ نہیں ہوتی، یہی عقلی محبت ہے جو وقت پر غالب آجاتی ہے۔

فائدہ: اور اللہ کا پسند کرنا اور ناپسند کرنا مُشاکلۃ (ہم شکل ہونے کی وجہ سے) وارد ہوا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اللہ نے مؤمن کامل کے لئے آخرت میں نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔ موت کا گھونٹ پیتے ہی وہ ان سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ اور کافر کے لئے تکلیف دہ عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور گھات میں ہیں کہ کب آئے، اور سزا پائے (یہ فائدہ شاہ صاحب نے درمیانِ کلام میں بیان کیا ہے)

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم: "من أحب لقاء الله أحب اللّٰه لقاءه، ومن كره لقاء الله كره اللّٰه لقاءه"

أقول: معنى لقاء الله: أن ينتقل من الإيمان بالغيب إلى الإيمان عيانًا وشهادةً، وذلك أن تنقشعَ عنه الحُجُبُ الغليظةُ البهيميةُ، فيظهر نورُ الملكية، فيترشح عليه اليقين من حظيرة القدس، فيصير ما وُعِدَ على ألْسنةِ التراجمةِ بمرأًى منه ومسمَعٍ؛ والعبدُ المؤمن الذى لم يزل يسعى فى ردع بهيميته، وتقوية ملكيته، يشتاق إلى هذه الحالة اشتياقَ كل عنصر إلى حَيِّزِه، وكلِّ ذى حسٍّ إلى ما هو لذة ذلك الحس، وإن كان بحسب نظام جسده يتألم، ويتنفَّر من الموتِ وأسبابِه؛ والعبدُ الفاجر الذى لم يزل يسعى فى تغليظ البهيمية يشتاق إلى الحياة الدنيا، ويميلُ إليها كذلك؛ وحبُّ اللّٰه وكراهيتُه وَرَدا على المشاكلة، والمرادُ إعداد ما ينفعه أو يؤذيه، وتَهيِئَتُه، وكونه بمرصادٍ من ذلك.

ولما اشتبه على عائشة رضى الله عنها أحدُ الشيئين بالآخر، نَبَّه رسولُ الله صلى الله عليه وسلم على المعنى المراد، بذكر أصرح حالات الحب المترشح من فوقه، الذى لايشتبه بالآخر، وهى حالةُ ظهور الملائكة.

ترجمہ: (۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''جو شخص اللہ کی ملاقات پسند کرتا ہے۔ اللہ بھی اس کی ملاقات پسند کرتے ہیں۔ اور جو اللہ کی ملاقات ناپسند کرتا ہے، اللہ بھی اس کی ملاقات ناپسند کرتے ہیں'' میں کہتا ہوں: ''اللہ کی ملاقات'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب سے منتقل ہو یعنی ترقی کرے: ایمان عینی اور ایمان بالمشاہدہ کی طرف۔ اور اس کی

تفصیل یہ ہے کہ موت سے بہیمی گاڑھا پردہ کھل جاتا ہے، پس ملکیت کا نور چمکتا ہے۔ پس مؤمن پر مقدس بارگاہ سے یقین ٹپکتا ہے۔ پس ہو جاتی ہیں وہ باتیں جو وعدہ کی گئی ہیں مترجمین کی زبانوں سے (انبیائے کرام اس عالم میں اللہ تعالیٰ کی باتوں کے ترجمان ہیں) آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی۔ اور مؤمن بندہ جو برابر کوشاں رہتا ہے اپنی بہیمیت کو روکنے میں، اور اپنی ملکیت کو قوی کرنے میں، مشتاق ہوتا ہے اس حالت کی طرف (یعنی موت کے بعد کی حالت کی طرف، جس میں بن دیکھی باتیں یعنی اللہ اور اللہ کی صفات مشاہدہ کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں) ہر عنصر کے مشتاق ہونے کی طرح اپنے حیّز کی طرف، اور ہر ذی حاسہ کے مشتاق ہونے کی طرح اس چیز کی طرف جو کہ وہ اس حاسہ کی لذت (دلچسپی کی چیز) ہے۔ اگرچہ وہ اپنے نظام جسمانی کے اعتبار سے رنجیدہ ہوتا ہے (یعنی موت کی تکالیف سے گھبراتا ہے) اور نفرت کرتا ہے وہ موت سے اور اس کے اسباب سے۔ اور فاجر (بدکار) بندہ: جو برابر کوشاں رہتا ہے: بہیمیت کو گاڑھا کرنے میں: وہ مشتاق ہوتا ہے دنیا کی زندگی کی طرف۔ اور وہ اس دنیا کی زندگی کی طرف اسی طرح مائل ہوتا ہے (جس طرح عناصر اپنے حیّز کی طرف اور حواس اپنے لذائذ کی طرف مائل ہوتے ہیں) (فائدہ) اور اللہ کا محبت کرنا اور اللہ کا ناپسند کرنا دونوں وارد ہوئے ہیں مشاکلت کے طور پر۔ اور مراد اس چیز کو تیار کرنا ہے جو اس کو نفع پہنچائے یا اس کو تکلیف پہنچائے، اور اس کو مہیا کرنا ہے۔ اور اللہ کا اس معاملہ میں گھات میں لگا ہوا ہونا ہے (فائدہ ختم ہوا)

اور جب عائشہ رضی اللہ عنہا پر دو چیزوں میں سے ایک دوسری کے ساتھ مشتبہ ہوئی تو آگاہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معنی مرادی سے: اس کے اوپر ٹپکنے والی محبت کے حالات میں سے واضح ترین حالت کو ذکر کر کے، جو کہ وہ مشتبہ نہیں ہوتی دوسری کے ساتھ۔ اور وہ فرشتوں کے ظہور کی حالت ہے۔

☆ ☆ ☆

موت کے وقت امیدوارِ رحمت رہنے کی حکمت

حدیث ــــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وفات سے تین دن پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص کی ایسی حالت میں موت آنی چاہئے کہ اس کا اللہ کے ساتھ اچھا گمان ہو'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۰۵)

تشریح: فرائض و واجبات کی ادائیگی اور کبائر سے اجتناب تو نفس کو سیدھا کرنے کا اور اس کی کجی کو دور کرنے کا اوّل درجہ ہے یعنی اس کے بغیر تو کام چلتا نہیں۔ مگر اس کے بعد انسان کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش عمل امیدوارِ رحمت رہنا ہے۔ کیونکہ جس طرح الحاح وزاری سے دعا مانگنا اور کامل توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا رحمتِ الٰہی کے نزول کا باعث ہے، اسی طرح رحمت کی آس لگائے رہنا بھی نزولِ رحمت کو تیار کرتا ہے۔

اور خوف کا معاملہ تو تلوار جیسا ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ کے دشمنوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے یعنی اس کے ذریعہ گاڑھے

شہوانی جذبات اور درندگی والے ارادے اور شیطانی وساوس روکے جاتے ہیں۔ اور جس طرح یہ بات ہے کہ جو شخص مہارت نہیں رکھتا: وہ کبھی تلوار سے حملہ کرتا ہے تو خود کو زخمی کرلیتا ہے، اسی طرح جو شخص نفس کو سنوارنے کے معاملہ میں مہارت نہیں رکھتا: وہ کبھی اللہ کے خوف کو بے محل استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے تمام اعمالِ حسنہ کے بارے میں بدگمان ہوجاتا ہے کہ ان میں خودستائی، خودنمائی اور اس قسم کی دوسری آفات پائی جاتی ہیں۔ اور وہ اس درجہ اپنی نیکیوں سے بدظن ہوجاتا ہے کہ ان کو اللہ کے یہاں کسی اجروثواب کا مستحق ہی نہیں سمجھتا۔ اور وہ اپنے معمولی گناہوں اور لغزشات کو مہلک اور سخت ضرررساں گمان کرنے لگتا ہے۔ ایسا شخص جب مرتا ہے تو اس کی برائیاں اس حال میں اس کے سامنے آتی ہیں کہ اس کے گمان کے مطابق اس کو کاٹ رہی ہوتی ہیں۔ پس یہ چیز اُن خیالی تصورات میں قوتِ مثالیہ کے فیضان کا سبب بن جاتی ہے، اور اس کو ایک طرح کا عذاب ہونے لگتا ہے۔ اور وہ اپنے ہی ظنون وشکوک کی وجہ سے اپنی نیکیوں سے معتدبہ فائدہ حاصل نہیں کرپاتا۔ اور متفق علیہ روایت میں یہ مضمون آیا ہے: اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: "میں اپنے بندے سے ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں، جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے" (بخاری حدیث ۷۵۰۵) اور بیماری اور کمزوری کی حالت میں بسا اوقات آدمی خوف کی تلوار کو برمحل استعمال کرنے پر قادر نہیں ہوتا یا موقع ومحل اس پر مشتبہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے اس کے حق میں مسنون یہ ہے کہ اس حال میں خوف سے امید زیادہ ہونی چاہئے۔

فائدہ: اللہ پر ایمان اور اس کی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ بندے کو اللہ کا خوف بھی ہو، اور اس سے رحمت کی امید بھی۔ خوف ورجاء کا آمیزہ ہی ایمان ہے۔ کیونکہ خوف ہی خوف: قنوطیت پیدا کرتا ہے۔ اور صرف رجاء بے عملی کا سبب بنتی ہے۔ اور دونوں کا مجموعہ گناہوں سے بچاتا ہے۔ اور نیک عمل پر ابھارتا ہے۔ پس صحت کی حالت میں خوف کا غلبہ رہنا چاہئے۔ یہ بات عمل کے لئے مفید ہے۔ اور آخر وقت میں رحمت کی امید غالب ہونی چاہئے۔ مریض خود بھی اس کی کوشش کرے اور تیماردار اور عیادت کرنے والے بھی اس وقت میں ایسی باتیں کریں جس سے مریض کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان اور رحم وکرم کی امید پیدا ہو۔ کیونکہ اب عمل کا وقت تو رہا نہیں۔ اب سارا مدار کرم خداوندی پر ہے۔

[۱۰] قوله صلى الله عليه وسلم: "لايموتن أحدكم إلا وهو يحسن ظنَّه بربه"

اعلم: أنه ليس عملٌ صالحٌ أنفعَ للإنسان، بعدَ أدنى ما تستقيم به النفسُ، ويندفع به اعْوِجَاجُها، أعنى أداءَ الفرائض، والاجتناب من الكبائر: من أن يرجُوَ من الله خيرًا، فإن التَّمَلِّيَ من الرجاء بمنزلة الدعاء الحثيث، والهمةِ القوية، في كونه معدًّا لنزولِ رحمة الله.

وإنما الخوفُ سيفٌ، يُقَاتَلُ به أعداءُ الله: من الحجب الغليظة الشهوية، والسَّبُعية، ووساوسِ الشيطان؛ وكما أن الرجل الذي ليس بحاذق في القتال، قد يَسْطُوْ بسيفه، فيصيبُ نفسَه، كذلك الذي ليس بحاذق في تهذيب النفس، ربما يستعمل الخوفَ في غير محله، فَيَتَّهِمُ جميعَ أعماله الحسنةِ

بالعُجب والرياء، وسائر الآفات، حتى لايحتسب لشيئ منها أجرا عند الله، ويرىٰ جميعَ صغائره وزلّاته واقعةً به لامحالة، فإذا مات تمثلت سيئاته عاضّةً عليه في ظنه، فكان ذلك سببا لفيضان قوة مثالية في تلك المُثُلِ الخيالية، فيعذَّب نوعًا من العذاب ولم ينتفع بحسناته من أجل تلك الشكوك والظنون انتفاعًا معتدًا به، وهو قوله صلى الله عليه وسلم عن الله تبارك وتعالىٰ: "أنا عند ظن عبدي بي"

ولما كان الإنسان في مرضه وضعفه، كثيرًا مًّا لايتمكن من استعمال سيف الخوف في محله، أو يشتبه عليه، كانت السنّةُ في حقه: أن يكون رجاؤه أكثرَ من خوفه.

ترجمہ:(۱۰) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''ہرگز نہ مرے تم میں سے کوئی مگر اس حال میں کہ وہ اپنا گمان اچھا رکھتا ہو اپنے رب کے بارے میں'' —— جان لیں یہ بات کہ نہیں ہے کوئی نیک عمل زیادہ نفع بخش انسان کے لئے: اس چیز کے کم سے کم کے بعد جس سے نفس سیدھا ہوتا ہے، اور جس سے اس کی کجی دور ہوتی ہے، مراد لیتا ہوں میں: فرائض کی ادائیگی کو اور کبائر سے پرہیز کرنے کو: اس بات سے کہ امیدوار رہے وہ اللہ سے خیر کا۔ پس بیشک امید سے متمتع ہونا: تیز دعا اور مضبوط توجہ کی طرح ہے، اس کے تیار کرنے والا ہونے میں اللہ کی رحمت کے نزول کے لئے —— اور خوف تو تلوار ہی ہے۔ لڑا جاتا ہے اس سے اللہ کے دشمنوں سے یعنی گاڑھے شہوانی اور درندگی والے حجابات سے اور شیطانی وساوس سے۔ اور جس طرح یہ بات ہے کہ وہ آدمی جو کہ لڑائی کا ماہر نہیں ہے، کبھی اپنی تلوار سے حملہ کرتا ہے، پس وہ خود کو زد پہنچاتا ہے، اسی طرح وہ شخص جو ماہر نہیں ہے اصلاح نفس کے معاملہ میں: کبھی استعمال کرتا ہے خوف کو غیر محل میں۔ پس وہ متہم کرتا ہے اپنے تمام نیک اعمال کو: خود پسندی اور ریاء اور دیگر آفات کے ساتھ۔ یہاں تک کہ نہیں گنتا وہ ان میں سے کسی چیز کے لئے کوئی ثواب اللہ کے پاس۔ اور دیکھتا ہے وہ اپنے تمام چھوٹے گناہوں کو اور اپنی لغزشوں کو قطعی طور پر اس پر واقع ہونے والا۔ پس جب وہ مرتا ہے تو متمثل ہوتی ہیں اس کی برائیاں درانحالیکہ وہ اس کو اس کے گمان میں کاٹ رہی ہوتی ہیں۔ پس یہ چیز سبب ہوتی ہے قوت مثالیہ کے فیضان کے لئے اُن خیالی تصورات میں (یعنی آخرت کے معاملہ میں وہ خیالات واقعی چیز بن جاتے ہیں) پس وہ عذاب دیا جاتا ہے ایک نوع کا عذاب (یعنی انہی تصورات کے ذریعہ) اور نہیں فائدہ اٹھاتا وہ اپنی نیکیوں سے، ان شکوک وظنون کی وجہ سے کوئی معتد بہ فائدہ اٹھانا۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے کہ: ''میں میرے بندے کے گمان کے پاس ہوں میرے ساتھ'' —— اور جب انسان اپنی بیماری اور اپنی کمزوری میں بسا اوقات قادر نہیں ہوتا خوف کی تلوار کے استعمال کرنے پر اس کی جگہ میں یا اس پر خوف کی جگہ مشتبہ ہوجاتی ہے، تو اس کے حق میں سنت یہ ہے کہ اس کی امید زیادہ ہو اس کے خوف سے۔

لغات: تَمَلّٰی منه: فائدہ اٹھانا...... سَطَابه: حملہ کرنا...... المُثُل: جمع ہے مِثال کی۔

موت کو بکثرت یاد کرنے کا فائدہ

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ''لذتوں کو توڑنے والی موت کو بکثرت یاد کیا کرو'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۰۷)

تشریح: حجاب نفس کو توڑنے میں اور طبیعت کو دنیوی لذتوں میں گھسنے سے روکنے میں موت کو یاد کرنے سے زیادہ مفید کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ موت کو یاد کرنے سے دنیا کی ناپائیداری، دنیا سے جدائی اور بارگاہ خداوندی میں حاضری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اور یہ نقشہ عجیب تاثیر رکھتا ہے۔ پہلے بھی ہم نے اس سلسلہ میں کچھ لکھا ہے۔ اس کو دیکھ لیں (غالبًا یہ حجاب نفس کے دور کرنے کے طریقہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو مبحث چہارم، باب ہفتم میں آچکا ہے رحمۃ اللہ ۱:۵۶۹)

کلمہ پر مرنے کی فضیلت اور اس کی وجہ

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ''جس شخص کا آخری کلام لا إلٰہ إلا اللہ ہو وہ جنت میں جائے گا'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۲۱)

تشریح: کلمہ طیبہ پر جو جاں: جاں آفریں کے سپرد کرتا ہے، اس کے جنت میں جانے کی دو وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: ایسی حالت میں کہ اس کی جان پر آبنی ہے، اس نے ذکر الٰہی کو تھام رکھا ہے: یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا ایمان صحیح ہے۔ اور ایمان کی خوشی اس کے دل میں داخل ہو چکی ہے۔ اور مؤمن بہر حال جنت میں جائے گا۔

دوسری وجہ: جانکنی کے وقت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا نفس نیکوکاری کے رنگ میں رنگا ہوا ہے یعنی وہ نیک مؤمن ہے۔ اور جو اس حالت میں مرتا ہے، جنت اس کے لئے واجب ہوتی ہے (دوسری وجہ مؤمن کامل کے تعلق سے ہے اور پہلی عام ہے)

جاں بلب کے پاس کلمہ پڑھنے کی

اور

اس کو یٰسٓ شریف سنانے کی حکمت

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ''مرنے والوں کو کلمہ شریف: لا إلٰہ إلا اللہ کی تلقین کرو'' تلقین کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس لا إلٰہ إلا اللہ پڑھا جائے، تاکہ اس کا ذہن اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور زبان ساتھ دے سکے تو زبان سے بھی کلمہ پڑھ کر اپنا ایمان تازہ کر لے، اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو۔ مگر کلمہ چلا کر نہ پڑھا جائے۔ نہ مریض سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا جائے بس ایک آدمی اس کے پاس اتنے جہر سے پڑھے کہ مریض سن لے۔

حدیث ــــــ میں ہے کہ: ''تم اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰس پڑھو'' یعنی ان کو سناؤ۔ یہ سورت توحید، رسالت اور آخرت کے اہم مضامین پر مشتمل ہے۔ پس موت کے وقت یہ سورت سن کر مریض کا اعتقاد پختہ ہوگا اور دل دنیا سے ٹوٹے گا اور آخرت سے جڑے گا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

تشریح: لب جاں کے ساتھ آخری درجہ کا حسن سلوک یہ ہے کہ اس سے کلمہ کہلوایا جائے، اور اس کو یٰس شریف سنائی جائے۔ ان دونوں باتوں سے اس کی آخرت سنورے گی۔ اور کلمہ کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ افضل الذکر ہے۔ توحید اور شرک کی نفی کے مضمون پر مشتمل ہے۔ اور اذکار میں سب سے عالی شان ذکر ہے (ورنہ درحقیقت مطلوب: یاد الٰہی پر جان سپرد کرنا ہے۔ پس جو اَللّٰہ، اَللّٰہ کرتا رہا اور جان اٹک گئی تو وہ بھی جنت کا حقدار ہے) اور یٰس شریف کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''قرآن کا دل'' ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے یہ حدیث آگے بقية أبواب الإحسان میں آئے گی۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ قرآن نصیحت پذیری کے لئے ہے۔ اور یٰس شریف ایک درمیانی اور کافی مقدار ہے۔ جس سے یہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔ قل هو الله أحد سنائی جائے تو وہ بہت چھوٹی سورت ہے اور سورۂ بقرہ سنائی جائے تو وہ بہت بڑی سورت ہے۔ اس لئے درمیانی سورت کا انتخاب کیا گیا۔ تاکہ مریض جلدی سن کر فارغ ہوجائے۔ اور مقصد (نصیحت پذیری) بھی حاصل ہوجائے۔

فائدہ: اور لوگوں میں جو مشہور ہے کہ قریب المرگ کے پاس یٰس شریف پڑھنے سے موت آسان ہوتی ہے۔ چنانچہ جب مریض بالکل غافل اور بے خبر ہوجاتا ہے تب کوئی آدمی یٰس شریف پڑھنا شروع کرتا ہے: یہ بات بے اصل ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ کی بیان کردہ حکمت سے معلوم ہوا کہ اس کا اصل مقصد نصیحت پذیری ہے۔ پس جب مریض کو کچھ ہوش ہو، اس وقت میں ایک آدمی مریض کے پاس بیٹھ کر آہستہ قراءت سے اس کو یہ سورت سنائے۔ اور مریض غور سے سنے۔

[۱۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "أَكْثِرُوا ذكرَ هاذِمِ اللذَّاتِ"

أقول: لاشيئَ أنفعُ في كسر حجاب النفس، وَرَدْعِ الطبيعة عن خوضها في لذة الحياة الدنيا: من ذكر الموت، فإنه يُمَثِّلُ بين عينيه صورةَ الانفكاك عن الدنيا، وهيئةَ لقاء الله؛ ولهذا التمثُّل أثر عجيب، وقد ذكرنا شيئًا من ذلك، فراجع.

[۱۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "من كان آخر كلامه: لا إلٰه إلا الله، دخل الجنة"

أقول: ذلك: لأن مؤاخذتَه نفسَه- وقد أحيط بنفسه- بذكر الله تعالى دليلُ صحة إيمانه، ودخولِ بشاشته القلبَ؛ وأيضًا: فذكره ذلك مظنة انصباغ نفسه بصبغ الإحسان، فمن مات، وهذه حالتُه، وجبت له الجنة.

[۱۳] قولـه صـلـى الله عليه وسلم: " لَقِّنوا موتاكم لا إله إلا الله" وقوله صلى الله عليه وسلم: "اقرء وا على موتاكم يٰسٓ"

أقول: هـذا غـاية الإحسان بالمحتضر، بحسب صلاح معاده؛ وإنما خُصَّ: " لا إله إلا الله" لأنـه أفضـل الـذكر، مشتـمل على التوحيد ونفي الشرك، وأنْوَهُ أذكارِ الإسلام، و" يٰسٓ" لأنه قلب القرآن، وسيأتيك، ولأنه مقدار صالح للعِظَة.

ترجمہ:(۱۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "زیادہ کرو تم لذتیں توڑنے والی چیز (موت) کی یاد" میں کہتا ہوں: نہیں ہے کوئی چیز زیادہ مفید نفس کا پردہ توڑنے میں، اور طبیعت کو روکنے میں اس کے گھسنے سے دنیوی زندگی کے مزہ میں: موت کی یاد سے۔ پس بیشک موت کی یاد متمثل کرتی ہے اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے دنیا سے جدا ہونے کی اور اللہ کی ملاقات کی کیفیت کا نقشہ۔ اور اس تمثل کے لئے عجیب اثر ہے۔ اور تحقیق ذکر کیا ہم نے اس میں سے کچھ، پس اس کو دیکھ لیں۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "جس کا آخری کلام لا إله إلا الله ہو، وہ جنت میں جائے گا" میں کہتا ہوں: یہ بات اس لئے ہے کہ اس کا اپنے نفس کو پابند بنانا —— درانحالیکہ اس کی جان کو گھیر لیا گیا ہے —— اللہ تعالیٰ کے ذکر کا: اس کے ایمان کے درست ہونے اور دل میں ایمان کی خوشی داخل ہونے کی دلیل ہے۔ اور نیز: پس اس کا یہ ذکر احتمالی جگہ ہے اس کے نفس کے رنگین ہونے کی احسان (نیکوکاری) کے رنگ کے ساتھ۔ پس جو مرا درانحالیکہ یہ اس کی حالت ہے تو ثابت ہوگی اس کے لئے جنت۔

(۱۳) آنحضرت ﷺ کے دو ارشادات:...... میں کہتا ہوں: یہ لبِ گور کے ساتھ آخری درجہ کا حسن سلوک ہے، اس کی آخرت کو سنوارنے کے اعتبار سے اور لا إله إلا الله کی تخصیص محض اس وجہ سے ہے کہ وہ بہترین ذکر ہے، توحید اور شرک کی نفی پر مشتمل ہے۔ اور اذکارِ اسلام میں سب سے عالی شان ذکر ہے۔ اور یٰسٓ خاص کی گئی ہے محض اس وجہ سے کہ وہ قرآن کا دل ہے۔ اور عنقریب آئے گی تیرے پاس وہ حدیث۔ اور اس لئے کہ یٰسٓ نصیحت کے لئے ایک معتد بہ مقدار ہے۔

☆ ☆ ☆

موت پر ترجیع کی حکمت

حدیث —— میں ہے کہ: "جس مسلمان پر (جانی یا مالی) کوئی مصیبت آئے، اور وہ اس وقت میں وہ بات کہے، جس کے کہنے کا اللہ تعالیٰ نے (سورۃ البقرہ آیت ۱۵۶ میں) حکم دیا ہے یعنی إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ، وَأَخْلِفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا (بیشک ہم اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ اور ہم انہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اے اللہ!

مجھے میری مصیبت میں ثواب عطا فرما! اور میری جو چیز فوت ہوگئی ہے، اس کے بدلے میں اس سے بہتر چیز عنایت فرما!) تو اللہ تعالیٰ اس چیز کے بدلے میں اس سے بہتر چیز اس کو عطا فرماتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۱۸) یعنی اللہ نے ایسے موقعہ پر جو کہنے کا حکم دیا ہے، وہ کہہ کر آگے دو جملوں کا اضافہ کرے۔

تشریح: یہ دعا چار مضامین پر مشتمل ہے:

۱ــــ ہم اور ہماری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ اور مالک کو اپنی ملکیت میں ہر وقت تصرف کرنے کا حق ہے۔ ایک وقت تک کے لئے مالک نے وہ چیز ہمیں عاریت کے طور پر دی تھی۔ جب وہ وقت پورا ہوگیا، واپس لے لی۔

۲ــــ ہماری ہمارے آدمی سے یا ہماری چیز سے جدائی محض عارضی ہے۔ کیونکہ ہم سب کو لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ اور عارضی جدائی کا کیا صدمہ!

۳ــــ ہمیں فوت شدہ چیز پر اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرماتے ہیں۔

۴ــــ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ فوت شدہ چیز کے بدل اس سے بہتر چیز عطا فرمائیں۔

یہ چاروں باتیں ذہن میں رکھ کر جو دعا پڑھے گا، اس کا صدمہ یقیناً ہلکا پڑ جائے گا۔ بے سمجھے پڑھنے سے پورا فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

میت کے پاس کلماتِ خیر کہنے کی حکمت

حدیث ــــ میں ہے کہ: ''جب تم میت کے پاس جاؤ تو اچھی بات کہو۔ اس لئے کہ فرشتے اس بات پر جو تم کہتے ہو آمین کہتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۱۷) اور کلماتِ خیر کا تذکرہ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے۔ جب حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرما! اور اپنے ہدایت مآب بندوں میں شامل فرما کر ان کا درجہ بلند فرما۔ اور اس کے پسماندگان کی سرپرستی اور نگرانی فرما۔ اور اے رب العالمین! ہم کو اور اس کو بخش دے۔ اور اس کی قبر کو وسیع اور منور فرما'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۱۹)

تشریح: زمانۂ جاہلیت کی ریت یہ تھی کہ پسماندگان اپنے لئے بددعا کرتے تھے۔ یہ ہرگز نہیں چاہئے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ قبولیت کی گھڑی ہو، اور بددعا قبول ہوجائے۔ اس لئے اس کے بدل ایسی دعا تلقین فرمائی جس میں میت کا بھی فائدہ ہے، اور پسماندگان کا بھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ صدمہ کی ابتداء ہے۔ اور اس وقت غم شدید ہوتا ہے اس لئے مذکورہ دعا مسنون کی تا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کا ذریعہ بن جائے۔

[۱٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " ما من مسلم تصيبُه مصيبة، فيقول ما أمره الله: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اللّٰهم اجُرنى في مصيبتى، وأخلِف لى خيرًا منها: إلا أخلف الله له خيرًا منها"

أقول: وذلك: ليتذكر المصابُ ما عند الله من الأجر، وما اللّٰه قادرٌ عليه: من أن يُخلِف عليه خيرًا، لِتخَفَّفَ موجِدَتُه.

[١٥] قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا حضرتم الميتَ فقولوا خيرًا" كقوله صلى الله عليه وسلم: "اللهم اغفر لأبي سلمة، وارفع درجته" الحديث.

أقول: كان من عادة الناس في الجاهلية: أن يدعُوا على أنفسهم، وعسى أن يتفق ساعةَ الإجابة فيُستجاب، فَبَدَّلَ ذلك بما هو أنفعُ له ولهم، وأيضًا: فهذه هي الصدمة الأولى، فيُسَنُّ هذا الدعاء، ليكون وسيلةً إلى التوجه تلقاءَ اللّٰه.

ترجمہ: (۱۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: اور وہ دعا اس لئے ہے کہ مصیبت زدہ اس ثواب کو یاد کرے جو اللہ کے پاس ہے۔ اور اس بات کو یاد کرے جس پر اللہ تعالیٰ قادر ہیں یعنی یہ بات کہ فوت شدہ کے بدل اس سے بہتر چیز دیں: تاکہ ہلکا پڑ جائے اس کا صدمہ۔

(۱۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی عادتوں میں سے تھا کہ بددعا کرتے تھے وہ اپنے لئے۔ اور ہوسکتا ہے کہ اتفاقاً وہ قبولیت کی گھڑی ہو، پس وہ بددعا قبول کرلی جائے۔ پس بدل دیا اس بددعا کو اس دعا کے ساتھ جو میت کے لئے بھی اور ان کے لئے بھی زیادہ مفید ہے۔ اور نیز: پس یہی وہ صدمہ کی ابتداء ہے۔ پس مسنون ہے یہ دعا، تاکہ وہ اللہ کی جانب توجہ کا ذریعہ ہو۔

غسل وکفن کے سات مسائل اور ان کی حکمتیں

جب رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔ اور خواتین ان کو نہلانے کے لئے جمع ہوئیں، تو نبی ﷺ نے ان کو یہ ہدایات دیں: "دھوؤتم میت کو طاق عدد سے: تین دفعہ یا پانچ دفعہ یا سات دفعہ۔ بیری کے پتوں کے ساتھ جوش دیئے ہوئے پانی سے۔ اور آخری مرتبہ میں کافور شامل کرنا" اور فرمایا: "میت کی داہنی جانب سے اور وضوء کے اعضاء سے نہلانا شروع کرنا" (مشکوۃ حدیث ۱۶۳۴)

تشریح: اس حدیث کے ذیل میں شاہ صاحب نے سات مسائل اور ان کی حکمتیں بیان کی ہیں:

پہلا مسئلہ: ـــــ میت کو نہلانے میں حکمت اور نہلانے کا طریقہ ـــــ اللہ کا جو بندہ دنیا سے رخصت ہوکر آخرت کی راہ لیتا ہے: شریعت نے اس کو اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور میت کی تکریم کا اس

سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اس کو نہایت پاکیزہ حالت میں نہلا کر اور اچھے کپڑے پہنا کر رخصت کیا جائے۔

اور میت کو نہلانے کا طریقہ وہی ہے جو زندوں کے نہانے کا ہے۔ یعنی جو چیزیں زندوں کے نہانے میں فرض، سنت یا مستحب ہیں، وہی مردے کے نہلانے میں بھی فرض، سنت اور مستحب ہیں۔ اس میں کوئی زائد بات یا اس کا کوئی خاص طریقہ نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مُردہ اپنی زندگی میں اسی طرح نہایا کرتا تھا۔ اور دنیا کے بھی لوگ اسی طرح نہایا کرتے ہیں۔ یعنی غسل میت میں غسل احیاء کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

دوسرا مسئلہ:——بیری کے پتوں کے ساتھ اُبالے ہوئے پانی سے غسل دینے کی، اور تین بار سے زیادہ دھونے کی وجہ یہ ہے کہ بیماری کی وجہ سے احتمال ہے کہ میت کا بدن چرکیں ہو گیا ہو، اور بدبو پیدا ہو گئی ہو۔ اس لئے تین بار دھونے پر اکتفانہ کیا جائے۔ ضرورت پڑے تو زیادہ بھی دھویا جائے۔ اور بیری کے پتوں کے ساتھ اُبالا ہوا پانی جسم سے میل کو خوب صاف کرتا ہے۔ جس مقصد سے لوگ نہانے میں صابن استعمال کرتے ہیں اُسی مقصد سے یہ پانی استعمال کیا جاتا تھا۔ پس اگر بیری کے پتے میسر نہ ہوں تو صابن بھی کافی ہے۔

تیسرا مسئلہ: آخری مرتبہ دھونے میں کافور ملا ہوا پانی استعمال کرنے میں چار فائدے ہیں:

پہلا فائدہ:——اس سے جسم جلدی خراب نہیں ہوتا۔ کافور میں یہ خاصیت ہے کہ جس چیز میں وہ استعمال کیا جاتا ہے، اس میں جلدی تغیر نہیں آتا۔

دوسرا فائدہ:——کافور لگانے سے موذی جانور: کیڑے وغیرہ پاس نہیں آتے۔ اسی لئے لوگ کتابوں اور کپڑوں میں کافور کی گولیاں رکھتے ہیں۔

تیسرا فائدہ:——کافور ایک سستی خوشبو ہے، جس سے جسم معطر ہو جاتا ہے۔

چوتھا فائدہ:——کافور تیز خوشبو ہے۔ پس اگر اچھی طرح نہلانے کے باوجود جسم میں کچھ بدبو رہ گئی ہو گی تو وہ کافور کی خوشبو میں دب جائے گی۔

چوتھا مسئلہ:——جسم کی داہنی جانب سے غسل شروع کرنے کا حکم اس لئے ہے کہ مردہ کا غسل زندہ کے غسل کی طرح ہو جائے یعنی زندہ کے نہانے میں مستحب یہ ہے کہ وہ دائیں جانب سے شروع کرے، پس یہی بات مردے کے غسل میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ نیز اس میں دائیں جانب کے اعضاء کا احترام بھی ہے۔

پانچواں مسئلہ:——شہید کا حکم یہ ہے کہ اس کو نہ غسل دیا جائے، نہ کفن پہنایا جائے۔ بلکہ جن کپڑوں میں وہ شہید ہوا ہے: انہی کپڑوں میں: خون کے ساتھ (نماز جنازہ پڑھ کر) دفن کیا جائے۔ البتہ شہید کے بدن پر جو چیزیں کفن کے قبیل سے نہ ہوں وہ نکال دی جائیں۔ اور اوپر کی چادر بڑھا دی جائے۔ اور اس میں تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: اس طرح دفنانے سے اس مقدس عمل (شہادت) کی عظمتِ شان ظاہر ہوگی۔ یعنی یہ بات لوگوں کے

ذہن میں بیٹھے گی کہ راہِ خدا میں مارا جانا ایک ایسا پیارا عمل اور ایک ایسی عمدہ حالت ہے کہ عام اموات کی طرح اس کی زندگی کی حالت میں تبدیلی نہیں کی گئی۔ بلکہ اس حالت کو گلے سے لگائے رکھا گیا۔

دوسری حکمت: اس طرح دفنانے سے عملِ شہادت کے بقاء کا نقشہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے رہے گا، گو سرسری ہی سہی۔ یعنی شہید چونکہ لفافہ میں لپٹا ہوا ہوگا، اس لئے اس کی اصلی حالت تو لوگوں کو نظر نہیں آئے گی۔ مگر چونکہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ شہید ہے، اس لئے اس شہادت کا نقشہ کچھ نہ کچھ ان کی نگاہوں میں رہے گا۔

تیسری حکمت: اس طرح دفن کرنے سے خود شہید کو بھی اس کے اُس مقدس عمل کی یاد تازہ رہے گی۔ کیونکہ عام روحوں میں بھی جسم سے جدا ہونے کے بعد گونہ احساس باقی رہتا ہے، اور مُردے اپنی حالت کو جانتے ہیں۔ اور شہداء تو زندہ ہیں، وہ اُن امور کا جو ان سے متعلق ہیں پورا پورا ادراک رکھتے ہیں۔ اس لئے جب ان کی شہادت کا اثر باقی رہے گا تو وہ ان کو اس مقدس عمل کی یاد دلاتا رہے گا۔ اور قیامت کے میدان میں اس کی مظلومیت بھی ظاہر ہوگی۔ ایک حدیث میں ہے: ''قیامت کے دن شہداء کے زخموں سے خون بہتا ہوگا: رنگ خون کا ہوگا، مگر خوشبو مشک سی ہوگی (بخاری حدیث ۲۳۷)

چھٹا مسئلہ: شہید ہی کی طرح جس شخص کا احرام کی حالت میں انتقال ہوا ہو، اس کے بارے میں صحیح روایت میں آیا ہے کہ: ''تم اس کو اس کے دو کپڑوں میں کفناؤ۔ اور تم اس کو خوشبو نہ لگاؤ۔ اور تم اس کا سر نہ ڈھانکو۔ پس بیشک وہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ وہ تلبیہ پڑھ رہا ہوگا'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۳۷) پس اس حدیث پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ایک حدیث میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ آیا ہے۔ حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے نئے کپڑے منگوا کر پہنے، اور فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے کہ: ''مُردہ اُن کپڑوں میں اٹھایا جائے گا، جن میں اس کی موت ہوئی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۴۰) پس اِس حدیث کی رو سے بھی محرم کو احرام کی حالت میں دفنانا چاہئے۔

فائدہ: یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک: موت کے بعد بھی مُحرم کا احرام باقی رہتا ہے۔ اور مذکورہ حدیث ان کا مستدل ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک: موت سے دیگر عبادات کی طرح احرام بھی ختم ہوجاتا ہے۔ پس عام اموات کی طرح اس کی تجہیز وتکفین کی جائے گی۔ اور شاہ صاحب نے اوپر جو حدیث ذکر کی ہے، اس کا پہلا جملہ جو نہایت اہمیت کا حامل ہے چھوڑ دیا ہے اور وہ یہ ہے: اِغْسِلوہ بماءٍ وسِدْرٍ یعنی اس محرم کو بیری کے پتوں کے ساتھ جوش دیئے ہوئے پانی سے نہلاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ احرام ختم ہوگیا ہے۔ اگر احرام باقی ہوتا تو اس پانی سے نہلانا کیسے درست ہوتا۔ محرم جس طرح صابن سے نہیں نہا سکتا، اسی طرح بیری کے پتوں کے ساتھ جوش دیئے ہوئے پانی سے بھی نہانا درست نہیں۔

درحقیقت یہ واقعہ حجۃ الوداع میں پیش آیا تھا۔ ایک صحابی اونٹ پر سے گر گئے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ اور وفات ہوگئی تھی۔ چونکہ یہ واقعہ سفر میں پیش آیا تھا۔ اور کفن کے لئے کپڑے موجود نہیں تھے۔ اس لئے

انہیں کے دو کپڑوں میں کفنانے کا حکم دیا۔ اور چونکہ وہ چھوٹے تھے، اس لئے فی الجملہ احرام کی رعایت کر کے سر کو کھلا رکھنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ شہدائے احد کے واقعہ میں پیروں کو کھلا چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ اور جب کسی درجہ میں احرام کی رعایت کی گئی، تو اس کا اثر قیامت کے دن ظاہر ہونا لازمی ہے۔ اس لئے وہ قیامت کے دن تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھیں گے۔ اور خوشبو لگانے سے اس لئے منع کیا تھا کہ کفنانے والے احرام میں تھے۔ وہ خوشبو کو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ موطا (۱: ۳۲۷ باب تخمیر المحرم وجهه) میں روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحب زادے واقد کا حالتِ احرام میں انتقال ہوا، تو آپؓ نے ان کو عام مردوں کی طرح کفنایا، سر اور چہرہ بھی ڈھانکا۔ پھر فرمایا: لولا أنّا حُرُمٌ لَطَيَّبْنَاه: اگر ہم حالت احرام میں نہ ہوتے تو اس کو خوشبو بھی لگاتے واللہ اعلم۔

ساتواں مسئلہ: جس طرح غسلِ میت میں: غسل احیاء کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اسی طرح میت کو کفن دینے میں: اس زندہ شخص کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جو کپڑا اوڑھ کر سویا ہوا ہو۔ وہ دو کپڑے پہنے ہوئے اور ایک بڑی چادر اوڑھے ہوئے سوتا ہے۔ پس مرد کا کفن سنت بھی تین کپڑے ہے: تہبند، کرتا اور لفافہ (بڑی چادر) اور کفن کفایت حُلّہ (دو کپڑوں کا جوڑا) ہے یعنی تہبند اور لفافہ، کیونکہ آدمی کبھی کرتا نکال کر بھی سوتا ہے۔ اور عورت کا کفن بھی یہی ہے۔ البتہ کچھ کپڑے زائد ہیں۔ کیونکہ عورت زندگی میں پردہ پوشی کے لئے کچھ زائد کپڑے استعمال کرتی ہے یعنی وہ سر بند (اوڑھنی) اور سینہ بند بھی استعمال کرتی ہے۔ پس عورت کے لئے کفن سنت یہی پانچ کپڑے ہیں: تہبند، کرتا، اوڑھنی، سینہ بند اور لفافہ۔ اور کفن کفایت تین کپڑے ہیں۔ اور مرد وعورت دونوں کے لئے کفن ضرورت ایسا ایک کپڑا ہے جس میں ساری میت چھپ جائے۔ یا پھر جس قدر یا جو چیز دستیاب ہو جائے اسی میں کفن دیدیا جائے۔

[۱۶] قال النبيُّ صلى الله عليه وسلم في ابنته:" اغسِلْنها وترًا: ثلاثا، أو خمسًا، أوسبعًا، بماء وسِدْرٍ، واجعلنَ في الآخرة كافوراً" وقال:" ابْدَأْنَ بمَيَامِنِها، ومواضعِ الوضوءِ منها"

أقول:

[۱] الأصل في غُسل الموتى أن يُحمل على غُسل الأحياء، لأنه هو الذي كان يستعمله في حياته، وهو الذي يستعمله الغاسلون في أنفسهم، فلا شيئَ في تكريم الميت مثلُه.

[۲] وإنما أَمَرَ بالسدر، وزيادة الغَسَلاتِ: لأن المرض مظنة الأوساخ والرياح المنتنة؛

[۳] وإنما أَمَرَ بالكافور في الآخرة: لأن من خاصيته أن لايَسْرُع التغير فيما استُعمل، ويقال: من فوائده: أنه لايقرب منه حيوان مؤذٍ.

[٤] وإنما بُدئ بالميامن: ليكون غُسل الموتى بمنزلة غُسل الأحياء، وليحصل إكرام هذه الأعضاء.

[٥] وإنما جرت السنَّةُ في الشهيد: أن لايُغسل، ويُدفن في ثيابه ودمائه تَنْوِيهًا بما فعل،

وليتمثّل صــــورةُ بقاء عمله بادىَ الرأى، ولأن النفوس البشرية إذا فارقت أجسادها بقيت حساسةً، عالمةً بأنفسها، ويكون بعضُها مدرِكًا لما يُفعل بها، فإذا أُبقى أثرُ عملٍ مثلِ هذه كان إعانةً فى تَذَكُّرِ العمل وتمثُّلِه عندها، وهذا قوله صلى الله عليه وسلم:" جروحُهم تَدْمٰى: اللونُ لونُ الدم، والريحُ ريحُ المِسْك"

[٦] وَصَحَّ فِيْ المحرم ايضًا:" كفِّنوه فى ثوبيه، ولاتمسُّوه بطيب، ولاتُخَمِّروا رأسَهُ، فإنه يُبعث يومَ القيامة مُلَبِّيًا" فوجب المصير إليه؛ وإلى هذه النكتة أشار النبىُّ صلى الله عليه وسلم بقوله:" الميت يبعثُ فى ثيابه التى يموت فيها"

[٧] قوله والأصل فى التكفين: الشِبه بحال النائم المُسَجّى بثوبه؛ أكملُه فى الرجل: إزار، وقميص، وملحفة، أو حلةٌ؛ وفى المرأة: هذه مع زيادة مّا، لأنها يناسبها زيادة الستر.

ترجمہ: آنحضرت ﷺ کا ارشاد:......... میں کہتا ہوں:(۱) مُردوں کو نہلانے کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ محمول کیا جائے زندوں کو نہلانے پر۔ اس لئے کہ وہ مردہ خود اسی طرح نہایا کرتا تھا اپنی زندگی میں۔ اور وہی وہ طریقہ ہے جس کو نہانے والے استعمال کرتے ہیں اپنے لئے اور نہیں ہے کوئی چیز میت کی تکریم میں اس کے مانند (۲) اور بیری کے پتوں کا اور (تین سے) زائد بار دھونے کا حکم اسی وجہ سے دیا کہ بیماری مَیل کی اور بدبو کی احتمالی جگہ ہے (۳) اور آخری مرتبہ میں کافور کا حکم اسی لئے دیا کہ کافور کی خاصیت میں سے یہ بات ہے کہ تبدیلی جلدی نہیں آتی اس چیز میں جس میں وہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کہا گیا کہ اس کے فوائد میں سے یہ بات ہے کہ اس سے اذیت پہنچانے والے جانور قریب نہیں آتے (۴) اور دائیں جانب سے اسی لئے شروع کیا گیا تا کہ مُردوں کو نہلانا: زندوں کو نہلانے جیسا ہو۔ اور تا کہ حاصل ہو اعضاء کا احترام۔ (۵) اور شہید کے بارے میں یہی سنت جاری ہے کہ وہ نہلایا نہ جائے۔ اور دفن کیا جائے اس کے کپڑوں میں اور اس کے خون میں۔ عظمتِ شان ظاہر کرتے ہوئے اس کام کی جو اس نے کیا۔ اور تا کہ متمثل ہو اس کے عمل کے بقاء کی صورت سرسری نظر میں۔ اور اس لئے کہ انسانی ارواح جب اپنے اجسام سے جدا ہوتی ہیں تو بھی احساس کرنے والی باقی رہتی ہیں۔ اپنی ذات کو جاننے والی رہتی ہیں۔ اور بعض ارواح ادراک کرنے والی ہوتی ہیں اس معاملہ کو جو ان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پس جب باقی رکھا گیا اس کے اس جیسے عمل کا اثر تو ہوگا وہ مددگار عمل کے یاد رکھنے میں، اور عمل کے متمثل ہونے میں اس کے پاس۔ اور یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''شہداء کے زخم خون بہارہے ہوں گے: رنگ خون کا رنگ ہے۔ اور بو مشک کی خوشبو ہے''

(۶) اور ثابت ہوا ہے محرم کے بارے میں: ''کفناؤ تم اس کو اس کے دو کپڑوں میں۔ اور نہ لگاؤ تم اس کو خوشبو، اور نہ ڈھانکو تم اس کے سر کو، پس بیشک وہ اٹھایا جائے گا قیامت کے دن تلبیہ پڑھتا ہوا'' پس ضروری ہے اس حدیث کی طرف

لوٹنا۔ اور اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے نبی ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے: ''میت اٹھائی جائے گی اس کے ان کپڑوں میں جن میں اس کی موت ہوئی ہے''

(۷) اور کفنانے کے سلسلہ میں بنیادی بات: کپڑا اوڑھ کر سوئے ہوئے شخص کی حالت کے ساتھ مشابہت ہے۔ اور کامل ترین کفن مرد کے لئے: تہبند اور کرتا اور لفافہ (بڑی چادر) ہے۔ یا حُلّہ (جوڑا) ہے۔ اور عورت میں یہی کچھ زیادتی کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ عورت کے لئے پردہ کی زیادتی مناسب ہے۔

☆ ☆ ☆

کفن میں اعتدال کا حکم

حدیث ــــ میں ہے: ''کفن میں مبالغہ نہ کرو، کیونکہ اسے جلد سڑ گل جانا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۳۹)

تشریح: اس ارشاد کے دو مقصد ہیں:

پہلا مقصد: افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کی راہ اپنائی جائے۔ افراط: یہ ہے کہ مسنون تعداد سے زیادہ کپڑوں میں کفن دیا جائے یا کفن میں بیش قیمت کپڑا استعمال کیا جائے۔ اور تفریط: یہ ہے کہ استطاعت کے باوجود مسنون تعداد سے کم کپڑوں میں کفن دیا جائے یا پھٹے پرانے رَدّی کپڑوں میں کفن دیا جائے۔ اور اعتدال کی راہ یہ ہے کہ مسنون تعداد میں اور درمیانی قیمت کے کپڑے میں کفن دیا جائے۔

دوسرا مقصد: یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں میں جو کفن میں مبالغہ کرنے کی عادت تھی اس سے لوگ بچیں۔

تدفین میں جلدی کرنے کی حکمت

حدیث ــــ میں ہے: ''جنازے کو جلدی لے چلو۔ کیونکہ جنازہ اگر نیک آدمی کا ہے تو تم جلدی اس کو خیر سے ہم آغوش کروگے۔ اور اگر وہ اس کے سوا ہے، تو تم جلدی ایک بدی کو اپنے کندھوں سے اُتاروگے'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۴۶)

تشریح: تدفین میں جلدی کرنے کے دو سبب ہیں:

پہلا سبب: تدفین میں دیر کی جائے گی تو اندیشہ ہے کہ میت کا جسم بگڑنے لگے۔

دوسرا سبب: تدفین میں دیر کی جائے گی تو اعزاء کی بے چینی میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ جب وہ میت کو دیکھیں گے تو ان کا صدمہ بڑھے گا۔ اور میت نظروں سے اوجھل ہوجائے گی، تو ان کی توجہ بٹ جائے گی، اور غم ہلکا پڑے گا۔

اور آنحضرت ﷺ نے ایک مختصر جامع ارشاد میں دونوں سببوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ: ''مسلمان کی لاش کے لئے مناسب نہیں کہ اس کو اس کے اہل وعیال کے درمیان روکے رکھا جائے'' (ابوداؤد حدیث ۳۱۵۹) جیفہ کے معنی

ہیں: مردہ بدبودار جثہ۔ اس لفظ میں پہلے سبب کی طرف اشارہ ہے کہ تدفین میں دیر کی جائے گی تو میت جیفہ بن جائے گی۔ اور ''اہل وعیال کے درمیان'' میں دوسرے سبب کی طرف اشارہ ہے۔

[۱۷] قوله صلى الله عليه وسلم: " لاتُغَالُوا في الكفن، فإنه يُسْلَب سلبًا سريعًا" أراد العدل بين الإفراط والتفريط، وأن لاينتحلوا عادةَ الجاهلية في المغالاة.

[۱۸] قوله صلى الله عليه وسلم: "أَسْرِعوا بالجنازة، فإنها إن تلك صالحة" إلخ.

أقول: السبب في ذلك: أن الإبطاء مظنةُ فسادِ جُثَّةِ الميت، وقَلَقِ الأولياء، فإنهم متى مارَأَوْا الـميتَ اشتدت موجدتُهم، وإذا غاب منهم اشتغلوا عنه، وقد أشار النبيُّ صلى الله عليه وسلم إلى كلا السببين في كلمة واحدة، حيث قال: " لاينبغي لجيفة مسلم أن تُحْبَس بين ظَهْرَانَيْ أَهْلِه"

ترجمہ: (۱۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہ حد سے بڑھو کفن میں۔ پس بیشک وہ چھین لیا جائے گا جلدی چھین لیا جانا'' چاہا آپؐ نے افراط وتفریط کے درمیان اعتدال اور یہ کہ نہ اپنائیں لوگ مبالغہ کرنے میں جاہلیت کی ریت۔

(۱۸) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جلدی لے چلو تم جنازے کو، پس بیشک وہ اگر نیک ہے'' آخر تک: میں کہتا ہوں: اس کا سبب یہ ہے کہ دیر کرنا میت کی باڈی کے بگڑنے کی اور پسماندگان کی بے چینی کی احتمالی جگہ ہے۔ پس بیشک اعزاء جب دیکھیں گے میت کو تو بڑھ جائے گا ان کا غم۔ اور جب اوجھل ہو جائے گی ان سے تو ان کی توجہ اس سے ہٹ جائے گی۔ اور تحقیق نبی ﷺ نے دونوں ہی سببوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ایک ہی جملہ میں۔ چنانچہ فرمایا آپؐ نے: ''مسلمان کی لاش کے لئے مناسب نہیں کہ وہ روک رکھی جائے اس کے اہل وعیال کے درمیان''

☆ ☆ ☆

جنازہ واقعی گفتگو کرتا ہے

حدیث ـــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب جنازہ تیار کیا جاتا ہے، اور لوگ اس کو اپنی گردنوں پر اٹھا کر لے چلتے ہیں: تو اگر جنازہ نیک ہوتا ہے تو کہتا ہے: مجھے جلدی لے چلو۔ اور اگر وہ غیر صالح ہوتا ہے تو اپنے لوگوں سے کہتا ہے: تمہارا ناس ہو! تم اس کو (یعنی مجھے) کہاں لے چلے! جنازہ کی یہ آواز ہر چیز سنتی ہے، انسان کے علاوہ۔ اور انسان اگر سن لے تو بے ہوش ہو جائے'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۴۷)

تشریح: اس حدیث میں میت کی جس گفتگو کا ذکر ہے: وہ حقیقت ہے، مجاز نہیں ہے۔ کچھ ارواح (یہ حیوانات کی ارواح سے احتراز ہے) جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی اُن معاملات کو محسوس کرتی ہیں جو ان کے اجسام کے ساتھ کیا

جاتا ہے۔مگر وہ روحانی گفتگو ہوتی ہے۔معروف کانوں سے نہیں سنی جاسکتی۔صرف وجدانی علوم ہی سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔اور دلیل حدیث کا یہ جملہ ہے کہ:"انسان کے علاوہ" دیگر مخلوقات وہ گفتگو سنتی ہیں۔معلوم ہوا کہ حدیث میں بیانِ واقعہ ہے تمثیل اور پیرایۂ بیان نہیں ہے۔

جنازہ کے ساتھ جانے کی حکمت

حدیث ـــــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"جو شخص ایمان ویقین اور بہ امید ثواب کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے۔اور اس وقت تک اس کے ساتھ رہے کہ نماز پڑھی جائے۔اور اس کے دفن سے فراغت ہوجائے،تو وہ ثواب کے دو قیراط لے کر لوٹتا ہے۔ہر قیراط اُحد پہاڑ کے بقدر ہوتا ہے۔اور جو صرف نماز جنازہ پڑھ کر لوٹ آئے،وہ ثواب کا ایک قیراط لے کر لوٹتا ہے"(مشکوۃ حدیث ۱۶۵۱)

تشریح:جنازہ کے ساتھ جانا چار وجوہ سے مشروع کیا گیا ہے:

پہلی وجہ:میت کی تکریم مقصود ہے یعنی جس طرح معزز مہمان کو رخصت کرنے کے لئے تھوڑی دور تک ساتھ جایا جاتا ہے،میت کے ساتھ جانے میں بھی اس کی تکریم ہے۔

دوسری وجہ:میت کے اولیاء(پسماندگان)کی دلجوئی مقصود ہے یعنی جنازہ کے ساتھ جانے سے ورثاء کے ساتھ درد اور غم میں شرکت کا اظہار ہوتا ہے۔

تیسری وجہ:یہ ایک طریقہ ہے نیک بندوں کے جمع ہونے کا،اور میت کے لئے دعا کرنے کا یعنی اس بہانے لوگ جمع ہوجاتے ہیں اور میت کا جنازہ پڑھتے ہیں اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

چوتھی وجہ:میت کو دفن کرنے میں ورثاء کی امداد واعانت مقصود ہے۔اور اسی مقصد سے نبی ﷺ نے دو حکم اور بھی دیئے ہیں:

ایک:دفن سے فارغ ہونے تک جنازہ کے ساتھ رہنے کی ترغیب دی ہے۔تاکہ ہر شخص قبر تیار کرنے میں حصہ لے اور اولیاء کا کام آسان ہوجائے۔مذکورہ حدیث میں جو ثواب کے دو قیراطوں کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے،اس کا یہی منشا ہے۔پس جو لوگ مٹی دیکر،قبر تیار ہونے سے پہلے لوٹ جاتے ہیں:وہ شریعت کے منشا کی تکمیل نہیں کرتے۔

دوسرا حکم:یہ دیا ہے کہ جب تک جنازہ زمین پر نہ اتر جائے،لوگوں کو بیٹھنا نہیں چاہئے،تاکہ جنازہ اتارتے وقت مزید آدمیوں کی مدد درکار ہو تو فوری اعانت کی جاسکے۔یہ حکم بھی اولیاء کی اعانت کے لئے ہے۔

فائدہ:قیراط:درہم کے بارہویں حصہ کا نام ہے۔چونکہ دور نبوی میں مزدوروں کو اُن کے کام کی اجرت قیراطوں کے حساب سے دی جاتی تھی،اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بھی اس موقع پر قیراط کا لفظ بولا۔اور واضح فرمایا کہ یہ دنیا کا

قیراط نہیں ہے۔ بلکہ آخرت کا ہے۔ اور جس طرح آخرت کا دن یہاں کے دنوں سے بڑا ہوتا ہے، اسی طرح وہاں کا قیراط بھی اُحُد پہاڑ کے برابر ہوگا۔

فائدہ: جنازہ کے ساتھ جانا، رشتہ داری وغیرہ تعلقات کی وجہ سے تو آسان کام ہے۔ مگر کسی تعلق کے بغیر محض اسلامی اخوت کی بنیاد پر ساتھ جانا بعض مرتبہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو آسان بنانے کا فارمولہ: ''ایمان واحتساب'' ذکر کیا۔

جنازہ دیکھ کر پہلے کھڑے ہونے کی پھر کھڑے نہ ہونے کی حکمت

حدیث —— حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک جنازہ گذرا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ صحابہ بھی کھڑے ہوگئے۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ ایک یہودی عورت کا جنازہ ہے! یعنی مسلمان کا جنازہ نہیں ہے کہ اس کی تکریم کے لئے کھڑا ہوا جائے۔ آپؐ نے فرمایا: ''موت ایک گھبراہٹ ہے، پس جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہوجاؤ'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۱۶۴۹)

حدیث —— حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: **إذا رأیتم الجنازةَ فقوموا، فمن تَبِعَها فلا يَقْعُدْ حتى تُوْضَعَ**: جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہوجاؤ۔ پھر جو جنازہ کے ساتھ جائے وہ اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک جنازہ رکھ نہ دیا جائے (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۱۶۴۸)

حدیث —— حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ کھڑے ہوئے تو ہم بھی کھڑے ہوئے۔ اور بیٹھے تو ہم بھی بیٹھے (رواہ مسلم) اور موطا اور ابوداؤد کی روایت میں ہے: ''آپؐ جنازہ میں کھڑے ہوئے۔ پھر بعد میں بیٹھے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۵۰) اور مسند احمد (۱:۸۲) کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جنازہ میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ پھر آپؐ اس کے بعد بیٹھے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۸۲)

تشریح: جنازہ دیکھ کر کھڑے ہونے کا حکم پہلے تھا بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا ہے۔ نسخ کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت ہے۔ شاہ صاحب دونوں کی حکمتیں بیان کرتے ہیں کہ پہلے جب یہ حکم تھا تو اس کی کیا حکمت تھی۔ پھر کس حکمت سے یہ حکم ختم کردیا گیا؟ فرماتے ہیں:

جب جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا مشروع تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ موت کو یاد کرنا جو زندگی کا مزہ مٹانے والی ہے، اور بھائیوں کی موت سے عبرت پکڑنا امر مطلوب ہے۔ مگر چونکہ یہ امر مخفی تھا۔ یعنی کس نے عبرت پکڑی اور کس نے نہیں پکڑی اس کا پتہ چلانا مشکل تھا۔ اس لئے نبی ﷺ نے جنازہ کے لئے کھڑا ہونا متعین کیا۔ تاکہ موت سے لوگوں کی عبرت پذیری کا اندازہ ہوجائے۔ مگر پہلے بھی یہ حکم واجب نہیں تھا۔ نہ اب یہ معمول بہ سنت ہے (بلکہ منسوخ ہے)

پھر جب یہ حکم منسوخ کردیا گیا تو نسخ کی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں قیام تعظیمی کا رواج تھا۔ شریعت میں ایسا قیام ممنوع ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے: لاتقوموا کما یقوم الأعاجمُ: یُعَظِّمُ بعضُها بعضًا یعنی تم کھڑے نہ ہوا کرو جس طرح عجمی لوگ کھڑے ہوتے ہیں، اور وہ اس طرح ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا عبرت پذیری کے لئے ہے، تعظیم کے لئے نہیں ہے۔ مگر آنحضرت ﷺ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں لوگ جنازہ کے لئے کھڑے ہونے کو غیر محل میں استعمال نہ کرنے لگیں یعنی ممکن ہے وہ یہ خیال کرنے لگیں کہ جب مُردے کے لئے کھڑے ہونے کا حکم ہے تو زندے تو اس کے بدرجۂ اولی مستحق ہیں۔ اور اس طرح ایک ناجائز چیز کا رواج چل پڑے۔ اس لئے فساد کا دروازہ بند کرنے کے لئے جنازہ کے لئے قیام ختم کردیا گیا۔ واللہ اعلم۔

[١٩] قوله عليه السلام:" فإن كانت صالحةً " إلخ

أقول: هذا عندنا محمول على حقيقته؛ وبعضُ النفوس: إذا فارقت أجسادَها تُحِسُّ بما يُفعل بجسدها، وتتكلَّم بكلام روحاني، إنما يُفهم من الترشح على النفوس، دون المألوف عند الناس: من الاستماع بالأُذُن، وذلك قوله صلى الله عليه وسلم:" إلا الإنسان"

[٢٠] قوله صلى الله عليه وسلم:" مَنِ اتَّبع جنازةَ مسلم إيمانا واحتسابًا" إلخ.

أقول: السر في شرع الاتباع: إكرام الميت، وجَبْرُ قلوب الأولياء، وليكون طريقًا إلى اجتماع أمَّة صالحة من المؤمنين للدعاء له، وتعرضًا لمعاونة الأولياء في الدفن، ولذلك رغَّب في الوقوف لها إلى أن يُفرغ من الدفن، ونهى عن القعود حتى توضع.

[٢١] قوله صلى الله عليه وسلم:" إن الموتَ فَزَعٌ، فإذا رأيتم الجنازة فقوموا"

أقول: لما كان ذكر هاذم اللذّات، والاتعاظُ من انقراض حياة الأخوان مطلوبًا، وكان أمرًا خفيًا: لايُدرى العاملُ به من التارك له، ضَبَطَ بالقيام لها، ولكنه صلى الله عليه وسلم لم يَعْزِم عليه، ولم يكن سنةً قائمةً، وقيل: منسوخ؛ وعلى هذا: فالسر في النسخ: أنه كان أهل الجاهلية يفعلون أفعالاً مشابهة بالقيام، فخشي أن يُحمل ذلك على غير مَحمله فيُفتح بابُ الممنوعات، واللّٰهُ أعلم.

ترجمہ: (۱۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پس اگر جنازہ نیک آدمی کا ہوتا ہے'' آخر تک: میں کہتا ہوں: یہ حدیث ہمارے نزدیک اس کے حقیقی معنی پر محمول ہے۔ اور بعض ارواح: جب وہ اپنے اجسام سے جدا ہوتی ہیں تو وہ محسوس کرتی ہیں اس بات کو جو ان کے جسموں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اور وہ روحانی کلام کرتی ہیں۔ جو نفوس پر (علوم

کے) نکلنے کے ذریعہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کے نزدیک مانوس ذرائع سے یعنی کانوں سے سننے کے ذریعہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''انسان کے علاوہ''

(۲۰) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جو کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ گیا، ایمان اور ثواب کی امید سے'' آخر تک۔ میں کہتا ہوں: جنازہ کی پیروی مشروع کرنے میں راز: (۱) میت کا اکرام (۲) اولیاء کے دلوں کی ڈھارس ہے (۳) اور تاکہ ہو وہ راہ مؤمنین کے ایک معتد بہ گروہ کے جمع ہونے کی میت کے لئے دعا کرنے کے لئے (۴) اور تاکہ ہو وہ تعرض دفن میں اولیاء کی معاونت کے لئے۔ اور اسی وجہ سے ترغیب دی آپؐ نے ٹھہرنے کی جنازہ کے لئے یہاں تک کہ دفن سے فارغ ہوجائے۔ اور منع کیا بیٹھنے سے یہاں تک کہ جنازہ اتار دیا جائے۔

(۲۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: جب لذتوں کو توڑنے والی موت کا یاد کرنا اور بھائیوں کی زندگی کے ختم ہونے سے عبرت پکڑنا مطلوب تھا، اور وہ ایک پوشیدہ امر تھا: نہیں جانا جاتا اس پر عمل کرنے والا، اس کو چھوڑنے والے سے تو منضبط کیا جنازے کے لئے کھڑے ہونے کے ذریعہ۔ مگر آپؐ نے اس امر کو پختہ نہیں کیا اور نہیں ہے وہ کھڑا ہونا معمول بہ سنت۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ حکم منسوخ ہے۔ اور اس قول پر: پس نسخ کا راز یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ کچھ کام کیا کرتے تھے قیام سے ملتے جلتے (یعنی زندوں کے لئے قیام تعظیمی کیا کرتے تھے، جو جنازہ کے لئے قیام سے ملتا جلتا ہے) پس آپؐ نے اندیشہ محسوس کیا کہ یہ چیز یعنی جنازہ کے لئے کھڑا ہونا محمول کیا جائے اس کے غیر محل پر (یعنی کہیں لوگ اس سے قیام تعظیمی کا جواز نہ نکال لیں) پس کھول دیا جائے ممنوعات کا دروازہ (یعنی ناجائز قیام تعظیمی کا سلسلہ شروع ہوجائے) واللہ اعلم۔

☆ ☆ ☆

نماز جنازہ کا طریقہ اور دعائیں

نماز جنازہ: میت کے لئے اجتماعی دعا کرنے کے لئے مشروع کی گئی ہے۔ کیونکہ مؤمنین کے ایک گروہ کا اکٹھا ہوکر میت کے لئے دعائے مغفرت کرنا: عجیب تاثیر رکھتا ہے۔ میت پر رحمت الٰہی کے نزول میں دیر نہیں لگتی۔ یعنی انفرادی دعا کی بہ نسبت اجتماعی دعا میں قبولیت کی شان زیادہ ہے۔

اور نماز جنازہ کا طریقہ: یہ ہے کہ امام اس طرح کھڑا ہو کہ میت اس کے اور قبلہ کے درمیان ہو۔ اور لوگ امام کے پیچھے صفیں بنائیں۔ پھر امام چار تکبیریں کہے: پہلی تکبیر کے بعد حمد وثنا کرے (امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک) یا سورۂ فاتحہ پڑھے (امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک) اور دوسری تکبیر کے بعد درود شریف پڑھے۔ یہ دونوں چیزیں دعا کی تمہید ہیں۔ اور تیسری تکبیر کے بعد میت کے لئے دعا کرے (اور مقتدی بھی یہی عمل کریں) پھر

چوتھی تکبیر کہہ کر سلام پھیر دیں (اور چونکہ نماز جنازہ خود دعا ہے، اس لئے سلام کے بعد دعا نہ کریں)

اور روایات میں اگر چہ اختلاف ہے کہ نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہی جائیں یا پانچ؟ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں چار تکبیروں پر اتفاق ہو گیا ہے۔ جمہور صحابہ وتابعین اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔

اور اس امر میں بھی اختلاف ہوا ہے کہ نماز جنازہ میں قراءت ہے یا نہیں؟ دو اماموں کے نزدیک سورۂ فاتحہ پڑھنا سنت ہے۔ اور دو اماموں کے نزدیک سنت نہیں ہے۔ البتہ ان کے نزدیک ثنا کی نیت سے فاتحہ پڑھنا جائز ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں

مسنون طریقہ فاتحہ پڑھنا ہے کیونکہ فاتحہ: بہترین اور جامع دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے بندوں کو یہ دعا سکھلائی ہے اور تیسری تکبیر کے بعد رسول اللہ ﷺ جو دعائیں پڑھتے تھے۔ ان میں سے تین دعائیں درج ذیل ہیں (ان میں سے جونسی دعا چاہے پڑھے، اور ایک سے زائد دعاؤں کو جمع بھی کر سکتا ہے)

پہلی دعا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کوئی جنازہ پڑھتے تو اس میں یوں دعا کرتے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا، وَشَاھِدِنَا وَغَائِبِنَا، وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا، وَذَکَرِنَا وَأُنْثَانَا، اَللّٰھُمَّ مَنْ أَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَأَحْیِہٖ عَلَی الْإِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْإِیْمَانِ، اَللّٰھُمَّ لَاتَحْرِمْنَا أَجْرَہٗ، وَلَاتَفْتِنَّا بَعْدَہٗ (اے اللہ! ہمارے زندوں اور مُردوں کی، حاضرین اور غائبین کی۔ چھوٹوں اور بڑوں کی۔ مَردوں اور عورتوں کی: مغفرت فرما! اے اللہ! جس کو آپ ہم میں سے زندہ رکھیں، اس کو اسلام پر قائم رکھتے ہوئے زندہ رکھیں۔ اور جس کو آپ اس عالم سے اٹھالیں، اس کو ایمان کی حالت میں اٹھائیں۔ اے اللہ! اس میت کے اجر سے ہمیں محروم نہ کر یعنی اس کی وفات کے حادثہ سے جو ہمیں غم پہنچا ہے اور اس پر جو ہم نے صبر کیا ہے اس کے ثواب سے ہمیں محروم نہ فرما۔ اور اس کے بعد ہمیں کسی فتنہ میں مبتلا نہ فرما! یعنی گمراہی سے بچا!) (مشکوۃ حدیث ۱۶۷۵)

دوسری دعا: حضرت واثلۃ رضی اللہ عنہ نے ایک نماز جنازہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا پڑھتے سنا: اَللّٰھُمَّ إِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ فِیْ ذِمَّتِکَ وَحَبْلِ جِوَارِکَ، فَقِہٖ مِنْ فِتْنَۃِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ، وَأَنْتَ أَھْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ، وَارْحَمْہُ، إِنَّکَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (اے اللہ! بیشک فلاں بن فلاں آپ کی ذمہ داری میں اور آپ کی پناہ کی رسّی یعنی امان میں ہے۔ پس آپ اس کو قبر کے عذاب اور دوزخ کے عذاب سے بچائیں۔ اور آپ وعدہ وفا کرنے والے اور برحق وعدہ والے ہیں۔ اے اللہ! آپ اس کی مغفرت فرمائیں اور اس پر مہربانی فرمائیں۔ بیشک آپ ہی بڑے بخشنے والے، نہایت رحم کرنے والے ہیں) (فلان بن فلان کی جگہ میں میت کا اور اس کے باپ کا نام لے (مشکوۃ حدیث ۱۶۷۷)

تیسری دعا: عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک نماز جنازہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا پڑھتے سنا: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ، وَارْحَمْہُ، وَعَافِہٖ، وَاعْفُ عَنْہُ، وَأَکْرِمْ نُزُلَہٗ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَہٗ، وَاغْسِلْہُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّہٖ مِنَ

الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِنْ دَارِهِ، وَأَهْلًا خَيْرًا مِنْ أَهْلِهِ، وَزَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهِ، وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ، وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ اور ایک روایت میں أَعِذْهُ إلخ کی جگہ ہے: وَقِهِ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ (اے اللہ! اس میت کی مغفرت فرما۔ اس پر رحم فرما۔ اس کو مکروہات سے بچا۔ اس سے درگذر فرما۔ اس کی باعزت مہمانی فرما۔ اس کی قبر کو کشادہ فرما۔ اس کو پانی، برف اور اولے سے دھو ڈال۔ اور خطاؤں سے ایسا ستھرا کر دے جیسا سفید کپڑے کو میل سے ستھرا کرتا ہے۔ اور اس کو دنیا کے گھر سے اچھا گھر، دنیا کے گھر والوں سے اچھے گھر والے اور دنیا کی بیوی سے اچھی بیوی عطا فرما۔ اور اس کو جنت میں داخل فرما اور قبر کے عذاب سے اور دوزخ کے عذاب سے پناہ میں لے لے (اور اس کو قبر کی آزمائش اور دوزخ کے عذاب سے بچا) (مشکوۃ حدیث ۱۶۵۵)

[۲۲] وإنما شُرعت الصلاةُ على الميت: لأن اجتماع أمة من المؤمنين، شافعين للميت، له تأثير بليغ في نزول الرحمة عليه.

وصفة الصلاة عليه: أن يقومَ الإمام بحيث يكون الميت بينه وبين القبلة، ويصطفُّ الناس خلفه، ويكبر أربع تكبيرات، يدعو فيها للميت، ثم يسلِّم؛ وهذا ما تقرَّر في زمان عمر رضي الله عنه، واتفق عليه جماهير الصحابة ومن بعدهم، وإن كانت الأحاديث متخالفة في الباب.

ومن السنَّة قراءة فاتحة الكتاب، لأنها خير الأدعية وأجمعُها، علَّمها الله تعالى عبادَه في محكم كتابه.

ومما حُفِظَ من دعاء النبيِّ صلى الله عليه وسلم على الميت:

[۱] "اللهم اغفر لحينا وميتنا، وشاهدنا وغائبنا، وصغيرنا وكبيرنا، وذكرنا وأنثانا، اللهم من أحييته منا فأحيه على الإسلام، ومن توفيته منا فتوفه على الإيمان، اللهم لاتحرمنا أجره، ولا تفتنا بعده"

[۲] و" اللهم إن فلانَ بنَ فلانٍ في ذمتك، وحَبْلِ جِوَارِكَ، فقِهِ من فتنة القبر وعذاب النار، وأنت أهلُ الوفاء والحقِّ، اللهم اغفر له وارحمه، إنك أنت الغفور الرحيم"

[۳] و" اللهم اغفر له، وارحمه، وعافِهِ، واعفُ عنه، وأكرم نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَه، واغسله بالماء والثلج والبرد، ونَقِّهِ من الخطايا كما نقيتَ الثوبَ الأبيضَ من الدَّنسِ، وأبدِلْه دارًا خيرًا من داره، وأهلاً خيرًا من أهله، وزوجًا خيرًا من زوجه، وأدخِلْهُ الجنةَ، وأَعِذْهُ من عذاب القبر، ومن عذاب النار" وفي رواية:" وقِهِ فتنةَ القبر وعذابِ النار"

ترجمہ: (۲۲) اور جنازہ کی نماز صرف اس لئے مشروع کی گئی ہے کہ مؤمنین کے ایک گروہ کا اکٹھا ہونا، درانحالیکہ وہ سفارش کرنے والے ہوں میت کے لئے: اس کے لئے کارِ تاثیر ہے میت پر رحمت کے نزول میں ——— اور میت پر نماز کا طریقہ: یہ ہے کہ امام کھڑا ہو بایں طور کہ میت اس کے اور قبلہ کے درمیان ہو۔ اور لوگ امام کے پیچھے صفیں بنائیں۔ اور امام چار تکبیریں کہے۔ دعا کرے وہ نماز میں میت کے لئے، پھر سلام پھیرے۔ اور یہی وہ بات ہے جو طے پائی ہے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اور اس پر اتفاق کیا ہے جمہور صحابہ نے۔ اور ان کے بعد کے حضرات نے۔ اگرچہ احادیث اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔

اور سورۂ فاتحہ پڑھنا مسنون ہے۔ کیونکہ وہ بہترین اور جامع ترین دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ دعا اپنے بندوں کو سکھلائی ہے ——— اور ان دعاؤں میں سے جو میت پر نبی ﷺ کی دعاؤں میں سے محفوظ کی گئی ہیں۔ یہ ہیں ——— (دعاؤں کا ترجمہ اوپر آ گیا ہے)

بزرگ شخصیت کا یا بڑی جماعت کا جنازہ پڑھنا باعثِ بخشش ہے

حدیث ——— ایک حبشن مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ اس کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں نے جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع نہ کی۔ جب آپؐ کو پتہ چلا تو آپؐ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور نماز پڑھی۔ اور فرمایا: ''یہ قبریں مُردوں پر تاریکی سے پُر ہوتی ہیں۔ میرے ان پر نماز پڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُن قبروں کو مُردوں پر روشن کرتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۵۹)

حدیث ——— حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: ''جس مسلمان کا بھی انتقال ہو، اور اس کے جنازے کی نماز چالیس ایسے آدمی پڑھیں، جن کی زندگی شرک کی گندگی سے پاک ہو، تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش (دعائے مغفرت) اس میت کے حق میں قبول فرماتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۶۰)

حدیث ——— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے: رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے: ''جس مسلمان پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نمازِ جنازہ پڑھے، جن کی تعداد سو تک پہنچ جائے۔ اور وہ سب اس میت کے لئے سفارش کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش قبول فرماتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۶۱)

حدیث ——— حضرت مالک بن ہُبیرہ رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: ''جس مسلمان کا انتقال ہو جائے، اور مسلمانوں کی تین صفیں اس کی نماز جنازہ پڑھیں تو وہ جنت کو اس کے لئے واجب کر دیتا ہے (مشکوۃ حدیث ۱۶۸۷) مراد: مسجد نبوی سے باہر جو جنازہ پڑھنے کی جگہ بنائی گئی تھی اس کی تین صفیں ہیں۔ جن میں تقریباً سو آدمی

سماتے تھے۔ اور حضرت مالک رضی اللہ عنہ جو تھوڑے لوگوں کی بھی تین صفیں بناتے تھے، تو وہ ایک صحابی کی تاویل بعید ہے، پس وہ مقبول ہے[1] (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۲:۵۵۱)

تشریح: دعا انہی لوگوں کی مؤثر ہوتی ہے جن کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک قدر و منزلت ہے۔ ایسے لوگوں کی دعا حجابات کو چیر کر نزولِ رحمت کو تیار کرتی ہے۔ جیسے بارش طلب کرنے میں یعنی جب قحط سالی ہوتی تھی تو لوگ نبی ﷺ سے بارش کی دعا کرایا کرتے تھے۔ حالانکہ لوگ خود بھی دعا کر سکتے تھے، اللہ پاک تو سب کی سنتے ہیں۔ مگر صحابہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ کی دعا کی بات کچھ اور ہے[2]۔ نیز بارش طلب کرنے کے لئے لوگ اکٹھے ہو کر دعا کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی جگہ بھی دعا کر سکتے ہیں۔ مگر اکٹھا ہو کر اس لئے دعا کرتے ہیں کہ اجتماعی دعا کی شان ہی کچھ اور ہے۔ پس ضروری ہوا کہ دو امروں میں سے کسی ایک کی ترغیب دی جائے: یا تو کوئی ایسی شخصیت جنازہ پڑھائے جو اپنی ذات میں انجمن ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی ہستی ایک ایسی ہی ہستی تھی۔ یا پھر مسلمانوں کا ایک انبوہ نماز جنازہ پڑھے۔ پہلی روایت کا تعلق پہلی بات سے ہے۔ اور باقی روایات کا تعلق دوسری بات سے ہے۔

فائدہ: اگر کوئی بزرگ شخصیت موجود ہو تو اس سے جنازہ پڑھوایا جائے۔ ورنہ مناسب طریقہ پر نمازیوں کی کثرت کا اہتمام کیا جائے۔ اوپر جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی چالیس آدمیوں کے جنازہ پڑھنے کی روایت آئی ہے، وہ آپؓ نے اس موقعہ پر بیان کی ہے، جب آپ کے صاحب زادے کا مقام قُدید یا مقام عُسفان میں انتقال ہو گیا تھا۔ آپ نے اپنے خادم کُریب سے فرمایا: ذرا دیکھو کتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں؟ کریب نے بتلایا: کافی لوگ جمع ہو گئے ہیں! آپؓ نے پوچھا: چالیس ہوں گے؟ کریب نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: اب جنازہ باہر لے چلو، پھر مذکورہ حدیث سنائی۔ غرض حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نمازیوں کی کثرت کا اہتمام فرمایا ہے۔

[۲۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن هذه القبور مملوءة ظُلْمَةً على أهلها، وإن الله يُنَوِّرُها لهم بصلاتي عليهم" وقوله صلى الله عليه وسلم: " ما من مسلم يموت، فيقوم على جنازته أربعون رجلاً، لايشركون بالله شيئاً، إلا شَفَّعهم الله فيه" وفي رواية: " يصلِّي عليه أمة من

[1] اور حضرت مالک بن ہُبیرہ رضی اللہ عنہ نے یہ تاویل بامید رحمت کی ہے۔ کیونکہ رحمتِ حق بہانہ می جوید، بہانہ می جوید۔ اور اس کی نظیر: میت کی نمازوں کا فدیہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی نص نہیں، مگر بامیدِ فضل یہ فقہاء فدیہ تجویز کیا ہے ۱۲

[2] اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں بارش کی دعا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کرائی تھی۔ بخاری شریف حدیث (۱۰۱۰) کی شرح میں عمدۃ القاری میں اس کی پوری وضاحت ہے۔ اس حدیث کا تعلق معروف توسل کے مسئلہ سے نہیں ہے۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ اگر اموات کا توسل جائز ہوتا تو حضرت عمرؓ نبی ﷺ کا توسل چھوڑ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا توسل کیوں کرتے؟ یہ ایک بے معنی بات ہے۔ یہ لوگ واقعہ کی صحیح نوعیت سے واقف نہیں۔ محض بخاری شریف کے الفاظ سامنے رکھ کر بات کرتے ہیں ۱۲

المسلمين يبلغون مائة"

أقول: لما كان المؤثر هو الدعاء ممن له بالٌ عند الله، ليخرق دعاؤه الحجبَ، ويُعَدُّ لنزول الرحمة، بمنزلة الاستسقاء: وجب أن يرغَّب في أحد الأمرين: أن يكون من نفس عالية، تُعَدُّ أمةً من الناس، أو جماعةٍ عظيمة.

ترجمہ: (۲۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:......... میں کہتا ہوں: جب تھی اثر انداز ہونے والی وہ دعا جو اس شخص کی طرف سے ہو جس کے لئے کچھ اہمیت ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک۔ تاکہ پھاڑے اس کی دعا پردوں کو، اور تیار کرے وہ رحمت کے نزول کو، طلب باراں کے بمنزلہ۔ تو ضروری ہوا کہ ترغیب دی جائے دو چیزوں میں سے کسی ایک کی: یا ہو دعا ایسے بلند آدمی سے جو لوگوں کی ایک بڑی جماعت شمار کیا جاتا ہو یا کوئی بڑی جماعت دعا کرے۔

☆ ☆ ☆

نیک لوگوں کی گواہی جنت یا جہنم کو واجب کرتی ہے

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ ایک جنازہ لے کر گذرے، صحابہ نے اس کا ذکر خیر کیا، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''واجب ہوئی!'' پھر دوسرے موقعہ پر لوگ ایک جنازہ لے کر گذرے، صحابہ نے اس کی برائی کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''واجب ہوئی!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ''کیا چیز واجب ہوئی؟'' آپؐ نے فرمایا: ''جس کی آپ لوگوں نے تعریف کی، اس کے لئے جنت واجب ہوئی، اور جس کی برائی کی، اس کے لئے جہنم واجب ہوئی۔ تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۶۲)

تشریح: احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو ملأ اعلیٰ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر ملأ اعلیٰ سے ملأ سافل میں قبولیت اترتی ہے۔ پھر نیک لوگوں کی طرف آتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت کرتے ہیں، تو نفرت بھی اسی طرح اترتی ہے (رحمۃ اللہ ۱: ۲۰۷)

پس جس مسلمان کے لئے صالحین کی ایک جماعت خیر کی گواہی دے ـــــ بشرطیکہ وہ گواہی دل کی گہرائی سے ہو، اُوپری دل سے نہ ہو اور بغیر ریاء کے ہو، نمائشی نہ ہو اور ریت رواج کے موافق نہ ہو، کیونکہ رواجی طور پر تو ہر مرنے والے کو پسماندگان کی دلداری کے لئے اچھا ہی کہا جاتا ہے ـــــ تو یہ شہادت اس میت کے ناجی ہونے کی نشانی ہے یعنی قطعی بات تو نہیں ہے البتہ علامت ضرور ہے۔ اسی طرح جب صالحین کسی میت کی برائی کریں تو وہ اس کے تباہ ہونے کی علامت ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صالحین کے دلوں میں یہ باتیں غیب سے ڈالی گئی ہیں۔ حدیث کے آخری جملہ میں اس کی

وضاحت ہے۔فرمایا:''تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو''یعنی اللہ کی طرف سے یہ باتیں مؤمنین صالحین کو الہام کی جاتی ہیں۔اوران کی زبانیں غیب کی ترجمانی کرتی ہیں۔پس ان کا کہا: اللہ کا کہا ہے!

مُردوں کو بُرا کہنا ممنوع کیوں ہے!

حدیث ـــــ میں ہے کہ:''مُردوں کو گالی گلوچ مت کرو،اس لئے کہ وہ ان کاموں کی جزاء تک پہنچ گئے جوانھوں نے آگے بھیجے ہیں''(مشکوۃ حدیث ۱۶۶۴)

تشریح: مُردوں کی برائی دووجہ سے ممنوع ہے:

پہلی وجہ: مُردوں کو بُرا کہنے سے زندوں کو غصہ آتا ہے،اوران کو تکلیف پہنچتی ہے۔اوراس میں کچھ فائدہ بھی نہیں۔ یہ وجہ ایک واقعہ میں خود نبی ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔کسی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے کسی جاہلی باپ کی برائی کی۔آنجناب نے اس کو طمانچہ رسید کردیا۔بات بڑھ گئی۔تو آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے خطاب فرمایا۔اس میں ارشادفرمایا: لاتَسُبُّوا موتانا، فتُؤْذُوا أحيانا یعنی ہمارے مُردوں کو برامت کہو،اس سے ہمارے زندوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔اورایذائے مسلم حرام ہے(نسائی ۸:۳۳ کتاب القسامة، القود من اللَّطْمَة)

دوسری وجہ: بہت سوں کا حال بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔پس اگر مُردہ خوش اطواراورخوش انجام ہے،تو اس کی برائی کرنے والاخود بدانجام ہے۔اوراگر وہ بدکار ہےتو اس نے اپنی برائی کا بدلہ پالیا۔اب اس کی برائی کرنے سے کیاحاصل!اوریہ بھی ممکن ہے کہ اللہ نے اس کو بخش دیا ہو،پس برائی کرنے والا برا بنے گا۔اس لئے مُردوں کو گالی دینے سے منع کردیا۔اوریہ دوسری وجہ خوداسی حدیث میں مصرَّح ہے۔

[۲۴] قوله صلى الله عليه وسلم:'' هذا أثنيتم عليه خيرًا، فوجبت له الجنة'' الحديث.

أقول: إن الله تعالى إذا أحب عبدًا أحبه الملأُ الأعلى، ثم ينزل القبول في الملأ السافل، ثم إلى الصالحين من الناس، وإذا أبغض عبدًا، ينزل البغض كذلك، فمن شهد له جماعة من صالحي المسلمين بالخير ـــــ من صميم قلوبهم، من غير رياء، ولا موافقةِ عادة ـــــ فإنه آية كونه ناجيًا، وإذا أثنوا عليه شرًا، فإنه آية كونه هالكًا؛ ومعنى قوله صلى الله عليه وسلم:'' أنتم شهداء الله في الأرض'': أنهم موردُ الإلهام، وتراجِمَةُ الغيب.

[۲۵] قوله صلى الله عليه وسلم:'' لاتَسُبُّوا الأمواتَ، فإنهم قد أفْضَوْا إلى ما قدَّموا''

أقول: لما كان سبُّ الأموات سببَ غيظ الأحياء وتأذِّيهم، ولافائدة فيه، وإن كثيرًا من الناس لايعلم حالَهم إلا الله، نُهِيَ عنه؛ وقد بيَّنَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم هذا السببَ في قصة

سبَّ جاهليٌّ، وغضبِ العباس لأجله.

ترجمہ: (۴۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:......... میں کہتا ہوں: بیشک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس سے ملأ اعلیٰ محبت کرتے ہیں۔ پھر قبولیت ملأ سافل میں اترتی ہے۔ پھر نیک لوگوں کی طرف۔ اور جب وہ کسی بندے سے نفرت کرتے ہیں، تو نفرت بھی اسی طرح اترتی ہے۔ پس جس کے لئے نیک مسلمانوں کی ایک جماعت خیر کی گواہی دے —— اپنے دلوں کی گہرائی سے، بغیر ریاء کے، اور بغیر عادت کی موافقت کے —— تو بیشک وہ اس کے ناجی ہونے کی نشانی ہے۔ اور جب بیان کریں وہ اس کی برائی تو وہ اس کے تباہ حال ہونے کی نشانی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد: ''تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو'' کا مطلب یہ ہے کہ صالحین الہام وارد ہونے کی جگہ اور عالَم غیب کے ترجمان ہیں۔

(۴۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ..... میں کہتا ہوں: جب مُردوں کو برا بھلا کہنا زندوں کے غصہ کا اور اُن کی تکلیف کا سبب تھا۔ اور اس میں کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اور بیشک بہت سے لوگ: اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا حال کوئی نہیں جانتا، تو برائی کرنے سے منع کیا گیا۔ اور نبی ﷺ نے اس سبب کی وضاحت کی ہے۔ جاہلی گالی گلوچ، اور اس کی وجہ سے عباسؓ کے غصہ ہونے کے واقعہ میں۔

☆ ☆ ☆

تین مسائل: میں ہر طرح عمل کی گنجائش ہے

پہلا مسئلہ: لوگ جنازہ کے ساتھ آگے چلیں یا پیچھے؟ دونوں صورتیں جائز ہیں اور افضل میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک پیچھے چلنا افضل ہے، اور شوافع کے نزدیک آگے۔ روایات دونوں طرح کی ہیں۔ اور وجہ ترجیح میں اختلاف ہے کہ جنازہ کے ساتھ جانے والے کس غرض سے ساتھ جاتے ہیں؟ احناف کے نزدیک الوداع کرنے جاتے ہیں۔ اور رخصت کرنے والا مہمان کے پیچھے تھوڑی دور تک جاتا ہے۔ اور شوافع کے نزدیک سفارشی بن کر جاتے ہیں۔ اور سفارش کرنے والا اس آدمی کو لیکر جاتا ہے جس کے لئے وہ سفارش کرے گا۔ ترجیح کی دوسری وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اور شیخین: ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما جنازہ سے آگے چلتے تھے۔ شوافع نے اسی کو افضل کہا ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ یہ بڑے حضرات تھے۔ اگر یہ لوگوں کے ساتھ چلتے تو لوگوں کو چلنے میں تکلف ہوتا۔ اس لئے یہ حضرات آگے چلتے تھے اور عام لوگ پیچھے چلتے تھے۔ پس وہی اصل ہے اور وہی افضل ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ اگر سبھی جنازہ سے آگے چلتے ہوتے تو راوی ان حضراتِ ثلاثہ کی تخصیص نہ کرتا۔

دوسرا مسئلہ: جنازہ چار آدمی مل کر اٹھائیں یا دو آدمی؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسنون یہ ہے کہ چار آدمی اٹھائیں۔ سعید بن منصور رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں یہ اثر روایت کیا ہے۔ اور ابن المنذر نے حضرت عثمان حضرت سعد بن ابی وقاص حضرت ابن عمر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ دو آدمی جنازہ اٹھائیں۔ احناف کے نزدیک پہلی صورت افضل ہے۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک دوسری صورت۔ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں لیس فی حمل المیت توقیت یعنی جنازہ اٹھانے کا کوئی طریقہ متعین نہیں جس طرح چاہیں اٹھائیں (مگر سہولت چار کے اٹھانے میں ہے)

تیسرا مسئلہ: میت قبر میں قبلہ کی جانب سے لی جائے یا پیروں کی جانب سے؟ ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ تبوک میں راستہ میں ایک صحابی کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر میں خود آنحضرت ﷺ اترے اور میت کو قبلہ کی جانب سے لیا (مشکوۃ حدیث ۱۷۰۶) احناف کے نزدیک یہ طریقہ افضل ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ خود آنحضرت ﷺ کو سرہانے کی طرف سے قبر میں لیا گیا ہے (مشکوۃ حدیث ۱۷۰۵) یعنی قبر کی پائینتی کی جانب سے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: یہ طریقہ بہتر ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ ایسا عذر کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرے میں قبلہ کی جانب جنازہ رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس لئے ایسا کیا گیا تھا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تینوں مسائل میں مختار یہ ہے کہ ہر طرح عمل کی گنجائش ہے۔ اور ہر طرف کوئی حدیث یا اثر ہے۔

بغلی قبر کیوں بہتر ہے؟

حدیث ——— حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ: ”بغلی قبر ہمارے لئے ہے، اور صندوقی قبر ہمارے علاوہ کے لئے ہے (مشکوۃ حدیث ۱۷۰۱)

تشریح: دونوں طرح سے قبر بنانا درست ہے۔ مگر بغلی قبر بہتر ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: بغلی قبر میں میت کا زیادہ اکرام ہے۔ کیونکہ بے ضرورت میت کے چہرے پر مٹی ڈالنا بے ادبی ہے۔

دوسری وجہ: بغلی قبر میں میت مردار خور جانوروں سے محفوظ رہتی ہے۔ جانور نرم مٹی کھودتا رہتا ہے اور میت ایک طرف ہوتی ہے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔

قبروں کی بے حد تعظیم یا توہین ممنوع کیوں ہے؟

حدیث ——— میں ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو کاموں کے لئے بھیجا: ایک: یہ کہ جو بھی

(جاندار کی) تصویر نظر پڑے اس کو مٹا دیں۔ دوسرا: یہ کہ جو بھی قبر بلند ہو اس کو زمین کے برابر کردیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۹۶) دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پختہ قبر بنانے کی اور قبر پر عمارت بنانے کی اور قبر پر بیٹھنے کی ممانعت فرمائی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۹۷) تیسری حدیث میں قبروں کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۹۸) چوتھی حدیث میں قبر پر کتبہ لگانے کی اور قبر پر چلنے کی ممانعت فرمائی (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۰۹) اور پانچویں حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو بکثرت قبرستان جاتی ہیں اور ان لوگوں پر بھی جو قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں اور ان پر چراغاں کرتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۷۴۰)

تشریح: قبور کے معاملہ میں لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں۔ مذکورہ احادیث میں اعتدال قائم رکھنے کی ہدایت ہے۔ افراط: یہ ہے کہ قبریں اونچی کی جائیں۔ قبریں پختہ بنائی جائیں۔ قبروں پر روضہ بنایا جائے۔ ان کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی جائے۔ ان پر کتبہ لگایا جائے۔ ان پر پھول اور چادر ڈالی جائے اور ان پر چراغاں کیا جائے۔ یہ سب افعال شرک سے نزدیک کرنے والے ہیں۔ اور قبروں کو سجدہ کرنا، ان کا طواف کرنا، صاحبِ قبر سے مرادیں مانگنا۔ قبروں پر پھول اور چادر چڑھانا تو عین شرکیہ افعال ہیں۔ اور تفریط: یہ ہے کہ ان کو روندا جائے، ان پر چلا جائے، ان پر بیٹھا جائے اور ان پر قضائے حاجت کی جائے وغیرہ۔ اور اعتدال: یہ ہے کہ دل میں قبور کی قدر ومنزلت ہو اور وہ معاملہ کیا جائے جو سنت سے ثابت ہے یعنی قبروں کی زیارت کے لئے جانا اور ان کے پاس کھڑے ہوکر ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کرنا۔ علامہ ابن الہمام فتح القدیر (۱۰۲:۲) میں تحریر فرماتے ہیں: **والمعهودُ من السنةِ ليس إلا زيارتُها، والدعاءُ عندها قائما، كما كان يفعل النبي صلى الله عليه وسلم في الخروج إلى البقيع اهـ**

اور قبروں پر بیٹھنے کی جو ممانعت کی گئی ہے اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں: ایک: مجاور بن کر بیٹھنا۔ اس صورت میں یہ حکم باب افراط سے ہے دوسرا: قبروں پر آرام کرنے کے لئے بیٹھنا، اس صورت میں یہ حکم باب تفریط سے ہے یعنی اکرامِ میت کے خلاف ہے۔

اور قبور کی اہانت اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے قبور کی قدر ومنزلت دل سے ختم ہوجائے گی۔ اور لوگ قبروں کی زیارت کے لئے جانا چھوڑ دیں گے۔ حالانکہ زیارتِ قبور مامور بہ ہے۔ اس میں مُردوں اور زندوں: دونوں ہی کا فائدہ ہے۔

اور حد سے زیادہ تعظیم اس لئے جائز نہیں کہ وہ شرک تک پہنچاتی ہے۔ جب لوگ قبروں کی تعظیم میں مبالغہ کرتے ہیں، اور ناجائز طریقوں سے تعظیم بجالاتے ہیں، تو وہ قبروں کی پرستش کا ذریعہ بن جاتی ہے اور دین میں تحریف در آتی ہے۔ اہل کتاب نے اپنا دین اسی راہ سے بگاڑ لیا تھا۔ حدیث میں ہے: ''یہود ونصاری پر خدا کی پھٹکار! انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا!'' (مشکوٰۃ حدیث ۷۱۲)

[۲۶] وهل يُمشى أمامَ الجنازة أو خلفها؟ وهل يحمِلُها أربعةٌ أو اثنان؟ وهل يُسَلُّ من قِبَلِ رجليه أو من القبلة؟ المختار: أن الكل واسع، وأنه قد صحَّ في الكل حديث أو أثر.

[۲۷] قوله صلى الله عليه وسلم: "اللحدلنا، والشق لغيرنا"

أقول: ذلك: لأن اللحد أقربُ من إكرام الميت، وإهالةُ التراب على وجهه من غير ضرورة سوءُ أدب.

[۲۸] وإنما بعث النبيُّ صلى الله عليه وسلم عليًا رضي الله عنه: أن لايدعَ تمثالاً إلا طَمَسَه ولا قبرًا مُشْرِفًا إلا سَوَّاه، ونَهى أن يجصص القبر، وأن يبنىٰ عليه، وأن يقعد عليه، وقال: "لاتصلوا إليها" لأن ذلك ذريعةٌ أن يتخذها الناس معبودًا، وأن يُفرِطوا في تعظيمها بما ليس بحق، فيحرِّفوا دينَهم، كما فعل أهلُ الكتاب، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "لعن الله اليهود والنصارى اتَّخذُوا قبورَ أنبيائهم مساجد"

ومعنى: "أنْ يُقعد عليه": قيل: أنْ يُلازِمَه المزوِّرُوْنَ، وقيل: أن يَطَئُوا القبورَ، وعلى هذا: فالمعنى: إكرام الميت، فالحقُّ: التوسط بين التعظيم الذي يقارب الشرك، وبين الإهانة، وتركِ المبالاة به.

ترجمہ: (۲۶) اور کیا جنازہ کے آگے چلا جائے یا اس کے پیچھے؟ اور کیا جنازہ کو چار آدمی اٹھائیں یا دو؟ اور کیا میت کھینچی جائے اس کے دونوں پیروں کی جانب سے یا قبلہ کی جانب سے؟ پسندیدہ بات یہ ہے کہ ہر طرح گنجائش ہے۔ اور یہ کہ ثابت ہوئی ہے ہر صورت میں کوئی حدیث یا کوئی اثر۔

(۲۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "بغلی قبر ہمارے لئے ہے اور صندوقی قبر ہمارے علاوہ کے لئے" میں کہتا ہوں: وہ بات (یعنی بغلی قبر کی بہتری) اس لئے ہے کہ بغلی قبر نزدیک تر ہے میت کے اکرام سے۔ اور مٹی ڈالنا میت کے چہرے پر بے ضرورت بے ادبی ہے۔

(۲۸) اور نبی ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو اسی لئے بھیجا کہ نہ چھوڑیں وہ کسی تصویر کو مگر مٹادیں اس کو، اور نہ کسی بلند قبر کو مگر برابر کردیں اس کو۔ اور منع فرمایا اس بات سے کہ قبر پختہ بنائی جائے اور اس بات سے کہ قبر پر تعمیر کی جائے اور اس بات سے کہ قبر پر بیٹھا جائے۔ اور فرمایا: "نہ نماز پڑھو تم قبروں کی طرف": اس لئے کہ یہ ذریعہ ہے اس بات کا کہ لوگ قبروں کو معبود بنائیں اور اس بات کا کہ لوگ حد سے بڑھ جائیں ان کی تعظیم میں، اس طریقہ سے جو جائز نہیں، پس بگاڑ لیں وہ اپنے دین کو، جیسا کہ اہل کتاب نے (بگاڑ لیا) اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "رحمت سے دور کیا اللہ نے یہود ونصاریٰ کو: انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدوں کی جگہیں بنایا۔

اور ''اس بات سے کہ قبر پر بیٹھا جائے'' کا مطلب: کہا گیا کہ چمٹے رہیں اس سے مجاور ین۔ اور کہا گیا کہ روندیں لوگ قبروں کو۔ اور اس معنی پر: پس ممانعت کی وجہ میت کا اکرام ہے۔ پس برحق بات: اعتدال ہے اس تعظیم کے درمیان جو شرک کے لگ بھگ ہے اور توہین کرنے کے درمیان اور قبروں کے ساتھ لاپروائی برتنے کے درمیان۔

تصحیح: المبالاۃ مطبوعہ نسخہ میں الموالاۃ تھا۔ یہ تصحیف ہے۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

میت پر آنسو بہانا کیوں جائز ہے؟

میت پر رونا یعنی آنسو بہانا اور اس پر حزن وملال کرنا ایک فطری چیز ہے۔ اس سے بچنا انسان کی استطاعت سے باہر ہے۔ اس لئے اس سے بالکلیہ نہیں روکا گیا۔ اور کیسے روکا جاتا؟ یہ چیز تو رقّتِ قلبی کا نتیجہ ہے۔ اور رحم لی امر محمود ہے۔ عمرانی زندگی میں باہمی الفت ومحبت اسی پر موقوف ہے۔ اور انسان کی سلامتیٔ مزاج کا بھی تقاضا ہے۔ اس لئے میت پر آنسو بہانا جائز ہے۔ متفق علیہ روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ایک نواسے کے انتقال کا وقت قریب آیا تو صاحب زادی نے اصرار سے آپؐ کو بلایا۔ آپؐ صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے۔ بچہ آپؐ کی گود میں دیدیا گیا۔ اس کی جانکنی کا وقت تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر آپؐ کے آنسو بہنے لگے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یہ کیا؟! یعنی آپؐ میت پر رونے سے منع فرماتے ہیں اور آج آپؐ خود رو رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ جذبۂ رحمت ہے، جو اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں بندوں پر رحم فرماتے ہیں جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۲۳)

میت پر نوحہ ماتم کرنا کیوں منع ہے؟

حدیث ــــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن عُبادۃ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے۔ نبی ﷺ صحابہ کے ساتھ ان کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ دیکھا وہ بے ہوش ہیں۔ آپؐ نے دریافت کیا کیا: وفات ہوگئی؟ لوگوں نے بتایا: نہیں۔ آپؐ ان کا حال دیکھ کر رو پڑے۔ لوگ بھی آپؐ کو روتا دیکھ کر رونے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: سنو! اللہ تعالیٰ آنسو بہانے پر اور دل کے حزن وملال پر سزا نہیں دیتے۔ بلکہ اس کی وجہ سے سزا دیتے ہیں ــــ اور اپنی زبان کی طرف اشارہ کیا ــــــ یا مہربانی فرماتے ہیں'' یعنی اگر زبان سے ناشکری، بے صبری اور بے ادبی کے کلمات نکالے تو مستحق عذاب ہوگا۔ اور حمد وترجیع کی تو مستحق ثواب ہوگا۔ ''اور بیشک میت کو سزا دی جاتی ہے، اس پر اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے'' یعنی نوحہ اور آہ وبُکاء کرنے کی وجہ سے (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۲۴)

حدیث ــــ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہم میں سے نہیں جو رخسار پیٹے اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی طرح پکاریں پکارے" (مشکوۃ حدیث ۱۷۲۵)

تشریح: میت پر نوحہ اور ماتم کرنا تین وجوہ سے ممنوع ہے:

پہلی وجہ: یہ چیزیں غم میں ہیجان پیدا کرتی ہیں۔ اور جس کا کوئی آدمی مرجاتا ہے وہ بمنزلۂ مریض کے ہوتا ہے۔ مریض کا علاج ضروری ہے تاکہ مرض میں تخفیف ہو۔ اس کے مرض میں اضافہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اسی طرح مصیبت زدہ کا ذہن کچھ وقت کے بعد حادثہ سے ہٹ جاتا ہے۔ پس بالقصد اس صدمہ میں گھسنا کسی طرح مناسب نہیں۔ جب لوگ تعزیت کے لئے آئیں گے اور نوحہ ماتم کریں گے تو پسماندگان کو بھی خواہی نخواہی اس میں شریک ہونا پڑے گا، اور ان کا صدمہ تازہ ہوگا۔ پس یہ تعزیت نہ ہوئی، تعزیرات ہوگئیں!

دوسری وجہ: کبھی بے چینی میں ہیجان قضائے الٰہی پر عدم رضا کا سبب بن جاتا ہے۔ اور اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنا ضروری ہے۔ پس جو چیز اس میں خلل انداز ہو وہ ممنوع ہونی ہی چاہئے۔

تیسری وجہ: زمانۂ جاہلیت میں لوگ بہ تکلف (بناوٹی) دردوغم کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اور یہ بری نقصان رساں عادت ہے اس لئے شریعت نے نوحہ ماتم کرنے سے منع کیا۔

[۲۹] ولما كان البكاءُ على الميت، والحزنُ عليه، طبيعةً لايستطيعون أن ينفكوا عنها، لم يَجُزْ أن يكلَّفوا بتركه، كيف؟ وهو ناشيءٌ من رقّة الجنسية، وهي محمودة، لتوقفِ تألُّفِ أهل المدينة فيما بينهم عليها، ولأنها مقتضىٰ سلامة مزاج الإنسان وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "إنما يرحم الله من عباده الرحماءَ"

[۳۰] قوله صلى الله عليه وسلم: "إن الله لايعذِّبُ بدمع العين، ولابحزن القلب، ولكن يعذب بهذا ــــ وأشار إلى لسانه ــــ أو يرحم" قوله صلى الله عليه وسلم: "ليس منا من ضرب الخدود، وشق الجيوب، ودعا بدَعوى الجاهلية"

[أقول:] السر فيه: أن ذلك سببُ تهيُّج الغم، وإنما المصاب بالثُّكل بمنزلة المريض، يُعالَج ليتخفف مرضُه، ولاينبغي أن يُسعى في تضاعف وجعه، وكذلك المُصاب يَشْغَلُ عمَّا يجده، ولاينبغي أن يغوص بقصده.

وأيضًا: فلعل هيجان القَلَق يكون سببا لعدم الرضابالقضاء.

وأيضًا: فكان أهلُ الجاهليةِ يراء ون الناسَ بإظهارِ التفجُّع، وتلك عادة خبيثة ضارَّة، فنهوا عنها.

ترجمہ: (۲۹) اور جب میت پر رونا اور میت پر غم کرنا ایسی فطری بات تھا جس سے جدا ہونے کی لوگ استطاعت

نہیں رکھتے تو نہیں جائز ہے کہ لوگ مکلف کئے جائیں اس کو چھوڑنے کے۔ کیسے مکلف کئے جاسکتے ہیں؟ درانحالیکہ وہ بات پیدا ہونے والی ہے ابنائے جنس پر دل کے پسیجنے سے، اور وہ ستودہ ہے، اہل شہر کی باہمی الفت موقوف ہونے کی وجہ سے اس رقت پر۔ اور اس لئے کہ وہ رقت انسان کے مزاج کی درستگی کا تقاضا ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے مہربانی کرنے والوں ہی پر رحم کرتے ہیں''

(۳۰) آنحضرت ﷺ کے دوارشادات: ...... میں کہتا ہوں: رازِ ممانعت میں یہ ہے کہ یہ چیز (نوحہ ماتم) غم کے ہیجان کا سبب ہے۔ اور کسی کی موت کی مصیبت پہنچایا ہوا شخص مریض جیسا ہی ہے۔ اس کا علاج کیا جاتا ہے تاکہ اس کی بیماری میں تخفیف ہو۔ اور نہیں مناسب ہے کہ کوشش کی جائے اس کے درد کو دوچند کرنے میں، اور اسی طرح مصیبت زدہ غافل ہو جاتا ہے اس غم سے جس کو وہ پاتا ہے۔ اور نہیں مناسب ہے کہ گھسے وہ (اس غم میں) بالا رادہ ـــــ اور نیز: پس شاید بےچینی کا جوش سبب بن جائے فیصلۂ خداوندی پر راضی نہ ہونے کا ـــــ اور نیز: پس زمانۂ جاہلیت والے نمائش کرتے تھے لوگوں کے سامنے دردمندی کا اظہار کر کے۔ اور یہ بری نقصان دہ عادت ہے، پس لوگ اس سے روکے گئے۔

☆ ☆ ☆

نوحہ کرنے والی عورت کی سزا اور اس کا راز

نوحہ خوانی: ایک پیشہ ہے۔ عام طور پر یہ دھندا عورتیں کرتی ہیں۔ ان کا کام مُردے کے سچے جھوٹے فضائل بیان کر کے رونا رُلانا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ نوحہ گری کرنے والی عورت نے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کی تو اسے قیامت کے دن اس حال میں کھڑا کیا جائے گا کہ اس پر قطران کا کرتا اور خارش کی قمیص ہوگی (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۲۷)

تشریح: قَطِران: تارکول جیسا ایک سیاہ بدبودار مادہ ہے، جو درختِ اَبہل (ہوبیر) سے نکلتا ہے۔ اور خارشتی اونٹوں پر ملا جاتا ہے۔ اور وہ آگ بہت جلدی پکڑتا ہے اور حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اس پر خارش مسلط ہوگی اور اوپر سے قطران ملا جائے گا۔ یہ سزا جنسِ عمل سے ہے۔ کیونکہ بین کرنے والی عورت کا اس کے گناہ نے احاطہ کر لیا ہے۔ پس اس کا گناہ جسم کا احاطہ کرنے والے بدبودار مادہ کی صورت میں متمثل ہوگا۔ اور کھڑا کرنا یا تو تشہیر کے لئے ہے یا یہ بھی جنسِ عمل سے سزا ہے، کیونکہ نوحہ کرنے والی عورت مجمع میں کھڑی ہو کر گریہ وزاری کرتی ہے، اس لئے اس کی سزا بھی ویسی ہی ہونی چاہئے۔

جاہلیت کی چار باتوں سے پیچھا چھڑانا مشکل کیوں ہے؟

حدیث ـــــ میں ہے کہ جاہلیت کی چار باتیں میری امت میں رہیں گی۔ لوگ ان کو بالکلیہ نہیں چھوڑیں گے:

ایک: حَسَب (خاندانی خوبیوں) پر فخر کرنا یعنی اپنی بڑائی جتلانا دوم: نَسَب میں طعن کرنا یعنی دوسروں کے نسب میں کیڑے نکالنا۔ سوم: ستاروں سے بارش کی توقع رکھنا یعنی یہ امید باندھنا کہ فلاں ستارہ فلاں منزل میں آئے گا یا فلاں مہینہ شروع ہوگا تو بارش ہوگی۔ چہارم: نوحہ کرنا یعنی میت پر واویلا کرنا (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۲۷)

تشریح: نبی ﷺ نے فراستِ نبوت سے یہ بات سمجھ لی کہ لوگ مذکورہ باتوں سے کنارہ کش نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ باتیں بشری طبیعت کے حد اعتدال سے نکل جانے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور یہ ایسا ہی تقاضا ہے جیسا شدتِ شہوت کا تقاضا۔ جس سے شہوت پرست جدا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح بعض لوگ ڈینگ ہانکنے اور لاف زنی کے خوگر ہوتے ہیں۔ جس سے پہلی دو برائیاں جنم لیتی ہیں۔ ڈینگیا اپنی خاندانی خوبیوں پر اتراتا ہے، اور دوسرے کی خوبیاں اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتیں اور وہ اس کے حَسَب ونَسَب میں کیڑے نکالتا ہے۔ اسی طرح لوگوں میں مُردوں کی الفت ومحبت پائی جاتی ہے، جو ان کو نوحہ گری پر ابھارتی ہے۔ اور رصد بندی یعنی سیاروں کا مشاہدہ کرنے کا سلسلہ بھی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ جو ستاروں سے بارش کی امید باندھنے تک مُفضی ہوتا ہے۔ چنانچہ آج بھی دنیا کے سبھی لوگوں میں خواہ عرب ہوں یا عجم، یہ سلسلہ جاری ہے۔

فائدہ: حدیث کا منشا یہ ہے کہ ان چار برائیوں کا ازالہ چونکہ مشکل ہی سے ہوتا ہے، اس لئے لوگ ان سے پیچھا چھڑانے کی ہرممکن کوشش کریں۔ جیسے کپڑے پر کوئی ایسی چیز لگ جائے جس کا ازالہ دشوار ہو تو لوگ مختلف تدبیروں سے داغ چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگ اپنی خاندانی خوبیوں پر شیخی نہ بگھاریں، بلکہ خدا کا شکر بجالائیں۔ اور دوسروں کی خاندانی خوبیوں کے سلسلہ میں لوگ عالی ظرفی اور سیر چشمی کا مظاہرہ کریں۔ اور مُردوں کی محبت میں اعتدال قائم رکھیں۔ اور نمائشی طور پر ہاہو کرنے سے احتراز کریں۔ اور فضلِ الٰہی سے بارش کی امید باندھیں۔

عورتوں کا جنازہ کے ساتھ جانا ممنوع کیوں ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک جنازہ میں تشریف لے جارہے تھے آپؐ نے چند عورتوں کو ایک جگہ بیٹھا ہوا دیکھا۔ پوچھا: ''یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' جواب دیا: ہم جنازہ کا انتظار کررہی ہیں۔ پوچھا: ''تم نے جنازہ کو نہلایا؟'' جواب دیا: نہیں! پوچھا: ''تم جنازہ کو کندھا دوگی؟'' جواب دیا: نہیں! پوچھا: ''تم جنازہ کو قبر میں اُتاروگی؟'' جواب دیا: نہیں! آپؐ نے فرمایا: ''تو واپس جاؤ گناہوں کا بوجھ لیکر، ثواب سے خالی ہاتھ!'' (ابن ماجہ حدیث ۱۵۷۸)

تشریح: مذکورہ سوال وجواب سے واضح ہوا کہ عورتوں کا جنازہ میں کوئی کام نہیں۔ پس ان کی شرکت بے معنی ہے۔ اور ان کی شرکت میں مفاسد کا اندیشہ ہے: وہ شور وشغب کریں گی، واویلا مچائیں گی، بے صبری دکھلائیں گی اور بے

پردگی بھی ہوگی، اس لئے عورتوں کو جنازہ کے ساتھ جانے سے روک دیا گیا۔

[۳۱] قوله صلى الله عليه وسلم في النائحة: "تُقام يوم القيامة وعليها سِرْبال من قَطِرَان، ودِرْعٌ من جَرَبٍ.

أقول: إنما كان كذلك: لأنها أحاطت بها الخطيئة، فجوزيت بتمثُّل الخطيئة نَتْنًا محيطًا بجسدها، وإنما تقام تشهيرًا، أو لأنها كانت قائمةً عند النوحة.

[۳۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "أربع في أمتي من أمر الجاهلية، لايتركونهن" الحديث.

أقول: إنما تفطَّن النبيُّ صلى الله عليه وسلم أنهم لايتركون: لأن ذلك مقتضى إفراطِ الطبيعة البشرية بمنزلة الشَّبَق، فإن النفوس لها تِيهٌ يظهر في الأنساب، وألفةٌ بالأموات تستدعي النياحة، ورَصدٌ يُؤدِّي إلى الاستسقاء بالنجوم، ولذلك لن ترى أمة من البشر، من عربهم وعجمهم، إلا وهذه سنَّةٌ فيهم.

[۳۳] قوله صلى الله عليه وسلم: في النساء يتَّبِعْنَ الجنازة: "ارجعْنَ مأزوراتٍ، غير مأجوراتٍ"

أقول: إنما نُهِينَ عن ذلك: لأن حضورهن مظنة الصخب والنياحة، وعدم الصبر، وانكشاف العورات.

ترجمہ: (۳۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: نوحہ گری کرنے والی عورت کے بارے میں: کھڑی کی جائے گی وہ قیامت کے دن: درانحالیکہ اس پر قطران کا کرتا اور خارش کی قمیص ہوگی" میں کہتا ہوں: تھا ویسا ہی (یعنی اس کی یہی سزا ہے) اس لئے کہ گناہ نے اس کا احاطہ کرلیا ہے۔ پس بدلہ دی گئی گناہ کے متمثّل ہونے کے ذریعہ: اس کے جسم کو گھیرنے والی بدبودار چیز کے ذریعہ۔ اور کھڑی کی جائے گی: رسوائی کے طور پر ہی یا اس لئے کہ وہ نوحہ گری کے وقت کھڑی رہا کرتی تھی۔

(۳۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: " چار باتیں میری امت میں جاہلیت کی چیزوں میں سے، لوگ ان کو نہیں چھوڑیں گے" آخر حدیث تک۔ میں کہتا ہوں: سمجھ لیا نبی ﷺ نے کہ لوگ نہیں چھوڑیں گے: اس لئے کہ یہ باتیں بشری فطرت کے: حد سے باہر ہوجانے کا تقاضا ہیں۔ جیسے شدت شہوت۔ پس بیشک نفوس کے لئے ایک ڈینگ ہے جو نسبوں میں ظاہر ہوتی ہے، اور مُردوں کے ساتھ الفت ہے جو نوحہ کو چاہتی ہے۔ اور رصد بندی ہے، جو ستاروں سے بارش کی امید باندھنے تک پہنچاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے نہیں دیکھے گا تو انسانوں کے کسی گروہ کو، ان کے عربوں اور عجمیوں میں سے مگر یہ طریقہ (رصد بندی کا) ان میں رائج ہوگا۔

(۳۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ان عورتوں کے بارے میں جو جنازہ کے ساتھ جارہی تھیں: " لوٹ جاؤ تم

درانحالیکہ گناہ گار ہونے والی ہو، ثواب پانے والی نہیں ہو!'' میں کہتا ہوں: وہ اس سے اسی لئے روکی گئی ہیں کہ ان کی جنازہ میں شرکت: شور و شغب، واویلا، بے صبری اور بے پردگی کی احتمالی جگہ ہے۔

☆ ☆ ☆

تین بچے فوت ہونے کا ثواب اور اس کی وجہ

حدیث ——— میں ہے کہ: ''کسی مسلمان کے تین بچے نہیں مرتے، پھر وہ جہنم میں داخل ہو جائے (یعنی ایسا نہیں ہوسکتا) مگر قسم کھولنے کے طور پر'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۲۹)

تشریح: جس کے تین بچے فوت ہو گئے ہوں، اس کے جہنم میں نہ جانے کی چند وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اس نے بامید ثواب صبر کر کے اپنے نفس سے جہاد کیا ہے۔ اس کا یہ صلہ ملا ہے باقی وجوہ مبحث ۵ باب ۱۳ میں گذر چکی ہیں۔ دیکھیں رحمۃ اللہ (۱:۵۷۷) عنوان: ''آفات وبلیات کی حکمتیں''

تسلی دینے والے کو مصیبت زدہ کے مانند اجر ملنے کی وجہ

حدیث ——— میں ہے کہ: ''جو شخص کسی مصیبت زدہ کو تسلی دے، اس کے لئے اُس مصیبت زدہ کے ثواب کے مانند ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۳۷)

تشریح: مصیبت عام ہے: خواہ کسی کے مرنے کی مصیبت ہو یا کوئی مالی یا غیر مالی آفت ٹوٹ پڑی ہو۔ اور تسلی دینا بھی عام ہے: خواہ مصیبت زدہ کے پاس جا کر تسلی دے، یا خط وغیرہ کے ذریعہ تسلی دے۔ ہر صورت میں تسلی دینے والے کو بھی ویسا ہی اجر ملے گا، جیسا مصیبت زدہ کو صبر کرنے پر ملتا ہے (مگر دونوں کے اجر میں برابری ضروری نہیں) اور ان کی تین وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: تسلی دینے والا مصیبت زدہ کے صبر کا باعث بنا ہے یعنی اس کے تسلی دینے سے مصیبت زدہ کو صبر آیا ہے۔ اور حدیث میں ہے: الدالُّ علی الخیر کفاعله یعنی جو اچھی بات کا راستہ بتاتا ہے اس کو بھی اس اچھی بات پر عمل کرنے والے کی طرح ثواب ملتا ہے (مجمع الزوائد ۱:۱۶۶) (یہ وجہ شارح نے مظاہر حق سے بڑھائی ہے)

دوسری وجہ: جو مصیبت زدہ کے پاس حاضر ہوتا ہے، وہ بھی مصیبت زدہ کی طرح بے قرار ہوتا ہے۔ اور وہ بھی صبر کرتا ہے۔ پس ہر ایک کو اس کے صبر کا اجر ملتا ہے۔

تیسری وجہ: جس کا کوئی آدمی فوت ہو گیا ہے: اس کی صورت، اور اس کو تسلی دینے کی صورت ایک جیسی ہے۔ کیونکہ تسلی دینے والا اس صدمہ کو اپنا صدمہ تصور کرتا ہے۔ اور عالم مثال (آخرت) کا مدار مماثلت پر ہے یعنی عمل کی جزا عمل

کے مشابہ ہوتی ہے۔اس لئے جوثواب میت کے پسماندگان کوملتا ہے، وہی تسلی دینے والے کو بھی ملتا ہے۔ کیونکہ دونوں کا عمل ایک جیسا ہے، پس دونوں کی جزا بھی ایک جیسی ہوگی۔

پسماندگان کے لئے یک شبانہ روز کھانا تیار کرنے کی حکمت

حدیث ــــــ میں ہے کہ جب غزوۂ موتہ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اوراس کی اطلاع مدینہ پہنچی، تو ان کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا کہ: ''جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو، اس لئے کہ ان کے یہاں ایسی خبر آئی ہے کہ انہیں کھانا پکانے کا ہوش نہیں!'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۳۹)

تشریح: میت کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرنا ان پر انتہائی درجہ کی شفقت ہے۔ اوران کو بھوک کی تکلیف سے بچانا ہے۔ یعنی یہ حکم اظہار شفقت اوراعانت کے لئے ہے۔

[٣٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " لايموت لمسلم ثلاثة من الولد فيلج النار"

أقول: ذلك: لجهاده نفسَه بالاحتساب، ولمعانٍ ذكرناها.

[٣٥] قوله صلى الله عليه وسلم: " مَن عَزّى مُصابا فله مثلُ أجرِه"

أقول: ذلك لسببين: أحدهما: أن الحاضر يَرِقُّ رِقّةَ المصاب، وثانيهما: أن عالَم المثال مبناه على ظهور المعانى التضايفية، ففى تعزية الثُكلىٰ صورةُ الثُكلِ، فجوزى شِبْهَ جزائه.

[٣٦] قوله صلى الله عيه وسلم: " اصنعوا لآل جعفر طعامًا، فقد أتاهم ما يُشغلهم"

أقول: هذا نهاية الشفقة بأهل المصيبة، وحفظهم من أن يتضرروا بالجوع.

ترجمہ: (۳۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:......... میں کہتا ہوں: وہ بات (یعنی جہنم میں نہ جانا) اس کے ٹکڑ لینے کی وجہ سے ہے اپنے نفس کے ساتھ بامید ثواب اوران وجوہ سے جن کو ہم نے ذکر کیا ہے۔

(۳۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:...... میں کہتا ہوں: وہ بات (یعنی مصیبت زدہ کے مانند ثواب ملنا) دو وجہ سے ہے: ان میں سے ایک: یہ ہے کہ موجود بھی بے قرار ہوتا ہے مصیبت زدہ کے بے قرار ہونے کی طرح۔ اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ عالَم مثال کا مدار معانی تضایفیہ (باہم دیگر مناسبت رکھنے والی باتیں) کے ظاہر ہونے پر ہے۔ پس جس کا کوئی آدمی فوت ہوگیا، اس کو تسلی دینے میں بھی آدمی فوت ہونے کی صورت ہے، پس وہ مصیبت زدہ کے بدلے کے مشابہ بدلہ دیا گیا۔

(۳۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:...... میں کہتا ہوں: یہ مصیبت زدوں کے ساتھ انتہائی درجہ کی شفقت ہے۔ اور ان کو بچانا ہے اس سے کہ وہ بھوک سے ضرر اٹھائیں۔

لغت: تضایُف (مصدر باب تفاعل) ضَاف إليه: مائل ہونا أضافه: مائل کرنا، منسوب کرنا، مضاف مضاف الیہ اسی سے بنے ہیں اس دنیا کی چیزیں: عالم مثال کی شبیہ ہیں۔ اور عالم مثال کی چیزیں اس دنیا کی چیزوں کے مانند ہیں۔ یہی تضایف (باہم دیگر مناسبت رکھنا) ہے۔ اور اعمال کی جزائیں بھی چونکہ عمل کے مشابہ ہوتی ہیں، اس لئے اعمال اور ان کی جزائیں تضایفی امور ہیں۔ غرض یہ فلسفہ کی اصطلاح ہے۔ جن دو چیزوں میں نسبتِ اضافت ہوتی ہے وہ تضایُفی امور کہلاتے ہیں۔

پہلے زیارتِ قبور کی ممانعت پھر اجازت کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ''میں نے آپ لوگوں کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا۔ پس ان کی زیارت کرو'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۶۲) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: ''میں نے آپ لوگوں کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا، پس ان کی زیارت کرو۔ کیونکہ قبرستان جانا دنیا سے بے رغبت کرتا ہے۔ اور آخرت کی یاد دلاتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۶۹)

تشریح: شروع میں جب عام مسلمانوں کے دلوں میں توحید کا بیج پوری طرح جما نہیں تھا۔ اندیشہ تھا کہ قبرستان جانے سے قبور پرستی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اس لئے قبروں پر جانے سے منع کیا گیا تھا۔ پھر جب امت کا توحیدی مزاج پختہ ہو گیا۔ اور اسلام کی بنیادی تعلیمات دلوں میں جڑ پکڑ گئیں۔ اور شرک سے دلوں میں نفرت بیٹھ گئی۔ اور قبور پر جانے سے شرک کا اندیشہ نہ رہا، تو آپؐ نے قبور پر جانے کی اجازت دیدی۔ اور جواز کی وجہ یہ بیان کی کہ زیارتِ قبور میں بڑا فائدہ ہے۔ اس سے آدمی کو اپنی موت یاد آتی ہے۔ اور وہ انقلاباتِ دہر سے عبرت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

زیارتِ قبور کی دعائیں

پہلی دعا: رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم دیا کرتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو اس طرح دعا کریں: أَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ، نَسْئَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ (سلام ہو تم پر اے گھر والو! مؤمنین اور مسلمین میں سے۔ اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو تم سے ضرور ملنے والے ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے سلامتی کی) (مشکوۃ حدیث ۱۷۶۴)

دوسری دعا: رسول اللہ ﷺ کا گذر مدینہ میں چند قبروں پر ہوا۔ آپؐ نے ان کی طرف رخ کیا، اور کہا: أَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ (سلام ہو تم پر، اے قبروالو!

اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائیں، تم ہمارے پیش رَو ہو، اور ہم نشان قدم پر ہیں یعنی تمہارے پیچھے آرہے ہیں) (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۶۵)

تشریح: اموات کی زیارت پر احیاء کی زیارت کے احکام جاری کئے گئے ہیں۔ پس جس طرح زندوں سے ملاقات ہوتی ہے تو ان کی طرف منہ کرکے سب سے پہلے سلام کیا جاتا ہے، اسی طرح اموات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی اموات کے لئے دعائے مغفرت کی جاتی ہے اور اپنی موت کو یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ زیارتِ قبور سے اصل مقصود یہی دو باتیں ہیں۔

[۳۷] قوله صلى الله عليه وسلم: " نهيتكم عن زيارة القبور، فزوروها"

أقول: كان نهى عنها لأنها تفتح باب العبادة لها، فلما استقرت الأصول الإسلامية، واطمأنت نفوسهم على تحريم العبادة لغير الله: أَذِنَ فيها، وَعَلَّلَ التجويز: بأن فائدته عظيمة، هي: أنها تذكر الموتَ، وأنها سبب صالح للاعتبار بتقلب الدنيا.

[۳۸] ومن دعاء الزائر لأهل القبور: " السلام عليكم أهل الديار من المؤمنين والمسلمين وإنا إن شاء الله بكم لَلاَحِقون، نسأل الله لنا ولكم العافية" وفي رواية: " السلام عليكم يا أهلَ القبور، يغفر الله لنا ولكم، أنتم سَلَفُنا ونحن بالأثر" والله أعلم.

ترجمہ: (۳۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: نبی ﷺ نے منع کیا تھا زیارت قبور سے۔ اس لئے کہ زیارتِ قبور: قبور کی پرستش کا دروازہ کھولتی ہے۔ پھر جب اسلامی عقائد جم گئے اور لوگوں کے اذہان غیر اللہ کی عبادت کی تحریم پر مطمئن ہوگئے، تو زیارت قبور کی اجازت دیدی۔ اور جائز کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ اس کا فائدہ بڑا ہے۔ اور وہ فائدہ یہ ہے کہ قبروں کی زیارت موت کو یاد دلاتی ہے۔ اور یہ کہ وہ بہترین ذریعہ ہے انقلابات دہر سے عبرت پذیری کا۔

(۳۸) اور قبور والوں کی زیارت کی دعا ہے: السلام إلخ ـــــ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(بہ توفیق الٰہی آج بروز جمعرات ۱۳ محرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۸ مارچ ۲۰۰۲ء
کتاب الصلاۃ کی شرح مکمل ہوئی فللّٰہ الحمد والمنّۃ)